مفردات القرآن (اردو)

تصنیف

امام راغب اصفہانی

ترجمہ و حواشی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہ فیروزپوری

شیخ شمس الحق

۲۴۔ کشمیر بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

مفردات القرآن (اردو)

تصنیف

امام راغب اصفہانی

ترجمہ و حواشی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہ فیروزپوری

جلد اوّل

شیخ شمس الحق

۲۳۸ کشمیر بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور

نام کتاب : مفردات القرآن

نام مولف : امام راغب اصفہانی

نام مترجم : حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدہ صاحب

طابع وناشر : شیخ شمس الحق

مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز

تاریخ اشاعت : جون ۸۷ء

قیمت :

واحد تقسیم کار

اسلامی اکادمی

اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا قرآن پاک نوعِ انسانی کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور یہ اپنی وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے انسانی عقل و فکر کے لئے ہر دور میں رہنما بن سکتا ہے اس کے مضامین کی وسعت اور ہمہ گیر تعلیمات کا تقاضا یہ تھا کہ اسے اس زبان میں نازل کیا جاتا جو اس وسعت کی متحمل ہو سکے اور اس کے اعجاز بیان کو اپنے اندر سمو سکے۔

یہ ادعا نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ یہ وسعت صرف عربی زبان میں پائی جاتی ہے فصاحت و بلاغت کے جو نادر اس زبان میں پنہاں ہیں دوسری سامی اور ایریائی زبانوں کا دامن ان سے یکسر تہی ہے اشتقاقات اور مترادفات کی جو فراوانی عربی زبان میں پائی جاتی ہے کسی دوسری زبان کو میسر نہیں محسنات بدیعہ کے خدوخال اور آثار جو اس کے چہرے پر نمایاں ہیں۔ دوسری زبانیں ان سے عاری نظر آتی ہیں الغرض عربی زبان ہی وہ زبان ہے جو ہر قسم کی لفظی اور معنوی خوبیوں سے آراستہ پیراستہ ہے اور دوسری زبانوں پر فائق نظر آتی ہے۔

اسکی دلیل یہ بھی ہے کہ عربی زبان میں جس قدر ضخیم قوامیس و معاجم لکھے گئے ہیں دوسری زبانوں میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں ملتا ان معاجم کے ملاحظہ سے عربی زبان کی فراخ دامانی اور جامعیت بخوبی سمجھ آسکتی ہے صحاح جوہری[1] کو لیجئے کہ وہ چالیس ہزار مواد (ROOTS) پر مشتمل ہے قاموس فیروز آبادی[2] میں ساٹھ ہزار مواد مذکور ہیں لسان العرب میں ابن منظور افریقی[3] نے اسی ہزار مواد سے بحث کی ہے ان کے بعد تاج العروس شرح قاموس ملاحظہ فرمایئے جس میں سید مرتضیٰ زبیدیؒ نے

---

[1] اسماعیل بن حماد الجوہری اللغوی ۳۳۲ھ یا ۳۹۳ھ [2] القاموس المحیط والقابوس الوسیط فیما ذہب من کلام العرب شماطیط لمجد الدین ابی طاہر محمد بن یعقوب بن محمد الشیرازی الفیروز آبادی (۷۲۹ھ - ۸۱۶ھ) [3] ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری ... (۶۳۰ھ - ۷۱۱ھ)

اپنے متبع سے ایک لاکھ بیس ہزار مطالع کر ڈالے ہیں[1]۔

ان تصریحات کے پیش نظر ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ قرآن پاک ایسی جامع کتاب کو، جو ابدی حقائق پر مشتمل ہے عربی زبان میں ہی نازل ہونا چاہیئے تھا اور یہی زبان ایسی تھی جو لسانِ وحی کی ترجمان بن سکتی تھی[2]۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عرب محض اہل زبان ہونے کی بنا پر قرآن کے اجمال و تفصیل سے کما حقہٗ آگاہ ہو جاتے تھے اور اس کے مفہوم و معنی کی تہ تک پہنچ جاتے تھے جیسا کہ ابن خلدون اور ان کے بالتبع بعض دوسرے مؤلفین نے اس قسم کے خیال کا اظہار کیا ہے[3] کیونکہ ایسی بات کہنا کسی قوم یا معاشرے کے احوال طبعی سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے موجودہ دور ہی کو لیجئے کہ کسی زبان میں جو علمی کتابیں تالیف کی جا رہی ہیں کیا اس زبان کے جاننے اور بولنے والے محض اہل زبان ہونے کی بنا پر ان کتابوں کو سمجھ رہے ہیں جب یہ واقعہ ہے کہ ان کتابوں کو پڑھنے اور سمجھنے کے لئے معرفت لسانی کے علاوہ خاص درجہ کی ذہنی اور عقلی صلاحیتوں کی ضرورت ہے تو ہم یہ کیسے باور کر سکتے ہیں کہ نزول قرآن کے زمانہ میں جو عام اہل عرب یا صحابہ کرام موجود تھے محض عربی ہونے کی بنا پر خود ہی قرآن سمجھ لیتے تھے اور انہیں کسی معلم یا رہنما کی طرف مراجعت کی ضرورت نہ تھی۔

مزید برآں ہم صحابہؓ میں سے اہل علم حضرات کو دیکھتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کے بعض الفاظ کے معنی کے ادراک سے عجز کا اظہار فرمایا ہے علامہ سیوطیؒ الاتقان میں لکھتے ہیں:۔

حضرت عمرؓ نے آیت کریمہ: وَفَاكِهَةً وَّأَبًّا میں "أَبًّا" کے معنی سمجھنے سے عجز کا اعتراف کیا ہے[4]

نیز منقول ہے کہ حضرت عمرؓ نے منبر پر کھڑے ہو کر آیت کریمہ، أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَىٰ تَخَوُّفٍ تلاوت فرمائی اور حاضرین سے "تخوف" کے معنی دریافت فرمائے اس پر بنی ہذیل سے ایک شخص کھڑا ہو کر کہنے لگا "اس آیت میں "تخوف" بمعنی "تنقص" ہے اور اس پر یہ شاہد پیش کیا[5]۔

تخوف الرحل منها تامكا قردا   كما تخوف عود النبعة السفن

حضرت ابن عباسؓ ترجمان القرآن کے لقب سے معروف ہیں مگر مجاہد راوی ہیں کہ ابن عباسؓ نے فرمایا "فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ" کا صحیح مفہوم میرے ذہن میں نہیں آرہا تھا حتی کہ دو اعرابی ایک کنوئیں کے متعلق نزاع میرے پاس لائے ان میں سے ایک نے اپنے حق ملکیت کے ثبوت میں کہا: "انا فطرتها" کہ اس کنوئیں کو پہلی مرتبہ میں نے کھودا ہے یہ کلمہ سن کر میری مشکل حل ہوگئی اور فاطر السموٰت کا صحیح مفہوم میں نے سمجھ لیا۔

صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں عدی بن حاتم کا قصہ مشہور ہے جو دلچسپ بھی ہے یعنی کہ جب آیت کریمہ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (بقرہ: ۱۸۷) نازل ہوئی تو عدیؓ کا بیان ہے کہ میں نے سیاہ اور سفید دو عقال اپنے تکیے کے نیچے رکھ لئے کہ جب دونوں ایک دوسرے سے ممتاز نظر آنے لگیں گے تو کھانا پینا بند کر دوں گا آنحضرتؐ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا:۔

---

[1] محمد بن محمد بن عبدالرزاق الحسینی الزبیدی الملقب بمرتضی (۱۱۴۵ھ - ۱۲۰۵ھ) [2] راجع شرح دیباجہ القاموس للعلامہ نصر الہورینی ص ۲۶ [3] راجع الفیض الخبیر علی نہج التیسیر ص ۳۲ - ۳۴ بحوالہ ترجمہ قرآن [4] ملاحظہ ہو مقدمہ ابن خلدون ص ۸۰۴

[5] جزء ۲ ص ۱۱۳ و الموافقات بحوالہ اسماعیلی [6] الموافقات جلد ۲ ص ۸۷ - ۸۸ [7] صحیح بخاری مع الفتح ۸: ۱۲۹

إِنَّكَ لَعَرِيضُ الْقَفَا إِنَّمَا هِيَ سَوَادُ اللَّيْلِ وَبَيَاضُ النَّهَارِ

کہ ..... اس سے مراد تو صبح کی روشنی اور رات کی تاریکی ہے[1]

مندرجہ بالا سطور سے یہ امر بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ صحابہ کرام کو بعض مفرد اور مرکب کلمات کے سمجھنے میں مشکل پیش آتی تھی ورنہ آنحضرت یا اپنے رفقاء میں سے کسی دوسرے سے دریافت کرتے تھے اور قرآن فہمی میں سب یکساں صلاحیتوں کے مالک نہ تھے ابن قتیبہ لکھتے ہیں :

عرب قرآن فہمی میں مساوی درجہ پر نہ تھے کہ ان میں سے ہر ایک قرآن کے غریب اور متشابہات کا ادراک کر لیتا ہو بلکہ وہ مختلف مدارج کے حامل تھے

اسی طرح مسروق کا بیان ہے :

میں صحابہ کرام کی مجالس میں بیٹھتا رہا اور ان سے مستفید بھی ہوتا رہا میں نے دیکھا کہ صحابہؓ کی مثال پانی کے جوہڑ کی ہے بعض جوہڑ وہ ہیں جو پورے علاقہ کی ضروریات کو پورا کر رہے ہیں اور بعض چھوٹے ہیں جن سے بمشکل ایک آدمی سیر ہو سکتے ہیں۔

اس مختصر تمہید سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ صحابہؓ محض اہل زبان ہونے کی بنا پر قرآن کے ہر مقام کو نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو آنحضرت کی طرف رجوع کی ضرورت تھی اور یہ کہ علم و فضل میں سب صحابہ مساوی صلاحیتوں کے مالک نہ تھے بلکہ طبعی اور فطری طور پر ان میں بھی تفاوت درجات موجود تھا اس کے بعد اب ہم ان وسائل و مصادر سے بحث کرتے ہیں جو دور صحابہ میں موجود تھے جن سے بے نیازی دراصل تفسیر بالرائے کا در وازہ کھولتی ہے۔

تتبع اور جستجو سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں قرآن فہمی کے چار ذرائع تھے جن سے صحابہ و تابعین مستفید ہوتے رہے اور آج بھی ان ذرائع کی وہی حیثیت حاصل ہے جو اس دور میں سمجھی جاتی تھی۔

(۱) قرآن کریم (۲) احادیث نبویہ (۳) اسرائیلیات (۴) آثار صحابہؓ

(۱) قرآن کریم نے اپنے اسلوب بیان میں اگر ایک مقام پر اجمال سے کام لیا ہے تو دوسرے مقام پر اس کی تفصیل بھی فرما دی ہے اور بعض آیات میں اگر اطلاق یا عموم پایا جاتا ہے تو دوسرے مقامات پر ان کی تقیید و تخصیص بھی موجود ہے اس بنا پر علماء نے لکھا ہے کہ بقول "القرآن یفسر بعضہ بعضاً" لازم ہے کہ قرآن سمجھنے کے لئے پہلے قرآن ہی کا مطالعہ کیا جائے جس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ایک موضوع سے متعلقہ آیات کو یکجا کر کے مجموعی حیثیت سے ان پر غور کیا جائے علمائے تفسیر نے اس طریق تفسیر کو سب سے مقدم اور بہتر قرار دیا ہے حافظ ابن کثیرؒ اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں :

اگر ہم سے پوچھا جائے کہ قرآن فہمی کے لئے سب سے بہتر طریقہ کیا ہو سکتا ہے تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ قرآن کو قرآن ہی سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔[2]

اس سلسلہ میں اختلاف قراءت کو بھی ایک اہم مرجع کی حیثیت حاصل رہی ہے صحابہ کرام اور تابعین بعض آیات کو سمجھنے کے لئے اختلاف قراءت سے بھی استفادہ کرتے تھے خصوصاً حضرت عبداللہ بن مسعود اور ابی بن کعبؓ کی قراءت بہت زیادہ

---

[1] المسائل والاجوبہ ص ۸ طبع سعادت مصر ۱۳۴۹ھ [2] تفسیر ابن کثیر ص ۲

اہمیت کی حامل ہیں حضرت مجاہدؒ بیان فرماتے ہیں:۔

"اگر میں حضرت ابن مسعودؓ کی قراءت کو اختیار کرتا تو میرے بہت سے سوال ابن عباسؓ سے استفسار کے بغیر ہی حل ہو جاتے[1]۔"

بلکہ بعض علماء نے تفسیر کے ارتقاء اور اس کے مدارج کے سلسلہ میں اختلاف قراءت کو پہلا زینہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ تدوین تفسیر میں یہ پہلی کوشش تھی جسے صحابہؓ اور تابعینؒ نے اختیار کیا مگر اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قراءت متواترہ تو نصوص کی حیثیت رکھتی ہیں ہاں قراءت غیر متواترہ کو تفسیر کی حیثیت دے سکتے ہیں۔

مستشرقین نے اختلاف قراءت کو غلط رنگ دے کر اس سے غلط نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی ہے یعنی یہ کہ مسلمانوں نے قراءات کے قبول کرنے میں تساہل سے کام لیا حالانکہ نصوص قرآن کا ایک ہی شکل پر ہونا ضروری تھا اور یہ کہ ان قراءات کے موجد صحابہؓ کرام ہیں مگر یہ تعصب کی ہرزہ سرائی ہے۔ اگر یہ لوگ قراءت کی صحت اور اس کی قبولیت کے شرائط پر غور کر لیتے تو کبھی بھی صحابہؓ کی طرف تساہل کی نسبت نہ کرتے۔

"تفسیر القرآن بالقرآن" کے طرز پر علماء نے تفاسیر بھی لکھی ہیں ان میں سے ایک تفسیر امام راغب کی طرف بھی منسوب ہے جس کے متعلق حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:۔

" وطريقة انه اورد جملاً من الآيات ثم فسرها تفسيراً مشبعاً "

متاخرین میں سے حافظ ابن کثیرؒ نے خصوصیت کے ساتھ اس طرز تفسیر کا اعتناء کیا ہے اور نہایت سہولت سے اسے اپنایا ہے حتیٰ کہ علماء نے ان کی تفسیر کو "تفسیر القرآن بالقرآن" کا منبع قرار دیا ہے ان کی یہ تفسیر نہایت صحیح اور قابل اعتماد تفاسیر میں شمار ہوتی ہے اور چونکہ سلفؒ کے مسلک کے مطابق لکھی گئی ہے اس لئے راقم کو اس تفسیر سے خصوصی شغف ہے اور تفسیری حواشی "اشرف الفوائد" میں خاص طور پر اس کو اپنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

شیخ الاسلام مولانا امرتسری مرحوم نے بھی "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" کے نام سے عربی زبان میں نہایت اہم تفسیر تالیف کی ہے جو گو مختصر ہے لیکن قابل قدر ہے "تبویب القرآن" وغیرہ بھی اسی قسم میں داخل ہو سکتی ہیں۔

(۲) تفسیر قرآن کے سلسلہ میں سنت نبوی کو دوسرے مرجع کی حیثیت حاصل رہی ہے اور ائمہ نے سنت کو قرآن کے شارح کی حیثیت سے قبول کیا ہے آیت کریمہ (نحل آیت ۴۴) " وانزلنا اليك الذكر لتبين للناس " سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت پر وحی کی تبلیغ کے علاوہ اس کی تبیین بھی لازم تھی علماء نے احادیث کو مدون کر کے اس تبیین (تفسیر نبوی) کو محفوظ کر دیا ہے علمائے بدعت نے اس تفسیر کو رد کر کے گویا ایک طرف تو تفسیر بالرای کا دروازہ کھول دیا ہے اور دوسری طرف سنت کی حجیت کے انکار کی بھی طرح ڈال دی ہے محققین علماء نے ان لوگوں کی تردید کرتے ہوئے سنت کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور قرآن فہمی کے لئے اس کو لازم قرار دیا ہے چنانچہ امام شافعیؒ "الرسالہ" لکھتے ہیں:۔

آنحضرت نے جو فیصلہ بھی صادر فرمایا ہے وہ قرآن ہی سے سمجھ کر صادر فرمایا ہے[2]

امام شافعیؒ اور دوسرے ائمہؒ نے اس سلسلہ میں جو تفصیلات درج کی ہیں یہاں پر ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں بلکہ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ سنت قرآن کی شارح ہے اور قرآن فہمی کے لئے قرآن کے بعد سنت کی طرف رجوع ضروری ہے۔ چنانچہ

---

[1] المذاہب الاسلامیہ فی تفسیر القرآن ص ، [2] الرسالہ رقم ۳۰۲

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں :۔
اگر قرآن کی تفسیر قرآن سے نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کیا جائے کیونکہ سنت قرآن کی شارح ہے[1]۔
خصوصاً قرآن میں جسقدر آیات احکام ہیں ان کی تفسیر و تشریح کے سلسلہ میں تو سنت سے بے اعتنائی ناممکن ہے مثلاً نمازوں کی تعداد ان کا طریق ادا، احکام نکاح و طلاق اور بیوع وغیرہا معاملات وہ ہیں کہ ان کا بیان سنت ہی سے مل سکتا ہے
ابن جریر طبری اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :۔
جہاں تک قرآن میں احکام کا ذکر ہے وہ سنت کی روشنی میں ہی سمجھے جا سکتے ہیں لہٰذا تفسیر قرآن کے لئے سنت کی طرف رجوع ناگریز ہے[2]

ایک اشکال اور اس کا حل یہاں پر ایک بہت بڑا اشکال لازم آتا ہے کہ تفسیری روایات اگر مستند اور قابل اعتنا ہوتیں تو امام احمد بن حنبل جیسے محدث یہ نہ فرماتے[3]:۔

ثلاثۃ لیس لہا اصل التفسیر و الملاحم والمغازی
کہ تین قسم کی کتابیں یا روایات بالکل بے بنیاد ہیں یعنی تفسیر ملاحم اور مغازی۔ مگر خطیب بغدادی فرماتے ہیں کہ اس قول سے امام احمد بن حنبل کے پیش نظر خاص قسم کی روایات یا کتابیں ہیں چنانچہ فرماتے ہیں :۔
اما کتب التفسیر فمن اشہرھا کتابا الکلبی و مقاتل بن سلیمان وقد قال احمدؒ فی تفسیر الکلبی من اولہ الی اخرہ کذب۔
ورنہ تو امام احمدؒ بن حنبل نے تفسیری روایات پر مشتمل ایک صحیفہ کی خود تحسین فرمائی ہے اور اسکے حصول کی ترغیب دی ہے[4]۔

ایک اہم بحث بعض علمائے تفسیر مرفوع تفسیر کو تو حجت مانتے ہیں بشرطیکہ صحت کے ساتھ ثابت ہو مگر ان کا کہنا ہے کہ اس نوع کی تفسیر نہایت قلیل ہے اور اس سلسلہ میں حضرت عائشہؓ کی روایت سے احتجاج کرتے ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں[5] :۔

لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم یفسر شیئاً من القرآن الآیات تعد علمھن ایاہ جبرئیل
اسی طرح امام سیوطیؒ اس موضوع پر بحث کے دوران میں لکھتے ہیں :۔
الذی صح من ذالک قلیل جداً بل اصل المرفوع منہ فی غایۃ القلۃ[6]
یعنی حقیقتاً مرفوع تفسیر تو نہ ہونے کے برابر ہے اس لئے قرآن کی تفسیر میں حدیث کو مستقل رکن کی حیثیت دینا اور ہر آیت کی تفسیر میں احادیث مناسبہ کو پیش کرنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا مگر آیات قرآنیہ اور دلائل سے جو آگے آ رہے ہیں ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے جسطرح صحابہؓ کے سامنے پورے قرآن کی تلاوت فرمائی ہے اسی طرح ان کے سامنے قرآن کے مطالب و معانی بھی بیان کئے ہیں اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ سورہ نحل آیت ۴۴ میں قرآن کی تبیین کو آنحضرتؐ کے فرائض سے قرار دیا ہے امام ابن تیمیہؒ اور ان کے بالتبع دوسرے علماء کا بھی یہی رجحان ہے[7]۔
ابو عبدالرحمٰن السلمی (عبداللہ بن حبیب تابعی ۷۲ھ) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ، عبداللہ بن مسعود اور دیگر صحابہ۔ جو

---

[1] مقدمہ تفسیر ص ۳ [2] ص ۳۳ [3] موضوعات ملا علی قاری ص ۹۵ [4] النفوذ لدہلوی [5] القرطبی ج ۱ ص ۳۱ و طبری ص ۱۳ [6] الاتقان ج ۲ ص ۱۹۱
[7] دیکھئے رسالہ اصول تفسیر لابن تیمیہ

ہمیں قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے ـــــ کا بیان ہے کہ جب ہم آنحضرت سے دس آیات کی تعلیم حاصل کر لیتے تو جب تک ان کے معنی ومفہوم کو پوری طرح ذہن نشین نہ کر لیتے اور پھر عملی طور پر اپنا نہ لیتے ان سے تجاوز نہ کرتے چنانچہ صحابہ کرامؓ کا بیان ہے۔

ہم نے قرآن کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اس پر عمل بھی سیکھا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام ایک ہی سورہ کے حفظ میں سالہا سال لگے رہتے تھے مؤطا میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے[۱]

انه اقام علی حفظ البقرة ثمان سنوات

کہ انہوں نے سورہ بقرہ کے حفظ میں پورے آٹھ برس صرف کر دیئے۔

اور حضرت عمرؓ نے دس برس کی مدت میں یہ سورہ ختم کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ محض قرآن کی قرأت یا تجوید نہ تھی بلکہ اس کے مطالب پر عبور اور عمل بھی اس میں شامل تھا۔

اور اس بات کو ہم عادۃً باور بھی نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص مثلاً حساب کی کوئی کتاب تو پڑھے مگر اس کی تشریح حاصل نہ کرے اور پھر قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کا بغیر معنی سمجھنے کے پڑھنا آج کل کے عجمی مسلمانوں سے تو ہو سکتا ہے مگر صحابہ کرام کے متعلق اس قسم کا تصور بھی بعید ہے خصوصاً جب کہ وہ تعلیم کے ساتھ اس کی عملی تطبیق بھی حاصل کرنے پر حریص بھی تھے۔

جو لوگ مرفوع تفسیر کے نہایت قلیل ہونے کے قائل ہیں ان کا حضرت عائشہؓ کی مذکورہ روایت سے استدلال نہایت ہی مضحکہ خیز ہے اولاً تو حضرت عائشہؓ کی یہ روایت ہی غریب اور منکر ہے اس کی سند میں ایک راوی محمد بن جعفر زبیدی ہے جس پر امام بخاری اور دیگر ائمہ رجال نے جرح کی ہے خود امام طبری ان کے متعلق لکھتے ہیں :۔

انه ممن لا یعرف فی اهل الآثار

اور پھر یہ روایت واقعات کے بھی خلاف ہے اور بشرط صحت اس میں تاویل کی گنجائش ہے یعنی حضرت عائشہ کی مراد قرآن کی تفسیر کا وہ حصہ ہو جس کا تعلق مغیبات سے ہے مثلاً قیامت کے وقت کا علم وغیرہ جس کی تعیین کا اظہار مشیت الٰہی کے خلاف تھا جیسا کہ آنحضرت نے جبریلؑ کے جواب میں "ما المسئول عنها باعلم من السائل" کے جملہ سے اس کی وضاحت فرما دی ہے نیز امام طبریؒ نے ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں[۲]

تفسیر چار قسم پر ہے ایک قسم تو وہ ہے جسے عرب اپنے محاورات کی روشنی میں سمجھ لیتے اس نوع کی تفسیر کے بیان کی ضرورت نہ تھی ...... تیسری قسم تفسیر کی وہ ہے جسے علماء ہی جان سکتے ہیں (جیسے متشابہات) اور چوتھی قسم وہ ہے جو علم الٰہی کے ساتھ خاص ہے اور انسان اس کا ادراک نہیں کر سکتا۔

الغرض قرآن کی تفسیر وتشریح بھی آنحضرت نے فرمائی ہے جو کہ کتب احادیث وسنن میں محفوظ ہے اسی بنا پر علماء نے قرآن و سنت کو لازم ملزوم قرار دیا ہے اور سنت کو بھی وحی کا حصہ قرار دیا ہے امام اوزاعی، حسان بن عطیہ سے بیان کرتے ہیں:۔[۳]
آنحضرت پر قرآن کی وحی نازل ہوتی پھر حضرت جبریل قرآن کی تفسیر کے لئے آنحضرت کی خدمت میں سنت لے کر حاضر ہوتے۔[۴]

---

[۱] ابن کثیر ص ۳ [۲] الموافقات ج ۴ ص ۳۹۲ [۳] ص ۹۴ [۴] مراسیل ابی داؤد، قرطبی ج ۱ ص ۳۸-۳۹

یہی امام اوزاعی مکحول سے روایت کرتے ہیں :-

القرآن احوج الی السنة من السنة الی القرآن۔

کہ قرآن اپنی تشریحات کیلئے جس قدر سنت کا محتاج ہے سنت کے مطالب کی وضاحت کے لئے قرآن کی ضرورت نہیں ہے خود آنحضرتؐ نے "الا انی اوتیت القرآن و مثلہ معہ" فرما کر سنت کے اصل مقام کی وضاحت فرمادی ہے کہ سنت میں مزید احکام بھی ہیں جو قرآن میں بطور نص مذکور نہیں ہیں[1]

۳۔ اقوال صحابہ صحابہ کرامؓ جاہلی عرب اہل کتاب کے عادات و اطوار اور لغت عرب کے اوضاع و اسرار سے بخوبی واقف تھے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جن احوال وظروف میں قرآن نازل ہو رہا تھا وہ انکی نظروں کے سامنے تھے پھر ان کے اذہان بھی صاف ستھرے اور گردو پیش کی آلائشوں سے منزہ تھے ان جملہ وجوہات کی بنا پر حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں :-

صحابہ کرامؓ قرائن و احوال سے آگاہ ہونے کی بنا پر قرآن ہم سے زیادہ سمجھتے تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل و فہم علم صحیح اور عمل صالح سے وافر حصہ عطا فرمایا تھا[2]۔

اس بنا پر علمائے تفسیر نے قرآن و سنت کے بعد اقوال و آثار صحابہؓ کو تیسرے درجہ پر رکھا ہے ان کے اقوال کی بنیاد تین چیزوں پر تھی :-

۱۔ اسباب نزول کی معرفت

۲۔ توراۃ و انجیل (اسرائیلیات)

۳۔ اوضاع لغت کی معرفت۔

اب ہم ان تینوں کی تفسیری حیثیت سے بحث کرتے ہیں تاکہ ان سے استفادہ میں غلو سے کام نہ لیا جائے اور نہ ہی ان پر کلی طور پر اعتماد کر کے قطعیت کا حکم لگایا جائے۔

۱۔ اسباب نزول قرآن پاک تدریجاً بحسب الحوائج نازل ہوا ہے اس کا اکثر حصہ تو وہ ہے جو ابتداءً موعظت و عبرت یا تشریعی احکام کے لئے نازل ہوا ہے اور دوسرا حصہ وہ ہے جو کسی حادثہ یا سوال کے جواب میں اترا ہے علماء نے ان حوادث یا سوالات کو "اسباب نزول" سے تعبیر کیا ہے[3]۔

اسباب نزول کی معرفت سے چونکہ آیت کا پس منظر سمجھ آتا ہے اس لئے علم تفسیر میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے اور علماء نے علوم تفسیر پر جو کتابیں تالیف کی ہیں ان میں اسباب نزول کے عنوان کو مستقل جگہ دی ہے بلکہ اس موضوع پر مستقل کتابیں بھی تالیف کی ہیں علامہ سیوطی لکھتے ہیں :-

افردہ بالتصنیف جماعة اقدمهم علی بن المدینی شیخ البخاری

کہ علماء کی ایک جماعت نے اس پر مستقل تالیفات لکھی ہیں اور اس باب میں سب سے پہلی تالیف علی بن المدینیؒ کی ہے جو امام بخاریؒ کے شیخ ہیں[4]

---

[1] قرطبی ص ۳۹ [2] دیکھئے رسالہ امام شافعیؒ [3] مقدمہ التفسیر ص ۳۰ [4] الاتقان ج ۱ ص ۲۹ [5] ص ۲۰۸ و الفنا کشف الظنون حاجی خلیفہ

(فائدہ) امام سیوطیؒ نے بعض دوسری تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے علامہ واحدی (ابوالحسین علی بن احمد ۴۶۸ھ) کی تالیف کو مشہور ترین تالیف قرار دیا ہے مگر ساتھ ہی "منفیہ اعواز" لکھ کر طنز بھی کر دی ہے اور حافظ ابن حجر (۸۵۲ھ) کی اسباب نزول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "مات عنہ مسودۃ فلم نقف علیہ کاملاً" صاحب کشف نے اس باب میں ابن الجوزی محمد بن اسعد العراقی اور شیخ ابوجعفر بازندرانی کی کتابوں کا بھی تذکرہ کیا ہے امام سیوطیؒ خود اپنی کتاب کے متعلق لکھتے ہیں۔

"وألفت فیه کتاباً حافلاً موجزاً محرراً لم یؤلف مثله فی ھذا النوع سمیته "لباب النقول فی اسباب النزول"

بہرحال "سبب النزول" کی اہمیت کے پیش نظر علماء نے اس کو مستقل فن کی حیثیت دی ہے اور اس پر کتابیں تالیف کی ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے رسالہ "الفوز الکبیر" میں اس کی معرفت کو "مواضع صعبۃ" سے شمار کیا ہے اور اس فن کے مباحث کو منقح کرنے کی کوشش کی ہے[۱] لہذا جن علماء نے اس فن کو تاریخی حیثیت دیکر اس کے "لاطائل" ہونے کا گمان کیا ہے ان کا یہ موقف سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے کذا قال السیوطی فی اتقانہ[۲]

دو گروہ | بعض علماء نے اس فن کی معرفت کو تفسیر قرآن کا موقوف علیہ قرار دیا ہے چنانچہ علامہ واحدی اپنے "اسباب" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

لا یمکن معرفۃ تفسیر الآیۃ دون الوقوف علی قصتھا و بیان نزولھا[۳]

اسی طرح امام سیوطیؒ بھی اپنے "لباب" میں اس فن کی معرفت کے بغیر تفسیر پر اقدام کو حرام قرار دیتے ہیں مگر امام ابن دقیق العید ابوالفتح قشیریؒ نے اس فن کی معرفت کو فی الجملہ معاون تسلیم ہے نہ یہ کہ اس کے بغیر تفسیر ہی ممکن نہیں حافظ ابن تیمیہؒ بھی اسی طرف مائل نظر آتے ہیں چنانچہ اپنے مقدمہ تفسیر میں لکھتے ہیں:

معرفۃ سبب النزول تعین علی فھم الآیۃ فان العلم بالسبب یورث العلم بالمسبب[۴]

اصل میں صحابہؓ یا تابعینؒ کرام نے جو اسباب نزول بیان فرمائے ہیں وہ دو قسم پر ہیں، اسباب نزول کی ایک قسم تو وہ ہے جس کی طرف آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے مثلاً مغازی یا دوسرے واقعات کہ جب تک تفصیلی واقعات سامنے نہ ہوں متعلقہ آیات میں جو جزئیات مختصراً مذکور ہیں صحیح طور پر ذہن نشین نہیں ہوتیں اس قسم کے اسباب نزول کے متعلق واقعی کہا جا سکتا ہے کہ ایک مفسر قرآن کو ان کا جاننا لازم ہے جیسا کہ علامہ واحدی نے تصریح کی ہے لیکن دوسری قسم اسباب نزول کی وہ ہے جسے صحابہؓ یا تابعین کسی آیت کے تحت نزلت فی کذا یا انزل اللہ قولہ کذا کے الفاظ سے ذکر کر دیتے ہیں اس قسم کے واقعات کسی مناسبت سے محولہ آیات کے تحت ذکر کر دیئے جاتے ہیں۔ ورنہ آیت کے مفہوم کی وضاحت کے سلسلہ میں اس واقعہ کے بیان کی ضرورت نہیں ہوتی چنانچہ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

وقد ذکر القدماء المفسرون تلک الحادثۃ بقصد الاحاطۃ بالآثار المناسبۃ للآیۃ او بقصد بیان ما صدقت علیه العموم ولیس ھذا القسم من الضروریات ...... وکان غرضھم تصویر ما صدقت علیه الآیۃ الخ[۵]

پہلی قسم کے اسباب نزول میں چونکہ ان کے اجتہاد کو دخل نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کی بنیاد روایت و سماع پر ہوتی تھی اس بنا پر

لہ حاجی خلیفہ ۲/۶۰ سے ۲ بحر ص ۱۰ ـ ۲۵ سلفیہ لاہور ۳ الاتقان ص ۲۸/۱ ۲۲ ص ۳ ۴ الاتقان سیوطی ۱/۳۱ والبرہان للزرکشی ۱/۲۲ ۵ الفوز ص ۴۴

علماء نے بلا اختلاف اس کو حدیث مسند کا درجہ دیا ہے حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں :-

واذا ذکر سببًا نزلت عقبہ فانہم کلہم یدخلون مثل ھذا فی المسند لان مثل ذالک لایقال بالرای[1]

اور دوسری قسم یعنی جب کوئی صحابی نزلت فی کذا کے الفاظ استعمال کرے اس میں اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی قسم اول کی طرح مسند حدیث کے حکم میں ہے یا اس کی بنیاد صحابی کے اجتہاد و رای پر ہے امام حاکم اپنے علوم الحدیث میں لکھتے ہیں :۔

اذا اخبر الصحابی الذی شھد الوحی والتنزیل عن آیۃ من القرآن " انہا نزلت فی کذا " فانہ حدیث مسند ومشی علی ھذا ابن الصلاح وغیرہ[2]

یعنی جب کسی آیت کے متعلق صحابی جس نے وحی و تنزیل کا مشاہدہ کیا ہو یہ بیان کرے کہ یہ آیت فلاں حادثہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو ابن الصلاح وغیرہ محدثین کے نزدیک مسند حدیث شمار ہو گی حافظ ابن تیمیہؒ اس میں تفصیل و توزیع کے قائل ہیں یعنی اگر ان الفاظ سے سبب النزول مراد ہے تو تمام کے نزدیک حدیث مسند میں داخل ہے کما مرّ اور اگر اس سے صحابی کا مقصد یہ ہے کہ یہ واقعہ بھی اس آیت کے حکم میں داخل ہے گو اس کا سبب نزول نہیں ہے تو اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا یہ بھی مسند حدیث کے حکم میں ہو گا یا نہیں امام بخاریؒ تو اسے اس صحابی کی مسند میں داخل مانتے ہیں مگر امام احمد بن حنبل وغیرہ نے اس کو مسانید میں شامل نہیں کیا اکثر علماء حدیث و تفسیر کا میلان امام احمد بن حنبل کے قول کی طرف ہے۔ چنانچہ علامہ زرکشی لکھتے ہیں[3] :۔

قد عرف من عادۃ الصحابۃ والتابعین ان احدھم اذا قال نزلت ھذہ الآیۃ فی کذا فانہ یرید بذالک انہا تتضمن ھذا الحکم لان ھذا کان السبب فی نزولہا فھو من جنس الاستدلال علی الحکم بالآیۃ لا من جنس النقل لما وقع۔

الغرض اسباب نزول کے بیان میں صحابہؓ کے اقوال مبنی بر اجتہاد بھی ہوتے اور بعض اوقات تو خود صحابیؓ کو بھی اپنے بیان پر یقین نہ ہوتا اور وہ " احسب ھذہ الآیۃ نزلت فی کذا " کے الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ لہٰذا اسباب نزول کے بیان کرنے میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے اور یہ علم صحابہؓ سے سماع و روایت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا چنانچہ علامہ واحدی لکھتے ہیں[4] :۔

لا یحل القول فی اسباب نزول الکتاب الا بالروایۃ والسماع ممن شاھدوا التنزیل ووقفوا علی الاسباب وبحثوا عن علمہا

سلف تو اسباب نزول کے سلسلہ میں روایت قبول کرنے میں تشدد سے کام لیتے اور جب تک صحت سند کے ساتھ اس کا صحابی سے مروی ہونا ثابت نہ ہو جاتا وہ اسے قابل التفات نہ سمجھتے ابن سیرین بیان کرتے ہیں کہ میں نے عبیدہؓ سے ایک آیت کے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فرمایا[5]

اتق اللہ وقل سدادا ذھب الذین یعلمون فیما انزل القرآن

لیکن ان کے بعد علماء نے تشدد کو ترک کر کے تساہل سے کام لینا شروع کر دیا حتی کہ اس سلسلہ میں کذب بیانی کی بھی کچھ پروا نہ کی گئی علامہ واحدی اسی قسم کے علماء پر اظہار تاسف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

۱؎ منہج الفرقان ص ۲۹ ۲؎ ج ا ص ۳۱ - ۳۲ ، الاتقان ۱/۳۱ ۳؎ الاتقان ۱/۳۱ ۴؎ الاتقان ۱/۳۱ ۵؎ الاتقان ۱/۳۱

واما الیوم فکل احد یخترع شیئاً ویختلق افکاً وکذباً ملقیاً زمامہالی الجہالۃ غیر منکر فی انّ وعید للجاھل بسبب الآیۃ۔

جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ متاخرین نے ہر آیت کے تحت شان نزول بیان کرنے کی کوشش کی اور رطب ویابس سے تفاسیر کو بھر دیا مبالغہ آمیزی اور کذب بیانی کے علاوہ بہت سی تاریخی لغزشوں کا بھی ارتکاب کیا اور امام طبری جیسے مؤرخ بھی ان غلطیوں سے محفوظ نہ رہ سکے۔

لہٰذا اسباب نزول کی روایات پر نقد و نظر کی ضرورت ہے اور جب تک کسی حادثہ کا صحت اسناد سے سبب ہونا ثابت نہ ہو جائے اسے قبول نہ کیا جائے اور پھر آیت کے مفہوم کو سبب نزول کے ساتھ مختص نہ کیا جائے بلکہ آیت کے معنی و مفہوم کو عموم پر رکھا جائے علامہ سیوطی لکھتے ہیں[1]:۔

> اصح یہ ہے کہ نظم قرآن کو عموم پر محمول کیا جائے اور اسباب خاصہ کا اعتبار نہ کیا جائے ... کیونکہ صحابہ کرام پیش آمدہ وقائع کی توضیح میں آیات کے عموم سے استدلال کرتے رہے ہونگے ان کے اسباب نزول خاص تھے۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسباب نزول دو قسم پر ہیں بعض اسباب تو وہ ہیں جن سے آیت کے پس منظر پر روشنی پڑتی ہے اور جب تک اس واقعہ کو بیان نہ کیا جائے پورے طور آیت کا مفہوم ذہن نشین نہیں ہوتا لیکن اکثر واقعات وہ ہیں جو اسباب نزول کے طور پر علمائے تفسیر نے ذکر کر دیئے ہیں مگر نہ وہ درحقیقت اسباب نزول ہیں اور نہ ہی ان سے صرف نظر کرنے پر آیت کا مفہوم متعین کرنے میں کوئی صعوبت پیش آتی ہے جیسا کہ شاہ صاحب نے الفوز میں تصریح کی ہے۔

روایات اہل کتاب یا اسرائیلیات

قرآن نے بعض مسائل اور واقعات کے بیان میں توراہ سے موافقت کی ہے اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کی ولادت اور ان کے معجزات کے بیان میں انجیل کی تصدیق کی ہے تاہم ان واقعات کے بیان میں کتب سابقہ کے نہج اور اسلوب بیان سے گریز کیا ہے اور قصص کی غیر ضروری جزئیات ترک کر کے صرف ان حصوں کو موضوع بحث بنایا ہے جن کا تعلق عبرت و موعظت سے تھا۔

اس بنا پر بعض مفسرین صحابہ نے ان قصص کی جزئیات معلوم کرنے کے سلسلہ میں مسلمان اہل کتاب علماء کی طرف رجوع کیا اور ان سے روایت بھی لی تاہم نقل و روایت میں حد اعتدال سے تجاوز نہیں کیا اور حدیث "حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج" کے تحت جواز کی حد تک ان سے استفادہ کیا اور وہ بھی صرف ان روایات میں جو قرآن و حدیث اور اسلامی عقائد سے متصادم نہ ہوں[2]۔

جن صحابہؓ نے اہل کتاب سے روایت نقل کی ہے ان میں سے حضرت ابو ہریرہؓ، ابن عباسؓ اور عبداللہؓ بن عمرو بن العاص خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان کی مرویات سے ہمارے دعویٰ کی بخوبی تصدیق ہوتی ہے جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں[3]۔

اسرائیلی روایات اور تابعین

البتہ صحابہؓ کے بعد تابعینؒ نے اہل کتاب سے اخذ روایت میں توسع سے کام لیا چنانچہ تفسیری روایات میں اسرائیلیات کی کثرت اسی دور کی پیداوار ہے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس دور

---

[1] الاتقان ار ا ۳ ص [2] مقدمہ اصول تفسیر ابن تیمیہ ص [3] تفصیل کے لئے دیکھئے ہمارا مقالہ "عدالت صحابہ"

میں یہود ونصاریٰ میں سے بہت سے لوگ مسلمان ہوگئے تھے اور لوگ قصے کہانیاں سننے کے لئے ان کے گرد جمع ہوجاتے تھے اس دور میں مفسرین کی ایک جماعت پیدا ہوگئی جنہوں نے روایت میں احتیاط سے کام نہ لیا اور رطب ویابس کے بیان کو اپنا مشغلہ بنالیا ان میں سے مقاتلؒ بن سلیمان (المتوفی ۱۵۰ھ) اور وہب بن منبہ رؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔[1]

تابعین کے بعد تو اس شغف علمی نے خاصی ترقی کر لی اور ہر قسم کے خرافات کو تفسیر کے سلسلہ میں روایت کیا جانے لگا۔ حتیٰ کہ دور تدوین میں بعض مفسرین نے ان خرافات سے اپنی تفاسیر کو مزین کرنے کی کوشش کی۔

ایک مفسر کا فریضہ

اہل کتاب سے اس کثرت کے ساتھ نقل وروایت دراصل دین میں ایک سازش کی حیثیت رکھتی ہے چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی الفوز میں لکھتے ہیں:۔

ان النقل عن بنی اسرائیل دسیسۃ دخلت فی دیننا[2]

لہٰذا ایک مفسر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس قسم کی روایات کے نقل میں نہایت مستعدی اور بیدار مغزی کا ثبوت دے اور غور وفکر سے ایسے نتائج اخذ کرے جو قرآن کی روح سے ہم آہنگ ہوں اور نقل وروایت میں صرف انہی حصوں پر اکتفا کرے جو قرآن کے مجمل مقامات کو سمجھنے میں ممد ہوں اور پھر سنت سے بھی ثابت ہوں[3]۔

البتہ جب اس قسم کے خیالات کے بیان میں متقدمین کا اختلاف ہو تو گو ایک شخص مؤلف کی حیثیت سے ان سب کو نقل کرکے ان میں سے صحیح بات کی نشان دہی کر سکتا ہے تاہم بہتر یہ ہے ایسے موقع پر اسرائیلیات کو کلیۃً ترک کرکے قرآن پر تدبر میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کرے جیسا کہ قرآن نے بعض مقامات پر اس اصول کی طرف رہنمائی کی ہے[4]۔ شاہ ولی اللہ الدہلوی فرماتے ہیں کہ اس مقام پر ایک نہایت باریک نکتہ ہے جو طالب علم کے لئے رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ یہ ہے

انہا قد تذکر فی القرآن قصۃ فی موضع الاجمال وفی موضع بالتفصیل .... فیمکن ان یعلم من التفصیل تفسیر الاجمال وینتقل من التفصیل الی الاجمال واللہ اعلم۔[5]

خلاصہ بحث

صحابہؓ نے اسرائیلی روایات سے بے شک استفادہ کیا ہے اور ضرورت کی حد تک ان کی روایت کو بھی جائز سمجھا ہے تاہم ان میں حزم واحتیاط کو ملحوظ رکھا ہے اور ان کا بیان محض ایک تفتیش علمی کی حیثیت رکھتا ہے جسے وضاحت کے سلسلے میں قبول تو کیا جا سکتا ہے مگر میزان صحت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

لغت ومحاورات

اگر کسی آیت کے مفہوم پر کتاب وسنت اور اقوال صحابہؓ سے روشنی نہ پڑتی ہو تو پھر لغت ومحاورات عرب کی طرف رجوع ہوگا کیونکہ قرآن فہمی کے سلسلہ صحابہؓ اس سے استفادہ کرتے رہے ہیں حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں:۔

الشعر دیوان العرب فاذا تعاجم علینا شیئٌ من القرآن رجعنا الیہ[6]

مگر لغت ومحاورات عرب سے قرآن فہمی ہر ایک کا کام نہیں بلکہ اس کے لئے عربی زبان کا خصوصی ذوق اور اہلیت شرط ہے کیونکہ

۱؎ دیکھئے روح المعانی ج ۱۵ ص ۹۳ ۲؎ الفوز الکبیر ص ۴۵-۴۶ ۳؎ دیکھئے مقدمہ اصول التفسیر لابن تیمیہ ص ۲۰

۴؎ تفسیر طبری ج ۱۷ ص ۲۹ مذاہب التفسیر الاسلامی ۸۹-۹۰ ۵؎ الفوز الکبیر ص ۴۶

معاجم و قوامیس میں علمائے لغت نے جن اقوال کو جمع کیا ہے اس میں احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا بلکہ بلا اسناد جمع کر دیا ہے۔ خصوصاً اشعار و امثال جن کو حضرت ابن عباسؓ دیوان العرب قرار دے رہے ہیں علمائے ادبیات جانتے ہیں کہ ان کی نسبت میں اختلاف و اختلاط کا بے حد دخل ہے اور شاذ و نادر ہی کوئی ایسی روایت ہوگی جس پر اعتماد ہو سکے اور پھر محاورات کے بیان میں بھی ان میں باہم اختلاف ہے اور ان علماء نے تشریحات میں عمومی محاورات کو ملحوظ رکھا ہے خاص طور پر الفاظ قرآن کی تشریحات ان کے پیش نظر نہیں ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ وہ عام محاورہ قرآن کے مفہوم سے بھی ہم آہنگ ہو اور اگر انہوں نے قرآنی الفاظ کو پیش نظر رکھا بھی ہو تو پھر بھی احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ وہ لوگ مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھتے تھے اور ہر ایک مؤلف نے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق محاورات عرب کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور عربی زبان میں یہ لچک بدرجہ اتم پائی جاتی ہے لہٰذا لغت و محاورہ عرب سے استفادہ کے لئے چند امور کی رعایت ضروری ہے:۔

(۱) لغت کا تتبع کرتے وقت الفاظ مفردہ کے ان معانی کو سامنے پیش نظر رکھا جائے جو زمانۂ نزول کے وقت مفہوم ہوتے تھے اور پھر قوانین اعراب و بلاغت سے اس کے ترکیبی معنی پر غور کیا جائے اور سیاق و سباق پر بھی نظر ڈالی جائے اور پھر سیاق کلام سے معنی مقصود کو متعین کرنے کی کوشش کی جائے چنانچہ شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں:۔

انصاف پسند مفسر کا فرض ہے کہ شرح الغریب کی دو مرتبہ جانچ پڑتال کرے اوّلاً موارد استعمال پر نظر ڈالے اور پھر ترکیب کلام اور سیاق و سباق کے اعتبار سے جو معنی انسب نظر آئے اسے اختیار کرے بایں ہمہ یہ معنی اجتہادی ہوگا جس میں اختلاف کی گنجائش ہے شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

لان الکلمۃ الواحدۃ تجیٔ فی لغۃ العرب لمعان شتّی[1]

(۲) لغت و محاورہ عرب سے جو تفسیر بھی کی جائے اس پر نظر ثانی کی جائے کہ کیا یہ تفسیر آنحضرت کی ہدی و سیرت کے بھی مطابق ہے اور آپ کے اقوال و افعال اور تفسیر صحابہ کے منافی تو نہیں ہے کوئی اور اجتماعی قواعد اور تاریخی حقائق سے کس حد تک مطابقت رکھتی ہے۔

یہ تمام تر غور و فکر اور مساعی اس بنا پر بھی ضروری ہیں کہ کتب لغت بہرحال کتب لغت ہیں ان سے الفاظ کا معنوی حل ہی مل سکتا ہے وہ قرآنی تصورات کی وضاحت سے بہرصورت قاصر ہیں اور جن لوگوں نے محض لغت کے سہارے پر تفسیر کی ہے انہوں نے قرآن کا مفہوم متعین کرنے میں ٹھوکریں کھائی ہیں اس کا پہلا نمونہ ابو عبیدہ کی مجاز القرآن ہے اور پاک و ہند میں جن لوگوں نے تفسیر باللغۃ کی ہے انہوں نے دراصل لغت کا سہارا لے کر مغربی افکار و نظریات کو اپنانے کی کوشش کی ہے جس طرح پہلے ایک دور میں قرآن کو اسرائیلیات کے لئے تختۂ مشق بنانے کی کوشش کی گئی تھی تفسیر القرآن سرسید بسر اللہ القرآن وغیرہ کی اساس بھی اس قسم کے نظریات پر رکھی گئی ہے اور قرآن جو کتاب ہدایت تھی ان مضحکہ خیز تفاسیر نے اس کی آب و تاب کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے اس لئے ہم سمجھتے ہیں مقاصد قرآن کی وضاحت کے لئے سنت نبوی کی طرف رجوع ضروری ہے چنانچہ علامہ طبری لکھتے ہیں:۔

مفردات قرآن کے معانی معلوم کرنے کے لئے تو لغت کی طرف رجوع ہو سکتا ہے مگر کسی آیت کے مفہوم کو متعین کرنے کے لئے بہرحال وحی الٰہی اور سنت کی طرف رجوع سے چارۂ کار نہیں۔

---

[1] مقدمہ طبری

ان تصریحات کی روشنی میں ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ موارد استعمال کے تتبع سے کسی حد تک صرف مفردات کے حل میں مدد ملتی ہے ورنہ یہ ایسا ذریعہ نہیں کہ تفسیر کے دوسرے سرچشموں سے بے نیاز کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جن علماء نے تفاسیر میں لغت و محاورات سے استفادہ کیا ہے اور لغوی تشریحات کے لئے شواہد تک کو چھان مارا ہے وہ بھی اپنی تفاسیر میں سنت اور اقوال صحابہؓ سے بے نیاز نہیں ہو سکے اور باوجود معتزلہ اور عقل پسند ہونے کے حدیث نبوی اور اقوال صحابہؓ کا سہارا ضرور لیتے رہے ہیں الکشاف زمخشری کے مطالعہ سے ہر صاحب علم یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اُس وقت کے اعتزال اور اِس زمانہ کے اعتزال میں نظریاتی اختلاف پایا جاتا ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ ان کے اسلاف تو اعتزال کے ساتھ صفات علم سے بھی متصف تھے اور معتزلہ کا موجودہ گروہ تدلیس و تلبیس میں تو شاطر نظر آتا ہے مگر صفات علم سے عاری ہے۔

بعض علماء نے شرح غریب القرآن کا خصوصی اعتناء بھی کیا ہے مفردات راغب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس لئے اب ہم ان کتابوں کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

غریب القرآن پر جن علماء نے خصوصی توجہ دی ہے ان میں سرفہرست حبر امت حضرت ابن عباسؓ کا نام ذکر کیا جاتا ہے چنانچہ علامہ عطار مقدمہ الصحاح للجوہری میں لکھتے ہیں :۔

وكانوا يستعينون بالشعر وكلام العرب لبيان معاني القرآن .... وكان اول اتجاه للعناية اللغوية هو رغبة دينية محضة ولهذا نسب الى ابن عباس كتاب غريب القرآن[1]

بروکلمن نے "تاریخ ادب العرب" میں اس کے بعض خطی نسخوں کی نشان دہی بھی کی ہے[2]۔ اور التفسير الكبير جو حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے اس میں علی بن ابی طلحہ اور ابن الکلبی کی روایت سے غریب القرآن کی تشریحات منقول ہیں اور علی بن لیث کی روایت سے یہ نسخہ ابو صالح کاتب اللیث مصری کے پاس محفوظ تھا جسے وہ معاویہ بن ابی صالح کے واسطہ سے روایت کرتے تھے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں اسی نسخہ پر اعتماد کیا ہے اور امام احمد بن حنبل نے اس کی تحسین کی ہے[3]۔

ان تفاسیر کی نسبت حضرت ابن عباس کی طرف صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ ضرور ثابت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ غریب القرآن کی تشریح کے سلسلہ میں شعر اور کلام عرب سے استشہاد میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے گو بعض دیگر صحابہؓ سے بھی حضرت ابن عباسؓ کی طرز پر غریب القرآن کی تشریحات منقول ہو[4]

(۲) غریب القرآن کے سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ کے بعد ابان بن تغلب الجریری (۱۴۱ھ) کا نام لیا جاتا ہے جو کہ قاری فقیہ ہونے کے علاوہ لغت میں بھی عظیم پایہ رکھتے تھے اور علی بن علی بن حسین ابو جعفر اور ابو عبد اللہ رحمہم اللہ سے روایت کرتے ہیں استاذ عطار لکھتے ہیں :۔

.... سمع من العرب والف "غريب القرآن" وذكر شواهده من الشعر[5]

---

[1] مقدمہ الصحاح ص ۳۴ [2] ج ۱ ص ۱۲ [3] فتح الباری ج ۸ ص ۳۲۲ الاتقان للسیوطی ج ۲ ص ۱۸۸-۱۸۹ مطبوعہ بمکتبہ شیخ الاسلام عارف حکمت بالمدینۃ المنورہ ۱۲ [4] مقدمہ الصحاح ۴۷ [5] یاقوت ج ۱ ص ۱۰۸ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۰۷ طوسی ج ۲ ص ۴

اور یہ ابان بن تغلب وہ ہیں جن سے امام مسلمؒ اور اصحابؒ سنن اربعہ نے روایت کی ہے یہ گو تشیع میں غالی تھے یعنی حضرت علیؓ کی تفضیل کے قائل تھے تاہم رافضی نہ تھے اور پھر روایت میں ثقہ تھے اس بنا پر محدثین نے ان سے روایت لی ہے[۱]
ان کے بعد بہت سے علماء نے معانی القرآن، مجاز القرآن اور غریب القرآن کے نام سے تفاسیر جمع کیں جن کے نام فہرست ابن الندیم کشف الظنون حاجی خلیفہ اور مفتاح السعادۃ میں مذکور ہیں ان میں حسب ذیل ائمہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں :-

(۱) ابوزکریا یحییٰ بن زیاد الفراء ۲۰۷ھ
(۲) ابوعبیدہ معمر بن المثنیٰ التمیمی ۲۱۰ھ
(۳) ابوعلی محمد بن المستنیر المعروف بہ قطرب ۲۰۶ھ
(۴) ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن یحییٰ الیزیدی ۲۳۶ھ
(۵) ابومحمد عبداللہ بن مسلم الدینوری المعروف بہ ابن قتیبہ ۲۷۶ھ
(۶) ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن السری الزجاج ۳۱۱ھ
(۷) امام راغب اصفہانی ۵۰۲ھ

علاوہ ازیں ابوعبید قاسم بن سلام اور ابن ترکمانی نے غریب القرآن کے نام سے کتابیں لکھی ہیں اور ابوالمعالی احمد بن علی البغدادی المعروف بابن سمین (۵۹۶ھ) کی مفردات القرآن کے متعلق امام سیوطی لکھتے ہیں :-

وھو من احسن الکتب المؤلفۃ فی ھذا الشأن

سجستانی کی غریب القرآن حروف معجم کی ترتیب پر ہے اس لئے اس سے اخذ و تناول میں سہولت پائی جاتی ہے حجم کے اعتبار سے تقریباً راغب کی مفردات کے برابر ہے[۲]

ابوعبیدہ کے حالات میں مذکور ہے کہ انہوں نے مجاز القرآن، معانی القرآن اور غریب القرآن کے نام سے تفاسیر تالیف کیں[۳] ان الفاظ سے بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مستقل تین کتابیں تصنیف کی ہیں مگر بعض علماء کی تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ ایک ہی تالیف کے تین نام ہیں مثلاً زبیدی طبقات النحویین میں لکھتے ہیں[۴]:-

سألت اباحاتم عن غریب القرآن لابی عبیدہ الذی یقال لہ المجاز

اسی طرح ابن خیر الاشبیلی الفہرست میں لکھتے ہیں[۵]:-

واول کتاب جمع فی غریب القرآن و معانیہ کتاب ابی عبیدہ معمر بن المثنی وھو کتاب المجاز۔

علاوہ ازیں مجاز القرآن کے مختلف نسخوں پر نام میں اختلاف ہے جس سے ہماری تائید ہوتی ہے چنانچہ اسماعیل صاحب کے نسخہ میں پہلی جزء پر "کتاب مجاز القرآن" کا عنوان ہے اور اس کے آخر میں کتاب غریب القرآن ہے اور مراد منلا کے نسخہ میں یہ عنوان ہے "کتاب المجاز التفسیر غریب القرآن"

---

[۱] ملخص من المیزان للذہبی ص ۵-۶ [۲] کشف الظنون مع حاشیہ کالم ۱۲۰۷-۱۲۰۸ [۳] الفہرست لابن الندیم ص
[۴] ص ۱۲۵ [۵] ص ۱۳۴

ابوعبیدہ کے معاصرین نے ان پر تنقید بھی کی ہے جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ابوعبیدہ میں شعوبیت کے علاوہ خارجیت بھی تھی اور وہ خالص عربی کلام سے قرآن کی تفسیر کے قائل تھے جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ وہ تفسیر بالرائی کی طرف مائل تھے اور محدثین وفقہاء اس کے خلاف تھے چنانچہ فراء (م ۲۰۷) اور اصمعی نے ابوعبیدہ کی مخالفت کی[1] اور ابوحاتم نے ان کی مجاز القرآن کو تنقید کا نشانہ بنایا اور زجاج، زہری اور نحاس نے بھی یہی موقف اختیار کیا۔

مگر اس مخالفت کے باوجود ان کے بعد جن علماء نے اس موضوع پر قلم اٹھایا وہ ابوعبیدہ سے بے نیاز نہ ہو سکے ابن قتیبہ نے اپنی "المشکل اور الغریب" دونوں کتابوں میں مجاز القرآن پر اعتماد کیا ہے اور امام بخاری نے اپنی صحیح میں مجاز القرآن سے استفادہ کیا ہے[2]۔

امام طبری (م ۳۱۰) نے اپنی تفسیر میں ان پر اعتماد تو کیا ہے مگر دوسرے علماء کے اقوال و آراء نقل کر کے مناقشہ و معارضہ بھی کیا ہے طبری کے علاوہ ابوعبید القاسم، الیزیدی، الزجاج، ابن درید نے "الجمہرہ" اور سجستانی نے غریب القرآن میں ان سے نقل کیا ہے اور متاخرین میں سے حافظ ابن حجر ہیں جنہوں نے فتح الباری میں کتاب المجاز سے استفادہ کیا ہے۔

ابن قتیبہ کی غریب القرآن جو دراصل ان کی کتاب مشکل القرآن کا تتمہ ہے جیسا کہ اس کے مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے اس موضوع پر اہم کتاب ہے مؤلف نے اپنی ان دونوں کتابوں میں اہل بدعت پر تنقید کی ہے اور اہل سنت کے مسلک کو ثابت کیا ہے۔

ابن قتیبہ نے اپنے وقت کے امام ائمہ سے استفادہ کیا ہے حتیٰ کہ آداب میں جاحظ سے ان کی بعض کتابوں کی اجازت بھی حاصل کی بعض مخالفین نے ان پر تشبیہ اور خارجیت کی تہمت لگائی ہے مگر یہ شدت تعصب کی بنا پر ہے ورنہ تو ابن قتیبہؒ کو اہل سنت میں وہی اہمیت حاصل ہے جو جاحظ کو معتزلہ میں حاصل ہے یعنی جاحظ اگر خطیب معتزلہ ہیں تو ان کے مقابلے میں ابن قتیبہؒ اہل سنت کے خطیب مانے گئے ہیں۔

ان کی مشکل اور غریب کو کتانی نے "القرطین" کے نام سے یکجا کر دیا ہے جو مصر میں طبع ہو کر شائع ہو چکی ہے امیر قنوجی نے الاکسیر میں ابن قتیبہ کو مفسرین کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے۔

امام راغب کی مفردات اس موضوع پر اہم کتاب ہے قبل اس کے کہ ہم اس کے متعلق کچھ عرض کریں یہ واضح کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ امام راغب کے بعد بھی متاخرین نے اس موضوع پر کتابیں تالیف کی ہیں جن میں سے ... تحفۃ الاریب بما فی القرآن من الغریب" لابی حیان نحوی (المتوفی ۷۴۵ھ) تراجم الاعاجم تالیف زین المشائخ محمد بن ابوالقاسم الخوارزمی (م ۵۶۲ھ) اور مفردات القرآن سمین حلبی (م ۷۵۶ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں مگر ان سب کتابوں میں مفردات راغب جو شہرت اور امتیاز حاصل ہے وہ کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں۔

مفردات میں راغب نے تقریباً پندرہ سو نواسی مواد سے بحث کی ہے قرآن کے بعض مواد متروک بھی ہیں تاہم وہ غیر اہم ہیں مؤلف نے اپنی کتاب کو حروف تہجی پر ترتیب دیا ہے اور ہر کلمہ کے حروف اصلیہ میں سے اول حرف کی رعایت

---

[1] تاریخ بغداد ۱۳/ ۲۵۵ [2] مقدمہ مجاز القرآن بحوالہ الزبیدی ج ۱ ص ۱۲۵-۱۲۶

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے ہمارا مقالہ "امام بخاری اور مجاز القرآن"

کی ہے طریق بیان فلسفیانہ ہے یعنی پہلے ہر مادہ کے جوہری معنی متعین کرتے ہیں پھر قرآن میں مختلف آیات پر اس معنی کو منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں تشریح لغت میں یہ طریق اصولی حیثیت رکھتا ہے اصول لغت پر جن علماء نے تالیفات لکھی ہیں انھوں نے اسی طریقہ کو اپنایا ہے تمام متعلقہ آیات کو سامنے رکھ لینے سے اس کلمہ کے صحیح معنی سمجھ میں آجاتے ہیں اور سیاق وسباق پر نظر ڈالنے سے ہر قسم کا اشتباہ دور ہو جاتا ہے۔

پھر مؤلفؒ الفاظ کی تشریح کے سلسلہ میں اشعار و محاورات اور احادیث کو بھی بطور شواہد پیش کرتے ہیں اور بعض علمائے تفسیر ولغت کے اقوال بھی بطور تائید پیش کرتے ہیں اور بعض مقامات پر وضاحت کے لئے اختلاف قراءات کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔

کتاب کی افادیت اور اہمیت کے لئے یہی کافی ہے کہ اصحاب تفسیر کے علاوہ حافظ ابن حجر اور علامہ عینی جیسے شارحین حدیث بھی امام راغب سے استفادہ کرتے ہیں حضرت الامیر القنوجی ان کی مفردات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ا۔

ومن احسنها المفردات للراغب . . . . . وہ ہیں باب اعتماد جمہور مفسرین بر تحقیقات اوست

اس کتاب کا پورا نام "المفردات فی تحقیق مواد لغات العرب المتعلقہ بالقرآن" ہے مطبوعہ نسخوں پر "المفردات فی غریب القرآن" کا عنوان مرقوم ہے ہم اس کے اردو ترجمہ کو "مفردات القرآن" کے نام سے پیش کر رہے ہے عربی ایڈیشن کے چار نسخے مطبوعہ ایران ومصر راقم کی نظر سے گذر چکے ہیں طبع کراچی میں بھی مصری نسخہ پر اعتماد کیا گیا ہے مگر افسوس ہے کہ اتنی بڑی اہم کتاب کا اب تک محقق ایڈیشن شائع نہیں ہوا ہم یہ ہ ہمزا ایڈیشن پوری تحقیق سے شائع کر رہے ہیں اور اس کے ترجمہ و تحقیق میں مندرجہ ذیل کو ملحوظ رکھا ہے :۔

(۱) بعض اہل علم احباب کے مشورہ کے مطابق عموماً لفظی یا حرفی ترجمہ کو ملحوظ رکھا گیا ہے تاہم اس میں حتی الوسع سلاست پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲) ہر آیت کے تحت آیت اور سورۃ کا نمبر دے دیا ہے تاکہ سہولت سے مراجعت ہو سکے مثلاً (۲-۲۸) سے ہماری مراد سورہ نمبر ۲ اور آیت نمبر ۲۸ ہے۔

(۳) آیات کا ترجمہ عموماً مولانا فتح محمدؐ صاحب جالندھری کا ہے لیکن بعض مقامات پر مؤلف کا مقصود ترجمہ ہی لکھ دیا گیا ہے۔

(۴) پوری کوشش کی ہے کہ حاشیہ میں احادیث واشعار کی مکمل تخریج آجائے۔

(۵) کتاب کے متن کی تصحیح میں عموماً تاج العروس اور لسان العرب پر اعتماد کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ دیگر مراجع سے بھی بلا واسطہ استفادہ کی کوشش کی ہے۔

(۶) ابتداء میں یہ خیال تھا کہ متروکہ مواد کو آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا جائے مگر عدیم الفرصتی اس میں حائل رہی اور ہم اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مندرجہ بالا امور کی رعایت سے اس اردو ایڈیشن میں وہ خوبیاں پیدا ہو گئیں ہیں جو عربی ایڈیشن میں نہیں ہیں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس محنت کو قبول فرمائے اور اس کے بعد "مفردات الحدیث" کی اشاعت کی توفیق عطا فرمائے۔

اِمَامْ رَاغِبْ اَصْفَہَانِیْ

امام راغب پانچویں اور چھٹی صدی کے علماء سے شمار ہوتے ہیں ان کا پورا نام حسین بن محمد بن مفضل بن محمد ہے اور راغب اصفہانی کے نام سے مشہور ہیں صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں۔

توفی سنۃ خمس مائۃ ونیف

یعنی سنہ ۵۰۰ھ کے بعد فوت ہوئے ہیں مگر امام سیوطیؒ "بغیۃ الوعاۃ" میں لکھتے ہیں:۔

کان فی اوائل المائۃ الخامسۃ

اور امام سیوطی اور ان کے بالتبع طاش کبریٰ زادہ نے ان کا نام مفضل بن محمدؒ لکھا ہے مگر یہ ان کی فروگذاشت ہے صحیح نام حسین بن محمد ہی ہے اور وفات سنہ ۵۰۲ھ ہے۔

تاریخ اخبار البشر کی غلطی | سید محسن بن الحسینی صاحب "روضات الجنات" کے حوالہ سے اپنی کتاب اعیان الشیعہ میں لکھتے ہیں:۔

صاحب "تاریخ اخبار البشر" نے امام راغب کی وفات سنہ ۵۶۵ھ نقل کی ہے مگر یہ ان کی فاش غلطی ہے کیونکہ اس کے بعد انہوں نے خود ہی یہ تصریح کی ہے کہ امام موصوف علامہ جاراللہ زمخشری سے پہلے فوت ہوئے ہیں حالانکہ علامہ کی وفات بالاتفاق سنہ ۵۳۸ھ ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ امام موصوف کا سنہ وفات سنہ ۵۶۵ھ ہو"

علاوہ ازیں حاجی خلیفہ امام راغب کی کتاب "الذریعہ الی مکارم الشریعہ" کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ان الغزالی کان یستصحب کتاب الذریعہ

کہ امام غزالی مؤلف کی کتاب "الذریعہ" ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے اور امام غزالی کی وفات سنہ ۵۰۵ھ ہے لہٰذا قرین قیاس یہ ہے کہ راغبؒ ان سے پہلے فوت ہوئے ہیں۔

راغبؒ کی شخصیت | مؤلفؒ کی تالیفات خصوصاً مفردات القرآن اور محاضرات الادباء کے مطالعہ سے یہ تأثر پیدا ہوتا ہے کہ مؤلف جامع علوم وفنون ہونے کے ساتھ بلند پایہ صوفی بھی تھے چنانچہ صاحب "روضات الجنات" ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

الراغب الاصفہانی صاحب لغة العرب والحدیث والشعر والحکمة والکلام وعلوم الاوائل وغیر ذالک وفضله اشهر من ان یوصف وکفاه منقبة قبول العامه والخاصة وفیما تحقق له من اللغة خاصة۔

اسی طرح یاقوت معجم الادبار میں لکھتے ہیں:۔

احد اعلام العلم بغیر فن من العلوم ادبها وحکمها له کتاب فی تفسیر القرآن قیل وهو الکبیر۔

یعنی موصوف "کوعلم" تھے اور ادب وفلسفہ بلکہ جملہ علوم میں ان کا پایہ بہت بلند تھا اور انہوں نے قرآن پاک کی ایک بہت بڑی تفسیر بھی لکھی ہے۔

الغرض موصوف علم وفضل میں یگانۂ روزگار تھے اور ان کے فضل ومرتبہ کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ علامہ ذہبی نے ان کا تذکرہ "طبقات المفسرین" میں کیا ہے اور امام سیوطیؒ ان کو لغت ونحو کے ائمہ سے شمار کرتے ہیں علی بن محمد البیہقی نے اپنے "تتمہ صوان الحکمۃ" میں انہیں حکماء کی صف میں کھڑا کر دیا ہے اور یاقوت نے ایک ادیب کی حیثیت سے ان کا تعارف کروایا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوفؒ ہمہ فنی امام تھے اور بیک وقت تفسیر و لغت کے امام ہونے کے ساتھ بہت بڑے حکیم اور صوفی بھی تھے۔

امام راغب اور شیعیت دار الحدیث رحمانیہ دہلی کے زمانہ میں جب راقم الحروف کو ایک سلسلے میں مفردات القرآن کا استیعاب سے مطالعہ کا اتفاق ہوا تو خصوصاً ہوا کہ بعض مقامات پر امام راغب حضرت علیؓ کو بجائے نام امیر المومنین کے لقب سے ذکر کرتے ہیں جس سے ذہن میں تردد پیدا ہوا کہ غالباً مؤلف شیعہ ہوں گے کیونکہ علمائے شیعہ کی یہ عادت ہے کہ وہ علیؓ نام کی بجائے انہیں امیر المومنین لکھتے ہیں مگر یہ خیال کرکے کہ بہت سے علمائے اہل سنت بھی ایسے ہیں جو حضرت علیؓ حسنؓ حسینؓ کے ساتھ علیہ السلام لکھ دیتے ہیں اس لئے ضروری نہیں کہ حضرت علیؓ کے نام کی بجائے امیر المومنین لکھنے والا ضرور شیعہ ہی ہو۔

اب جب کہ مفردات کی اشاعت کے سلسلہ میں مؤلف کے تعارف کے لئے کتب تراجم اور تذکروں کی طرف رجوع کی ضرورت محسوس ہوئی تو معلوم ہوا کہ کسی شخص کے مسلکاً شیعہ ہونے کی علامت ہی یہی ہے کہ وہ حضرت علیؓ کو امیر المومنین کے لقب سے یاد کرے جیسا کہ صاحب "روضات الجنات" نے تصریح کی ہے اور پھر آخر میں لکھا ہے۔[1]

"وَهٰذه آیة الفطن"

کہ یہ اس کے ذہن وفطین ہونے کی علامت ہے اسے ہمیشہ یاد رکھئے صاحب "اعیان الشیعہ" لکھتے ہیں:۔

اکثر علماء نے تصریح کی ہے کہ امام راغب معتزلی تھے اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعہ بھی تھے کیونکہ معتزلہ اور شیعہ عموماً اصول میں متحد ہیں اور اصحاب تراجم معتزلہ اور شیعہ کا تذکرہ ایک ساتھ کرتے ہیں[2]

پھر صاحب روضات لکھتے ہیں:۔

---

[1] ص ۲۴۸ - ۲۵۵ ج [2] ص ۲۴۸

ان کی کتاب "محاضرات الادبا" کے مطالعہ سے گمان ہوتا ہے کہ وہ کٹر سنی تھے
پھر اس پر مفصل تبصرہ کرتے ہیں مگر امام کی علمی زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلکاً سنی شافعیؒ تھے علامہ
سیوطیؒ "بغیۃ الوعاۃ" میں لکھتے ہیں :۔

پہلے پہل میرا گمان یہ تھا کہ امام موصوف معتزلی تھے
مگر جب میں نے "القواعد الصغریٰ" لابن عبد السلام
کی پشت پر زرکشی کے ہاتھ سے یہ لکھا ہوا پایا کہ امام
فخر الدین رازی نے "تاسیس التقدیس" میں تصریح کی
ہے کہ امام راغب ائمہ سنت میں سے تھے اور غزالی
کے ہم پایہ' تو میری یہ بدظنی دور ہو گئی خصوصاً جبکہ
امام رازی جیسی شخصیت ان کی تقدیس کر رہی ہے[1]

ان تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ گو امام موصوف کے متعلق لوگوں نے مختلف آراء کا اظہار کیا ہے مگر سیوطیؒ کی
رائے اور ان کا آخری میلان صحیح معلوم ہوتا ہے کہ امام موصوف علمائے سنت سے تھے۔ صاحب "روضات الجنات" کے
الفاظ سے بھی اس کی تائید ملتی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں :۔

وکان من الشافعیۃ کما استفید لنا من محاضراتہ

تالیفات سید محسن نے "اعیان الشیعۃ" میں اور بروکلمن نے "تاریخ ادب العرب" میں ان کی تالیفات کا ذکر کرتے ہوئے
کل دس کتابوں کا تذکرہ کیا ہے۔ جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) محاضرات الادباء :۔
یہ کتاب دس جلدوں میں ہے اور ۱۹۰۲ء میں ابراہیم بن زیدان کی تصحیح سے قاہرہ سے شائع ہو چکی ہے اب اس کا دوسرا
ایڈیشن بھی آ گیا ہے۔ یہ کتاب عجائب وغرائب سے پر ہے اور نہایت دلچسپ خوانساری نے اسی کتاب کی بنا پر ان کے
سنی ہونے کا اعتراف کیا ہے۔

(۲) جامع التفسیر :۔
یہ قرآن پاک کی بہت بڑی تفسیر ہے جس کی طرف مؤلف نے اپنی کتاب مفردات میں بھی متعدد بار اشارے فرمائے
ہیں۔ بروکلمن لکھتے ہیں کہ "آیا صوفیا" استنبول میں اس کا مخطوطہ محفوظ ہے اور ایک جزء طبع ہو کر شائع بھی ہو چکا ہے
مگر راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔

(۳) حل متشابہات القرآن :۔
نام سے ظاہر ہے کہ مؤلف نے متشابہات پر سیر حاصل بحث کی ہو گی اس موضوع پر شیعہ علماء نے بھی بہت
کچھ لکھا ہے لیکن علمائے سنت نے عموماً اہل بدعت کی تردید کی غرض سے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔

---

[1] جزء ۲، ص ۲۲۱ [2] اعیان الشیعہ

(۴) الذریعہ الی مکارم الشریعہ۔

اخلاق ناصری کی طرز پر فارسی میں ہے اس میں مؤلفؒ نے کلیلہ و دمنہ سے بہت سی حکایات نقل کی ہیں اور عجیب و غریب اشعار نقل کئے ہیں چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

زصد ہزار محمد کہ در جہاں آید
یکے بمنزلہ جاہ مصطفیٰ نشود؛
وگرچہ عرصۂ عالم ہزار علیؓ گردد
یکے بعلم وسخاوت بمرتضیٰ نشود
جہاں گرچہ ز موسیٰ وچوب خالی نیست
یکے کلیم نگردد یکے عصا نشود

(۵) درۃ التاویل فی غرۃ التنزیل:۔

اس کتاب میں مؤلفؒ نے آیات کے تکرار کی حکمت اور تشابہات کے رموز بیان فرمائے ہیں مفردات میں بعض مقامات پر اس کی طرف اشارہ کیا ہے حاجی خلیفہ اس کتاب کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ذکر انہ صنفہ بعد ما عمل کتاب المعانی الاکبر و املی کتاب کتاب احتجاج القراء

(۶) تحقیق البیان فی تاویل القرآن:۔

مصنفؒ نے اپنی کتاب الذریعہ کے دیباچہ میں اس تالیف کا نام لیا ہے حاجی خلیفہ کے اس کتاب کے تحت امام سیوطیؒ کے طبقات النحاۃ کے حوالہ سے لکھتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مفردات القرآن ہی کا دوسرا نام ہے لیکن علماء نے الگ تالیف کے نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۷) افانین البلاغۃ:۔

صاحب کشف الظنون نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔

(۸) کتاب الایمان والکفر:۔

عجیب وغریب طرز پر لکھی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف اصول میں اشعری تھے۔

(۹) تفصیل النشأتین:۔

یہ کتاب پہلے ۱۳۱۹ھ میں بیروت سے شائع ہوئی پھر امرتسر سے اردو ترجمہ کے ساتھ دو کالموں میں اس کا خوبصورت ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔

(۱۰) المفردات فی غریب القرآن۔ جس کا اردو ترجمہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

(۱۱) کتاب المعانی الاکبر۔

(۲۱) کتاب احتجاج القراء ۔

هٰذا آخر ما اردنا والحمد لله رب العٰلمين وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه محمد وآله واصحابه اجمعين۔

محمد عبدہٗ الفلاح

قاسم منزل حاجی آباد لائل پور

۱۰ رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۰ھ

مفردات القرآن (اردو)

تصنیف

امام راغب اصفہانی

ترجمہ و حواشی

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد عبدہ فیروزپوری

جلد اوّل

شیخ شمس الحق

۳۸ بی کشمیر بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَصَلوٰتُهٗ عَلٰى نَبِيِّهٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِهٖ اَجْمَعِيْنَ ٥

امابعد۔ بندۂ ناچیز شیخ ابوالقاسم حسین بن محمد بن المفضل الراغب (خدا اس پر رحم فرمائے) درگاہ ایزدی میں دست بدعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے انوار قدسیہ سے نور ایمان عطا فرمائے جس کے ذریعہ ہم خیر وشر کو ان کی اصلی شکل میں دیکھ سکیں اور حق و باطل میں کما حقہ تمیز کر سکیں حتی کہ اس پسندیدہ گروہ میں شامل ہو جائیں جن کا نور ایمان قیامت کے دن ان کے سامنے اور دائیں طرف سے ضوء افشانی کرتا جاتا ہے اور جن کی تعریف میں قرآن فرماتا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۸﴾ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (۵۸-۲۲)

وہ ذات ہے جس نے مومنین کے دلوں میں طمانیت اور تسلی نازل فرمائی۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان کو راسخ کر دیا اور ان کی روحانی تائید فرمائی ہے۔

قبل ازیں ہم اپنی کتاب "الرسالۃ المنبھۃ علی فوائد القرآن" میں اس امر کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا ہے اور دین اسلام کو تمام ادیان کا ناسخ اور اسے ہر پہلو سے جامع و مکمل بنایا ہے چنانچہ فرمایا۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵-۳)

آج کے دن میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور بحیثیت دین تمہارے لئے اسلام پسند کیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت پر نازل کردہ کتاب یعنی قرآن پاک میں تمام سابقہ کتب سماویہ کے مطالب و مضامین کا نچوڑ اور خلاصہ جمع کر دیا ہے چنانچہ قرآن کی توصیف کرتے ہوئے فرمایا:۔

يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۙ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۔

وہ (نبی کریم) پاکیزہ صحیفوں کی تلاوت کرتا ہے جن میں سیدھے (اور دین کو قائم رکھنے والے) نوشتے ہیں۔

اور اس نے قرآن پاک کو یہ اعجاز بخشا ہے کہ ضخامت و حجم میں مختصر ہوتے ہوئے بھی معنوی عظمت

اور مضامین کی وسعت کے لحاظ وہ اتاہ سمندر ہے کہ انسانی عقل و فراست اِن کے ادراک عاجز ہے اور اس کائنات کے اسباب و وسائل اس کے مضامین کی گہرائیوں تک پہنچنے سے قاصر ہیں چنانچہ اسی حقیقت کی طرح اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :-

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (۳۱/۲۷)

اور زمین کے جتنے بھی درخت ہیں اگر وہ قلم بن جائیں اور موجودہ سمندر سات گنا بڑھ جائیں ان سے سیاہی کا کام لیا جائے تو بھی اللہ کے کلمات ختم ہونے کے نہیں بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے ۔

ہم نے اپنی کتاب " الذریعۃ الی مکارم الشریعۃ " میں اس امر کی وضاحت کی ہے کہ قرآن پاک کے انوار و برکات سے ہر شخص اپنی (علمی و روحانی) استعداد کے مطابق روشنی حاصل کر سکتا ہے۔ اور اس کی تلاوت سے بقدر ظرف مستفید ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ بقول[1] ع

(۱) كَالْبَدْرِ مِنْ حَيْثُ الْتَفَتَّ رَأَيْتَهُ ... يُهْدِي إِلَى عَيْنَيْكَ نُورًا ثَاقِبًا

(۲) كَالشَّمْسِ فِي كَبِدِ السَّمَاءِ وَضَوْءُهَا ... يَغْشَى الْبِلَادَ مَشَارِقًا وَمَغَارِبًا

اس کی مثال ماہ کامل کی ہے جس پہلو سے بھی اس کی جانب دیکھو گے وہ تمہاری آنکھوں کو نور اور بینائی بخشنے گا دیا، سورج کی مانند ہے جو وسط آسمان میں نمودار ہوتا ہے۔ مگر اسکی روشنی مشرق اور مغرب تک پھیلی ہوئی ہو۔ لیکن اس کے محاسن انوار سے صرف اصحاب بصیرت ہی مستنیر ہو سکتے ہیں اور اس کے پاکیزہ معانی اور مطالب سے پاکباز اور برگزیدہ نفوس ہی فیضیاب ہوتے ہیں اور اس کے اکسیری نسخوں سے صرف پاکیزہ طبائع ہی شفایاب ہو سکتی ہیں چنانچہ قرآن نے خود اس کی تشریح کی ہے کہ :-

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ ○ فِي كِتَابٍ مَكْنُونٍ ○ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ (۵۶/۷۷،۷۸،۷۹)

یقیناً یہ ایک باعزت کتاب مکنون میں محفوظ ہے صرف پاکباز اور صالح لوگ ہی اس کے حقائق و معارف تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

نیز اس کے سامعین کی حالت بیان کرتے ہوئے فرمایا :-

قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءٌ وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقْرٌ وَهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى (۴۱/۴۴)

آپ کہدیجئے کہ یہ (قرآن پاک) ایمان والوں کے لئے ہدایت و شفا ہے اور جو اس پر ایمان نہیں لاتے اِن کے کانوں پر گرانبار گزرتا ہے اور اِن پر اس کے معانی مخفی رکھے جاتے ہیں۔

اور اپنے رسالہ میں ہم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ جس طرح خیر و برکت کے فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر اور کتا موجود ہو اسی طرح بصیرت افروز اور اطمینان بخش کیفیت اس دل میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو حرص و آز اور کبر و نخوت سے بھر چکا ہو۔ چنانچہ قرآن نے اس حقیقت

---

[1] قالہ المتنبی فی مدح سیف الدولۃ والبیت فی دیوانہ (۱/۳۰۰) بشرح العکبری و مجموعۃ المعانی و الاتقان للسیوطی ۲/۲۰۶ و بینھما ثالث کالبحر یقذف للقریب جواہرا۔ جوداً و یبعث للبعید سحائبا۔

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا :۔

اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ وَالطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ (۲۴/۲۶) ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے اور (اسی طرح) پاکباز عورتیں پاکباز مردوں کے لئے ہیں اور پاکباز مرد پاکباز عورتوں کے لئے۔

نیز اپنی کتاب میں ہم نے اس زادِ راہ کو حاصل کرنے کے طریقے بھی بتائے ہیں جن کے ذریعہ انسان امکانی حد تک علوم و معارف میں بلند مقام حاصل کر سکتا ہے اور کتاب الٰہی کی مدد سے آسمان و زمین کے رازہائے سربستہ پر آگاہ ہو جاتا ہے اور پھر اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ اپنے کلام کی توصیف میں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (۶/۳۸) کہ ہم نے الکتاب میں کسی چیز کے ذکر کرنے میں کوتاہی نہیں برتی۔ بالکل صحیح ہے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں شامل فرمائے جن کی ہدایت کا اس نے ذمہ لیا ہے اور ان کی رفاقت میں بلند مرتبہ اور عالی مقام پر فائز فرمائے اس لئے کہ جسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نصیب نہ ہو اسے کوئی بھی راہ راست پر نہیں لا سکتا چنانچہ فرمایا :۔

اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ (۲۸/۵۶) آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

ہم نے اس امر کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ علوم قرآن میں سب سے پہلے ان علوم کی ضرورت پیش آتی ہے جن کا تعلق نظم قرآن (الفاظ) سے ہے اور ان میں بھی سب سے پہلے مفرد الفاظ کی تحقیق ضروری ہے لہذا قرآن کے مطالب و معانی کی تحقیق کے لئے مفرداتِ قرآن کے معانی حاصل کرنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ عمارت بنانے کے لئے سب سے پہلے اینٹ (اور مسالہ) کا حصول ضروری ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ مفردات قرآن کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے محض علوم قرآنی کے سمجھنے ہی میں مدد نہیں ملتی بلکہ اس طرح تمام علوم شرعیہ تک رسائی میں مدد ملتی ہے اس لئے کہ قرآن مجید کے مستعمل الفاظ عربی زبان میں استعمال ہونے والے تمام الفاظ کا لب لباب اور مغز ہیں احکام و مسائل اور حکم و مصالح کے استنباط میں فقہاء اور حکماء نے انہی الفاظ کو مبنی قرار دیا ہے اور شعر و سخن کے شہسوار بھی انہی الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔ قرآن کے استعمال کردہ مواد اور ان کے مشتقات کے علاوہ جو الفاظ بھی عربی زبان میں مستعمل ہیں ان کی حیثیت قرآن کے مستعمل الفاظ کے مقابلہ میں وہی ہے جو مغز اور رس کے مقابلہ میں گٹھلی اور چھلکے کو حاصل ہے۔

چنانچہ مفردات قرآن کو حروف ہجا کی ترتیب پر ایک جامع کتاب کی شکل میں تالیف کیلئے میں نے خدا کے حضور استخارہ کیا اس کتاب کی ترتیب میں ہم سب سے پہلے وہ کلمات لکھیں گے جن کے شروع میں الف آتا ہے اور پھر وہ جو حرف باء سے شروع ہوتے ہیں اس طرح پوری کتاب

میں حروف تہجی کی ترتیب ملحوظ رکھی جائے گی اس ترتیب میں ہم زوائد کو نظر انداز کرکے حروف اصلی (مادوں) کو پیش نظر رکھیں گے اسی طرح اس کتاب کی گنجائش کے مطابق ان تعلقات کو بھی زیر بحث لایا جائے جو مستعار الفاظ اور ان کے مشتقات میں پائے جاتے ہیں اور الفاظ کے تعلقات کے متعلق اصول و قواعد اور ان کی تحقیق کو کسی دوسری کتاب میں زیر بحث لائیں گے جو مستقل اسی موضوع پر لکھی جائے گی اور جس کا ہم جا بجا حوالہ بھی دیتے جائیں گے۔

اور اس سلسلہ میں جو کچھ ہم نے تسیر و قلم کیا ہے اس پر کلی اعتماد کر لینے سے تمام وہ دشواریاں دور ہو جاتی ہیں جو مسابقت الی الخیر کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں جس پر اللہ تعالیٰ نے سَابِقُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۵۷/۲۱) (اپنے رب کی بخشش حاصل کرنے کے لئے مسابقت کرو) کے فرمان سے ترغیب دی ہے۔ خدائے عزوجل ہمارے لئے اس راہ پر گامزن ہونا آسان فرمائے۔

انشاء اللہ بشرط زندگی اس کے بعد ایک ایسی جامع کتاب کی پیشکش کا ارادہ رکھتے جس میں الفاظ مترادف کی تحقیق اور ان کے معانی میں جو فرق پایا جاتا ہے اسے بالوضاحت بیان کیا جائے گا۔ جس سے کہ قرآن مجید کے ایک ہی مضمون میں استعمال کردہ مختلف الفاظ۔ مثلاً ایک جگہ قَلْبٌ دوسرے موقع پر فُؤَادٌ اور تیسرے مقام پر صَدْرٌ کا لفظ استعمال کرنے میں کیا مصلحت ہے۔ کی توجیہ معلوم ہو سکے گی اسی طرح وہاں ہم یہ بھی بتائیں گے کہ ایک ہی قصہ کے خاتمہ پر قرآن مجید میں ایک جگہ پر اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۶/۷۹) ارشاد ہے اور دوسرے مقام پر لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳۰/۲۱) اسی طرح تیسرے مقام پر لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۳/۴۴) اور کہیں پر لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ مذکور ہے۔ تو اس میں کونسی لطافت پائی جاتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس قرآن میں لِاُولِى الْاَبْصَارِ، لِذِىْ حِجْرٍ اور لِاُولِى النُّهٰى وغیرہ کلمات جو مختلف مقامات پر استعمال ہوتے ہیں اور انہیں دیکھ کر سطحی اور ظاہر بین حضرات غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ انہیں مترادف الفاظ قرار دیکر بزعم خود سمجھتے ہیں کہ انہوں نے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کی تفسیر "الشکر للہ" یا "لا ریب" کی تفسیر لا شك سے بیان کر کے پس قرآن مجید کی تفسیر کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی توفیق سے ہماری رہنمائی فرمائے اور خلوص ہمارے شامل حال ہے اور جو علم ہمیں بخشتا ہے اس کے ذریعہ ہمیں فائدہ پہنچائے اور اسے ہمارا زاد آخرت بنائے جس کے لئے ہمیں بدیں الفاظ تاکید فرمائی ہے۔ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (۲/۱۹۷) اور زاد راہ تیار کرو اور بہترین زاد راہ تقویٰ ہے۔ وَاللہُ الموافق وَهُوَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حَامِدًا وَّمُصَلِّيًا

كِتَابُ الْهَمْزَةِ

أ

أ: الف با معنی کی تین قسمیں ہیں۔ایک وہ جو شروع کلام میں آتا ہے۔ دوسرا وہ جو وسط کلام میں واقع ہو۔تیسرا وہ جو آخر کلام میں آئے۔

(ا) وہ الف جو شروع کلام میں آتا ہے اس کی چند قسمیں ہیں:-

(۱) الف الاِستِخبار اسے ہمزہ استفہام کہنے کے بجائے الف استخبار کہنا زیادہ صحیح ہوگا کیونکہ اس میں عمومیت ہے جو استفہام و انکار نفی تبکیت زجر و توبیخ تسویہ سب پر حاوی ہے۔چنانچہ معنی استفہام میں فرمایا۔ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (۲-۳۰) (انہوں نے کہا) کیا تو اس میں ایسے شخص کو نائب بنانا چاہتا ہے جو خرابیاں کرے اور کشت و خون کرتا پھرے

اور تبکیت[1] یعنی سرزنش کبھی مخاطب کو ہوتی ہے اور کبھی غیر کو چنانچہ (قسم اول کے متعلق) فرمایا:-

(۱) اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ (۴۶-۲۰) تم اپنی لذتیں حاصل کر چکے۔

(۲) اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (۲-۸۰) کیا تم نے خدا سے اقرار لے رکھا ہے؟

(۳) آٰلْئٰنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ (۱۰-۹۱) کیا اب (ایمان لاتا ہے) حالانکہ تو پہلے نافرمانی کرتا رہا؟

اور غیر مخاطب کے متعلق فرمایا:-

(۴) اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا (۱۰-۲) کیا لوگوں کے لئے تعجب خیز ہے؟

(۵) اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ[2] (۳-۱۴۴) تو کیا اگر یہ مرجائیں یا مارے جائیں؟

(۶) اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ- (۲۱-۳۴)

---

[1] وجوخا فل ظالکان لتوبیخی دالا ابطالی و ہما قسمان متقابلان معنی الاول ان مابعد الہمزۃ ناقع دان فاعلہ ملوم کما یظہر من الاختلہ ۱، ۲، ۳ ومعنی الثانی ان مابعد الہمزۃ لم یقع وان مدعیہ کاذب کما یظہر من ۴، ۵، ۶، ۷۔ [2] انقلبتم علی اعقابکم و بہ یتم المثال ∴ ∴ ∴ ∴

بھلا اگر تم مرگئے تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟
(۲) آٰلذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ (۶-۱۴۴)
بتاؤ تو (خدا نے) دونوں نروں کو حرام کیا ہے۔
یا دونوں مادینوں کو۔
اور معنی تسویہ[1] میں فرمایا، سَوَآءٌ عَلَيْنَا اَجَزِعْنَا اَمْ صَبَرْنَا (۱۴-۲۱) اب ہم گھبرائیں
یا صبر کریں ہمارے حق میں برابر ہے۔
سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (۲-۶) تم خواہ انہیں نصیحت کرو یا
نہ کرو ان کے لئے برابر ہے، وہ ایمان نہیں لانے کے۔
اور یہ الف (استخبار) کلام مثبت پر داخل
ہو تو اسے نفی میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جیسے اَخَرَجَ
(وہ باہر نہیں نکلا) کہ اس میں نفی خروج کے معنی
پائے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر نفی کے معنی نہ
ہوتے تو اس کے اثبات کے متعلق سوال نہ ہوتا۔
اور جب کلام منفی پر داخل ہو تو اسے مثبت بنا دیتا
ہے۔ کیونکہ کلام منفی پر داخل ہونے سے نفی کی نفی
ہوئی۔ اور اس طرح اثبات پیدا ہو جاتا ہے[2]۔
چنانچہ فرمایا:۔
اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (۷-۱۷۲) کیا میں تمہارا پروردگار
نہیں ہوں (یعنی ضرور ہوں)
اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ (۹۵-۸) کیا خدا
سب سے بڑا حاکم نہیں ہے یعنی ضرور ہے۔
اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ (۱۳-۴۱) کیا انہوں
نے نہیں دیکھا کہ ہم زمین کا بندوبست کرتے ہیں۔

اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةٌ (۲۰-۱۳۳) کیا ان کے
پاس کھلی نشانی نہیں آئی۔
اَوَلَا يَرَوْنَ (۹-۱۲۶) اور کیا یہ نہیں دیکھتے
اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ (۳۵-۳۷) اور کیا ہم نے
تم کو اتنی عمر نہیں دی۔
(۲) الف جو مضارع کے صیغہ واحد متکلم
کے شروع میں آتا ہے اور "میں" کے معنی رکھتا ہے
جیسے اَسْمَعُ وَاُبْصِرُ یعنی میں سنتا ہوں اور
میں دیکھتا ہوں
(۳) ہمزۂ فعل امر خواہ قطعی ہو یا وصلی
جیسے فرمایا:۔ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَائِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ
(۵-۱۱۴) ہم پر آسمان سے خوان نازل فرما۔
رَبِّ ابْنِ لِىْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِى الْجَنَّةِ (۶۶-۱۱)
اے میرے پروردگار میرے لئے بہشت میں
اپنے پاس ایک گھر بنا۔
(۴) الف جو لام کے ساتھ معرفہ بنانے کے
لئے آیا ہے جیسے فرمایا اَلْعٰلَمِيْنَ (۱-۱) تمام جہانوں
(۵) الف نداء جیسے اَزَيْدُ (اے زید[3])
(ب) وہ الف جو وسط کلمہ میں آتا ہے اس
کی پہلی قسم الف تثنیہ ہے (مثلاً رَجُلَانِ) اور
دوسری وہ جو بعض اوزان جمع میں پائی جاتی ہے
مثلاً مُسْلِمَاتٌ وَمَسَاكِيْنُ۔
(ج) اب رہا وہ الف جو کلمہ کے آخر میں آتا
ہے۔ وہ یا تو تانیث کے لئے ہوتا ہے جیسے
حُبْلٰى اور بَيْضَاءُ میں آخری الف یا پھر تثنیہ میں

---

[1] ویکن علی ذکر منک ان الھمزۃ التی تدخل علی جملۃ یصح حلول المصدر محلھا یقال لہ ہمزۃ التسویۃ ولا یلزم ان یکون بعد کلمۃ "سواء" کما توہم نحو ما ابالی اقمت ام قعدت اعم لم یرد فی القرآن الا بعد کلمۃ "سواء" رضی علی الکافیۃ ج ۲ ص ۳۷۲ و نحو بعد سواء او جملۃ لا ابالی [2] ولہذا عطف المثبت علی المنفی فی سورۃ الانشراح (۹۴-۲) والضحیٰ (۹۳-۷) والفیل (۱۰۵-۳) والمعانی الہمزۃ غیر الاستفہام راجع المالی الشجریہ (ج ۱ ص ۲۶۸) [3] لیس فی التنزیل نداء بغیر یاء الا ما قال الفراء فی الآیۃ اَمَّنْ ھُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ (۳۹-۹) ان الہمزۃ فیہ للنداء الا ان الجمہور والجوانہ وجوہ النظر المغنی لابن ہشام ج ۱ ص ۵

ضمیر کے لئے جیسا کہ اِذْ هَبَا میں آخر کا الف ہے۔ وہ الف جو آیات قرآنی کے آخر میں کہیں بڑھا دیا جاتا ہے جیسے وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ الظُّنُوْنَا (۳۳-۱۰) فَاَضَلُّوْنَا السَّبِیْلَا (۳۳-۶۷) تو یہ کوئی معنوی اضافہ نہیں کرتا بلکہ محض لفظی اصلاح (اور صوتی ہم آہنگی) کے لئے آخر میں بڑھا دیا جاتا ہے جیسا کہ ابیات کے اواخر میں الف "اشباع" بڑھا دیتے ہیں)

اب ب

اَلْاَبُّ: اس گھاس کو کہتے ہیں جو جانوروں کے چرنے اور کٹنے کے لئے بالکل تیار ہو یہ اَبَّ لِکَذَا اَبًّا وَاَبَابَۃً وَاَبَابًا کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کوئی کام کرنے کے لئے تیار ہو جانا کے ہیں۔ جیسے محاورہ ہے۔

اَبَّ اِلٰی وَطَنِہٖ۔ وطن کا مشتاق ہو کر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اَبَّ لِسَیْفِہٖ تلوار سونتنے کو مستعد ہو جانا اور اسی سے اِبَّانَ ذٰلِکَ کی ترکیب ہے جس میں اِبَّانَ بروزن فِعْلَانَ ہے[1] یعنی وہ زمانہ جو کسی کام کرنے کے لئے بالکل مناسب ہو۔

قرآن میں ہے:-

وَفَاکِھَۃً وَّاَبًّا (۸۰-۳۱) اور میوے اور چارہ۔

اب د

اَلْاَبَدُ۔ ایسے زمانہ دراز کے پھیلاؤ کو کہتے ہیں جس کے لفظ زمان کی طرح ٹکڑے نہ کئے جا سکیں۔ یعنی جس طرح زَمَانُ کَذَا (فلاں زمانہ) کہا جا سکتا ہے اَبَدُ کَذَا نہیں بولتے، اس لحاظ سے اس کا تثنیہ اور جمع نہیں بننا چاہیئے۔ اس لئے کہ اَبَدٌ تو ایک ہی مسلسل جاری رہنے والی مدت کا نام ہے جس کے متوازی اس کی جیسی کسی مدت کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ایسے ملا کر اس کا تثنیہ بنا یا جائے[2] قرآن میں ہے

خَالِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا (۹۸-۱۱) وہ ابد الاباد ان میں رہیں گے۔

لیکن بعض اوقات اسے ایک خاص مدت کے معنی میں لے کر آبَادٌ اس کی جمع بنا لیتے ہیں جیسا کہ اسم جنس کو بعض افراد کے لئے مختص کر کے اس کا تثنیہ اور جمع بنا لیا جاتا ہے بعض علمائے لغت کا خیال ہے کہ آبَادٌ جمع مُوَلَّدٌ ہے۔ خالص عرب کے کلام میں اس کا نشان نہیں ملتا اور اَبَدٌ اٰبِدٌ وَاَبَدٌ اَبِیْدٌ (ہمیشہ ہمیشہ کے لئے) میں دوسرا لفظ محض تاکید کے لئے لایا جاتا ہے تَاَبَّدَ الشَّیْءُ کے اصل معنی تو کسی چیز کے ہمیشہ رہنے کے ہیں مگر کبھی عرصہ دراز تک باقی رہنا مراد ہوتا ہے۔ اَلْاٰبِدَۃُ وحشی گائے والجمع اَوَابِد (وحشی جانور) تَاَبَّدَ الْبَعِیْرُ (وابد) اونٹ بدک کر وحشی جانور کی طرح بھاگ گیا۔ تَاَبَّدَ وَجْہُ فُلَانٍ وَاَبِدَ اس کے چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار نمایاں ہوئے بعض کے نزدیک اس کے معنی غضب ناک ہونا بھی آتے ہیں[3]۔

(اب ق)

اَبَقَ (ض ن) اَبْقًا اَبَاقًا۔ غلام بھاگ

---

[1] وعند البعض وزنہ فَعَّال والنون للعجمیۃ — اللسان والنہایۃ (ابن) [2] وفی حدیث الحج العامنا ہذا ام لابد فقال بل لابد الابد (اللسان وابد) [3] قال فی اللسان وابد علیہ ابدًا غضب وفی تیارح فی الشغیب (ص ۱۱) عبید عبید ابد وبہا وطمدای غضب علیہ فہمای الیبین والتمنہ من الابدال المزدوج وجع الیضا الابدال لابی الطیب ج ۲ ص ۱۰۰ والنوادر لابی مسحل ص ۷۴-۷۵

گیا۔ قرآن میں ہے: اِذْ اَبَقَ اِلَی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (۳۷-۱۴۰) جب بھاگ کر بھری ہوئی کشتی میں پہنچے آبِقٌ (صفت فاعلی) بھاگا ہوا غلام والجمع اُبَّاق۔ تَاَبَّقَ الرجل۔ وہ بھاگے ہوئے غلام کی طرح چھپ گیا اور شاعر کے قول[۱]

۳- قد اُحْكِمَتْ حَكَمَاتِ الْقِدِّ وَالْاَبَقَا

(ان گھوڑوں کے چمڑے کے تسمے اور جوٹ کی کی کنپٹیاں کسی ہوئی ہیں)

میں بعض نے کہا ہے کہ اَبَقٌ کے معنی جوٹ یا اس کی رسی کے ہیں۔

(اب ل)

اَلْاِبِلُ۔ اونٹ کا گلہ۔ اس کا واحد اس مادہ سے نہیں آتا قرآن میں ہے۔ وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ (۶-۱۴۴) اور دو اونٹوں میں سے۔

اور آیت کریمہ: اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (۸۸-۱۷) کیا یہ لوگ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے (عجیب) پیدا کئے گئے ہیں (میں بعض نے کہا ہے کہ اِبِلٌ بمعنی سحاب ہے یہ قول صرف معنی تشبیہ کے اعتبار سے صحیح ہوسکتا ہے کیونکہ کثرت اسفار میں بادل اور اونٹ میں یک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے۔[۲]

اَبَلَ الوحشی ابولا وَاَبِلَ اَبَلًا۔ وحشی جانور کا اونٹ کی طرح پانی سے بے نیاز ہونا۔ تَاَبَّلَ الرجل عن امرءته۔ عورت سے مقاربت ترک کرنا اَبَّلَ الرجل۔ بہت اونٹوں والا فلان لا یأْبل فلاں اونٹ پر جم کر سوار نہیں ہوسکتا۔ رجلٌ اَبِلٌ وَاٰبِلٌ اونٹوں کا اچھی طرح انتظام کرنے والا ابل مؤبّلة اکٹھے کئے ہوئے اونٹ الاِبالۃ۔ لکڑیوں کا گٹھا۔[۳] اور آیت کریمہ۔ وَاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ (۱۰۵-۳) میں اَبَابِيْل کے معنی یہ ہیں کہ ان پر پرندے اونٹوں کی مختلف ٹکڑیوں کی طرح قطار در قطار بھیجے گئے اور ابابیل کا واحد اِبِّيْلٌ ہے۔[۴]

(اب و)

اَلْاَبُ۔ اس کے اصل معنی تو والد کے ہیں (مجازاً) ہر اس شخص کو جو کسی شے کی ایجاد ظہور یا اصلاح کا سبب ہوا سے اَبُوْهُ کہہ دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ:۔ اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ (۳۳-۶) میں آنحضرت کو مومنین کا باپ قرار دیا گیا ہے۔ ایک قرأت میں وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ بھی آیا ہے[۵] نیز مروی ہے کہ آنحضرت نے حضرت علی کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا[۶] (۱) انا وانت ابوا هذه الامة

---

[۱] قاله زهير بن ابی سلمیٰ بن رباح المزنی و صدرہٗ القائد الخیل منکوبا دوابرہا ۔ ۔ ۔ ۔ انظر للبیت دیوانہ ۱۲۰ بشرحہ للاعلم الشنتمری (لیدن) (۱۳۰۶) والمختارات ۹۴ ومختار الشعر الجاہلی ج ۱ ص ۲۷۱ والعقد الثمین ۸۵ والحکم (حکم) والاشتقاق ۲۷ [۲] قال ابو عمرو بن العلا: من جعله السحاب قرء الی الابل (بتشدید اللام) اعراب ثلاثین - ۷ الکشاف ۴: ۲۷ والبحر المحیط ۸: ۴۶۴ واللسان (ابل) [۳] روح المعانی ۳۰: ۱۱۷ وفی غریب القرآن للقتیبی ۴۸۴ اشارۃ الیہ [۴] وفی المثل ضغث علی اِبالۃ ومعناہ البلیۃ علی اخری المیدانی رقم ۲۲۰۲ [۵] وعند الفراء والاخفش لا واحد لہ وعند الکسائی واحدہ ابول مثل عجاجیل وعجول ویمکن ان یکون واحدہ ابالۃ مثل دینار ودنانیر رابع [۶] ذکر المؤلف ہذہ القراءۃ ایضاً فی المحاضرات (۲) ۲۳۴ وہٰذہ قراءۃ ابی فی مصحفہ منقول عن ابی عباس ۔ مجاہد وعکرمۃ ثم نسخ کما یعلم من روایۃ کنز العمال ۴ ۱۸۶ والدر ۵: ۱۸۳ [۷] لم اجدہ فلینظر من اخرجہ ۱۲ ؛

کہ میں اور تم اس امت کے باپ ہیں نیز اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا[۱] (۴)

کل سبب ونسب منقطع یوم القیامۃ الاسببی ونسبی کہ قیامت کے دن میرے تعلق و رشتہ کے سوا تعلقات اور رشتے منقطع ہو جائیں گے۔ اور میزبان کو ابو الاضیاف کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ مہمانوں کی دیکھ بھال کرتا ہے

ابو الحرب۔ لڑائی کا بھڑکانے والا۔ بڑا جنگجو۔ ابو عذرتہا۔ مرد دوشیزگی دبائے زن (مجازا) موجد الابوان۔ یہ لفظ ماں باپ، باپ دادا۔ نیز باپ چچا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ: مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ آبَائِكَ اِبْرَاهِيْمَ وَاِسْمَاعِيْلَ وَاِسْحَاقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (۲-۱۳۳) میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے (تو) انہوں نے کہا آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ اور اسحاقؑ کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے۔

میں حضرت اسماعیل کو یعقوب علیہما السلام کے آباء کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے حالانکہ وہ حضرت یعقوب کے چچا تھے۔ اور کبھی استاد اور معلم پر بھی ابٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ انسان کا روحانی مربی ہوتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اور آیت کریمہ:- وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلٰى اُمَّةٍ (۴۳-۲۲) میں بعض نے کہا ہے[۲] کہ آباء سے مراد وہ علماء ہیں جو ان کی علمی اور روحانی تربیت کرتے تھے۔ کیونکہ دوسری جگہ آیت:- رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (۳۳-۶۷) میں ان آباء کو سادۃ اور کبراء کہا ہے بعض نے کہا ہے کہ آیت: اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (۳۱-۱۴) میں والدین سے باپ اور معلم مراد ہیں اور آیت کریمہ:- مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ (۳۳-۴۰) کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں ــــ میں نفی ابوۃ بلحاظ ولادت کے ہے۔ نیز تنبیہ کی ہے کہ متبنّٰی حقیقی اولاد کا حکم نہیں رکھتا۔

اَبٌ کی جمع آباءٌ ہے کبھی بُعُوْلَةٌ اور خُؤُوْلَةٌ (جمع بعل وخال) کی طرح اس کی جمع اُبُوَّةٌ بھی آجاتی ہے اصل میں ابٌ (اَبَوٌ) بروزن فَعَلٌ ہے اور اور شاعر کے قول[۳] (۱-)

---

[۱] رواہ الدارقطنی عن ابن عباس مرفوعًا فی حدیث طویل وقال فی آخرہ۔ تفرد بہ خارجۃ ولیس بثقۃ قال السیوطی روی الترمذی وابن ماجہ وقال ابن عدی ہو من یکتب حدیثہ اللالی للسیوطی: ۲۶۵ والحدیث فی المجاز لابی عبیدۃ ۲: ۱۷۸ ورواہ الحاکم فی المستدرک (۳: ۱۴۲) من حدیث عمرؓ فی قصۃ نکاح ام کلثوم وقال فی آخرہ فانا احببت ان یکون بینی وبین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سبب ونسب قال الذہبی فی تلخیص المستدرک منقطع وایضًا راجع لتذکرۃ للذہبی: ۷۵ وتتمۃ قد بلغا

[۲] من المجد غایتاہا۔ وفی العینی (شرح شواہد الکبری علی ہوامش الخزانہ ۱: ۱۳۳) انہ لابی النجم ویقال انہ لرؤبۃ ولیس فی دیوانہ وفی النوادر لابی زید الانصاری بروایۃ المفضل الضبی عن ابی الغول لبعض اہل الیمن قال السیوطی فی شرح شواہدہ ۸۴: قیل ان الرجز لرؤبۃ وعزاہ الجوہری لابی النجم وراجع للشطر الاول اللسان (ابا) والخزانۃ البغدادیۃ (۳: ۳۳۷) وابن عقیل (۱: ۱۴) ومعانی القرآن المنسوب الی الزجاج، ۲۴ والمغنی (۱: ۳۱) والشطر الثانی (۱: ۳۷) واسرار الانصاری ۴۶ وعزاہ صاحب التحقیق الی ابی النجم العجلی من بنی بکر بن وائل المتوفی ۱۳۰ھ) وفی البلدان (ابو قبیس) وذکرا لیاقوت بحثا فی اعراب ابی قبیس (جبل فی مکۃ) وقال نسب فیہ لحن الی ابی حنیفۃ والقصۃ ایضًا فی العقد الفرید (۲: ۴۸۲) والعہدۃ علیہ انظر ایضًا دفاع الکھنوی فی التعلیق الممجد (مقدمۃ) وقد قام رضا عن العینی واطال البحث فی شرح شواہدہ (۱: ۱۳۴-۱۳۹)

(۴) "اِنَّ اَبَاهَا وَاَبَا اَبَاهَا"
(اس کا باپ اور دادا)

میں اسے قفًا کا حکم دیا گیا ہے یعنی قفًا کی طرح اسم مقصور سمجھ کر نصبی جری حالت میں الف کو ثابت رکھا گیا ہے) محاورہ ہے۔ اَبَوْتُ الْقَوْمَ (میں قوم کا باپ بن گیا) فلان یَأْبُوْ بَهْمَتَهٗ۔ (وہ اپنے جانوروں کی باپ کی طرح حفاظت کرتا) اور ندا کی حالت میں اَبْ پر تا زیادہ کر کے یا اَبَتِ (اے میرے باپ) کہا جاتا ہے[1]۔ بَاْبَاَ الصَّبِیُّ (حکایت) بچے نے بابا کہا۔

(اب ی)

الْاِبَاءُ۔ کے معنی شدت امتناع یعنی سختی کے ساتھ انکار کرنا ہیں۔ یہ لفظ الامتناع سے خاص ہے لہذا ہر اِبَاء کو امتناع کہہ سکتے ہیں مگر ہر امتناع کو اِبَاءٌ نہیں کہہ سکتے قرآن میں ہے۔ وَیَاْبَی اللّٰهُ اِلَّا اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ (۹-۳۲) اور خدا اپنے نور کو پورا کئے بغیر رہنے کا نہیں۔ وَتَاْبٰی قُلُوْبُهُمْ (۹-۸) لیکن ان کے دل ان باتوں کو قبول نہیں کرتے۔ اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ (۲-۳۴) اس نے سخت سے انکار کیا اور تکبر کیا اِلَّا اِبْلِیْسَ اَبٰی (۱۵-۳۱) مگر ابلیس نے انکار کر دیا۔

ایک روایت میں ہے[2] کُلُّکُمْ فِی الْجَنَّةِ اِلَّا مَنْ اَبٰی (کہ) تم سب جنتی ہو مگر وہ شخص جس نے (اطاعت الٰہی سے) انکار کیا۔

رَجُلٌ اَبِیٌّ[3]۔ خود دار آدمی جو کسی کا ظلم برداشت نہ کرے اَبَیْتَ الضَّیْمَ (مضارع تَاْبٰی) تجھے اللہ تعالیٰ ہر قسم کے ضرر سے محفوظ رکھے۔ تَیْسٌ آبٰی۔ وہ بکرا جو پہاڑی بکروں کا بول ملا ہوا پانی پی کر بیمار ہو جائے اور پانی نہ پی سکے اس کا مؤنث اَبْوَاءُ ہے

(ا ت ی)

اَلْاِتْیَان۔ (مص ض) کے معنی کسی چیز کے بسہولت آنا کے ہیں۔ اسی سے سیلاب کو اَتِیٌّ کہا جاتا ہے[4] اور اسی سے بطور تشبیہ مسافر کو اَتَاوِیٌّ کہہ دیتے ہیں۔

الغرض اِتْیَان کے معنی "آنا" ہیں خواہ کوئی بذاتہ آئے یا اس کا حکم پہنچے یا اس کا نظم و نسق وہاں جاری ہو یہ لفظ خیر و شر اور اعیان و اعراض سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا: اِنْ اَتٰکُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْکُمُ السَّاعَةُ (۶-۴۰) اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آموجود ہو اَتٰی اَمْرُ اللّٰهِ (۱۶-۱) خدا کا حکم (یعنی عذاب گویا) آ ہی پہنچا۔

اور آیت کریمہ فَاَتَی اللّٰهُ بُنْیَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ (۱۶-۲۶) میں اللہ کے آنے سے اس کے حکم کا عملاً نفوذ مراد ہے جس طرح کہ آیت وَجَاءَ رَبُّكَ (۸۹-۲۲) میں ہے اور شاعر نے کہا ہے[5]

(۵) "اتیت المروءة من بابها"
تو جوانمردی میں اس کے دروازہ سے داخل ہوا

---

[1] انظر الایات (۳۷-۱۰۲) (۱۹-۴۲-۴۵) [2] رواه البخاری من حدیث ابی ہریرة ۱۲ [3] قارن النوادر لابی مسحل وفی النہایة (۱: ۱۷) عکسہ الاتی والاتاوی فی الاصل الغریب ویقال للسیل الذی یاتی من بعید اتی واتاوی ومنہ قیل طریق مسلوک میتاء کما فی حدیث اللقطة الفائق (۱-۷) [4] انظر تکملة النوادر لابی مسحل (۶۷) وہو منسوب الی اتی والقیاس اتوی کما فی عدی وعدوی زیدت فیہ الالف للنسبة او لاشباع الفتحة (۱-۱۵) [5] لم اجدہ ولعلہ للاعشی وصدرہ: لکی یعلم الناس انی امرؤ... وفی دیوانہ المخنبل المروءة فلعل احد اللفظین مصحف مکان الآخر ۱۲

اور آیت کریمہ: وَلَا یَأْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلَّا وَھُمْ کُسَالٰی (۹-۵۴) میں یأتون بمعنی یتعاطون ہے یعنی مشغول ہونا اور آیت کریمہ، یَأْتِیْنَ الْفَاحِشَۃَ (۴:۱۵) میں الفاحشۃ (بدکاری) کے متعلق اتیان کا لفظ ایسے ہی استعمال ہوا ہے جس طرح کہ آیت کریمہ: لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا (۱۹-۲۷) فری کے متعلق مجیٔ کا لفظ استعمال ہوا ہے (یعنی دونوں جگہ ارتکاب کے معنی ہیں)

اور آیت (مذکورہ) میں ایک قرارت تَأْتِی الْفَاحِشَۃَ بھی ہے اور یہ اَتَیْتُہٗ وَاَتَوْتُہٗ (دواوی اور یائی) دونوں طرح آتا ہے[1]۔ چنانچہ (دودھ کے) مشکیزہ کو بلونے سے جو اس پر مکھن آجاتا ہے اسے "اَتْوَۃٌ" کہا جاتا ہے لیکن اصل میں اَتْوَۃٌ اس آنے والی چیز کو کہتے ہیں جو کسی دوسری چیز سے حاصل ہو کر آئے لہٰذا یہ مصدر بمعنی فاعل ہے۔

اَرْضٌ کثیرۃ الاتاء۔ زرخیز زمین جس میں بکثرت پیداوار ہو اور آیت کریمہ: اِنَّہٗ کَانَ وَعْدُہٗ مَاْتِیًّا (۱۹-۶۱) بے شک اس کا وعدہ آیا ہوا ہے) میں مَاْتِیًّا (فعل) اتیتہ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے بعض علماء کا خیال ہے کہ یہاں ماتیا بمعنی آتیا ہے (یعنی مفعول بمعنی فاعل) ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ محاورہ میں اتیتُ الاَمْرَ و اَتَانِی الاَمْرُ دونوں طرح بولا جاتا ہے[2] اَتَیْتُہٗ بکذا واتیتہ کذا۔ کے معنی کوئی چیز لانا یا دینا کے ہیں قرآن میں ہے:۔

وَاُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِھًا (۲-۲۵) اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے۔

فَلَنَاْتِیَنَّھُمْ بِجُنُوْدٍ لَا قِبَلَ لَھُمْ بِھَا (۲۷-۳۷) ہم ان پر ایسے لشکر سے حملہ کریں گے جس سے مقابلہ کی ان میں سکت نہیں ہوگی۔ وَآتَیْنٰھُمْ مُلْکًا عَظِیْمًا (۴-۵۴) اور سلطنت عظیم بھی بخشی تھی۔

جن مواضع میں کتاب الہٰی کے متعلق آتَیْنَا (صیغہ معروف متکلم) استعمال ہوا ہے وہ اُوْتُوْا (صیغہ مجہول غائب) سے ابلغ ہے (کیونکہ) اُوْتُوْا کا لفظ کبھی ایسے موقع پر استعمال ہوتا ہے جب دوسری طرف سے قبولیت نہ ہو مگر آتَیْنَا کا صیغہ اس موقع پر استعمال ہوتا ہے جب دوسری طرف سے قبولیت بھی پائی جائے اور آیت کریمہ اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ (۱۸-۹۶) تو تم لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے لاؤ۔ میں ہمزہ نے الف موصولہ (ائْتُوْنِیْ) کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنی جِیْئُوْنِیْ کے ہیں۔

اَلْاِیْتَاءُ (افعال) اس کے معنی اِعْطَاءٌ یعنی دینا اور بخشنا کے ہیں۔ قرآن بالخصوص صدقات کے دینے پر یہ لفظ استعمال ہوا ہے چنانچہ فرمایا:۔ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَآتَوُا الزَّکٰوۃَ (۲-۲۷۷) اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءَ الزَّکٰوۃِ (۲۱-۷۳) اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم بھیجا ولا یحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّا آتَیْتُمُوْھُنَّ (۲-۲۲۹) اور یہ جائز نہیں ہے کہ جو مہر تم ان کو دے چکو اس میں سے کچھ واپس لے لو وَلَمْ یُؤْتَ سَعَۃً مِّنَ الْمَالِ (۲-۲۴۷) اور اسے مال کی فراخی نہیں دی گئی۔

---

[1] الواو لغۃ ھذیل یقال: ما احسن اَتْوَیدی الناقۃ واتی یدیھا قال خالد بن زھیر یا قوم ما بال ابی۔ کنت اذا اتوتہ من غیبۃ انظر الامالی ۲-۵۰۶ و اللسان (اتی)

[2] یعنی یعدی بحرف الجر و بھمزۃ الافعال ۱۲

(ا ث ث)

اَلْاَثَاثُ۔ وافر رخت خانہ اصل میں یہ اَثَّ (ن) سے مشتق ہے جس کے معنی زیادہ اور گنجان ہونا کے ہیں۔ پھر یہ لفظ (اَثَاث) ہر قسم کے فراواں مال پر بولا جانے لگا ہے اور مَتَاعٌ کی طرح اس کا بھی واحد نہیں آتا اس کی جمع اِثَاث (بکسر الہمزہ) ہے۔ نِسَاءٌ اَثَائِثُ۔ پر گوشت عورتیں گویا گوشت ان پر وافر سامان کی طرح چڑھا ہوا ہے تَاَثَّثَ فُلَانٌ۔ فلاں بہت زیادہ مالدار ہوگیا قرآن میں ہے:۔ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْيًا (۱۹-۷۴) وہ سازوسامان میں زیادہ تھے اور خوش منظر بھی وَاَثَاثًا وَّمَتَاعًا (۱۶-۸۰) یعنی سازوسامان۔

(ا ث ر)

اَثَرُ الشَّیْءِ۔ (بقیہ علامت) کسی شی کا حاصل ہونا جو اصل شی کے وجود پر دال ہو اس سے فعل اَثَرَ (ض) و اَثَّرَ (تفعیل) ہے اَثَرٌ کی جمع آثَارٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا (۵۷-۲۷) پھر ہم نے ان کے پیچھے اور پیغمبر بھیجے وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ (۴۰-۲۱) اور زمین میں نشانات بنانے کے لحاظ سے فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ (۳۰-۵۰) تم رحمت الٰہی کے نشانات پر غور کرو اسی سے ان طریق کو آثار کہا جاتا ہے جس سے گذشتہ لوگوں کے اطوار وخصائل) پر استدلال ہوسکے جیسے فرمایا فَهُمْ عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ (۳۷-۷۰) سو وہ انہیں کے نقش قدم پر دوڑتے چلے جاتے ہیں۔ هُمْ اُولَآءِ عَلٰۤى اَثَرِیْ (۲۰-۸۵) وہ میرے طریقہ پر کاربند ہیں۔

اسی سے مشہور محاورہ ہے سَمِنَتِ الْاِبِلُ عَلٰى اَثَارَةٍ اَثَرٍ من شحم فربہ شدند شتراں بر بقیہ پیہ کہ پیش ازیں بود اَثَرْتُ الْبَعِيْرَ۔ میں نے اونٹ کے تلوے پر نشان لگایا تاکہ (گم ہوجانے کی صورت میں) اس کا کھوج لگایا جا سکے۔ اور جس لوہے سے اس قسم کا نشان بنایا جاتا ہے اسے اَلْمِئْثَرَةُ کہتے ہیں۔

اَثَرُ السَّيْفِ۔ تلوار کا جوہر جو اسکی عمدگی کا نشان ہوتا ہے۔ سَيْفٌ مَأْثُوْرٌ۔ جوہر دار تلوار اَثَرْتُ (ن) اَلْعِلْمَ آثَرُوْهُ اَثْرًا وَاِثَارَةً وَّاُثْرَةً۔ کے معنی ہیں علم کو روایت کرنا۔ در اصل اس کے معنی نشانات علم تلاش کرنا ہوتے ہیں۔ اور آیت:۔ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ (۴۶-۴) میں اَثَارَةٍ سے مراد وہ علم ہے جس کے آثار (نا حال) روایت یا تحریر کی وجہ سے باقی ہوں ایک قراءۃ میں اَثْرَةٍ ہے یعنی اپنے مخصوص علم سے اَلْمَآثِرُ انسانی مکارم جو نسلاً بعد نسل روایت ہوتے چلے آتے ہیں۔ اسی سے بطور استعارہ اَثَرٌ بمعنی فضیلت بھی آجاتا ہے۔ اور اَلْاِيْثَارُ (افعال) کے معنی ہیں (ایک چیز کو اس کے افضل ہونے کی وجہ سے دوسری پر) ترجیح دینا اور پسند کرنا اس سے آثَرْتُهٗ ہے

ل۱ انظر ایضًا (۱۸-۶۴) (۲۰-۹۶)

یعنی میں نے اسے پسند کیا۔ قرآن میں ہے:۔ وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ (۵۹-۹) دوسروں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں تَاللّٰہِ لَقَدْ اٰثَرَکَ اللّٰہُ عَلَیْنَا (۱۲-۹۱) بخدا اللہ نے تمہیں ہم پر فضیلت بخشی ہے۔ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا (۸۷-۱۶) مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو۔

(۵) حدیث میں ہے: سَیَکُوْنُ بَعْدِیْ اَثَرَۃٌ[1] (میرے بعد تم میں خود پسندی آجائے گی) یعنی تم میں سے ہر ایک اپنے کو دوسروں سے بہتر خیال کرے گا۔

اَلْاِسْتِئْثَارُ۔ یعنی کسی چیز کو اپنے لئے مخصوص کر لینا اور (محاورہ میں) اِسْتَاْثَرَ اللّٰہُ بِفُلَانٍ فلاں کی موت سے کنایہ ہوتا ہے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شرف بخشی کے لئے اسے چن لیا ہے اور اپنے لئے خاص کر لیا ہے۔

رَجُلٌ اَثِرٌ جو اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دے۔ لحیانی[2] نے حکایت کی ہے خُذْ اٰثِرًا مَّا، وَ اِثْرًا مَّا، وَ اٰثِرَ ذِیْ اَثِیْرٍ یعنی سب سے پہلے یہ کام کرو[3]۔

(ا ث ل)

اَثْلٌ (جھاؤ کا درخت) قرآن میں ہے:۔ ذَوَاتَیْ اُکُلٍ خَمْطٍ وَّ اَثْلٍ وَّ شَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ (۳۴-۱۶) (یعنی دو ایسے باغ دیئے) جن کے میوے بدمزہ اور جھاؤ اور کچھ سبریاں تھیں اَثْل یعنی وہ درخت جس کی جڑ خوب مضبوط ہو اسی سے شَجَرٌ مُّتَاَثِّلٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ درخت جس جڑ اثل کی طرح مضبوط ہو۔ تَاَثَّلَ کَذَا وہ چیز اثل کی طرح مضبوطی سے جم گئی اس نے جڑ پکڑ لی اور آنحضرت کا وَصِیّ کے متعلق "غَیْرَ مُتَاَثِّلٍ مَالًا" (۵) فرمایا ہے[4] (یعنی یتیم کے مال سے بقدر ضرورت لے اور ذخیرہ اندوزی نہ کرے) یہ مال کے اذخار اور اقتنا سے کنایہ ہے اور اسی سے بطور استعارہ نَحَتَ اَثْلَتَہٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی غیبت اور بدگوئی کرنا کے ہیں۔

(ا ث م)

اَلْاِثْمُ وَالْاٰثَامُ۔ وہ (اعمال و افعال) جو ثواب سے روکنے اور پیچھے رکھنے والے ہو اس کی جمع آثام آتی ہے چونکہ اس لفظ میں تاخیر اور بُطُوْء (دیر لگانا) کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لئے

---

[1] قالہ صلی اللہ علیہ وسلم للانصار والحدیث باختلاف الفاظہ وطرقہ فی البخاری ومسلم (۱-۳۴۸) طبع انصاری ولیس فی شیئ من الطرق سیکون فتنبہ لذالک والحدیث فی الکشاف ۲/۲۰۶ وفی الحدیث قصۃ ابی قتادۃ مع معاویۃ راجع الحاکم والبیہقی (تخریج احادیث الکشاف ۲۰۸ رقم ۸۷) والحدیث ایضا فی النہایۃ واللسان (اثر)۔ [2] ابوالحسن علی بن مبارک او ابن خازم للحیانی من بنی لحیان بن ہذیل بن مدرکہ اخذ عن الکسائی وابن زیدۃ ابی عمرو الشیبانی وطبقتہم وعمدتہم الکسائی راجع لترجمتہ بغیۃ الوعاۃ ۳۴۶ والفہرست ۷۲ و ۱۲۰ طبقات زبیدی ۲۱۳ والانباہ ۱: ۱۰۹-۲/۲۵۵ ومعجم الادباء ۱۴/۱۶-۱۰۸۔ [3] راجع للکلمۃ المعاجم [4] راجع للحدیث الکشاف (۱: ۲۴۸) والمصنف لعبدالرزاق والطبری عن الحسن العرنی ومسند احمد وابن ماجہ والنسائی وابوداؤد من روایۃ عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ وابن حبان من روایۃ صالح بن رستم عن جابر والکامل لابن عدی (ترجمہ صالح بن رستم) وابونعیم فی الحلیۃ فی ترجمۃ عمرو بن دینار (وقال تفرد بہ الخزان (صالح بن رستم ابو عامر الخزان) وہو من ثقات البصریین وضعفہ ابن معین (راجع تخریج الکشاف ص ۳۸-۳۹ رقم ۲۲۳) والنہایۃ ۱/۱۹ والفائق ۱/۸ وقالہ صلی اللہ وسلم فی وصی الیتیم وعمر فیمن وقف ارضہ لمن ولیہا ایضا مجمع البحار (اثل)۔

شاعر نے اونٹنی کے متعلق کہا ہے۔[1] (المتقارب)

(۶) جمالیۃ تغتلی بالرادف
اذا کذب الآثمات الھجیرا

وہ اونٹ کی طرح مضبوط ہے جب سست رفتار اونٹنیاں دوپہر کے وقت چلنے سے عاجز ہو جاتی ہیں تو یہ ردیف کو لے کر تیز رفتاری کے ساتھ چلتی ہے اور آیت کریمہ: فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (۲: ۲۱۹) میں خمر اور میسر میں اثم کبیر کے یہ معنی ہیں کہ ان کا تناول (اور ارتکاب) انسان کو ہر قسم کے افعال خیر سے روک لیتا ہے۔

أَثِمَ (س)، إِثْمًا وَأَثَامًا فَهُوَ آثِمٌ وَأَثِمٌ وَأَثِيمٌ (گناہ کا ارتکاب کرنا) اور تَأَثَّمَ (تفعل) کے معنی گناہ سے نکلنا (یعنی رک جانا اور توبہ کرنا) کے ہیں جیسے تَحَوَّبَ کے معنی حوب (گناہ) اور تحرج کے معنی حرج یعنی تنگی سے نکلنا کے آجاتے ہیں۔[2]

اور "الکذب" (جھوٹ) کو اثم کہنا اس وجہ سے ہے کہ یہ بھی ایک قسم کا گناہ ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ انسان کو حیوان کا ایک فرد ہونے کی وجہ سے حیوان کہہ دیا جاتا ہے اور آیت کریمہ: أَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْإِثْمِ (۲-۲۰۶) کے معنی یہ ہیں کہ اس کی عزت نفس (اور ہٹ دھرمی) اسے گناہ پر اکساتی ہے اور آیت: وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا (۲۵-۶۸) میں آثام سے (مجازاً) عذاب مراد ہے اور عذاب کو اثام اس لئے کہا گیا ہے کہ ایسے گناہ (یعنی قتل و زنا) عذاب کا سبب بنتے ہیں جیسا کہ نبات اور شحم (چربی) کو ندیٰ (نمی) کہہ دیا جاتا ہے کیونکہ نمی سے نباتات اور (راس سے) چربی پیدا ہوتی ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے[3] (طویل)

(۷) "تعلی الندی فی متنہ وتحدرا"

اس کی پیٹھ پر تہ برتہ چربی چڑھی ہوئی ہے اور نیچے تک پھیلی ہوئی ہے۔ بعض نے آیت کریمہ: میں يَلْقَ أَثَامًا کے یہ معنی بھی کئے ہیں کہ مذکورہ افعال اسے دوسرے گناہوں پر برانگیختہ کریں گے کیونکہ (عموماً) صغائر گناہ کبائر کے ارتکاب کا موجب بن جاتے ہیں اور آیت کریمہ: فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا (۱۹-۵۹) کی تفسیر بھی ان ہر دو وجہ سے بیان کی گئی ہے۔

الآثم۔ گناہ کا ارتکاب کرنے والا۔ قرآن میں ہے: آثِمٌ قَلْبُهُ (۲-۲۸۳) وہ دل کا گنہگار ہے۔

اور اثم کا لفظ بِرّ (نیکی) کے بالمقابل استعمال

---

[1] قالہ الاعشیٰ فی مدح ناقتہ وقبلہ: بناجیۃ کاتان الثمیل. تقضی السری بعد این عیرا. وفی روایۃ تغتلی بالعین المھملۃ ومعناہ تنھض وتعلیق راجع دیوانہ ۔۷ والاقتضاب ۱۹۹ واللآلی مع السمط (۱/۸۲۱) والجمہرۃ (۲: ۵۷) واللسان (اثم، غلا) والاعشیٰ ھو میمون بن قیس ادرک الاسلام [2] ھہنا سقط وخرم فی النسخ المطبوعۃ ولعل الصواب وتحرج خرج من حرجہ ای ضیقتہ۔ [3] البیت لعمرو بن احمر الباہلی واولہ: کثور العداب الفرد یضربہ الندی ..... وفی روایۃ المعذاب بدل العداب والبیت فی اللسان (ندی) والاقتضاب ۴۴۰ والصاحبی ۹۵ وابن احمر ھو ابوالخطاب عمرو بن احمر الباہلی شاعر فحل مخضرم مشہور بالفصاحۃ والغریب توفی فی خلافۃ عثمان (قبل سنۃ ۳۵ ھ) راجع الشعراء ۳۱۵ والخزانۃ ۳: ۳۸ والبیت ایضاً فی الصحاح والتاج والمحکم (عدب) ۱۲

ہوتا ہے چنانچہ آنحضرت نے فرمایا: (۶)

(۶) اَلْبِرُّ مَا اطمأنت الیہ النفس وَالْاِثْمُ مَا حاک فی صدرک[1] کہ نیکی وہ ہے جس پر طبیعت مطمئن ہو اور گناہ وہ ہے جس کے متعلق دل میں تردد ہو۔ یاد رہے کہ اس حدیث میں آنحضرت نے البر والاثم کی تفسیر نہیں بیان کی ہے بلکہ ان کے احکام بیان فرمائے ہیں۔

اور آیت کریمہ: مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ (۶۸-۱۲) میں اثیم بمعنی آثم ہے اور آیت: یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵-۶۲) (کہ وہ گناہ اور ظلم میں جلدی کر رہے ہیں) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ آثم سے آیت: وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (۵-۴۴) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے (یعنی عدم الحکم بما انزل اللہ کفر) اور عدوان سے آیت کریمہ:۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۵-۴۵) کے مفہوم کی طرف اشارہ (یعنی عدم الحکم بما انزل اللہ ظلم) اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ لفظ اِثم عدوان سے عام ہے۔

(ا ج ج)

اَلْاُجَاجُ۔ کے معنی سخت کھاری اور گرم پانی کے ہیں قرآن میں ہے:۔ ھٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّھٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ (۲۵-۵۳) ایک کا پانی نہایت شیریں اور دوسرے کا سخت گرم ہے۔ یہ (اُجَاج) اجیج النار (شعلہ نار یا اس کی شدید تپش اور حرارت) واَجَّجْتُھَا وَقَدْ اَجَّتْ۔ میں نے آگ بھڑکائی چنانچہ وہ بھڑک اٹھی (وغیرہ محاورات) سے مشتق ہے۔

اِئْتَجَّ النَّھَارُ۔ دن گرم ہوگیا۔ اسی (ا ج ج) سے یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ (۱۸-۹۴)(۲۱-۹۶) ہے ان کے کثرت اضطراب کی وجہ سے مشتعل آگ یا موجزن اور متلاطم پانی کے ساتھ تشبیہ دے کر یاجوج ماجوج کہا گیا ہے۔

اَجَّ الظَّلِیْمُ اَجِیْجًا۔ شتر مرغ نہایت سرعت رفتار سے چلا۔ یہ محاورہ اشتعال نار کے ساتھ تشبیہ دے کر بولا جاتا ہے۔

(ا ج ر)

اَلْاَجْرُ وَالْاُجْرَۃُ کے معنی جزائے عمل کے ہیں خواہ وہ بدلہ دنیوی ہو یا اخروی چنانچہ فرمایا:۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ (۱۱-۲۹) میرا اجر تو خدا کے ذمے ہے۔ وَاٰتَیْنٰہُ اَجْرَہٗ فِی الدُّنْیَا وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ (۲۹-۲۷) اور ان کو دنیا میں بھی ان کا صلہ عنایت کیا اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں سے ہوں گے۔ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَۃِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۱۲-۵۷) اور جو لوگ ایمان لائے ۔۔۔ ان کے لئے آخرت کا اجر بہت بہتر ہے۔

اَلْاُجْرَۃُ (مزدوری) یہ لفظ خاص کر دنیوی بدلہ پر بولا جاتا ہے اَجْرٌ کی جمع اُجُوْرٌ ہے اور آیت کریمہ: وَاٰتُوْھُنَّ اُجُوْرَھُنَّ (۴-۲۵) اور ان کے مہر بھی انہیں ادا کردو میں کنایہ عورتوں

---

(۱) کلمۃ من حدیث وابصۃ الاسدی انظر (حم، طب، فی الدلائل عنہ وحب) ذکرہ فی کنز العمال ۳: ۲۱۸۴، ۲۱۵۸، وبمعناہ روایۃ واصلۃ ۲۱۷۷، ۲۱۸۲ و ذکرہ الغزالی فی الاحیاء فی مواضع ۳/۳۴ بتخریج العراقی

کے نہر کو "اُجُوْر" کہا گیا ہے پھر اَجْرٌ اور اُجْرَۃٌ
کا لفظ ہر اس بدلہ پر بولا جاتا ہے جو کسی عہد و پیمان
یا تقریبًا اسی قسم کے عقد کی وجہ سے دیا جائے۔
اور یہ ہمیشہ نفع مند بدلہ پر بولا جاتا ہے۔ ضرر
رساں اور نقصان دہ بدلہ کو اجر نہیں کہتے جیسے فرمایا۔
لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۲-۲۷۷) ان کو ان
کے کاموں کا صلہ خدا کے ہاں ملے گا۔ فَاَجْرُهٗ عَلَى
اللّٰهِ (۴۲-۴۰) تو اس کا بدلہ خدا کے ذمے ہے
اَلْجَزَاءُ ہر بدلہ کو کہتے ہیں خواہ وہ کسی عہد
کی وجہ سے ہو یا بغیر عہد کے اچھا ہو یا برا دونوں
پر بولا جاتا ہے۔
چنانچہ فرمایا:۔ وَجَزَاهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً
وَّحَرِيْرًا (۷۶-۱۲) اور ان کے صبر کے بدلے
ان کو بہشت کے باغات اور ریشم (کے ملبوسات)
عطا کریں گے۔ فَجَزَاءُهٗ جَهَنَّمُ (۴-۹۳)
اس کی سزا دوزخ ہے۔
محاورہ ہیں ہے اَجَرَ (ن) زَيْدٌ عَمْرًا يَاْجُرُهٗ اَجْرًا
کے معنی ہیں زید نے عمر کو اجرت پر کوئی چیز دی
اور اٰجَرَ عَمْرٌو زَيْدًا کے معنی ہوں گے عمرو
نے زید کو اجرت دی قرآن میں ہے :۔
عَلٰى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ (۲۸-۲۷)
کہ تم اس کے عوض آٹھ برس میری خدمت کرو۔
اور یہی معنی اٰجَرَ (مفاعلہ) کے ہیں لیکن اس
میں معنی مشارکت کا اعتبار ہوتا ہے اور مجرد
(اَجَرَ) میں مشارکت کے معنی ملحوظ نہیں ہوتے
ہاں مال کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں۔ محاورہ ہے
اَجَرَهُ اللّٰهُ وَاٰجَرَهٗ دونوں طرح بولا جاتا ہے
یعنی خدا اسے بدلہ دے۔
اَلْاَجِيْرُ بروزن فَعِيْلٌ بمعنی فاعل یا مفاعل
ہے یعنی معاوضہ یا اجرت کا پر کام کرنے والا۔
اَلْاِسْتِيْجَارُ کے اصل معنی کسی چیز کو اجرت پر طلب
کرنا پھر یہ اجرت پر رکھ لینے کے معنی میں بولا جاتا
ہے جس طرح کہ استجاب (استفعال) بمعنی اجاب
آجاتا ہے چنانچہ آیت کریمہ: اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ
خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ (۲۸-۲۶)
اسے اجرت پر ملازم رکھ لیجئے کیونکہ بہتر ملازم جو
آپ رکھیں وہ ہے جو توانا اور امانت دار ہو
میں (استیجار کا لفظ) ملازم رکھنے کے معنی میں استعمال
ہوا ہے۔

(ا ج ل)

اَلْاَجَلُ کے معنی کسی چیز کی مدت مقررہ
کے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔ وَلِتَبْلُغُوْا اَجَلًا
مُّسَمًّى (۴۰-۶۷) اور تاکہ تم (موت کے) وقت
مقررہ تک پہنچ جاؤ۔
اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ (۲۸-۲۸) ان دو معینہ
مدتوں میں سے جونسی مدت میں پوری کر دوں۔
محاورہ ہے دَيْنُهٗ مُؤَجَّلٌ اس کے قرضہ کی وصول
کرنے کے لئے ایک مدت معین ہے قَدْ اَجَّلْتُهٗ
میں نے اس کے لئے مدت مقرر کر دی اور انسان
کی زندگی کے لئے جو مدت مقرر ہوتی ہے اسے بھی
"اَجَلٌ" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے دَنَا اَجَلُهٗ
یعنی اس کی موت کا وقت قریب آپہنچا۔ اصل
میں اس کے معنی مدت حیاۃ (زندگی) پورا کر
لینا ہیں۔ قرآن میں ہے :۔
وَبَلَغْنَا اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا (۶-۱۲۹)
اور (آخر) ہم اس وقت معین کو پہنچ گئے جو تو
نے ہمارے لئے مقرر کیا تھا۔

یہاں اَجَلٌ سے مراد حدِ موت ہے اور بعض نے بڑھاپے کی انتہا مراد لی ہے۔ درحقیقت ان دونوں کا ایک مفہوم ہے (کیونکہ جب انسان بڑھاپے کی انتہاء کو پہنچ جائے تو موت کے قریب ہو جاتا ہے) اور آیت کریمہ :- ثُمَّ قَضٰى اَجَلًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ (۶-۲) میں اجل اول سے حیات دنیوی اور اجل ثانی سے بقاء اخروی مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اول سے دنیا میں بقا اور ثانی سے (برزخی زندگی مراد ہے جو) موت سے لے کر حشر تک کا زمانہ مراد ہے یہ حسنؒ سے مروی ہے ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ یہ آیت کریمہ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (۳۹-۴۲) میں جو دو موتیں مذکور ہیں ان کی طرف اشارہ ہے یعنی اول اجل سے نیند اور ثانی سے موت مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ دونوں جگہ اَجَلٌ سے مراد موت ہی ہے لیکن بعض کی موت کسی حادثہ مثلاً قتل، آتش زدگی، غرق وغیرہ ناموافق اسباب کی وجہ سے جو اس کی زندگی کے خاتمہ کا باعث بنتے ہیں اور بعض ان حوادث سے محفوظ اور عافیت کی زندگی بسر کرتے ہیں حتی کہ ان کو طبعی موت آجاتی ہے۔ انہی دونوں قسم کی موت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرتؐ نے فرمایا:(۷) مَنْ اَخْطَأَتْهُ سَهْمُ الرَّزِيَّةِ لَمْ تُخْطِئْهُ سَهْمُ الْمَنِيَّةِ اگر کوئی مصیبت کے تیر سے بچ بھی جائے تو موت کا تیر اس سے خطا نہیں کرے گا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ انسان کی اجل (یعنی موت) دو قسم پر ہے۔ بعض جوانی کی حالت میں (کسی حادثہ کی وجہ) مر جاتے ہیں اور بعض عمر کی اس انتہا کو پہنچ کر مرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کی طبعی زندگی کی آخری حد مقرر کی ہے۔ چنانچہ ان دونوں قسم کی موت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ (۲۲-۵) اور بعض (قبل از پیری) مر جاتے ہیں اور بعض (شیخ فانی ہو جاتے اور بڑھاپے کی) نہایت خراب عمر کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ اور شاعر نے کہا ہے[۸] (طویل)

(۸) رأيتُ المنايا خَبْطَ عشواءَ من تُصِبْ
تُمِتْهُ . . . . . .

موت اندھی اونٹنی کی طرح مخبوط پھر رہی ہیں جس کو پہنچ جائیں اسے ختم کر ڈالتی ہیں

اسی طرح دوسرے شاعر نے کہا ہے[۹]: (المنسرح)

(۹) : مَنْ لَمْ يَمُتْ عَبْطَةً يَمُتْ هَرَمًا :

---

[۱] وفی فتح القدیر للشوکانی (ج ۱ ص ۹۸-۹۹) سبعۃ اقوال [۲] راجع ابن کثیر (ج ۱ ص ۱۲۳) قول الحسن فی روایۃ عنہ [۳] اخرجہ

[۴] زہیر فی معلقتہ وتکملتہ . . . . . ومن تخطیٔ یُعَمَّر فیہرم راجع للبیت اللسان والمحکم (عشو، خبط) ودیوانہ ۲۹ والامالی المرتضیٰ ۱ : ۲۲۶ ومختار الشعر الجاہلی ۱ : ۱۵۷ ومحاضرات المؤلف ۳ : ۲۲۹ والجمہرۃ ۱۱۱ والحیوان للجاحظ ۲ : ۱۰۲ و ۶ : ۵۰۹ والعقد الثمین ۹۶ وایام العرب ۲۷۶ وشرح المعلقات لابن الانباری ۲۸۸ [۵] وتمامہ : للموت کاس والمرء ذائقہا۔ البیت لامیۃ بن ابی الصلت الجاہلی کما فی المحکم واللسان (عبط) وراجع للبیت الکامل للمبرد ۶۶ وقال فی ۲۹۷ : قال ابو الحسن الاخفش الاصغر وصاعد اللغوی انہ رجل من الخوارج واحری ان یکون ہو الصواب راجع السمط للمیمنی والبیت ایضاً فی امالی المرتضیٰ ۱-۳۰۳ وعیون الاخبار ۲ : ۳۰۷ والاغانی ۳ : ۱۷۹ والقرطبی ۴ : ۲۹۷ والعینی ۲ : ۱۸۸ ودیوانہ رقم ۴۰ وذیل الامالی ۱۳۵-۱۳۶ فی ثلاثۃ وفیہ لاید ذائقہا والنقائض ۲۰۷ والادیار للمؤلف ۴ / ۸۸۴ وفی اسد الغابۃ انشدت الفارعۃ اخت امیۃ بین یدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قصیدۃ لاخیہ وفیہا البیت ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴

جو شخص جوانی میں فوت نہ ہو آخر کار پیر فرتوت ہو کر مر جائے گا۔

اَلْاٰجِلُ (دیر سے ہونے والا) یہ عَاجِلٌ کی ضد ہے اور ہر اس جنایۃ کو اجل کہہ دیا جاتا ہے جس کے انجام بد کا جلد ہی اندیشہ نہ ہو۔ اس اعتبار سے ہر اجل جنایۃ ہوتا ہے لیکن ہر جنایۃ اجل نہیں ہر محاورہ ہے:۔

فَعَلْتُ کَذَا مِنْ اَجْلِہٖ میں نے فلاں کی وجہ سے یہ کام کیا قرآن میں ہے:۔ مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۵-۳۲) اس (قتل) کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ حکم نازل کیا۔ یعنی اس قتل کے ارتکاب کی وجہ سے، ایک قرات میں اِجْل (بکسر الہمزہ) [۵۱] ہے یعنی اس جرم کی وجہ سے۔

(اَجَلْ) (ہاں بے شک) یہ حرف ایجاب ہے اور کسی خبر کی تصدیق کے لئے آتا [۵۲] ہے اور آیت کریمہ:۔

اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ اور جب تم عورتوں کو (دو دفعہ) طلاق دے چکو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو انہیں .... نکاح میں رہنے دو (۲-۲۳۱) میں بلوغ الاجل سے وہ مدت مراد ہے جو طلاق اور انقضاء عدت کے درمیان ہوتی ہے (نیز بلوغ اجل سے عدت کا ختم ہونا یا عدت کے ختم ہونے تک کی مدت کے قریب پہنچ جانا مراد ہے) اور آیت کریمہ: فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ (۲-۲۳۲) میں بھی انقضاء عدت کی طرف اشارہ ہے یعنی اس وقت فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ (۲-۲۳۴) ان پر کچھ گناہ نہیں ہے کہ اپنے حق جو پسند کریں کر گزریں۔

(ا ح د)

اَحَدٌ کا لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ کبھی [۱] صرف نفی میں اور [۲] کبھی صرف اثبات میں۔ نفی کی صورت میں ذوی العقول کے لئے آتا ہے اور استغراق جنس کے معنی دیتا ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر مجتمع ہو یا متفرق جیسے مَا فِی الدَّارِ اَحَدٌ (گھر میں کوئی بھی نہیں ہے) یعنی نہ ایک ہے اور نہ دو یا دو سے زیادہ نہ مجتمع اور نہ ہی متفرق طور پر اس معنی کی بنا پر کلام مثبت میں اس کا استعمال درست نہیں ہے کیونکہ دو متضاد چیزوں کی نفی تو صحیح ہو سکتی ہے لیکن دونوں کا اثبات نہیں ہوتا جب فِی الدَّارِ وَاحِدٌ کہا جائے تو ظاہر ہے کہ ایک اکیلے کا گھر میں ہونا تو ثابت ہوگا ہی مگر ساتھ ہی دو یا دو سے زیادہ کا بھی اجتماعا و افتراقا اثبات ہو جائے گا پھر احد کا لفظ چونکہ مَا فَوْقَ الْوَاحِدِ کی بھی نفی کرتا ہے اس لئے مَا مِنْ اَحَدٍ فَاضِلِیْنَ۔ کہنا صحیح ہوگا۔ چنانچہ قرآن میں ہے [۵۳] فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ (۶۹-۴۷) پھر تم میں سے کوئی بھی ہمیں اس سے روکنے والا نہ ہوگا۔

---

۵۱ ہذہ قرارۃ ابی جعفر وحدہ راجع فتح القدیر ۱: ۲۳ و شرح الدرۃ للخفاجی۔ ۵۲ وکذا جیر وان راجع الرضی علی الکافیہ (۲: ۳۹۳) و ابن یعیش (۸-۱۲۴) وغیرہ الشواہد ۵۳ و ایضا قال:۔ وَمَا یُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ (۲-۱۰۲)

کلام مثبت میں احد کا استعمال تین طرح پر ہوتا ہے (۱) عشرات کے ساتھ ضم ہو کر جیسے اَحَدَ عَشَرَ (گیارہ) اَحَدٌ وَّ عِشْرُوْنَ (اکیس) وغیرہ (۲) مضاف یا مضاف الیہ ہو کر اس صورت میں یہ اول (یعنی پہلا) کے معنی میں ہوگا جیسے فرمایا:۔ اَمَّا اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا (۱۲-۴۱) یعنی تم میں سے جو پہلا ہے وہ تو اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا۔
يَوْمُ الْاَحَدِ ہفتے کا پہلا دن یعنی اتوار (۳) مطلقاً بطور وصف استعمال ہو تو اس صورت میں یہ باری تعالٰے کا وصف ہی ہوگا اور اس کے معنی ہوں گے یکتا، یگانہ بے نظیر، بے مثل) جیسے فرمایا :۔
قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲-۱) کہو کہ وہ (ذات پاک جس کا نام) اللہ ہے۔ ایک ہے۔
اَحَدٌ اصل میں وَحَدٌ ہے لیکن وَحَدٌ کا لفظ غیر باری تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ نابغہ نے کہا ہے[1] ع (بسیط)

(۱۰) كَاَنَّ رَحْلِيْ وَقَدْ زَالَ النَّهَارُ بِنَا
بِذِي الْجَلِيْلِ عَلٰى مُسْتَاْنِسٍ وَحَدٍ

(دن ڈھلے وادی ذوالجلیل میں میری اونٹنی کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ جیسے میرا پالان بجائے اونٹنی کے اس گورخر پر کسا ہوا ہو جو تنہا ہو اور انسان کی آہٹ پا کر ڈر کے مارے تیز بھاگ رہا ہو۔

(ا خ ذ)

الْاَخْذُ کے معنی ہیں کسی چیز کو حاصل کر لینا، جمع کر لینا اور احاطہ میں لے لینا اور یہ حصول کبھی کسی چیز کو پکڑ لینے کی صورت میں ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗ (۱۲-۷۹) خدا پناہ میں رکھے کہ جس شخص کے پاس ہم نے اپنی چیز پائی ہے اس کے سوا ہم کسی اور کو پکڑ لیں اور کبھی غلبہ اور قہر کی صورت میں جیسے فرمایا:۔
لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (۲-۲۵۵) نہ اس پر اونگھ غالب آسکتی اور نہ ہی نیند۔
محاورہ ہے۔ اَخَذَتْهُ الْحُمّٰى (اسے بخار چڑھ گیا) قرآن میں ہے:۔ وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ (۱۱-۶۷) اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان کو چنگھاڑ (کی صورت میں عذاب) نے آ پکڑا۔
فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (۷۹-۲۵) تو خدا نے اس کو دنیا اور آخرت (دونوں) کے عذاب میں پکڑ لیا۔
وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَا اَخَذَ الْقُرٰى (۱۱-۱۰۲) اور تمہارا پروردگار (جب نافرمان) بستیوں کو پکڑا کرتا ہے تو اس کی پکڑ اسی طرح ہوتی ہے۔
اور قیدی کو مَاْخُوْذٌ اور اَخِيْذٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے اَلْاِتِّخَاذُ (افتعال) ہے اور یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہو کر جَعَلَ کے جاری مجری ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَاۗءَ (۵-۵۱) یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَاۗءَ (۳۹-۳) جن لوگوں

[1] قالہ النابغۃ یصف سرعۃ سیرہ والبیت فی دیوانہ وشرح العشر للتبریزی واللسان (انس۔ زول۔ وحد) وشواہد الکشاف (۲۴) وامالی الشجریہ ۲: ۲۷۱ والمعانی الکبیر للقتبی ۳۲، والخزانۃ البغدادیہ (۱: ۵۲۱) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۵۷) والحاضرات للمؤلف (۳: ۲۶۶) والشطر الثانی فی البلدان (اسم جلیل) وفی روایۃ اللسان والثمین یوم الجلیل بدل بذی الجلیل ومستوحش بدل مستانس ؛

نے اس کے سوا اور دوست بنائے۔ فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سُخْرِیًّا (۲۳-۱۱۰) تو تم نے ان سے تمسخر بنا لیا۔ أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَأُمِّیَ اِلٰهَیْنِ (۵-۱۱۶) کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو معبود بنا لو۔

اور آیت کریمہ: وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ (۱۶-۶۱) میں صیغہ مفاعلہ لاکر معنی مجازات اور مقابلہ پر تنبیہ کی ہے کہ جو انعامات خدا کی طرف سے انہیں ملے ان کے مقابلہ میں انہوں نے شکر گذاری سے کام نہیں لیا۔ فُلَانٌ مَأْخُوْذٌ وَبِهٖ اَخْذَةٌ مِنَ الْجِنِّ فلاں جن کے اثرات میں گرفتار ہے۔ فُلَانٌ یَأْخُذُ مَأْخَذَ فُلَانٍ یعنی فلاں اس جیسا کام کرتا ہے یا اس کے مسلک پر چلتا ہے اور اسی سے محاورہ ہے: ذَهَبُوْا وَمَنْ اَخَذَ اَخْذَهُمْ وَاِخْذَهُمْ وہ اور ان کے ہم مشرب سب چلے گئے۔

رَجُلٌ اُخُذٌ اَوْ بِهٖ اُخُذٌ کنایۃً شخص جو آشوب چشم میں مبتلا ہو۔ اَلْاِخَاذَةُ وَالْاِخَاذُ وہ زمین جسے کوئی شخص اپنے لئے خاص کرلے۔

(ا خ ر)

اٰخِرُ۔ اوّلٌ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اور اٰخَرُ (دوسرا) وَاحِدٌ کے مقابلہ میں آتا ہے اور اَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ سے نشأۃ ثانیہ مراد لی جاتی ہے جس طرح کہ اَلدَّارُ الدُّنْیَا سے نشأۃ اولی چنانچہ فرمایا وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِیَ الْحَیَوَانُ (۲۹-۶۴) ہمیشہ کی زندگی کا مقام تو آخرت کا گھر ہے لیکن کبھی اَلدَّارُ کا لفظ حذف کرکے صرف اَلْاٰخِرَةُ کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے جیسے فرمایا:

اُولٰئِكَ الَّذِیْنَ لَیْسَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ (۱۱-۱۶) یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔

اور دَارٌ کا لفظ کبھی اٰخِرَةٌ کا موصوف ہوتا ہے اور کبھی اس کی طرف مضاف ہو کر آتا ہے چنانچہ فرمایا:۔ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ اور یقیناً آخرت کا گھر بہتر ہے۔ ان کے لئے جو خدا سے ڈرتے ہیں (۶-۳۲)

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (۱۶-۴۱) اور آخرت کا اجر بہت بڑا ہے۔ اگر وہ اسے جانتے ہوتے۔ یہ اصل میں وَلَاَجْرُ دَارِ الْحَیَاةِ الْاٰخِرَةِ ہے (اور دار کا لفظ الْحَیَاةِ الْاٰخِرَةِ کی طرف مضاف ہے)

اور اُخَرُ (جمع الاخرٰی) کا لفظ الاٰخَرُ (معرف باللام) سے معدول ہے اور کلام عرب میں اس کی دوسری نظیر نہیں ہے کیونکہ اَفْعَلُ مِنْ کَذَا (یعنی صیغہ تفضیل) کے ساتھ اگر لفظ مِنْ لفظاً یا تقدیراً مذکور ہو تو نہ اس کا تثنیہ ہوتا اور نہ جمع اور نہ ہی تانیث آتی ہے اور اگر مِنْ مذکور نہ ہو تو معرف باللام ہوتا ہے اور اس کا تثنیہ جمع دونوں آسکتے ہیں[1]۔ لیکن لفظ آخَر میں اس کے نظائر کے برعکس الف لام کے بغیر اس کے استعمال کو جائز سمجھا گیا ہے تو معلوم ہوا کہ یہ اَلْاٰخَرُ سے معدول ہے۔

اَلتَّاخِیْرُ یہ تقدیم کی ضد ہے (یعنی پیچھے کرنا چھوڑنا۔ چنانچہ فرمایا:۔ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ (۷۵-۱۳) جو عمل اس نے آگے بھیجے اور جو پیچھے چھوڑے۔

مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (۴۸-۲)

[1] وفی القرآن و آخرون اعترفوا بذنوبهم (۹-۱۰۲) و آخرین منهم (۶۲-۳) و آخر مثلہ (۹-۱۵) بین فی الاٰخرین (۲۶-۸۴) الاستخبار والاستفعال) راجع الایات (۱۵-۱۵ اذ ...

تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ
إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيهِ الْأَبْصَارُ (۱۴-۴۲) وہ ان کو اس دن تک مہلت دے رہا ہے جب کہ دہشت کے سبب آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔
رَبَّنَا أَخِّرْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ (۱۴-۴۴) اے ہمارے پروردگار ہمیں تھوڑی سی مہلت عطا کر۔
محاورہ ہے۔ بِعْتُهُ بِأَخِرَةٍ میں نے اسے تاخیر اجل کے بیچ ڈالا یہ لفظ و معنی نَظِرَةٍ کی طرح ہے اور أَبْعَدَ اللّٰهُ الْآخِرَ میں اَلْآخِرَ کے معنی مُتَأَخِّرٌ عَنِ الْفَضِيلَةِ او عن تحری الحق کے ہیں یعنی اللہ فضیلت اور حق کی تحری میں کوتاہی کرنے والے کو ہلاک کرے یا اپنی رحمت کو دور رکھے۔

(ا خ و)

أَخٌ (بھائی) اصل میں أَخَوٌ ہے اور ہر وہ شخص جو کسی دوسرے شخص کا ولادت میں ماں باپ دونوں یا ان میں سے ایک کی طرف سے یا رضاعت میں شریک ہو وہ اس کا أَخٌ کہلاتا ہے لیکن بطور استعارہ اس کا استعمال عام ہے اور ہر اس شخص کو جو قبیلہ دین و مذہب صنعت وحرفت دوستی یا کسی دیگر معاملہ میں دوسرے کا شریک ہو اسے أَخٌ کہا جاتا ہے[1] چنانچہ آیت کریمہ:۔
لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ (۳-۱۵۶) ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو کفر کرتے ہیں اور اپنے مسلمان بھائیوں کی نسبت کہتے ہیں۔ میں إِخْوَان سے ان کے ہم مشرب لوگ مراد ہیں اور فرمایا۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (۴۹-۱۰)

مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتًا (۴۹-۱۲) کیا تم میں سے کوئی ایسی بات کو پسند کریگا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔
اور آیت کریمہ:۔
فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ (۴-۱۱) اگر میت کے بھائی بھی ہوں۔ میں إِخْوَةٌ کا لفظ بہن بھائی دونوں کو شامل ہے اور آیت کریمہ:۔ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ (۱۵-۴۷) (گویا) بھائی بھائی مسہریوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں متنبہ کیا ہے کہ اہل جنت میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوگا۔
اَلْأُخْتُ (بہن) یہ أَخٌ کا مؤنث ہے اور اس میں تاء بمنزلہ عوض عن المحذوف کے ہے اور آیت کریمہ: يَا أُخْتَ هَارُونَ (۱۹-۲۸) اے ہارون کی بہن۔ میں بہن بلحاظ نسب مراد نہیں ہے بلکہ صلاح و تقوی کے اعتبار سے مریم علیہا السلام کو اخت ہارون کہا گیا ہے جس طرح کہ يَا أَخَا تَمِيمٍ کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:۔
أَخَا عَادٍ (۴۶-۲۱) میں ہود علیہ السلام کو قوم عاد کا بھائی کہنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ وہ ان پر بھائیوں کی طرح شفقت فرماتے تھے اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا:۔
وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا (۱۱-۶۱) اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔
وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ (۱۱-۵۰) اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی (ہود) کو بھیجا۔
وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا (۱۱-۸۴) اور

---

[1] اس کی جمع اخوۃ اور اخوان آتی ہے ۱۲

مدین کی طرف ان کے بھائی (شعیب) کو بھیجا۔
اور آیت کریمہ :۔
وَمَا نُرِیْھِمْ مِّنْ اٰیَۃٍ اِلَّا ھِیَ اَکْبَرُ مِنْ اُخْتِھَا
(۴۳-۴۸) اور جو نشانی ہم ان کو دکھاتے تھے
وہ اس کی بہن سے بڑی ہوتی تھی۔ میں اُخْتِھَا
پہلی نشانی سے ہے اور اس کو اخت اس لئے
کہا ہے کہ صحت و صداقت اور اظہار حق میں
دونوں ایک جیسی ہیں اور آیت کریمہ: کُلَّمَا
دَخَلَتْ اُمَّۃٌ لَّعَنَتْ اُخْتَھَا (۷-۳۸) جب
ایک جماعت وہاں داخل ہوگی تو اپنی بہن پر
لعنت کرے گی۔ میں اُخْتَھَا سے ان کے دیگر
ہم مشرب لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر
اَوْلِیَآؤُھُمُ الطَّاغُوْتُ (۲-۲۵۷) ان کے دوست
طاغوت ہیں۔ اور اسی قسم کی دیگر آیات میں پایا
جاتا ہے۔
تَاَخَّیْتُ کسی کے ساتھ برادرانہ سلوک کرنا اور
چونکہ دو بھائی مل کر رہتے ہیں اس جہت سے اس
مادہ میں لزوم اور وابستگی کا مفہوم پیدا ہوگیا ہے۔
چنانچہ اس اعتبار سے اس کھونٹے کو اَخِیَّۃُ الدَّابَّۃِ
کہہ دیتے ہیں جس سے جانور بندھا رہتا ہے

(ا د د)

قرآن میں ہے :۔
لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْئًا اِدًّا (۱۹-۸۹) یہ تو تم نا زیبا
اور ناپسندیدہ بات زبان پر لائے ہو۔
اِدًّا کے معنی ہیں نہایت ہی ناپسندیدہ بات جس
سے ہنگامہ بپا ہو جائے گا یہ اَدَّتِ النَّاقَۃُ
تَئِدُّ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی
ہیں اونٹنی (اپنے بچے کی جدائی میں) سخت روئی
اور گریہ کیا۔
اَلْاَدِیْدُ شور ہنگامہ اور اُدٌّ (نام پدر قبیلہ)
یا تو وُدٌّ سے مشتق ہے یا پھر اَدَّتِ النَّاقَۃُ سے۔

(ا د م)

اٰدَمُ۔ ابو البشر آدم علیہ السلام بعض نے کہا ہے۔
کہ یہ اَدِیْمُ الْاَرْضِ سے مشتق ہے اور ان کا نام
آدم اس لئے رکھا گیا ہے کہ ان کے جسم کو بھی ادیم
ارض یعنی روئے زمین کی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے
اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اُدْمَۃٌ سے مشتق ہے
جس کے معنی گندمی رنگ کے ہیں۔ چونکہ آدم
علیہ السلام بھی گندمی رنگ کے تھے اس لئے
انہیں اس نام سے موسوم کیا گیا ہے چنانچہ رَجُلٌ
آدَمُ کے معنی گندمی رنگ مرد کے ہیں۔ اور بعض
آدم کی وجہ تسمیہ بیان ہے کہ وہ مختلف عناصر
اور متفرق قویٰ کے امتزاج سے پیدا کئے
گئے تھے۔ جیسا کہ آیت اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْہِ
(۷۶-۲) مخلوط عناصر سے ..... کہ اسے
آزماتے ہیں۔ سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ
محاورہ ہے جَعَلْتُ فُلَانًا اُدْمَۃَ اَھْلِیْ
میں نے فلاں کو اپنے اہل و عیال میں ملا لیا مخلوط
کر لیا۔
بعض نے کہا ہے کہ آدم اِدَامٌ سے مشتق
ہے اور اِدَامٌ (سالن وغیرہ) ہر چیز کو کہتے ہیں
جس سے طعام کو لذیذ اور خوشگوار محسوس ہو اور
آدم میں بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی روح ڈال کر اسے
پاکیزہ بنا دیا تھا جیسے کہ آیت وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ
رُوْحِیْ (۳۸-۷۲) (اور اس میں اپنی روح پھونک
دوں) میں مذکور ہے اور پھر اسے عقل و فہم اور

ذکر عطا کر کے دوسری مخلوق پر فضیلت بھی دی ہے جیسے فرمایا:۔ وَ فَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا (۱۷-۷۰) اور ہم نے انہیں اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی۔

اس بنا پر ان کا نام آدم رکھا گیا ہے اور حدیث میں ہے[۸] لَوْ نَظَرْتَ إِلَيْهَا فَإِنَّهُ أَحْرٰى أَنْ يُّؤْدَمَ بَيْنَكُمَا اگر تو اسے (اپنی منگیتر کو) ایک نظر دیکھ لے تو اس سے تمہارے درمیان الفت اور خوشگواری پیدا ہو جانے کا زیادہ امکان ہے۔

(ا د ی (و))

اَلْاَدَاءُ کے معنی ہیں یکبارگی اور پورا پورا حق دے دینا۔ چنانچہ خراج اور جزیہ کے دے دینے اور امانت کے واپس کر دینے کو اداء کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔ فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهٗ (۲-۲۸۳) تو امانت دار کو چاہیئے کہ صاحب امانت کی امانت ادا کرے۔ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ إِلٰى أَهْلِهَا (۴-۵۸) خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے حوالہ کر دیا کرو۔ وَ اَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ (۲-۱۷۸) اور پسندیدہ طریق سے خون بہا اسے پورا پورا ادا کرنا۔ اصل میں یہ

اَدَاۃ سے ہے محاورہ ہے اَدَوْتُ تَفْعَلُ كَذَا کسی کام کے لئے حیلہ اور تدبیر کرنا اصل میں اس کے معنی اَدَاۃ (کسی چیز کو پکڑنے کے ہیں جس کے ذریعہ دوسری چیز تک پہنچا جا سکے۔

(ا ذ ا)

إِذَا - (ظرف زمان) زمانہ مستقبل پر دلالت کرتا ہے[۹] کبھی جب اس میں شرطیت کا مفہوم پایا جاتا ہے تو فعل مضارع کو جزم دیتا ہے[۱۰] اور یہ عام طور پر نظم میں آتا ہے اور إِذْ (ظرف) ماضی کیلئے آتا ہے اور جب ما کے ساتھ مرکب ہو (اِذْمَا) تو معنی شرط کو متضمن ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[۱۱]

(۱۱) إِذْ مَا أَتَيْتَ عَلَى الرَّسُوْلِ فَقُلْ لَهٗ
جب تو رسول اللہ کے پاس جائے تو ان سے کہنا۔

(ا ذ ن)

اَلْاُذُنُ کے معنی کان کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر ہنڈیا کی کوروں کو اُذُنُ الْقِدْرِ کہا جاتا ہے اور استعارہ کے طور پر ہر اس شخص پر اُذُنٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جو ہر ایک کی بات سن کر اسے مان لیتا ہو۔ چنانچہ فرمایا:۔

---

[۸] لفظ حدیث من روایۃ ابی عبید فی غریبہ والذی فی الترمذی والنسائی وابن ماجۃ وابن خیثمۃ وابن حبان والحاکم واحمد والبزار وغیرہم فی حدیث المغیرۃ انہ خطب امرأۃ فقال لہ صلی اللہ علیہ وسلم انظر الیہا الخ وراجع تخریج الکشاف للحافظ ص ۱۳۱ رقم ۸۹) والفائق ۱/۱۱ والمنتقی بشرح النیل (۶: ۱۰۶-۱۰۷) والاحیاء بتخریج العراقی ۲/ ۳۹ واللسان (ادم) قال الزمخشری فی الحدیث او یعنی لیت فان الغرض منہ الحث علی النظر ومنہ قولہم لو تاتینی فتحدثنی ۱۲ [۹] وایضا الاطلاق کما فی التنزیل اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ (۴۴-۱۸) ۱۲ [۱۰] وان دخل علی الماضی نحو اذا جاء نصر اللہ (۱۱۰-۱) [۱۱] وتارۃ تدل علی معنی المفاجاۃ نحو فاذا ہی حیۃ تسعٰی (۲۰-۲۱) [۱۲] قالہ العباس بن مرداس یمدح النبی صلی اللہ علیہ وسلم وتمامہ . . . حقا علیک اذا اطمان المجلس والبیت فی السیرۃ ۴: ۹۷) والکامل ۹۴ ۲ والکتاب لسیبویہ (۱: ۴۳۲) قال الشنتمری والبیت مضمن وتمامہ فیما بعدہ والبیت الثانی فی الصحاح (اذ) وفی روایۃ الامیر بدل الرسول وہو محرف وفی اللسان "الامین"

وَیَقُوْلُوْنَ ھُوَ اُذُنٌ۔ قُلْ اُذُنُ خَیْرٍ لَّکُمْ (۹-۶۱) اور کہتے ہیں یہ شخص نرا کان ہے ان سے کہدو کہ وہ کان ہے تو تمہاری بھلائی کے لئے ۔ اور آیت کریمہ :۔

وَفِیْٓ اٰذَانِھِمْ وَقْرًا (۶۵-۲۵) اور انکے کانوں میں گرانی پیدا کردی ہے۔ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ بہرے ہوگئے ہیں بلکہ اس سے ان کی جہالت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ اور اَذِنَ (الیہ) کے معنی توجہ سے سننا کے ہیں جیسے فرمایا:۔ وَاَذِنَتْ لِرَبِّھَا وَحُقَّتْ (۸۴-۲،۵) اور وہ اپنے پروردگار کا فرمان سنے گی اور اُسے واجب بھی ہے اور اِذْنٌ کا لفظ اس علم پر بھی بولا جاتا ہے جو سماع سے حاصل ہو۔ جیسے فرمایا:۔ فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ (۲-۲۷۹) تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) خدا اور رسول سے تمہاری جنگ ہے۔ اور اِذْنٌ و اَذَانٌ ہر سنی ہوئی بات کو کہتے ہیں اور ان سے علم مراد لیا جاتا ہے۔ کیونکہ ہمارا اکثر علم مسموعات پر مبنی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ اِئْذَنْ لِّیْ وَلَا تَفْتِنِّیْ (۹-۴۹) مجھے اجازت دے دیجئے اور آفت میں نہ ڈالئے ۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّکَ (۷-۱۶۷) اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا۔ اَذَنْتُہٗ بِکَذَا اور اَذَّنْتُہٗ کے ایک معنی ہیں یعنی اطلاع دینا اور اعلان کرنا اور اعلان کرنے والے کو مُؤَذِّنٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُھَا الْعِیْرُ (۱۲-۷۰) تو ایک پکارنے والے نے آواز دی کہ اے قافلے والو۔

فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَیْنَھُمْ (۷-۴۴) تو اس وقت) ان میں ایک پکارنے والا پکار دیگا۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ (۲۲-۲۷) اور لوگوں میں حج کے لئے اعلان کردو ۔

اَلْاَذِیْنُ ۔ وہ خاص جگہ جہاں اذان کی آواز پہنچتی ہو۔ اَلْاِذْنُ فِی الشَّیْءِ کے معنی ہیں یہ بتا دینا کہ کسی چیز میں اجازت اور رخصت ہے۔ اور آیت کریمہ :۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (۴-۶۴) اور ہم نے پیغمبر بھیجا ہی اس لئے ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے۔ میں اِذْن بمعنی ارادہ اور حکم ہے (اسی طرح فرمایا :۔

وَمَآ اَصَابَکُمْ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰہِ (۳-۱۶۶) اور جو مصیبت تم پر دونوں جماعتوں کے مقابلے کے دن واقع ہوئی سو خدا کے حکم سے واقع ہوئی ۔

وَمَا ھُمْ بِضَآرِّیْنَ بِہٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (۲-۱۰۲) اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

وَلَیْسَ بِضَآرِّھِمْ شَیْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (۵۸-۱۰) مگر خدا کے حکم کے سوا انہیں کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی علم الٰہی کے ہیں مگر اِذْن اور علم میں فرق ہے کیونکہ اِذْنٌ کا لفظ خاص ہے اور اس کا استعمال اس موقع پر ہوتا ہے جہاں علم کے ساتھ مشیت بھی شامل ہو عام اس کہ وہ فعل پسندیدہ ہو یا پسندیدہ نہ ہو۔ لیکن علم میں مشیت کا ہونا ضروری ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۱۰-۱۰۰) (حالانکہ کسی شخص کو قدرت نہیں ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر ایمان لائے)

میں ظاہر ہے کہ اللہ کی مشیت اور اس کا امر دونوں پائے جاتے ہیں[1]۔ اور آیت کریمہ:۔

وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (۲-۱۰۲) (اور خدا کے حکم کے سوا وہ اس (جادو) سے کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں مشیت من وجہ پائی جاتی ہے کیونکہ یہ امر مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو طبعی طور پر ایسا بنایا ہے کہ دوسرے کی ضرب سے متأثر ہو اور اسے اس سے گزند پہنچے۔ وہ پتھر کی طرح نہیں ہے کہ کسی قسم کی ضرب سے اسے تکلیف نہ ہو اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان میں اس قسم کی قوت کا پایا جانا اللہ تعالیٰ کے فعل سے ہے اس اعتبار سے جب کسی شخص کو ظالم کے ظلم سے تکلیف پہنچتی ہے تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ اللہ کے اذن اور مشیت سے ہی پہنچی ہے۔ یہ ایک جداگانہ موضوع ہے۔ جس کی تفصیل کے لئے دوسری کتاب درکار ہے۔

اَلْاِسْتِئْذَانُ کے معنی اجازت طلب کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۹-۴۵) اجازت وہی لوگ مانگتے ہیں جو خدا پر اور پچھلے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔

فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ (۲۴-۶۲) سو جب یہ لوگ تم سے کسی کام کے لئے اجازت مانگا کریں۔

اِذَنْ۔ یہ جواب اور جزا کے لئے آتا ہے یعنی لفظاً یا تقدیراً جواب کو چاہتا ہے اور اس کے بعد کا کلام جزا کے معنی کو متضمن ہوتا ہے۔ جب یہ شروع کلام میں آئے اور اس کے بعد فعل مضارع ہو تو حتماً اس کو نصب دیگا۔ جیسے اِذَنْ اَخْرُجَ لیکن جب اثنائے کلام میں آئے اور پھر اس کے بعد فعل مضارع ہو تو فعل مضارع پر رفع اور نصب دونوں جائز ہیں جیسے اَنَا اِذَنْ اَخْرُجُ وَاَخْرُجَ مگر جب فعل کے بعد آئے یا اس کے بعد فعل مضارع ہی نہ ہو تو عمل نہیں کرتا[2] جیسے اَنَا اَخْرُجُ اِذَنْ) قرآن میں ہے: اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (۴-۱۴۰) ورنہ تم بھی انہیں جیسے ہو جاؤگے۔

(اذی)

اَلْاَذٰی۔ ہر اس ضرر کو کہتے ہیں جو کسی جاندار کو پہنچتا ہے[3] وہ ضرر جسمانی ہو یا نفسانی یا اس کے متعلقات سے ہو اور پھر وہ ضرر دنیوی ہو یا اخروی چنانچہ قرآن میں ہے:۔ لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (۲-۲۶۴) اپنے صدقات (وخیرات) کو احسان جتا کر اور ایذا دے کر برباد نہ کرو۔

اور آیت کریمہ۔ فَاٰذُوْهُمَا (۴-۱۶) میں مار پٹائی (سزا) کی طرف اشارہ ہے اسی طرح سورۃ توبہ میں فرمایا:۔ وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ (۹-۶۱) اور ان میں بعض ایسے ہیں جو خدا کے پیغمبر کو ایذا دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص نرا کان ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ

---

[1] ایضاً راجع الآیۃ ویمسک السماء اَنْ تَقَعَ عَلَی الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِہٖ (۲۲-۶۵) و (۲-۲۱۳) [2] راجع للتفصیل الرضی علی الکافیۃ ۲/۲۳۵-۲۳۶ [3] وفی حدیث شعب الایمان ادناھا اماطۃ الاذی عن الطریق وفی العقیقۃ: امیطوا عنہ الاذی ۱۲ ❊ ❊ ❊

أَلِيْمٌ (۹ - ۶۱) اور جو لوگ رسول خدا کو رنج پہنچاتے ہیں ان کے لئے عذاب الیم (تیار) ہے۔
لَا تَكُوْنُوا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى۔ (۳۳-۶۹) تم اِن لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے موسیٰؑ کو تکلیف دی (عیب لگا کر) رنج پہنچایا۔
وَ اُوْذُوْا حَتّٰى اَتٰاهُمْ نَصْرُنَا (۶-۳۴) اور ایذا (پر صبر کرتے رہے) یہاں تک کہ اِن کے پاس ہماری مدد پہنچتی رہی۔
لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ (۶۱-۵) تم مجھے کیوں ایذا دیتے ہو۔ اور آیت کریمہ:۔ وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى (۲-۲۲۲) میں حیض (کے دنوں میں عورت سے جماع کرنے) کو اَذًى کہنا یا تو از روئے شریعت ہے یا پھر بلحاظ علم طب کے جیسا کہ اس فن کے ماہرین بیان کرتے ہیں۔
آذَيْتُهٗ (افعال) اِيْذَاءً وَ اَذِيَّةً وَ اَذًى کسی کو تکلیف دینا۔
اَلْاٰذِيُّ۔ موج بحر جو بحری مسافروں کیلئے تکلیف دہ ہو۔

(ا ر ب)

اَلْاَرَبُ کے معنی سخت احتیاج کے ہیں جسے دور کرنے کے لئے حیلہ اور تدبیر کرنی پڑے پس اَرَبٌ خاص اور حَاجَةٌ عام ہے پھر کبھی اَرَبٌ کا لفظ صرف حاجت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی محض حیلہ اور تدبیر کرنے کے لئے آتا ہے گو حاجت نہ ہو مثلاً محاورہ ہے۔ فُلَانٌ ذُوْ اَرَبٍ وَ اَرِيْبٌ فلاں صاحب حیلہ اور چالاک ہے۔
اَرِبَ اِلٰى كَذَا، اَرَبًا وَ اُرْبَةً وَ اِرْبَةً وَ مَارَبَةً کے معنی ہیں وہ کسی چیز کا سخت محتاج ہوا۔
(مَاْرُبَةٌ) سخت حاجت ج مَآرِبُ) قرآن میں ہے۔ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى (۲۰-۱۸) اور (اس میں میرے لئے اور بھی کئی فائدے ہیں۔
وَلَا اَرَبَ لِيْ فِيْ كَذَا۔ مجھے اس کی کوئی شدید ضرورت نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ: غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ (۲۴-۳۱) نیز وہ خدمت گزار مرد جو عورتوں کی خواہش نہ رکھیں۔ میں اِرْبَةٌ سے بطور کنایہ حاجت نکاح مراد ہے۔
اَلْاُرْبِيُّ بڑی مصیبت جس کے دور کرنے کیلئے تدبیر اور حیلہ کرنا پڑے۔
اَلْاٰرَابُ (واحد اِرْبٌ) وہ اعضاء جن کی انسان کو سخت ضرورت رہتی ہے کیونکہ اعضاء دو قسم کے ہیں ایک وہ جنکے ذریعہ ہر جاندار چیز اپنی ضروریات پورا کرتی ہے جیسے ہاتھ، پاؤں اور آنکھ اور دوسرے وہ جو محض زینت کے لئے بنائے گئے ہیں جیسے بھویں، داڑھی وغیرہ پھر وہ اعضاء جو حوائج کو پورا کرنے کیلئے بنائے گئے ہیں دو قسم پر ہیں ایک وہ جن کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی اور دوسرے وہ ہیں جن کی سخت احتیاج رہتی ہے اور اِن کے بغیر جسم انسانی کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اس دوسری قسم کے اعضاء کو اٰرَابٌ کہا جاتا ہے حدیث میں ہے[1] (۹) اِذَا سَجَدَ الْعَبْدُ سَجَدَ مَعَهٗ سَبْعَةُ اٰرَابٍ کہ جب بندہ سجدہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ سات اعضاء سجدہ کرتے ہیں چہرہ، دو ہتھیلیاں، دو گھٹنے اور دو پاؤں

---

[1] رواہ الاربعۃ من حدیث ابن عباس وفی الصحیحین عنہ امرت ان اسجد علی سبعۃ اعظم وفی لفظ اعضاء رقم الی داؤد وابیکا امرنبیکم راجع تخریج الکشاف للحافظ ابن حجر ۱۷۸ رقم ۲۳۲ والفیل ۲: ۲۶۷ والعون باب اعضاء السجود ۱۲

اور جب کوئی شخص اپنی ضرورت کے مطابق وافر حصہ لے تو کہا جاتا ہے اَرَّبَ نَصِیْبَہٗ اس نے بڑا حصہ لیا اور وافر۔ اسی سے محاورہ ہے:۔ اَرَّبَ مَالَہٗ اس نے اپنا مال بڑھالیا اَرَّبْتُ الْعُقْدَۃَ میں نے مضبوط گرہ لگائی۔

(ا ر ض)

اَلْاَرْضُ (زمین) سَمَاءٌ (آسمان) کے بالمقابل ایک جرم کا نام ہے اس کی جمع اَرْضُوْنَ ہے۔ جس کا صیغہ قرآن میں نہیں ہے کبھی اَرْض کا لفظ بول کر کسی چیز کا نیچے کا حصہ مراد لے لیتے ہیں جس طرح سماء کا لفظ اعلیٰ حصہ پر بولا جاتا ہے۔ شاعر نے گھوڑی کے وصف میں کہا ہے[1] (الطویل)

۱۲۔ وَاَحْمَرَ کَالدِّیْبَاجِ اَمَّا سَمَاؤُھَا
فَرَیَّا وَاَمَّا اَرْضُھَا فَمَحُوْلٌ

وہ دیبا کی طرح سرخ ہے اس کا اوپر کا حصہ موٹا گداز ہے لیکن اس کا زیریں حصہ (یعنی ٹانگیں وغیرہ) خشک اور سخت ہے اور آیت کریمہ:۔ اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا۔ جان رکھو کہ خدا ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے (۵۷۔۱۷) میں فساد کے بعد تکوین (اور بدء کے بعد عود کی طرف اشارہ ہے وہ نظام جو عالم میں جاری وساری ہے) اسی بنا پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے دلوں کو ان کے سخت ہونے کے بعد نرم کرنا مراد ہے۔ محاورہ ہے:۔ اَرْضٌ اَرِیْضَۃٌ زرخیز زمین تَاَرَّضَ النَّبْتُ نباتات زمین پر جم گئی اور زیادہ ہوگئی تَاَرَّضَ الْجَدْیُ بکری کے بچہ نے گھاس کھائی اور اَرَضَۃٌ کے معنی دیمک کے ہیں اور اُرِضَتِ الْخَشَبَۃُ کے معنی ہیں لکڑی کو دیمک خوردہ ہوگئی اور دیمک خوردہ لکڑی کو مَاْرُوْضَۃٌ کہا جاتا ہے۔

(ا ر ک)

اَلْاَرِیْکَۃُ (مسہری، حجلہ (چھپر کھٹ)) جو مسہری یعنی تخت کے اوپر رکھا ہو اس کی جمع اَرَائِکُ ہے اور اسے اَرِیْکَۃٌ کہنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ وہ ارض یعنی دنیا میں اراک (پیلو کی لکڑی) سے بنایا جاتا ہے جو ایک قسم کا درخت ہے اور یا محل اقامت ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ اَرَکَ بِالْمَکَانِ اُرُوْکًا سے مشتق ہے جس کے اصل معنی کسی جگہ پر اراک (یعنی پیلو) کے پتے چرنے کے لئے ٹھہرنا کے ہیں پھر مطلق ٹھہرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ (اس لئے جنت کے چھپر کھٹوں کو جو اہل جنت کی اقامت گاہ ہوں گے۔ اَرَائِکُ (۱۸۔۳۱) کہا گیا ہے)

(ا ر م)

اَلْاِرَمُ۔ دراصل اس نشان کو کہتے ہیں

---

[1] البیت لطفیل الغنوی وفی اللسان (ارض) ارضہ وسماءہ بالتذکیر ایضاً راجع الاقتضاب ۲۳۵ و تہذیب الاصلاح (۱: ۴۰) والعقد (۱: ۱۸۵) ومعانی العسکری ۲: ۱۰۶) والسمط (۲: ۸۸۱) والقالی ۲: ۴۸۲ والمعانی للقتبی (۱: ۱۵۵) قال وسما الفرس ماکان من عجب الذنب الی العذر وارضہ قوائمہ وارض الفرس فی غیر ہذا المواضع حوافرہ والبیت فی دیوانہ ۶۲ (ملحقات) وقانون البلاغۃ ضمن رسائل البلاغۃ (صنعۃ کرد علی) وامالی المرتضی (۲: ۱۶۹) وفیہ کالدنیار بدل کالدیباج وھو احسن

جو پتھروں سے بنا دیا جاتا ہے اس کی جمع اٰدَامٌ
ہے اور پتھروں کو اُدُمٌ کہا جاتا ہے اور اسی
سے غضب ناک آدمی کے متعلق کہا جاتا ہے۔
فَلَانٌ یَحْرِقُ الْاُرَّمَ یعنی فلاں مارے غصے
کے دانت پیستا ہے اور آیت کریمہ :۔
اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (۸۹-۶) ارم ستونوں والے۔
میں ارم سے بلند اور مزین ستون مراد ہیں (جو قوم
عاد نے بنائے تھے) مَابِھَا اَرِمٌ وَّ اَرِیْمٌ یعنی
اس میں کوئی نہیں اصل میں اس کے معنی اَللَّازِمُ
لِلْاُرَّمِ کے ہیں اور اس کا استعمال ہمیشہ (حرف)
نفی کے ساتھ ہوتا ہے جس طرح کہ مَابِھَا دَیَّارٌ
کا محاورہ ہے اور اس کے اصل معنی مقیم فی الدار کے ہیں۔

(ا ز ز)

آیت کریمہ:۔ تَؤُزُّھُمْ اَزًّا (۱۹-۸۳)
کے معنی ہیں کہ وہ ان کو برانگیختہ کرتے رہتے ہیں
یہ اَزَّتِ الْقِدْرُ سے ہے جس کے معنی ہیں:۔
ہانڈی میں جوش اور ابال آگیا (اسی مناسبت
سے ورغلانا یا ابھارنا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے)
ایک روایت میں ہے:۔
(۷) اَنَّہٗ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ کَانَ یُصَلِّیْ
وَلِجَوْفِہٖ اَزِیْزٌ کَاَزِیْزِ الْمِرْجَلِ کہ آنحضرتؐ نماز
پڑھتے تو آپ کے اندروں سے ہانڈی کے کھد کھدانے
کی (طرح رونے کی) آواز آتی۔ اَزَّہٗ اس کو بھڑکایا اور
جھنجھوڑا یہ ھَزَّہٗ سے ابلغ ہے۔

(ا ز ر)

اصل میں اِزْر اور اِزَار کے معنی لباس
(یعنی تہبند) کے ہیں اِزَارٌ اِزَارَۃٌ وَمِئْزَرَۃٌ
تینوں ہم معنی ہیں کنایہ کے طور پر اِزَارٌ سے
عورت مراد لی جاتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] ؎

(۱۳) اَلَا اَبْلِغْ اَبَا حَفْصٍ رَسُوْلًا
فِدًی لَّکَ مِنْ اَخِیْ ثِقَۃٍ اِزَارِیْ

ابوحفص (حضرت عمرؓ) کو میرا پیغام پہنچا دو تجھ جیسے
قابل اعتماد بھائی پر میری بیوی قربان ہو۔
اور عورت کو اِزَار اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ
مرد کے لئے بمنزلہ لباس کے ہے جیسے فرمایا:۔
ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ (۲-۱۸۷)
وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔
اَلْاَزْرُ کے معنی قوت شدیدہ کے ہیں قرآن میں ہے:۔
اُشْدُدْ بِہٖ اَزْرِیْ (۲۰-۳۱) اس سے میری قوت
کو مضبوط فرما یعنی مجھے اس سے تقویت حاصل ہو گی۔
اٰزَرَہٗ۔ اعانت کرنا اور تقویت بخشنا۔ اصل میں یہ
شَدَّ الْاِزَار سے ہے جس کے معنی ہیں چادر باندھنا
قرآن میں ہے :۔ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔہٗ فَاٰزَرَہٗ
(۴۸-۲۹) وہ گویا ایک کھیتی ہیں جس نے (پہلے)
زمین سے اپنی سوئی نکالی پھر اس کو مضبوط کیا۔
محاورہ ہے :۔ اٰزَرْتُہٗ فَتَاَزَّرَ میں نے اسے
تہبند پہنائی تو اس نے پہن لی۔ ھُوَ حَسَنُ
الْاِزْرَۃِ وہ خوش وضع ہے۔ اٰزَرْتُ الْبِنَاءَ
وَاَزَّرْتُہٗ میں نے عمارت کی بنیاد کو مضبوط

---

[1] قالہ ابو المنہال بقیلۃ الاکبر الاشجعی فی قصیدۃ لہ الی عمرؓ عرض فیہا بجعدۃ بن عبداللہ السلمی والی الکوفۃ والبیت والقصۃ فی اللسان (ازر) فی ستۃ ابیات والمؤتلف للآمدی ۸۲ فی خمسۃ ابیات والابواب مختارۃ ۱۰ والعقد الفرید (۲: ۲۳۴) والفائق (۱: ۱۷) والعمدۃ (۱: ۲۶۲) فی اربعۃ والشکل للقتبی ۱۰۸، ۲۰۵ فی خمسۃ ابیات ومجازات القرآن للشریف الرضی ۳۵۳ والاصابۃ ۲۱، ۷۲۸۸ رقم وکنز العمال بروایۃ ابن سیرین ج ۵ رقم ۴۶۱۸ وفی الصناعتین غیر منسوب ۱۲

کیا تَاٰزَّرَ النَّبَاتُ نبات بڑھ گئی اور مضبوط ہو گئی اٰزَرْتُہٗ وَوَازَرْتُہٗ میں اس کا وزیر بن گیا اصل میں یہ مثال واوی (وزر) سے ہے (جس کے معنی دوسرے کا بوجھ اٹھانا کے ہیں)
فَرَسٌ اٰزَرُ گھوڑا جس کی ٹانگیں محل ازار تک سفید ہوں۔ اور آیت کریمہ :۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ لِاَبِیْہِ اٰزَرَ (۶-۷۴) اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے جب ابراہیمؑ نے اپنے باپ آزر سے کہا۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام تارخ تھا اور آزر اسی کا معرب ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ لقب ہے اور ان کی زبان میں آزر کے معنی گمراہ کے ہیں۔

(ا ز ف)

قرآن میں ہے :۔
اَزِفَتِ الْاٰزِفَۃُ (۵۳-۵۷) یعنی قیامت قریب آپہنچی اَزِفَ وَاَفِدَ دونوں قریب المعنی ہیں قیامت کو اَزِفَ کہنا بلحاظ ضیق وقت کے ہے جیسے کہا جاتا ہے اَزِفَ الشُّخُوْصُ (کوچ کا وقت قریب آپہنچا) اور اَزَفٌ کے معنی ضیق وقت کے ہیں اور قیامت کو اٰزِفَۃٌ کہنا اس کے قرب وقت کے اعتبار سے ہے اور اسی بنا پر اس کو سَاعَۃٌ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ اور نیز آیت کریمہ :۔
اَتٰی اَمْرُ اللّٰہِ (۱۶-۱) خدا کا حکم (یعنی عذاب گویا) آہی پہنچا۔
میں قیامت کو لفظ ماضی کے ساتھ تعبیر کیا ہے نیز فرمایا۔
وَاَنْذِرْھُمْ یَوْمَ الْاٰزِفَۃِ (۴۰-۸) اور ان کو قریب آنے والے دن سے ڈراؤ۔

(ا س ر)

اَلْاَسْرُ کے معنی قید میں جکڑ لینے کے ہیں۔ یہ اَسَرْتُ الْقَتَبَ سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں میں نے پالان کو مضبوطی سے باندھ دیا اور قیدی کو اَسِیْرٌ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ رسی وغیرہ سے باندھا ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔
یَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا (۷۶-۸) اور یتیموں اور قیدیوں کو۔ پھر ہر اس شخص کو جو گرفتار اور مقید ہو کر آئے اسیر کہہ دیا جاتا ہے گو وہ باندھا ہوا نہ ہو اسیر کی جمع اِسَارٰی وَاُسَارٰی واَسْرٰی ہے[1] اور مجازاً۔ اَنَا اَسِیْرُ نِعْمَتِکَ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی تیرے احسان کی رسی میں بندھا ہوا ہوں۔ اور اُسْرَۃُ الرَّجُلِ کے معنی افراد خاندان کے ہیں جن سے انسان قوت حاصل کرتا ہے۔ اور آیت کریمہ : وَشَدَدْنَا اَسْرَھُمْ (۷۶-۲۸) اور ان کی بندش کو مضبوطی سے باندھ دیا۔ میں اس حکمت الٰہی کی طرف اشارہ ہے جو انسان کی ہیئت ترکیبی میں پائی جاتی ہے جس پر کہ آیت وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (۵۱-۲۱) میں غور و فکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔
اَلْاُسْرُ۔ کے معنی ہیں پیشاب بند ہو جانا۔ اور جو شخص اس بیماری میں مبتلا ہو اسے مَاْسُوْرٌ کہا جاتا ہے گویا اس کی پیشاب کی نالی بند کر دی گئی ہے اس کے مقابلہ میں پاخانہ کی بندش پر حُصْرٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

(ا س س)

اَسَّسَ بُنْیَانَہٗ۔ (۹-۱۰۹) کے معنی ہیں اس

[1] قرآن میں ہے وان یاتوکم اُسَارٰی (۲-۸۵)۔ ما کان لنبی ان یکون لہ اسرٰی (۸-۶۷)

نے عمارت کی بنیاد رکھی اور بنیاد کو اُسٌّ وَاَسَاسٌ کہا جاتا ہے۔ اُسٌّ کی جمع اِسَاسٌ اور اَسَاسٌ کی جمع اُسُسٌ آتی ہے محاورہ: ہے کَانَ ذَالِكَ عَلٰى اُسِّ الدَّهْرِ (وہ ابتدائے زمانہ سے موجود ہے) (بود آں بر ہمیشگی زمانہ واول آن) یعنی وہ قدیم زمانہ سے ہے جیساکہ عَلٰى وَجْهِ الدَّهْرِ کا محاورہ مشہور ہے۔

(ا س ف)

اَلْاَسَفُ۔ حزن اور غضب کے مجموعہ کو کہتے ہیں کبھی آسَفَ کا لفظ حزن اور غضب میں سے ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے اصل میں اس کے معنی جذبہ انتقام سے دم قلب کے جوش مارنا کے ہیں۔ اگر یہ کیفیت اپنے سے کمزور آدمی پر پیش آئے تو پھیل کر غضب کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اگر اپنے سے قوی آدمی پر ہو تو منقبض ہو کر حزن بن جاتی ہے اس لئے جب حضرت ابن عباسؓ سے حزن اور غضب کی حقیقت دریافت کی گئی تو انہوں نے فرمایا: لفظ دو ہیں مگر ان کی اصل ایک ہی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے سے کمزور کے ساتھ جھگڑتا ہے تو غیظ و غضب کا اظہار کرتا ہے اور جب اپنے سے قوی کے ساتھ جھگڑتا ہے تو واویلا اور غم کا اظہار کرتا ہے اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے[1] ع البسیط

(۴۸) فَحُزْنُ كُلِّ اَخِيْ حُزْنٍ اَخُو الْغَضَبِ

کہ ہر غمزدہ کا حزن غضب کا ساتھی ہے۔ اور آیت کریمہ: فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ (۴۳-۵۵) کے معنی یہ ہیں کہ جب انہوں نے ہمیں غضب ناک کیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا۔ یہاں ابو عبد اللہ الرضا کا قول ہے کہ اللہ میاں ہماری طرح خفا نہیں ہوتے بلکہ اللہ تعالیٰ کے خفا ہونے سے اس کے اولیاء کا خفا ہونا مراد ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کے معنی اسکے اولیاء کے راضی ہونے کے ہیں۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے[2] (۱۰) مَنْ اھان لی ولیا فقد بارزنی بالمحاربة یعنی جس نے میرے دوست کی اہانت کی اس نے میرے ساتھ جنگ کی۔ اور قرآن میں ہے۔ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴-۸۰) جو شخص رسول کی فرمانبرداری کریگا تو بیشک اسنے خدا کی فرمانبرداری کی۔ اور آیت کریمہ: غَضْبَانَ اَسِفًا (۷-۱۵۰) میں اَسِفٌ کے معنی بھی غضبناک ہی کے ہیں اور استعارہ کے طور پر ماتحت غلام کو نیز جس کا (بوجہ کراہت کے) نام لینا پسند نہ ہو اسے اَسِيفٌ (بیچارہ) کہہ دیا جاتا ہے[3]۔

(ا س ن)

اَسَنَ (ن ض) اَلْمَاءُ پانی کا سخت بدبودار ہو

---

[1] وصدره جزاک ربک بالاحزان مغفرة ...... قاله المتنبی فی رثاء اخت سیف الدولة فی (۴۸) بیتا مطلعها یا اخت خیر اخ یابنت خیر آب کناية بهما عن اشرف النسب راجع دیوانه ۲۱۳ طبقة هندية مصر ۱۳۲۲ھ و بشرح العکبری (۱: ۹۴) والشطر الثانی فی محاضرات المؤلف (۴: ۵۰۶: ۲۲۳) [2] له اصل فی الصحیحین ورواه ابن ابی الدنیا فی کتاب الاولیاء والحکیم الترمذی فی جامعه وابن مردویة حل فی الاسماء وابن عساکر عنها انس انظر للحدیث باختلاف الفاظه کنز العمال (ج ۱ رقم ۵۶ (۱۱۶۹ و ۱۱۶۲ و ۱۱۶۴-۱۲۰) ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴

[3] ایضا اسفی وفی القرآن یا اسفٰی علی یوسف (۱۲-۸۴) ایضا رجل اسیف ای سریع الحزن والبکاء کما فی حدیث عائشة: ان ابا بکر رجل اسیف راجع الفائق ۱/۱۹ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴ ∴

ہو جانا مَاءٌ اٰسِنٌ متغیر اور بدبودار پانی چنانچہ فرمایا۔ مِنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ (۴۷-۱۵) اس پانی کی نہریں ہیں) جو کبھی بدبودار نہیں ہوگا۔

أَسِنَ الرَّجُلُ پانی کی بدبو سے بیمار اور بیہوش ہونا شاعر نے کہا ہے[1]

(۱۵) يَمِيدُ فِي الرُّمْحِ مَيْدَ الْمَائِحِ الْأَسِنِ

نیزے پر اس طرح تڑپتا ہے جیسے کنویں میں اترنے والا بیہوش آدمی تڑپ رہا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ تشبیہ کے طور تَأَسَّنَ الرَّجُلُ محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی بیمار پڑنے کے ہیں

(ا س و)

اَلْاُسْوَةُ وَالْاِسْوَةُ (قُدْوَةٌ اور قِدْوَةٌ کی طرح) انسان کی اس حالت کو کہتے ہیں جس میں وہ دوسرے کا متبع ہوتا ہے خواہ وہ حالت اچھی ہو یا بری، سرور بخش ہو یا تکلیف دہ اسی لیے آیت کریمہ:۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳-۲۱) تمہارے لئے پیغمبر خدا میں اچھا اسوہ ہے۔ میں اُسْوَةٌ کی صفت حَسَنَةٌ لائی گئی ہے[2]۔

تَأَسَّيْتُ بِهٖ میں نے اس کی اقتدار کی۔

اَلْاَسٰی بمعنی حزن آتا ہے اصل میں اس کے معنی کسی فوت شدہ چیز پر غم کھانا ہوتے ہیں۔ أَسِيْتُ عَلَيْهِ اَسًى وَاَسِيْتُ لَهٗ۔ کسی چیز پر غم کھانا قرآن میں ہے:۔ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۵-۶۸) تو تم قوم کفار پر افسوس نہ کرو۔

شاعر نے کہا ہے[3] ع

(۱۶) " أَسِيْتُ لِاَخْوَالِيْ رَبِيْعَة

میں نے اپنے اخوال بنی ربیعہ پر افسوس کیا۔ یہ اصل میں (ناقص) واوی سے ہے کیونکہ محاورہ ہیں غمگین آدمی کو اَسْوَانُ (بالفتح) کہا جاتا ہے۔

اَلْاَسْوُ کے معنی زخم کا علاج کرنے کے ہیں۔ اصل میں اس کے معنی ازالۂ غم کے ہیں اور یہ كَرَّبْتُ النَّخْلَ کی طرح ہے جس کے معنی کھجور کے درخت کی شاخوں کی جڑوں کو دور کرنے کے ہیں کہا جاتا ہے اَسَوْتُهٗ اَسْوًا وَّاَسْوًا از باب نصر یعنی میں نے اس کا غم دور کیا اس کو تسلی دی۔

اَلْاٰسِيْ معالج۔ مرہم پٹی کرنے والا اس کی جمع اِسَاءٌ وَّاُسَاةٌ ہے اور زخمی آدمی کو مَاْسِيٌّ وَّاَسِيٌّ کہا جاتا ہے۔ اَسَيْتُ بَيْنَ الْقَوْمِ باہم صلح کرانا۔

اٰسَيْتُهٗ (مفاعلہ) کسی کے ساتھ ہمدردی کرنا۔ (مال وغیرہ کے ذریعہ)۔ شاعر نے کہا ہے[4] ع

(۱۷) " آسٰی اَخَاهُ بِنَفْسِهٖ (طویل)"

جس نے خود کو اپنے بھائی پر نثار کر دیا ہو۔

---

[1] قال زہیر السلمی وصدرہ: وقد اترک القرن مصفرا انامله ۔۔۔ وفی روایۃ اللسان (اسن) یغادر بدل اترک وہو الصواب لانہ من صفۃ الممدوح ای ابن سنان راجع للبیت ملحقات دیوانہ ۴۱۹ والعقد الثمین والمختارات ۵۲ والسمط (۱: ۱۹۹) والبحر (۲: ۷۰) والطبرسی (۲-۴۳) وفی روایۃ التارک القرن مصفرا انامله ویمیل بدل یمید [2] نیز فرمایا: قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراہیم والذین معہ (۶۰-۴) [3] قطعۃ من البیت قالہ البحتری فی قصیدۃ لہ فی ۵۴ بیتا یمدح المتوکل ویذکر صلح بنی تغلب وتمامہ ۔۔۔ ان عفت مصایفہا واقوت ربوعہا والبیت فی الحصری (۱: ۱۱۱) وفی روایۃ دیوانہ ۸۴۶ بشرح حسن کامل صیرفی۔ اذا عفت بدل ان عفت ومصانعہا بدل مصایفہا [4] قطعۃ من البیت من قصیدۃ جمہریۃ فی ۲۵ بیتا قالہا درید بن الصمۃ احد بنی بکر بن جشم فی رثاء اخیہ عبد اللہ وتکملتہ۔ قتال امرء آسی اخاہ بنفسہ ویعلم ان المرء غیر مخلد۔ والبیت فی الجمہرۃ ۲/۲ والشعر النساء فی اشعار حلیلۃ والعمدۃ لابن رشیق (۲: ۱۳۷) ودرید ہذا شاعر شجاع فارس قتل یوم حنین مع المشرکین (بنی ہوازن) راجع المعمرین ۲۱-۲۲ والاشتقاد ۱۷۷-۱۸۰ والاغانی ۹-۲-۱۹ والالیٰ ۳۹-۴۰ والموتلف ۱۱۳ والخزانۃ ۴: ۴۴۶-۴۴۷ / ۲۱۳-۲۱۶ والمیزۃ ۸۴۲-۸۴۸ (جو تیغون) والشعراء ۷۲۵-۷۲۹:

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے[1]

(۱۸) " فَآمنی و آداہ فکان کمن جنیٰ "
اس نے ہمدردی کی اور سامان حرب دیا تو گویا اس جنایت کی۔
یہاں آمنی بروزن فاعَلَ ہُوا سی سے ہے اسی طرح شاعر کے قول[2]

(۱۹) یکفون اثقالَ ثائی المستآسی "
المستآسی بروزن مستفعل بھی اسی مادہ سے مگر اَلْاِسَاءَۃُ (افعال) جس کے معنی تکلیف پہنچانے کے ہیں اس مادہ سے نہیں ہے بلکہ سَاءَ (س وء) سے منقول ہے۔

(ا ش ر)

اَلْاَشَرُ بہت زیادہ اترانا اَشِرَ یا شَرُ اَشَرًا (س) (اَلْاَشِرَ بہت زیادہ اترانے والا) قرآن میں ہے: سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ (۵۴-۲۶) ان کو کل ہی معلوم ہو جائیگا کہ کون جھوٹا خود پسند ہے۔ پس اَشَرٌ۔ بَطَرٌ سے ابلغ ہے اور بَطَرٌ میں فَرَحٌ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے اور فَرَحٌ اگرچہ عام حالات میں مذموم ہوتا ہے جس طرح کہ قرآن میں ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ (۲۸-۷۶) کہ خدا اترانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔
لیکن ایسے موقع پر جب خوشی کا اظہار ضروری ہو اور وہ اظہار بھی جب ضرورت ہو تو فرحت ممدوح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے: فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (۱۰-۵۸) تو چاہیئے کہ لوگ اس سے خوش ہوں۔ کیونکہ کبھی سرور کی وجہ سے فرحت کا حصول تقاضائے عقل کے مطابق ہوتا ہے مگر اَشَرٌ اس فرحت کو کہتے ہیں جو مبنی بر ہوائے نفس ہو اور اسی سے بطور تشبیہ نَاقَةٌ مُئْشِيْرٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی چست اونٹنی کے ہیں۔ اور اس کے معنی دبلی اونٹنی بھی آتے ہیں اس صورت میں یہ اَشَرْتُ الْخَشَبَةَ سے ماخوذ ہوگا جسکے معنی لکڑی چیرنا کے ہیں۔

(ا ص ب ع)

اَلْاِصْبَعُ (انگلی) کا لفظ انگلی کی ہڈی ناخن بالائی سرا خم اور جوڑ کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے[3]۔ اور بطور استعارہ ظاہری احسان کے معنی میں آتا ہے چنانچہ لَكَ عَلَيْهِ يَدٌ کی طرح لَكَ عَلٰى فُلَانٍ اِصْبَعٌ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے[4]

(ا ص ر)

اَلْاَصْرُ۔ (ض) کے اصل معنی کسی چیز میں گرہ لگانے اور اس کو زبردستی روک لینا کے ہیں اَصَرَ يَاْصِرُ اِصْرًا فَهُوَ مَاصُوْرٌ اور مَاْصَرٌ وَمَاْصِرٌ بندرگاہ پر جہاز کھڑا کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ (۷-۱۵۷) اور ان پر سے بوجھ... اتارتے ہیں -

---

[1] قالہ سوید المراثد الحارثی وصدرہ: ولم یجنها ولکن جناها ولیها - وفی البیت آداہ (بالمهملة) من الاداۃ ای عدۃ الحرب آداہ اصلہ عداہ بالعین فابدلت ہمزۃ (راجع المرزوقی ص ۸۱۰ رقم ۲۷۱، والکامل ۲ - ۲۰۲ فی ۱۵ ابیات والعیون ۱ - ۱۹ واللسان (جنی) وفی النسخ المطبوعۃ اذاہ (بالمعجمۃ) مصحف۔ [2] لم اجدہ

[3] وجمعہ اصابع راجع الآیۃ (۲-۱۹)

یہاں اِصْرٌ سے وہ دشواریاں مراد ہیں جو خیرات اور ثواب تک پہنچنے سے اِن کے لئے رکاوٹ بنی ہوئی تھیں اور آیت :-
وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا (۲-۲۸۶) میں بھی اِصْرٌ اسی معنی پر محمول ہے۔ بعض کا قول ہے کہ اِصْرٌ کے معنی بوجھ کے ہیں۔ لیکن اس کی حقیقت وہی ہے جو ہم نے بیان کر دی ہے۔
نیز اِصْر اس عہد موکد کو بھی کہتے ہیں جو خلاف ورزی کرنے والے کو ثواب اور خیرات سے روک دے چنانچہ قرآن میں ہے :-
ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ (۳-۸۱) بھلا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا پختہ عہد لیا۔
اَلْاِصَارُ رسی یا میخ جن کے سہارے پر خیمہ کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ مَا يَاْصِرُنِىْ عَنْكَ شَيْءٌ مجھے تیرے پاس پہنچنے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔
اَلْاَيْصَرُ۔ وہ کمبل جس میں خشک گھاس بھر کر اونٹ کی کوہان کے گرد لپیٹا جاتا ہے تاکہ اس پر آسانی کے ساتھ سواری ہو سکے۔

(ا ص ل)

اَصْلُ الشَّيْءِ (جڑ) کسی چیز کی اس بنیاد کو کہتے ہیں کہ اگر اس کا ارتفاع فرض کیا جائے تو اس شے کا باقی حصہ بھی معلوم ہو جائے قرآن میں ہے :- اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِى السَّمَآءِ (۱۴-۲۵) اِس کی جڑ زمین میں پختگی سے جمی ہے اور شاخیں آسمان میں۔ اور تَاَصَّلَ كَذَا کے معنی کسی چیز کے جڑ پکڑنا ہیں اس سے اصل اور خاندانی بزرگی مجد اَصِيْلٌ کہا جاتا ہے۔ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ لَا اَصْلَ لَهٗ وَلَا فَصْلَ یعنی نیست اورا حسب و نہ زبان۔
اَلْاَصِيْلُ وَالْاَصِيْلَةُ کے معنی (عَشِيَّةٌ) عصر اور مغرب کے درمیانی وقت کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ سَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (۳۳-۴۲) اور صبح و شام کی تسبیح بیان کرتے رہو۔
اَصِيْلٌ کی جمع اُصُلٌ و اٰصَالٌ اور اَصِيْلَةٌ کی جمع اَصَائِلُ ہے قرآن میں ہے۔ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ (۷-۲۰۵) صبح اور شام

(ا ف ف)

اَلْاُفُّ۔ اصل میں ہر گندی اور قابل نفرت چیز کو کہتے ہیں میل کچیل اور ناخن کا تراشہ وغیرہ اور محاورہ میں کسی بری چیز سے اظہار نفرت کے لئے یہ لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے: اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۲۱-۶۷) تف ہے تم پر اور جنہیں تم خدا کے سوا پوجتے ہو ان پر بھی۔
اَفَّفْتُ بِكَذَا کسی چیز سے کراہت ظاہر کرنا اُفٍّ کہنا۔ اسی سے اَفَّفَ فُلَانٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی مکروہ چیز سے دل برداشتگی کا اظہار کرنے کے ہیں۔

(ا ف ق)

اَلْاُفُقُ۔ کنارہ جمع آفَاقٌ۔ قرآن میں ہے: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ (۴۱-۵۳) ہم عنقریب ان کو اطراف (عالم) میں بھی... نشانیاں دکھائیں گے آفاق کے معنی اطراف کے ہیں اس کا واحد اُفُق وَاُفْق ہے[1] اور نسبت کے وقت اُفُقِيٌّ کہا جاتا ہے اور

---

[1] و فی القرآن ولقد راٰہ بالافق المبین (۸۱-۲۳) وھو بالافق الاعلیٰ (۵۳-)

اَفِقٌ فُلَانٌ کے معنی آفاق (اطراف عالم) میں جانے کے ہیں اور افق کے اطراف میں انتہائی بُعد اور وسعت سے تشبیہ کے طور پر اُفِقٌ کا لفظ انتہائی سخی پر بولا جاتا ہے۔

(ا ف ک)

اَلْاِفْكُ۔ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنے صحیح رخ سے پھیر دی گئی ہو۔ اسی بناء پر ان ہواؤں کو جو اپنا اصلی رخ چھوڑ دیں مُؤْتَفِکَةٌ کہا جاتا ہے اور آیات کریمہ:۔ وَالْمُؤْتَفِکَاتُ بِالْخَاطِئَةِ (۶۹-۹) اور وہ الٹنے والی بستیوں نے گناہ کے کام کئے تھے۔
وَالْمُؤْتَفِکَةَ اَهْوٰی (۵۳-۵۳) اور الٹی ہوئی بستیوں کو دے پٹکا۔ (میں مُؤتفکات سے مراد وہ بستیاں جن کو اللہ تعالیٰ نے مع ان کے بسنے والوں کے الٹ دیا تھا)
قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ (۹-۳۰) خدا ان کو ہلاک کرے۔ یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں۔ یعنی اعتقاد حق سے باطل کی طرف اور سچائی سے جھوٹ کی طرف اور اچھے کاموں سے برے افعال کی طرف پھر رہے ہیں۔ اسی معنی میں فرمایا:۔ یُؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ (۵۱-۹) اس سے وہی پھرتا ہے جو (خدا کی طرف سے) پھیرا جائے۔
فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ (۶-۹۵) پھر تم کہاں بہکے پھرتے ہو۔ اور آیت کریمہ:۔ اَجِئْتَنَا لِتَاْفِکَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا (۴۶-۲۲) کیا تم ہمارے پاس اسلئے آئے ہو کہ ہمارے معبودوں سے پھیر دو۔
میں اِفك کا استعمال ان کے اعتقاد کے مطابق ہوا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے اعتقاد میں آلہۃ کی عبادت ترک کرنے کو حق سے برگشتگی سمجھتے تھے۔
جھوٹ بھی چونکہ اصلیت اور حقیقت سے پھرا ہوتا ہے اس لئے اس پر بھی اِفْكٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔ اِنَّ الَّذِیْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْکُمْ (۲۴-۱۱) جن لوگوں نے بہتان باندھا ہے تمہیں لوگوں میں سے ایک جماعت ہے۔
لِکُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍ (۴۵-۷) ہر جھوٹے گنہگار کے لئے تباہی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ اَئِفْکًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِیْدُوْنَ (۳۷-۸۶) کیوں جھوٹ (بنا کر) خدا کے سوا اور معبودوں کے طالب ہو۔
میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِفْکًا مفعول لہٗ ہو اَیْ اٰلِهَةً مِنَ الْاِفْكِ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اِفْکًا تُرِیْدُوْنَ کا مفعول ہو اور اٰلِهَةً اس سے بدل ۔۔۔ اور باطل معبودوں کو (مبالغہ کے طور پر) اِفْکًا کہہ دیا ہو[1]۔
اور جو شخص حق سے برگشتہ ہو اسے مَاْفُوْكٌ کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے[2] (منسرح)

(۲۰) فَاِنْ تَكُ عَنْ اَحْسَنِ الْمُرُوْءَةِ مَاْفُوْ
كًا فَفِیْ آخَرِیْنَ قَدْ اُفِکُوْا

اگر تو حسن مروت کے راستہ سے پھر گیا ہے تو تم ان لوگوں میں ہو جو برگشتہ ہوچکے ہیں۔
اُفِكَ الرَّجُلُ یُؤْفَكُ کے معنی دیوانہ اور باؤلا ہونے کے ہیں اور باؤلے آدمی کو مَاْفُوْكُ الْعَقْلِ کہا جاتا ہے

---

[1] ذکر الزمخشری ہہنا ثلاثۃ اوجہ من الاعراب اختاف ذکرہما المؤلف والثالث ان یکون افکا حالا من ضمیر الفاعل ۴ ۹۴؛ طبع مصر۔
[2] قالہ عمرو بن اذینہ والبیت فی اللسان والصحاح (انک) والطبرسی (۲۶-۱۹) وشواہد الکشاف ۸۷ وتہذیب الاصلاح (۱: ۳۴) والاصلاح ۲۳ وتہذیب الالفاظ ۵۵۲ والبحر ۳: ۵۰۶/۷: ۴۹۴ والغریب القتبی ۳۰

(ا ف ل)

اَلْاُفُوْلُ کے معنی ماہتاب اور نجوم (وغیرہ نیّرات) کے غروب ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ فَلَمَّا اَفَلَ قَالَ لَا اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ (۶-۷۶) جب وہ غائب ہوگیا تو کہنے لگے کہ مجھے غائب ہو جانے والے پسند نہیں۔

فَلَمَّا اَفَلَتْ (۶-۷۸) مگر جب وہ بھی غروب ہوگیا۔

بعبض بکری کے چھوٹے بچوں کو اِفال اور اونٹ کے کمزور اور چھوٹے بچے کو اَفِیْلٌ کہا جاتا ہے۔

(ا ک ل)

اَلْاَکْلُ کے معنی کھانا تناول کرنے کے ہیں اور مجازاً اَکَلَتِ النَّارُ الْحَطَبَ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی آگ نے ایندھن کو جلا ڈالا۔ اور جو چیز بھی کھائی جائے اسے اُکُلٌ (بضم کاف وسکونا) کہا جاتا ہے ارشاد ہے اُکُلُهَا دَائِمٌ (۱۳-۳۵) اسکے پھل ہمیشہ قائم رہنے والے ہیں۔

اَلْاَکْلَةُ مرۃ کا صیغہ ہے یعنی ایک مرتبہ کھانا اور اَلْاُکْلَةُ بمعنی لُقْمَةٌ ہے۔

اَکِیْلَةُ الْاَسَدِ شیر کا شکار کیا ہوا جانور جسے وہ کھا جاتا ہے۔

اَلْاَکُوْلَةُ بکری جو کھانے کیلئے موٹی کی گئی ہو۔

اَلْاُکِیْلُ ہم پیالہ کو کہتے ہیں اور استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ مُؤْکَلٌ وَمُطْعَمٌ (کنایہ مالدار تونگر۔

ثَوْبٌ ذُوْ اُکُلٍ سخت بنا ہوا کپڑا۔ گھنی بناوٹ کا کپڑا۔

اَلتَّمْرُ مَأْکَلَةٌ لِلْفَمِ کھجور خوردنی چیز ہے۔ قرآن میں ہے:۔ ذَوَاتَیْ اُکُلٍ خَمْطٍ (۳۴-۱۶) اور کبھی اُکُلٌ کا لفظ نصیب پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے فُلَانٌ ذُوْ اُکُلٍ مِنَ الدُّنْیَا یعنی وہ دنیا سے بہرہ یاب ہے

اِسْتَوْفَی فُلَانٌ اُکُلَهٗ کنایہ از موت یعنی رزق پورا لے لیا۔

اَکَلَ فُلَانٌ فُلَانًا اس نے فلاں کی غیبت کی اور یہی معنی اَکَلَ لَحْمَهٗ کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا (۴۹-۱۲) کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔

شاعر نے کہا ہے[ل] (طویل)

(۲۱) فَاِنْ کُنْتُ مَاْکُوْلًا فَکُنْ اَنْتَ اٰکِلِیْ۔

اگر مجھے کھایا جانا ہے تو تم خود ہی کھالو۔

مَا ذُقْتُ اُکْلًا میں نے کوئی چیز نہیں کھائی اور چونکہ کھانے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت مال کی ہوتی ہے اس لئے اَلْاَکْلُ کے معنی مال خرچ کرنا بھی آجاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:۔ وَلَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ (۴-۲۹) ایک دوسرے کا مال ناحق صرف نہ کرو۔ اور آیت:۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ

[ل] قالہ الممزق العبدی حینما غضب علیہ النعمان بن المنذر عمرو بن ہند وتمامہ .... والا فادرکنی ولما امزق وفی اللسان امزق) خیر آکل بدل انت آکلی والبیت ایضًا فی اللسان (اکل) وذیل امالی المرتضیٰ (۱-۳۲۵) والکامل للمبرد (۱: ۱۸) والسیوطی ۱۰ والاصمعیات ۵۸ والاشباہ والنظائر (۲: ۲۲۲) فی بحث الفرق بین لم ولما والبحر (۷-۵۵) والمؤتلف للآمدی ۲۸۳ وکتب عثمان ایام الفتنۃ الی علیؓ متمثلا یستنجدہ وختم ہذا البیت انظر العمدۃ (۱: ۷۴، ۲۵۶) وابن ہشام (۱: ۳۰۹) والحوراب ثلاثین ۲۰۲ والحصری (۱: ۷۵) وامالی ابن الشجری (۱: ۱۳۵) والعقد (۳-۱۹۳-۱۹۴) والعیون (۱: ۱۴۳) والیضًا السیوطی ۲۳۳ والشاعر اسمہ شاس بن نہار العبدی ولقب بالممزق لقولہ فی ہذا البیت (وما امزق)، راجع الآمدی ۱۸۵-۱۸۶

اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا (۴-۱۰) میں یتامیٰ کا مال کھانے سے اس کو ناجائز طور پر صرف کرنا مراد ہے اور پھر بعد میں اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا (۴-۱۰) کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ یہ انہیں جہنم میں لے جائیگا۔

اَلْاَکُوْلُ وَالْاَکَّالُ (مبالغہ) زیادہ کھانے والا۔ قرآن میں ہے:۔

اَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (۵-۴۲) اور رشوت کا حرام مال بہت زیادہ کھانے والے ہیں۔

۲ کِلٌ کی جمع اَکَلَةٌ ہے محاورہ ہے ھُمْ اَکَلَةُ رَاْسٍ۔ یعنی وہ تعداد میں اتنے کم ہیں کہ ایک بکری کا ایک سر ہی انہیں کافی ہے[1]۔ کبھی اَکْلٌ کے معنی خراب کرنا بھی آجاتے ہیں (یعنی کھانے کے بعد جو خراب سا رہ جاتا ہے) جیسے فرمایا۔ کَعَصْفٍ مَّاْکُوْلٍ یعنی کھایا ہوا بھس۔

تَاَکَّلَ کَذَا۔ کسی چیز کا خراب ہوجانا اَصَابَهٗ اُکَالٌ فِیْ رَاْسِهٖ وَفِیْ اَسْنَانِهٖ سر کا کھجلی اور دانتوں کا خوردہ سے خراب ہوجانا واکلنی راسی یعنی میرے سر کے بال جھڑ گئے مِیْکَائِیْل ایک فرشتے کا نام ہے اور یہ عربی لفظ نہیں ہے۔

(ا ل ل)

اَلْاِلُّ ہر وہ صاف اور ظاہری حالت جس کا انکار ناممکن ہو، عہد قرابت داری۔ قرآن میں ہے:۔ لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (۹-۱۰) یہ لوگ کسی مؤمن کے حق میں نہ تو رشتہ داری کا پاس کرتے ہیں نہ عہد کا۔

اَلَّ الْفَرَسُ گھوڑے کا تیز چلنا اس کے اصل معنی چمکنے کے ہیں اور پھر تیز روی کے لئے بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے جیسے کہ بَرَقَ و طَارَ کے الفاظ ہیں۔ اَلْاَلَّةُ چمکدار برچھا اَلَّ بِهَا اس نے نیزہ یا برچھا سے مارا اور اسی سے تیز کان کو اُذُنٌ مُؤَلَّلَةٌ کہا جاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اِلٌّ و اِیْلٌ اسماء حسنیٰ سے ہیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اَلْاِلَالُ چھری کے دونوں پہلو

(ا ل ف)

اَلْاَلِفُ۔ حروف تہجی کا پہلا حرف ہے[1] اور اَلْاَلِفُ (ض) کے معنی ہیں ہم آہنگی کے ساتھ جمع ہونا۔ محاورہ ہے:۔ اَلَفْتُ بَیْنَهُمْ میں نے ان میں ہم آہنگی پیدا کردی اور اسی سے اُلْفَةٌ (بمعنی محبت) ہے اور کبھی ہر مالوف چیز کو اِلْفٌ و آلِفٌ کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔ اِذْ کُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ (۳-۱۰۳) جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ (۸-۶۳) اگر تم دنیا بھر کی دولت خرچ کرتے تب بھی ان کے دلوں میں الفت پیدا نہ کرسکتے

اور مُؤَلَّفٌ اس مجموعہ کو کہتے ہیں جس کے مختلف اجزاء کو یکجا جمع کردیا گیا ہو اور ہر جزء کو تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے اس کی صحیح جگہ پر رکھا گیا ہو۔ اور آیت کریمہ:۔

لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ (۱۰۶-۱) قریش کے مالوف کرنے کے سبب میں اِیْلَافٌ (افعال) کا مصدر ہے اور آیت:۔ وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ (۹-۶۰)

---

[1] راجع البحث عن حروف الہجاء المتقدم ص ۲ وایضاً (اوک)

ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے۔ میں مُؤَلَّفَۃُ الْقُلُوْبِ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی بہتری کا خیال رکھا جائے حتیٰ کہ وہ ان لوگوں کی صف میں داخل ہو جائیں جن کی وصف میں قرآن نے لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ فرمایا ہے یعنی مخلص مسلمان ہو جائیں۔

اَوَالِفُ الطَّیْرِ مانوس پرندے جو گھروں میں رہتے ہیں۔

اَلْاَلْفُ۔ ایک خاص عدد (ہزار) کا نام ہے اور اسے اَلْفٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں اعداد کے تمام اقسام جمع ہو جاتے ہیں کیونکہ اعداد کی چار قسمیں ہیں۔ اکائی، دہائی، سینکڑہ، ہزار تو اَلْفٌ میں یہ سب اعداد جمع ہو جاتے ہیں اس کے بعد جو عدد بھی ہو وہ مکرر آتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ الف حروف تہجی بھی اسی سے ہے کیونکہ وہ مبدأ انتظام بنتا ہے۔ اَلَفْتُ الدَّرَاهِمَ میں نے درہموں کو ہزار کر دیا جس طرح مَاءَیْتُ کے معنی ہیں میں نے انہیں سو کر دیا۔ اٰلَفْتُ وہ ہزار کو پہنچ گئے جیسے اَمْاَتْ سو تک پہنچ گئے

(ا ل ك)

اَلْمَلٰٓئِکَۃُ (فرشتے) اور مَلَکٌ اصل میں مَاْلَکٌ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ مَلْاَکٌ سے مقلوب ہے اور مَاْلَکٌ وَمَاْلَکَۃٌ وَاَلُوْکٌ کے معنی رسالت یعنی پیغام کے ہیں اسی سے اَلِکْنِیْ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں "اسے میرا پیغام پہنچا دو"۔

اَلْمَلٰٓئِکَۃُ کا لفظ (اسم جنس ہے اور) واحد و جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا (۲۲-۷۵) خدا فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والے منتخب کر لیتا ہے۔ خلیل نے کہا ہے کہ مَاْلُکَۃٌ کے معنی ہیں پیغام اور اسے (مَاْلُکَۃ) اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی منہ میں چبایا جاتا ہے اور یہ فَرَسٌ یَاْلُکُ اللِّجَامَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں گھوڑے کا منہ میں لگام کو چبانا۔

(ا ل م)

اَلْاَلَمُ کے معنی سخت درد کے ہیں کہا جاتا ہے اَلِمَ یَاْلَمُ (س) اَلَمًا فَھُوَ اٰلِمٌ قرآن میں ہے:۔ فَاِنَّهُمْ یَاْلَمُوْنَ کَمَا تَاْلَمُوْنَ (۴-۱۰۴) تو جس طرح تم شدید درد پاتے ہو اسی طرح وہ بھی شدید درد پاتے ہیں۔

اٰلَمْتُ فُلَانًا میں نے فلاں کو سخت تکلیف پہنچائی۔ اور (آیت کریمہ):۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۲-۱۰) میں اَلِیْمٌ بمعنی مُؤْلِمٌ ہے یعنی دردناک۔ دکھ دینے والا۔ اور (آیت):۔ اَلَمْ یَاْتِکُمْ (۶-۱۳۰) کیا تم کو... نہیں پہنچی۔ میں الف استفہام کا ہے جو لَمْ پر داخل ہوا ہے (یعنی اس مادہ سے نہیں ہے)

(ا ل ہ)

اَللّٰهُ (۱) بعض کا قول ہے کہ اَللّٰهُ کا لفظ اصل میں اِلٰهٌ ہے ہمزہ (تخفیفًا) حذف کر دیا گیا ہے اور اس پر الف لام (تعریف) لا کر باری تعالیٰ کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے اسی تخصیص

کی بنا پر فرمایا۔ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا (۱۹-۶۵) کیا تمہیں اس کے کسی ہمنام کا علم ہے۔

اِلٰهٌ کا لفظ عام ہے اور ہر معبود پر بولا جاتا ہے (خواہ وہ معبود برحق ہو یا معبود باطل) اور وہ سورج کو اَلْاٰلِهَة کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ انہوں نے اس کو معبود بنا رکھا تھا۔

اِلٰهٌ کے اشتقاق میں مختلف اقوال ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلَهَ (ف)، یَأْلَهُ فُلَانٌ وَتَأَلَّهَ سے مشتق ہے جس کے معنی پرستش کرنا کے ہیں اس بنا پر اِلٰه کے معنی ہوں گے معبود اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلِهَ (س) بمعنی تحیر سے مشتق ہے اور باری تعالیٰ کی ذات وصفات کے ادراک سے چونکہ عقول متحیر اور درماندہ ہیں اس لئے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امیر المؤمنین حضرت علیؓ نے فرمایا ہے[1]۔ كَلَّ دُوْنَ صِفَاتِهٖ تَحْبِيْرُ الصِّفَاتِ وَضَلَّ هُنَاكَ تَصَارِيْفُ اللُّغَاتِ۔

اے بروں از وہم وقال وقیل من
خاک بر فرق من وتمثیل من

اس لئے کہ انسان جس قدر صفات الٰہیہ میں غور و فکر کرتا ہے اس کی حیرت میں اضافہ ہوتا ہے اس بنا پر آنحضرتؐ نے فرمایا ہے[2] (۱۱) تَفَكَّرُوْا فِيْ آلَاءِ اللّٰهِ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِي اللّٰهِ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں غور و فکر کیا کرو اور اس کی ذات کے متعلق مت سوچا کرو۔

(۲) بعض نے کہا ہے کہ اِلٰه اصل میں وِلَاهٌ ہے واؤ کو ہمزہ سے بدل کر اِلاہ بنالیا ہے اور وَلِهَ (س) کے معنی عشق ومحبت میں وارفتہ اور بیخود ہونے کے ہیں[3] اور ذات باری تعالیٰ سے بھی چونکہ تمام مخلوق کو والہانہ محبت ہے اس لئے اسے اللہ کہا جاتا ہے اگرچہ بعض چیزوں کی محبت تسخیری ہے جیسے جمادات اور حیوانات اور بعض کی تسخیری اور ارادی دونوں طرح ہے جیسے بعض انسان۔ اسی لئے بعض حکماء نے کہا ہے کہ ذات باری تعالیٰ تمام اشیاء کو محبوب ہے اور آیت کریمہ۔ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (۱۷-۴۴) مخلوقات میں سے کوئی چیز نہیں ہے مگر اس کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرتی ہے۔ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

(۳) بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں لَاهَ يَلُوْهُ لِيَاهًا سے ہے جس کے معنی پردہ میں چھپ جانا کے ہیں اور ذات باری تعالیٰ بھی نگاہوں سے مستور اور محجوب ہے اس لئے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (۶-۱۰۳) وہ ایسا ہے کہ نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔

نیز آیت کریمہ:۔ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (۵۷-۳) میں الباطن" کہہ کر بھی اسی معنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

---

[1] نہج متفق قال رضی اللہ عنہ فی خطبتہ الغراء والخطبۃ بطولہا فی العقد وفیہ "صفتہ" بدل صفاتہ وایضا ابن الحدید [2] انظر الحدیث للسان (۱۱۱) و وابوالشیخ علس، عد جیب عن ابن عمرؓ) وفی روایۃ فی خلق اللہ وعل عن ابن عباس وابوالشیخ عن ابی ذر) ورد فی کل قسیۃ وابوالشیخ فی العظمۃ عن ابن عباس) راجع کنز العمال ۳/۵۷۷-۵۸۱ ومعناہ ۵۸۶-۵۸۷ وابوالشیخ فی العظمۃ حل عن عبد اللہ بن سلام [3] نسبہ الطبرسی الی ابی عمرو

الله یعنی معبود درحقیقت ایک ہی ہے اس لئے ہونا یہ چاہیئے تھا کہ اس کی جمع نہ لائی جائے لیکن اہل عرب نے اپنے اعتقاد کے مطابق بہت سی چیزوں کو معبود بنا رکھا تھا اس لئے اٰلِهَة صیغہ جمع استعمال کرتے تھے۔ قرآن میں ہے:۔ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِنْ دُوْنِنَا (۲۱-۴۳) کیا ہمارے سوا ان کے اور معبود ہیں کہ ان کو مصائب سے بچالیں۔

وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ (۷-۱۲۷) اور آپ سے اور آپ کے معبودوں سے دست کش ہوجائیں۔ ایک قرأت میں وَاِلَاهَتَكَ ہے جس کے معنی عبادت کے ہیں لَاهِ اَنْتَ۔ یہ اصل میں لِلّٰهِ اَنْتَ ہے ایک لام کو تخفیف کے لئے حذف کردیا گیا ہے۔

اَللّٰهُمَّ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی یا اللہ کے ہیں اور اس میں میم مشدد یا (حرف ندا) کے عوض میں آیا ہے اور بعض کا قول ہے کہ یہ اصل میں یَا اللّٰهُ اُمَّنَا بِخَيْرٍ (اے اللہ تو خیر کے ساتھ ہماری طرف توجہ فرما) ہے (کثرت استعمال کی بنا پر) ... حَيَّهَلَا کی طرح مرکب کرکے اَللّٰهُمَّ بنا لیا گیا ہے۔[1] (جیسے هَلُمَّ)

اِلٰی۔ حرف (جر) ہے اور جہات ستہ میں سے کسی جہت کی نہایۃ حد بیان کرنے کے لئے آتا ہے۔

(ا ل و)

اَلَوْتُ فِی الْاَمْرِ کے معنی ہیں کسی کام میں کوتاہی کرنا گویا کوتاہی کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس امر کی انتہا ہی ہے۔ اور اَلَوْتُ فُلَانًا کے معنی اَوْلَيْتُهٗ تَقْصِيْرًا (میں نے اسے کوتاہی کا والی بنا دیا) کے ہیں جیسے كَسَبْتُهٗ اَیْ اَوْلَيْتُهٗ كَسْبًا (میں نے اسے کسب کا والی بنادیا) مَا اَلَوْتُهٗ جُهْدًا میں نے مقدور بھر اس سے کوتاہی نہیں کی اس میں جهدًا تمیز ہے جس طرح مَا اَلَوْتُهٗ نُصْحًا میں نُصْحًا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا (۳-۱۱۸) یعنی یہ لوگ تمہاری خرابی چاہنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔ اور آیت کریمہ: وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ (۲۴-۲۲) اور جو لوگ تم میں سے صاحب فضل (اور صاحب وسعت) ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہ اَلَوْتُ سے باب افتعال ہے اور بعض نے اَلَيْتُ بمعنی حَلَفْتُ سے مانا ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکرؓ کے متعلق نازل ہوئی تھی جب کہ انہوں نے قسم کھائی تھی کہ وہ آئندہ مسطح کی مالی امداد نہیں کریں گے۔ لیکن اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ صیغہ افتعال اَفْعَلَ (مزید فیہ) سے نہیں آتا بلکہ فَعَلَ (مجرد) سے بنایا جاتا ہے جیسے:۔ كَسَبْتُ سے اِكْتَسَبْتُ اور صَنَعْتُ سے اِصْطَنَعْتُ اور رَاَيْتُ سے اِرْتَاَيْتُ اور روایت[2]۔

(۱۲) لَا دَرَيْتَ وَلَا ائْتَلَيْتَ میں بھی مَا اَلَوْتُهٗ شَيْئًا سے افتعال کا صیغہ ہے۔ گویا اس کے معنی وَلَا اسْتَطَعْتَ کے ہیں (یعنی تم نے نہ جانا اور نہ تجھے اس کی استطاعت ہوئی) اصل میں اِيْلَاءٌ

---

[1] راجع للبحث فی (اللھم) المسائل والاجوبۃ لابن سیدہ ۱: ۱۰۹ معالم ص ۲-۲۲ المطرزی علی المقامات ص ۳۴۵ الکناش الکواکبی ص ۸۱ والکلام فی میم (اللھم) ومناقشتہ فیھا: ذخائر القصر لابن طولون آخر ص ۱۵

[2] رواہ البخاری ومسلم من حدیث انس رض للکس فی روایتھا ولاتلیت والحدیث ایضاً فی مسند البزار واحمد عن عبداللہ بن عمرو الطبرانی فی الاوسط

وَ اَلِيَّةٌ اس قسم کو کہتے ہیں جس پر قسم کھانے والے کو تکلیف اور کوتاہی کا سامنا کرنا پڑے اور اصطلاح شریعت میں اِیْلَاءٌ اس قسم کو کہتے ہیں جو عورت کے ساتھ جماع پر اٹھائی جائے اس قسم کی کیفیت اور احکام کا بیان کرنا کتب فقہ کے ساتھ مختص ہے اور آیت کریمہ:۔

وَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ (۷-۷۴)، پس خدا کی نعمتوں کو یاد کرو۔ میں اٰلَاۗءُ کا واحد اَلًی وَ اِلًی ہے جس طرح کہ اٰنَاۗءٌ کا واحد اَنًا وَ اِنًی آتا ہے بعض نے آیت کریمہ:۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (۷۵-۲۳-۲۴) اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے (اور) اپنے پروردگار کے محو دیدار ہوں گے) میں اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کے معنی اِلٰى نِعْمَةِ رَبِّهَا مُنْتَظِرَةٌ کئے ہیں یعنی اپنے پروردگار کی نعمتوں کے منتظر ہونگے لیکن بلاغت قرآن کی رو سے یہ سراسر تعسف ہے

(الا)

اَلَا یہ حرف استفتاح ہے[1] (یعنی کلام کے ابتداء میں تنبیہ کے لئے آتا ہے)

(الّا)

اِلَّا یہ حرف استثناء ہے[2]

اُولَاۗءِ (اولا)

یہ اسم مبہم ہے جو جمع مذکر و مؤنث کی طرف اشارہ کے لئے آتا ہے اس کا مفرد من لفظہٖ نہیں آتا کبھی اس کے شروع میں ھا تنبیہ بھی آجاتا ہے، قرآن میں ہے:۔ هٰٓاَنْتُمْ اُولَاۗءِ تُحِبُّوْنَھُمْ (۳-۱۱۹) دیکھو! تم ایسے لوگ ہو کہ ان سے دوستی رکھتے ہو اُولٰۗىِٕكَ عَلٰي ھُدًى (۲-۵) یہی لوگ ..... ہدایت پر ہیں اور کبھی اس میں قصر (یعنی بحذف ہمزہ آخر) بھی کر لیا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[3] ع

(۲۲) هٰؤُلَا ثُمَّ هٰؤُلَا كُلًّا اَعْطَيْـ
ـتُ نِوَالًا مَحْذُوَّةً بِمِثَالِ

ان سب لوگوں کو میں نے بڑے بڑے گرانقدر عطیے دیئے ہیں

(ا م م)

اَلْاُمُّ یہ اَبٌ کا بالمقابل ہے اور ماں قریبی حقیقی ماں اور بعیدہ یعنی نانی پرنانی وغیرہ سب کو اُمٌّ کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حواء کو اُمُّنَا کہا گیا ہے اگرچہ ہمارا ان سے بہت دور کا تعلق ہے۔ پھر ہر اس چیز کو اُمٌّ کہا جاتا ہے۔ جو کسی دوسری چیز کے وجود میں آنے یا اس کی اصلاح و تربیت کا سبب ہو یا اس کے آغاز کا مبداء بنے۔ خلیل کا قول ہے کہ ہر وہ چیز جس کے اندر اس کے جملہ متعلقات منضم ہو جائیں یا سما جائیں ..... وہ ان کی اُمٌّ کہلاتی ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔ وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ (۴۳-۴) اور یہ اصل نوشتہ (یعنی لوح محفوظ) میں ہے۔ میں اُمِّ الْكِتٰبِ سے مراد لوح محفوظ ہے کیونکہ وہ

---

[1] یکون مما للتوبیخ والتمني والاستفهام عن النفي والعرض والتحضيض نحو اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ (۲۴-۲۲) وفي معنى التنبيه الا يوم ياتيهم ليس مصروفا عنهم (۱۱-۸)، [2] وقد يكون صفة بمنزلة غير نحو لو كان فيهما اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (الانبياء ۲۱: ۲۲) وفيه بحث وعاطفة بمنزلة الواو لئلا يكون للناس عليكم حجة الا الذين ظلموا الاية (۲: ۱۵۰) (۲۷: ۱۰-۱۱) وزائدة فهذه اربعة اوجه واما الّا فحرف تحضيض او مركب من ان وان الناصبة المخففة ولا النافية وراجع للبحث المغني ج ۱ ص ۷۰-۸۰)، [3] قاله الاعشى وفي جمهرة اشعار العرب لها لابدل نوالا ومعناه سقيتهم كاس الردى والبيت في السمط ۱: ۱۷۸ وديوانه ۱۶۷

وہ تمام علوم کا منبع ہے اور اسی کی طرف تمام علوم منسوب ہوتے ہیں اور مکہ مکرمہ کو اُمُّ الْقُرٰی کہا گیا ہے کیونکہ وہ خطۂ عرب کا مرکز تھا) اور بموجب روایت تمام روئے زمین اس کے نیچے سے بچھائی گئی ہے (اور یہ ساری دنیا کا دینی مرکز ہے) قرآن میں ہے:۔

لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا (۴۲ - ۷)

تاکہ تو مکہ کے رہنے والوں کو اور جو لوگ اس کے اردگرد رہتے ہیں۔ بدعملی کے انجام سے ڈرائے۔

اُمُّ النُّجُوْمِ۔ کہکشاں۔ شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۲۳) "بِحَيْثُ اهْتَدَتْ اُمُّ النُّجُوْمِ الشَّوَابِكِ"

یعنی جہاں کہ کہکشاں راہ پاتی ہے

اُمُّ الْاَضْيَافِ۔ مہمان نواز۔ اُمُّ الْمَسَاكِيْنِ۔ مسکین نواز۔ مسکینوں کا سہارا۔ ایسے ہی جیسے بہت زیادہ مہمان نواز کو "اَبُوالْاَضْيَافِ" کہا جاتا ہے اور رئیس جیش کو امّ الجیش۔ شاعر نے کہا ہے[2] (طویل)

(۲۴) "وَاُمُّ عِيَالٍ قَدْ شَهِدْتُ تَقُوْتُهُمْ"

اور وہ اپنی قوم کے لئے بمنزلہ ام عیال ہے جو ان کو رزق دیتا ہے۔

اُمُّ الْكِتَابِ۔ سورۃ فاتحہ کا نام ہے۔ کیونکہ وہ قرآن کے لئے بمنزلہ دیباچہ اور مقدمہ ہے۔

اور آیت کریمہ:۔ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ (۱۰۱ - ۹) مثوی یعنی رہنے کی جگہ کے ہیں۔ جیسے دوسری جگہ دوزخ کے متعلق مَأْوَاكُمُ النَّارُ (۲۹ - ۲۵) فرمایا ہے (اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ایک محاورہ ہو) جس طرح کہ وَيْلُ اُمِّهٖ وَهَوَتْ اُمُّهٗ ہے یعنی اس کیلئے ہلاکت ہو۔ اور اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ:۔ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهَاتُهُمْ (۳۳ - ۶) میں ازواج مطہرات کو امہات المؤمنین قرار دیا ہے۔ جس کی وجہ بحث اَبٌ میں گزر چکی ہے۔ نیز فرمایا۔ يَا ابْنَ اُمَّ (۲۰ - ۹۴) کہ بھائی۔

اُمٌّ (کی اصل میں اختلاف پایا جاتا ہے) بعض نے کہا ہے کہ اُمٌّ اصل میں اُمَّهَةٌ ہے کیونکہ اس کی جمع اُمَّهَاتٌ اور تصغیر اُمَيْهَةٌ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اصل میں مضاعف ہی ہے کیونکہ اس کی جمع اُمَّاتٌ اور تصغیر اُمَيْمَةٌ آتی ہے۔ بعض کا قول ہے کہ عام طور پر حیوانات وغیرہ کے لئے اُمَّاتٌ اور انسان کے لئے اُمَّهَاتٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

اَلْاُمَّةُ ہر وہ جماعت جن کے مابین رشتہ دینی ہو یا وہ جغرافیائی اور عصری وحدت میں منسلک

---

[1] قالہ تابط شرا وصدرہ تیری الوحشۃ الانس الانیس ویھتدی ... والبیت فی الحماسۃ مع المرزوقی رقم ۱۳ فی تسعۃ ابیات والبیت فی الفاعتیق ۳۴۲ واللالی (۱۲-۱۳۵) ونقد الشعر ۱۸ والحیوان (۶: ۲۵۶) فی ستۃ ابیات وثمار القلوب ۲۳ وزھر الآداب (۴: ۲۱) فی عشرۃ ابیات وام النجوم الشوابک ہی الشعری والبیت فی التیجان ۲۴۲ منسوب لسلیک بن سلکۃ وراجع للبیت ایضاً السمط ۲۰۷ وادبا والمؤلف (ص ۱۲۸) [2] قالہ الشنفری عمرو بن مالک الازدی (م ق ھ ۷۰ ق م) شاعر جاہلی من الصعالیک صاحب لامیۃ العرب التی شرحہا الزمخشری فی اعجب العجاب واراد بام عیال تابط شرا وانہم حین غزوا جعلوا ازادھم الیہ فکان یقتر علیہم مخافۃ ان تطول الغزاۃ فیموتوا جوعاً والازد قبیس رئیس القوم وولی امرہم اکمو تمام البیت: اذا اطعمتہم او تحت واقلت والبیت من کلمۃ مفضلیۃ رقم ۲۰ فی ۳۶ بیتا والبیت فی اللسان (ام) والاغانی (۲۱: ۹۰) وفی المطبوع تقوتہم بدل تقوتہم مصحف وفی روایۃ اتہیت بدل اوتحت واحترتہم بدل اطعمتہم وراجع للبیت تہذیب الالفاظ ۶۷۰۵۶ واللسان (حتر، ام) والتاج (ام) والجمہرۃ (۱: ۷۱) والمخصص (۳: ۱۳۲) وکتاب الابدال لابی الطیب والسمط ۴۱۳ ام والاغانی (۱۰: ۱۴) والخزانۃ (۲: ۱۶) والحماسۃ مع المرزوقی ۵۵۰ والتبریزی (۲: ۲۳۰) ومجالس الاشتقاق (۱۱: ۳۲) والعینی (۲: ۷۸)

ہوں پھر وہ رشتہ اور تعلق اختیاری ہو یا غیر اختیاری اس کی جمع اُمَمٌ آتی ہے اور آیت کریمہ: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُکُمْ (۶-۳۸) اور زمین پر جو چلنے پھرنے والے (حیوان) دو پروں سے اُڑنے والے پرند ہیں وہ بھی تمہاری طرح جماعتیں ہیں۔ میں اُمَمٌ سے ہر وہ نوع حیوان مراد ہے جو فطری اور تسخیری طور پر خاص قسم کی زندگی بسر کر رہی ہو۔ مثلاً مکڑی جالا بنتی ہے اور سرفۃ (موریسپید تنکوں سے) اپنا گھر بناتی ہے اور چیونٹی ذخیرہ اندوزی میں لگی رہتی ہے اور چڑیا کبوتر وغیرہ وقتی غذا پر بھروسہ کرتے ہیں الغرض ہر نوع حیوان اپنی طبیعت اور فطرت کے مطابق ایک خاص قسم کی زندگی بسر کر رہی ہے اور آیت کریمہ: کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲-۲۱۳) (پہلے تو سب) لوگ ایک امت تھے۔ کے معنی یہ ہیں کہ تمام لوگ صنف واحد اور ضلالت و کفر کے ہی مسلک پر گامزن تھے اور آیت کریمہ: وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۵-۴۸) اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ہی شریعت پر کر دیتا۔ میں اُمَّةً وَّاحِدَةً سے وحدۃ بلحاظ ایمان مراد ہے۔ اور آیت کریمہ: وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ (۳-۱۰۴) کے معنی یہ ہیں کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہونی چاہیے جو علم اور عمل صالح کا راستہ اختیار کرے اور دوسروں کے لئے اسوۂ بنے اور آیت کریمہ: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ (۴۳-۲۲) ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک متفقہ دین پر پایا ہے میں اُمَّةٍ کے معنی دین کے ہیں۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے۔[1] ع

(۲۵) وَهَلْ یَأْثَمَنْ ذُوْ اُمَّةٍ وَهُوَ طَائِعٌ (طویل)

بھلا کوئی متدین آدمی رضا اور رغبت سے گناہ کر سکتا ہے اور آیت کریمہ: وَادَّکَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ (۱۲-۴۵) میں اُمَّۃ کے معنی حین یعنی عرصہ دراز کے ہیں اور ایک قرأت میں بعد اَمَهٍ (بالهاء)[2] یعنی نسیان کے بعد جب اسے یاد آیا۔ اصل میں بَعْدَ اُمَّةٍ کے معنی ہیں ایک دور یا کسی ایک مذہب کے متبعین کا دور گزر جانے کے بعد اور آیت کریمہ:

اِنَّ اِبْرٰهِیْمَ کَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ (۱۶-۱۲۰) کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیم عبادت الٰہی میں ایک جماعت اور قوم کے بمنزلہ تھے[3]۔ جس طرح کہ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ فِیْ نَفْسِهٖ قَبِیْلَةٌ کہ فلاں بذات خود ایک قبیلہ ہے یعنی ایک قبیلہ کے قائم مقام ہے[4]۔ وَرُوِیَ اَنَّهٗ یُحْشَرُ زَیْدُ بْنُ عَمْرِو ابْنِ نُفَیْلٍ اُمَّةً وَحْدَهٗ اور ایک روایت میں ہے کہ حشر کے دن زید بن عمرو بن نفیل اکیلا ہی امت ہوگا[5]۔ اور آیت کریمہ:

---

[1] قاله النابغة و اوله: حلفت فلم اترک لنفسک ریبة .... والبیت من القصیدة التی یعتذر بها الی النعمان بن المنذر عما وشت به بنو قریع وهو فی دیوانه من الستة ۱۹ واللسان والصحاح (امم) و ذیل مجالس ثعلب ۱/ ۵۰ و مجاز القرآن لابی عبیدة ۱/ رقم ۷۲ و مختار الشعر الجاهلی (۱: ۱۴۸) والبلدان (زیم: شبرق) والعقد الثمین ۱۹ والمعانی والمشکل للقتبی ۲۴۳ و فی روایة المرتضی حلفت .. . . ولیس وراء الله للمرء مذهب۔ و هو الطبق لروایة الدیوان (۲: ۱۷)

[2] قرء بذالک ابن عباس و کان ابو الهیثم یقرء به ایضاً انظر اللسان (امه) و النوادر لابی مسحل الاعرابی ۴۴۴ والفائق (۲۶/۱)

[3] رواه الطبرانی و فی الحدیث قصة والبزار باختصار عنه و فیه المسعودی و قد اختلط و بقیة رجاله ثقات و ابو یعلی و کذا قال ابن مسعود فی معاذ و قد ورد ذالک فی حدیث شاذ فوع راجع مجمع الزوائد ۹ ص ۴۱۷، ۴۱۸ و تخریج الکشاف للحافظ ابن حجر رقم ۲۶۵-۲۶۶

لَيْسُوْا سَوَآءً مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ۔ (۳-۱۱۳) وہ سب ایک جیسے نہیں ہیں ان اہل کتاب میں کچھ لوگ (حکم خدا پر) قائم بھی ہیں۔

یں اُمَّةٌ بمعنی جماعت ہے زجاج[1] کے نزدیک یہاں قَائِمَةٌ بمعنی استقامت ہے یعنی ذو وطَرِيْقَةٍ وَّاحِدَةٍ تو یہاں مضمر متروک ہے

اَلْاُمِّيُّ۔ وہ ہے جو نہ لکھ سکتا ہو اور نہ ہی کتاب میں سے پڑھ سکتا ہو چنانچہ آیت کریمہ:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ۔ (۶۲-۲) وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انہی میں سے (محمد کو) پیغمبر بنا کر بھیجا۔

میں اُمِّیّٖنَ سے یہی مراد ہے قطرب[2] نے کہا ہے کہ اُمِّيَّةٌ بمعنی غفلت وجہالت کے ہے اور امی سے امی ہے کیونکہ اسے بھی معرفت نہیں ہوتی چنانچہ فرمایا:۔ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ (۲-۷۸) اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہیں کہ اپنے خیالات باطل کے سوا (خدا کی کتاب سے) واقف ہی نہیں ہیں۔

یہاں اِلَّآ اَمَانِيَّ کے معنی اِلَّا اَنْ يُّتْلٰى عَلَيْهِمْ کے ہیں یعنی مگر یہ کہ انہیں پڑھ کر سنایا جائے۔ فَرَّاءُ[3] نے کہا ہے کہ اُمِّيُّوْنَ سے مراد ہیں جو اہل کتاب نہ تھے اور آیت کریمہ:۔

اَلرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ (۷-۱۵۷) اور وہ جو (محمد) رسول (اللہ) نبی امی کی پیروی کرتے ہیں جن (کے اوصاف) کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اُمِّیٌّ اس امت یعنی قوم کی طرف منسوب ہے جو لکھنا پڑھنا نہ جانتی ہو جس طرح کہ عَامِّیٌّ اسے کہتے ہیں جو عوام جیسی صفات رکھتا ہو۔

بعض نے کہا ہے کہ آنحضرت کو اُمِّیٌّ کہنا اس بنا پر ہے کہ آپ نہ لکھنا جانتے تھے اور نہ ہی کوئی کتاب پڑھتے تھے۔ بلکہ وحی الٰہی کے بارے میں اپنے حافظہ اور (خدا کی اس ضمانت پر کہ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى (۸۷-۶) ہم تمہیں پڑھائیں گے کہ تم فراموش نہ کرو گے۔ اعتماد کرتے تھے یہ صفت آپ کے لئے باعث فضیلت تھی۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ ام القری یعنی مکہ کی طرف نسبت ہے[4]

اَلْاِمَامُ وہ ہے جس کی اقتدا کی جائے خواہ وہ انسان ہو یا اس کے قول وفعل کی اقتدا کی جائے یا کتاب وغیرہ ہو اور خواہ وہ شخص جس کی پیروی کی جائے حق پر ہو یا باطل پر ہو اس کی جمع اَئِمَّةٌ

---

[1] ابو اسحاق ابراہیم بن السری بن سہل الزجاج توفی بین ۳۱۰ھ ۳۱۶ وکان من اشہر تلامیذ المبرد واستاذ الزجاجی ومن مؤلفاتہ معانی القرآن راجع نزہۃ الالباء ۳۰۸-۳۱۲ طبقات زبیدی ۱۲۴ تاریخ بغدادی ۶/ ۸۹-۹۳ ابن خلکان رقم ۱۲ والاعلام زرکلی [2] محمد بن المستنیر بن احمد ابو علی النحوی المعروف بقطرب (۰۰۰-۲۰۶) اللغوی البصری مولی سالم بن زیاد لازم سیبویہ وکان یدلج الیہ فسماہ قطربا ای دویبۃ اللیل ۷ ومن تصانیفہ معانی القرآن ومواول من وضع المثلث فی اللغۃ وفیات الاعیان ۱: ۴۹۴ طبقات النحویین ۱۰۶ بغیۃ الوعاۃ ۱۰۴ الفہرست ۵۲ معجم المطبوعات ۱۵۱۷ نزہۃ الالباء ۱۱۹ [3] ابو زکریا یحیی بن زیاد الفراء (۰۰۰-۲۰۷) روی عن الکسائی وطبقتہ صاحب التصانیف بغیۃ الوعاۃ ۴۱۱-۴۱۲ الفہرست ۱۰۰ ۱۰۷ والانباہ ۱/۹ و ۲/۲۵۷ ومعجم الادباء ۲۰/ ۱۴ وکشف الظنون ۲/ ۱۷۲۰ [4] نسب ہذا القول الی الامام الباقر (انظر روح المعانی صفحہ ۹)

(أفعلة) ہے اور آیت :۔
يَوْمَ نَدْعُوا كُلَّ أُنَاسٍ بِإِمَامِهِمْ (۱۷-۷۱)
جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے پیشواؤں کے ساتھ بلائیں گے۔ میں امام سے وہ شخص مراد ہے جس کی وہ اقتداء کرتے تھے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ امام بمعنی کتاب ہے[1] اور آیت کریمہ:۔
وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا (۲۵-۷۴) اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔ میں ابوالحسن نے کہا ہے کہ یہ امام (مفرد) کی جمع ہے[2] اور دوسرے علماء کے نزدیک یہ دِرْعٌ دِلاص ودروع دِلاص کے باب سے ہے[3] یعنی فِعَال مفرد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اور آیات :۔
وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً (۲۸-۵) اور ان کو پیشوا بنائیں
وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ (۲۸-۴۱)
اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا تھا وہ لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے۔
میں أَئِمَّةً کا واحد امام ہے اور آیت :۔
كُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ (۳۶-۱۲)
اور ہر چیز کو ہم نے کتاب روشن یعنی لوح محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ لوح محفوظ کی طرف اشارہ ہے۔
الأَمُّ (ن) کے معنی ہیں سیدھا مقصد کی جانب متوجہ ہونا (اور کسی طرف مائل نہ ہونا) اور آیت کریمہ:۔
وَلَا آمِّينَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ (۵-۲) اور نہ ان لوگوں کی جو عزت والے گھر (یعنی بیت اللہ) کو جا رہے ہوں۔ میں آمِّينَ اسی پر محمول ہے :۔
أَمَّهُ بمعنی شَجَّهُ کسی کا سر پھوڑ دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اس کے اصل معنی ام دماغ پر مارنا کے ہیں۔ جیسا کہ اہل عرب کسی عضو پر مارنے کے لئے اس سے فَعَلْتُهُ کا صیغہ بنا لیتے ہیں جیسے (أَسْتُهُ، رَجَلْتُهُ، كَبَدْتُهُ، بَطَنْتُهُ)

(ا م حرف)

أَمْ۔ جب یہ ہمزہ استفہام کے بالمقابل استعمال ہو تو بمعنی أو ہوتا ہے جیسے أَزَيْدٌ فِي الدَّارِ أَمْ عَمْرٌو۔ یعنی ان دونوں میں سے کون ہے؟ اور اگر ہمزہ استفہام کے بعد نہ آئے تو بمعنی بَلْ ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا :۔
أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْأَبْصَارُ (۳۸-۶۳) (یا) ہماری آنکھیں ان (کی طرف) سے پھر گئی ہیں۔

(أ مّا حرف)

أَمَّا۔ یہ کبھی حرف تفصیل ہوتا ہے (اور احد الشیئین کے معنی دیتا ہے اور کلام میں مکرر استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا :۔ أَمَّا أَحَدُكُمَا فَيَسْقِي رَبَّهُ خَمْرًا وَأَمَّا الْآخَرُ فَيُصْلَبُ (۱۲-۴۱) تم میں سے ایک (جو پہلا خواب بیان کرنے والا ہے وہ) تو اپنے آقا کو شراب پلایا کرے گا اور جو دوسرا ہے وہ سولی دیا جائے گا۔
اور کبھی ابتداء کلام کے لئے آتا ہے جیسے أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّهُ كَذَا۔

(ا م د)

الْأَمَدُ۔ (موت۔ غایت) قرآن میں ہے :۔
تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا۔ (۳-۳۰) تو آرزو کرے گا کہ کاش اس میں اور اس برائی

---

[1] قراءة الحسن بكتابهم (الكشاف ص۶۸۲) ج ۲ ۔ [2] كذا في الصحاح وعند البعض جمع آم كصائم وصيام كذا في لسان العرب والكشاف للزمخشري ص۲۹۶ ج ۳ ۔ [3] وقال الزمخشري اراد ائمة فاكتفى بالواحد لدلالته على الجنس ولعدم اللبس ص۲۹۰ ج ۳ ۔

میں انتہائی بُعد ہوتا۔

اَلْاَمَدُ وَالْاَبَدُ دونوں قریب المعنی ہیں لیکن اَبَدٌ غیر متعین اور غیر محدود زمانہ کے معنی دیتا ہے لہذا اَبَدٌ کَذَا (اتنی مدت) کا محاورہ صحیح نہیں ہے اور اَمَدٌ غیر معین مگر محدود زمانہ کے معنی دیتا ہے لہذا اَمَدٌ کَذَا (اتنی مدت) کہنا صحیح ہے جس طرح کہ زمان کذا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ زَمَانٌ اور اَمَدٌ کے لفظ میں صرف اتنا فرق ہے کہ اَمَدٌ کا لفظ کسی مدت کی نہایت اور غایت کے لئے بولا جاتا ہے اور زمان کا لفظ کسی مدت کے مبدأ اور غایت کے لئے استعمال ہوتا ہے اسی بنا پر بعض نے کہا ہے اَلْمَدَی وَالْاَمَدُ دونوں قریب المعنی ہیں (یعنی کسی چیز کی موت کی غایت بیان کرنے کے لئے آتے ہیں)

(ا م ر)

اَلْاَمْرُ (اسم) کے معنی شان یعنی حالت کے ہیں۔ اس کی جمع اُمُوْرٌ ہے اور اَمَرْتُهٗ (ن) کا مصدر بھی اَمْرٌ آتا ہے جس کے معنی حکم دینا کے ہیں اَمْرٌ کا لفظ جملہ اقوال وافعال کے لئے عام ہے۔ چنانچہ آیات:۔

وَاِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ (۱۱-۱۲۳) اور تمام امور کا رجوع اسی کی طرف ہے۔ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّهٗ لِلّٰهِ یُخْفُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا یُبْدُوْنَ لَكَ یَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ (۳-۱۵۴) تم کہدو کہ بیشک سب باتیں خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔ یہ لوگ (بہت سی باتیں) دلوں میں مخفی رکھتے تھے جو تم پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ اگر ہمارے بس کی بات ہوتی۔ وَاَمْرُهٗٓ اِلَی اللّٰهِ (۲-۲۷۵) اور (قیامت میں) اس کا معاملہ خدا کے سپرد۔ میں امر سے یہی معنی مراد ہیں۔

اور کبھی امر بمعنی ابداع بھی آجاتا ہے جیسے فرمایا: اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (۷-۵۴) دیکھو خلق اسی کے اختیار میں ہے اور ابداع بھی۔ اور امر بایں معنی ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور کوئی مخلوق اس معنی میں اس کے ساتھ شریک نہیں اور آیت:۔

وَاَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (۴۱-۱۲) اور ہر آسمان میں اس (کے امر) کا حکم بھیجا۔ میں بھی امر اسی معنی پر حمل کیا گیا ہے۔ اور حکمائے امت نے آیت کریمہ:۔ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (۱۷-۸۵) کہدو کہ روح میرے پروردگار کے امر سے ہے۔ میں بھی اَمْرِ رَبِّیْ کے معنی اِبْدَاعِهٖ کئے ہیں[1] اور آیت کریمہ:۔ وَاِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (۱۶-۴۰) جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو (ہماری) بات یہی ہے کہ اس

---

[1] وفیہ لغۃ اَیْمَا وهو حرف شرط وتفصیل وتوکید ولزمت الفاء بعدها وقد تحذف الفاء للضرورۃ والدیات التی بغیر فاء کما فی (۳: ۱۰۶) و(۵۴-۳۱) فہناک یقدر لفظۃ فیقال راجع للبحث المغنی ج ۱ ص ۵۷۔ وقد یاتی للتوکید والشرط والفصل بین اما والفاء بواحد من امور ستۃ (۱) المبتدا (۲) الخبر (۳) جملۃ الشرط (۴) اسم منصوب لفظا او محلا بالجواب کما فی سورۃ الضحیٰ ۹-۱۰-۱۱ (۵) اسم منصوب معمول لمحذوف یفسره بعد الفاء (۶) ظرف معمول لاما راجع المغنی ج ۱ ص ۵۹-۶۰ والرضی علی الکافیہ ج ۲ ص ۳۹۵-۴۰۰) وفیہ وقد یحذف کما فی نحو وثیابک فطہر والرجز فاہجر الایۃ

کو کہہ دیتے ہیں کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ میں بھی امر اِبْدَاعی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور کسی کام کو سرانجام دینے کے لئے باری تعالیٰ کی طرف سے جو اہتمام ہوتا ہے اسے نہایت اختصار اور بلاغت سے اس آیت میں بیان فرمایا ہے اسی طرح آیت کریمہ:۔
وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (۵۴-۵۰)
اور ہمارا حکم تو آنکھ کے جھپکنے کی طرح ایک (بات) ہوتی ہے۔ میں بھی سرعت ایجاد سے کنایہ ہے اور عالم میں ایجاد و تکوین کا جو سلسلہ جاری ہے اس کی تیز رفتاری کو بتانے کے لئے ایسا بلیغ طریقہ اختیار کیا ہے جو ہماری قوت واہمہ سے بھی بلند ہے اور امر بمعنی المتقدم بالشئ (یعنی حکم دینا) عام ہے کہ بصیغہ امر ہو یا بلفظ خبر ہو جیسے فرمایا:۔
وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ (۲-۲۲۸)
اور طلاق والی عورتیں اپنے تئیں روکے رکھیں۔ اور یا بطریق اشارہ وغیرہ ہو چنانچہ آیت کریمہ:۔
اِنِّیْ اَرٰى فِی الْمَنَامِ اَنِّیْ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ط قَالَ يَآاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (۳۷-۱۰۲)
میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں تو تم سوچو کہ تمہارا کیا خیال ہے انہوں نے کہا ابا جو آپ کو حکم ہوا ہے وہی کیجئے۔
میں حضرت ابراہیم کا خواب میں اپنے بچے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھنے کو امر (مَا تُؤْمَرُ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَمَا اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ (۱۱-۹۷)
اور فرعون کا معاملہ درست نہیں تھا۔ میں امر کا لفظ فرعون کے جملہ اقوال اور افعال کو شامل ہے اور آیت کریمہ:۔ اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ (۱۶-۱) خدا کا حکم (یعنی عذاب گویا) آہی پہنچا۔ میں امر سے مراد قیامت ہے اور اس کے لئے سب سے زیادہ عام لفظ استعمال کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا (۱۲-۱۸) بلکہ تمہارے لئے تمہارے دلوں نے بات کو خوشنما بنا لیا ہے۔ میں اَمْرًا سے مراد یہ ہے کہ یہ ان برے کاموں سے ہے جن پر نفس امارہ انسان کو اکساتا رہتا ہے۔
اَمِرَ (س) الْقَوْمُ کے معنی ہیں قوم زیادہ ہو گئی کیونکہ آبادی بڑھ جائے تو امیر (حاکم) کا تقرر ضروری ہو جاتا ہے جس کے بغیر انتظام صحیح نہیں رہ سکتا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ع (البسیط)
(۲۶) لَا يَصْلُحُ النَّاسُ فَوْضٰى لَا سَرَاةَ لَهُمْ[1]
جس قوم کا رئیس نہ ہو اس کا معاملہ درست نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا امر بمعنی کثرت استعمال ہونے لگا ہے اور آیت کریمہ:۔ اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا (۱۷-۱۶) (تو) وہاں کے آسودہ حال لوگوں کو حکم دیا۔ میں امر بمعنی حکم ہے یعنی ہم انہیں اطاعت الٰہی کا حکم دیتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَمَرْنَا بمعنی کثرنا ہے یعنی وہاں کے خوشحال لوگوں کو بڑھا

---

[1] قاله الافوه الاودی واسمه صلاءة بن عمرو ویکنی ابا ربیعه والبیت فی العقد ا: ۱۰/۳۴۴ والسمط (: ۷۲۰) واللالی (۲: ۷۲۲) قال الاستاذ المیمنی والبیت من کلمته، ایشا فی نسخة دیوان الافوه (الطرائف ۹-۱۰) ولا توجد کاملة فی الکتب المعروفة وبعضها فی آخر دیوان ابی الاسود صنعة السکری قال وقد زعم لی بعض الرواة انها للافوه اصح والبیت فی حماسة المعانی (۲/ ۱۹، ۱۹-۱۳۰) والشعراء ۱۷۵ وابن الحدید ۴: ۵۳۱ والصحاح واللسان (فوض) والمزہر (ا: ۴/ ۱۴۴) والنوادر (ا: ۲۹۸) وروضة العقلاء ۲۴۴ والبیت ثالث ثلاثة للافوه التی ذکرها المؤلف (س و) ص ۳۵۵

دیتے ہیں۔

ابوعمرو کا قول ہے کہ معنی کثرت کے لئے اَمَرْتُ (مجرد) نہیں آتا بلکہ آمَّرْتُ (تفعیل) وَاٰمَرْتُ استعمال ہوتا ہے لیکن ابوعبیدہ کا قول [۱] ہے کہ کبھی اس معنی کے لئے اَمَرْتُ (مجرد) بھی استعمال ہوتا ہے جیساکہ حدیث میں ہے [۲]۔ (۱۴) خَیْرُ الْمَالِ مُهْرَةٌ مَأْمُوْرَةٌ وَسِكَّةٌ مَأْبُوْرَةٌ کہ بہتر مال پرورش کیا ہوا بچھیرا اور پیوند کئے کھجور کے درخت ہیں تو مَأْمُوْرَةٌ اَمَرْتُ سے ہے ایک قرأت میں آمَّرْنَا ہے جس کے معنی ہیں:۔ ہم ان کو امیر بنا دیتے ہیں جیساکہ دوسری آیت میں ہے وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا۔ کہ ہم نے اس کے اکابر کو مجرم بنا دیا تاکہ اس میں مکروفریب کریں (۶-۱۲۳) اور ایک قرأت میں آمَرْنَا بمعنی اَكْثَرْنَا بھی ثابت [۳] ہے

اَلْاِئْتِمَارُ کے اصل معنی حکم بجا لانا کے ہیں اور تَشَاوُرْ یعنی باہم مشورہ کرنے کو بھی اِئْتِمَارٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ مشورہ میں بھی ایک دوسرے کے حکم کو قبول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ شہر کے رئیس تمہارے بارے میں صلاح مشورے کرتے ہیں (۲۸-۲۰)

اور شاعر نے کہا ہے [۴]

(۲۷) اَمَرْتُ نَفْسِيْ اَيَّ اَمْرٍ اَفْعَلُ

میں نے اپنے جی میں سوچا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔

اور آیت کریمہ:۔

لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا اِمْرًا یہ تو آپ نے بڑی ناپسندیدہ بات کی (۱۸-۷۱) میں اِمرٌ بمعنی منکر ہے اور یہ اَمِرَ الْاَمْرُ کے محاورہ سے ہے جس کے معنی کسی معاملہ کے حد سے بڑھ جانے کے ہیں جس طرح کہ اِسْتَفْحَلَ الْاَمْرُ کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ:۔ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (۴-۵۹) اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں۔ میں بعض کے نزدیک عہد نبوی کے امراء مراد ہیں۔ اور بعض آئمہ اہل بیت مراد لیتے ہیں اور بعض کا قول ہے کہ اولی الامر کے معنی اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ کے ہیں۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اس سے وہ فقہاء اور اہل علم مراد ہیں۔ جو احکام الٰہی کے فرمانبردار ہوں اور یہ سبھی اقوال صحیح ہیں کیونکہ اولی الامر جو لوگوں کو برائی سے روکتے ہیں چار قسم پر ہیں (۱) انبیاء جن کا حکم عوام و خواص کے ظاہر و باطن پر نافذ ہوتا ہے (۲) حکام جن کا صرف لوگوں کی ظاہری حالت پر جاری ہو سکتا ہے۔ دلوں پر ان کی حکومت نہیں ہوتی (۳) حکماء خواص کے دلوں پر حکومت کرتے

---

[۱] انظر لقول ابی عبیدۃ فی مجازہ ج ۱ ص ۳۷۲-۳۷۳ واللسان (امر) ثم القراءۃ بالتخفیف مرویۃ عن الصحابۃ والتابعین الا الحسن فانہ قرأ بالتشدید وتبعہ ابوعبیدۃ فی مجازہ عن ابی العالیۃ الریاحی آمّرنا بالتشدید وروییت عن علیؓ ۱۲) [۲] راجع للحدیث الفائق ۱: ۳۰ والنھایۃ ۱/۱۱ واللآلی ۸۳۱ والحدیث اخرجہ ابن کثیر من مسند احمد (حم طب) عن سوید بن ہبیرۃ والماوردی فی ادب الدنیا والدین ۳۶۷ مع شرح المنہاج وبوشل انظر البیان ۲/۱۰ والعیون والمستقصی والثعالبی ۲/۴ ۲۰ و ۲۱۰ والالفاظ ۳ و ۶۸۳ و اللسان (امر) وراجع ایضا ذیل تفسیر الکشاف ۲/۵۵۶ وفیہ التخریج قال البکری وحمل الحدیث علی ہذہ اللغۃ الفصیحۃ اولی من حملہ علی الاتباع [۳] ہی قراءۃ شاذۃ عن ابی عثمان النھدی واللیث عن ابی عمرو وابان بن عاصم انظر القراءات الشاذۃ لابن خالویہ ۷۵ [۴] قالہ کعب بن زہیر وصدرہ:۔ انخت قلوصی وکلتات بعینہا (راجع السمط (ا: ۲۰۰) واللسان (کلا) ودیوانہ (البحر ۴: ۱۹) وفی روایتہم جمیعًا ای امری بدل ای امر۔

ہیں رہ، واعظ جن کا حکم صرف عوام کے قلب وضمیر پر ہی جاری ہو سکتا ہے[1]۔

(امن)

اَلْاَمْنُ۔ اصل میں امن کا معنی نفس کے مطمئن ہونا کے ہیں۔ اَمْنٌ، اَمَانَۃٌ اور اَمَانٌ یہ سب اصل میں مصدر ہیں اور امان کے معنی کبھی حالت امن کے آتے ہیں اور کبھی اس چیز کو کہا جاتا ہے جو کسی کے پاس بطور امانت رکھی جائے۔ قرآن میں ہے:۔ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِکُمْ (۸-۲۷) یعنی وہ چیزیں جن پر تم امین مقرر کئے گئے ہو ان میں خیانت نہ کرو۔ اور آیت کریمہ:۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہم نے (بار) امانت آسمان اور زمین پر پیش کیا (۳۳-۷۲) کی تفسیر میں بعض نے "عدل وانصاف" مراد لیا ہے۔ بعض نے حروف تہجی اور بعض نے عقل مراد لی ہے اور یہی صحیح ہے کیونکہ معرفت توحید عدل وانصاف کا قیام اور حروف تہجی کی معرفت عقل کے بغیر ممکن نہیں۔ بلکہ انسان کے لئے علوم ممکنہ کی تحصیل اور افعال حسنہ کی سرانجام دہی عقل کے بغیر مشکل ہے۔ اور عقل کے باعث ہی انسان کو اکثر مخلوق پر فضیلت دی گئی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا اور جو شخص اس (مبارک گھر) میں داخل ہوا اس نے امن پالیا (۳-۹۷) میں امن پانے سے مراد دوزخ کی آگ سے بے خوف ہونا کے ہیں اور بعض نے کہا ہے۔ کہ ان دنیوی مصائب سے بے خوف ہونا مراد ہے جو اُن لوگوں کو پہنچتے ہیں جن کے بارے میں اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ بِھَا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ خدا چاہتا ہے کہ ان چیزوں سے دنیا کی زندگی میں ان کو عذاب دے (۹-۵۵) ارشاد فرمایا ہے اور نہ زیر بحث آیت میں خبر بمعنی انشاء ہے یعنی جو شخص حرم میں داخل ہو اسے امن دیا جائے۔

بعض نے کہا ہے کہ ہلاکت سے بے خوف ہونا مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ اسے پرامن رہنے دیا جائے جیسے محاورہ ہے ھٰذَا حَلَالٌ وَھٰذَا حَرَامٌ یعنی اللہ کا حکم یہ ہے کہ یہ چیز حلال ہے اور دوسری حرام ہے لہٰذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ مجرم جب تک حرم کے اندر ہے نہ اس سے قصاص لیا جائے اور نہ ہی کسی جرم میں اسے قتل کیا جائے[2] اسی طرح آیت:۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو مقام امن بنایا ہے (۲۹-۶۷) اور آیت وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا (۲-۱۲۵) میں بھی امن کے یہی معنی مراد ہو سکتے ہیں اور آیت کریمہ:۔ اَمَنَۃً نُّعَاسًا سلی (یعنی) نیند نازل فرمائی (۳-۱۵۴) میں اَمَنَۃً بمعنی امن ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کَتَبَۃٌ کی طرح اٰمِنٌ کی جمع ہے نزول مسیح والی حدیث میں ہے[3] (۱۵) وَتَقَعُ

---

[1] لم یذکر بعدہ (ام س) ولام ل) راجع الاستدراک [2] کما روی عن عمر رضی اللہ عنہ لو ظفرت فیہ بقاتل الخطاب ما مسستہ حتی یخرج منہ راجع الکشاف ج ۱ ص ۳۸۹ - [3] والحدیث باختلاف الفاظہ رواہ ابن حبان واصحاب السنن الاربعۃ والشیخان والبیہقی فی الاسماء والصفات وانظر تخریجہ ابن کثیر ۱/ ۵۸۳ و ۵۷۸ والشوکانی رسالۃ سماہا التوضیح فی تواتر ما جاء فی المنتظر والدجال والمسیح

اَلْاَمَنَةُ فِی الْاَرْضِ اور زمین میں امن قائم ہو جائیگا اور آیت کریمہ:۔
ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ۔ پھر اس کو امن کی جگہ واپس پہنچا دو (۹-۶) میں مَاْمَنَ ظرف ہے جس کے معنی "جائے امن" کے ہیں۔

'اَمِنَ' (افعال) دو طرح سے استعمال ہوتا ہے
(۱) متعدی بنفسہٖ۔ جیسے 'اٰمَنْتُهٗ' (میں نے اسے امن دیا) اور اسی معنی کے اعتبار سے اسماء حسنٰی میں مُؤْمِنٌ آیا ہے۔
(۲) لازم جس کے معنی ہیں پر امن ہونے والا۔
اَلْاِیْمَانُ کے ایک معنی شریعت محمدیؐ کے آتے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصَارٰی وَالصَّابِئُوْنَ۔
اور جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی یا عیسائی یا ستارہ پرست (۲-۶۲) میں 'اٰمَنُوْا' کے یہی معنی ہیں اور ایمان کے ساتھ ہر وہ شخص متصف ہو سکتا ہے جو توحید و نبوۃ کا اقرار کر کے شریعت محمدی میں داخل ہو جائے اور بعض نے آیت وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُشْرِکُوْنَ۔ اور ان میں سے اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر (اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں (۱۲-۱۰۶) کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے۔

۲ اور کبھی ایمان کا لفظ بطور مدح استعمال ہوتا ہے اور اس سے "حق کی تصدیق کر کے اس کا فرمانبردار ہو جانا" مراد ہوتا ہے اور یہ چیز تصدیق بالقلب، اقرار باللسان اور عمل بالجوارح سے حاصل ہوتی ہے اس لئے فرمایا:۔
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصِّدِّیْقُوْنَ (۵۷-۱۹) اور جو لوگ خدا اور اس کے پیغمبر پر ایمان لائے ہیں۔ وہی صدیق ہیں یہی وجہ ہے کہ اعتقاد، قول صدق اور عمل صالح میں سے ہر ایک کو ایمان کہا گیا ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔ وَمَا کَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَکُمْ۔ اور خدا ایسا نہیں کہ تمہارے ایمان کو یوں ہی کھو دے (۲-۱۴۳) میں ایمان سے مراد نماز ہے اور (۱۶) آنحضرتؐ نے حیا اور راستہ سے تکلیف کے دور کرنے کو جزو ایمان قرار دیا ہے اور حدیث جبریل میں آنحضرت نے چھ باتوں کو کو اصل ایمان کہا ہے[له] اور آیت کریمہ:۔
وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ کُنَّا صٰدِقِیْنَ اور آپ ہماری بات کو گو ہم سچ ہی کہتے ہوں باور نہیں کریں گے (۱۲-۱۷)
میں مُؤْمِن بمعنی مصدق ہے۔ لیکن ایمان اس تصدیق کو کہتے ہیں جس سے اطمینان قلب حاصل ہو جائے اور تردد جاتا رہے اور آیت کریمہ:۔
اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ اُوْتُوْا نَصِیْبًا مِّنَ الْکِتٰبِ یُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا ہے کہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں۔ (۴-۵۱) میں ان کی مذمت کی ہے کہ وہ ان چیزوں سے امن و اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں جو باعث امن نہیں ہو سکتیں کیونکہ انسان فطری طور پر کبھی بھی باطل

له حدیث شعب الایمان فی الصحیحین مرفوعًا عن ابی ہریرۃ: الایمان بضع وسبعون شعبۃ اعلاها قول لا الٰہ الا اللہ وادناها اماطۃ الاذی عن الطریق والحیاء شعبۃ من الایمان والحدیث ایضًا فی ابی داؤد وابن ماجۃ والنسائی وحدیث جبریل مروی فی الصحیحین عن عمر بن الخطاب وفیہ: ان تؤمن باللہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ والیوم الآخر وتؤمن بالقدر خیرہ وشرہ

پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ تو یہاں یُؤْمِنُوْنَ کا لفظ ایسے ہی (بطور طنز) کے ہے جس طرح آیت:۔ مَنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ (بلکہ، وہ جو (دل سے اور) دل کھول کر کفر کرے تو ایسوں پر اللہ کا غضب ہے (۱۶-۱۰۶) میں کفر کے ساتھ شرح صدر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ تو یہ اِیْمَانُهُ الْكُفْرُ وَتَحِيَّتُهُ الضَّرْبُ کے قبیل سے ہے۔ رَجُلٌ اُمَنَةٌ وَاُمْنَةٌ ہر ایک پر اعتماد کرنے والا۔ رَجُلٌ اَمِيْنٌ وَاَمَانٌ امانتدار آدمی۔ اَلْاَمُوْنُ۔ وہ اونٹنی جس کے تھک جانے اور لغزش کھانے سے سوار بے خوف ہو۔

آمِيْن۔ یہ ممدود اور مقصور دونوں طرح بولا جاتا ہے اور صَهْ وَمَهْ کی طرح اسم فعل ہے[1] جن کے نزدیک آمین بمعنی استجب ہے یعنی میری دعا قبول فرما اور اَمَّنَ (تفعیل) کے معنی آمین کہنے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ آمین اسماء حسنیٰ سے ہے[2]۔ ابو علی الفسوی فرماتے ہیں[3] کہ اسم الٰہی کہنے سے ان کی مراد یہ ہے کہ یہ بمعنی اِسْتَجِبْ کے ہے اور ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔

اور آیت کریمہ:۔ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاءَ الَّيْلِ (بھلا مشرک اچھا ہے) یا وہ شخص جو رات کے وقتوں میں۔۔۔ عبادت کرتا ہے (۳۹-۹) میں اَمَّنْ اصل میں اَمْ مَنْ ہے اور ایک قرأت میں اَمَنْ ہے۔ بہر حال اس کا تعلق اس مادہ سے نہیں ہے۔

(اِنَّ حرف)

اِنَّ وَاَنَّ (حرف) یہ دونوں اسم کو نصب اور خبر کو رفع دیتے ہیں[4] اور دونوں میں فرق یہ ہے کہ اِنَّ جملہ مستقل پر آتا ہے اور اَنَّ کا ما بعد ایسے مفرد کے حکم میں ہوتا ہے جو اسم مرفوع، منصوب اور مجرور کی جگہ پر واقع ہوتا ہے جیسے اَعْجَبَنِيْ اَنَّكَ تَخْرُجُ وَعَجِبْتُ اَنَّكَ تَخْرُجُ اور تَعَجَّبْتُ مِنْ اَنَّكَ تَخْرُجُ جب اِنَّ کے بعد ما (کافہ) آجائے تو یہ عمل نہیں کرتا اور (کلمہ حصر کے معنی دیتا ہے۔ فرمایا:۔ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ۔ مشرک تو پلید ہیں (۹-۲۸) یعنی نجاست تامہ تو مشرکین کے ساتھ مختص ہے۔ نیز فرمایا:۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور لہو۔۔ حرام کر دیا ہے (۲-۱۷۳) یعنی مذکورہ اشیاء کے سوا اور کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا اس میں تنبیہ ہے کہ مطعومات میں سے جو چیزیں اصول شریعت میں حرام ہیں ان میں سے

---

[1] راجع للبحث من کلمۃ آمین الرضی علی الکافیہ ۶۷ ج ۲ القرطبی ۹۹-۱۰۰ وزن آمین: المسائل الحلبیہ ص ۸ [2] وفی ابن کثیر ۱: ۳۱ وحکی القرطبی عن مجاہد وجعفر الصادق وبلال بن یساف ان آمین اسم من اسماء اللہ تعالیٰ قال وروی عن ابن عباس مرفوعا ولا یصح قالہ ابوبکر ابن العربی المالکی بل روی ابن مردویہ عن ابی ہریرۃ مرفوعاً آمین خاتم رب العلمین وفی الدعاء لابن ابی شیبۃ ان جبریل لقن رسول اللہ وقال قل آمین فقال آمین واختلف الفقہاء فی انہ یستحب برفع الصوت ام باخفائہ راجع کتب الخلاف [3] ابو علی الحسن بن احمد (او محمد) بن عبد الغفار الفسوی الفارسی الشیرازی (۲۸۸-۳۷۷) من تلامذۃ السراج والزجاج صاحب التصانیف الشہیرۃ انظر الفہرست ۶۴ ونزہۃ الالباء ۳۸۷-تاریخ بغداد ۷/۲۷۵ ابن خلکان ۱۳۵ الارشاد ولیا قوت ۳: ۹-۲۲ والکامل لابن اثیر ۹ = ۳۶ شذرات ۳/۸۸-۹۹ بغیہ ۲۱۶ [4] تحقیق نفیس فی الفرق بینہما الروض الانف ج ۲ ص ۳۱ بحث انما۔ بدائع الفوائد لابن القیم ص ۱۰۲ علۃ تخفیف النون فی اشہد ان لا الٰہ وتشدیدہا فی وان محمداً (ازاہیر الریاض المریعۃ للبیہقی فی اللغۃ ۱۹

یہ چیزیں سب سے بڑھ کر ہیں۔

(اَنْ)

یہ چار طرح پر استعمال ہوتا ہے (۱) اَنْ مصدریہ۔ یہ ماضی اور مضارع دونوں پر داخل ہوتا ہے اور اس کا مابعد تاویل مصدر میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ مضارع کو نصب دیتا ہے جیسے:۔

اَعْجَبَنِیْ اَنْ تَخْرُجَ وَ اَنْ خَرَجْتَ۔

۲۔ اَنْ المخففہ مِنَ المثقلۃ یعنی وہ اَنّ جو ثقیلہ سے خفیفہ کر لیا گیا ہو یہ کسی شے کی تحقیق اور ثبوت کے معنی دیتا ہے جیسے:۔ اَعْجَبَنِیْ اَنْ زَیْدٌ مُنْطَلِقٌ

۳۔ اَنْ (زائدہ) جو لَمَّا کی توکید کے لئے آتا ہے۔ جیسے فرمایا فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ جب خوشخبری دینے والا آ پہنچا (۱۲-۹۶)

۴۔ اَنْ مفسرہ۔ یہ ہمیشہ اس فعل کے بعد آتا ہے جو قول کے معنی پر مشتمل ہو (خواہ وہ لفظاً ہو یا معنیً) جیسے فرمایا:۔ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا اور ان میں جو معزز تھے وہ چل کھڑے ہوئے (اور بولے) کہ چلو (۳۸-۶) یہاں اَنِ امْشُوْا، قَالُوْا کے معنی کو متضمن ہے[1]

اِنْ

اَنْ کی طرح یہ بھی چار طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ اِنْ شرطیہ جیسے فرمایا:۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں (۵-۱۱۸)

۲۔ اِنْ مخففہ جو اِنَّ ثقیلہ سے مخفف ہوتا ہے (یہ تاکید کے معنی دیتا ہے اور) اس کے بعد لام (مفتوح) کا آنا ضروری ہے جیسے فرمایا:۔

اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا (تو) یہ ضرور ہم کو بہکا دیتا (۲۵-۴۲)

۳۔ اِنْ نافیہ اس کے بعد اکثر اِلَّا آتا ہے[2] جیسے فرمایا:۔ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا... ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں (۴۵-۳۲)

اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (پھر بولا) یہ (خدا کا کلام نہیں بلکہ) بشر کا کلام ہے (۷۴-۲۵)

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے کسی معبود نے تمہیں آسیب پہنچا (کر دیوانہ کر) دیا ہے (۱۱-۵۴)

۴۔ اِنْ (زائدہ) جو (ما) نافیہ کی تاکید کے لئے آتا ہے جیسے: مَا اِنْ يَخْرُجُ زَيْدٌ۔ زید باہر نہیں نکلے گا۔

(ا ن ث)

اَلْاُنْثٰى (مادہ) یہ ذَكَرٌ یعنی نر کی ضد ہے اصل میں انثیٰ و ذکر عورت اور مرد کی شرمگاہوں کے نام ہیں پھر اس معنی کے لحاظ سے (مجازاً) یہ دونوں نر اور مادہ پر بولے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى۔ جو نیک کام کرے گا مرد ہو یا عورت (۴-۱۲۴)

اور چونکہ تمام حیوانات میں مادہ بنسبت نر کے کمزور ہوتی ہے لہذا اس میں معنی ضعف کا اعتبار کر کے ہر ضعیف الاثر چیز کو انثیٰ کہہ دیا جاتا ہے چنانچہ کمزور لوہے کو حَدِيْدٌ اَنِيْثٌ کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے[3] ع

(۲۸) ...... عِنْدِیْ جُرَازٌ لَا اَفَلُّ وَلَا اَنِيْثٌ

---

[1] راجع المغنی ج ۱ ص ۲۴-۳۵ وبحث اَنْ ۱۷-۴۷ [2] ایضاً [3] لصخر الغی واولہ: فیعلمہ بان العقل ... والبیت فی اللسان (انث) والبحر (۳: ۲۵۳) والاقتضاب ۴۵ وقبلہ: ولیت مبلغا یاتی بقولی۔ نقار ابی المثلم لا یریث

میرے پاس شمشیر براں ہے جو کند اور کمزور نہیں ہے۔ اور انثیٰ (مادہ) کے ساتھ تشبیہ دیگر نرم اور زرخیز زمین کو بھی ارض انیث کہہ دیا جاتا ہے یہ تشبیہ یا تو محض نرمی کے اعتبار سے ہے۔ اور یا عمدہ اور پیداوار دینے کے اعتبار سے اسے انیث کہا گیا ہے جیسا کہ زمین کو عمدہ اور پیداوار کے اعتبار سے حُرّۃ اور ذَلُول کہا جاتا ہے۔

پھر بعض اشیاء کو لفظوں میں مذکر کے ساتھ تشبیہ دے کر اس کے لئے صیغہ مذکر استعمال کیا جاتا ہے اور بعض کو مؤنث کے ساتھ تشبیہ دے کر صیغہ تانیث استعمال کرتے ہیں جیسے۔ یَدٌ۔ اُذُنٌ اور خُصْیَۃٌ چنانچہ خصیتین پر تانیث لفظی کی وجہ سے انثیین کا لفظ بولا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (ع وافر)

(۲۹) وَمَا ذَكَرٌ وَإِنْ يَسْمَنْ فَأُنْثَىٰ

اور کونسا مذکر ہے کہ اگر وہ موٹا ہو جائے تو مؤنث ہو جاتا ہے۔ اس سے مراد قُراد یعنی چیچڑ ہے کہ جب وہ بڑھ کر خوب موٹا ہو جاتا ہے تو اسے حَلَمَۃٌ بلفظ مؤنث کہا جاتا ہے اسی طرح آیت کریمہ۔ وَإِنْ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا (۴-۱۱۷) وہ خدا کے سوا جن کی بھی پرستش کرتے ہیں وہ مادہ ہیں۔ میں إِنَاثٌ، اُنْثیٰ کی جمع ہے) بعض مفسرین نے احکام لفظیہ کا اعتبار کرتے ہوئے لکھا ہے

کہ مشرکین اپنے بتوں کو جن اسماء سے پکارتے تھے جیسے لات، عزیٰ، منات الثالثۃ یہ سب مؤنث ہیں اس لئے قرآن نے اناث کہہ کر پکارا[2] ہے۔ اور بعض نے معنی کا اعتبار کیا ہے اور کہا ہے کہ ہر منفعل اور ضعیف چیز کو انیث کہا جاتا ہے جیسے کمزور لوہے پر انیث کا لفظ بولتے ہیں اسکی تفصیل یہ ہے کہ موجودات کی باہمی نسبت کے اعتبار سے تین قسمیں ہیں ۱ فاعل غیر منفعل، یہ صفت صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مختص ہے۔
۲ منفعل غیر فاعل یہ خاصہ جمادات کا ہے۔
۳ ایک اعتبار سے فاعل اور دوسرے اعتبار سے منفعل جیسے جن وانس اور ملائکہ کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اعتبار سے منفعل اور اپنی مصنوعات کے لحاظ سے فاعل ہے اور چونکہ ان کے معبود جمادات کی قسم سے تھے جو منفعل محض ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے انہیں اناث کہہ کر پکارا ہے اور اس سے ان کی اعتقادی جہالت پر تنبیہ کی ہے کہ جن کو تم نے معبود بنا رکھا ہے ان میں نہ عقل ہے نہ سمجھ، نہ سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں بلکہ کسی حیثیت سے بھی کوئی کام سرانجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

اسی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے (توحید کی طرف دعوت کے سلسلہ میں) اپنے باپ سے کہا۔

---

[1] وفی التنبیہ للبکری قالہ بیاض والبیت فی المخصص (۱۶: ۱۰۲) والمفضلیات لشرح ابن الانباری ۲۷۰ واللسان والصحاح (ضرس) غیر منسوب والاقتضاب ۸ الم دفی روایتہم جمیعا دان یکبر بدل وان لیسمن وہو الصواب راجع السمط (۱: ۱۷۵) وتمامہ: شدید الازم لیس بذی ضروس ثنال البکری وکذا انشدہ ابوعلی الفارسی وفی روایۃ لیس لہ ضروس والصواب الا ول قالہ ابن البری وراجع حواشی الصحاح والتنبیہ للبکری ۳۰ والمزہر (۱: ۵۷۲) وشرح ابیات الایضاح للشنتری ۷۴ آ (مخطوط) والمعانی للقتبی ۴۴۲ وبعدہ: اناوجدنا بن سلمۃ بمنزلۃ مثل القراد علی حالیسنی بالناس وبعدہ ابیات لغزنی الشطرنج [2] چنانچہ حسن سے مروی ہے: لم یکن حی من احیاء العرب الا ولہم صنم یعبدونہ یسمونہ انثی بنی فلان الکشاف

يَا اَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْئًا (۱۹-۴۲) کہ ابا آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آ سکیں لیکن آیت کریمہ:۔ وَجَعَلُوا الْمَلٰئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا (۴۳-۱۹) اور انہوں نے فرشتوں کو کہ وہ بھی خدا کے بندے ہیں (مادہ خدا کی بیٹیاں) بنا دیا میں ملائکہ کو اناث قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔

(ا ن س)

اَلْاِنْسُ یہ جن کی ضد ہے اور (اُنْسٌ (بضمہ الہمزہ) نُفُوْرٌ کی ضد ہے اور اِنْسِيٌّ۔ اِنْسٌ کی طرف منسوب ہے اور اِنْسِيٌّ اسے کہا جاتا ہے۔ جو بہت زیادہ مانوس ہو اور ہر وہ چیز جس سے اُنس کیا جائے اسے بھی اِنْسِيٌّ کہدیتے ہیں اور جانور یا کمان کی وہ جانب جو سوار یا کمانچی کی طرف ہو اسے اِنْسِيٌّ کہا جاتا ہے اور اس کے بالمقابل دوسری جانب کو وَحْشِيٌّ کہتے ہیں اِنْسٌ کی جمع اَنَاسِيٌّ ہے قرآن میں ہے:۔

وَاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا (۲۵-۴۹) بہت سے (چوپایوں) اور آدمیوں کو۔ اور نفس انسانی کو اِبْنُ اِنْسِكَ کہا جاتا ہے۔

اٰنَسَ (افعال) کے معنی کسی چیز سے انس پانا یا دیکھنا ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا (۴-۶) اگر ان میں عقل کی پختگی دیکھو۔ اٰنَسْتُ نَارًا (۲۷-۷) میں نے آگ دیکھی۔

اور آیت کریمہ:۔ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا (۲۴-۲۷) کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تم ان سے اجازت لے کر انس پیدا نہ کر لو۔

اَلْاِنْسَانُ۔ انسان چونکہ فطرۃً ہی کچھ اس قسم کا واقع ہوا ہے کہ اس کی زندگی کا مزاج باہم انس اور میل جول کے بغیر نہیں بن سکتا اس لئے اسے انسان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اسی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ انسان طبعی طور پر متمدن واقع ہوا ہے۔ کیونکہ وہ آپس میں میل جول کے بغیر نہیں رہ سکتا اور نہ ہی اکیلا ضروریات زندگی کا انتظام کر سکتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اسے جس چیز سے محبت ہوتی ہے اسی سے مانوس ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے انسان کہا جاتا ہے۔ بعض کا قول ہے کہ انسان اصل میں اِنْسِيَانٌ بروزن اِفْعِلَانٌ ہے اور (انسان) چونکہ اپنے عہد کو بھول گیا تھا اس لئے اسے انسان کہا گیا ہے۔

(ا ن ف)

اَلْاَنْفُ اصل میں اَنْفٌ بمعنی ناک[1] ہے۔ مجازاً کسی چیز کے سرے اور اس کے بلند تر حصہ کو بھی اَنْفٌ کہا جاتا ہے چنانچہ پہاڑ کی چوٹی کو اَنْفُ الْجَبَلِ اور کنارہ ریش کو اَنْفُ اللِّحْيَةِ کہدیتے ہیں۔ اور حمیت و غضب اور عزت و ذلت کو انف کی طرف منسوب کیا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے ع

(۳۰) اِذَا غَضِبَتْ تِلْكَ الْاُنُوْفُ لَمْ اُرْضِهَا
وَلَمْ اَطْلُبِ الْعُتْبٰى وَلٰكِنْ اَزِيْدُهَا

اور جب وہ ناراض ہوں گے تو میں انہیں راضی نہیں کروں گا۔ بلکہ ان کی ناراضگی کو اور بڑھاؤں گا۔

---

[1] وفی القرآن:۔ والانف بالانف (۵-۴۵)

اور متکبر کے متعلق کہا جاتا ہے۔ شَمَخَ فُلَانٌ بِأَنْفِهٖ فلاں نے ناک چڑھائی یعنی تکبر کیا۔
تَرِبَ أَنْفُهٗ وہ ذلیل ہو۔
أَنِفَ فُلَانٌ مِنْ كَذَا کسی بات کو باعث عار سمجھنا أَنَفْتُهٗ اس کی ناک پر مارا۔ اور أَنَفَةٌ بمعنی حمیت بھی آتا ہے۔
اِسْتَأْنَفْتُ الشَّیْءَ کے معنی کسی شے کے سرے اور مبدا کو پکڑنے اور اس کا آغاز کرنے کے ہیں، اور اسی سے ارشاد ہے۔ مَاذَا قَالَ آنِفًا (۴۷-۱۶) انہوں نے ابھی (شروع میں) کیا کہا تھا؟

(ا ن م ل)

آیت کریمہ:۔
عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ (۳-۱۱۹) (تو) تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کھاتے ہیں میں أَنَامِلُ أَنْمُلَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی انگلی کے اوپر کے پورے کے ہیں جس میں ناخن ہوتا ہے۔ محاورہ ہے۔ فُلَانٌ مُؤَنْمَلُ الْأَصَابِعِ فلاں کی انگلیوں کے پور غلیظ اور چھوٹے ہیں۔ اس میں ہمزہ زائدہ ہے کیونکہ نَمِلُ الْأَصَابِعِ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے اور اسے صرف لفظی مناسبت کی وجہ سے ہم نے یہاں کر دیا ہے۔

(أَنّٰی)

أَنّٰی۔ یہ حالت اور جگہ دونوں کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے اس لئے بعض نے کہا ہے کہ یہ بمعنی أَيْنَ اور كَيْفَ۔ کے آتا ہے پس آیت کریمہ:۔ أَنّٰی لَكِ هٰذَا (۳-۳۷) کے معنی یہ ہیں کہ کھانا تجھے کہاں سے ملتا ہے۔

(أَنَا)

ضمیر واحد متکلم ہے ایک لغت میں وصل کے وقت اس کا الف حذف کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ (۱۸-۳۸) مگر میں تو یہ کہتا ہوں کہ خدا ہی میرا پروردگار ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ لٰكِنَّا اصل میں لٰكِنْ أَنَا ہے أَنَا کے ہمزہ کو حذف کر کے لٰكِنْ کے نون کو نَا کے نون میں ادغام کر دیا گیا ہے ایک قرأت میں لٰكِنْ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ۔ ہے جس میں أَنَا کے آخری الف کو حذف کر دیا گیا ہے۔
إِنِّيَّةُ الشَّیْءِ وَ أُنِّيَّتُهٗ۔ کے معنی ذات شی کے ہیں اس سے کسی شے کے وجود کی طرف اشارہ ہوتا ہے یہ ترکیب عربی نہیں ہے بلکہ محدث ہے۔

(ا ن ی)

أَنَی (ض) الشَّیْءُ اس کا وقت قریب آگیا۔ وہ اپنی انتہا اور پختگی کے وقت کو پہنچ گئی۔ قرآن میں ہے:۔ أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا کیا ابھی تک مومنوں کے لئے وقت نہیں آیا (۵۷-۱۶)
غَيْرَ نَاظِرِيْنَ إِنَاهُ (۳۳-۵۳) تم کھانے کے وقت کا انتظار کر رہے ہو (أَنَی الْحَمِيْمُ۔ پانی حرارت میں انتہا کو پہنچ گیا) قرآن میں ہے حَمِيْمٍ آنٍ (۵۵-۴۴) مِنْ عَيْنٍ آنِيَةٍ (۸۸-۵) گرم کھولتے ہوئے چشمے سے۔
أَنْیٌ (بتثلیث الھمزہ) وقت کا کچھ حصہ اس کی جمع آنَاءٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
يَتْلُوْنَ آيَاتِ اللّٰهِ آنَاءَ اللَّيْلِ (۳-۱۱۳)

جورات کے وقت خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں وَمِنْ آنَاءِ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ (۲۰-۳۰) اور رات کے اوقات میں (بھی) اس کی تسبیح کیا کرو۔

اِنًی"۔ ہمزہ مکسور ہونے کی صورت میں اسم مقصور ہوگا اور ہمزہ مفتوح ہونے کی صورت میں اسم ممدود حطیئہ نے کہا ہے[1] (الوافر)

(۳۱) آنَيْتُ الْعَشَاءَ اِلٰی سُهَيْلٍ

اَوِ الشِّعْرٰی فَطَالَ بِیَ الْاَنَاءُ

میں نے سہیل یا شعریٰ ستارہ کے طلوع ہونے تک کھانے کو مؤخر کر دیا اور میرا انتظار طویل ہو گیا۔ آنَيْتُ الشَّيْئَ اِيْنَاءً۔ کسی کام کو اس کے مقررہ وقت سے مؤخر کرنا[2]۔ تَاَنَّيْتُ۔ میں نے دیر کی اَلْاَنَاةُ۔ حلم۔ وقار۔ طمانیت تَاَنّٰی فُلَانٌ تَاَنِّيًا۔ وَاَنٰی يَاْنِیْ اَنْیًا (س) تحمل اور حلم سے کام لینا۔ اِسْتَاْنَيْتُ الشَّیْئَ میں نے اس کے وقت کا انتظار کیا نیز اس کے معنی دیر کرنا بھی آتے ہیں جیسے اِسْتَاْنَيْتُ الطَّعَامَ۔ میں نے کھانے کو اس کے وقت سے مؤخر کر دیا۔

اَلْاِنَاءُ۔ برتن۔ جمع آنِيَةٌ۔ جیسے كِسَاءٌ وَاَكْسِيَةٌ اس کی جمع الجمع اَلْاَوَانِیْ ہے۔

(اھ ل)

اَهْلُ الرَّجُلِ۔ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو اس کے ہم نسب یا ہم دین ہوں اور یا کسی صنعت یا مکان میں شریک ہوں یا ایک شہر میں رہتے ہوں اصل میں اھل الرجل تو وہ ہیں جو کسی کے ساتھ ایک مسکن میں رہتے ہوں پھر مجازاً آدمی کے قریبی رشتہ داروں پر اہل بیت الرجل کا لفظ بولا جانے لگا ہے اور عرف میں اہل البیت کا لفظ خاص کر آنحضرت ؐ کے خاندان پر بولا جانے لگا ہے کیونکہ قرآن میں ہے:۔ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ (۳۳-۳۳) اے پیغمبر کے اہل بیت خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دور کر دے۔

اور کبھی اہل الرَّجُل سے بیوی مراد ہوتی ہے[3]۔ اور اَهْلُ الْاِسْلَامِ کے معنی مسلمان قوم کے ہیں۔ شریعت (اسلامیہ) نے اکثر احکام میں کافر اور مسلمان کے مابین چونکہ نسبی تعلق کو کالعدم قرار دیا ہے اس لئے (نوح علیہ السلام) کے لڑکے متعلق فرمایا:۔ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (۱۱-۴۶) یعنی یہ تیرے خاندان سے نہیں ہے اس کے اعمال غیر صالح ہیں۔ اور فرمایا وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ (۱۱-۴۰) اپنے اہل کو کشتی میں سوار کر لو۔ ہاں جس شخص کی نسبت حکم ہو چکا ہے اس کو سوار نہ کرنا۔

---

[1] قالہ حطیئۃ فی قصیدۃ ۳۴ بیتا یہجو فیہا الزبرقان بن بدر مطلعہا:۔ الا ابلغ بنی عوف بن کعب۔ فہل قوم علی خلق سواء القصیدۃ فی دیوانہ (۹۸-۱۰۹ نشر نعمان قاہرہ ۱۳۲۷ھ والبیت فی اضداد الاصمعی ۲۷ وابن السکیت ۱۸۲ واضداد ابن الانباری ۸۲ واضداد ابی الطیب ۶۱ واللسان (انی) والطبری ۲۲: ۴۳ والاشباہ والنحویہ ۴: ۹۴ وابن ولاد ۷، ۸۱ والعمدۃ ۱: ۲، ۱۷ وذیل مجالس ثعلب (۱: ۲۷۶) وفی روایۃ ابی عبیدۃ واکریت بدل وآنیت (اللسان بکرا) واصلاح ابی یعقوب ۲۴۳ وفی روایۃ الاصمعی آنیت وروایہ فی المختارات ۱۳۰ فی قصیدۃ ۳۴ مطلعہا: الا قالت امامۃ ہل تعزی۔ فقلت امیم قد غلب العزاء [2] وفی الحدیث قال صلی اللہ علیہ وسلم لقد آنیت وآذیت فی رجل جاء یوم الجمعۃ یتخطی رقاب الناس۔ [3] وفی القرآن: وسار باہلہ (۲۸-۲۹)

اَھَلَ الرَّجُلُ (ن ض)، یَأْھُلُ اُھُوْلاً اس نے شادی کرلی۔
مَکَانٌ مَاھُوْلٌ آباد جگہ جہاں لوگ بستے ہوں۔
اُھِلَ بِہٖ۔ وہ جگہ آباد ہوگئی۔ دَابَّۃٌ اَھِلٌ وَ اَھْلِیٌّ وہ چوپایہ جوکسی جگہ سے مانوس ہو (پالتو) تَاَھَّلَ الرَّجُلُ۔ اس نے شادی کرلی اس سے (بطور دعا) کہا جاتا ہے اَھَّلَکَ اللّٰہُ فِی الْجَنَّۃِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں بیوی اور اہل بخشے کہ تم ان کے ساتھ رہو۔
فُلَانٌ اَھْلٌ لِکَذَا۔ فلاں اس کا مستحق اور سزاوار ہے اور مہمان کی آمد پر اسے خوش آمدید کے طور پر مَرْحَبًا وَ اَھْلًا کہا جاتا ہے" یعنی ہمارے پاس تمہارے لئے فراخی ہے اور ہم تمہارے اہل بیت کی طرح تمہارے ساتھ شفقت سے پیش آئیں گے۔ اَھْلٌ کی جمع اَھْلُوْنَ وَ اَھَالٍ وَ اَھْلَاتٌ آتی ہے[1]

(ا و ب)

اَلْاَوْبُ۔ گو اس کے معنی رجوع ہونا کے ہیں لیکن رجوع کا لفظ عام ہے جو حیوان اور غیر حیوان دونوں کے لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔ مگر اَوْبٌ کا لفظ خاص کر حیوان کے ارادۃً لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔ آبَ اَوْبًا وَاِیَابًا وَ مَآبًا وہ لوٹ آیا قرآن میں ہے:۔
اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَھُمْ (۸۸-۲۵) بیشک ہماری طرف لوٹ کرآنا ہے۔ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّہٖ مَاٰبًا (۷۸-۳۹) پس جو شخص چاہے اپنے پروردگار کے پاس ٹھکانا بنائے۔
اَلْمَاٰبُ۔ یہ مصدر (میمی) ہے اور اسم زمان اور مکان بھی۔ قرآن میں ہے:۔
وَ اللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (۳-۱۴) اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔
اَلْاَوَّابُ۔ یہ تَوَّابٌ کی (صیغہ مبالغہ) ہے یعنی وہ شخص جو معاصی کے ترک اور فعل طاعت سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا ہو۔ قرآن میں ہے:۔ لِکُلِّ اَوَّابٍ حَفِیْظٍ۔ یعنی ہر رجوع لانے اور حفاظت کرنے والے کے لئے (۵۰-۳۲) اِنَّہٗ اَوَّابٌ (۳۸-۱۷) بیشک وہ رجوع کرنے والے تھے۔
اسی سے اَوْبَۃٌ بمعنی توبہ بولا جاتا ہے۔۔۔۔
اَلتَّاْوِیْبُ۔ دن کو سفر کرنا اور شاعر کے قول ع
(۴۲) آبَتْ یَدُ الرَّامِیْ اِلَی السَّھْمِ"
تیرانداز کا ہاتھ تیر کی طرف لوٹ آیا۔
میں اٰوَبَ (لوٹنا) کی نسبت ید کی طرف کی گئی ہے حو درحقیقت تیرانداز کا فعل ہے۔ اس سے ہمارے سابق بیان پر اعتراض نہیں ہوسکتا ہے کہ اَوْبٌ کا ارادہ اور اختیار کے ساتھ لوٹنے پر بولا جاتا ہے[2]۔
اسی طرح نَاقَۃٌ اَءُوْبٌ سبک رفتار اونٹنی کو کہتے کیونکہ اس کے ہاتھ پھرتی سے لوٹتے ہیں۔

(ا و د)

اَلْاَوْدُ (ن)، آدَیَؤُدُ اَوْدًا وَاِیَادًا کے بوجھل اور گرانبار کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] واہلنا اہل الکتاب الذین عندہم کتاب سماوی وفی جمیع القرآن المراد بہم الیہود والنصاریٰ [2] وفی القرآن: یٰجبال اوّبی معہ (۳۴-۱۰) وفی الحدیث شغلونا عن صلوۃ الوسطیٰ حتی آبت الشمس راجع ھتاج (راغب)

وَلَا يَؤُدُهٗ حِفْظُهُمَا (۲-۲۵۵) اور آسمان و زمین کی حفاظت باری تعالیٰ کو بوجھل نہیں کرتی اور یہ بروزن قَالَ يَقُوْلُ قَوْلاً ہے اس سے واحد متکلم کا صیغہ اُدْتُ بروزن قُلْتُ ہوگا اصل میں آدَهٗ کے معنی ہیں اس نے اپنے بوجھ اور گرانباری کی وجہ اس کی گذرگاہ سے ٹیڑھا کر دیا۔

(ا و ل)

اٰلُ۔ بعض نے کہا ہے کہ آل اصل میں اہل ہے کیونکہ اس کی تصغیر اُھَیْلٌ آتی ہے مگر اس کی اضافت ناطقین انسان میں سے ہمیشہ عَلَم کی طرف ہوتی ہے کسی اسم نکرہ یا زمانہ یا مکان کی طرف اس کی اضافت جائز نہیں ہے اس لئے آل فلان (علم) تو کہہ سکتے ہیں مگر آل رجل، آل زمان کذا و آل مکان کذا بولنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح ہمیشہ صاحب شرف اور افضل ہستی کی طرف مضاف ہوگا اس لئے آل الحیاط بھی نہیں کہہ سکتے بلکہ آل اللہ یا آل السلطان کہا جائیگا۔ مگر اھل کا لفظ مذکورہ بالا میں سے ہر ایک کی طرف مضاف ہو کر آجاتا ہے۔ چنانچہ جس طرح اہل زمن کذا و بلد کذا بولا جاتا ہے اسی طرح اہل اللہ و اہل الحیاط بھی کہہ دیتے ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ لفظ "آل" دراصل بمعنی شخص ہے اس کی تصغیر اُوَیل آتی ہے اور یہ اس شخص کے متعلق استعمال ہوگا جس کو دوسرے کے ساتھ ذاتی تعلق ہو مگر قریبی رشتہ داری یا تعلق والا ہو۔ قرآن میں ہے وَاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ (۳-۳۳) خاندان ابراہیم اور خاندان عمران۔ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (۴۰-۴۶) فرعون والوں کو نہایت سخت عذاب میں داخل کر دو۔

آلُ النبیؐ۔ بعض نے کہا ہے کہ آل النبی سے آنحضرت کے رشتہ دار مراد ہیں۔ اور بعض کے نزدیک اس سے وہ لوگ مراد ہیں جنہیں علم و معرفت کے اعتبار سے آنحضرت کے ساتھ خصوصی تعلق حاصل ہو۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اہل دین دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو علم و عمل کے اعتبار سے راسخ اور محکم ہوتے ہیں ان کو آلُ النبیِّ اور اُمَّتُهٗ بھی کہہ سکتے ہیں دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا سراسر تقلیدی ہوتا ہے ان کو اُمَّتُ محمدٍ صلی اللہ علیہ وسلم تو کہہ سکتے ہیں مگر آلِ محمدٍ نہیں کہہ سکتے اس سے معلوم ہوا کہ امت اور آل میں عموم و خصوص کی نسبت ہے یعنی ہر آل نبی اس کی امت میں داخل ہے مگر ہر امتی آلِ نبی نہیں ہو سکتا۔

امام جعفر صادقؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ لوگ تمام مسلمانوں کو آل نبی میں داخل سمجھتے ہیں۔ تو انہوں نے فرمایا یہ صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ سائل نے عرض کی یہ کیسے؟ فرمانے لگے غلط تو اس لئے کہ تمام امت آل نبی میں داخل نہیں ہے اور صحیح اس لئے کہ وہ شریعت کے کماحقہٗ پابند ہو جائیں تو انہیں آل النبی کہا جا سکتا ہے[لہ]۔

اور آیت کریمہ: قَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ (۴۰-۲۸) اور فرعون کے لوگوں میں سے ایک مومن شخص۔۔۔ کہنے لگا میں اس مرد مومن کے آل فرعون سے ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ (بظاہر) تو اس کے خصوصی اہل کاروں اور فرعونی شریعت کے ماننے والوں سے تھا اور مسکن

لہ فی الحدیث آل محمد کل تقی (طس) والرسالۃ القشیریہ ص ۵۶ عن انس) انظر المجالس للشیخ الجیلانی والشفاء للقاضی عیاض مع شرح نسیم الریاض — وایضاً الرخصۃ وشرح المہذب للنووی۔

ونسب کے اعتبار سے انہیں میں سے شمار ہوتا تھا نہ اس لئے کہ وہ لوگ بھی اسے اپنی شریعت کا پابند خیال کرتے تھے۔

بعض نے کہا ہے کہ جبرئیل اور میکائیل میں ایل اسماء حسنیٰ سے ہے مگر قواعد عربیہ کی رو سے یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر یہ اسماء مرکب اضافی ہوتے تو لفظ ایل کو مضاف الیہ ہونے کی بنا پر مجرور ہونا چاہیئے تھا۔

آلُ الشیٔ کے معنی کسی چیز کا شخص کے ہیں اور جو دور سے مضطرب نظر آ رہا ہو۔

شاعر نے کہا ہے[۱] (طویل)

(۳۳) وَلَمْ یَبْقَ اِلَّا آلُ خَیْمٍ مُنَضَّدٍ

کہ مرتب خیموں کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا

اور آل اس حالت کو بھی کہتے ہیں جس کی طرف انسان کا معاملہ آخر کار لوٹ کر آئے شاعر نے کہا ہے[۲]

سَاَحْمِلُ نَفْسِیْ عَلٰی آلَۃٍ (متقارب)

فَاِمَّا عَلَیْھَا وَ اِمَّا لَھَا

آخر الامر میں اپنی جان کو ایسے امر پر مجبور کرونگا وہ یا تو اس کے لئے نقصان دہ ہوگی یا فائدہ مند۔

اور آل بمعنی سراب بھی آتا ہے یعنی وہ جو ہوا کے تموج سے یا ویسے بے حقیقت چیز (دوپہر کے وقت) دکھائی دیتی ہے لہذا یہ اصل میں آل یوٴل سے ہے جس کے معنی لوٹنا کے ہیں۔ آل اللَّبَنُ دودھ گاڑھا ہو گیا گویا اس میں نقصان کی طرف رجوع ہونے کے معنی ملحوظ ہیں جیسا کہ ناقص چیز کو رَاجِعٌ کہا جاتا ہے۔

اَلتَّاوِیْلُ۔ یہ بھی اول سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کے اصل کی طرف رجوع ہونے کے ہیں اور جس مقام کی طرف کوئی چیز لوٹ کر آئے اُسے مَوْئِلٌ (جائے بازگشت) کہا جاتا ہے۔

پس تَاوِیْلٌ کسی چیز کو اس غایت کی طرف لوٹانا کے ہیں جو اس سے بلحاظ علم یا عمل کے مقصود ہوتی ہے۔ چنانچہ غایت علمی کے متعلق فرمایا:

وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗ اِلَّا اللّٰہُ وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (۳-۶) حالانکہ اس کی مراد اصلی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا یا وہ لوگ جو علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں اور غایت عملی کے متعلق شاعر نے کہا ہے[۳]

(۳۵) "وَلِلنَّوٰی قَبْلَ یَوْمِ الْبَیْنِ تَاوِیْلُ"

اور جدائی کے دن سے پہلے ہی جدائی کا انجام کار اور اس کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔

اور قرآن میں ہے ھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِیْلَہٗ یَوْمَ یَاْتِیْ تَاْوِیْلُہٗ (۷-۵۳) اب صرف وہ اس کی تاویل یعنی وعدہ عذاب کے انجام کار کا انتظار کر رہے ہیں جس دن اس وعدہ عذاب کے نتائج

---

[۱] قالہ زہیر یمدح ہرم بن سنان و صدرہ: اربت بہا الارواح کل عشیۃ ـ ... وفی روایۃ فلم یبق بدل ولم والبیت فی دیوانہ ۱۸۰ بشرحہ للشنتمری طبع لیدن سنہ ۱۳۰۶ھ والعقد الثمین ۹۷ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۲۰۸) تا البحر (۱: ۵۵۴) وفیہ آل نؤی بدل آل خیم وفی اللسان انظر صدر البیت وعجزہ: یسفع علی آس ونؤی معثلب ونسبہ الی النابغۃ ویروی عجزہ وثم علی عرش الخیام غسیل۔ قال ورواہ ابو عبیدۃ للنابغۃ و ثعلب للزہیر [۲] قالتہ خنساء فی رثاء ابی عمرو والبیت فی اللسان والمحکم (علاء فوق) وایام العرب و ۲۹ یوم حوزۃ الثانی (۸: والکامل للمبرد و ۱۲۱۶ فی ستۃ ابیات [۳] قالہ عبدۃ بن الطبیب وصدرہ، وللاحبۃ ایام تذکرھا والبیت فی المفضلیات (۱: ۱۴۳) وتفسیر الطبری (۴: ۳۳) وتاریخ الطبری (۴: ۳۳) والقصیدۃ فی منتہی الطلب (۱: ۱۸۹-۱۹۲)

سامنے آجائیں گے۔

یعنی اس دن سے جو غایت مقصود ہے وہ عملی طور پر ان کے سامنے ظاہر ہو جائے گی۔

اور آیت کریمہ: ذَالِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاوِيلًا (۴-۵۹) میں بعض نے معنی اور مفہوم کے اعتبار سے احسن تاویلا ہونا مراد لیا ہے اور بعض نے آخرت میں بلحاظ ثواب کے احسن ہونا مراد لیا ہے۔

اَلْاَوْلُ (ن) کے معنی ہیں مآل اور نتیجہ پر نظر رکھتے ہوئے سیاست اور انتظام کرنا۔ اسی سے کہا جاتا ہے قَدْ اُلْنَا وَ اِیلَ عَلَیْنَا ہم نے حکومت کی اور ہم پر حکومت کی گئی۔

اَلْاَوَّلُ۔ خلیل کے نزدیک اس کی اصل (اول) ہے اس لئے فَعَّلٌ کے وزن پر ہوگا بعض کا خیال ہے کہ اس کا مادہ (و د ل) ہے اس لئے اَوَّل بروزن اَفْعَل ہوگا لیکن پہلا قول زیادہ صحیح ہے کیونکہ فا اور عین کلمہ میں دو حرف یک جنس نہایت قلیل الاستعمال ہیں۔ بہت صورت میں یہ اَوْلٌ سے مشتق ہوگا جس کے معنی اصل کی طرف رجوع ہونا کے ہیں اور اَوَّلَ اصل میں اَ دْلُ ہوگا کثرت استعمال کے باعث الف ثانی کو واؤ میں ادغام کر دیا گیا ہو۔

اَوَّلُ۔ اصل میں صیغہ صفت ہے کیونکہ اس کی تانیث اُولٰی بروزن اُخْرٰی آتی ہے۔ پس اَوَّل وہ ہے جس پر اس کا غیر مرتب ہو اور بچند وجوہ استعمال ہوتا ہے۔

(۱) جو دوسرے پر باعتبار زمانہ متقدم ہو جیسے عبد الملک اولاثم منصور۔ کہ پہلے عبد الملک اور پھر منصور۔

(۲) اور مرتبہ اور ریاست کے اعتبار سے دوسرے پر متقدم ہو اور دوسرا اس کی اقتدا کرے جیسے الامیر اولاثم الوزیر۔ کہ پہلے امیر اور اس کے بعد وزیر۔

(۳) وضع اور نسبت کے اعتبار سے پہلے ہو جیسے ایک شخص عراق سے روانہ ہو تو اسے کہا جائیگا۔ القادسیۃ اولاثم فید۔ کہ پہلے قادسیہ آئے گا اور پھر فید۔ اور مکہ سے روانہ ہونے والے کو کہا جائے گا کہ پہلے فید اور پھر قادسیہ آئے گا۔

(۴) جو نظام صناعی کے اعتبار سے متقدم ہو جیسے الاس اولاثم البناء کہ پہلے بنیا د رکھی جاتی ہے اس پر عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔

اور جب صفت باری تعالیٰ میں ھوالاول کہا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات ہوتی ہے جس سے پہلے کوئی چیز موجود نہ ہو اور جن علماء نے اول کے معنی غیر محتاج یا مستغنی بنفسہ کئے ان کا اشارہ بھی اسی معنی کی طرف ہے۔

اور آیت وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (۶-۱۶۴) اور آیت وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۷-۱۴۳) میں اَوَّل کے معنی یہ ہیں کہ اسلام و ایمان میں ہی سب سے پہلے دوسروں کے لئے اسوہ اور مقتدا بنتا ہوں اسی طرح آیت:۔ وَلَا تَكُوْنُوْا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ (۲-۴۱) کے معنی یہ ہیں کہ کفر میں پہل کر کے دوسروں کے لئے اسوہ اور پیشوا نہ بنو کہ لوگ تمہاری اقتدار کریں۔

لہ دنی القرآن۔ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى (۹۲-۱۳) راجع ایضاً (الدخان: ۳۵-۵۶) (النجم: ۲۵-۵۰-۵۶) (الواقعۃ: ۶۲) (النازعات: ۲۵) (اللیل: ۱۸) (الضحیٰ: ۴)

کبھی اوّل کا لفظ بطور ظرف بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس صورت میں یہ مبنی علی الضم ہوتا ہے جیسے جِئْتُکَ اَوَّلُ۔ اور کبھی اوّل بمعنی قدیم بھی آ جاتا ہے جیسے جِئْتُکَ اَوَّلاً وَ آخِرًا ای قدیمًا وحدیثًا یعنی پہلے بھی آیا تھا اور اب بھی۔

اور آیت کریمہ:۔ اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی (۷۵-۳۴) میں اولیٰ کلمۂ تہدید اور تخویف ہے اور جو شخص ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہو اسے تنبیہ کرنے کے لئے آتا ہے پھر جو شخص بڑی ذلت کے بعد ہلاکت سے بچ جائے اسے دوبارہ روکنے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے عموماً یہ کلمہ مکرر آتا ہے گویا اسے تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ انجام پر غور کر کے اس سے بچنے کی کوشش کرے[۱]۔

(ا و ن)

اَلْاٰنَ۔ ہر وہ لمحہ جو ماضی اور مستقبل کے مابین فرض کیا جائے اسے اَلْاٰنَ کہا جاتا ہے۔ جیسے اَلْاٰنَ افعل کذا (میں اب کرتا ہوں) اور اَلْاٰنَ کا لفظ ہمیشہ الف لام تعریف کے ساتھ استعمال ہوتا ہے[۱] اور اَفْعَلُ کَذَا آوِنَۃً کا محاورہ بھی اَلْاٰنَ سے ماخوذ ہے ھٰذَا اوان ذالک (یہ اس کا صحیح زمانہ یا وقت ہے) سیبویہ نے کہا ہے کہ اَلْاٰنَ آنُکَ کے معنی ہیں ھٰذَا الْوَقْتُ وَقْتُکَ اسی سے فعل آن یؤون اَوْنًا استعمال ہوتا ہے۔ ابو العباس[۳] لکھتے ہیں کہ یہ "اَلْاٰنَ" سے نہیں ہے بلکہ ایک مستقل اور علٰحدہ فعل ہے۔

(ا و ہ)

اَلْاَوَّاہُ۔ وہ شخص جو بہت زیادہ تلفظ کرتا ہو اور تَاَوَّہَ کے معنی ہیں حزن و غم ظاہر کرنے کے لئے اَوَّہْ زبان پر لانا اور ہر وہ کلمہ جس سے تاسف اور حزن کا اظہار ہوتا ہو اسے تَاَوَّہَ سے تعبیر کر لیتے ہیں لہٰذا اَوَّاہٌ کا لفظ ہر اس شخص پر بولا جاتا ہے جو خشیت الٰہی کا بہت زیادہ اظہار کرنیوالا ہو۔ اور آیت کریمہ:۔ اَوَّاہٌ مُّنِیْبٌ (۱۱-۷۵) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ (حضرت ابراہیم علیہ السلام) مومن اور بہت زیادہ دعا کرنے والے تھے مآل کے اعتبار سے یہ معنی بھی ماتقدم کی طرف راجع ہے۔

ابو العباس فرماتے ہیں کہ کام کے روکنے کے لئے کلمہ "اِیْھًا" اور ترغیب دینے کے لئے وَیْھًا کہا جاتا ہے اور اظہار تعجب کے لئے وَاھًا کہتے ہیں۔

(ا و ی)

اَلْمَاْوٰی (یہ اَوٰی (ض)، اُوِیًّا وَمَاْوًی کا مصدر ہے (جس کے معنی کسی جگہ پر نزول کرنے

---

[۱] قال فی اللسان الاصل فی الآن "ان یکون لزمان الحال ثم توسعوا فیہ للوصف واللام فیہ للتعریف واصل الآن" اوان "حذف الہمزۃ ثم غیرت واوہا الی الالف کما فی الراح والرباح [۲] بنصب الآن ورفع آنک قال ابن جنی وکذا قرأناہ فی الکتاب لسیبویہ راجع اللسان (این) والکتاب [۳] ابو العباس محمد بن یزید (۲۱۰ھ ۲۸۶) الثمالی المعروف بالمبرد امام العربیۃ واحد ائمۃ الادب والاخبار من کتبہ المطبوعۃ "الکامل" وشرح لامیۃ العرب المطبوع مع شرح الزمخشری ولہ کتب اخری معروفۃ۔ قال الزبیدی فی شرح خطبۃ القاموس المبرد بفتح الراء المشددۃ وبعضہم یکسر راجع لاحوالہ النزہۃ ۲۸۵ والبغیۃ ۱۱۶ والفہرست ۵۹ وطبقات للزبیدی رقم ۴۰ والانساب ۱۱۶ الثمالی والحصری ۲/۲۱۶ و۲۳۷ والادباء ۷/۱۳۷ والوفیات ۱/۴۹۵ ولسان المیزان ۵/۴۳۰ ومعانی العسکری ۱/۱۷ …

یا پناہ حاصل کرنے کے ہیں) اور اٰوٰی اِلٰی کذا۔ کے معنی ہیں کسی کے ساتھ مل جانا اور منضم ہو جانا اور آداہ (افعال) اِیْوَاءٌ کے معنی ہیں کسی کو جگہ دینا قرآن میں ہے اِذْ اَوَی الْفِتْیَۃُ اِلَی الْکَھْفِ (۱۸-۱۰) جب وہ اس غار میں جا رہے قَالَ سَاٰوِیْٓ اِلٰی جَبَلٍ (۱۱-۴۳) اس نے کہا کہ میں (ابھی) پہاڑ سے جا لگوں گا۔ وَتُؤْوِیْٓ اِلَیْکَ مَنْ تَشَآءُ (۳۳-۵۱) جسے چاہو اپنے پاس ٹھکانا دو وَفَصِیْلَتِہِ الَّتِیْ تُؤْوِیْہِ (۷۰-۱۳) اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا۔

اور آیت کریمہ:۔ عِنْدَھَا جَنَّۃُ الْمَاْوٰی (۵۳-۱۵) میں لفظ جَنَّۃ کی اضافت مَاْوٰی (مصدر) کی طرف ہے جیسا کہ دَارُ الْخُلْدِ (۴۱-۲۸) میں لفظ دار کی اضافت اَلْخُلْد مصدر کی طرف ہے[1] اور آیت مَاْوٰھُمْ جَھَنَّمُ (۱۷-۹۷) میں مَاْوٰی کے معنی رہنے کی جگہ کے ہیں۔

اَوَیْتُ لَہٗ اَوْیًا وَاِیَّۃً وَمَاْوِیَۃً وَمَاْوَاۃً کے معنی ہیں میں نے اس پر رحم کھایا۔ اصل میں اس کے معنی رَجَعْتُ اِلَیْہِ بِقَلْبِیْ کے ہیں یعنی میں دل سے اس کی طرف مائل ہوا۔

اور آیت کریمہ:۔ اٰوٰٓی اِلَیْہِ اَخَاہُ (۱۲-۶۹) کے معنی یہ ہیں کہ یوسفؑ نے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ملا لیا اور حاتم طائی کے شعر[2] (الطویل)

(۳۷) اَمَاوِیَّ اِنَّ الْمَالَ غَادٍ وَرَائِحٌ

ای ماویہ! بے شک مال صبح شام آنے جانے والی چیز ہے۔

میں اَلْمَاوِیَۃ۔ عورت (بیوی) کا نام ہے چنانچہ بعض نے اسے بھی اسی باب (اوی) سے مانا ہے اور کہا ہے کہ گویا قبولِ صورت (ماوی الصورۃ) ہونے کی وجہ سے اسے الماویہ کہا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے یہ مَاءٌ کی طرف نسبت ہے اور اصل میں مَائِیَۃ ہے ہمزہ کو واو کے ساتھ بدل لیا گیا ہے[3]

(ا ی ی)

اَیٌّ۔ جب استفہام کیلئے ہو تو جنس یا نوع کی تعیین اور تحقیق کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے اور یہ خبر اور جزا کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے[4] چنانچہ فرمایا: اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی (۱۷-۱۱۰) جس نام سے اسے پکارا اس کے سب نام اچھے ہیں اَیَّمَا الْاَجَلَیْنِ قَضَیْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَیَّ (۲۸-۲۸) کہ میں جونسی مدت (چاہوں) پوری کر دوں پھر مجھ پر کوئی زیادتی نہ ہو۔

---

[1] فی النسخ المطبوعۃ کلھا دار الخلود تصحیف وجاء فی التنزیل یوم الخلود (۵۰-۳۴) فی آیۃ فقط واما کلمۃ خلد فقد جاء فی آیات (۱۰-۵۲) (۲۵-۱۵) (۲۱-۳۴) (۳۲-۱۴) [2] قال فی شواھد الکشاف ۶۰ ان ماویۃ اسم ام حاتم وھی بنت عفیر وکانت تلومہ فی جودہ بالمال واصلہ نسبۃ الی الماء لانہا تشبیہ فی اللین والرقۃ وعجز البیت ۔۔۔ ویبقی من المال الاحادیث والذکر انظر دیوانہ ۵۰ فی ۲۰ بیتاً وراجع للبیت ایضاً الخزانۃ ۴: ۱۵۸/۳، ۱۹۳، ۱۹۳ وذیل الامالی ۳۰ فی اربعۃ ابیات والعقد ۳:۲۳۶ فی ۵ ابیات وقیل انہ افضل ما قیل فی الجود ورایت فی تقدمۃ دیوان (بیروت ۱۳۸۳ھ) ان ماویۃ زوجتہ وذکر فیہ قصۃ زواجہ معہ [3] راجع شرح شواھد الکشاف ۶۰ [4] ای یکون شرطا وقد یاتی موصولا نحو لننزعن من کل شیعۃ ایہم اشد (۱۹-۶۹) وفی اعراب الآیۃ اعتراک بین العلماء ویاتی والا علی معنی الکمال فیقع صفۃ للنکرۃ نحو زید رجل ای رجل وان یکون وصلۃ الی نداء ما فیہ ال نحو یا ایہا الناس فہذہ خمسۃ وجوہ

اَلْاٰیَۃُ۔ اسی کے معنی علامت ظاہرہ یعنی واضح علامت کے ہیں دراصل "آیۃ" ہر اس ظاہر شے کو کہتے ہیں جو دوسری ایسی شے کو لازم ہو جو اس کی طرح ظاہر نہ ہو مگر جب کوئی شخص اس ظاہر شے کا ادراک کرے گو اس دوسری (اصل) شے کا بذاتہ اس نے ادراک نہ کیا ہو مگر یقین کر لیا جائے کہ اس نے اصل شے کا بھی ادراک کر لیا کیونکہ دونوں کا حکم ایک ہے اور لزوم کا یہ سلسلہ محسوسات اور معقولات دونوں میں پایا جاتا ہے چنانچہ جب کسی شخص کو معلوم ہو کہ فلاں راستے پر فلاں قسم کے نشانات ہیں اور پھر وہ نشان بھی مل جائے تو اسے یقین ہو جائیگا کہ اس نے راستہ پالیا ہے۔ اسی طرح کسی مصنوع کے علم سے لامحالہ اس کے صانع کا علم ہو جاتا ہے۔

آیۃ کا لفظ یا تو اَیٌّ سے مشتق ہے کیونکہ یہ بھی ایک چیز کو دوسری سے تمیز دیتی ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ تَاَیِّیْ (مصدر تفعل) سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز پر ٹھہرنے اور تثبت حاصل کرنا کے ہیں کہا جاتا ہے: تَاَیَّ (امر) یعنی ٹھہرو اور رفق سے کام لو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُوِیٰ اِلَیْہِ سے مشتق ہو۔

(۱) آیۃً کا لفظ بلند عمارت پر بھی بولا جاتا ہے جیسے فرمایا: اَتَبْنُوْنَ بِکُلِّ رِیْعٍ آیَۃً تَعْبَثُوْنَ (۲۶-۱۲۸) کہ تم ہر فضا مقام پر بے کار نشان تعمیر کرتے ہو۔

(۲) اور قرآن کے ہر اس حصہ کو جو کسی حکم پر دال ہو آیۃ کہا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ ایک سورۃ ہو یا اس کی ایک فصل یا کئی فصلیں ہو۔

(۳) اور کبھی ہر اس کلام کو جو لفظی اعتبار سے دوسرے سے الگ ہو آیۃ کہدیا جاتا ہے اسی اعتبار سے سُوَر کی آیات کو آیات کہا جاتا ہے جن کے ذریعہ سورۃ شمار کی جاتی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَاتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۲۹-۴۴) میں آیات سے فکری دلائل مراد ہیں کہ لوگ اپنے مراتب علمیہ کے اعتبار سے ان کی معرفت میں مختلف درجات رکھتے ہیں۔ اسی معنی میں فرمایا: بَلْ ھُوَ آیَاتٌ بَیِّنَاتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا یَجْحَدُ بِآیَاتِنَا اِلَّا الظَّالِمُوْنَ (۲۹-۴۹) بلکہ یہ اہل علم کے نزدیک واضح دلائل ہیں اور ہمارے ان دلائل سے وہی لوگ انکار کرتے ہیں جو بے انصاف ہیں۔ وَکَاَیِّنْ مِّنْ آیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۲-۱۰۵) اور آسمان و زمین میں بہت سے دلائل موجود ہیں۔

پھر قرآن مجید میں کسی خاص معنی کا لحاظ کرتے بعض مواضع میں آیۃً مفرد اور دوسرے مقامات پر آیات بصیغۂ جمع لایا گیا ہے جس کی تفصیل اور توضیح اس کتاب کے موضوع سے خارج ہے۔

اور آیت کریمہ: وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّہٗ آیَۃً (۲۳-۵۰) میں حضرت عیسٰی علیہ السلام اور ان کی والدہ مریم کو آیَتَیْنِ (دو آیتیں) کہنے کی بجائے آیۃً (ایک آیت) قرار دیا ہے کیونکہ یہ دونوں مل کر (بحیثیت مجموعی) ایک آیت بنتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰیَاتِ اِلَّا تَخْوِیْفًا (۱۷-۵۹) میں بعض نے کہا ہے کہ آیات سے جراد، قمل، ضفادع وغیرہ کی طرف اشارہ ہے جو امم سابقہ پر (بطور عذاب) بھیجی گئی تھیں۔ اور "تخویفًا" کے لفظ سے متنبہ کیا ہے کہ جو لوگ اس قسم کے افعال کا ارتکاب کریں گے ان پر اسی طرح کے عذاب نازل ہوں گے اور یہ کہ اس قسم کی آیات

کو طلب کرنا مکلّفین کے خسیس ترین ہونے کی دلیل
ہے کیونکہ انسان فعل خیر یا تو کسی رغبت اور خوف
کی وجہ سے کرتا ہے یہ سب سے ادنیٰ مرتبہ ہے اور یا
اچھی شہرت حاصل کرنے کے لئے۔ مگر اشرف اور اعلیٰ
مرتبہ یہ ہے کہ فضیلت کو فضیلت سمجھ کر حاصل
کیا جائے اور امت محمدیہ چونکہ اشرف امت ہے
جیسا کہ آیت۔ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ
لِلنَّاسِ (   ) میں مذکور ہے اس لئے انہیں
اللہ تعالیٰ نے اس (خسیس) مرتبہ سے بلند قرار دیا ہے
اور متنبہ کیا ہے کہ گو ان میں سے جہلاء یہ کہہ کر۔
أَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا
بِعَذَابٍ أَلِيمٍ۔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں
لیکن ان پر عمومی عذاب نہیں آئے گا۔

بعض نے کہا ہے کہ آیات سے مراد دلائل ہیں اور
تنبیہ کی ہے کہ ان کے سامنے صرف دلائل بیان ہوں
گے اور انہیں اس عذاب سے محفوظ رکھا جائیگا
وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ (۲۲-۴۷)
جس کے متعلق یہ جلدی کر رہے ہیں۔

لفظ آیۃ کے وزن میں تین اقوال ہیں:۔

(۱) یہ فَعْلَۃٌ کے وزن پر ہے ایسے کلمات
(جن کے عین اور لام کلمہ میں حرف علت ہو میں
حق تو یہ ہے کہ ان کے لام کلمہ میں تعلیل کی جائے
نہ کہ عین کلمہ میں جیسے حَیَاۃٌ اور نَوَاۃٌ (وغیرہ
نظائر موجود ہیں) لیکن عین کلمہ میں حرف یا آنے
کی وجہ سے لام کلمہ میں تعلیل نہیں ہوئی جیسے
دَایَۃٌ وغیرہ۔

(۲) بعض نے کہا ہے یہ فَعَلَۃٌ کے وزن پر
ہے دو حرف علت جمع ہونے کی وجہ سے پہلی یا کو
الف سے تبدیل کر دیا گیا ہے جیسے طَائِيٌّ اور طَيِّئِيٌّ۔

(۳) بعض نے کہا ہے کہ آیَۃٌ دراصل آیِیَۃٌ بروزن
فَاعِلَۃٌ ہے بغرض تخفیف یا اول کو حذف
کر کے آیَۃٌ بنا لیا گیا ہے مگر یہ آخری قول ضعیف
ہے کیونکہ آیَۃٌ کی تصغیر اُیَیَّۃٌ ہے اگر یہ اصل
میں فَاعِلَۃٌ کے وزن پر ہوتا تو اس کی تصغیر
اُوَیَّۃٌ آنا چاہیئے تھی۔

(أَيَّانَ)

أَيَّانَ (کب) کسی شے کا وقت دریافت
کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہ قریب
قریب "مَتٰی" کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں
ہے۔ أَيَّانَ مُرْسَاهَا (۷۹-۴۲) کہ اس
(قیامت) کا وقوع کب ہوگا۔ وَمَا يَشْعُرُونَ
أَيَّانَ يُبْعَثُونَ (۱۶-۲۱) ان کو بھی یہ معلوم
نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے أَيَّانَ يَوْمُ
الدِّينِ (۵۱-۱۲) کہ جزا کا دن کب ہوگا۔
لفظ أَيَّانَ دراصل اَيٌّ سے مشتق ہے اور
بعض کے نزدیک اس کی اصل اَیُّ اَوَانٍ
ہے جس کے معنی ہیں "کونسا وقت" الف کو
حذف کر کے واؤ کو یا اور پھر اسے یا میں
ادغام کر کے أَيَّانَ بنا لیا گیا ہے۔

(إِيَّا)

یہ کلمہ ضمیر منصوب منفصل کے تلفظ کے لئے
وضع کیا گیا ہے جب ضمیر (منصوب) اپنے
عامل پر (مقدم ہو یا اس پر کسی کلمہ کا عطف ڈالا
جائے اور یا اِلَّا کے بعد آئے تو اس (اِیَّا) کے
ساتھ استعمال ہوتی ہے جیسے (تقدیم کی صورت
میں فرمایا) اِیَّاكَ نَعْبُدُ (۱-۴) اور عطف کی

صورت میں فرمایا نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِیَّاكُمْ (۱۷-۳۱) ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں وَقَضٰی رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ (۱۷-۲۳) اور تیرے پروردگار نے قطعی طور ارشاد فرمایا کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

(ا ی)

اِیْ۔ حرف ایجاب ہے کلام متقدم کی تحقیق اور توثیق کے لئے وضع کیا گیا ہے[1] جیسے فرمایا:۔ قُلْ اِیْ وَرَبِّیْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ (۱۰-۵۳) کہدو ہاں خدا کی قسم یہ سچ ہے۔

(ا ی)

اَیْ - یہ حرف ندا ہے جیسے اَیْ زَیْدُ اور کبھی (حرف تفسیر ہوتی ہے اور) اس بات پر تنبیہ کے لئے بھی آجاتا ہے کہ اس کا مابعد اس کے ماقبل کی شرح اور تفسیر ہے[2]

(ایا)

حرف ندا ہوتا ہے جیسے اَیَا زَیْدُ۔

(أ)

یہ بھی منجملہ حروف ندا ہے جیسے اَزَیْدُ۔

(ا ی د)

اَلْاَیْدُ (اسم) سخت قوت اس سے اَیَّدَ (تفعیل) ہے جس کے معنی تقویت دینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ اَیَّدْتُكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (۵-۱۱۰) ہم نے تمہیں روح قدس سے تقویت دی وَاللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ (۳-۱۳) یعنی جسے چاہتا ہے اپنی نصرت سے بہت زیادہ تقویت بخشتا ہے اِدْتُهٗ (ض) اَئِیْدُهٗ اَیْدًا جیسے بِعْتُهٗ اَبِیْعُهٗ بَیْعًا (تقویت دینا) اور اس سے اَیَّدْتُهٗ (تفعیل) تکثیر کے لئے آتا ہے قرآن میں ہے۔ وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰهَا بِاَیْدٍ (۵۱-۴۸) اور ہم نے آسمان کو بڑی قوت سے بنایا اور اَیْدٌ میں ایک لغت آدٌ بھی ہے اور اسی سے امر عظیم کو مُؤَیِّدٌ کہا جاتا ہے اور جو چیز دوسری کو سہارا دے اور بچائے اسے اِیَادُ الشیئ کہا جاتا ہے ایک قرأت میں اَیَدْتُكَ ہے جو اَفعلتُ (افعال) سے ہے اور اِیَادُ الشیٔ کے محاورہ سے ماخوذ ہے زجاج رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ فاعلت (مفاعلہ) مثل عاونتُ سے بھی ہوسکتا ہے۔

(ا ی ك)

اَلْاَیْكُ - درختوں کا جھنڈ (ذوایکۃ) اور آیت۔ اَصْحٰبُ الْاَیْكَةِ (۱۵-۷۸) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے[3] کہ اَلْاَیْكَةُ ان کے شہر اور آبادی کا نام ہے۔

(ا ی م)

اَلْاَیَامٰی (۲۴-۳۲) یہ اَلْاَیِّمُ کی جمع ہے اور آمَ الرَّجُلُ وَتَاَیَّمَ کے معنی ہیں مرد رنڈوا ہو گیا اور عورت کے بیوہ ہونے کے لئے آمَتِ الْمَرْاَةُ وَتَاَیَّمَتْ کہا جاتا ہے

---

[1] ای سواء کان قبلہا خبرا و استفہام وعلی کل حال یکون بعدہا القسم [2] وحینئذ یکون مابعدہا عطف بیان علی ماقبلہا او بدل لاعطف نسق ابن المغنی ۱/۸۰ [3] راجع آیت (۲۶-۱۷۶) (۳۸-۱۳) (۵۰-۱۴)

اِمْرَءَةٌ اَیِّمَةٌ۔ بیوہ عورت رَجُلٌ اَیِّمٌ رنڈوا مرد اَلْحَرْبُ مَأْیَمَةٌ جنگ مرد کو عورت سے الگ کردیتی ہے اَلْاَیْمُ۔ سانپ۔

اَیْن ظرف،

یہ کلمہ کسی جگہ کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے جیسا کہ لفظ "متی" زمانہ کے متعلق سوال کے لئے آتا ہے۔

(ا ی ن)

اَلْاَیْنُ (ض) کے معنی تھک کر چلنے سے عاجز ہو جانا کے ہیں نیز آنَ یَئِیْنُ اَیْنًا اور آنیٰ یَأْنِیْ اُنْیًا کے معنی کسی چیز کا موسم یا وقت آ جانا کے ہیں اور محاورہ میں بَلَغَ اَنَاہُ کے متعلق بعض نے کہا ہے کہ آنیٰ (ناقص) سے مقلوب ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ابو العباسؒ نے کہا ہے کہ آنَ یَئِیْنُ اَیْنًا کا ہمزہ در اصل حاء سے مقلوب (بدلا ہوا) ہے اور اصل میں حَانَ یَحِیْنُ حَیْنًا ہے اور اصل کلمہ اَلْحِیْنُ ہے۔

ؔ لہ قرآن القرآن ۔ فاین تذہبون (۸۱ - ۲۶)

کتَابُ البَاءِ

(ب)

الباء (حرف جار) یہ ہمیشہ فعل ظاہر یا مضمر کے متعلق ہوکر استعمال ہوتی ہے پھر متعلق بفعل ظاہر دو قسم پر ہے۔

(۱) ہمزہ افعال کی طرح تعدیہ فعل کے لئے آتی ہے جیسے ذھبت بہ واذھبتہٗ۔ قرآن میں ہے[۱]: وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵-۷۲) جب ان کو بیہودہ چیزوں کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو بزرگانہ انداز سے گزر جاتے ہیں۔

(۲) آلہ کے لئے ہوتی ہے[۲] جیسے قطعتہٗ بالسکین (میں نے اسے چھری سے کاٹا)

اور متعلق بمضمر کبھی موضع حال میں ہوتی ہے جیسے خرج بسلاحہ (یعنی وہ نکلا اور آنحالیکہ اس پر یا اس کے ساتھ اسلحہ بھی تھا۔ اور کبھی زائدہ ہوتی ہے جیسے فرمایا: وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا (۱۲-۱۷) اور آپ ہماری بات کو باور نہیں کریں گے۔

اس جگہ میں اور مَا اَنْتَ مُؤْمِنًا میں فرق ہے کیونکہ منصوب ہونے کی صورت میں متکلم کے ذہن میں ایک ہی ذات کا تصور ہے جیسا کہ زَيْدٌ خَارِجٌ میں ہے مگر مجرور ہونے کی صورت میں جیسے مَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا ہے دو ذات کا تصور ہے جیسا کہ لَقِيْتُ بِزَيْدٍ رَجُلًا فَاضِلًا میں ہے[۳]۔ کہ یہاں فَاضِلًا سے تو زید ہی مراد ہے مگر اسے ایسی صورت میں پیش کیا گیا ہے کہ اس سے ایک شخص (فاضل) متصور ہوتا ہے گویا تقدیر کلام یہ ہے کہ رَأَيْتُ بِرُؤْيَتِي لَكَ آخر وھو رجل فاضل اسی طرح رَأَيْتُ بِكَ حَاتِمًا فِي السخاء کا محاورہ ہے چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: وَمَا اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۲۶-۱۱۴) اور میں مومنوں کو راندنے والا بھی نہیں ہوں۔ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (۳۹-۳۶) کیا خدا اپنے بندوں کو کافی نہیں ہے۔ مگر شیخ[۴] فرماتے ہیں کہ یہ کلام محل نظر ہے[۵]۔ اور آیت کریمہ: تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ (۲۳-۲۰) میں بعض نے کہا ہے یہ تُنْبِتُ الدُّهْنَ کے معنی میں ہے[۶] مگر اس آیت سے یہ معنی مقصود نہیں ہے بلکہ تُنْبِتُ النبات ومعہ الدھن کے ہم معنی ہے[۷] یعنی اس میں بالقوہ روغن موجود ہوتا ہے اور بالدُّھن کا لفظ لاکر اللہ تعالیٰ کے انعام ایزدی کی ہے نیز اس کے نکالنے کی طرف رہنمائی فرمائی ہے۔ بعض نے کہا ہے اس میں باء حال کے معنی میں ہے یعنی در آنحالیکہ اس میں روغن موجود ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہمزہ اور باء دونوں برائے تعدیہ آتے ہیں اور یہ دونوں ایک ہی کلمہ میں جمع نہیں ہو سکتے۔

---

[۱] الباء فی الآیۃ للالصاق المجازی لا للتعدیۃ وہما نوعان راجع ابن ہشام ج ۱ ص ۱۰۶-۱۰۷ وباء التعدیۃ تسمی باء النقل والاولی کامثل ذھب اللّٰہ بنورھم (۲-۱۷) [۲] وتسمی باء الاستعانۃ [۳] الاولی ان تکون الباء فیہا سببیۃ ای بسبب لقائی ایاہ واصحاب المعانی یسمون مثل ہذا الباء [۴] ای الشیخ عبدالقاھر الجرجانی [۵] ای الباء زائدۃ [۶] فعلی ہذا یکون الظرف حالا من المفعول ای تنبت الثمر مصاحبا للدھن

اور آیت کریمہ: وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا۔ (۴-۷۹) میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں باء زائدہ ہے[1] اور یہ اصل میں وَكَفَى اللّٰهُ شَهِيْدًا ہے جیسا کہ آیت: وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ (۳۳-۲۵) میں ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس سے تو لازم آتا ہے آیت مقیس علیہ میں بھی وَكَفٰى بِاللّٰهِ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ کہنا صحیح ہو حالانکہ درست نہیں ہے کیونکہ باء زائدہ اسی مقام پر آتی ہے جہاں اس کے بعد منصوب موضع حال میں مذکور ہو جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے لہذا صحیح یہ ہے کہ یہاں کَفٰی کا لفظ اِکْتَفِ (امر) کی جگہ لایا گیا ہے[2] جیسا کہ اَحْسِنْ بِزَیدٍ میں لفظ احسن، ما احسن کی جگہ لایا گیا ہے[3] اور آیت کے معنی یہ ہیں۔ اِکْتَفِ بِاللّٰهِ شَهِيْدًا۔ اور اسی معنی میں فرمایا۔ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا (۲۵-۳۱) وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا (۴-۴۵) اور خدا ہی کارساز کافی ہے اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۴۱-۵۳) کیا تم کو کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے باخبر ہے اور حُبِّبَ اِلَیَّ بِفُلَانٍ کا محاورہ بھی اسی توجیہ پر محمول ہوگا ای اَحْبِبْ اِلَیَّ بِہٖ

اور آیت کریمہ: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (۲-۱۹۵) میں بعض نے دعوی کیا ہے کہ یہاں باء زائدہ ہے[4] اور اصل میں لَا تُلْقُوْا اَيْدِيَكُمْ ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ یہاں بھی باء آلہ کی ہے اور اصل میں لَا تُلْقُوْا اَنْفُسَكُمْ بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ہے مگر مفعول کو عدم ضرورت اور معنوی عموم کے پیش نظر حذف کر دیا گیا ہے کیونکہ جس طرح اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ممنوع ہے اسی طرح دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈالنے سے منع فرمایا گیا ہے۔

اور آیات: عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ (۸۳-۲۸) وہ ایک چشمہ ہے جس سے خدا کے مقرب پئیں گے عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ (۷۶-۶) یہ ایک چشمہ ہے جس میں سے خدا کے بندے پئیں گے ـــــ میں بعض نے کہا ہے۔ کہ باء بمعنی مِنْ ہے[5] ای يَشْرَبُ مِنْهَا اور بعض نے زائدہ کہا ہے ای يَشْرَبُهَا لیکن صحیح یہ ہے کہ باء کو اس کے معنی پر رہنے دیا جائے اور کہا جائے کہ عَيْنًا سے پانی مراد نہیں ہے بلکہ چشمہ کا گڑھا ہے لہذا یہ مَكَانًا يُّشْرَبُ بِهٖ کی طرح ہوگا[6]

اور آیت: فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ (۳-۱۸۸) میں بھی بِمَفَازَةٍ کے معنی بِمَوْضِعِ الْفَوْزِ کے ہیں یعنی ان کی نسبت خیال نہ کرنا کہ وہ کسی نجات کی جگہ کے ذریعہ عذاب سے چھٹکارا ہو جائیں گے۔

(ب ء ر)

اَلْبِئْرُ (کنویں) اصل میں یہ مہموز (العین)

---

[1] قال الخراز زیدت الباء للمبالغة فی المدح کما قالوا: اظرف بعبد اللہ وانبل بزید وحسبک بصدیقنا (اللسان)
[2] قالہ الزجاج وصرح ابن ہشام بان ہذا التوجیہ بعید راجع الاتقان ج ۱ ص ۱۵۹ والمغنی [3] ای غیر الخبر الی معنی الطلب [4] ذکرہ ابن ہشام فی المغنی وقال الثانی مما تزاد فیہ الباء المفعول کما فی الآیۃ [5] قالہ الفارسی والاصمعی والقتیبی وابن مالک (ابن ہشام ص ۱۱) [6] ای الباء للاستعانۃ کما قالہ الزمخشری فالمعنی یشرب بہا الخمر۔

ہے۔ بَأَرتُ بِئْرًا وَ بَأَرْتُ بُؤْرَةً کے معنی گڑھا کھودنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ وَ بِئْرٍ مُعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَشِيْدٍ (۲۲-۴۵) اور بہت سے کنویں بیکار اور محل ویران پڑے ہیں۔ اسی سے اَلْمِئْبَرَةُ کا لفظ مشتق ہے جو اصل میں اس گڑھے کو کہتے ہیں جس کا منہ اس طرح ڈھانپ دیا جائے کہ جو شخص اس کے اوپر سے گزرے اس میں گر پڑے ایسے گڑھے کو مِغْوَاةٌ بھی کہا جاتا ہے اور کنایۃً مِئْبَرَۃٌ ایسی سخن چینی کو کہتے ہیں جو انسان کو بلا میں ڈالنے والی ہو اس کی جمع اَلْمَآبِرُ آتی ہے

(ب ء س)

اَلْبُؤْسُ وَ الْبَأْسُ وَالْبَأْسَاءُ۔ تینوں میں سختی اور ناگواری کے معنی پائے جاتے ہیں مگر بُؤْس کا لفظ زیادہ تر فقر و فاقہ اور لڑائی کی سختی پر بولا جاتا ہے اور اَلْبَأْسُ وَ الْبَأْسَاءُ بمعنی نکایہ (یعنی جسمانی زخم اور نقصان کیلئے آتا ہے قرآن میں ہے وَاللّٰهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَ أَشَدُّ تَنْكِيْلًا (۴-۸۴) اور خدا لڑائی کے اعتبار سے بہت سخت ہے اور سزا کے لحاظ سے بھی بہت سخت ہے فَأَخَذْنَاهُمْ بِالْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ (۶-۴۲) پھر (ان کی نافرمانیوں کے سبب) ہم انہیں سختیوں اور تکلیفوں میں پکڑتے رہے وَالصَّابِرِيْنَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ (۲-۱۷۷) اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔۔ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ (۵۹-۱۴) ان کا آپس میں بڑا رعب ہے۔

بَؤُسَ يَبْؤُسُ (بَأْسًا) بہادر اور مضبوط ہونا۔ اور آیت کریمہ:۔ بِعَذَابٍ بَئِيْسٍ (۷-۱۶۵) میں بَئِيْسٌ بروزن فعیل ہے اور یہ بَأْس یا بُؤْس سے مشتق ہے یعنی بُرے سخت عذاب میں اور آیت کریمہ:۔ فَلَا تَبْتَئِسْ (۱۱-۳۶) کے معنی یہ ہیں کہ غمگین اور رنجیدہ رہنے کے عادی نہ بن جاؤ۔ حدیث میں ہے ﷺ اِنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَكْرَهُ الْبُؤْسَ وَالتَّبَاؤُسَ وَالتَّبَؤُّسَ۔ کہ آنحضرت کو یہ بات بری لگتی تھی کہ فقراء دوسروں کے سامنے عجز و انکسار کریں یا کوئی شخص اپنے آپ کو ذلیل کرے (اور عزت نفسی کا خیال نہ رکھے) بِئْسَ۔ فعل ذم ہے اور ہر قسم کی مذمت کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ نِعْمَ ہر قسم کی مدح کے لئے استعمال ہوتا ہے اِن کا اسم اگر معرف باللام ہو یا معرف باللام کی طرف مضاف ہو تو اسے رفع دیتے ہیں جیسے بِئْسَ الرجل زیدٌ وَبِئْسَ غلامُ الرَّجُلِ زیدٌ اور اسم نکرہ کو نصب دیتے

ہے ومنہ ابتر بمعنی ادخر في الحديث :۔ فلم يبتهر خيثا اى فلم يدخر (اللسان) ۵۹۲ فی اللسان (باس) ويجوز التبؤس اى بالقصر والتشديد وكذا جاء في حديث الصلوة :۔ ان تقنع بديك وتباءس تعاز كلمة من بئس بمعنى افتقر والحديث اخرجه ابو نعيم في تاريخ اصبهان وحمزه السلمی فی تاریخ جرجان عن ابی ہریرۃ ' ان الله اذا انعم على عبد نعمة ۔ ويكره البؤس والتبؤس ورواه ابو يعلى والبيهقي في الشعب ويبغض البؤس والتباؤس النظر ص ۲۲۳ رقم ۱۸۹ ص ۲۴ رقم ۲۶۰ عن ابی ہریرۃ مرفوعا وفيه عن ابى سعيد وهناد ــــ عن يحيى بن جعدة مرسلا ــــ ويبغض بدل يكره والحديث مذكور مع حديث ان الله جميل يحب الجمال راجع تخريج الكشاف وكنز العمال ۶:۷۵۸۶

۵۹۲ لا يحب بدل يكره (طب، بق، والضياء عن زهير بن ابی علقمة) ۲۶۰۲، ۲۶۱۱، ۲۶۱۲ (ابن صیعری فی امالیہ عن ابی ہریرۃ)

ہیں جیسے قرآن میں ہے :۔ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ (۵-۷۹) ای بِئْسَ شَيْئًا يَفْعَلُونَهٗ یعنی بلاشبہ وہ برا کرتے تھے وَبِئْسَ الْقَرَارُ (۱۴-۲۹) اور وہ برا ٹھکانا ہے فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِينَ (۳۹-۷۲) تکبر کرنے والوں کا برا ٹھکانا ہے۔ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا (۱۸-۵۰) ظالموں کے لئے برا بدل ہے۔ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ (۵-۶۳) بلاشبہ وہ بھی برا کرتے ہیں بِئْسَ اصل میں بَئِسَ (س) اور بُؤْسٌ سے مشتق ہے۔

(ب ت ر)

اَلْبَتْرُ۔ یہ قریبًا بَتْكٌ کے ہم معنی ہے مگر خاص کر دُم کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ پھر مجازًا قطع نسل کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اور اَبْتَر اس شخص پر بولا جاتا ہے جس کی موت کے بعد اس کا خلف نہ ہو اور اَبْتَر یا اَبَاتِر وہ جس کا ذکر خیر باقی نہ رہے نیز رَجُلٌ اَبَاتِرٌ۔ قاطع رحم۔ اور جس خطبہ کے شروع میں حمد و ثنا نہ ہو اسے بھی مجازًا خُطْبَةٌ بَتْرَاء کہا جاتا ہے چنانچہ آنحضرت نے فرمایا ہے[1] كُلُّ اَمْرٍ لَا يُبْدَءُ فِيهِ بِذِكْرِ اللهِ فَهُوَ اَبْتَرُ (۱۷) ہر وہ کام جس کے شروع میں اللہ کا نام نہ لیا جائے وہ ابتر رہے۔

اور آیت کریمہ :۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (۱۰۸-۳) میں اَبْتَرُ کے معنی یہ ہیں کہ تیرے مخالف کا ذکر خیر باقی نہیں رہے گا۔ جب کفار نے طعنہ دیا کہ محمدؐ کی موت کے ساتھ ہی اس کا نام و نشان منقطع ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کی نسل (اولاد) نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا کہ تمہارا بداندیش ہی مقطوع النسل رہے گا آپؐ کو تو اللہ تعالیٰ نے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۹۴-۴) کا مقام بخشا ہے کیونکہ جملہ مؤمنین آپ کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو آپ کے اور آپ کے دین کے محافظ مقرر کر دیا ہے۔

چنانچہ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے فرمایا ہے[2] (۲۰) اَلْعُلَمَاءُ بَاقُوْنَ مَا بَقِيَ الدَّهْرُ، اَعْيَانُهُمْ مَفْقُوْدَةٌ وَاٰثَارُهُمْ فِي الْقُلُوْبِ مَوْجُوْدَةٌ۔ علماء تا قیامت باقی رہیں گے ان کے اجسام مفقود ہوتے جاتے ہیں۔ مگر ان کے آثار لوگوں کے دلوں پر ثبت رہتے ہیں۔ جب علماء کو یہ فضیلت حاصل ہے جو آنحضرت کے متبعین سے ہیں تو آنحضرت کی شان تو اس سے کہیں بلند ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو "رفع ذکر" کا شرف بخشا ہے اور آپ کو خاتم الانبیاء قرار دیا ہے صلی اللہ علیہ وعلیہم افضل الصلاۃ والسلام

(ب ت ک)

اَلْبَتْكُ (ض) یہ قریب قریب بَتٌّ (کاٹنا) کے ہم معنی ہے مگر بَتْكٌ کا لفظ اعضاء یا بال کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے جیسے بتك شعره

---

[1] والحدیث اوردہ العلماء بالفاظ مختلفۃ رواہ ابو عوانۃ فی صحیحہ واصحاب السنن ـــ عن ابی ہریرۃ بلفظ لا یبدأ فیہ بحمد اللہ اقطع واحمد فی مسندہ من ہذا الوجہ لا یفتتح بذکر اللہ فہو ابتر واقطع "وللخطیب فی الجامع عن الزہری لا یبدأ فیہ ببسم اللہ الرحمان الرحیم فہو اقطع وما رواہ المؤلف فلم ار فی المراجع بہذا اللفظ راجع تخریج الکشاف ص ۲ رقم ۳ ؛ [2] انظر القول علی ہذا ادب الدنیا والدین للماوردی وفا ۱۶ ولفظہ :۔ وبقی خزان العلم احیاء ہم مفقودۃ واشخاصہم فی القلوب موجودۃ ۱۲ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛ ؛

وَاُذُنَهٗ۔ اس نے فلاں کے بال یا کان کاٹ ڈالے قرآن میں ہے: فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ (۴-۱۱۹) کہ وہ جانوروں کے کان چیرتے رہیں۔

اسی سے سَيْفٌ بَاتِكٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی قاطع تلوار کے ہیں۔ اور جب کسی جانور کے بال یا پر پکڑ کر اس طرح کھینچے جائیں کہ وہ جڑ سے اکھڑ جائیں تو اس معنی میں بَتَكْتُ الشَّعْرَ بولتے ہیں اور اس طرح اکھڑے ہوئے بالوں کے قطعہ کو بِتْكَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع بِتَكٌ ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1]

(۳۷) طَارَتْ وَفِيْ يَدِهٖ مِنْ رِيْشِهَا بِتَكٌ (بسیط)

وہ (قطاۃ) اڑ گئی اور اس کے ہاتھ میں کچھ پر باقی رہ گئے اور بَتٌّ کا لفظ رسی یا تعلق کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے محاورہ ہے طَلَّقْتُ الْمَرْءَةَ بَتَّةً وَبَتْلَةً۔ میں نے عورت کو قطعی طلاق دے دی بَتَّ الْحُكْمَ بَيْنَهُمَا۔ میں نے ان کے درمیان قطعی فیصلہ کر دیا۔ ایک روایت میں ہے[2]

(۲۱) لَاصِيَامَ لِمَنْ لَمْ يَبُتَّ الصِّيَامَ مِنَ اللَّيْلِ جو شخص رات کو روزہ کی قطعی نیت نہ کرے اسکا روزہ نہیں ہے۔

اور بَتْكٌ بھی اس کے ہم معنی ہے مگر یہ لفظ کپڑے کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے نیز رہوا اونٹنی کو نَاقَةٌ بَتْكَى کہا جاتا ہے کیونکہ سرعت رفتار میں اونٹنی کے ہاتھ کو بافندہ عورت کے ہاتھ مشابہ ہوتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[3]۔

(۳۸) فِعْلَ السَّرِيْعَةِ بَادَرَتْ جُدَّادُهَا قَبْلَ الْمَسَاءِ تَهُمُّ بِالْاِسْرَاعِ

جیسا کہ بافندہ عورت کپڑا بنتی ہوئی اس کے دامن تک پہنچ جاتی ہے اور وہ غروب آفتاب سے قبل اسے ختم کرنے کے لئے جلدی کرتی ہے۔

(ب ت ل)

آیت کریمہ:۔ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (۷۳-۸) کے معنی یہ ہیں کہ اخلاص نیت اور عبادت میں سب سے کٹ کر ایک خدا کی طرف متوجہ ہو جاؤ چنانچہ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔ قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ (۶-۹۱) کہدو کہ (اس کتاب کو) خدا ہی نے (نازل کیا تھا) پھر ان کو چھوڑ دو۔ لہذا اس آیت یعنی وتبتل الیہ تبتیلا اور حدیث[4]

(۲۲) لَارَهْبَانِيَّةَ وَلَا تَبَتُّلَ فِي الْاِسْلَامِ کے درمیان منافات نہیں ہے کیونکہ حدیث میں جس تبتل سے منع کیا گیا ہے وہ نکاح سے کنارہ کشی انقطاع ہے اور اسی معنی میں مریم علیہ السلام کو اَلْعَذْرَاءُ الْبَتُوْلُ کہا جاتا ہے کیونکہ مریم علیہ السلام عمر بھر ازدواجی زندگی سے کنارہ کش رہیں اور ترک نکاح شرعًا ممنوع ہے جیسے فرمایا:

---

[1] قالہ زہیر وصدرہ: حتی اذا ما کف الغلام لہا ..... والمؤنث یرجع الی القطاۃ والبیت فی دیوانہ والبحرہ: ۳۲۳/۳ : ۸۴۳ و مختار الشعر الجاہلی (۱ : ۲۷۰) وذیل ابدال الی الطیب ۲: ۵۵ والعقد الثمین ۸۷ من قصیدۃ فی ۳۴ بیتا قالہا حین اغار بنو اسد علی ابلہم واستاقتہا [2] الحدیث رواہ احمد السنن والطبرانی العصص [3] قالہ المسیب بن علس والبیت من کلمۃ مفضلیۃ (۲: ۲) وایضا والامالی القالی (۱: ۵۶۰) وفی المطبوع عدا دلم دبالحار) مصحف والجداد معناہ صعدب الثوب یعنی ان ہذہ النساجۃ قد قاربت الفراغ من الثوب وبلغت الی صعدبہ فہی تبادر بفراغ منہ قبیل المساء والقصیدۃ فی ذیل الامالی ۱۳۰-۱۳۲ فی ۲۶ بیتا وذکر ان ابا جعفر المنصور استحسنہا [4] حدیث النہی عن التبتل رواہ الترمذی وابن ماجۃ عن سمرۃ رضی اللہ تعالی عنہ وایضا راجع الفائق ۱/ ۶۹ ۲ وابو عبید فی غریبہ:

وَ اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ (۲۴-۳۲) کہ اپنی قوم کی بیوہ عورتوں کے نکاح کر دیا کرو اور حدیث میں ہے[1] (۲۳) تناکحوا تکثروا فانی اباھی بکم الامم یوم القیامۃ۔ کہ نکاح کرو تاکہ تمہاری کثرت ہو قیامت کے دن دوسروں کے مقابلہ میں مجھے تمہاری کثرت تعداد سے فخر ہوگا۔
نَخْلَۃٌ مُّبْتِلٌ۔ کھجور جس کے ساتھ کا چھوٹا پودا اس سے الگ ہو گیا ہو

(ب ث ث)

اَلْبَثُّ (ن ض) اصل میں بَثٌّ کے معنی کسی چیز کو متفرق اور پراگندہ کرنا کے ہیں جیسے بثت الریح التراب۔ ہوا نے خاک اڑائی۔ اور نفس کے سخت ترین غم یا بھید کو بث النفس کہا جاتا ہے بثثتہ فانبث میں نے اسے منتشر کیا چنانچہ وہ منتشر ہو گیا اور اسی سے فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا (۵۶-۶) ہے یعنی پھر وہ منتشر ذرات کی طرح اڑنے لگیں اور آیت کریمہ: وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ (۲-۱۶۴) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں ہر قسم کے جانوروں کو پیدا کیا اور ان کو ظہور بخشا اور آیت: كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ (۱۰۱-۴) میں المبثوث سے مراد وہ پروانے ہیں جو مخفی اور پرسکون جگہوں میں بیٹھے ہوں اور ان کو پریشان کر دیا گیا ہو۔ اور آیت اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (۱۲-۸۶) میں بث کے معنی سخت ترین اور پوشیدہ غم کے ہیں جو وہ ظاہر کر رہے ہیں اس صورت میں مصدر بمعنی مفعول ہوگا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصدر بمعنی فاعل ہو یعنی وہ غم جس نے میرے فکر کو منتشر کر رکھا ہے جیسا کہ توزعنی الفکر کا محاورہ ہے یعنی مجھے فکر نے پریشان کر دیا۔

(ب ج س)

بَجَسَ الْمَاءُ وَانْبَجَسَ۔ پانی پھوٹ کر بہ نکلا یہ اِنْفَجَرَ کے ہم معنی ہے مگر اِنْبِجَاسٌ عام طور پر اس مقام پر بولا جاتا ہے جب کسی تنگ مقام سے پانی بہ نکلا ہو اور اِنْفِجَارٌ کا لفظ عام ہے یعنی وہ کسی تنگ مقام سے پانی بہ نکلنے پر بھی بولا جاتا ہے اور وسیع جگہ سے بھی۔
یہی وجہ ہے قرآن میں ایک مقام پر فَانْبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (۷-۱۶۰) آیا ہے اور دوسرے مقام پر فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (۲-۶۰) آیا ہے یعنی تنگ مقام (پتھر) سے پانی بہ نکلنے پر دونوں لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ (مگر جہاں یہ معنی ملحوظ نہیں) جیسے وَفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا (۱۸-۳۳) کہ دونوں کے درمیان ہم نے ایک نہر بھی جاری کر دی۔ وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا (۵۴-۱۲) کہ ہم نے زمین میں چشمے جاری کر دیئے ـــــ وہاں صرف فَجَّرَ کا لفظ استعمال ہوا بجسنا نہیں فرمایا:

(ب ح ث)

اَلْبَحْثُ (ف) کے معنی کریدنا اور تلاش کرنا کے ہیں بحثت عن الامر وبحثت کذا

---

[1] الحدیث بالفاظہ مرفوعاً فی الاحیاء ومسند الفردوس للدیلمی وابن مردویہ فی تفسیرہ موقوفاً علی ابن عمر واسنادہ ضعیف والبیھقی فی المعرفۃ عن الشافعی ازبلغۃ راجع الاحیاء بتخریج العراقی ۲/۲۲ والنیل ۶/۶

میں نے فلاں معاملہ کے متعلق کرید کی یا فلاں چیز کو تلاش کیا قرآن میں ہے: فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْأَرْضِ (۵-۳۱) اب خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین کریدنے لگا۔ اور جب اونٹنی چلتے وقت زمین پر سخت پاؤں رکھے (کہ مٹی اڑاتی ہوئی چلی جائے) تو ایسے موقعہ پر بَحَثَتِ النَّاقَةُ فِي السَّيْرِ کہا جاتا ہے۔

(ب ح ر)

اَلْبَحْرُ (سمندر) اصل میں اس وسیع مقام کو کہتے ہیں جہاں کثرت سے پانی جمع ہو پھر کبھی اس کی ظاہری وسعت کے اعتبار سے بطور تشبیہ بَحَرْتُ كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سمندر کی طرح کسی چیز کو وسیع کر دینا کے ہیں اسی سے بَحَرْتُ الْبَعِيْرَ ہے یعنی میں نے بہت زیادہ اونٹ کے کان کو چیر ڈالا یا پھاڑ دیا اور اس طرح کان چرے ہوئے اونٹ کو اَلْبَحِيْرَةُ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ (۵-۱۰۳) یعنی اللہ تعالیٰ نے بحیرہ جانور کا حکم نہیں دیا کفار کی عادت تھی کہ جو اونٹنی دس بچے جن چکتی تو اس کا کان پھاڑ کر بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے نہ اس پر سواری کرتے اور نہ بوجھ لادتے۔

اور جس کو کسی صنعت میں وسعت حاصل ہو جائے اسے بحر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ بہت زیادہ دوڑنے والے گھوڑے کو بحر کہہ دیا جاتا ہے۔ آنحضرت نے ایک گھوڑے پر سواری کے بعد فرمایا[1]:
(۲۲) وَجَدْتُهُ بَحْرًا کہ میں نے اسے سمندر پایا۔

اسی طرح وسعت علمی کے اعتبار سے بھی بحر کہہ دیا جاتا ہے اور تَبَحَّرَ فِي كَذَا کے معنی ہیں اس نے فلاں چیز میں بہت وسعت حاصل کر لی اور اَلْبَحْرُ فِي الْعِلْمِ علم میں وسعت حاصل کرنا۔

اور کبھی سمندر کی ملوحت اور نمکینی کے اعتبار سے کھاری اور کڑوے پانی کو بَحْرَانِيٌّ کہدیتے ہیں۔ اَبْحَرَ الْمَاءُ۔ پانی کڑوا ہوگیا شاعر نے کہا ہے[2]

(۳۹) قد عاد ماء الارض بحرا فزادني
الى مرضي ان ابحر المشرب العذب

زمین کا پانی کڑوا ہوگیا تو شیریں گھاٹ کے تلخ ہونے سے میرے مرض میں اضافہ کر دیا۔

اور آیت کریمہ: بَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَهٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ (۲۵-۵۳) دو دریا ایک کا پانی شیریں ہے پیاس بجھانے والا اور دوسرے کا کھاری ہے چھاتی جلانے والا میں عَذْبٌ کو بحر کہنا مِلْحٌ کے بالمقابل آنے کی وجہ سے ہے جیسا کہ سورج اور چاند کو قمران کہا جاتا ہے اور بنات بَحْرٍ کے معنی زیادہ بارش برسانے والے بادلوں کے ہیں۔ اور آیت: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۳۰-۴۱) کی تفسیر میں بعض نے

---

[1] من حديث انس بن مالك رواه البخاري في مواضع من صحيحه باب الركوب على الدابة الصعبة راجع الفتح ومسلم باختلاف الالفاظ (اللسان بحر) قاله في فرس لابي طلحة يقال له مندوب۔ [2] قاله نصيب والبيت في اللسان والحكم (بحر) والصحاح وفي روايته فردني بدل فزادني والاشباه النحويه ۳/ ۲۴۴ والبحر (۱: ۹۵) والبلدان (اسم بجار) وفي روايته عذب الماء بدل ماء الارض وعلى ظمائي بدل الى مرضي۔

کہا ہے کہ بحر سے سمندر مراد نہیں ہے بلکہ بَرّ سے جنگلات اور بحر سے زرخیز علاقے مراد ہیں۔
لَقِيْتُهُ صَحْرَةَ بَحْرَةَ میں اسے ایسے میدان میں ملا جہاں کوئی اوٹ نہ تھی[1]۔

(ب خ س)

اَلْبَخْسُ (س) کے معنی کوئی چیز ظلم سے کم کرنا کے ہیں قرآن میں ہے وَ هُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ (۱۱ - ۱۵) اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَاءَهُمْ (۷ - ۸۵) اور لوگوں کو چیزیں کم نہ دیا کرو۔
اَلْبَخْسُ وَالْبَاخِسُ۔ حقیر اور ناقص چیز۔ اور آیت کریمہ:۔ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ (۱۲ - ۲۰) میں بعض نے کہا ہے کہ بَخْسٌ کے معنی حقیر اور ناقص کے ہیں اور بعض نے منحوس یعنی منقوص کا ترجمہ کیا ہے۔
محاورہ ہے تَبَاخَسُوْا۔ انہوں نے ایک دوسرے کی حق تلفی کی۔

(ب خ ع)

اَلْبَخْعُ (ف) کے معنی غم سے اپنے تئیں ہلاک کر ڈالنا کے ہیں[2] اور آیت کریمہ:۔ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ (۱۸ - ۶) شاید تم غم و غصہ سے خود کو ہلاک کر ڈالو۔۔۔ میں رنج و غم کے ترک کی ترغیب دی گئی ہے جیسا کہ آیت: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ (۳۵ - ۸) میں ہے کہ ان پر حسرتوں کے باعث تمہاری جان نہ نکل جائے۔ شاعر نے کہا ہے[3] (طویل)

(۴۰) اَلَا اَيُّهَا الْبَاخِعُ الْوَجْدِ نَفْسَهُ

. . . .

اے غم کی وجہ سے خود کو ہلاک کرنے والے
بَخَعَ فُلَانٌ بِالطَّاعَةِ فلاں نے طاعت میں مبالغہ کیا۔ بَخَعَ فُلَانٌ بِمَا عَلَيْهِ مِنَ الْحَقِّ فلاں نے سخت بیزاری کے ساتھ اپنے اوپر دوسرے کے حق کا اقرار کیا گویا یہاں سخت کراہت اور بیزاری کو خود کو ہلاک کرنے کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔

(ب خ ل)

اَلْبُخْلُ (س) اپنے جمع کردہ ذخائر کو ان جگہوں سے روک لینا جہاں پر خرچ کرنے سے اسے روکنا نہیں چاہئے۔ اس کے بالمقابل الجود ہے بَخِلَ اس نے بخل کیا بَاخِلٌ۔ بخل کرنے والا۔
اَلْبَخِيْلُ (صیغہ مبالغہ) جو بہت زیادہ بخل سے کام لیتا ہو جیسا کہ الراحم (مہربان) سے اَلرَّحِيْمُ مبالغہ کے لئے آتا جاتا ہے۔
اَلْبُخْلُ۔ دو قسم پر ہے ایک یہ ہے کہ انسان اپنی چیزوں کو خرچ کرنے سے روک لے اور دوم یہ کہ دوسروں کو بھی خرچ کرنے سے منع کرے یہ پہلی

---

[1] ای لیس بینی وبینہ حاجز انظر للکلمۃ المیدانی ۲/ ر د ۱۹ والصحاح (بحر) وفی ہوامش الصحاح: کل من صحرۃ و بحرۃ غیر منصرف وفی القاموس وبینہ ان [2] اصلہ فی الذبیحۃ یقال بخع الذبیحۃ اذا بالغ فی الذبح حتی یقطع عظم رقبتہا والنخاع العرق فی الصلب ثم کثر استعمالہ للمبالغۃ فی جمیع (الفائق: ۱: ۲۷) [3] قالہ ذوالرمۃ وتمامہ . . . بشیئ نحتہ عن یدیہ المقادر۔ راجع دیوانہ ۲۵۱ ط کیمبرج ۱۹۱۹ء) ومجاز القرآن لابی عبیدۃ (۱: ۳۹۳ ر ۲: ۳۸) وغریب القرآن للقتیبی ۲۶۳ والسیوطی ۲۲۷ والبحر (۶: ۹۲) وعزاہ الی الفرزدق والصحاح والتاج والاساس واللسان (بخع) والبیت من شواہد الطبری فی تفسیرہ (۱۵: ۱۹۹ ر ۹: ۵۸) وفی روایۃ عن یدیک وفی البیت ایضاً شاہد علی وصف ای فی النداء باسم الاشارۃ موصوف بأل و البیت ایضاً فی الفتح ۸: ۳۰۸)

قسم سے بدتر ہے جیسے فرمایا۔ اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ (۴-۳۷) یعنی جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم دیں۔

(ب د ء)

بَدَأْتُ بِكَذَا وَاَبْدَأْتُ وَابْتَدَأْتُ میں نے اسے مقدم کیا۔ اس کے ساتھ ابتدا کی۔

اَلْبَدْءُ وَالْاِبْتِدَاءُ۔ ایک چیز کو دوسری پر کسی طور مقدم کرنا قرآن میں ہے وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ (۳۲-۷) اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا۔ كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (۲۹-۲۰) اس نے کیسے مخلوق کو پہلی مرتبہ پیدا کیا۔ اَللّٰهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ (۳۰-۱۱) خدا ہی نے مخلوق کو پہلی دفعہ پیدا کیا كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ (۷-۲۹) اس نے جس طرح تم کو ابتدا میں پیدا کیا تھا اس طرح تم پھر پیدا ہو جاؤ گے۔

مَبْدَاُ الشَّيْءِ۔ جس سے کوئی چیز مرکب ہو یا اس سے بنے مثلاً حروف تہجی کو مبدء کلام کہا جاتا ہے اور لکڑی دروازے یا تخت کا مبدء ہے اسی طرح نَوَاةٌ (گٹھلی) کھجور کا مبدء کہلاتی ہے۔

بَدْءٌ (پہلا سردار) یعنی سرداروں کا شمار کیا جائے تو اس سے ابتدا ہو اور اللہ تعالیٰ کی صفت میں اَلْمُبْدِئُ وَالْمُعِيْدُ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز کی ابتداء اور انتہا کا سبب اصلی ذات باری تعالیٰ ہی ہے۔ رَجَعَ عَوْدَهٗ عَلٰى بَدْءِهٖ۔ یعنی جس راستہ پر آیا اسی پر واپس لوٹا۔ فعل ذالك عَائِدًا وَّبَادِئًا وَّمُبْدِئًا وَّمُعِيْدًا۔ اسے سب سے پہلے کیا اَبْدَأْتُ مِنْ اَرْضِ كَذَا میں نے فلاں سرزمین سے سفر شروع کیا اور آیت کریمہ۔ بَادِيَ الرَّاْيِ (۱۱-۲۷) رائے فطری یعنی وہ رائے جو ابتداء سے قائم کر لی جائے۔

ایک قراءت میں بَادِيَ الرَّاْيِ بدون ہمزہ کے ہے اس صورت میں اس کے معنی ظاہری رائے کے ہوں گے جس میں غور و فکر سے کام نہ لیا گیا ہو۔

شَيْءٌ بَدِيْءٌ۔ انوکھی چیز جو پہلی مرتبہ دیکھنے میں آئے جیسا کہ اَلْبَدِيْعُ جو پہلے معمول نہ ہو۔

اَلْبَدْأَةُ وہ حصہ جس سے تقسیم کی ابتداء کی جائے اسی سے گوشت کے بڑے ٹکڑے کو بَدْءٌ کہا جاتا ہے۔

(ب د ر)

بَدَرْتُ اِلَيْهِ وَبَادَرْتُ: کسی کام کے لئے جلدی کرنا قرآن میں ہے وَلَا تَاْكُلُوْهَا اِسْرَافًا وَّبِدَارًا (۴-۶) جلدی میں نہ اڑا دینا یعنی اسراف اور عجلت سے یتیم کا مال مت کھاؤ اور جو لغزش جلد بازی سے انسان سے سرزد ہو اسے بَادِرَةٌ کہا جاتا ہے۔ بَوَادِرُ كَانَتْ مِنْ فُلَانٍ بَوَادِرُ فِيْ هٰذَا الْاَمْرِ فلاں سے اس معاملہ میں جلد بازی سے لغزشیں ہوئی ہیں۔

اَلْبَدْرُ (ماہ کامل) بعض نے کہا ہے کہ پورے چاند کو بَدْرٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ سورج سے پہلے طلوع ہوتا ہے اور بعض نے بَدْرَةٌ (روپے سے بھری ہوئی تھیلی) سے اخذ کیا ہے اور کہا ہے کہ پورا چاند بھی بَدْرَةٌ کی طرح بھرپور ہوتا ہے اس لئے اسے بَدْرٌ کہا جاتا ہے اس توجیہ کی بنا پر یہ مصدر بمعنی فاعل ہوگا۔ لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ بَدْرٌ کو اس باب میں اصل

قرار دیا جائے۔ اور دوسرے معانی کو بَدْرٌ کے مختلف اوصاف کے اعتبار سے اس پر متفرع کیا جائے مثلاً بَدَرَ کذا کے معنی ہوں گے وہ بدر کی طرح طلوع اور ظاہر ہوا اور معنی اِمْتلاء کے لحاظ سے وراہم کی تھیلی کو بِدْرَۃٌ کہہ دیتے ہیں اس طرح کھلیان کو اَلْبَیْدَرُ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی غلہ سے پُر ہو جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ۔ وَلَقَدْ نَصَرَکُمُ اللّٰہُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّۃٌ۔ (۳-۱۲۳) اور خدا نے جنگ بدر میں تمہاری مدد کی تھی اور اس وقت بھی تم بے سروسامان تھے۔ میں بَدْرٌ مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مشہور مقام کا نام ہے[1]

(ب د ع)

اَلْاِبْدَاعُ۔ کسی کی تقلید اور اقتداء کے بغیر کسی چیز کو ایجاد کرنا۔ اسی سے نئے کھودے ہوئے کنوئیں کو رَکِیَّۃٌ بَدِیْعٌ کہا جاتا ہے۔ جب اِبْدَاعٌ کا لفظ اللہ عزوجل کے لئے استعمال ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں بغیر آلہ بغیر مادہ اور بغیر زمان ومکان کے کسی شیئے کو ایجاد کرنا اور یہ معنی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مختص ہے۔ اور اَلْبَدِیْعُ بمعنی مُبْدِعٌ بھی آیا ہے جیسے فرمایا:۔ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (وہی آسمان اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے (۲-۱۱۷) اور بمعنی مُبْدَعٌ (اسم مفعول) بھی آجاتا ہے جیسے رَکِیَّۃٌ بَدِیْعٌ (نیا کھودا ہوا کنواں) اسی طرح بِدْعًا کا لفظ بھی اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔ مَا کُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ کہ میں کوئی نیا پیغمبر نہیں ہوں (۴۶-۹) میں بِدْعًا بمعنی مُبْدِعٌ بھی ہو سکتا ہے یعنی پیغمبر ایسا کہ مجھ سے پہلے کوئی پیغمبر نہ آیا ہو اور بمعنی مُبْدَعٌ کے بھی یعنی میں کوئی نئی بات نہیں کہتا۔

اَلْبِدْعَۃُ مذہب میں نئی بات داخل کرنا جس کا قائل یا فاعل صاحب شریعت کی اقتدا نہ کرے اور نہ ہی سلف صالحین اور اصول شریعت سے اس کا ثبوت ملتا ہو ایک روایت میں ہے[2] (۲۵) کُلُّ مُحْدَثَۃٍ بِدْعَۃٌ وَکُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ وَکُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ کہ ہر نئی رسم بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں ہے۔ اَلْاِبْدَاعُ بِالرَّجُلِ سواری کے ماندہ اور دبلا ہونے کی وجہ سے رفقاء سے منقطع ہو جانا[3]۔

(ب د ل)

اَلْاِبْدَالُ وَالتَّبْدِیْلُ وَالتَّبَدُّلُ وَ الْاِسْتِبْدَالُ کے معنی ایک چیز کو دوسری کی جگہ رکھنا کے ہیں یہ عوض سے عام ہے کیونکہ عوض میں پہلی چیز کے بدلہ میں دوسری چیز لینا شرط ہوتا ہے لیکن تبدیل مطلق تغیر کو کہتے ہیں۔ خواہ اس کی جگہ پر دوسری چیز نہ لائے قرآن میں ہے فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَھُمْ (۲-۵۹) تو جو ظالم تھے انہوں نے اس لفظ کو جس کا ان کو حکم دیا گیا تھا بدل کر اس

---

[1] راجع لتحقیقہ البلدان ومعجم البکری۔ [2] کلہ من خطبتہ صلی اللہ علیہ وسلم انظر رقم م، ن، حم، عن جابر وابن حبان فی زوائدہ رقم ۱۰۲ [3] والفعل منہ فی ہذا المعنی لا یستعمل الا مجہولا ۱۲

کی جگہ اور لفظ کہنا شروع کر دیا۔ وَلَيُبَدِّلَنَّهُم مِّن بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا (۲۴-۵۵) اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ اور آیت: فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (۲۵-۷۰) کے معنی بعض نے یہ کئے ہیں کہ وہ ایسے نیک کام کریں جو ان کی سابقہ برائیوں کو مٹا دیں اور بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرما دیگا اور ان کے نیک عملوں کا انہیں ثواب عطا کریگا فَمَن بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ (۲-۱۸۱) تو جو شخص وصیت کو سننے کے بعد بدل ڈالے۔ وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ (۱۶-۱۰۱) جب ہم کوئی آیت کسی آیت کی جگہ بدل دیتے ہیں۔ وَبَدَّلْنَاهُم بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ (۳۴-۶)۔ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ (۷-۹۵) پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی سے بدل دیا۔

اور آیت کریمہ: يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ (۱۴-۴۸) کے معنی یہ ہیں کہ زمین کی موجودہ حالت تبدیل کر دی جائے گی۔ أَن يُبَدِّلَ دِينَكُمْ (۴۰-۲۶) کہ وہ (کہیں) تمہارے دین کو (نہ) بدل دے۔ وَمَن يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ (۲-۱۰۸) اور جس شخص نے ایمان (چھوڑ کر اس) کے بدلے کفر اختیار کیا وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (۴۷-۳۸) اور اگر تم منہ پھیرو گے تو وہ تمہاری جگہ اور لوگوں کو لے آئیگا۔ اور آیت کریمہ: مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ (۵۰-۲۹) ہمارے ہاں بات بدلا نہیں کرتی۔ کا مفہوم یہ ہے کہ لوح محفوظ میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہ تبدیل نہیں ہوتا پس اس میں تنبیہ ہے کہ جس چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ وقوع پذیر ہو گی وہ اس کے علم کے مطابق ہی وقوع پذیر ہو گی اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آ سکتی۔

بعض نے اس کا مفہوم یہ بیان کیا ہے کہ اس کے وعدہ میں خلف نہیں ہوتا۔ اور فرمان باریتعالیٰ: لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (۶-۳۴) تو قوانین خداوندی کو تبدیل کرنے والا نہیں۔ نیز: لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ فطرت الٰہی میں تبدیلی نہیں ہو سکتی (۳۰-۳۰) بھی ہر دو معانی پر محمول ہو سکتے ہیں مگر بعض نے کہا ہے کہ اس آخری آیت میں خبر بمعنی امر ہے اس میں اختصاء کی ممانعت ہے۔

اَلْاَبْدَالُ وہ پاکیزہ لوگ کہ جب کوئی شخص ان میں سے مر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرے کو اس کا قائم مقام فرما دیتے ہیں[1] درحقیقت ابدال وہ لوگ ہیں جنہوں نے صفات ذمیمہ کی بجائے صفات حسنہ کو اختیار کر لیا ہو۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جنکی طرف آیت: فَأُولَٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ (۲۵-۷۰) میں ارشاد فرمایا ہے۔

اَلْبَادِلَةُ گردن اور ہنسلی کے درمیان کا حصہ اس کی جمع بَآدِلُ ہے[2] ع (طویل)

---

[1] قال علی الابدال بالشام والنجباء بمصر والعصائب بالعراق والنقائق (رہم) والحدیث الابدال راجع مجمع الزوائد ج ۱۰ ص ۶۲-۶۳ عن علی موقوفاً وعن عبادة بن الصامت وانس وابن مسعود مرفوعاً ولا یخلوا ای حدیث عن مقال۔

[2] وصدرہ: فتی قدَّ قدَّ السیف لا متضائل ۔۔۔ وفی اللسان وابدال ابی الطیب متأزف بدل متضائل وفی الاصول ولا رھل بدل رہل وقد وقع فی نسبۃ ہذا البیت تخلیط وارتباک ففی المرزوقی (۳-۱۰۴۴-۱۰۴۹) والحماسۃ مع التبریزی ۲: ۲۶۴ ... لزینب بنت الطثریہ فی رثاء اخیہ ولکن اخوہ شاعراً مغلقاً کذا فی الحماسۃ البحتری ص ۲۷۵ والبیان (۱: ۲۱۶) والاغانی ۷: ۱۴۶) والامالی القالی (۲: ۸۵-۸۶) لکن فی الحماسۃ نفسہا ۲: ۱۹۳) ذکر ہذا البیت مع ابیات لعجیر السلولی (عجیر بن عبداللہ) وفی الصناعتین ص ۳۵۲ غیر معزو وفی روایۃ صدرہ "طویل نجاد السیف لا متضائل" وفی السمط ۴۰۸ انہ لشور بن الطثریہ فی رثاء اخیہ یزید وقیل لام یزید ترثی ابنہا راجع السمط وفی محاضرات المؤلف (۳: ۲۶۴) وبعضہم نسبہا الی الابیرد الریاحی راجع الاغانی ۱۲: ۱۲۴-۱۲۷)

(۱۹) وَلَا رَهِلٌ لَبَّاتُهُ وَبَآدِلُهُ

اس کے سینہ اور بغلوں کا گوشت ڈھیلا نہیں تھا۔

(ب د ن)

اَلْبَدَنُ یہ جَسَدٌ کے ہم معنی ہے لیکن بدن باعتبار عظمت جثہ کے بولا جاتا ہے اور جَسَدٌ باعتبار رنگ کے اسی سے رنگین کپڑے کو ثَوْبٌ مُجَسَّدٌ کہا جاتا ہے اور جسیم عورت کو اِمْرَءَةٌ بَادِنٌ وَبَدِیْنٌ کہتے ہیں اسی سے قربانی کے جانوروں کو اس کے فربہ ہونے کی وجہ سے بَدَنَةٌ کہا جاتا ہے اور بَدَّنَ وَبَدَنَ کے معنی موٹا ہونے کے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ بَدَّنَ کے معنی عمر رسیدہ ہو جانا کے ہیں شاعر نے کہا ہے[۱] (رجز)

(۲۰) وَکُنْتُ خِلْتُ الشَّیْبَ وَالتَّبْدِیْنَا۔

میں بڑھاپے اور عمر رسیدہ ہونے کو خیال کرتا تھا اسی معنی میں آنحضرتؐ نے فرمایا[۲] (۲۶)

لَاتُبَادِرُوْنِیْ بِالرُّکُوْعِ وَالسُّجُوْدِ فَاِنِّیْ قَدْ بَدَّنْتُ۔ کہ میں بوڑھا اور سن رسیدہ ہو گیا ہوں اس لئے رکوع و سجود میں مجھ سے سبقت نہ کیا کرو۔ اور آیت کریمہ: فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ (۱۰-۹۲) تو آج ہم تیرے بدن کو دریا سے نکال لیں گے۔ میں بَدَنٌ بمعنی جَسَدٌ ہے اور بعض نے اس سے زرہ مراد لی ہے کیونکہ زرہ کو بھی جسم پر ہونے کی وجہ بَدَنَةٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ قمیص کے بازو کو یَدٌ اور اس کی اگلی اور پچھلی طرف کو ظہر اور بطن کہدیتے ہیں۔

اور آیت کریمہ: وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَکُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لئے شعائر خدا مقرر کیا ہے (۲۲-۳۶) میں بُدْنٌ بَدَنَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہدی یعنی قربانی کے ہیں جو حرم میں لے جا کر ذبح کی جائے۔

(ب د و)

بَدَا (ن) الشَّیْءُ یَبْدُوْ بَدْوًا وَبَدَاءً کے معنی نمایاں طور پر ظاہر ہو جانا کے ہیں قرآن میں ہے:۔ وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ یَکُوْنُوْا یَحْتَسِبُوْنَ۔ (۳۹-۴۷) اور ان پر خدا کی طرف سے وہ امر ظاہر ہو جائیگا جس کا ان کو خیال بھی نہ تھا۔ وَبَدَا لَهُمْ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوْا (۳۹-۴۸) اور ان کے اعمال کی برائیاں ان پر ظاہر ہو جائیں گی۔ فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا (۲۰-۱۲۱) تو ان پر ان کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں۔

اَلْبَدْوُ یہ حَضَرٌ کی ضد ہے اور آیت کریمہ:۔ وَجَآءَ بِکُمْ مِّنَ الْبَدْوِ (۱۲-۱۰۰) آپ کو گاؤں سے یہاں لایا۔ میں بَدْوٌ بمعنی بَادِیَةٌ (صحرا) ہے اور ہر وہ مقام جہاں کوئی عمارت وغیرہ نہ ہوں اور تمام چیزیں ظاہر نظر آتی ہوں اسے بَدْوٌ (یَا بَادِیَةٌ) کہا جاتا ہے اور اَلْبَادِیْ کے معنی صحرا نشین کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

سَوَآءَنِ الْعَاکِفُ فِیْهِ وَالْبَادِ (۲۲-۲۵) خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔ لَوْ اَنَّهُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ (۳۳-۲۰) کہ کاش گنواروں میں جا رہیں[۳]۔

---

[۱] قالہ حمید الارقط وتمامہ: وانہم مما یدعل القرینا۔ وفی اللسان (بدن وکون) واضداد ابی الطیب ۲۲۸ بغیر عزو والبیت فی الاقتضاب ۳۴۲ واصلاح المنطق ۳۳۰ وغریب ابی عبید ار ۲۱۵ وفیہ کمیت [۲] الحدیث باختلاف الالفاظ رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجۃ عن معاویۃ (ص) عن ابی موسیٰ والبیہقی عن معاویۃ وابن سعد والبغوی عن ابی سعدۃ صاحب الجیوش انظر کنز العمال ج ۷ رقم ۲۷۸، ۲۸۳، ۲۸۱۴، ۳۸۱۹ وغریب ابی عبید ار ۲۱

[۳] الابداء (افعال) ظاہر کرنا دیم ۲-۳۱) (۲-۳۳) (۲-۷۱)

(ب ذ ر)

اَلتَّبْذِیْرُ (تفعیل) کے معنی پراگندہ کرنے اور بکھیر دینے کے ہیں اصل میں "تَبْذِیْرٌ" کے معنی زمین میں بیج ڈالنے کے ہیں اور چونکہ زمین میں بیج ڈالنا ناعاقبت اندیش لوگوں کی نظر میں بظاہر ضائع کرنا ہوتا ہے اس لئے تَبْذِیْر کا لفظ بطور استعارہ مال ضائع کر دینے کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ (۱۷-۲۷) فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِیْرًا (۱۷-۲۶) اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ۔

(ب ر ر)

اَلْبَرُّ یہ بَحْرٌ کی ضد ہے (اور اس کے معنی خشکی کے ہیں) پھر معنی وسعت کے اعتبار سے اس سے اَلْبِرُّ کا لفظ مشتق کیا گیا ہے جس کے معنی وسیع پیمانہ پر نیکی کرنا کے ہیں اس کی نسبت کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے جیسے اِنَّہٗ ھُوَ الْبَرُّ الرَّحِیْمُ (۵۲-۲۸) بے شک وہ احسان کرنے والا مہربان ہے۔ اور کبھی بندہ کی طرف جیسے بَرَّ الْعَبْدُ رَبَّہٗ (یعنی بندے نے اپنے رب کی خوب اطاعت کی) چنانچہ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ طرف ہو تو اس کے معنی ثواب عطا کرنا ہوتے ہیں۔ اور جب بندہ کی طرف منسوب ہو تو اطاعت اور فرمانبرداری کے اَلْبِرُّ (نیکی) دو قسم پر ہے اعتقادی اور عملی اور

آیت کریمہ:۔ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ (۲-۱۷۷) (الآیۃ) دونوں قسم کی نیکی کے بیان پر مشتمل ہے۔ اسی بنا پر جب آنحضرت سے بِرٌّ کی تفسیر دریافت کی گئی تو آں جناب نے جواباً یہی آیت تلاوت فرمائی کیونکہ اس آیت میں عقائد و اعمال فرائض و نوافل کی پوری تفصیل پائی جاتی ہے[1]۔

بِرُّ الْوَالِدَیْنِ کے معنی ہیں ماں باپ کے ساتھ نہایت اچھا برتاؤ اور احسان کرنا اس کی ضد عُقُوْقٌ ہے۔ قرآن میں ہے۔ لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ (۶۰-۸) جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں جنگ نہیں کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ان کے ساتھ بھلائی ...... کرنے سے خدا تم کو منع نہیں کرتا۔

اور بِرٌّ کے معنی سچائی بھی آتے ہیں کیونکہ یہ بھی خیر ہے جس میں وسعت کے معنی پائے جاتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے:۔ بَرَّ فِیْ یَمِیْنِہٖ اس نے اپنی قسم پوری کر دکھائی اور شاعر کے قول[2] (۴۳) اَکُوْنُ مَکَانَ الْبِرِّ مِنْہُ۔ میں بعض نے کہا ہے کہ بِرٌّ بمعنی فؤاد یعنی دل ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ یہاں بھی بِرٌّ بمعنی نیکی ہے یعنی میرا مقام اس کے ہاں بمنزلہ بر کے ہوگا۔ بَرَّ اَبَاہُ فَھُوَ بَارٌّ وَ بَرٌّ صیغہ صفت جو کہ صَائِفٌ وَصَیِّفٌ وَطَائِفٌ وَطَیِّفٌ

---

[1] کذا فی الطبری ۲/۹۴ و فی ابن کثیر ۱/۲۰۷ عن ابی ذر از سأل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما الایمان؟ فتلا علیہ لکنہ منقطع لان مجاہدًا لم یحلیاذر و راجع ایضًا البصائر والتاج (بر) [2] لخداش بن زہیر کما فی التاج (بر) وفی اللسان غیر منسوب لکن البیت فی روایۃ التاج:۔ یکون مکان البر منی و دونہ ۔ واجعل مالی دونہ واوامرہ

کی شکل دونوں طرح آتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے۔
وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ (۱۹-۱۴) اور ماں باپ کے ساتھ
نیکی کرنے والے تھے۔ وَبَرًّا بِوَالِدَتِي (۱۹-۳۲)
اور مجھے اپنی ماں کے ساتھ حسن سلوک کرنے
والا (بنا)
بَرَّ فِي يَمِينِهِ فَهُوَ بَارٌّ وَاَبْرَرْتُهُ قسم پوری
کرنا۔ بَرَّتْ يَمِينِي میری قسم پوری ہو گئی۔
حَجٌّ مَبْرُورٌ حج جس میں رفث وفسق اور
جدال نہ ہو۔
اَلْبَارُّ کی جمع اَبْرَارٌ وَبَرَرَةٌ آتی ہے قرآن میں
ہے۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ (۸۲-۱۳) بیشک
نیکوکار نعمتوں (کی بہشت) میں ہوں گے۔ كَلَّا
اِنَّ كِتَابَ الْاَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ (۸۳-۱۸)
اور یہ بھی سن رکھو کہ نیکوکاروں کے اعمال علیین
میں ہیں۔ اور آیت کریمہ۔ كِرَامٍ بَرَرَةٍ
(۸۰-۱۶) جو سردار اور نیکوکار ہیں۔
میں خاص کر فرشتوں کو بَرَرَةٌ کہا ہے کیونکہ
اَبْرَارٌ (جمع) سے زیادہ بلیغ ہے۔ اس لئے کہ
بَرَرَةٌ، بَرٌّ کی جمع ہے اور اَبْرَارٌ بَارٌّ کی تو
جیسے عَادِلٌ کی نسبت عَدْلٌ میں مبالغہ پایا جاتا
ہے اسی طرح بَرٌّ میں بَارٌّ سے زیادہ مبالغہ ہے
اَلْبَرِيرُ خاص کر پیلو کے درخت کے پھل کو
کہتے ہیں عام محاورہ ہے:۔ فُلَانٌ لَا يَعْرِفُ
الْبِرَّ مِنَ الْهِرِّ (وہ چوہے اور بلی میں تمیز نہیں
کر سکتا) بعض نے کہا ہے کہ یہ دونوں لفظ حکایت
کی صورت کے طور پر بولے جاتے ہیں[1] مگر اس محاورہ
کے صحیح معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے خیر خواہ اور بدخواہ
میں امتیاز نہیں کر سکتا۔
اَلْبَرْبَرَةُ بڑبڑ کرنا یہ بھی حکایت صوت کے قبیل سے ہے۔

(ب ر ء)

اَلْبُرْءُ وَالْبَرَاءُ وَالتَّبَرِّي کے اصل
معنی کسی مکروہ امر سے نجات حاصل کرنا کے ہیں۔
اسی لئے کہا جاتا ہے۔ بَرَأْتُ مِنَ الْمَرَضِ
میں تندرست ہوا۔
بَرِئْتُ مِنْ فُلَانٍ وَتَبَرَّأْتُ میں فلاں سے
بیزار ہوں۔ اَبْرَأْتُهُ مِنْ كَذَا وَبَرَّأْتُهُ
میں نے اس کو تہمت یا مرض سے بری کر دیا۔
رَجُلٌ بَرِيءٌ پاک اور بے گناہ آدمی ج بُرَآءُ
بَرِيئُونَ قرآن میں ہے:۔ بَرَاءَةٌ مِنَ اللّٰهِ
وَرَسُولِهِ (۹-۱) اور اس کے رسول کی طرف
سے بیزاری کا اعلان ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ بَرِيءٌ مِنَ
الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ (۹-۳) کہ خدا مشرکوں
سے بیزار ہے اور اس کا رسول بھی (ان سے دست
بردار ہے)۔
اَنْتُمْ بَرِيئُونَ مِمَّا اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيءٌ
مِمَّا تَعْمَلُونَ (۱۰-۴۱) تم میرے عملوں
کے جواب دہ نہیں ہو اور میں تمہارے عملوں
کا جواب دہ نہیں ہوں۔
اِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ
اللّٰهِ (۶۰-۴) کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے
جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو بے تعلق ہیں۔
وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيمُ لِاَبِيهِ وَقَوْمِهِ اِنَّنِي
بَرَاءٌ مِمَّا تَعْبُدُونَ (۴۳-۲۶) اور جب

---

[1] کما ورد فی التاج وعن ابن الاعرابی البر سوق الغنم والهر دعائها تحالہ القتیبی راجع ایضاً کتاب الحیوان (۶: ۴۷۸) والمثل فی اللسان (بر) وادب الکاتب ۳۸ وکتب الامثال

ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ جن چیزوں کو تم پوجتے ہو میں ان سے بیزار ہوں۔ فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا (۳۳-۶۹) تو خدا نے ان کو بے عیب ثابت کیا۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا (۲-۱۶۶) اس دن (کفر کے) پیشوا اپنے پیروؤں سے بیزاری ظاہر کریں گے۔

اَلْبَارِئُ (پیدا کرنے والا) یہ اسماء حسنیٰ سے ہے۔ جیسے فرمایا:۔ اَلْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (۵۹-۲۴) ایجاد و اختراع کرنے والا صورتیں بنانے والا۔

فَتُوْبُوْا اِلٰی بَارِئِکُمْ (۲-۵۴) تو اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو۔

اَلْبَرِیَّةُ کے معنی مخلوق کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں مہموز ہے لیکن ہمزہ کو ترک (یا ادغام) کر دیا گیا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ بَرَیْتُ الْقَوْسَ سے مشتق ہے اور مخلوق کو بَرِیَّةٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ البری یعنی مٹی سے پیدا کی گئی ہے۔ جیسا کہ آیت:۔ خَلَقَکُمْ مِنْ تُرَابٍ (۳۵-۱۱) سے معلوم ہوتا ہے۔

قرآن میں ہے۔ اُولٰٓئِکَ هُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّةِ (۹۸-۶) یہ لوگ سب مخلوق سے بدتر ہیں۔

(ب ر ج)

اَلْبُرُوْجُ یہ بُرْجٌ کی جمع ہے جس کے معنی قصر کے ہیں اسی مناسبت سے ستاروں کے مخصوص منازل کو بروج کہا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (۸۵-۱) آسمان کی قسم جس میں بُرج ہیں۔ اَلَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا (۲۵-۶۱) جس نے آسمان میں برج بنائے۔

اور آیت کریمہ:۔ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ (۴-۷۸) خواہ بڑے بڑے محلوں میں رہو۔ میں بروج سے مضبوط قلعے اور محلات بھی مراد ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ستاروں کی برجیں مراد ہوں اس صورت میں بروج کے ساتھ فقط مُشَیَّدَةٍ کا استعمال بطور استعارہ ہوگا اور باعتبار معنی اس مفہوم کی طرف اشارہ ہوگا۔ جیسا کہ زہیر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۴۴) وَمَنْ هَابَ اَسْبَابَ الْمَنَایَا یَنَلْنَهُ
وَلَوْ نَالَ اَسْبَابَ السَّمَآءِ بِسُلَّمِ

جو شخص اسباب موت سے ڈرتا ہے تو وہ لامحالہ اس کو پالیں گے۔ اگرچہ سیڑھی لگا کر آسمان کے اسباب پر کیوں نہ چلا جائے۔

اگر زمین کی برجیں مراد ہوں تو یہ اسی معنی کی طرف اشارہ ہوگا جسے دوسرے شاعر نے یوں ادا کیا ہے[2] ع (بسیط)

(۴۵) وَلَوْ کُنْتُ فِیْ غُمْدَانَ یَحْرُسُ بَابَهُ
اَرَاجِیْلُ اُحْبُوْشٍ وَاَسْوَدُ اٰلِفُ

---

[1] انظر دیواۃ ۳۰ و شرح العقائد العشر ۱۲ وابن الانباری ۲۸۳ و فی روایتہ اختلاف و اللسان (سبب) والمشکل القتیبی ۴۲ ۳۵۷ والبحرر: ۲۶/۱: ۵۶/۴ / ۳: ۲۶۵) والطبری (۸-۵۷) والعمدۃ (۱: ۳۳۳) والجمھرۃ ۱۰ [2] من قول ثعلبہ بن عمرو العبدی و ہما من کلمۃ مفضلیتہ رقم ۷۴ فی ۱۲ بیتا و راجع الحماسۃ التبریزی ۷۹ والمقائیس ۴: ۴۸۵ و فی الاغانی (۱۱: ۱۲۷-۱۲۹ بہا الشیخ من الاختلاف فی الروایۃ نسبتہ الی الی الطلی بن القینی ولعلہ تمثل بہا و باختلاف طفیف فی دیوان ادس بن حجر (۱: ۴۲ راجع شرح شواہد علی المغنی ومعجم البلدان (ریمان)

اِذًا لَا تَاْتِنِیْ حَیْثُ کُنْتُ مَنِیَّتِیْ
یَخُبُّ بِهَا هَادٍ لِاَثْرِیْ قَائِفٌ

اور اگر غمدان کے قلعہ میں چلا جاؤں جس کے دروازہ پر حبشی پہرہ دے رہے ہوں تو پھر بھی موت میرے پاس پہنچ جائے جیسے ایک قائف بدی خواں میرے نقش قدم پر چلا جا رہا ہوگا
ثَوْبٌ مُبَرَّجٌ اس کپڑے کو کہتے ہیں جس پر برجوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں پھر اس میں معنی حسن کا اعتبار کرکے تَبَرَّجَتِ الْمَرْءَۃُ کا محاورہ استعمال کرتے ہیں۔ یعنی عورت نے مزین کپڑے کی طرح آرائش کا اظہار کیا۔ بعض کہتے ہیں کہ تَبَرَّجَتِ المرءۃ کے معنی ہیں عورت اپنے قصر سے ظاہر ہوئی جیسا کہ ان دونوں آیتوں ۔
وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی (۳۳-۳۳) اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح (پہلے) جاہلیت کے زمانہ میں اظہار تجمل کرکے اپنے محلات سے نکلا کرتی تھیں اسی طرح اب مت نکلو زینت نہ دکھاؤ۔
غَیْرَ مُتَبَرِّجَاتٍ بِزِیْنَةٍ (۲۴-۶۰) بشرطیکہ اپنی زینت کی چیزیں ظاہر نہ کریں۔ سے معلوم ہوتا ہے اور پھر حسن وسعت میں تشبیہ دے کر وسعت چشم اور حسن نظر کے لئے اَلْبُرْجُ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

(ب ر ح)

اَلْبَرَاحُ اس وسیع جگہ کو کہتے ہیں جہاں عمارت درخت وغیرہ کچھ نہ ہو۔ لہٰذا کبھی اس میں معنی ظہور کا اعتبار لیتے ہیں جیسے فَعَلَ کَذَا بَرَاحًا یعنی اس نے کھلے بندوں یہ کام کیا بَرِحَ الْخَفَاءُ راز فاش ہوگیا گویا وہ کھلے میدان میں ہے اسی سے بَرَاحُ الدَّارِ ہے جس کے معنی گھر کے کھلے صحن کے ہیں۔
بَرِحَ کھلے میدان میں چلا جانا۔ اسی سے اَلْبَارِحُ ہے جس کے معنی سخت ہوا کے ہیں۔
اَلْبَارِحُ مِنَ الظِّبَاءِ وَالطَّیْرِ۔ خاص کر اس ہرن یا پرند کو کہتے ہیں جو شکاری کے سامنے سے ایسے رخ پر گزرے کہ اس کا نشانہ ممکن نہ ہو ایسے شکار کو منحوس سمجھا جاتا ہے اسکی جمع بَوَارِحُ آتی ہے اس کے بالمقابل سَانِحٌ اس شکار کو کہتے ہیں جو ایسے رخ سے آئے کہ اس کا قصد کار کرنا آسان ہو ایسے شکار کو میمون (مبارک) خیال کیا جاتا ہے۔
اَلْبَارِحَةُ شب گزشتہ بَرِحَ کھلی جگہ جم کر ٹھہرے رہنا اسی سے فرمان الٰہی لَا اَبْرَحُ ہے یہ لَا اَزَالُ کی طرح معنی مثبت کے ساتھ مخصوص ہے۔ کیونکہ بَرِحَ اور زَالَ میں نفی کے معنی پائے جاتے ہیں اور "لَا" بھی نفی کے لئے ہوتا ہے اور نفی پر نفی آنے سے اثبات حاصل ہو جاتا ہے اسی بنا پر فرمایا:۔ لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰکِفِیْنَ کہ۔۔۔۔ ہم تو اس (کی پوجا) پر قائم رہیں گے (۲۰-۹۱)
لَا اَبْرَحُ حَتّٰی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ (۱۸-۶۰) کہ جب تک میں دو دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں ہٹنے کا نہیں۔ اور اَلْبَارِحُ کے معنی نحوست کا اعتبار کرکے تَبْرِیْحٌ اور تَبَارِیْحٌ کا لفظ تکلیف اور شدائد کے لئے استعمال ہونے لگا ہے جیسے بَرَّحَ بِیَ الْاَمْرُ۔ مجھے فلاں معاملہ سے تکلیف پہنچی بَرَّحَ بِیْ فُلَانٌ فِی التَّقَاضِیْ۔ فلاں نے سخت تقاضا کیا۔

ضَرَبَهٗ ضَرْبًا مُبَرِّحًا[1] اسے سخت مارا۔

جَاءَ فُلَانٌ بِالْبَرْحِ۔ فلاں نے حیرت انگیز کام کیا۔

اَبْرَحْتُ رَبًّا میں اپنے رب کی تعظیم بجا لایا۔

اَبْرَحْتُ جَارًا میں نے ہمسائے کی عزت کی

بَرْحیٰ (ارے) نشانہ خطا ہونے پر یہ کلمہ ملامت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے بالمقابل لفظ "مَرْحیٰ" ہے جو نشانہ لگنے پر تحسین کے لئے بولا جاتا ہے۔ یعنی واہ، کیا خوب محاورہ ہے[2]۔ لَقِیْتُ مِنْهُ الْبَرْحِیْنَ وَالْبُرَحَاءَ مجھے اس سے تکالیف پہنچیں بُرَحَاءُ الْحُمّٰی بخار کی شدت۔

(ب ر د)

اَلْبَرْدُ (ٹھنڈا) اصل میں یہ حرٌّ کی ضد ہے۔ محاورہ میں کبھی اس کی ذات کا اعتبار کر کے کہا جاتا ہے:۔

بَرَدَ (ن ک) کَذَا اس نے ٹھنڈ حاصل کی۔

بَرَدَ (ن) اَلْمَاءُ کَذَا پانی نے اسے ٹھنڈا کر دیا۔

جیسے[3] ع (الطویل)

(۴۷) سَتَبْرُدُ اَكْبَادًا وَتُبْكِي بَوَاكِيَا

تو بہت سے کلیجوں کو ٹھنڈا کیا اور بہت سی رونے والیوں کو رلا ڈالے گی۔

اور بَرَّدَ (تفعیل) بھی اس معنی میں استعمال ہوتا ہے بعض کے نزدیک اَبْرَدَ (افعال) بھی اس معنی میں آجاتا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔

اسی سے اَلْبَرَّادَةُ ہے جس کے معنی پانی ٹھنڈا کرنے والی چیز کے ہیں اور محاورہ میں بَرَدَ كَذَا کے معنی کسی چیز کے البرد والے کی طرح جامد اور ثابت ہونا بھی آتے ہیں جس طرح حرٌّ کو حرکت لازم ہے اسی طرح بَرْدٌ کے ساتھ کسی چیز کا ثبات مختص ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔

بَرَدَ عَلَيْهِ دَيْنٌ۔ اس پر قرض ٹھہر گیا۔

شاعر نے کہا ہے[4] (رجز)

(۴۸) اَلْيَوْمُ بَارِدٌ سُمُوْمُهٗ۔

آج باد سموم جامد ہے۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے[5] (خفیف)

(۴۹) ۔۔۔ قد بَرَدَ الموتُ علی مصطلاہ۔۔۔

کہ اس کے ہاتھ اور چہرہ پر موت طاری ہوگئی۔

لَمْ يَبْرُدْ بِيَدِيْ شَيْءٌ میرے ہاتھ میں کوئی چیز قرار نہیں پکڑتی۔ بَرَدَ الْاِنْسَانُ مرجانا فوت ہو جانا۔ بَرَدَهٗ اسے قتل کر ڈالا اسی سے سیوف کو بَوَارِدُ کہا جاتا ہے کیونکہ میت بھی فقدان روح سے سرد پڑ جاتی ہے اور اسے سکون لاحق ہوتا ہے۔

---

[1] وفی القرآن وَلَا تَضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا مُبَرِّحًا ای ضربا موجعا ۱۲ [2] قال المرزوقی: البرحین شدت البلا (مع فتح الراء وکسرها) استعملوہ کالضیق و قد اما تموا واحدہ لما ارادوا وصف الدواہی بالکثرۃ ذیل الکامل ۹۹ وانظر للکلمۃ ایضا تہذیب الالفاظ ۳۴ و مجالس ثعلب ۵۲۰-۵۲۱ و فی الفائق: ہو فی الاصل جمع برح جمع السلامۃ للمبالغۃ مثل بلغ وبلغین یجوز فی اعرابہ ان یجری علی النون وان یجری علی ماقبلہا (۱: ۷۰) [3] قال مالک بن ریب المازنی فی رثاء نفسہ وکان فی جند سعید بن عثمان بطریق فارس وصدرہ: فعطل قلوصی فی الرکاب فانہا ۔۔۔ والبیت فی البحر (۶: ۳۱۹) من قصیدۃ جمہریۃ فی ۵۷ بیتا ۲۶۹-۲۷۲ وذیل الامالی ۱۳۶-۱۳۸ وفیہ وغیرہ بدل عطل وتمامہا فی نوادر الیزیدی والاختیارین رقم ۱۰ وفی المعجم للمرزبانی ۲۹۱ [4] لجعفر بن علبۃ الحارثی یرثی نفسہ لما ہموا بقتلہ باختلاف طفیف وتو وقلوصی بینہن فانما متغضغات (؟) سرا وتبکی بواکیا۔ وایام العرب ۸۰ وفیہ و تبرد بدل عطل [5] قال الراجز وتمامہ: من عجز الیوم فلا یوم اذا ترما الشطر فی الجمہرۃ (۱: ۲۴۴) والتبریزی (۱: ۱۹۵) وفی اللسان (برد) من جزع بدل من عجز کمافی السمط ۴۳۵ والفائق (۱: ۷۴) [5] قال ابو زبید الطائی فی رثاء اللجلاج یصف الموت وتکملۃ البیت بارزا ناجزاہ قد برد الموت علی مصطلاہ ای برد والبیت من قصیدۃ جمہریۃ ۲۶۶-۲۷۲ فی ۵۸ بیتا والبیت فی اللسان (برد) والمعانی ۱۰۵۶ ۲۰۵ والاختیارین ۱۲۶ وجمہرۃ الاشعار ۲۷۰ وامالی الیزیدی

یا ظاہری طور پر جلد میں خنکی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ نیند بھی ایک طرح کی موت ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:۔ اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا (۳۹-۴۲) خدا لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کی (روحیں) سوتے میں (قبض کر لیتا ہے)

اور آیت کریمہ:۔ لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْہَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا (۷۸-۲۴) میں بھی بَرْد بمعنی نیند ہے یعنی وہاں کسی قسم کی راحت اور زندگی کی خوشگواری نصیب نہیں ہوگی اور اس اعتبار سے کہ گرمی میں سردی سے راحت اور سکون حاصل ہوتا ہے خوشگوار زندگی کے لئے عَیْشٌ بَارِدٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

اَلْاَبْرَدَانِ صبح وشام کیونکہ یہ دونوں وقت ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ اَلْبَرَدُ کے معنی "اولے" کے ہیں اور بَرِدَ السَّحَابُ کے معنی ہیں بادل نے ژالہ باری کی سَحَابٌ اَبْرَدُ وَ بَرِدٌ۔ اولے برسانے والے بادل قرآن میں ہے:۔

وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْہَا مِنْ بَرَدٍ (۲۴-۴۳) اور آسمان کے پہاڑوں سے اولے نازل کرتا ہے۔

اَلْبَرْدِیُّ نرکل کی قسم کا ایک پودا۔ یہ بَرْد کی طرف منسوب ہے کیونکہ یہ بھی پانی میں پیدا ہوتا ہے مثل مشہور ہے [1]۔ اَصْلُ کُلِّ دَاءٍ اَلْبَرَدَۃُ کہ بدہضمی ام الامراض ہے بدہضمی کو بَرَدَۃٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اس برودت طبعی کی وجہ سے عارض ہوتی ہے جس سے قوت ہضم ناقابل ہو جاتی ہے۔

اَلْبَرُوْدُ ٹھنڈ پہنچانے والی چیز کو کہتے ہیں اور کبھی ٹھنڈی چیز کو بھی کہہ دیتے ہیں کیونکہ فَعُوْلٌ کبھی بمعنی فاعل ہوتا ہے اور کبھی بمعنی مفعول آتا ہے۔ جیسے:۔ مَاءٌ بَرُوْدٌ (ٹھنڈا پانی) ثَغْرٌ بَرُوْدٌ (خنک دانت) جیسا کہ آنکھ کو ٹھنڈک پہنچانے والے سرمہ کو بَرُوْدٌ کہا جاتا ہے [2]

بَرَدْتُ الْحَدِیْدَ میں نے لوہے کو ریتی سے رگڑا یہ بَرَدْتُہٗ بمعنی قَتَلْتُہٗ سے مشتق ہے اور لوہ چون کو بُرَادَۃٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْمِبْرَدُ (آلہ) ریتی جس سے لوہے کو ریتتے ہیں۔

اَلْبُرُدُ یہ اَلْبَرِیْدُ کی جمع ہے اور محکمہ مواصلات کی اصطلاح میں بُرُدٌ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو کسی جگہ پر پیغام رسانی کے لئے متعین رہتے ہیں۔ وہ ہرکارے چونکہ سرعت سے پیغام رسانی کا کام کرتے تھے اس لئے ہر تیز رو کے کے لئے ھُوَ یُبْرِدُ کا محاورہ استعمال ہونے لگا ہے۔ اور پرندگے پروں کو بَرِیْدَانِ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی اسے بریں کا کام دیتے ہیں تو یہ بناء الفرع علی الفرع کے قبیل سے ہے جیسا کہ "علم الاشتقاق" میں بیان کیا جاتا ہے۔

(ب ر ز)

اَلْبَرَازُ کے معنی فضاء یعنی کھلی جگہ کے ہیں۔ اور بَرَزَ (ن) کے معنی ہیں کھلی جگہ میں چلے جانا اور بُرُوْزٌ (ظہور) کی طرح پر ہوتا ہے (۱) از خود کسی چیز کا ظاہر ہو جانا جیسے فرمایا:۔ وَتَرَی الْاَرْضَ بَارِزَۃً (۱۸-۴۷) اور تم زمین

---

[1] رواہ الدارقطنی فی العلل عن انس وابن السنی وابو نعیم فی الطب عن علیؓ وعن ابی سعید وعن الزہری مرسلاً قال فی النہایۃ ۱/۸۷ واللسان (برد) البردۃ ہی التخمۃ وثقل الطعام علی المعدۃ وایضاً فارس غریب لابی عبیدۃ

[2] وفی اللسان (برد) کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالبرود

کو صاف بیان دیکھو گے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ زمین پر سے عمارات اور ان کے ساکنین سب ختم ہو جائیں گے اسی سے مُبَارَزَۃٌ ہے جس کے معنی صفوف جنگ سے آگے نکل کر مقابلہ کرنے کے ہیں قرآن میں ہے:۔ لَبَرَزَ الَّذِیْنَ کُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰی مَضَاجِعِهِمْ (۳-۱۵۴) تو جن کی تقدیر میں مارا جانا لکھا تھا وہ اپنی اپنی قتل گاہوں کی طرف ضرور نکل آتے۔

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ (۲-۲۵۰) اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے بالمقابل میں آئے۔

(۲) دوم بُرُوْزٌ کے معنی فضیلت ظاہر ہونے کے ہیں جو کسی محمود کام میں سبقت لے جانے سے حاصل ہوتی ہے

(۳) کسی مستور چیز کا منکشف ہو کر سامنے آجانا جیسے فرمایا:۔ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (۱۴-۴۸) اور سب لوگ خدائے یگانہ زبردست کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِیْعًا (۱۴-۲۱) اور (قیامت کے دن) سب لوگ خدا کے سامنے کھڑے ہونگے۔

یَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ۔ (۴۰-۱۶) جس روز وہ نکل پڑیں گے۔

اور آیت کریمہ:۔ وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِلْغَاوِیْنَ (۲۶-۹۱) اور دوزخ گمراہوں کے سامنے لائی جائے گی میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے کہ انہیں دوزخ کے سامنے لایا جائیگا محاورہ ہے۔ تَبَرَّزَ فُلَانٌ کنایہ از قضائے حاجت اور پاکدامن عورت کو اِمْرَءَۃٌ بَرْزَۃٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی رفعت پاک دامنی اور عفت میں مضمر ہوتی ہے نہ یہ کہ بَرْزَۃٌ کا لفظ اس معنی کا مقتضی ہے۔

(ب ر ز خ)

اَلْبَرْزَخُ کے معنی دو چیزوں کے درمیان حد فاصل اور روک کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ دراصل یہ بَرْزَۃٌ (پردہ) سے معرب ہے۔ قرآن میں ہے۔ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیَانِ (۵۵-۲۰) دونوں میں ایک آڑ ہے کہ اس سے تجاوز نہیں کر سکتے[1]

اور بَرْزَخٌ اس رکاوٹ کو بھی کہا گیا ہے جو آخرت میں انسان اور اس کے منازل رفیعہ تک پہنچنے کے درمیان حائل ہو گی جیسے قرآن نے آیت:۔ فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ۔ (۹۰-۱۱) مگر وہ گھاٹی پر سے ہو کر نہ گزرا۔ میں عَقَبَۃٌ کہا ہے چنانچہ فرمایا:۔ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ اور ان کے پیچھے برزخ ہے (جہاں وہ) اس دن تک کہ (دوبارہ) اٹھائے جائیں گے (رہینگے) (۲۳-۱۰۰)

لہٰذا عَقَبَۃٌ سے مراد وہ موانع ہیں جو بلند درجات تک پہنچنے سے روک لیتے ہیں جن تک کہ نیک لوگ ہی پہنچ سکتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں برزخ سے موت اور حشر کے مابین کی مدت مراد ہے۔

(ب ر ص)

اَلْبَرَصُ پھلبہری مشہور مرض کا نام ہے[2] اور

---

[1] وایضًا: وَجَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا (۲۵-۵۳) [2] د فی القرآن و ابرء الاکمہ والابرص (۳-۴۹) وتُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ (۵-۱۱۰)

چاند کو اس سیاہ دھبہ کی وجہ سے جو اس میں نظر آتا ہے، اَبْرَصُ کہا گیا ہے۔ اور سَامٌّ اَبْرَصُ کے معنی چھپکلی کے ہیں کیونکہ اس کی جلد پر بھی بَرَص جیسے دھبے ہوتے ہیں۔
اَلْبَرِیْصُ وہ ہے جو ابرص کی طرح چمکدار ہو۔ یہی معنی تقریبًا بصیص کے ہیں جو بَصَّ یَبِصُّ بمعنی برق سے مشتق ہے۔

(ب ر ق)

اَلْبَرْقُ کے معنی بادل کی چمک کے ہیں قرآن میں ہے:۔ فِیْہِ ظُلُمَاتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ (۲-۱۹) اس میں اندھیرے پر اندھیرا چھا رہا) ہو اور (بادل) گرج (رہا) ہو اور بجلی کوند رہی ہو۔
اس سے فعل بَرَقَ وَاَبْرَقَ دونوں آتے ہیں اور بَرَقَ ہر چمکدار چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے:۔ سَیْفٌ بَارِقٌ چمکدار تلوار۔
بَرِقَ وَبَرَقَ کے معنی خوف کی وجہ سے آنکھ خیرہ ہوجانا ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ (۷۵-۷) جب آنکھیں چندھیا جائیں
ایک قراءت میں بَرَقَ ہے۔
پھر کبھی بَرَقَ سے اختلاف رنگ کے معنی لے کر مختلف الوان کی پتھریلی زمین کو بُرْقَۃٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْاَبْرَقُ کے معنی سیاہ سفید پہاڑ کے ہیں اسی لئے آنکھ کو بَرْقَاءُ کہا جاتا ہے۔
نَاقَۃٌ بَرُوْقٌ۔ اونٹنی جو دم اٹھا کر حمل کو ظاہر کرے
اَلْبَرُوْقَۃُ ایک قسم کی گھاس جو ابر کو دیکھ کر ہی سرسبز ہوجاتی ہے اسی سے مثل مشہور ہے۔
اَشْکَرُ مِنْ بَرُوْقَۃٍ وہ بروقہ سے بھی زیادہ شکر گزار ہے

بَرَّقَ طَعَامَہٗ بِزَیْتِہٖ روٹی کو زیتون سے چپڑنا۔
اَلْبَارِقَۃُ وَالْاُبَیْرِقُ۔ چمکدار تلوار
اَلْبُرَاقُ بعض کہتے ہیں کہ یہ اس دابۃ کا نام ہے جس پر آنحضرت شب معراج کو سوار ہوئے تھے اس کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے۔
اَلْاِبْرِیْقُ لوٹا یا صراحی (ج اَبَارِیْقُ[1])
اور بَرَقَ سے کبھی خوف کے معنی لے کر بَرَقَ فُلَانٌ وَاَبْرَقَ وَاَرْعَدَ کے معنی دھمکی دینا بھی آجاتے ہیں۔

(ب ر ک)

اَلْبَرْکُ اصل میں اَلْبَرْکُ کے معنی اونٹ کے سینہ کے ہیں (جس پر وہ جم کر بیٹھ جاتا ہے) گو یہ دوسروں کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کے سینہ کو بِرْکَۃٌ کہا جاتا ہے۔
بَرَکَ الْبَعِیْرُ کے معنی ہیں اونٹ اپنے گھٹنے رکھ کر بیٹھ گیا پھر اس سے معنی لزوم کا اعتبار کرکے اِبْتَرَکُوْا فِی الْحَرْبِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی میدان جنگ میں ثابت قدم رہنے اور جم کر لڑنے کے ہیں۔
بُرَاکَاءُ الْحَرْبِ وَبَرُوْکَاءُ ھَا سخت کارزار جہاں بہادر ہی ثابت قدم رہ سکتے ہوں۔
اِبْتَرَکَتِ الدَّابَّۃُ چوپایہ کا جم کر کھڑا ہوجانا
بِرْکَۃٌ حوض، پانی جمع کرنے کی جگہ۔
اَلْبَرَکَۃُ کے معنی کسی شے میں خیر الٰہی ثابت ہونا کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔
لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکَاتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (۷-۹۶) تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکات

---

[1] وفی الواقعۃ ۵۶-۱۸ باکواب واباریق ویتصل بذالک لفظ استبرق (الحریر) راجع الآیات (۱۸-۳۱) (۴۴-۵۳) (۵۵-۵۴) ÷

(کے دروازے) کھول دیتے ۔
یہاں برکات سے مراد بارش کا پانی ہے اور چونکہ بارش کے پانی میں اس طرح خیر ثابت ہوتی ہے جس طرح کہ حوض میں پانی ٹھہر جاتا ہے اس لئے بارش کو برکات سے تعبیر کیا ہے ۔

اَلْمُبَارَكُ ہر وہ چیز جس میں خیر و برکت پائی جائے اور آیت کریمہ:۔ وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ اَنْزَلْنٰهُ (۲۱-۵۰) اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔ میں ذکر کو مبارک کہہ کر ان خیرات الٰہیہ پر تنبیہ کی ہے۔ جو اس میں پائی جاتی ہیں۔
نیز فرمایا:۔ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ (۳۸-۲۹) (یہ) کتاب جو ہم نے تم پر نازل کی ہے مبارک ہے۔
اور آیت کریمہ:۔ وَجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا (۱۹-۳۱) کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے مجھے خیر و برکت کا محل بنایا ہے ۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ (۴۴-۳) کہ ہم نے اس کو مبارک رات میں نازل فرمایا ۔

رَبِّ اَنْزِلْنِيْ مُنْزَلًا مُّبٰرَكًا (۲۳-۲۹) یعنی اے پروردگار ہمیں اس جگہ پر اتاریو جہاں خیر و برکت پائی جاتی ہو۔ اور آیت:۔ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا (۵۰-۹) اور آسمان سے برکت والا پانی اتارا۔ میں بارش کے پانی کو بابرکت قرار دیا ہے چنانچہ اس کی برکت کو دوسرے مقام پر بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ (۳۹-۲۱) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا آسمان سے پانی نازل کرتا پھر اس کو زمین میں چشمے بنا کر جاری کرتا پھر اس سے کھیتی اگاتا ہے جس کے طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں ۔
وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ (۲۳-۱۸) اور ہم نے آسمان سے ایک اندازے کے ساتھ پانی نازل کیا پھر اس کو زمین میں ٹھہرا دیا ۔

اور خیر الٰہی چونکہ غیر محسوس طریقہ پر صادر ہوتی ہے اور بے شمار طریقوں پر پائی جاتی ہے اس لئے ہر اس چیز کو جس میں غیر محسوس طور پر زیادتی محسوس ہو اسے مبارک (بابرکت) کہدیتے ہیں۔ اور حدیث میں جو مروی ہے[1]۔

(۲۷) لا ينقص مال من صدقة کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا۔ تو اس سے بھی اسی قسم کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ ورنہ نقصان حسی کی نفی نہیں ہے جیسا کہ بعض بدنصیب لوگوں نے اعتراض کیا ہے۔ کہ نقصان نہیں ہوتا تو ترازو سے تول کر دیکھ لو اور آیت کریمہ:۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا (۲۵-۶۱) اور (خدا) برکت والا ہے جس نے آسمانوں میں برج بنائے۔ میں ان نعمتوں پر تنبیہ کی ہے جو ان برجوں اور نیّرات کے ذریعہ ہم پر نازل ہوتی ہیں اور آیات کریمہ:۔ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (۲۳-۱۴) تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا ہے بڑا بابرکت ہے۔ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ (۲۵-۱) وہ (خدائے عزوجل) بہت ہی بابرکت ہے۔
تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ (۲۵-۱۰) وہ (خدا) بہت بابرکت ہے جو اگر چاہے تو تمہارے لئے اس سے بہتر (چیزیں) بنا دے۔

---

[1] راجع کنز العمال ج ۳ رقم ۱۸۸) وفی روایۃ۔ انقصت الحدیث فی دحم ام ات و روضۃ العقلاء للبستی ۵ ۱۴ عن ابی ہریرۃ و راجع لمعناہ مشکل الحدیث لابن قتیبۃ ۱۲

تَبَارَكَ اللّٰهُ رَبُّ العَالَمِيْنَ (۴-۵۴) پس خدائے پروردگار عالم بہت ہی بابرکت ہے۔ تَبَارَكَ الَّذِیْ بِيَدِهِ الْمُلْكُ (۶۷-۱) وہ (خدا) جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے بڑی برکت والا ہے۔
میں تنبیہ کی ہے کہ وہ تمام خیرات جن کو لفظ تبارک کے تحت ذکر کیا ہے' ذات باری تعالےٰ ہی کے ساتھ مختص ہیں۔

(ب ر م)

اَلْاِبْرَامُ کے معنی کسی معاملہ کو محکم اور مضبوط کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ اَمْ اَبْرَمُوْا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ (۴۳-۷۹) کیا انہوں نے کوئی بات ٹھہرا رکھی ہے تو ہم بھی کچھ ٹھہرانے والے ہیں۔
یہ اصل میں اِبْرَامُ الْحَبْلِ سے ماخوذ ہے جس کے معنی رسی کو مضبوط بٹنے کے ہیں شاعر نے کہا ہے[۱] (طویل)

(۵۰) عَلٰی كُلِّ حَالٍ مِنْ سَحِیْلٍ وَّ مُبْرَمٖ

یعنی ہر حالت میں نرم قابل ستائش ہو۔
اَلْبَرِیْمُ بمعنی مُبْرَم یعنی مضبوط بٹی ہوئی رسی محاورہ ہے۔ اَبْرَمْتُهٗ فَبَرِمَ فَهُوَ بَرِیْمٌ اسی بنا پر کنجوس آدمی کو جو جوا نہ کھیلتا ہو بَرَمٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ بخیل کو مغلول الید کہتے ہیں۔ اور مُبْرِمُ الْحَبْلِ کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر اس آدمی کو جو کسی معاملہ میں مصر اور بضد ہو اسے اَلْمُبْرِمُ کہا جاتا ہے یہی معنی اَلْبَرَمُ کے ہیں اور جو آدمی دو دو کھجوریں ملا کر کھاتا ہو اسے بھی بَرَمٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں سختی کے ساتھ کھانا کے معنی پائے جاتے ہیں۔
اور رسی کبھی دو رنگ پر ہوتی ہے اس لئے ہر سیاہ سفید پر مشتمل لشکر اور بکریوں کے ملے جلے ریوڑ کو بَرِیْمٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْبُرْمَةُ اصل میں پتھر کی ہنڈیا کو کہتے ہیں ج بِرَامٌ جیسے حُضْرَةٌ کی جمع حِضَارٌ اور یہ ضُحْكَةٌ وَهُزْءَةٌ کی طرح مفعول کے اوزان سے ہے۔

(ب ر ه)

اَلْبُرْهَانُ کے معنی دلیل اور حجت کے ہیں اور یہ رُجْحَانٌ وَ ثُنْیَانٌ کی طرح فُعْلَانٌ کے وزن پر ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بَرِهَ یَبْرَهُ کا مصدر ہے جس کے معنی سفید اور چمکنے کے ہیں ج صفت اَبْرَهُ مونث بَرْهَاءُ ج بُرْهٌ اور نوجوان سپید رنگ حسینہ کو بَرَهْرَهَةٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْبَرَهْرَهَةُ دقت کا کچھ حصہ لیکن بُرْهَان دلیل قاطع کو کہتے ہیں جو تمام دلائل سے زوردار ہو اور ہر حال میں ہمیشہ سچی ہو اس لئے کہ دلیل کی پانچ قسمیں ہیں۔
(۱) وہ جو ہمیشہ صدق کی مقتضی ہو (۲) وہ جو ہمیشہ کذب کی مقتضی ہو (۳) وہ جو اقرب الی الصدق ہو (۴) جو کذب کے زیادہ قریب ہو (۵) وہ جو اقتضاء صدق و کذب میں مساوی ہو۔ قرآن میں ہے۔
قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِیْنَ (۲-۱۱۱) اے پیغمبر ان سے) کہدو کہ اگر تم سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔
قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِیَ (۲۱-۲۴) کہدو کہ (اس بات پر) اپنی دلیل پیش کرو یہ (میری اور) میرے ساتھ والوں کی کتاب بھی ہے۔

---

[۱] قاله زهير فی معلقته واوله: یمینا لنعم السیدان وجدتما۔ راجع للبیت شرح المعلقات لابن الانباری ۲۷۰ والعشر للتبریزی ۸۰ وانسمط ۱۲:۴ واللسان (سحل) وشواهد الکشاف والاشباه والنحویه (۴: ۲۰۵) والمعانی للقتیبی ۸۰ ومختار الشعر الجاهلی فی شرح السعادا: ۱۳ ۵ والجمهرة ۲۰۷ والعقد الثمین ۹۶ وایام العرب ۲۴۳

قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۴-۱۷۴) تمہارے پاس دلیل (روشن) آچکی ہے۔

(ب ز غ)

بَزَغَ الشَّمْسُ کے معنی ہیں سورج کا طلوع ہونا۔ جب کہ اس کی روشنی پھیل رہی ہو۔ قرآن میں ہے۔

فَلَمَّا رَأَى الشَّمْسَ بَازِغَةً (۶-۷۸) پھر جب سورج کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھا۔

فَلَمَّا رَأَى الْقَمَرَ بَازِغًا (۶-۷۷) پھر جب چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا۔

تشبیہ کے طور پر بَزَغَ النَّابُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی اونٹ کی نیش نکل آنا کے ہیں۔ اصل میں یہ بَزَغَ الْبَيْطَارُ الدَّابَّةَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی جانور کے نشتر لگا کر خون بہانا کے ہیں۔

(ب س س)

آیت کریمہ :۔ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا (۵۶-۵) میں بُسَّتْ کے معنی پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جانا کے ہیں اور یہ بَسَسْتُ الْحِنْطَةَ وَالسَّوِيقَ بِالْمَاءِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی پانی میں گندم یا جو کے ستو ڈال کر نشاستہ نکالنے کے ہیں اور نشاستہ کو بَسِيْسَة کہا جاتا ہے بعض نے اس کے معنی تیز ہنکانا کے ہیں اور کہا ہے کہ یہ انْبَسَّتِ الْحَيَّةُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی سانپ کے نہایت تیزی کے ساتھ اپنے بل کی طرف دوڑنا کے ہیں اور اسی معنی کو دوسری جگہ يَوْمَ تُسَيَّرُ الْجِبَالُ (۱۸-۴۷) اور :۔ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (۲۷-۸۸) کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے بَسَسْتُ الْإِبِلَ اونٹوں کو ہنکاتے وقت ڈانٹنا أَبْسَسْتُ بِهَا عِنْدَ الْحَلْبِ اونٹنی دوہنے کے وقت اس کو چمکارنا اور اس اونٹنی کو جو بغیر چمکارنے کے دودھ نہ دے بَسُوسٌ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے[1]۔

(۲۸) جَاءَ أَهْلُ الْيَمَنِ يَبُسُّونَ عِيَالَهُمْ۔ کہ اہل یمن اپنے اہل وعیال کو نرمی سے چلاتے ہوئے آپہنچے ہیں۔

(ب س ر)

اَلْبَسْرُ کے معنی کسی چیز کو قبل از وقت جلدی لے لینا کے ہیں جیسے بَسَرَ الرَّجُلُ الْحَاجَةَ (اس نے قبل از وقت اپنی ضرورت کو طلب کیا) بَسَرَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ نر مادہ کی خواہش کے بغیر اونٹ نے اس سے جفتی کی، مَاءٌ بُسْرٌ بارش کا تازہ پانی جو زمین پر گرنے سے پہلے ہی لے لیا جائے بُسِرَ الْقَرْحُ پھوڑے کو پکنے سے پہلے پھوڑ دینا اسی سے گدری کھجور کو بُسْرٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ :۔ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ (۷۴-۲۲) پھر تیوری چڑھائی اور منہ بگاڑ لیا۔ میں بَسَرَ کے معنی قبل از وقت منہ بگاڑنے کے ہیں اس پر اعتراض ہوسکتا ہے کہ اگر بَسَرَ کے یہی معنی ہیں تو آیت :۔ وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ (۷۵-۲۴) اور بہت سے منہ اس دن اداس ہوں گے۔ میں بَاسِرَة کے کیا معنی ہوں گے کیونکہ وہاں تو قبل از وقت منہ بگاڑنا نہیں ہوگا اس کا جواب یہ ہے کہ چوں کہ

---

[1] الحدیث بتفصیلہ فی (رخ) مدینہ و (ط) راجع لشرح الحدیث غریب لابی عبید (بسس) ۳: ۱۵

ان کی یہ حالت آگ میں داخل ہونے سے قبل ہوگی اس لئے باسِرَۃ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ گویا آگ میں پہنچنے سے قبل ان کا منہ بگاڑنا محض تکلف اور قبل از وقت ہوگا جیسا کہ بعد کی آیت:۔ وَتَظُنُّ اَنْ یُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَۃٌ (۷۵-۲۵) خیال کریں گے کہ ان پر مصیبت واقع ہونے والی ہے۔ سے معلوم ہوتا ہے۔

(ب س ط)

بَسَطَ الشَّیْئَ کے معنی کسی چیز کو پھیلانے اور توسیع کرنے کے ہیں۔ پھر استعمال میں کبھی دونوں معنی ملحوظ ہوتے ہیں اور کبھی ایک معنی متصور ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے بَسَطَ الثَّوْبَ (اس نے کپڑا پھیلایا) اسی سے اَلْبِسَاطُ ہے جو ہر پھیلائی ہوئی چیز پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا (۷۱-۱۹) اور خدا ہی نے زمین کو تمہارے لئے فرش بنایا۔ اور بساط کے معنی وسیع زمین کے ہیں اور بَسِیْطُ الْاَرْضِ کے معنی ہیں کھلی اور کشادہ زمین۔ ایک گروہ کے نزدیک بسیط کا لفظ بطور استعارہ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جس میں ترکیب و تالیف اور نظم متصور نہ ہوسکے۔ اور بسط کبھی بمقابلہ قبض آتا ہے۔ جیسے وَاللّٰهُ یَقْبِضُ وَیَبْسُطُ (۲-۲۴۵) خدا ہی روزی کو تنگ کرتا اور (وہی) اسے کشادہ کرتا ہے۔ اور کبھی بمقابلہ قدر (یعنی تنگ کرنا) کے جیسے وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ (۴۲-۲۷) اور اگر خدا اپنے بندوں کے لئے رزق میں فراخی کردیتا۔ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲-۲۴۷) اسنے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور تن و توش بھی بڑا عطا کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ان کا بسیطۃ فی العلم یہ تھا کہ انہوں نے اس سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی نفع پہنچایا اور یہ ان کا بَسْطَة یعنی جودوسخا تھا۔

بَسْطُ الْيَدِ کے معنی ہاتھ پھیلانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ وَكَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ (۱۸-۱۸) ان کا کتا چوکھٹ پر دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔

اور بَسْطُ الْكَفِّ (ہتھیلی پھیلانا) یہ لفظ کبھی طلب وسوال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے:۔ كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ (۱۳-۱۴) اس شخص کی طرح جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلا دے۔ اور کبھی اَخْذٌ یعنی پکڑنے کے معنی میں آتا ہے جیسے:۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ (۶-۹۳) اور فرشتے (ان کی طرف عذاب کے لئے) ہاتھ بڑھا رہے ہوں۔ اور کبھی حملہ کرنے اور مارنے کے معنی میں آتا ہے جیسے فرمایا:۔ وَيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ (۶۰-۲) اور ایذا کے لئے تم پر ہاتھ (بھی) چلائیں اور زبانیں (بھی)۔ اور کبھی اس سے بخشش کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ (۵-۶۴) بلکہ اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔

اَلْبَسْطُ وہ اونٹنی جس کے ساتھ اس کے بچے کو چھوڑ دیا گیا ہو اور یہ بمعنی مَبْسُوْطَةٌ ہے جیسے نِكْثٌ بمعنی منکوث ونقض بمعنی منقوض آجاتا ہے۔ اَلْبَسَطَ نَاقَتَهٗ اونٹنی کو اس

کے بچے کے ساتھ چھوڑ دیا۔

(ب س ق)

قرآن میں ہے:۔
وَالنَّخْلَ بَاسِقَاتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيدٌ (۵۰-۱۰)
اور لمبی لمبی کھجوریں جن کا گابھا تہ بہ تہ ہوتا ہے۔
اَلْبَاسِقُ کے معنی ہیں بلندی میں لمبا چلا جانے والا چنانچہ اسی سے بَسَقَ فُلَانٌ عَلٰی اَصْحَابِہٖ ہے جس کے معنی ہیں اپنے ساتھیوں پر فضیلت میں بازی لے جانا۔
بَسَقَ وبَصَقَ جس کے معنی تھوکنا ہیں اصل میں بَزَقَ ہے بَسَقَتِ النَّاقَةُ اونٹنی کے تھنوں میں بغیر جفتی نر کے تھوک کیطرح معمولی سا دودھ اتر آیا۔

(ب س ل)

اَلْبَسْلُ کے معنی کسی چیز کو اکٹھا کرنا اور روکنا کے ہیں۔ اکٹھا کرنا کے مفہوم کے پیش نظر استعارۃً ترشروئی کے معنی استعمال ہوتا ہے اور ترشرو کو باسل و مبسل الوجہ کہا جاتا ہے۔ اور روکنے کے معنی کے پیش نظر حرام اور گروی چیز کو بَسْلٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ (۶-۷۰) یعنی اس (قرآن) کے ذریعے نصیحت کرتے رہو تاکہ (قیامت کے دن) کوئی نفس اپنے اعمال کے ثواب سے محروم نہ رہ جائے بلاکت میں نہ ڈالا جائے۔

بسل اور حرام میں فرق یہ ہے کہ حرام عام ہے جو ممنوع عنہ حکمی اور قہری دونوں کو شامل ہے اور بَسْلٌ کا لفظ صرف جبراً کسی چیز سے محروم کردینے پر بولا جاتا ہے قرآن میں ہے۔
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا (۶-۷۰)
یعنی یہی لوگ ہیں کہ اپنے اعمال کے سبب ثواب سے محروم کردیئے گئے۔ بعض نے آیت کریمہ:۔
• كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (۷۴-۳۸)
ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے گرو ہے کے پیش نظر اس کی تفسیر اِبْسَالٌ سے بھی کی ہے۔ یعنی یہ لوگ اپنے اعمال کے بدلے گروموں گے شاعر نے کہا:
(۵۱) وَاِبْسَالِيْ بَنِيَّ بِغَيْرِ جُرْمٍ (وافر)
اور میرا اپنے بیٹوں کو ناحق دیتی قشیر کے پاس) گرو کرنا اور دوسرے نے کہا ہے[1] ع (طویل)

[1] لعوف بن الاحوص البابلی یحسر علی تسلیم ابناء ہ بنی قشیر رھنًا فی دم رجل منھم اسمہ ابوالصحیفہ وتمامہ: بعوناہ ولا بدم مراق ... بعوناہ من بعا یبعو بعوًا بمعنی الجنایۃ والجرم والبیت فی نوادر ابی زید ۱۵۱ والطبری ۳۲۲۳ والقرطبی (۷: ۱۶) وشواہد الکشاف ۸۳ ومعانی الکبیر ۱۱۱ ومجاز القرآن (۱: ۱۹۴) وقم ۲۲۱ والبحر (۴: ۱۴۴) تہذیب الالفاظ ۲۲۴ واللسان والتاج والمحکم (بسل بعو) وفیہ قال ابن الطبری انہ لعبد الرحمان بن الاحوص وانظر لترجمۃ الشاعر المعجم للمرزبانی ۲۷۰ والسمط ۲۷۶ والمعانی ۴۱۱ [2] قالہ زہیر بن ابی سلمٰی وصدرہٗ: بلاد بہا نادمتہم والفتہم ہکذا الروایۃ فی دیوانہ ۹۰ بشرح الاعلم وبہا انشد ابوعلی فی المعالیہ لیکن فی کلیہما فانہما بدل فانہم وہکذا الروایۃ فی نوادر ابی زید ۱۵۲ روایۃ ابی سعید حسب روایۃ المؤلف ای فانہم بضمیر الجمع لکن فیہ فان اوحشت بدل فان تقویا وہی موافقۃ لروایۃ ابی الطیب عن قطرب والاضداد لابی الطیب ۱۳) وصلۃ البیت: تربص فان تقوا المرارۃ منہم۔ ودارا تہا لاتقوا منہم فتحکل فان تقویا منہم فان محجرًا۔ وجزع الحسا منہم اذا قلما یخلو۔ بلاد ... فان اوحشت ... وہی الروایۃ صحیحۃ ای قساد اللہ والبیت فی الاصل ملفق فاختلطت روایتہ علی الروایۃ ومعنی البیت علی روایۃ المؤلف فانہم حرام ای حیث کانوا لایقربہم احد ولایغیر علیہم وعلی الثانیۃ فضمیر التثنیۃ یرجع الی الموضعین ای یعدو لہم حرام علی زیادتہما والبیت فی المختارات ۱۴ والنوادر ۳ والامالی ۲: ۸۰ وفی اللآلی مع السمط ۹۲۲-۹۲۳ ۃ

15107

(۵۲) فَاِنْ تَفَوَّيَا مِنْهُمْ فَاِنَّهُمْ بُسُلٌ

اگر تم انہیں چھوڑ کر چلے جاؤ تو وہ بہادر ہیں۔

یہاں تَفَوَّیَا، اَقوَی الْمَکَانُ سے ہے جس کے معنی جگہ خالی ہونے کے ہیں اور بسالۃ بمعنی شجاعت ہے اور بُسُلٌ بَاسِلٌ کی جمع ہے اور بہادر کو بَاسِلٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ترش رو رہتا ہے اور یا اس لئے کہ اس کے ہمسروں پر اس کی جان حرام ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ دشمنوں کو اپنے مال سے محروم کر دیتا ہے۔

اَبْسَلْتُ الْمَکَانَ کسی جگہ کی حفاظت کرنا اور اس شخص کو جو اسے چھیننا چاہتا ہے محروم کر دینا۔

اَلْبُسْلَۃُ دم جھاڑ کرنے والے کی اجرت یہ رقیہ پڑھنے والے کے قول اَبْسَلْتُ فُلَانًا سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی شیطان، سانپ اور زہریلے کیڑوں کی مدافعت پر دلیر کرنے کے ہیں یا کسی کو ان چیزوں پر حرام کر دینے کے ہیں بعض نے بَسَلْتُ الْحَنْظَلَ کا محاورہ بھی نقل کیا ہے جس کے معنی حنظل کو طیب بنانے کے ہیں اگر یہ حکایت صحیح ہو تو اس کے اصل معنی حنظل کی بسالت یعنی شدت یا اس کی تحریم یعنی کڑوا پن دور کرنا ہوں گے جو بمنزلہ حرمت کے ہے:

بَسَلْ۔ ہاں بس

(ب ش ر)

اَلْبَشَرَۃُ کے معنی انسان کی جلد کی اوپر کی سطح اور اَدَمَۃٌ کے معنی باطنی سطح کے ہیں۔ عام ادباء کا یہی قول ہے مگر ابو زید[1] نے اس کے برعکس کہا ہے چنانچہ ابو العباس وغیرہ نے ان کی تردید کی ہے۔

بَشَرَۃٌ کی جمع بَشَرٌ وَ اَبْشَارٌ آتی ہے اور اسی سے انسان کو بشر کہا جاتا ہے کہ اس کی جلد بالوں سے صاف ہوتی ہے اس کے برعکس دیگر حیوانات کی کھال پر اون، بال یا پشم ہوتی ہے۔

لفظ بَشَرٌ واحد اور جمع دونوں کے لئے برابر طور پر استعمال ہوتا ہے اس کا تثنیہ بَشَرَیْنِ ہے۔ جیسے فرمایا:۔ اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَیْنِ مِثْلِنَا (۲۳-۴۷) کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔

اور قرآن میں جہاں کہیں انسان کی جسمانی بناوٹ اور ظاہری جسم کا لحاظ کیا ہے تو ایسے موقع پر خاص کر اسے بَشَر کہا گیا ہے جیسے فرمایا:۔

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا (۲۵-۵۴) اور وہی تو ہے جس نے پانی سے آدمی پیدا کیا۔

اِنِّیْ خَالِقٌ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ۔ (۳۸-۷۱) کہ میں مٹی سے انسان بنانے والا ہوں۔

کفار انبیاء علیہم السلام کی کسر شان کے لئے ان کو بَشَرٌ کہہ کر پکارتے تھے جیسے:۔

اِنْ هٰذَا اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ (۷۴-۲۵) یہ (خدا) کا کلام نہیں بلکہ بشر کا کلام ہے۔

اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗ (۵۴-۲۴) بھلا ایک آدمی جو ہم ہی میں سے ہے ہم اس کی پیروی کریں۔

---

[1] راجع للبحث عن مادہ (ب س م) فی الاستدراک [2]، ابو زید سعید بن اوس بن ثابت الانصاری الخزرجی من تلامیذ ابی عمرو بن العلاء والمفضل الضبی وکان جدہ من الصحابۃ وجمع نحوًا من القرآن علی عہد الرسول ﷺ) شدید العنایۃ بجمع اللغات واللہجات توفی سنہ ۲۱۴ھ وقد قارب المائۃ انظر المعارف لابن قتیبۃ ۲۷۰۔ نزہۃ الاولیاء ۱۷۳-۱۷۹ تاریخ بغداد للخطیب ۹/۷۷-۸۰ الارشاد ۴/۲۳۸-۲۴۰ ابن خلکان رقم ۲۴۹ مرآۃ الجنان الیافعی ۲/۵۷ تہذیب لابن حجر ۴/۳ والبغیۃ للسیوطی ۲۵۴ وکتاب النوادر من اشہر تالیفہ [3] قالوا ان اضداد ابی الطیب ۱/۷۲-۷۷ وقال ابو مالک من قول ابی زید انظر اللسان (بشر)۔

مَا اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (۳۶-۱۵) کہ تم اور کچھ نہیں مگر ہماری طرح کے آدمی (ہو)

اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا (۲۳-۴۷) کیا ہم اپنے جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں۔

فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا (۶۴-۶) تو یہ کہتے کہ کیا آدمی ہمارے ہادی بنتے ہیں۔

چنانچہ قرآن نے:۔

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۱۸-۱۱۰) کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں۔

کہہ کر اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ بلا شبہ بشری تقاضوں میں سب انسان برابر ہیں مگر معارف جلیلہ اور اعمال جمیلہ کے لحاظ سے ان میں تفاوت ربتی پایا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ان معارف واعمال کے ساتھ مخصوص فرما کر سرفراز کر دیتا ہے۔ چنانچہ جملہ يُوْحٰٓى اِلَيَّ میں اس حقیقت پر تنبیہ کی ہے کہ میں تم سے صرف وحی الٰہی کے ساتھ ممتاز ہوں۔

وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ۔ (۱۹-۲۰) مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں۔ یہاں خاص کر مس بشر کی نفی کی ہے اور آیت کریمہ:۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹-۱۷) تو وہ ان کے سامنے ٹھیک آدمی کی شکل بن گیا میں تَمَثَّلَ کا فاعل فرشتہ ہے اور اس میں تنبیہ کی ہے کہ فرشتہ خوبصورت انسان کی شکل میں ان کے سامنے ظاہر ہوا تھا اور آیت کریمہ:۔

مَا هٰذَا بَشَرًا (۱۲-۳۱) یہ آدمی نہیں۔ میں بشریت کی نفی مقصود نہیں ہے بلکہ یوسف علیہ السلام کی عظمت اور بزرگی کو ظاہر کرنا ہے کہ یہ تو اس سے بلند و اشرف معلوم ہوتے ہیں کہ انسانی جوہر سے مرکب ہو۔

بَشَرْتُ الْاَدِيْمَ میں نے کھال کی ظاہری سطح کو چھیل دیا جیسا کہ اَنْفَتُّ وَ رَجَلْتُ کا محاورہ ہے اور اسی سے بَشَرَ الْجَرَادُ الْاَرْضَ ہے جس کے معنی ٹڈی کے زمین کی روئیدگی کو چٹ کر جانے کے ہیں۔

اَلْمُبَاشَرَةُ کے اصل معنی تو ایک کی جلد کو دوسرے کی جلد کے ساتھ ملانا کے ہیں مگر کنایۃً عورت سے مجامعت کرنا کے معنی میں آجاتا ہے جیسے فرمایا:۔

وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ (۲-۱۸۷) اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھے ہو تو ان سے مباشرت نہ کرو۔ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ (۲-۱۸۷) اب تم کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرو۔

فُلَانٌ مُؤْدَمٌ مُبْشَرٌ فلاں ظاہر و باطن کے لحاظ سے اچھا ہے۔ اصل میں یہ محاورہ اَبْشَرَهُ اللّٰهُ وَاٰدَمَهُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کی کھال کے ظاہر و باطن کو اچھا کرے پھر ہر اس کامل شخص کو جو ظاہری و باطنی خوبیوں کا مالک ہو۔ اسے مُؤْدَمٌ وَمُبْشَرٌ کہہ دیتے ہیں۔ بعض نے اس کے معنی کئے ہیں۔ اس کا اٰدَمَۃ (باطن) نرم اور بشرہ (ظاہر) سخت ہے۔

اَبْشَرْتُ الرَّجُلَ وَبَشَّرْتُهٗ وَبَشَرْتُهٗ خوشخبری پہنچانا۔ خوش کن خبر سنانا جس سے انسان کے چہرہ پر انبساط ظاہر ہو کیونکہ انسان کو جب کوئی اچھی خبر سنائی جاتی ہے تو اس کے جسم میں (وفور مسرت سے) خون اس طرح دورہ کرنے لگتا ہے جیسے درختوں میں پانی اس لئے اَلتَّبْشِيْر کے معنی ہیں اس قسم کی خبر سنانا جسے سن کر چہرہ شدت فرحت سے تمتما اٹھے۔ مگر ان کے معانی میں قدرے فرق پایا جاتا ہے۔ تبشیر میں کثرت کے معنی ملحوظ ہوتے ہیں۔ اور

بَشَرْتُہٗ (مجرد) عام ہے جو اچھی و بُری دونوں قسم کی خبر پر بولا جاتا ہے۔ اور اَبْشَرْتُہٗ اَحْمَدْتُہٗ کی طرح لازم و متعدی آتا ہے جیسے:۔ بَشَرْتُہٗ فَاَبْشَرَ (یعنی وہ خوش ہوا)

اور آیت کریمہ:۔ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُكَ (۳-۴۵) کہ خدا تم کو اپنی طرف سے بشارت دیتا ہے میں ایک قرأت یَبْشُرُكَ وَیُبْشِرُكَ ہے نیز فرمایا:۔ قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِیْمٍ۔ قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِیْ عَلٰٓی اَنْ مَّسَّنِیَ الْکِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ۔ قَالُوْا بَشَّرْنٰکَ بِالْحَقِّ (۱۵-۵۳،۵۴،۵۵) مہمانوں نے کہا ڈریے نہیں ہم آپ کو ایک دانشمند بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں وہ بولے کہ جب بڑھاپے نے آپکڑا تو تم خوشخبری دینے لگے اب کاہے کی خوشخبری دیتے ہو انہوں نے کہا کہ ہم آپ کو سچی خوشخبری دیتے ہیں۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ (۳۹-۱۷) تو میرے بندوں کو بشارت سنادو۔ فَبَشِّرْہُ بِمَغْفِرَۃٍ (۳۶-۱۱) سو اس کو مغفرت کی بشارت سنادو۔

اِسْتَبْشَرَ کے معنی خوش ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ۔ (۳-۱۷۰) اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے (اور شہید ہوکر) ان میں شامل نہیں ہو سکے ان کی نسبت خوشیاں منا رہے ہیں۔

یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ (۳-۱۷۱) اور خدا کے انعامات اور فضل سے خوش ہو رہے ہیں۔ وَجَآءَ اَھْلُ الْمَدِیْنَۃِ یَسْتَبْشِرُوْنَ (۱۵-۶۷) اور اہل شہر (لوط کے پاس) خوش خوش (دوڑے) آئے۔

اور خوش کن خبر کو بشارۃ اور بُشْرٰی کہا جاتا ہے چنانچہ فرمایا:۔ لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ (۱۰-۶۴) ان کے لئے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت میں بھی۔

لَا بُشْرٰی یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ (۲۵-۲۲) اس دن گنہگاروں کے لئے کوئی خوشی کی بات نہیں ہوگی۔ وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰھِیْمَ بِالْبُشْرٰی (۲۹-۳۱) اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم کے پاس خوشخبری لے کر آئے۔

یٰبُشْرٰی ھٰذَا غُلٰمٌ (۱۲-۱۹) زہے قسمت یہ تو (حسین) لڑکا ہے۔

وَمَا جَعَلَہُ اللّٰہُ اِلَّا بُشْرٰی لَکُمْ (۳-۱۲۶) اور اس مدد کو تو خدا نے تمہارے لئے (ذریعہ بشارت) بنایا۔

اَلْبَشِیْرُ خوشخبری دینے والا۔ قرآن میں ہے:۔ فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ اَلْقٰہُ عَلٰی وَجْھِہٖ فَارْتَدَّ بَصِیْرًا (۱۲-۹۶) جب خوشخبری دینے والا آپہنچا تو کرتہ یعقوبؑ کے منہ پر ڈال دیا اور وہ بینا ہو گئے۔

اور آیت کریمہ:۔ وَھُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ مُبَشِّرٰتٍ (۳۰-۴۶)[1] کہ ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ خوشخبری دیتی ہیں۔ میں مُبَشِّرَات سے مراد بارش کی خوشخبری دینے والی ہوائیں ہیں۔

اور حدیث[2]:۔ (۲۹) اِنْقَطَعَ الْوَحْیُ وَلَمْ یَبْقَ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ کہ وحی منقطع ہوگئی اور مبشرات باقی رہ گئیں)

---

[1] ھکذا الایۃ فی النسخ المطبوعۃ لکن الصحیح بُشْرًا ـ موضع مبشرات راجع سورۃ الاعراف (۷-۵۷) ولعل المصنف اراد آیۃ سورۃ الروم ان یُرسل الریاح مبشرات (۳۰-۴۶) فوقع الزلۃ من المصحح ۱۲ [2] الحدیث باختلاف الفاظہ فی الترمذی وابن ماجۃ والحاکم و البیھقی واحمد والبزار والکامل لابن عدی وقد اخبع الکلام علی طرق الحدیث ابن کثیر (۲ ر ۳ ۲ ۴ - ۴ ۲ ۴) وابن جریر ۱ ر ۱۳۴ ـ بروایۃ ابن مسعود ۱۲

میں مُبَشِّرَات سے مومن کی سچی خوابیں مراد ہیں جیسا کہ بعد میں وَهِيَ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ الَّتِيْ يَرَاهَا الْمُؤْمِنُ اَوْ تُرٰى لَهٗ سے اس کی تشریح فرمائی ہے اور آیات کریمہ:۔

• فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹-۳۴) ان کو عذاب الیم کی خوشخبری سنا دو۔ وَبَشِّرِ الْمُنَافِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ (۴-۱۳۸) (اے پیغمبر) منافقوں (یعنی دوزخی لوگوں) کو بشارت دو کہ ان کے لئے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹-۳) اور (اے پیغمبر) کافروں کو دکھ دینے والے عذاب کی خوشخبری سنا دو۔ میں تبشیر کے لفظ سے تنبیہ کی ہے کہ سب سے بہتر خوش کن خبر جو وہ سن سکتے ہیں وہ عذاب الیم ہے جس میں قیامت کے روز گرفتار ہوں گے۔ اور عذاب کے متعلق بَشِّرْ کا لفظ بطور تہکم استعمال ہوا ہے جیسا کہ ع (وافر)

(۵۳) تَحِيَّةُ بَيْنِهِمْ ضَرْبٌ وَجِيْعٌ[1]

(ان کا باہمی سلام دردناک ضرب لگانا ہے)۔

میں ضرب وجیع کے متعلق تحیۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے[2]۔

اور آیت کریمہ:۔ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ (۱۴-۳۰) (کہدو کہ چند روز) فائدے اٹھالو آخر کار تم کو دوزخ کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ میں لفظ تَمَتَّعُوْا بھی ایسے ہی مفہوم کے پیش نظر آیا ہے نیز فرمایا:۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ (۴۳-۱۷) حالانکہ جب ان میں سے کسی کو اس چیز کی خوشخبری دی جاتی ہے جو انہوں نے خدا کے لئے بیان کی ہے تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا اور وہ غم سے بھر جاتا ہے۔

اَبْشَرَ کے معنی ہیں اس نے بشارت کو پایا جیسے اَبْقَلَ وَاَمْحَلَ یعنی اس نے بقل اور محل یعنی خشک سالی کو پایا۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ (۴۱-۳۰) اور بہشت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے خوشی مناؤ۔ اَبْشَرَتِ الْاَرْضُ کے معنی ہیں زمین سبزہ زار ہوگئی اور خوش منظر آنے لگی۔ اسی سے حضرت ابن مسعود کا قول ہے[3]

(۳۰) مَنْ اَحَبَّ الْقُرْاٰنَ فَلْيَبْشَرْ کہ جسے قرآن سے محبت ہے اسے خوش ہونا چاہیئے۔ فَرَّاء کا قول ہے[4] کہ اگر شین مشدد (یعنی باب تفعیل سے) ہو تو بُشْرٰی سے ہوگا اور اگر خفیفہ یعنی مجرد سے ہو تو معنی مسرور ہوگا جیسے محاورہ ہے:۔ بَشَرْتُهٗ فَبَشَرَ مثل جَبَرْتُهٗ فَجَبَرَ سیبویہ نے کہا ہے[5] کہ بَشَرْتُهٗ کا مطاوع اَبْشَرَ بھی آجاتا ہے۔ مگر ابن قتیبہ کی رائے ہے کہ یہاں یعنی حدیث میں فَلْيَبْشُرْ کا لفظ بَشَرْتُ الْاَدِيْمَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کھال کو چھیلنا کے ہیں۔ لہذا فَلْيَبْشُرْ کے معنی ہوئے تو اسے چاہیئے کہ اپنے آپ کو کمزور اور دبلا کرے[6]۔ جیسا کہ مروی ہے۔

(۳۱) اِنَّ وَرَاءَنَا عَقَبَةً لَا يَقْطَعُهَا اِلَّا الضُّمَّرُ

---

[1] قاله عمرو بن معدی کرب صاحب ریحانة اخت دريد بن الصمة واوله: وخيل قد دلفت لها بخيل والبيت من شواهد الطبری (۱: ۲۹۱) راجع للبيت الخزانة والاصمعيات وشواهد الكشاف ۹۶ والبحر ۶: ۱۶۲/۲: ۱۱۸) والكتاب (۱: ۳۶۵، ۲۲) والعمدة (۲: ۲۹۲) [2] الآية من باب التهكم لتكون استشهادا بالبيت فيه خلط وقع كثير من الشراح الذين شرحوا كلام الزمخشري لان البيت فيه صنعة التنويع والتنويع قد يأتي للتهكم قد حققه ابن فارس في الصاحبي (انظر البقا) والطراز للخفاجي ۲۹-۲ [3] راجع الفائق (راده) واللسان (بشر) والنهاية [4] فراء ابو زكريا يحيى بن زياد الفراء نسبة الى بيع الفراء [5] ابو بشر عمرو بن عثمان بن قنبر الملقب بسيبويه معناه بالفارسية رائحة التفاح من اشهر تلاميذ الخليل ومصنف اول كتاب في النحو الذی تلقاه من شيخه ومناظرته مع الكسائی فی مسئلة الزنبور نالمان التوضيح للسخاوی (۴۳) مشهورة حصل الكسائی نوال ... توفی سنة ۱۸۰ه او سنة ۱۸۳ه راجع النزهة لابن الانباری ۷۱-۸۰ وطبقات الزبيدی رقم ۲۷ وتاريخ بغداد والخطيب ۱۲/ ۱۹۵-۱۹۹ والارشاد ۶/ ۸۰-۸۸ ووفيات لابن خلكان رقم ۴۷۴ ومرآة الجنان ۱/ ۴۴۵-۴۴۶ وابو الفدا ۲/ ۴۴ وبغية ۳۶۶-۳۶۷ وشذرات لابن العماد ۱/ ۲۵۲-۲۵۵ ونفح الطيب للمقری ۲/ ۷۷-۷۹ ومعجم طبقات الكتاب طبع بولاق ۱۳۱۶ه مع تقريرات بالهامش وزيادة من شرح السيرافي وفي مقدمتها شرح الشواهد للاعلم الشنتمري [6] اسند من ابن عباس ... بالصواب وتاويله ابن قتيبة ذكره الزمخشري بلفظ قيل بغير عزو

مِنَ الرِّجَالِ کہ ہمارے سامنے ایک گھاٹی ہے جسے دبلے آدمی ہی عبور کر سکیں گے اور شاعر کا قول[1]

(۴۰) فَاَعِنْهُمْ وَابْشُرْ بِمَا بَشِرُوا بِهٖ
وَاِذَا هُمْ نَزَلُوا بِضَنْكٍ فَانْزِلِ

(ان کی مدد کرو اور جو چیز انہیں خوش لگتی ہو اسی پر خوش رہو اور جب وہ کسی تنگ مقام پر نازل ہوں تو تم بھی وہاں اتر پڑو۔ پہلے معنی یعنی فراء کے قول پر محمول ہے۔

تَبَاشِيْرُ الْوَجْهِ وَبَشَرَةُ چہرے پر خوشی کے آثار۔ خوش روئی۔ تَبَاشِيْرُ الصُّبْحِ آغاز صبح تَبَاشِيْرُ النَّخْلِ کھجور کا پہلا پختہ پھل۔ بُشْرٰى وَبِشَارَةٌ وہ عطیہ (یا انعام) جو بشارت دینے والے کو دیا جائے۔

(ب ص ر)

اَلْبَصَرُ کے معنی آنکھ کے ہیں جیسے فرمایا:۔
كَلَمْحِ الْبَصَرِ (۵۰-۵۴) آنکھ کے جھپکنے کی طرح۔
وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ (۳۳-۱۰) اور جب آنکھیں پھر گئیں۔
نیز قوت بینائی کو بصر کہہ لیتے ہیں اور دل کی بینائی پر بَصَرٌ اور بصیرت دونوں لفظ بولے جاتے ہیں قرآن میں ہے۔
فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (۵۰-۲۲) اب ہم نے تجھ پر سے پردہ اٹھا دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (۵۳-۱۷) ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ آگے بڑھی۔
بَصَرٌ کی جمع اَبْصَارٌ اور بَصِيْرَةٌ کی جمع بَصَائِرُ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
فَمَا اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَا اَبْصَارُهُمْ (۴۶-۲۶) تو نہ ان کے کان ہی ان کے کچھ کام آسکے اور نہ آنکھیں۔
اور آنکھ سے دیکھنے کے لئے بَصِيْرَةٌ کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ بصر کے لئے اَبْصَرْتُ استعمال ہوتا ہے اور بَصِيْرَةٌ کے لئے اَبْصَرْتُ وبَصُرْتُ بِهٖ دونوں فعل استعمال ہوتے ہیں جب حاسۂ بصر کے ساتھ رؤیت قلبی شامل نہ ہو تو بَصُرْتُ کا لفظ بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ابصار کے متعلق فرمایا:۔
لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ (۱۹-۴۲) آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں۔ رَبَّنَا اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا (۳۲-۱۲) اے ہمارے پروردگار ہم نے دیکھ لیا اور سن لیا۔ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ (۱۰-۴۳) اگرچہ کچھ بھی دیکھتے (بھالتے) نہ ہوں۔ وَاَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ (۳۷-۱۷۹) اور دیکھتے رہو یہ بھی عنقریب (نتیجہ) دیکھ لیں گے۔ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ (۲۰-۹۶) میں نے ایسی چیز دیکھی جو اور لوگوں نے نہیں دیکھی۔
اور اسی معنی میں فرمایا:۔
اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (۱۲-۱۰۸) یعنی پوری تحقیق اور معرفت کے بعد تمہیں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں (اور یہی حال میرے پیروکار کا ہے) اور آیت کریمہ:۔
بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ (۷۵-۱۴)

---

[1] قالہ عبدالقیس بن خفاف البرجمی ونسبہ صاحب اللسان لابی عطیۃ بن زید الجاہلی والبیت من کلمۃ مفضلیۃ رقم ۱۶ فی ۱۸ بیتًا وفی روایتہ: والیسر ما یسیرا بہ امی اسرع الی اجابتہم والبیت فی اللسان (بشر) وتفسیر الطبری ۱۳ / ۱۵ / ۷ ومعانی القرآن للفراء والاصمعیات ۸۰ وشواہد المغنی (۵۹) ۲ / ۲۰۳ وتہذیب اصلاح المنطق مع آخر قبلہ۔

میں عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ کے معنی یہ ہیں کہ انسان پر خود اس کے اعضاء میں سے گواہ اور شاہد موجود ہیں جو قیامت کے دن اس کے حق میں یا اس کے خلاف گواہی دینگے جیسے فرمایا:۔

یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَیْدِیْهِمْ (۲۴-۲۴) جس دن ان کی زبانیں ہاتھ ...... ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

اور کبھی ضَرِیْر (اندھے) کو بھی بَصِیْر کہہ دیا جاتا ہے اور یہ اطلاق الاسم علی ضدہ کے قبیل سے ہے۔ لیکن اولیٰ یہ ہے کہ اسے تَسْمِیَۃُ الشَّیْءِ بِاِسْمِ ضِدِّہٖ کے باب سے نہ بنایا جائے۔ بلکہ کہا جائے کہ ضَرِیْرٌ کو بصیر کہنا اس کی بصیرۃ قلبی کے لحاظ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو مُبْصِرٌ وَبَاصِرٌ نہیں کہا جاتا پس اگر یہ باسم ضدہ کے قبیل سے ہوتا تو یہ اطلاق بھی جائز ہونا چاہیئے تھا اور آیت کریمہ:۔

لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ (۶-۱۰۴) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ میں اکثر علماء نے اَبْصَارٌ کے معنی آنکھ کئے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ ظاہری آنکھ کے علاوہ اوہام وافہام کی نفی کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا قول ہے اَلتَّوْحِیْدُ اَنْ لَّا تَتَوَهَّمَهٗ (کہ حقیقتاً) توحید تو یہ ہے جو انسان کے وا ہمہ میں بھی نہ آسکے اور فرمایا کہ جو کچھ انسان ادراک کرتا ہے وہ توحید نہیں ہے۔ اَلْبَاصِرَۃُ کے معنی ظاہری آنکھ کے ہیں۔ محاورہ ہے رَأَیْتُهٗ لَمْحًا بَاصِرًا میں نے اسے عیاں طور پر دیکھا۔ اَلْمُبْصِرَۃُ روشن اور واضح دلیل۔ قرآن میں ہے۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَۃً (۲۷-۱۳) جب ان کے پاس ہماری روشن نشانیاں پہنچیں

وَجَعَلْنَا اٰیَۃَ النَّهَارِ مُبْصِرَۃً (۱۷-۱۲) یعنی ہم نے دن کی نشانی کو نظروں کی روشنی دینے والی بنایا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاٰتَیْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَۃَ مُبْصِرَۃً (۱۷-۵۹) اور ہم نے ثمود کی اونٹنی (نبوت صالحؑ) کی کھلی نشانی دی۔ میں مُبْصِرَۃً اسی معنی پر محمول ہے بعض نے کہا ہے کہ یہاں مُبْصِرَۃً کے معنی ہیں کہ ایسی نشانی جس سے ان کی آنکھ کھل گئی۔ جیسا کہ رَجُلٌ مُخْبِثٌ وَّمُضْعِفٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کے اہل اور قریبی رشتہ دار خبیث اور ضعیف ہوں اور آیت کریمہ:۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ مِنْ بَعْدِ مَا اَهْلَکْنَا الْقُرُوْنَ الْاُوْلٰی بَصَآئِرَ لِلنَّاسِ (۲۸-۴۳) میں بَصَائِرُ بصیرۃ کی جمع ہے جس کے معنی عبرت کے ہیں یعنی ہم نے پہلی قوموں کی ہلاکت کو ان کے لئے تازیانہ عبرت بنادیا اور آیت کریمہ:۔

وَاَبْصِرْ فَسَوْفَ یُبْصِرُوْنَ (۳۷-۱۷۵) کے معنی یہ ہیں کہ انتظار کرو حتی کہ تم سب اپنی آنکھوں سے نتائج ملاحظہ کرلو اور آیت کریمہ:۔

وَکَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ (۲۹-۳۸) حالانکہ وہ دیکھنے والے تھے میں مُسْتَبْصِرِیْنَ کے معنی طالب بصیرت کے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بطور استعارہ اِسْتِبْصَارٌ (استفعال) بمعنی اِبْصَارٌ (افعال) ہو جیسا کہ اِسْتِجَابَۃٌ بمعنی اِجَابَۃٌ کے آجاتا ہے اور آیت کریمہ:۔

وَاَنْبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِیْجٍ تَبْصِرَةً۔ (۵۰-۷) اور اس میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں اگائیں۔ یہاں تَبْصِرَةً کے معنی ہیں دکھانے اور سمجھانے کو اور یہ (تفعلة کے وزن پر) باب تفعیل کا مصدر ہے جیسے قَدَّمْتُهٗ تَقْدِیْمًا وَتَقْدِمَةً وَذَكَّرْتُهٗ تَذْكِیْرًا وَتَذْكِرَةً اور آیت کریمہ: وَلَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا یُّبَصَّرُوْنَهُمْ۔ (۷۰-۱۰-۱۱) اور کوئی دوست کسی دوست کا پرساں نہ ہوگا (حالانکہ) ایک دوسرے کو سامنے دیکھ رہے ہوں گے میں یُبَصَّرُوْنَهُمْ۔ کے معنی یہ ہیں کہ انہیں ان کے احوال و آثار سے خوب طرح واقف کر دیا جائے گا۔

بَصَّرَ الْجَرْوُ پلے نے آنکھیں کھولیں۔

اَلْبَصْرَةُ ملائم چمکدار پتھر گویا وہ بینا ہے اور یا اسے بَصْرَةٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دور سے چمکتا ہوا نظر آجاتا ہے اور اسے بَصْر بھی کہا جاتا ہے۔

اَلْبَصِیْرَةُ (ایضًا) خون کا دھبہ جو دور سے چمکتا ہوا دکھائی دے، چمکدار ڈھال، کپڑے یا شگیر کے دو ٹکڑوں کے درمیان کا شگاف جس سے آر پار نظر آتا ہو۔ اسی سے بَصَّرْتُ الثَّوْبَ وَالْاَدِیْمَ کا محاورہ ہے جس کے معنی کپڑے یا چمڑے کا درمیانی شگاف سلائی کرنا کے ہیں۔

(ب ص ل)

اَلْبَصَلُ پیاز قرآن میں ہے:۔
وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا (۲-۶۱) اور مسور اور پیاز اور تشبیہ کے طور پر لوہے کے خود کو بھی بَصَلٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] ع (رمل)

(۵۵) "وَتَرِیْكَةً كَالْبَصَلِ"
اور پیاز جیسی خود

(ب ض ع)

اَلْبِضَاعَةُ۔ مال کا وافر حصہ جو تجارت کے لئے الگ کر لیا گیا ہو اَبْضَعَ وَاَبْتَضَعَ بِضَاعَةً سرمایہ یا پونجی جمع کرنا۔ الگ کرنا قرآن میں ہے۔
هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَیْنَا (۱۲-۶۵) یہ ہماری پونجی بھی ہمیں واپس کر دی گئی ہے۔
وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ (۱۲-۸۸) اور ہم تھوڑا سا سرمایہ لائے ہیں۔
اصل میں بِضَاعَةٌ بَضْعٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں گوشت کا بڑا ٹکڑا۔ بَضَعْتُهٗ وَبَضَّعْتُهٗ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے بنانا اِبْتَضَعَ وَتَبَضَّعَ اس کا مطاوع آتا ہے جیسے قَطَعْتُهٗ وَقَطَّعْتُهٗ فَانْقَطَعَ وَتَقَطَّعَ اَلْمِبْضَعُ (آلہ)

---

[1] وتکملتہ: تحتہ ذو اوراق ترقی بالعوالی ترد ماتیا ... والبیت من قصیدۃ للبید فی رثاء اخیہ مطلعہا ولئن تقوی ربنا خیر نفل وباذن اللہ ریثی وعجل (سفینۃ الفاقیہ) فی دیوانہ ۱۱-۱۷۰ والبیت فی وصف کتیبۃ سمکۃ من الحدید علیہا ورع فخلۃ فخمۃ ای کتیبۃ عظیمۃ ذوار ودفراج ای منتنۃ الریح من الحدید القرمانی معرب (گرد نامہ) ای عمل ونقی وراجع معجم اقتباس س ۱۰۲۲ وابن الاخیا ۴ ذو ۱۶-۲۱۴ ای درع غلیظۃ والترک بیض الحدید والزمعناہ انشد یقول الشاعر: ان ہذہ الکتیبۃ ملبوسۃ فی دروع طریقۃ خدمت اطرافہا بالعری بسطہ المذ منتشر وتشتمہ موج بالسمہا وعلی رؤسہم بیض الحدید مثل البصل وقبلہ: فتی ینفع مراح صادق یحلو ما ذات جرس نرجل البیت فی اللسان والصحاح (ترکۃ ترقوقریم: ذفر) واللسان وحاد (بصل) وتہذیب الالفاظ ۴۹ والتوشیح ۸۰ والاقتضاب ۲۱۵-۴۱۹ وایضا عنہین ۹۴ ۱۰۷۱/۱۹۶ خورہ من روی التشبیۃ والاصلاح ۳۳۷ والمقاییس ۱: ۲۵۳، ۳۴۵ رہ ۲۹۵) والمعانی ۴۸۷ و۱۲۳۹، ۱۰۲۹ واضداد لابن السکیت ۱۹۷ واضداد لابن الانباری ۹۸ ودلائل الطیب ۲۷۹ ونوادر ابی مسحل ۲۸۸ والمعلقات لابن الانباری (۵۱۳) وکان طریقہ یا مر بروایۃ ہذا والقصیدۃ ۱۲

نشتر جیسے مِقْطَعٌ۔ کنایہ کے طور بُضْعٌ کے معنی عورت کی شرمگاہ بھی آجاتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے۔ مَلَكْتَ بُضْعَهَا کیا تم نے اس عورت سے نکاح کرلیا ہے۔
بَاضَعَهَا بِضَاعًا۔ عورت سے مجامعت کرنا۔
فُلَانٌ حَسَنُ الْبَضْعِ وَالْبَضِيْعِ وَالْبَضْعَةِ وَالْبَضَاعَةِ۔ فلاں خوب موٹا تازہ ہے۔ اَلْبَضِيْعُ ٹاپو۔ وہ جزیرہ جو خشکی سے بہت دور ہو۔ فُلَانٌ بَضْعَةٌ مِّنِّيْ۔ فلاں میرے جسم کا ٹکڑا ہے یعنی نہایت قریبی رشتے دار ہے اَلْبَاضِعَةُ زخم جو گوشت کو کاٹ ڈالے۔
اَلْبِضْعُ (بکسر الباء) عدد جو دس سے الگ کئے گئے ہیں یہ لفظ تین سے لے کر نو تک بولا جاتا ہے بعض کہتے ہیں کہ پانچ سے اوپر اور دس سے کم پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے[1]:
بِضْعَ سِنِيْنَ (۱۲-۴۲) چند سال۔

(ب ط ر)

اَلْبَطَرُ۔ وہ دہشت جو خوشحالی کے غلط استعمال حق نعمت میں کوتاہی اور نعمت کے غلط طور پر صرف کرنے سے انسان کو لاحق ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:
بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ (۸-۴۷) جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھانے کے لئے۔
بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا (۲۸-۵۸) اپنی معیشت میں اترا رہے تھے۔ یہ اصل میں بَطِرَتْ مَعِيْشَتُهٗ ہے فعل کی نسبت اس سے قطع کرکے بطور تمیز اسے منصوب کردیا گیا ہے۔ اور تقریباً طَرَبٌ بمعنی بَطَرٌ آتا ہے مگر طَرَبٌ اس خفت کو کہتے ہیں جو فرط مسرت کی وجہ سے انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی طَرَبٌ بمعنی غم بھی آجاتا ہے۔
اَلْبَيْطَرَةُ حیوانات کا علاج کرنا، انکی چیر پھاڑ کرنا۔

(ب ط ش)

اَلْبَطْشُ کے معنی کوئی چیز زبردستی لے لینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:
وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (۲۶-۱۳۰) اور جب کسی کو پکڑتے تو ظالمانہ پکڑتے ہو۔
يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى[2] (۴۴-۱۶) جس دن ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے۔
وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا (۵۴-۳۶) اور لوط نے ان کو ہماری گرفت سے ڈرایا۔
اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (۸۵-۱۲) بیشک تمہارے پروردگار کی گرفت بڑی سخت ہے۔
يَدٌ بَاطِشَةٌ سخت گیر ہاتھ۔

(ب ط ل)

اَلْبَاطِلُ یہ حق کا بالمقابل ہے اور تحقیق کے بعد جس چیز میں ثبات اور پائیداری نظر نہ آئے اسے باطل کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:
ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ (۳۱-۳۰) یہ اس لئے کہ خدا کی ذات برحق ہے اور جن کو یہ لوگ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ لغو ہیں۔
اور باطل کا لفظ قول و فعل دونوں پر بولا جاتا ہے۔

---

[1] قال علماء اللغۃ والتفسیر البضع ما بین الثلاث الی التسع راجع اللسان (بضع) ورواہ الطبرانی وابن مردویہ عن دینار بن مکرم والترمذی عن ابن عباس مرفوعًا۔ [2] ارید بالبطشۃ الکبری یوم بدر او عذاب یوم القیمۃ (الطبری ۲۵/۱۱۶-۱۱۸)

پسانچہ فرمایا: لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (۳-۷۱) تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط کیوں کرتے ہو۔

بَطَلَ (ن) بُطُوْلًا وَبُطْلًا وَبُطْلَانًا کسی چیز کا یونہی ضائع چلا جانا۔

اَبْطَلَہٗ ضائع کردینا۔ قرآن میں ہے:۔

وَبَطَلَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (۷-۱۱۸) اور جو کچھ فرعونی کرتے تھے باطل ہوگیا۔

اور ہر وہ آدمی جو دنیا اور آخرت کی بھلائی کیلئے کوئی مفید کام نہ کرے اسے بَطَّال وذو بِطَالَۃٍ کہا جاتا ہے۔

بَطُلَ (ک) دَمُہٗ خون کا رائیگاں جانا۔

بَطَلٌ بہادر جو موت سے نہ ڈرے ایسے آدمی کے خون کو رائیگاں سمجھ کر یہ لفظ اس پر بولا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۵۷) فَقُلْتُ لَہَا لَا تَنْکِحِیْہِ فَاِنَّہٗ
لِاَوَّلِ بَطَلٍ اَنْ یُّلَاقِیْ مَجْمَعًا

(میں نے اس سے کہا کہ اس سے نکاح مت کیجئے کیونکہ وہ لڑائی میں بہادر کے ہاتھ سے مارا جائیگا)

تو اس معنی کے لحاظ سے بَطَلٌ بروزن فَعَلٌ بمعنی مَفْعُوْلٌ ہے یعنی وہ جس کا خون رائیگان جانے والا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فَعَلٌ بمعنی فاعل ہو کیونکہ وہ اپنے دشمن کے خون کو رائیگاں کر دیتا ہے۔

بَطَلَ (ن) اَلرَّجُلُ بُطُوْلَۃً بہادر ہونا

بَطَّال یعنی بیکار یہ بَطَالَۃٌ (بیکاری) کی طرف منسوب ہے۔ محاورہ ہے:۔

ذَهَبَ دَمُہٗ بُطْلًا اس کا خون رائیگاں گیا۔

اَلْاِبْطَالُ کے معنی کسی چیز کو خراب اور نابود کرنے کے ہیں خواہ وہ چیز حق ہی کیوں نہ ہو قرآن میں ہے:۔

لِیُحِقَّ الْحَقَّ وَیُبْطِلَ الْبَاطِلَ (۸-۸) تاکہ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کردے۔

کبھی اِبْطَالٌ کا لفظ بے حقیقت بات کہنے پر بھی بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:۔

وَلَئِنْ جِئْتَهُمْ بِآيَةٍ لَيَقُولَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُبْطِلُوْنَ (۳۰-۵۸) اور اگر تم ان کے سامنے کوئی نشانی پیش کرو تو کافر کہہ دیں گے کہ تم جھوٹے ہو۔

اور آیت کریمہ:۔

وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ (۴۰-۷۸) اور اہل باطل نقصان میں پڑ گئے۔

میں مُبْطِلُوْن سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کو نابود کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(ب ط ن)

اَلْبَطْنُ اصل میں بَطْنٌ کے معنی پیٹ کے ہیں اس کی جمع بُطُوْنٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّۃٌ فِیْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ (۵۳-۳۲) اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔

بَطَنْتُہٗ میں نے اس کے پیٹ پر مارا۔

---

[1] قالہ تابط شرا مادحًا نفسہ عندما خطب امرءۃ فنہاہا الناس بانہ سیقتل فتبقین ایمًا والبیت فی الحماسۃ ۱۹۱ بشرحہ المرزوقی ۱ بیتًا وقد احسن الشارح فی اعراب البیت وفی روایۃ: قالوا بدل فقلت ونصل بدل بطل والبیت فی البحر ۵: ۳۲۵

اَلْبَطْنُ ہر چیز میں یہ ظَھْرٌ کی ضد ہے اور ہر چیز کی نیچے کی جہت کو بطن اور اوپر کی جہت کو ظہر کہا جاتا ہے اسی سے بطور تشبیہ کہا جاتا ہے:۔

بَطْنُ الْاَمْرِ (کسی معاملہ کا اندرون) بَطْنُ الْوَادِیْ (وادی کا نشیبی حصہ) اور بطن بمعنی قبیلہ بھی آتا ہے اس اعتبار سے کہ تمام عرب کو بمنزلہ ایک شخص کے فرض کیا جائے ہیں اور ہر قبیلہ بمنزلہ بطن فخذ اور کاہل (کندھا) وغیرہ اعضاء کے تصور کیا جائے۔ اسی بناء پر شاعر نے کہا ہے[1] ع (مدید)

(۵۷) اَلنَّاسُ جِسْمٌ وَّاِمَامُ الْھُدٰی

رَاْسٌ وَاَنْتَ الْعَیْنُ فِی الرَّاْسِ

(کہ لوگ بمنزلہ جسم ہیں اور امام ہدی بمنزلہ سر ہے مگر تم سر میں آنکھ ہو۔

اور ہر پیچیدہ معاملہ کو بطن اور جلی اور ظاہر کو ظہر کہا جاتا ہے۔ اسی سے بُطْنَانُ الْقِدْرِ وَظُھْرَانُھَا[2] کا محاورہ ہے۔ یعنی دیگ کی اندرونی اور بیرونی جانب۔

ہر اس چیز کو جس کا حاسہ بصر سے ادراک ہو سکے اسے ظاہر اور جس کا حاسہ بصر سے ادراک نہ ہو سکے اسے باطن کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔

وَذَرُوْا ظَاھِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَہٗ (۶-۱۲۰)

اور ظاہری اور پوشیدہ (ہر طرح کا) گناہ ترک کر دو۔

مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ (۷-۳۲) ظاہری ہوں یا پوشیدہ۔

اَلْبَطِیْنُ کلاں شکم۔ اَلْبَطِنُ بسیار خور

اَلْمِبْطَانُ جس کا بسیار خوری سے پیٹ بڑھ گیا ہو۔

اَلْبِطْنَۃُ بسیار خوری مثل مشہور ہے[3]

اَلْبِطْنَۃُ تُذْھِبُ الْفِطْنَۃَ بسیار خوری ذہانت ختم کر دیتی ہے۔

بَطِنَ الرَّجُلُ بَطَنًا شکم پری اور بسیار خوری سے اترانا۔

بَطُنَ (ک) الرَّجُلُ بڑے پیٹ والا ہونا۔

مُبَطَّنٌ پچکے ہوئے پیٹ والا۔

بُطِنَ الرَّجُلُ مرض شکم میں مبتلا ہونا اس سے صیغہ صفت مفعولی مَبْطُوْنٌ (مریض شکم) آتا ہے۔

اَلْبِطَانَۃُ کے معنی کپڑے کا استر یا اس کے اندرونی حصہ کے ہیں اور اس کی ضد ظِھَارَۃٌ ہے[4] جس کے معنی کپڑے کا اوپر کا حصہ یا ابرہ کے ہیں اور بَطَّنْتُ ثَوْبِیْ بِاٰخَرَ کے معنی ہیں میں نے ایک کپڑے کو دوسرے کے نیچے لگایا۔

بَطَنَ فُلَانٌ بِفُلَانٍ کسی شخص کے اندرونی معاملات سے واقف ہونا اور بطور استعارہ اَلْبِطَانَۃُ کا لفظ ہر اس شخص پر بولا جاتا ہے جو دوسرے کا رازداں ہو چنانچہ قرآن میں ہے:۔

لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَۃً مِّنْ دُوْنِکُمْ (۳-۱۱۸)

---

[1] قاله علی بن جبلة العکوک یمدح حمید بن عبد الحمید الطوسی والبیت فی الکامل ۸۷ والعمدة (۱: ۲۷۴) وفیه صنعة التولید وشرح الدرة للخفاجی ۷۰ والورقة لابن الجراح ۱۰۶ وذیل الامالی ۹۷ آخر والطبقات لابن المعتز ۱۴۳ وفی خاص الخاص للثعالبی قیله بدجلة تسقی یطیح من تسقی من الناس ونسبه المؤلف (فی محاضراته) الی المنصور العمری خلافا لجمیع المراجع الاخری وراجع لترجمة العکوک الضریر الاغانی وطبقات لابن المعتز ۱۷۱-۱۸۵ والشعر والشعراء لابن قتیبه ومسالک الابصار وابن خلکان والفهرست وان شعره مائة وخمسین ورقة ۱۲

[2] وفی الامثال للثعالبی تأفن بدل تذهب یضرب لمن غیر استغناء عقله وافسده راجع رقم ۵۴۳

[3] بطانة والجمیع بطائن

[4] ومنه قوله تعالی: بطائنها من استبرق (۵۵-۵۴) قال الحسن اراد ظواهرها ولذا عده العلماء من الاضداد وراجع اضداد لابی الطیب ۶۷

کسی غیر مذہب کے آدمی) کو اپنا رازدان نہ بنانا اور بطانۃ الثوب سے استعارہ ہے کیونکہ اسی معنی میں لَبِسْتُ فُلَانًا وَ فُلَانٌ شِعَارِیْ وَ دِثَارِیْ بھی کہا جاتا ہے ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا:

(۳۳) مَا بَعَثَ اللّٰہُ مِنْ نَّبِیٍّ وَّلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِیْفَۃٍ اِلَّا کَانَتْ لَہٗ بِطَانَتَانِ بِطَانَۃٌ تَامُرُہٗ بِالْخَیْرِ وَ تَحُضُّہٗ علیہ وبِطَانَۃٌ تَامُرُہٗ بِالشَّرِّ وَ تَحُثُّہٗ عَلَیْہِ کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا اور نہ کسی کو خلیفہ بنایا ہے مگر ہمیشہ اس کے دو رازدان رہے ہیں ایک رازدار اسے خیر کا مشورہ اور اس کی ترغیب دیتا رہا ہے اور دوسرا اسے شر کا مشورہ اور اسی پر اکساتا رہا ہے۔

اَلْبِطَانُ تنگ جس سے جانور کا پالان کسا جاتا ہے والجمع اَبْطِنَۃٌ وَبُطُنٌ۔ اَلْاَبْطِنَانِ پیٹ کی دو رگیں۔ اَلْبُطَیْنُ۔ ستارہ جو برج حمل کے لئے بمنزلہ شکم کے ہے (وآں سہ ستارۂ خرد است کہ بر صورت دیگ پایہا واقع شدہ)

اَلتَّبَطُّنُ (تفعل) کسی معاملہ کی تہ تک پہنچنا۔

اَلظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ (۵۷۔۳) صفات الٰہی سے ہیں۔ اور اَلْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ کی طرح مزدوج یعنی ایک دوسرے کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ اَلظَّاھِرُ کے متعلق بعض کا قول ہے کہ یہ اس معرفت کی طرف اشارہ ہے جو ہمیں بالبداہت حاصل ہوتی ہے کیونکہ انسان جس چیز کی طرف بھی نظر اٹھا کر دیکھے اس کی فطرت کا یہی فیصلہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے جیسے فرمایا:۔ وَھُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰہٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰہٌ اور وہی (ایک) آسمانوں میں معبود ہے اور وہی زمین میں معبود ہے (۴۳۔۸۴) اسی لئے بعض حکماء کا قول ہے کہ معرفت الٰہی کے طالب کی مثال اس شخص کی ہے جو اطراف عالم میں ایسی چیز کی تلاش میں سرگرداں پھر رہا ہو۔ جو خود اس کے پاس موجود ہو۔ اور اَلْبَاطِنُ سے اس حقیقی معرفت کی طرف اشارہ ہے۔ جس کے متعلق حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا ہے۔

(۳۴) یَا مَنْ غَایَۃُ مَعْرِفَتِہٖ اَلْقُصُوْرُ عَنْ مَعْرِفَتِہٖ اے وہ ذات جس کی معرفت کی انتہا اس کی معرفت سے درماندگی ہے۔)

بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی آیات (دلائل قدرت) کے لحاظ سے ظاہر ہے اور باعتبار ذات کے باطن ہے۔ اور بعض نے کہا کہ الظاہر سے اس کا تمام اشیاء پر محیط ہونا مراد ہے اور اس اعتبار سے کہ وہ ہمارے احاطہ ادراک میں نہیں آسکتا اَلْبَاطِنُ ہے۔ چنانچہ فرمان الٰہی ہے۔

لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ وَھُوَ یُدْرِکُ الْاَبْصَارَ (۶۔۱۰۳) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کرسکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کرسکتا ہے۔

حضرت علیؓ سے ایک مقولہ مروی ہے جس سے ان دونوں لفظوں کی تفسیر پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں[۱] (۳۵) تَجَلّٰی لِعِبَادِہٖ مِنْ غَیْرِ اَنْ رَاَوْہُ وَ اَرَاھُمْ نَفْسَہٗ مِنْ غَیْرِ اَنْ تَجَلّٰی لَھُمْ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر تجلی فرمائی بدوں اس کے کہ بندے اس کو دیکھ سکیں اور اپنی ذات کو دکھایا بدوں اسکے کہ ان کے سامنے جلوہ افروز ہو۔ مگر اس قول کو سمجھنے

---

[۱] الحدیث فی دحم، خ، ن۔ عن ابی سعید ولمعناہ زعدات۔ عن ابی ہریرۃ، ف۔ عن ابی ایوب وابی ہریرۃ، راجع کنز العمال ۲ رقم ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۳، ۲۵۰ ولمعناہ رواہ ابن حبان رقم ۲۱۰۲ وفی الکنز تحضہ بدل تحثہ، ۲ ہذا وذکر العلامۃ الماوردی فی تفسیر الآیۃ تسعۃ اقوال فتذکر ۱۲

کے لیے فہم روشن اور عقل وافر کی ضرورت ہے۔
اور آیت کریمہ:۔ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (۳۱-۲۰) اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ "ظَاهِرَةً" سے نبوت اور بَاطِنَةً سے عقل مراد ہے اور بعض نے ظَاهِرَةً سے محسوس نعمتیں مراد لی ہیں اور بَاطِنَةً سے معقولات یعنی وہ نعمتیں مراد لی ہیں جن کا حس سے ادراک نہیں ہو سکتا۔
اور بعض نے کہا ہے کہ ظَاهِرَةً سے وہ غلبہ مراد ہے جو دشمنوں پر انسانوں کے ذریعہ حاصل ہوا اور باطنہ سے وہ غلبہ مراد ہے جو فرشتوں کے ذریعہ حاصل ہوا۔ لیکن آیت اپنے عموم کے اعتبار سے ان تمام اقوال کو شامل ہے۔

(ب ط ء)

اَلْبُطْءُ (ک) کے معنی چلنے میں دیر لگانے اور سستی کرنے کے ہیں اور یہ باب کرم و تفاعل و استفعال و انفعال سے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن بَطُؤَ (ک) کے معنی اس وقت بولتے ہیں جب دیر لگانے کا عادی ہو جائے اور تَبَاطَاءَ کے معنی ہیں بتکلف دیر کرنا اور استفعال میں طلب کے معنی پائے جاتے ہیں۔
اِبْطَاءٌ (افعال) سست رفتاری کے ساتھ متصف ہونا۔ نیز بَطَّأَهٗ وَاَبْطَأَهٗ (متعدی) مؤخر کرنا اور آیت کریمہ:۔ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ (۴-۷۲) اور تم میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو (عمداً) دیر لگاتے ہیں۔
میں لَيُبَطِّئَنَّ کے معنی دوسروں سے دیر لگوانا کے ہیں اور بعض نے اس کے معنی بہت زیادہ سستی کرنا بھی لکھے ہیں حاصل یہ ہے کہ بعض تم میں سے خود بھی دیر لگاتے ہیں اور دوسروں سے بھی دیر لگواتے ہیں۔

(ب ظ ر)

ایک قرأت میں ہے:۔
وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُظُوْرِ اُمَّهٰتِكُمْ (۱۶-۷۸)
اور خدا ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کی شرمگاہوں سے باہر نکالا۔
بُظُوْرٌ (بَظَارَةٌ) کی جمع ہے جس کے معنی بکری کے تھنوں کے لٹکے ہوئے گوشت کے ہیں اور عورت کی شرمگاہ کے اوپر ابھرے ہوئے گوشت کو بَظَارَةٌ کہا جاتا ہے۔ پھر مجازاً بَضْعٌ کی طرح شرمگاہ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

(ب ع ث)

اَلْبَعْثُ (ف) اصل میں بعث کے معنی کسی چیز کو ابھارنے اور کسی طرف بھیجنا کے ہیں اور اِنْبَعَثَ دراصل مطاوع ہے بَعَثَ کا مگر متعلقات کے لحاظ سے اس کے معنی مختلف ہوتے رہتے ہیں مثلاً بَعَثْتُ الْبَعِيْرَ کے معنی اونٹ کو اٹھانے اور آزاد چھوڑ دینا کے ہیں اور مردوں کے متعلق استعمال ہو تو قبروں سے زندہ کرکے محشر کی طرف چلانا مراد ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ (۶-۳۶) اور مردوں کو تو خدا (قیامت ہی کو) اٹھائے گا۔
يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا (۵۸-۶) جس دن خدا ان سب کو جلا اٹھائے گا۔
زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى

وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ۔ (۶۴-۷) جو لوگ کافر ہوئے ان کا اعتقاد ہے کہ وہ (دوبارہ) ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔ کہدو کہ ہاں ہاں میرے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۳۱-۲۸) تمہارا پیدا کرنا اور جلا اٹھانا ایک شخص (کے پیدا کرنے اور جلا اٹھانے) کی طرح ہے۔

پس بَعْثٌ دو قسم پر ہے بعث بشری یعنی جس کا فاعل انسان ہوتا ہے جیسے بَعَثْتُ الْبَعِیْرَ (یعنی اونٹ کو اٹھا کر چلانا) اور بَعَثْتُ الْاِنْسَانَ فِیْ حَاجَةٍ (کسی کو کسی کام کے لئے بھیجنا)

دوم بعث الٰہی یعنی جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو پھر اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اول یہ کہ اعیان، اجناس اور انواع کو عدم سے وجود میں لانا۔ یہ قسم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور اس پر کبھی کسی دوسرے کو قدرت نہیں بخشی۔ دوم مردوں کو زندہ کرنا۔ اس صفت کے ساتھ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو بھی سرفراز فرما دیتا ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ہم مثل دوسرے انبیاء کے متعلق مذکور ہے اور آیت کریمہ:۔

فَهٰذَا يَوْمُ الْبَعْثِ (۳۰-۵۶) اور یہ قیامت ہی کا دن ہے۔ بھی اسی قبیل سے ہے یعنی یہ حشر کا دن ہے اور آیت کریمہ:۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ (۵-۳۱) اب خدا نے ایک کوا بھیجا جو زمین کو کریدنے لگا۔ میں بَعَثَ بمعنی قَيَّضَ ہے۔ یعنی مقرر کر دیا اور رسولوں کے متعلق کہا جائے۔ تو اس کے معنی مبعوث کرنے اور بھیجنے کے ہوتے ہیں چنانچہ فرمایا:۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا (۱۶-۳۶) اور ہم نے ہر جماعت میں پیغمبر بھیجا۔ جیسا کہ دوسری آیت میں اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا (۲۳-۴۴) فرمایا ہے اور آیت:۔

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا۔ (۱۸-۱۲) پھر ان کو جگا اٹھایا تاکہ معلوم کریں کہ جتنی مدت وہ (غار میں) رہے دونوں جماعتوں میں سے اس کی مقدار کس کو خوب یاد ہے۔ میں بَعَثْنَا کے معنی صرف (نیند سے) اٹھانے کے ہیں اور اس میں بھیجنے کا مفہوم شامل نہیں ہے۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا (۱۶-۸۹) اور اس دن کو یاد کرو جس دن ہم ہر امت میں سے خود ان پر گواہ کھڑا کریں گے۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ الآية (۶-۶۵) کہدو کہ (اس پر بھی) قدرت رکھتا ہے کہ تم پر (اوپر کی طرف سے) .... عذاب بھیجے۔ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ (۲-۲۵۹) تو خدا نے اس کی روح قبض کر لی (اور) سو برس تک (اس کو مردہ رکھا) پھر اس کو جلا اٹھایا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَهُوَ الَّذِیْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ (۶-۶۰) اور وہی تو ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس سے خبر رکھتا ہے پھر تمہیں دن کو اٹھا دیتا ہے۔ میں نیند کے متعلق توفی اور دن کو اٹھنے کے متعلق بعث کا لفظ استعمال کیا ہے کیونکہ نیند بھی ایک طرح کی موت ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ وَلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ (۹-۴۶)

لیکن خدا نے ان کا اٹھنا (اور نکلنا) پسند نہ کیا۔ میں انبعاث کے معنی جانے کے ہیں۔

(ب ع ث ر)

آیت کریمہ:۔ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (۸۲-۴) میں بُعْثِرَتْ کے معنی قبروں کی مٹی کو الٹ پلٹ کرنے اور مُردوں کو اٹھانے کے ہیں۔ جن علماء کے نزدیک رباعی اور خماسی دو ثلاثی مادوں سے مل کر بنتے ہیں ان کے خیال میں "بُعْثِرَ" بُعِثَ اور اُثِیْرَ سے مل کر بنا ہے جیسا کہ تَہَلَّلَ وَبَسْمَلَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اور بِسْمِ اللّٰہ سے بنے ہیں۔ اور اس میں کچھ بُعد نہیں ہے کیونکہ اَلْبَعْثَرَۃ میں ان دونوں فعلوں کے معنی موجود ہیں۔

(ب ع د)

اَلْبُعْدُ کے معنی دوری کے ہیں یہ قُرْب کی ضد ہے اور ان کی کوئی حد مقرر نہیں ہے بلکہ ایک ہی جگہ کے اعتبار سے ایک کو قریب اور دوسری کو بعید کہا جاتا ہے۔

محسوسات میں تو ان کا استعمال بکثرت ہوتا رہتا ہے مگر کبھی کبھی معانی کے لئے بھی آجاتے ہیں جیسے فرمایا:۔ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِیْدًا (۴-۳۶) وہ راہ ہدایت سے بھٹک کر دور جا پڑے۔

اُولٰٓئِکَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّکَانٍ بَعِیْدٍ (۴۱-۴۴) (ان کو گویا) دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔

بَعُدَ (ک) دور ہونا جیسے فرمایا:۔ وَمَا ھِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ (۱۱-۸۳) اور وہ (بستی ان) ظالموں سے کچھ دور نہیں ہے۔

لیکن بَعِدَ (س) کے معنی مرنا کے ہیں۔ اور عموماً اَلْبَعَدُ ہلاک ہونا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔ کَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ (۱۱-۹۵) جیسے ثمود تباہ ہو گئے۔ اور اَلْبُعْدُ وَالْبَعَدُ کبھی قرب کے مقابلہ میں استعمال ہوتے ہیں۔

جیسا کہ نابغہ نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۵۸) "فِی الادنیٰ وَ فِی الْبَعَدِ"

یعنی ہر قریب و بعید پر اس کے احسانات موجود ہیں اور کبھی یہ دونوں (اَلْبُعْدُ وَ الْبَعَدُ) ہلاکت کے معنی میں بھی آجاتے ہیں۔ چنانچہ انہی معنی میں فرمایا:۔ فَبُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (۲۳-۴۱) پس ظالم لوگوں پر لعنت ہے۔

فَبُعْدًا لِّقَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ (۲۳-۴۴) پس جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان پر لعنت۔

اور آیت کریمہ:۔ بَلِ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ فِی الْعَذَابِ وَالضَّلٰلِ الْبَعِیْدِ۔ (۳۴-۸) بات یہ ہے جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ آفت اور پرلے درجے کی گمراہی میں (مبتلا) ہیں۔ میں اَلضَّلَال البعید سے ویسی گمراہی مراد ہے جس کے بعد ہدایت کی طرف لوٹنا نہایت مشکل ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص شاہراہ سے بہت دور چلا جائے جس کے بعد دوبارہ اس کے شاہراہ کی طرف لوٹ کر آنے کی امید نہ ہو اور آیت کریمہ:۔

---

[1] قالہ النابغۃ یمدح النعمان وتکملتہ: فتلک تبلغنی النعمان ان لہ فضلاً علی الناس ..... والبیت فی العقد الثمین ۷ وشرح العشر للتبریزی ۲۹۵ والخزانۃ ۱: ۲۲ طبعۃ بولاق) والسیوطی ۲۰۲ ودیوانہ ۲۵ واللسان والتاج (بعد) فی روایۃ الصحاح والحکم (بعد) فی الاذنین والبُعد والیضاً شذ لعبید بن الابرص وتکملتہ: اولاتوت بجمیع لاکفار لہ۔ قوم ھم القوم راجع دیوان ابن الابرص مع شرح جالس طبعۃ لندن ۱۹۱۳ء

وَ مَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ (۱۱-۸۹) اور لوط کی قوم (تو) تم سے کچھ دور نہیں ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ تم بھی گمراہی میں ان جیسے ہو، اس لئے کچھ بعید نہیں کہ ان کی طرح تم پر بھی عذاب آجائے بَعْدُ یہ قَبْلُ کی ضد ہے لہذا قبل کی بحث میں اس کی جمیع انواع بیان کی جائیں گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(ب ع ر)

اَلْبَعِيْرُ۔ اونٹ (جنس) لفظ انسان کی طرح مذکر و مؤنث دونوں پر بولا جاتا ہے اس کی جمع اَبْعِرَةٌ وَ اَبَاعِرُ و بُعْرَان آتی ہے۔ قرآن میں ہے:
وَلِمَنْ جَاءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِيْرٍ (۱۲-۷۲) اور جو شخص اس کو لے آئے اس کے لئے بار شتر (انعام)
اَلْبَعْرُ۔ اونٹ کی مینگنی۔
اَلْمَبْعَرُ (جائے بعر) اَلْمِبْعَارُ: بہت زیادہ مینگنی کرنے والا اونٹ۔

(ب ع ض)

بَعْضُ الشَّيْءِ ہر چیز کے کچھ حصہ کو کہتے ہیں اور یہ کل کے اعتبار سے بولا جاتا ہے اسلئے کل کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے جیسے: بَعْضُهٗ وَ كُلُّهٗ اس کی جمع اَبْعَاضٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲-۳۶) تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔
وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا (۶-۱۲۹) اور اسی طرح ہم ظالموں کو ان کے اعمال کے سبب جو وہ کرتے تھے ایک دوسرے پر مسلط کر دیتے ہیں۔
وَيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (۲۹-۲۵) اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے
اور بَعَّضْتُ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو حصوں میں تقسیم کر دینا ہیں جیسے جَزَّءْتُهٗ اور آیت کریمہ:۔
وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ (۴۳-۶۳) نیز اس لئے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کرتے ہو تم کو سمجھا دوں۔
میں ابوعبیدہ نے کہا ہے[1] کہ یہاں بعض بمعنی کل ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2] (کامل)

---

[1] راجع مجاز القرآن ۱/۴۰ فانہ قال: والبعض یکون شیئاً من الشیء ویکون کل الشیء قال لبید... لکن تحت آیة ولاحل لکم بعض الذی حرم علیکم (۳-۵۰) ثم قال تحت الآیة (۴۳-۶۳) البحرتة: البعض ههنا الکل قال لبید... لان الموت لا یعتلق بعض النفوس دون بعض اھ وابوعبیدة معمر بن المثنی ۱۱۰-وتاریخ وفاتہ ۲۰۹/۲۱۰ مختلف فیہ الاغلب ۲۱۰-۲۱۳ کان من معاصری تلامذة الخلیل ولم یتأثر بہ تأثراً مباشراً، کان ابواہ من یہود فارس وکان مولی لبنی تیم قریش واخذ فی شبیبتہ عن ابی عمرو بن العلاء ویونس بن حبیب، اتصل بالخوارج (مقالات الاسلامیین للاشعری ۱/۲۰۱ والبیان للجاحظ ۱/۳۲۲) کان ضعیفاً فی علم النحو (مقدمة تہذیب الازہری) صنف کتاباً فی مثالب العرب نقماً منہم لاعیبہم علیہ نسبتہ العجم فکرہہ الناس حتی لم یحضر جنازتہ احد من البصریین (راجع ضحی الاسلام لاحمد امین ۲/۳۰۴ مع المراجع دیکن او مجازہ فی تفسیر القرآن مشہور وعلیہ تعلیقات للاصمعی (الارشاد لیاقوت ۷/۱۶۷-۱۶۸) [2] قال لبید بن ربیعہ وصدرہ "تراک امکنة اذا لم ارضہا... وفی روایة "او یعتلق" بدل او یرتبط والبیت فی معلقتہ فی شرح العشر ۱۵۵ والقرطبی (۴: ۹۶) وشواہد الکشاف ۲۹۰ والمحکم واللسان (بعض) ومجالس ثعلب ۵۰، ۳۶۸ والبحر (۲: ۴۶۸/ ۱۷، ۴۶۱) وذیل الجامع الکبیر ۲۷ والزوزنی ۹ والشطر ایضاً فی الصاحبی ۲۵۱

(۵۹) اَوْ يَرْتَبِطْ بَعْضَ النُّفُوْسِ حِمَامُهَا
(یا نفوس کو ان کی موت پالے)

لیکن یہ ابو عبیدہ کی کوتاہ بینی ہے[1]۔ کیونکہ مسائل شریعت کی چار قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جس کا بیان کرنا خلاف مصلحت ہوتا ہے ایسی چیز کا بیان کرنا صاحب شریعت کے لئے جائز نہیں ہوتا۔ جیسے قیامت یا موت کا وقت کہ اس کے بتا دینے میں مفسدہ لازم آتا ہے۔

(۲) اور بعض چیزیں محض عقلی ہوتی ہیں جن کا ادراک نبی کے علاوہ دوسرے لوگ بھی کر سکتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ کی معرفت جو کہ آسمان و زمین کی خلق میں پائی جاتی ہے تو ایسی چیزوں کا بیان کرنا صاحب شریعت پر فرض نہیں ہوتا اسی لئے قرآن نے ان چیزوں کی معرفت عقول کے سپرد کی ہے جیسا کہ آیت:۔ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۱۰-۱۰۱) (ان کفار سے) کہو کہ دیکھو تو آسمانوں اور زمین میں کیا کیا کچھ ہے۔ اور آیت اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا (۳۰-۸) کیا انہوں نے غور نہیں کیا۔

(۳) بعض چیزوں کا بیان کرنا صاحب شریعت پر واجب ہوتا ہے۔

(۴) بعض احکام فروعی ہوتے ہیں جو اصول شریعت سے مستنبط ہو سکتے ہیں پس جب کسی ایسے حکم میں اختلاف ہو جائے جس کا بیان کرنا نبی پر واجب نہیں۔ تو صاحب شریعت کو اختیار ہے کہ حسب موقع اسے بیان فرما دے یا سکوت اختیار کرے

زیر بحث آیت میں اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو ظاہر ہے کہ بعض سے کل مختلف فیہا اشیاء مراد نہیں ہیں۔

پھر جس شعر سے استدلال کیا گیا ہے اس میں بھی شاعر نے اپنی ذات مراد لی ہے[2] یعنی مگر یہ کہ مجھے موت پالے۔ لیکن شاعر نے تصریح کی بجائے تعریض سے کام لیا ہے۔ کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ موت سے دور بھاگتا ہے۔

خلیل نے کہا کہ رَأَيْتُ غِرْبَانًا تَتَبَعَّضُ کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک دوسرے کو پکڑ رہے ہیں

اَلْبَعُوْضُ (مچھر) یہ بھی لفظ بعض سے بنا ہے۔ مچھر چونکہ دوسرے حیوانات کی بہ نسبت صغیر الجسم ہوتا ہے اس لئے اسے بَعُوْضٌ کہا جاتا ہے۔

(ب ع ل)

اَلْبَعْلُ۔ کے معنی شوہر کے ہیں قرآن میں ہے:۔ وَهٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہیں (۱۱-۷۲)

اس کی جمع بُعُوْلَةٌ آتی ہے جیسے فَحْلٌ وَ فُحُوْلَةٌ فرمایا:۔
وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ (۲-۲۲۸)
اور ان کے خاوند... ان کو زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔

اور اس تصور کے پیش نظر کہ مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے۔ اسے عورت کا منتظم مقرر کیا گیا ہے۔ جیسا کہ آیت:۔

---

[1] وعلیہ ایضاً الطبری (۲۵/۵۰) والمبرد والنحاس فی معانیہ (۲۴۲ آ) وابن سیدہ فی المحکم (بعض) والطبری اکثر ما یرد علی ابی عبیدہ تفسیرہ ولنا مقالۃ (ابوعبیدۃ والطبری فی تفسیر الغریب والامام البخاری) وقد اشبعنا الکلام فی الرد علی من یلزم البخاری انہ قلد اباعبیدۃ فی تفسیر الغریب [2] راجع المبرد والقرطبی (۴-۹۲) تابع اباعبیدۃ وجوزان یکون بعض بمعنی کل

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (۴-۳۴) میں مذکور ہے بنابریں ہر وہ چیز جو دوسری اشیا پر فوقیت رکھتی ہو اسے بَعْلٌ کہنے لگے ہیں چنانچہ اہل عرب اپنے بت کو جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا چاہتے تھے بَعْلٌ کہہ کر پکارتے تھے۔ کیونکہ وہ اسے بلند اور برتر سمجھتے تھے جیسے فرمایا:۔ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ کیا تم بعل کو پکارتے (اور پوجتے) ہو اور سب سے بہتر کرنے والے کو چھوڑ دیتے ہو (۳۷-۱۲۵) محاورہ ہے:۔ اَتَانَا بَعْلُ هٰذِهِ الدَّابَّةِ اس دابہ کا مالک ہمارے پاس آیا۔

اَلْبَعْلُ (ایضاً) (۱) بلند زمین (۲) فحل نحل یعنی شہد کی مکھیوں کا سردار[1] (۳) ہر وہ بڑا درخت جو اپنی جڑوں کے ذریعہ از خود زمین سے پانی جذب کر لیتا ہو اور اسے آبیاری کی ضرورت نہ ہو۔ حدیث میں ہے[2] (۳۶) فِيْمَا سُقِيَ بَعْلًا الْعُشْرُ یعنی بعل میں عشر (واجب) ہے اور جب عالی کی اپنے مستولی علیہ ماتحت پر گرفت بھاری اور گراں ہو تو کہا جاتا ہے: اَصْبَحَ فُلَانٌ بَعْلًا عَلٰی اَهْلِهٖ یعنی فلاں اپنے علو کی وجہ اپنے اہل پر ثقیل ہے[3]۔

اور لفظ اَلْبَعْلُ سے مُبَاعَلَةٌ وَبِعَالٌ (مصدر مفاعلہ) بنایا گیا ہے جس کے معنی (کنایۃً) مجامعت کے ہوتے ہیں[4] محاورہ ہے بَعَلَ الرَّجُلُ (ن) بُعُوْلَةً وَاسْتَبْعَلَ فَهُوَ بَعْلٌ وَّمُسْتَبْعِلٌ شوہر ہونا۔

اِسْتَبْعَلَ النَّخْلُ کھجور کا تناور ہو جانا۔ اور بَعْلٌ کھجور سے ایک جگہ پر قیام اور ثبات کے معنیٰ کا تصور کر کے ہر اس آدمی کو جو اپنے معاملہ میں حیرت کی بنا پر ایک جگہ پر کھڑا رہے اس کے متعلق بَعِلَ فُلَانٌ بِاَمْرِهٖ کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ اپنے معاملہ میں حیران ہے، جیسا کہ اس شخص کے متعلق جو اپنی جگہ پر جم کر کھڑا رہے مَا هُوَ اِلَّا شَجَرٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

(ب غ ت)

اَلْبَغْتُ (ف) کے معنی کسی چیز کا یکبارگی ایسی جگہ سے ظاہر ہو جانا کے ہیں۔ جہاں سے اس کے ظہور کا گمان تک بھی نہ ہو۔ قرآن میں ہے:۔ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً (۷-۱۸۷) اور ناگہاں تم پر آ جائے گی۔ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً (۲۱-۱۰۷) یا ان پر ناگہاں قیامت آ جائے۔

بَغَتَ كَذَا فَهُوَ بَاغِتٌ کسی چیز کا ناگہاں آپہنچنا شاعر نے کہا ہے[5] ؂

(۷۰) اِذَا بَغَتَتْ اَشْيَاءُ قَدْ كَانَ مِثْلُهَا
قَدِيْمًا فَلَا تَعْتَدَّهَا بَغَتَاتٍ

(ب غ ض)

اَلْبُغْضُ کے معنی کسی مکروہ چیز سے دل کا متنفر اور بیزار ہونا کے ہیں۔ یہ حُبّ کی ضد ہے۔

---

[1] وفی اللسان فحل النحل وکذا فی اضداد ابی الطیب ۷۸-۷۳ [2] نصب بعلًا علی الحال کذا فی الفائق ۱/۵۵ والحدیث رواہ ابن جریر۔ عن معاذ ولفظہ (اوسقی بعلًا العشر وکنز العمال ۷:۸۳۶۸) وفی روایۃ النسائی وابی داؤد وابن ماجۃ من حدیث ابن عمرؓ اوکان بعلًا العشر و فی بعض الروایات عثریا بدل بعلًا راجع غریب ابی عبید ۱/۲۲ [3] کذا فی الفائق ۱/۵۵ [4] ومنہ الحدیث ایام التشریق ایام اکل وشرب وبعال ای ملاعبۃ الرجل اہلہ سیاتی تخریجہ (عود) [5] قالہ ابن الرومی یحث علی تصور المصائب والاستعداد لہا والبیت فی محاضرات المؤلف فی خمسۃ ابیات وقبلہ: ولا عونصف فی البلوی وقد سات عظات من الایام بعد عظات راجع دیوان ابن الرومی وفی المطبوع (وفی جمیع الطبعات) بعث بالعین المہملۃ والثاء المثلثۃ مصحف ؛

جس کے معنی کسی پسندیدہ چیز کی طرف دل کا منجذب ہونا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے
بَغِضَ (س)، الشَّیْءُ بُغْضًا وَ بَغَضْتُهٗ (ن)، بُغْضَاءً
قرآن میں ہے :۔
وَاَلْقَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ (۵۔۶۴)
اور ہم نے ان کے باہم عداوت اور بغض قیامت تک کے لئے ڈال دیا ہے۔
اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ (۵۔۹۱) شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوا دے۔ اور حدیث میں ہے[1]
(۳۷) اِنَّ اللّٰهَ یَبْغَضُ الْفَاحِشَ وَالْمُتَفَحِّشَ بیشک اللہ تعالیٰ بدکلام گالی دینے والے سے نفرت کرتا ہے۔ یہاں بغض کا لفظ بول کر اس امر پر تنبیہ کی ہے۔ کہ باری تعالیٰ اس سے اپنا فیضان اور توفیق احسان روک لیتا ہے[1]۔

(ب غ ل)

اَلْبَغْلُ (خچر) وہ جانور جو گدھے اور گھوڑی کے باہم ملاپ سے پیدا ہوتا ہے (والجمع بغالة)
قرآن میں ہے :۔
وَالْخَیْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِیْرَ (۱۶۔۸) اور اسی نے گھوڑے اور خچر اور گدھے۔
تَبَغَّلَ الْبَعِیْرُ اونٹ کا خچر کی طرح تیز چلنا۔ کبھی خچر کی شرارت اور خباثت کے پیش نظر کمینے شخص کو بھی بَغْلٌ کہہ دیا جاتا ہے۔

(ب غ ی)

اَلْبَغْیُ کے معنی کسی چیز کی طلب میں درمیانہ روی کی حد سے تجاوز کی خواہش کرنا کے ہیں۔ خواہ تجاوز کر سکے یا نہ۔ اور بَغْیٌ کا استعمال کمیت اور کیفیت یعنی قدر و وصف دونوں کے متعلق ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔
بَغَیْتُ الشَّیْءَ وَابْتَغَیْتُهٗ کسی چیز کے حاصل کرنے میں جائز حد سے تجاوز کرنا۔ قرآن میں ہے :۔
لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ (۹۔۴۸) یہ پہلے بھی طالب فساد رہے ہیں۔
یَبْغُوْنَکُمُ الْفِتْنَةَ (۹۔۴۷) تم میں فساد ڈلوانے کی غرض سے۔
بَغْیٌ دو قسم پر ہے۔ محمود[1] یعنی حد عدل و انصاف سے تجاوز کر کے مرتبہ احسان حاصل کرنا اور فرض سے تجاوز کر کے تطوع بجا لانا۔
۲۔ مذموم۔ یعنی حق سے تجاوز کر کے باطل یا شبہات میں واقع ہونا جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا[2] (۳۸)
اَلْحَقُّ بَیِّنٌ وَالْبَاطِلُ بَیِّنٌ وَبَیْنَ ذٰلِكَ اُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ وَمَنْ رَتَعَ حَوْلَ الْحِمٰی اَوْشَكَ اَنْ یَّقَعَ فِیْهِ حق بھی واضح ہے اور باطل بھی واضح ہے لیکن ان دونوں کے درمیان کچھ امور مشتبہ ہیں اور جو جانور چراگاہ کے ارد گرد کھائیگا کچھ بعید نہیں کہ چراگاہ میں چرنے لگے اور چونکہ بغی محمود بھی ہوتی ہے اور مذموم بھی اس لئے آیت کریمہ :۔
اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (۴۲۔۴۲)

---

[1] الحدیث فی دحم عن اساعة (بدون الواو وفی روایة لایحب (حل عن جابر و عن عائشة) وفی (مسلم عن عائشة) لایحب الفحش والتفحش وفی دحم عن اساعة ایضًا) کل فاحش متفحش (ای بدون اللام والواو) والاحادیث فی ذم الفحش کثیرة راجع الکنز للمتقی (۲ء ۳ و ۹ ۔۳۲۲۔ ۳۲۳)۔ [2] سقط لفظ المنع من المطبوع [3] والمعروف فی الروایة الحلال بین والحرام بین راجع (ق ام طس عن عمر ق ہ ک عن نعمان) الفتح الکبیر (۲۔ ۸۲۔۸۳) ؛

الزام توان لوگوں پر ہے۔ جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد پھیلاتے ہیں۔ میں عقوبۃ کو بغی بغیر الحق کے ساتھ مقید کیا ہے۔

اَبْغَيْتُكَ کسی شے کی طلب میں مدد کرنا۔ بَغَی الْجُرُوحُ زخم کا بہت زیادہ بگڑ جانا۔ بَغَتِ الْمَرْءَةُ عورت نے زنا کا ارتکاب کیا اور زنا کو بَغْیٌ اسلئے کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی حدود عفت سے تجاوز کے معنی پائے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔

وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (۲۴-۳۳) اور اپنی لونڈیوں کو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہیں تو...... بدکاری پر مجبور نہ کرنا۔

بَغَتِ السَّمَاءُ بادل کا ضرورت سے زیادہ برسنا اور بَغْیٌ کے معنی تکبر کرنا بھی آتے ہیں کیونکہ اس میں بھی اپنی حد سے تجاوز کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں (اور یہ ہر امر کے متعلق استعمال ہوتا ہے (گو لغت میں بَغْیٌ کا لفظ محمود اور مذموم دونوں قسم کے تجاوز پر بولا جاتا ہے مگر قرآن میں اکثر جگہ معنی مذموم کے لئے استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا :۔

يَبْغُوْنَ فِى الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ (۱۰-۲۳) تو ملک میں ناحق شرارت کرنے لگتے ہیں۔

اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ (۱۰-۲۳) تمہاری شرارت کا وبال تمہاری ہی جانوں پر ہوگا۔

ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ (۲۲-۶۰) پھر اس شخص پر زیادتی کی جائے تو خدا اسکی مدد کریگا۔

اِنَّ قَارُوْنَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَبَغٰى عَلَيْهِمْ (۲۸-۷۶) قارون موسیٰ کی قوم میں سے تھا اور ان پر تعدی کرتا تھا۔

فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ (۴۹-۹) اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو۔

اور آیت کریمہ :۔ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ (۲-۱۷۳) (بشرطیکہ خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے باہر نہ نکل جائے۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اتنا ہی لے جتنی اسے ضرورت ہے اور حد متعین سے آگے نہ بڑھے۔ امام حسن[1] نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ نہ تو محض لذت کے لئے کھائے۔ اور نہ ہی سد رمق (یعنی ضرورت سے) تجاوز کرے۔

مجاہد رحمہ اللہ نے کہا ہے[2] کہ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ کے یہ معنی ہیں بشرطیکہ وہ نہ تو امام وقت سے باغی ہو اور نہ ہی معصیت کا ارتکاب کرکے راہ حق سے تجاوز کرنے والا ہو۔

اَلْاِبْتِغَاءُ یہ خاص کر کوشش کے ساتھ کسی چیز کو طلب کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اگر اچھی چیز کی طلب ہو تو یہ کوشش بھی محمود ہوگی (ورنہ مذموم) چنانچہ فرمایا :۔

اِبْتِغَاءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ (۱۷-۲۸) اپنے

---

[1] راجع للقول الحسن (الطبری ۲: ۸۴) والحسن بن یسار البصری ابوسعید التابعی احد العلماء الفقہاء فی البصرۃ وعلیہ کتاب لاحسان عباس (الحسن البصری) ولقاد ولعل والباسہ الخرقۃ غیر محقق (کمرۃ النساء) ولی الندا الامیر القنوجی وأثبتہ صاحب "فخر الحسن" وفی الجماد ان لباس الخرقۃ بدعۃ حققتہا فی حواشی مآثر الکرام (فارسی بلجرامی) راجعہ راجع التراجم الحسن تہذیب ومیزان الاعتدال ۱ر۲۵۴ وامالی المرتضی ۱ر۱۰۶

[2] وقول مجاہد ہذا ذکرہ الشوکانی فی الفتح ۱ر۱۷۰ وفی اکل المضطر المیتۃ ومال الغیر اختلاف بین الفقہاء ولم یصف من انکر اکل مال الغیر مطلقاً راجع القرطبی وایضاً ابن کثیر والمجاہد ہو ابن جبیر المکی (۲۱-۱۰۴) تلمیذ ابن عباس فی التفسیر قال الذہبی شیخ القراء والمفسرین ہو وان کان من الثقات لکن لا یعتمد علی تفسیرہ لانہ ینقل عن اہل الکتاب (راجع طبقات الفقہاء ۵ والارشاد ۲: ۲۴۲ ومیزان الاعتدال ۳ر۹ والجمع بین رجال الصحیحین ۵۱۰ راجع الاعلام لزرکلی

پروردگار کی رحمت (یعنی فراخ دستی) کے انتظار میں۔
إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ (۹۲-۲۰) بلکہ اپنے خداوند اعلیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے دیتا ہے۔
اور ینبغی (انفعال) بغی کا مطاوع آتا ہے اور یَنْبَغِیْ اَنْ یَكُوْنَ كَذَا کا محاورہ دو طرح استعمال ہوتا ہے
(۱) اس شے کے متعلق جو کسی فعل کے لئے مسخر ہو جیسے اَلنَّارُ یَنْبَغِیْ اَنْ تُحْرِقَ الثَّوْبَ یعنی کپڑے کو جلا ڈالنا آگ کا خاصہ ہے (۲) یہ کہ وہ اس کا اہل ہے یعنی اس کے لئے ایسا کرنا مناسب اور زیبا ہے جیسے۔ فُلَانٌ یَنْبَغِیْ اَنْ یُّعْطِیَ لِكَرَمِهٖ کہ فلاں کے لئے اپنے کرم کی وجہ سے بخشش کرنا زیبا ہے اور آیت کریمہ:۔
وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَهٗ (۳۶-۶۹)
اور ہم نے ان (پیغمبر) کو شعر گوئی نہیں سکھلائی اور نہ وہ ان کو شایاں ہے۔
پہلے معنی پر محمول ہے۔ یعنی نہ تو آنحضرت فطرتاً شاعر ہیں۔ اور نہ ہی سہولت کے ساتھ شعر کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ معلوم کہ آپ کی زبان پر شعر جاری نہ ہوتا تھا۔ اور آیت کریمہ:۔ وَهَبْ لِیْ مُلْكًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِیْ (۳۸-۳۵) اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو۔ (دوسرے معنی پر محمول ہے۔ یعنی میرے بعد وہ سلطنت کسی کو میسر نہ ہو)

(ب ق ر)

اَلْبَقَرُ۔ (اسم جنس) کے معنی (بیل یا) گائے کے ہیں اس کا واحد بَقَرَۃٌ ہے۔ قرآن میں ہے۔ اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَیْنَا (۲-۷۰) کیونکہ بہت سے بیل ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔ بَقَرَۃٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ (۲-۶۸) کہ وہ بیل نہ تو بوڑھا ہو اور نہ بچھڑا۔ بَقَرَۃٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا (۲-۶۹) کہ اس کا رنگ گہرا زرد ہے۔
بَقَرَۃٌ کی جمع بَاقِرٌ و بَقِیْرٌ (بروزن حکیم) آتی ہے جیسے حَامِلٌ وَحَمِیْلٌ اور بعض کے نزدیک اس کی جمع بَیْقُوْرٌ بھی آتی ہے اور بیل کو ثَوْرٌ کہا جاتا ہے جیسے۔ نَاقَةٌ وَجَمَلٌ وَرَجُلٌ وَامْرَاَةٌ
اور بیل چونکہ کھیتی باڑی کے کام آتا ہے اس لئے زمین کو پھاڑنے اور جوتنے کے لئے بَقْرُ الْاَرْضِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور بیل چونکہ وسیع طور پر زمین کو پھاڑتا ہے اس لئے ہر وسیع شدکاف کے متعلق یہ لفظ استعمال ہونے لگا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔ بَقَرْتُ بَطْنَهٗ میں نے اس کا پیٹ چاک کر دیا۔
محمد بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو باقر کا لقب دیا گیا ہے[1] کیونکہ ان کو دقائق و رموز علمیہ کے متعلق گہری تحقیق حاصل تھی بَیْقَرَ الرَّجُلُ فِی الْمَالِ وَ فِیْ غَیْرِهٖ کسی کا بہت زیادہ مال دار ہونا بَیْقَرَ فِیْ سَفَرِهٖ ملک در ملک پھرنا۔ شاعر نے کہا ہے[2] ع (طویل)

(۶۱) الاهل اتاها والحوادث جمّة
بان امرئ القیس یهلک بیقرا

کیا اسے یہ خبر ملی ہے کہ زمانہ کی بوقلمونیوں کی وجہ

---

[1] محمد بن علی زین العابدین الحسین ابوجعفر الباقر (۵۷ھ/۱۱۴) خامس الائمۃ الاثنی عشر عند الامامیہ ولہ فی العلم وتفسیر القرآن آراء راجع کتاب اخبار ابی جعفر الباقر للجلودی (۳۰۲ھ) وتذکرۃ الحفاظ ۱/۱۱۷ الذریعۃ ۱: ۳۱۵ ونزہۃ الجلیس ۲: ۲۳ ومنہاج السنۃ ۲/۱۱۴ و۱۲۳ والیعقوبی ۳:

[2] قالہ امرا القیس راجع الطبری ۷/۱۳۹ ومعانی القرآن للفراء والسنتہ ۱۳۰ ودیوانہ ۶۴ (ضعتہ سندوبی والسمط ۴۰ والاقتضاب ۷۷۴ وتہذیب الالفاظ ۸۷۴ والبحر ۳: ۳۵۷ والبلدان (اسم و بیقر) وشرح السبع لابن الانباری ۵۹۴ واللسان (بیقر) والاغانی ۸: ۶۱) والمعانی ۸۷۵ وفی بعض الروایات ابن تملک بدل یہلک وہی بنت عمرو بن زبید ام امرئ القیس ❊ ❊ ❊ ❊

سے امرئ القیس بن تملک دربدر دھکے کھا رہا ہے۔
بَقَرَ الصِّبْیَانُ: بچوں کا بُقَیْرَیٰ کھیل کھیلنا یہ بچوں کے ایک کھیل کا نام ہے جس میں ریت کا ڈھیر لگا کر اس کے آس پاس گڑھے کھود دیتے ہیں (فارسی میں اسے کول موئی کہا جاتا ہے)
اَلْبَقْرَان: ایک قسم کے گھاس کا نام ہے کیونکہ وہ جب اگتا ہے تو زمین میں شگاف ڈال دیتا ہے اور اس کی جڑیں زمین میں دور تک چلی جاتی ہیں۔

(ب ق ل)

قرآن میں ہے:۔
مِنْ بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا (۲-۶۱) کہ ترکاری اور ککڑی
بَقْلٌ:۔ ان سبزیوں کو کہتے ہیں جن کی جڑیں اور شاخیں سردیوں میں باقی نہیں رہتیں۔
اس سے فعل مشتق کر کے بَقَلَ بمعنی نَبَتَ استعمال ہوتا ہے اور تشبیہ کے طور پر بَقَلَ وَجْهُ الصَّبِیِّ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی ہیں لڑکے کے چہرہ پر سبزہ نمودار ہونے لگا۔ ابن السکیت[1] کے نزدیک بَقَلَ نَابُ الْبَعِیْرِ کا محاورہ بھی بولا جاتا ہے جس کے معنی ہیں اونٹ کے کیلے نکل آئے
اَبْقَلَ الْمَكَانُ فَهُوَ مُبْقِلٌ" جگہ کا سرسبز ہونا
بَقَلْتُ الْبَقْلَ میں نے سبزی کاٹی اَلْمَبْقَلَةُ (ظرف) سبزیوں کی جگہ۔

(ب ق ی)

اَلْبَقَاءُ کے معنی کسی چیز کے اپنی اصلی حالت پر قائم رہنے کے ہیں یہ فناء کی ضد ہے۔ یہ باب بَقِيَ (س) يَبْقٰى بَقَاءً ہے۔ اور بعض کے نزدیک اس کا باب بَقٰى (ض) بَقْيًا بھی آتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے[2] (۳۹)
بَقَيْنَا رَسُوْلَ اللهِ۔ یعنی ہم آنحضرت کے منتظر رہے اور کافی عرصہ تک آپ کی نگہبانی میں بیٹھے رہے۔
اَلْبَاقِیْ (صفت) دو قسم پر ہے ایک اَلْبَاقِیْ بِنَفْسِهٖ جو ہمیشہ ایک حالت پر قائم رہے اور اس پر کبھی فنا طاری نہ ہو اس معنی میں یہ حق تعالیٰ کی صفت ہے۔ دوم الباقی بغیرہٖ اس میں سب ماسوی اللہ داخل ہیں کہ ان پر فناء اور تغیر کا طاری ہونا صحیح ہے۔
اَلْبَاقِیْ بِاللهِ بھی دو قسم پر ہے۔ ایک وہ جو بذاتہٖ جب تک اللہ کی مشیت ہو باقی رہے جیسے اجرام سماویہ۔ دوم وہ جس کے افراد و اجزاء تو تغیر پذیر ہوں مگر اس کی نوع یا جنس میں کسی قسم کا تغیر نہ ہو۔ جیسے انسان و حیوان۔ اسی طرح آخرت میں بھی بعض اشیاء بِشَخْصِهٖ باقی رہیں گی جیسے اہل جنت کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہیں گے۔ جیسے فرمایا:۔
خَالِدِیْنَ (۴-۱۴۴) جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔
اور بعض چیزیں صرف جنس و نوع کے اعتبار سے باقی رہیں گی۔ جیسا کہ آنحضرت سے مروی ہے[3] (۴۰)
ان ثمار اهل الجنة يقطفها اهلها و يأكلونها ثم تخلف مكانها مثلها: کہ ثمار جنت کو اہل جنت چن کر کھاتے رہیں گے اور ان کی جگہ

---

[1] هو ابو یوسف یعقوب بن اسحاق بن السکیت تأدب علی الکسائی والفراء واخذ عن الاصمعی وابی عبیدة البصری واشتهر بمصنفاته و کان مؤدبا لابن المعتز توفی فی رجب ۲۴۴ھ صنف کتاب اصلاح المنطق والالفاظ وکتاب المقصور والممدود والقلب والابدال والاضداد وقد انتشرت راجع لترجمته معجم الادباء ۲۰/۵۲ والبغیہ ۴۱۸-۴۱۹ شذرات ۲/۱۰۶ وابن خلکان ۷۹۸ والارشاد ۷/۳۰۰-۳۰۲ والیافعی ۲/۱۴۷-۱۴۹ [2] و تمامه: ذات لیلة فی صلاة العشاء والحدیث فی الکشاف ۲/۳۸ والفائق (۱: ۵۷) وابی داؤد من حدیث معاذ بن جبل (تخریج الکشاف ۸۸ رقم ۱۹۵) [3] فی الطبرانی والبزار بمعناه عن ثوبان راجع مجمع الزوائد (۱۰/۴۱۴)

نئے پھل پیدا ہوتے رہیں گے چونکہ آخرت کی تمام اشیاء دائمی ہیں اس لئے فرمایا :۔ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّ أَبْقٰى (۲۸-۶۰) اور جو خدا کے پاس ہے وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

اور آیت کریمہ :۔

وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ (۱۸-۴۶) میں وہ تمام اذکار و اعمال صالحہ داخل ہیں جن کا ثواب انسان کے لئے باقی رہے گا۔ بعض نے ان سے پانچ نمازیں مراد لی ہیں۔ اور بعض نے اس سے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ یعنی تسبیح و تحمید مراد لی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ ان میں ہر وہ عبادت داخل ہے جس سے رضائے الٰہی مقصود ہو یہی معنی آیت کریمہ :۔

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ (۱۱-۸۶) میں بَقِيَّتُ اللّٰهِ کے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف مضاف ہے۔ اور آیت کریمہ :۔

فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْ بَاقِيَةٍ (۶۹-۸) بھلا تو ان میں سے کسی کو بھی باقی دیکھتا ہے۔ میں بَاقِيَةٌ کا موصوف جماعۃ یا فِعْلَةٌ محذوف ہے یعنی باقی رہنے والی جماعت یا ان کا کوئی فعل جو باقی رہا ہو اور بعض کے نزدیک بَاقِيَةٌ بمعنی بَقِيَّةٌ ہے ان کا قول ہے کہ بعض مصادر فاعل کے وزن پر آتے ہیں اور بعض مفعول کے وزن پر لیکن پہلا قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

(ب ك ك)

بَكَّةُ۔ مجاہدؒ سے منقول ہے کہ یہ اصل میں مَكَّةُ ہے اور اس میں با میم سے مبدل ہے جیسا کہ: سَبَدَ رَأْسَهُ وَ سَمَدَهُ وَ ضَرْبٌ لَازِبٌ وَلَازِمٌ میں ہے۔ قرآن میں ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا (۳-۹۶) پہلا گھر جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکے میں ہے بابرکت۔

بعض کا قول ہے کہ بکہ سے اندرون مکہ مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ مسجد کا نام ہے۔ اور بعض نے بیت اللہ کے اسماء سے شمار کیا ہے اور بعض نے مطاف (طواف گاہ) سے تفسیر کی ہے۔ اور یا تو تَبَاكٌ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ازدحام کے ہیں اور وہاں چونکہ طواف کے لئے لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اس لئے اس کو بکہ کہا گیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ بَكَّةُ بَكٌّ (ن) سے مشتق ہے جس کے معنی مزاحمت کرنے اور پھاڑ ڈالنے کے ہیں چونکہ سنت الٰہی جاری ہے کہ جو ظالم وہاں الحاد و ظلم پھیلانا چاہتا ہے۔ اس کی گردن توڑ دی جاتی ہے اسلئے اسے اس نام سے پکارا گیا ہے۔

(ب ك ر)

اس باب میں اصل کلمہ بُكْرَةٌ ہے جس کے

سلہ راجع لاقوالہم ابن کثیر ۳ ر ۸۵ و اختار العموم ابن جریر الطبری والیضًا الکشاف ۲ ر ۷۰۵ و اختلف ایضًا فی الآیۃ (۲-۴۸) راجع البغوی ۱ ر ۲۱۶ و فی آیۃ او لو بقیۃ (۱۱-۱۱۶) المراد بہا اہل الفضل والعقل و بیضاوی (۱: ۳۲۸) سلہ اولہ ابوعبیدۃ بالمصدر فرد علیہ المؤلف و اکثر ما یرد علیہ سلہ لان الباء والمیم من حرف الشفۃ (؟) بدال راجع ابدال ابی الطیب سلہ تادن مجاز القرآن لابی عبیدۃ (۱: ۹۷) و غریب القرآن للسجستانی ۲۵ واللسان (بکر) وتاول الادلۃ والاشتقاق فی الفتح للشوکانی ۱ ر ۳۶۲ ؎

معنی دن کے ابتدائی حصہ کے ہیں پھر اس سے صیغہ فعل مشتق کرکے کہا جاتا ہے۔ بَكَرَ (ن) فُلَانٌ بُكُوْرًا کسی کام کو صبح سویرے نکلنا۔ اَلْبَكُوْرُ (صیغہ مبالغہ) بہت سویرے جانے والا۔

بَكَّرَ۔ فِیْ حَاجَتِهٖ وَابْتَكَرَ وَبَاكَرَ مُبَاكَرَةً۔ صبح سویرے کسی کام کے لئے جانا اور بُكْرَةٌ (دن کا پہلا حصہ) چونکہ دن کے باقی حصہ پر متقدم ہوتا ہے اس لئے اس سے شتابی کے معنی لے کر ہر اس شخص کے متعلق بَكِرَ (س) فعل استعمال ہوتا ہے جو کسی معاملہ میں جلدبازی سے کام لے شاعر نے کہا ہے[۱] (الکامل)

(۶۲) بَكَرَتْ تَلُوْمُكَ بَعْدَ وَهْنٍ فِی النَّدٰی
بُسْلٌ عَلَيْكَ مَلَامَتِیْ وَعِتَابِیْ

وہ کچھ عرصہ کے بعد جلدی سے سخاوت پر ملامت کرنے لگی میں نے کہا کہ تم پر مجھے ملامت اور عتاب کرنا حرام ہے۔

بِكْرٌ پہلا بچہ اور جب ماں باپ کے پہلا بچہ پیدا ہو تو احتراماً انہیں بِكْرٌ ان کہا جاتا ہے جیسا کہ بیت اللہ بولا جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ثواب الہیٰ اور ان غیرفانی نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے تیار کی ہیں[۲] جس کی طرف آیت کریمہ:۔

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (۲۹-۶۴)

اور دہمیشہ کی زندگی (کا مقام) تو آخرت کا گھر ہے میں اشارہ فرمایا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[۳] (رجز)

(۶۳) یَا بِكْرَ بِكْرَيْنِ وَيَا خِلْبَ الْكَبِدِ

اے والدین کے اکلوتے بیٹے اور جگر گوشے۔

پس آیت کریمہ:۔

لَا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ۔ (۲-۶۸) نہ تو بوڑھا ہو اور نہ بچھڑا۔ میں بِكْرٌ سے نوجوان گائے مراد ہے جس نے ابھی تک کوئی بچہ نہ دیا ہو۔ اور ثیّب کے اعتبار سے دوشیزہ کو بھی بِكْرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ اسے مجامعت کے لئے ثیّب پر ترجیح دی جاتی ہے بِكْرٌ کی جمع اَبْكَارٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا۔ (۵۶-۳۵-۳۶) ہم نے ان (حوروں) کو پیدا کیا تو ان کو کنواریاں بنایا۔

اَلْبَكَرَةُ چھوٹی سی چرخی۔ کیونکہ وہ تیزی کے ساتھ گھومتی ہے۔

(ب ك م)

اَلْاَبْكَمُ پیدائشی گونگا اور اخرس عام گونگے کو کہتے ہیں لہذا اَبْكَمُ عام اور اخرس خاص ہے قرآن میں ہے۔

---

[۱] البیت لضمرة بن ضمرة النهشلي انشده ابوزید النوری وابوحاتم فی ان البسل من الاضداد والبیت فی النوادر لابی زید ۲ والسمط ۹۲۲ والامالی (۲: ۲۷۹) والدرة مع شرح الخفاجی ۱۹۳ والاقتضاب ۴۲۸ وفیه ان لفظة بكرت یأتی مثلاً للتعجیل کما فی ہذا البیت وفی روایة الکامل ۴۲۸ بیت بدل بكرت والبیت فی الفاضل ۱۰۷ والاضداد لابی حاتم رقم ۳۴۱ ص ۱۰۳ ولباب الآداب وطبقات السیرافی ۵۷ والوحشیات رقم ۴۲ فی خمسة ابیات والبیت اولها والمجالس ۴۸۴ وابدال ابی الطیب (۲: ۵۳۶) وفی روایة ام عمرو بدل لبعد من ولعده: اا ضرّ ادیتی عمروسا غبنكفاک من ابة علی عتاب۔ راجع اضداد للبحستانی وابن الانباری ۷۲ واضداد ابی الطیب ۴۳۲ واعراب ثلاثین لابن خالویه واللسان (بسل)، والطبری [۲] ولعلہ اشارة الی تفسیر الآیة ولهم رزقهم فیها بكرة وعشیا (۱۹-۱۱) وہہنا سقط والدالم [۳] قال الراجز ولعدہ: اصبحت منی کذراع من عضد۔ والشطر فی اللسان (بكر) وفی الصحاح بغیر عزو (بكر)، والبحر (۱: ۲۴۸)، واضداد لابن الانباری ۲۴۷ واضداد ابی الطیب ۹۱ وامالی القالی (۱: ۲۴) ۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ (۱۶-۷۶) اور خدا ایک اور مثال بیان فرماتا ہے کہ دو آدمی ہیں ایک ان میں گونگا اور دوسرے کی ملک) ہے (بے اختیار و ناتوان) کہ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا۔

اور اَبْكَمُ کی جمع بُكْمٌ آتی ہے چنانچہ فرمایا:۔
صُمٌّ بُكْمٌ (۲-۱۸) یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اور جو شخص ضعف عقل کے سبب گفتگو نہ کر سکے اور گونگے کی طرح چپ رہے تو اس کے متعلق بَكِمَ عَنِ الْكَلَامِ کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ کلام سے عاجز ہو گیا۔

(ب ك ی)

بَكٰی يَبْكِیْ کا مصدر بُكًی و بُكَاءٌ یعنی ممدود اور مقصور دونوں طرح آتا ہے اور اس کے معنی غم کے ساتھ آنسو بہانے اور رونے کے ہیں اگر آواز غالب ہو تو اسے بُكَاءٌ (ممدود) کہا جاتا ہے جیسے رُغَاءٌ و ثُغَاءٌ اور اس نوع کے دیگر اوزان جو صوت کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور اگر غم غالب ہو تو اُسے بُكًی (بالقصر) کہا جاتا ہے۔
اَلْبَاكِیْ رونے والا۔ غم اور اندوہ سے آنسو بہانے والا اس کی جمع بَاكُوْنَ و بُكِیٌّ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا (۱۹-۵۸) تو سجدے میں گر پڑتے اور روتے رہتے تھے۔
اصل میں بُكِیٌّ (بُكُوْیٌ) بروزن فُعُوْلٌ ہے جیسے سَاجِدٌ و سُجُوْدٌ و رَاكِعٌ و رُكُوْعٌ و قَاعِدٌ و قُعُوْدٌ واؤ کو یاء سے تبدیل کر کے یاء میں ادغام کر دیا گیا ہے جیسے جَاثٍ و جُثِیٌّ و عَاتٍ و عُتِیٌّ نیز:۔

بُكًی کے اصل معنی تو غم کے ساتھ آنسو بہانے کے ہوتے ہیں۔ مگر کبھی صرف آنسو بہانے اور کبھی صرف غم کھانے کے لئے بھی آجاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا (۹-۸۲) یہ (دنیا میں) تھوڑا سا ہنس لیں اور (آخرت میں)..... بہت سا رونا ہوگا۔
میں مطلق خوشی اور غم کے معنی مراد ہیں اور ضحک کے ساتھ قہقہہ اور بکاء کے ساتھ آنسو بہانا ضروری نہیں ہے۔ یہی معنی آیت کریمہ:۔
فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ (۴۴-۲۹) پھر ان پر نہ تو آسمان اور زمین کو رونا آیا۔
میں مراد ہیں ہاں جو لوگ آسمان اور زمین کے لئے زندگی اور علم ثابت کرتے ہیں وہ اسے حقیقی معنی پر حمل کرتے ہیں اور جو زندگی کے قائل نہیں ہیں وہ نسبت مجازی قرار دیتے ہیں یعنی ان سے آسمان اور زمین کے باشندے مراد ہیں[1]۔

بَلْ (حرف)

بَلْ حرف استدراک ہے اور تدارک کی دو صورتیں ہیں (۱) جبکہ بل کا مابعد اس کے ماقبل کی نقیض ہو تو اس صورت میں کبھی تو اس کے مابعد حکم کی تصحیح سے ماقبل کی تردید مقصود ہوتی ہے۔ اور کبھی اس کے برعکس ماقبل کی تصحیح اور مابعد کے ابطال کی غرض سے بل کو لایا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلی صورت کے متعلق فرمایا۔
وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔

---

[1] قال الحسن ای اہل السماء والارض کما فی قولہ تعالیٰ حتی تضع الحرب اوزارہا (   ) ویمکن ان یکون المراد المبالغۃ فی وصف القوم بالصغر فی القدر او کنایۃ عن عدم عملہم الصالح فی الارض یرفع الی السماء کما روی عن ابن عباسؓ وقال السدی لما قتل الحسین بن علی بکت السماء علیہ وبکاءہا حمرۃ اطرافہا لکن الروایۃ غیر ثابت واللہ اعلم۔

(۸۳-۱۴) جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے یہ تو اگلے لوگوں کے افسانے ہیں دیکھو یہ جو اعمال بد کر رہے ہیں ان کا ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔

تو بَلْ کا معنی یہ نہیں کہ آیات الٰہی کو اساطیر کہنا صحیح نہیں ہے بلکہ یہ ان کی جہالت سے پھر رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ کہہ کر ان کی جہالت پر تنبیہ کی ہے۔

اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا:۔

قَالُوْا أَأَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يَا اِبْرَاهِيْمُ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَاسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (۲۱: ۶۱-۶۲) (جب ابراہیم آئے تو بت پرستوں نے کہا کہ ابراہیم بھلا یہ کام ہمارے معبودوں کے ساتھ تم نے کیا ہے (ابراہیم نے) کہا (نہیں) بلکہ یہ ان کے اس بڑے بت نے کیا (ہوگا) اگر یہ بولتے ہوں تو ان سے پوچھ دیکھو۔

اور دوسری صورت میں ماقبل کی تصحیح اور مابعد کے الطاف کے متعلق فرمایا:۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ۝ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۝ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (۸۹: ۱۵-۱۷) مگر انسان (عجیب مخلوق ہے کہ) جب اس کا پروردگار اس کو آزماتا ہے کہ اسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے تو کہتا ہے کہ (آہا) میرے پروردگار نے مجھے عزت بخشی اور جب (دوسری طرح) آزماتا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ (ہائے) میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کیا نہیں بلکہ تم لوگ یتیم کی خاطر نہیں کرتے۔

یعنی رزق کی فراخی یا تنگی اکرام یا اہانت کی دلیل نہیں ہے (بلکہ یہ پروردگار کی طرف سے آزمائش ہے) مگر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کیونکہ یہ مال کو بیجا صرف کر رہے ہیں اور اسی طرح آیت:۔

صٓ ۔ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ (۳۸: ۱-۲) قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے (کہ تم حق پر ہو) مگر جو لوگ کافر ہیں وہ غرور اور مخالفت میں ہیں وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ کہہ کر یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن تذکر یعنی نصیحت حاصل کرنے کی کتاب ہے اور کفار کا اس کی طرف متوجہ نہ ہونا اس کی نفی نہیں کرتا بلکہ ان کا اعراض محض غرور اور مخالفت کی وجہ سے ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

قٓ ۔ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْٓا (۵۰: ۱-۲) قرآن مجید کی قسم (کہ محمد پیغمبر ہیں) لیکن ان لوگوں نے تعجب کیا۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے یعنی ان کا قرآن پر ایمان نہ لانا قرآن کے بزرگ ہونے کے منافی نہیں ہے بلکہ محض ان کی جہالت سے بَلْ عَجِبُوْٓا کہہ کر ان کی جہالت پر متنبہ کیا ہے کیونکہ کسی چیز پر اسی وقت تعجب ہوتا ہے جب اس کا سبب معلوم نہ ہو۔ نیز فرمایا:۔

مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَاۗءَ رَكَّبَكَ ۝ كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ (۸۲: ۶-۹) تجھ کو اپنے پروردگار کرم گستر کے باب میں کس چیز نے دھوکہ دیا (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور (تیرے اعضاء کو) ٹھیک کیا اور (تیرے قامت کو) معتدل رکھا اور جس صورت میں چاہا جوڑ دیا۔ مگر ہیہات تم لوگ جزا کو جھٹلاتے ہو۔

یعنی رب کریم کے بارے میں کوئی چیز سوائے اس کے دھوکے میں ڈالنے والی نہیں ہے کہ وہ دین کو جھٹلا رہے ہیں۔

(۲) تدارک کی دوسری صورت یہ ہے کہ دوسری کلام کے ذریعہ پہلی کلام کی وضاحت اور اس پر اضافہ مقصود ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔

بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ۔ (۲۱-۵) بلکہ ظالم کہنے لگے کہ (یہ قرآن) پریشان (باتیں ہیں جو) خواب (ہیں دیکھ لی ہیں (نہیں) بلکہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے (نہیں) بلکہ یہ (شعر ہے) جو اس (شاعر) کا نتیجہ طبع ہے۔

یہاں متنبہ کیا ہے کہ اولاً انہوں نے قرآن کو خیالات پریشان کہا پھر اس پر اضافہ کرکے اسے افترا بتلانے لگے پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آپ کے متعلق (نعوذ باللہ) کذاب ہونے کا ادعا کرنے لگے کیونکہ قرآن کی اصطلاح میں شاعر فطرۃً کاذب کو کہا جاتا ہے اور آیت:۔

لَوْ يَعْلَمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا حِيْنَ لَا يَكُفُّوْنَ عَنْ وُّجُوْهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنْ ظُهُوْرِهِمْ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ بَلْ تَاْتِيْهِمْ بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ۔ (۲۱-۳۹-۴۰) اے کاش کافر اس وقت کو جانیں جب وہ اپنے مونہوں پر سے (دوزخ کی) آگ کو روک نہ سکیں گے اور نہ اپنی پیٹھوں پر سے اور نہ ان کا کوئی مددگار ہوگا بلکہ قیامت ان پر ناگہاں آ واقع ہوگی اور ان کے ہوش کھو دے گی۔

بھی اس معنی پر محمول ہے کہ کاش وہ اس کے علاوہ دوسری بات کو جانتے ہوتے جو پہلی بات سے زیادہ اہم ہے یعنی یہ کہ قیامت ان پر ناگہاں آ واقع ہوگی۔ قرآن میں جتنی جگہ بھی بَلْ آیا ہے ان دونوں معنی میں سے کسی ایک پر دلالت کرتا ہے اگرچہ بعض مقامات ذرا وضاحت طلب ہیں[1] اور ان کے پیچیدہ ہونے کی بنا پر بعض علمائے نحو نے غلطی سے کہدیا ہے کہ قرآن میں بل صرف معنی ثانی کیلئے استعمال ہوا ہے[2]

(ب ل د)

اَلْبَلَدُ (شہر) وہ مقام جس کی حد بندی کی گئی ہو اور وہاں لوگ آباد ہوں۔ اس کی جمع بِلَادٌ اور بُلْدَانٌ آتی ہے اور آیت:۔

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ (۹۰-۱) میں هٰذَا الْبَلَدِ سے مکہ مکرمہ مراد ہے دوسری جگہ فرمایا رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا۔ (۱۴-۳۵) کہ میرے پروردگار اس شہر کو (لوگوں کے لئے) امن کی جگہ بنا دے۔ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ (۳۴-۱۵) پاکیزہ شہر ہے۔

فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا (۴۳-۱۱) پھر ہم نے اس سے شہر مردہ کو زندہ کردیا۔

فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ (۳۵-۹) پھر ہم ان کو ایک بے جان شہر کی طرف چلاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا (۲-۱۲۶) اے پروردگار اس جگہ کو امن کا شہر بنا۔

---

[1] قال فی المغنی: بل حرف اضراب فان تلاہا جملۃ کان معنی الاضراب اما الابطال ای الاول واما الانتقال من غرض الی آخر وہی فی ذالک کلمۃ حرف ابتداء لا عاطفۃ علی الصحیح وان تلاہا مفرد فہی عاطفۃ ثم ان تقدمہا امر او ایجاب فہی تجعل ماقبلہا کالمسکوت عنہ واثبات الحکم لما بعدہا وان تقدمہا النفی او نہی فہی لتقریر ماقبلہا علی حالتہ وجعل ضدہ لما بعد (راجع ا: ۱۱۹-۱۲۰) [2] کما قال ابن مالک فی شرح الکافیہ (راجع ابن ہشام (ا: ۱۲۰)

میں بھی مکہ مکرمہ مراد ہے لیکن ایک مقام پر اسے معرفہ اور دوسرے مقام پر نکرہ لانے میں جو لطافت اور نکتہ ملحوظ ہے اسے ہم دوسری کتاب میں بیان کرینگے اور بَلَدٌ کے معنی بیابان اور قبرستان بھی آتے ہیں کیونکہ پہلا وحشی جانوروں دوسرا مردوں کا مسکن ہوتا ہے۔ اَلْبَلْدَۃُ منازل قمر سے ایک منزل کا نام ہے اور تشبیہ کے طور پر ابرو کے درمیان کی جگہ اور اونٹ کے سینہ کو بھی بَلْدَۃٌ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی شہر کی طرح محدود ہوتے ہیں اور بطور استعارہ انسان کے سینہ پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور اثر یعنی نشان کے معنی کے اعتبار سے بِجِلْدِہٖ بَلَدٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے یعنی اس کی کھال پر نشان ہے اس کی جمع اَبْلَادٌ آتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۴۲) وَفِی النُّحُوْرِ کُلُوْمٌ ذَاتُ اَبْلَادِ

اور ان کے سینوں پر زخموں کے نشانات ہیں۔

اَبْلَدَ الرَّجُلُ شہر میں چلا جانا جیسا کہ اَنْجَدَ وَ اَتْھَمَ کے معنی نجد اور تہامہ میں چلے جانے کے ہیں۔ بَلَدَ الرَّجُلُ۔ کے معنی شہر میں مقیم ہونے کے ہیں اور کسی مقام پر ہمیشہ رہنے والا اکثر اوقات دوسری جگہ میں جا کر متحیر ہو جاتا ہے اس لئے متحیر آدمی کے متعلق بَلَدَ فِیْ اَمْرِہٖ وَاَبْلَدَ وَتَبَلَّدَ وغیرہا کے محاورات استعمال ہوتے ہیں شاعر نے کہا ہے[2] (ع)

(۴۵) لَابُدَّ لِلْمَحْزُوْنِ اَنْ یَّتَبَلَّدَا

(کہ اندوہگین لازماً متحیر رہے گا)۔

اجڈ لوگ عام طور پر بلید یعنی کندذہن ہوتے ہیں اس لئے ہر جسیم آدمی کو اَبْلَدُ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:

وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذْنِ رَبِّہٖ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا (۷-۵۸) (جو زمین پاکیزہ ہے، اس میں سے سبزہ بھی پروردگار کے حکم سے نفیس ہی نکلتا ہے اور جو خراب ہے۔ اس میں سے جو کچھ نکلتا ہے ناقص ہوتا ہے) میں بلد کے طیب اور خبیث ہونے سے کنایۃً نفوس کا طیب اور خبیث ہونا مراد ہے۔

(ب ل س)

اَلْاِبْلَاسُ (افعال) کے معنی سخت ناامیدی کے باعث غمگین ہونے کے ہیں۔ اَبْلَسَ وہ مایوس ہونے کی وجہ سے مغموم ہوا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسی سے اِبْلِیْس مشتق ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَیَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَۃُ یُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ (۳۰-۱۲) اور جس دن قیامت برپا ہوگی گنہگار مایوس مغموم ہو جائیں گے۔

اَخَذْنٰھُمْ بَغْتَۃً فَاِذَا ھُمْ مُّبْلِسُوْنَ (۶-۴۴) تو ہم نے ان کو ناگہاں پکڑ لیا اور وہ اس وقت مایوس ہو کر رہ گئے۔

وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْھِمْ مِّنْ قَبْلِہٖ لَمُبْلِسِیْنَ۔ (۳۰-۴۹) اور بیشتر تو وہ مینہ کے اترنے سے پہلے ناامید ہو رہے تھے۔

اور عام طور پر غم اور مایوسی کی وجہ سے انسان خاموش رہتا ہے اور اسے کچھ سوجھائی نہیں دیتا اس لئے اَبْلَسَ فُلَانٌ کے معنی خاموش اور دلیل سے عاجز ہونے کے ہیں۔

---

[1] قالہ القطامی وأولہ:- لیست تجرح فرارا ظہورہم ۔ ۔ ۔ ۔ والبیت فی اللسان والتاج والصحاح (بلد) وتہذیب الالفاظ ۱۰۸ والاصلاح ۱۱۴ وفی النسخ المطبوعۃ النجوم بدل النحور مصحف والتصویب من المراجع [2] وفی مصارع العشاق (۲۵-۷۶) منشاہ لحبابۃ مع تغییر قالتہ حین رثیتہ بعد ہلاکہ متغیرا وروایۃ البیت: الا ان اقلمہ الیوم ان یتبلدا۔ فقد منع المحزون ان یتجلدا۔ والبیت فی اللسان (بلد) فی ارلعۃ منسوبۃ الی الاحوص

بَلَسَتِ النَّاقَةُ یعنی مِبْلَاسٌ آواز نہ کرو ناقہ از غایت خواہش کش اور بَلَاسٌ بمعنی ٹاٹ فارسی پلاس سے معرب ہے۔

(ب ل ع)

بَلَعْتُ (ف) اَلشَّیْءَ وَابْتَلَعْتُهٗ کے معنی کسی چیز کو نگل لینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
يَا اَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَكِ (۱۱-۴۴) کہ اے زمین اپنا پانی نگل جا۔
اسی سے بَلُوْعَةٌ ہے جس کے معنی بدرو اور گندی نالی یا چو بچہ کے ہیں۔ سَعْدُ بَلَعَ ایک ستارہ کا نام
بَلَعَ الشَّیْبُ فِیْ رَاْسِهٖ سر میں بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونا۔

(ب ل غ)

اَلْبُلُوْغُ وَالْبَلَاغُ (ن) کے معنی مقصد اور منتہی کے آخری حد تک پہنچنے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ مقصد کوئی مقام ہو یا زمانہ یا اندازہ کئے ہوئے امور میں سے کوئی امر ہو۔ مگر کبھی محض قریب تک پہنچ جانے پر بھی بولا جاتا ہے گو انتہا تک نہ بھی پہنچا ہو۔ چنانچہ انتہا تک پہنچنے کے معنی میں فرمایا:۔
حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً (۴۶-۱۵)
یہاں تک کہ جب خوب جوان ہوتا ہے اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے۔
فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ (۲-۲۳۲)
اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو ان کو... مت روکو۔
وَمَا هُمْ بِبَالِغِیْهِ (۴۰-۵۶) اور وہ اس کو پہنچنے والے نہیں۔
فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ (۳۷-۱۰۲) جب وہ ان کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا۔

لَعَلِّیْۤ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ (۴۰-۳۶) تاکہ میں (اس پر چڑھ کر) رستوں پر پہنچ جاؤں۔ اور آیت کریمہ:۔
اَمْ لَكُمْ اَیْمَانٌ عَلَیْنَا بَالِغَةٌ (۶۸-۳۹) یا تم نے ہم سے قسمیں لے رکھی ہیں جو... چلی جائیگی۔
یہاں بَالِغَةٌ سے انتہائی مؤکد قسمیں مراد ہیں۔
اَلْبَلَاغُ کے معنی تبلیغ یعنی پہنچا دینے کے ہیں۔ جیسے فرمایا: هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ (۱۴-۵۲) یہ (قرآن) لوگوں کے نام (خدا کا) پیغام ہے۔
بَلٰغٌ فَهَلْ یُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ (۴۶-۳۵) (یہ قرآن) پیغام ہے سو (اب) وہی ہلاک ہوں گے جو نافرمان تھے۔
وَمَا عَلَیْنَاۤ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (۳۶-۱۷) اور ہمارے ذمے تو صاف صاف پہنچا دینا ہے۔
فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ (۱۳-۴۰) تمہارا کام (ہمارے احکام کا) پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے۔
اور بَلَاغٌ کے معنی کافی ہونا بھی آتے ہیں جیسے:۔
اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ (۲۱-۱۰۶) عبادت کرنے والے لوگوں کے لئے اس میں (خدا کے حکموں کی) پوری پوری تبلیغ ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (۵-۶۷)
اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم نے یہ یا کوئی دوسرا حکم جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے نہ پہنچایا تو گویا تم نے وحی الٰہی سے ایک حکم کی بھی تبلیغ نہیں کی یہ اس لئے کہ جس طرح انبیاء کرام کے درجے بلند ہوتے ہیں اسی طرح ان پر احکام کی بھی سختیاں ہوتی ہیں اور وہ عام مومنوں کی طرح نہیں ہوتے جو اچھے

اور برے بلے جلے عمل کرتے ہیں اور انہیں معاف کردیا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔
فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ (۲-۶۵)
پھر جب وہ اپنی میعاد (یعنی انقضائے عدت) کو پہنچ جائیں تو یا توان کو زوجیت میں رہنے دو۔
میں بلوغ اجل سے عدت طلاق کا ختم ہونے کے قریب پہنچ جانا مراد ہے۔کیونکہ عدت ختم ہونے کے بعد تو خاوند کے لئے مراجعت اور روکنا جائز ہی نہیں ہے۔
بَلَغْتُهُ الْخَبَرَ وَاَبْلَغْتُهُ کے ایک ہی معنی ہیں مگر بَلَّغْتُ (تفعیل) زیادہ استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا۔
اُبَلِّغُكُمْ رِسَالَاتِ رَبِّيْ (۷-۶۲) تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچاتا ہوں۔
يَا اَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ (۵-۶۷) اے پیغمبر جوارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچا دو۔
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَا اُرْسِلْتُ بِهٖ اِلَيْكُمْ (۱۱-۵۷) اگر تم روگردانی کروگے تو جو پیغام میرے ہاتھ تمہاری طرف بھیجا گیا ہے وہ میں نے تمہیں پہنچا دیا ہے۔
اور قرآن پاک میں ایک مقام پر:۔
بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ (۳-۴۰) کہ میں تو بوڑھا ہوگیا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔
آیا ہے یعنی بلوغ کی نسبت کِبَر کی طرف کی گئی ہے۔
اور دوسرے مقام پر:۔
وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا (۱۹-۸) اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ گیا ہوں۔
ہے یعنی بلوغ کی نسبت متکلم کی طرف ہے اور یہ اَدْرَكَنِيَ الْجَهْدُ وَاَدْرَكْتُ الْجَهْدَ کے مثل دونوں طرح جائز ہے مگر بَلَغَنِيَ الْمَكَانُ یا اَدْرَكَنِيْ کہنا غلط ہے۔
اَلْبَلَاغَةُ کا لفظ دو طرح بولا جاتا ہے ایک یہ کہ وہ کلام بِذَاتِهٖ بَلِيْغ ہو اور اس کے لئے اوصاف ثلاثہ کا جامع ہونا شرط ہے یعنی وضع لغت کے اعتبار سے درست ہو، معنی مقصود کے مطابق ہو اور فی الواقع سچی بھی ہو اگر ان اوصاف میں کسی ایک وصف میں بھی کمی ہو تو بلاغت میں نقص رہتا ہے۔
دوسرے یہ کہ قائل اور مقول لہ (یعنی متکلم اور مخاطب کے اعتبار سے بلیغ ہو یعنی کہنے والا اپنے مافی الضمیر کو خوبی سے ادا کرے کہ مخاطب کو اس کا قائل ہونا پڑے اور آیت کریمہ:۔ وَقُلْ لَهُمْ فِيْ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا۔ (۴-۶۳) اور ان سے ایسی باتیں کہو جو ان کے دلوں پر اثر کر جائیں۔
میں "قول بلیغ" ان ہر دو معنی پر محمول ہوسکتا ہے اور بعض نے اس کے جو یہ معنی کئے ہیں کہ "ان سے کہہ دو کہ اگر تم نے اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کیا تو قتل کردیے جاؤگے یا یہ کہ انہیں ان پر نازل ہونے والے مصائب سے ڈراؤ" تو یہ اس کے عام مفہوم میں سے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ ہے۔
اَلْبُلْغَةُ اتنی مقدار جس سے گذراوقات ہوسکے۔

(ب ل و ی)

بَلِيَ الثَّوْبُ۔ بِلًى وَبَلَاءً کے معنی کپڑے کا بوسیدہ اور پرانا ہونے کے ہیں اسی سے بَلَاهُ السَّفَرُ اَیْ اَبْلَاهُ۔ کا محاورہ ہے۔یعنی سفر نے اسے لاغر کردیا ہے اور بَلَوْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اسے آزمایا۔گویا کثرت آزمائش سے میں نے اسے کہنہ کردیا اور آیت کریمہ:۔
هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَا اَسْلَفَتْ (۱۰-۳۰)

وہاں ہر شخص (اپنے اعمال کی) جو اس نے آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کرلے گا۔

یہاں ایک قرأت نَبْلُوْا (بصیغہ جمع متکلم) بھی ہے اور معنی یہ ہیں کہ وہاں ہم ہر نفس کے اعمال کی حقیقت کو پہچان لیں گے اور اسی سے اَبْلَیْتُ فُلَانًا کے معنی کسی کا امتحان کرنا بھی آتے ہیں۔ اور غم کو بَلَاءٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جسم کو گھلا کر لاغر کردیتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ (۲-۴۹)
اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی (سخت) آزمائش تھی۔

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ (۲-۱۵۵) الآیۃ۔ اور ہم کسی قدر خوف ...... سے تمہاری آزمائش کریں گے۔

اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِیْنُ (۳۷-۱۰۶)
بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی۔

اور تکلیف کو کئی وجوہ کی بناء پر بَلَاءٌ کہا گیا ہے ایک اس لئے کہ تکالیف بدن پر شاق ہوتی ہیں اس لئے انہیں بَلَاءٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دوم یہ کہ تکلیف بھی ایک طرح سے آزمائش ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِیْنَ مِنْکُمْ وَنَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ (۴۷-۳۱) اور ہم تم لوگوں کو آزمائیں گے تاکہ جو تم میں لڑائی کرنے اور ثابت قدم رہنے والے ہیں ان کو معلوم کریں۔

سوم اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کبھی تو بندوں کو خوش حالی سے آزماتے ہیں کہ شکر گزار بنتے ہیں یا نہیں اور کبھی تنگی کے ذریعہ امتحان فرماتے ہیں کہ ان کے صبر کو جانچیں۔ لہٰذا مصیبت اور نعمت دونوں آزمائش ہیں محنت صبر کا تقاضا کرتی ہے اور منحۃ یعنی فضل وکرم شکر گزاری چاہتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ کماحقہٗ صبر کرنا کماحقہٗ شکر گزاری سے زیادہ آسان ہوتا ہے اس لئے نعمت میں بہ نسبت مشقت کے بڑی آزمائش ہے اسی بنا پر حضرت عمرؓ فرماتے ہیں (۴۳) بُلِیْنَا بِالضَّرَّاءِ فَصَبَرْنَا وَبُلِیْنَا بِالسَّرَّاءِ فَلَمْ نَصْبِرْ کہ تکالیف پر تو صابر رہے لیکن فراخ حالی میں صبر نہ کرسکے اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں:۔

(۴۵) مَنْ وُّسِّعَ عَلَیْهِ دُنْیَاهُ فَلَمْ یَعْلَمْ اَنَّهٗ قَدْ مُکِرَ بِهٖ فَهُوَ مَخْدُوْعٌ عَنْ عَقْلِهٖ۔ کہ جس پر دنیا فراخ کی گئی اور اسے یہ معلوم نہ ہوا کہ آزمائش کی گرفت میں ہے تو فریب خوردہ اور عقل وفکر سے محروم ہے قرآن میں ہے:۔

وَنَبْلُوْکُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَیْرِ فِتْنَةً (۲۱-۳۵)
اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں۔

وَلِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا (۸-۱۷)
اس سے غرض یہ تھی کہ مومنوں کو اپنے (احسانوں) سے اچھی طرح آزمالے۔

اور آیت کریمہ:۔
وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَاءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ (۲-۴۹)
اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی (سخت) آزمائش تھی۔ میں بَلَاءٌ کا لفظ نعمت و مشقت دونوں طرح کی آزمائش کو شامل ہے چنانچہ آیت:۔
یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَاءَکُمْ (۲-۴۹)
(تمہارے بیٹوں کو) تو قتل کرڈالتے تھے اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ میں مشقت کا بیان ہے اور فرعون سے نجات میں نعمت کا تذکرہ ہے اسی طرح آیت:۔
وَاٰتَیْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰیٰتِ مَا فِیْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِیْنٌ (۴۴-۳۳)

اور ان کو ایسی نشانیاں دی تھیں جنہیں صریح آزمائش تھی
ہیں دونوں قسم کی آزمائش مراد ہے جیسا کہ کتاب اللہ
کے متعلق فرمایا:۔
قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاءٌ وَالَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى
(۴۱-۴۴) اِبْتَلٰى فُلَانٌ وَ اَبْلَاهُ (کسی کا امتحان کرنا)
یہ دو امر کو متضمن ہوتا ہے (۱) تو اس شخص کی حالت
کو جانچنا اور اس سے پوری طرح باخبر ہونا مقصود
ہوتا ہے دوسرے (۲) اس کی اچھی یا بری حالت
کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا۔ پھر کبھی تو یہ دونوں
معنی مراد ہوتے ہیں اور کبھی صرف ایک ہی معنی
مقصود ہوتا ہے جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ
کی طرف تو صرف دوسرے معنی مراد
ہوتے ہیں یعنی اس شخص کی خوبی یا نقص کو دوسروں
کے سامنے ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کیونکہ ذات
باری تعالیٰ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ہے اسے کسی کی حالت
سے باخبر ہونے کی ضرورت نہیں لہٰذا آیت کریمہ:۔
وَاِذِ ابْتَلٰى اِبْرٰهِيْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ
(۲-۱۲۴) اور پروردگار نے چند باتوں میں ابراہیم
کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے۔ دوسرے
معنی پر محمول ہوگی (یعنی حضرت ابراہیم کے کمالات
کو دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا مقصود تھا)
اَبْلَيْتُ فُلَانًا يَمِيْنًا کسی سے آزمائشی قسم لینا۔

بَلٰى (حرف)

حرف ایجاب ہے پہلی بات میں[1] نفی کی تردید
کے لئے آتا ہے، جیسا کہ:۔ وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا
النَّارُ کے بعد فرمایا:۔ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً
(۲-۸۱) کیوں نہیں! جو برے کام کرے۔
اور یا اس استفہام کے جواب میں آتا ہے۔ جو
نفی پر واقع ہو جیسے:۔
اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى (۷-۱۷۲) کیا میں تمہارا
پروردگار نہیں ہوں وہ کہنے لگے "کیوں نہیں"۔
نَعَمْ اور بَلٰى میں فرق یہ ہے کہ نَعَمْ صرف استفہام
(یعنی بدون نفی) کے جواب میں آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا قَالُوْا
نَعَمْ (۷-۴۴) بھلا جو وعدہ تمہارے پروردگار
نے تم سے کیا تھا تم نے بھی اسے سچا پایا؟
وہ کہیں گے ہاں۔
یہاں پر بَلٰى کا استعمال صحیح نہیں ہے[2]۔ نیز جب کوئی
شخص مَا عِنْدِيْ شَيْءٌ (کہ میرے پاس کچھ بھی
نہیں) کہے تو اس کے جواب میں اگر "بَلٰى" کہا جائے
تو اس کی تردید ہوگی یعنی غلط کہتے ہو اور اگر نَعَمْ سے
جواب دیں تو آپ نے نفی کا اقرار کر لیا یعنی بیشک
تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ
بَلٰى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔
(۱۶-۲۸) تو مطیع و منقاد ہو جاتے ہیں۔
(اور کہتے ہیں) کہ ہم کوئی برا کام نہیں کرتے تھے
کیوں نہیں! جو کچھ تم کرتے تھے خدا اسے خوب جانتا ہے۔
وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَاْتِيْنَا السَّاعَةُ قُلْ

---

[1] حرف جواب تختص بالنفی وتفید ابطالہ سواء کان مجردًا او مقرونًا بالاستفہام وسواء کان الاستفہام حقیقیا او توبیخیا او تقریریا (راجع المغنی بحث بلی)
[2] ہذا وان کان متفقا علیہ عند العلماء العربیۃ لکن وقع فی کتب الحدیث ما یقتضی انہا یجاب بہا الاستفہام المجرد ففی صحیح البخاری انہ علیہ السلام قال لاصحابہ: اترضون ان تکونوا ربع اہل الجنۃ؟ قالوا بلی او فی صحیح مسلم: أیسرک ان یکونوا لک فی البر سواء؟ قال: بلی: وایضا قال علیہ السلام لرجل: انت الذی لقیتنی بمکۃ فقال بلی۔ لکنہ قلیل (۳) وبذالک قال جماعۃ من الفقہاء لکن فی المسئلۃ خلاف (راجع المغنی ۱: ۱۲۱۔)

بَلٰی وَرَبِّیْ لَتَأْتِیَنَّکُمْ (۳۴-۳) اور کافر کہتے ہیں
کہ (قیامت کی) گھڑی ہم پر نہیں آئے گی۔ کہہ دو
کیوں نہیں (آئے گی) میرے پروردگار کی قسم۔
وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ
يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ
لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا قَالُوا بَلَىٰ (۳۹-۷۱)
تو جہنم کے خازن ان سے کہیں گے کہ کیا تمہارے
پاس تم ہی میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو تمہارے
پروردگار کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے اور اس
دن کے پیش آنے سے ڈراتے وہ کہیں گے
کیوں نہیں۔
قَالُوا أَوَلَمْ تَكُ تَأْتِيكُمْ رُسُلُكُم بِالْبَيِّنَاتِ
قَالُوا بَلَىٰ (۴۰-۵۰) وہ کہیں گے کہ تمہارے پاس
تمہارے پیغمبر نشانیاں لے کر نہیں آئے تھے وہ کہیں
گے کیوں نہیں

(ب ن ن)

اَلْبَنَانُ (واحد بَنَانَةٌ) کے معنی انگلیاں (یا
ان کے اطراف) کے ہیں۔ یہ اَبَنَّ بِالْمَكَانِ کے
محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی جگہ اقامت
پذیر ہونے کے ہیں اور چونکہ کسی جگہ اقامت کیلئے
ضروریات زندگی کی اصلاح بھی انگلیوں سے ہوتی
ہے اس لئے ان کو بَنَان کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے
کہ آیت کریمہ:۔
بَلَىٰ قَادِرِينَ عَلَىٰ أَن نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ (۷۵-۴)
ضرور کریں گے (اور) ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس
کی پور پور درست کر دیں۔
میں انگلیوں کی درستگی پر اپنی قدرت کا اظہار کیا ہے
اسی طرح آیت:۔
وَاضْرِبُوا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ (۸-۱۲) اور ان کا
پور پور مار (کر توڑ) دو۔
میں خاص کر ان کے پور پور کاٹ ڈالنے کا حکم دیا
گیا ہے۔ کیونکہ یہ مدافعت اور مقاتلہ کا واحد ذریعہ
ہیں۔
اَلْبَنَّةُ بو، اچھی یا بری۔ کیونکہ اس میں کسی چیز
کے ساتھ لازم ہونے کی وجہ سے ٹھہرنے کے
معنی پائے جاتے ہیں۔

(ب ن ی)

بَنَيْتُ أَبْنِي بِنَاءً وَبِنْيَةً وَبُنْيًا کے معنی
تعمیر کرنے کے ہیں قرآن میں ہے:۔
وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (۷۸-۲)
اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔
وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ (۵۱-۴۷) اور آسمانوں
کو ہم ہی نے ہاتھوں سے بنایا۔
وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا (۹۱-۵) اور آسمان اور
اس ذات کی (قسم) جس نے اسے بنایا۔
اَلْبُنْيَانُ یہ واحد ہے جمع نہیں ہے جیسا کہ آیات:۔
لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ
(۹-۱۱۰) یہ عمارت جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان
کے دلوں میں (موجب) خلجان رہے گی۔ كَأَنَّهُم
بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (۶۱-۴) کہ گویا سیسہ پلائی ہوئی
دیوار ہیں۔ قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا (۳۷-۹۷)
وہ کہنے لگے کہ اس کے لئے ایک عمارت بناؤ۔
سے معلوم ہوتا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ بُنْيَانَةٌ
کی جمع ہے اور یہ:۔ شَعِيرٌ وَشَعِيرَةٌ۔ تَمْرٌ
وَتَمْرَةٌ وَنَخْلٌ وَنَخْلَةٌ کی طرح ہے (یعنی
جمع اور مفرد میں تاء کے ساتھ فرق کرتے ہیں) اور جمع

کی اس قسم میں تذکیر و تانیث دونوں جائز ہوتے ہیں۔
لَهُمْ غُرَفٌ مِنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَبْنِيَّةٌ (۳۹-۲۰)
ان کے لئے اونچے اونچے محل ہیں جن کے اوپر بالا خانے بنے ہوتے ہیں۔
بِنَاءٌ (مصدر بمعنی مفعول) عمارت ج اَبْنِيَةٌ
اَلْبَنِيَّةُ سے بیت اللہ مراد لیا جاتا ہے[1]
اَلْاِبْنُ۔ یہ اصل میں بَنَوٌ ہے[2] کیونکہ اس کی جمع اَبْنَاءٌ اور تصغیر بُنَيٌّ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَى اِخْوَتِكَ (۱۲-۵)
کہ بیٹا اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا۔
يَا بُنَيَّ اِنِّي اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّي اَذْبَحُكَ (۳۷-۱۰۲)
کہ بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ (گویا) تم کو ذبح کر رہا ہوں۔
يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ (۳۱-۱۳) کہ بیٹا خدا کے ساتھ شرک نہ کرنا۔
يَا بُنَيَّ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ بیٹا شیطان کی عبادت نہ کرنا۔ اور بیٹا بھی چونکہ اپنے باپ کی عمارت ہوتا ہے اس لئے اسے ابن کہا جاتا ہے۔ کیونکہ باپ کو اللہ تعالیٰ نے اس کا بانی بنایا ہے اور بیٹے کی تخلیق میں باپ بمنزلہ معمار کے ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جو دوسرے کے سبب اس کی تربیت، دیکھ بھال اور نگرانی سے حاصل ہو اسے اس کا ابن کہا جاتا ہے۔ نیز جسے کسی چیز سے لگاؤ ہو اسے بھی اس کا ابن کہا جاتا ہے جیسے:۔
فُلَانٌ اِبْنُ حَرْبٍ۔ فلاں جنگ جو ہے۔ اِبْنُ السَّبِيْلِ مسافر۔ اِبْنُ اللَّيْلِ چور۔ اِبْنُ الْعِلْمِ پروردۂ علم۔
شاعر نے کہا ہے[3] ع (طویل)
(۴۶) اُولَاكَ بَنُوْ خَيْرٍ وَشَرٍّ كِلَيْهِمَا
یہ لوگ خیر و شر یعنی ہر حالت میں اچھے ہیں۔
فُلَانٌ اِبْنُ بَطْنِهٖ پیٹ پرست۔ فُلَانٌ اِبْنُ فَرْجِهٖ شہوت پرست۔ اِبْنُ يَوْمِهٖ جو کل کی فکر نہ کرے۔ قرآن میں ہے:۔
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ نِ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ (۹-۳۰)
اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔
اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ (۱۱-۴۵) میرا بیٹا بھی میرے گھر والوں میں ہے۔
اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ (۱۲-۸۱) کہ اب آپ کے صاحبزادے نے (وہاں جا کر) چوری کی۔
اِبْنٌ کی جمع اَبْنَاءٌ اور بَنُوْنَ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً (۱۶-۷۲) اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے
يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ (۱۲-۶۷)
کہ بیٹا ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا۔
يَا بَنِيْ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ

---

[1] يقال: لا ورب هذه البنية (كعبة) وقد كثر قسمهم بها (راجع التاج ب ن ى) [2] هذا وان كان في اصله خلاف لكن رجح في التاج ان اصله بَنَيٌ (محركة) بالياء وقال وانما قضينا انه من الياء لان بنى يبنى اكثر في كلامهم من يبنو [3] قال مسافع بن حذيفة العبسي (كما في شرح التبريزي) وتمامه: جميعًا ومعروف الم ومنكره كذا في الصناعتين ۳۱۴ مع آخر وفي ۸۴ والبيت في الحماسة مع المرزوقي ۷۴۶ في اربعة ابيات والاشباه ۲/۱۲۳ مع اختلاف في بعض الرواية وفي بعض النسخ وابناء معروف بدل جميعًا ومعروف وفي الحيوان (۲: ۸۹) قاله العتبي وفي روايته لكن بدل اولاك والعتبي هو محمد بن عبد الرحمن بن عتبة بن ابي سفيان ومسافع بن حذيفة شاعر فارسي من شعراء الجاهلية (راجع الخزانة ۲: ۲۶۰)۔

(۷-۳۱) اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنے
[ت]میں مزین کیا کرو۔
[یٰ]بَنِیۡۤ اٰدَمَ لَا یَفۡتِنَنَّکُمُ الشَّیۡطٰنُ (۷-۲۷)
[ا]ے بنی آدم (دیکھنا کہیں) شیطان تمہیں بہکا نہ دے۔
[ا]ور اِبۡنٌ کی مؤنث اِبۡنَۃٌ وَ بِنۡتٌ اور ان کی جمع
[ب]نَاتٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
[ہٰ]ٓؤُلَآءِ بَنَاتِیۡ ھُنَّ اَطۡهَرُ لَکُمۡ (۱۱-۷۸)
[ی]ہ (جو) میری (قوم کی) لڑکیاں ہیں تمہارے لئے
[ز]یادہ جائز اور) پاک ہیں۔
[لَ]قَدۡ عَلِمۡتَ مَا لَنَا فِیۡ بَنٰتِکَ مِنۡ حَقٍّ (۱۱-۷۹)
[ت]مہاری (قوم کی) بیٹیوں کی ہمیں کچھ حاجت نہیں۔
[ب]عض کہتے ہیں[1] کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اکابر قوم
[ک]و خطاب کیا تھا اور ان کے سامنے اپنی بیٹیاں
[پ]یش کی تھیں۔ مگر یہ ناممکن سی بات ہے کیونکہ نبی
[ک]ی شان سے بعید ہے کہ وہ اپنی چند لڑکیاں مجمع کثیر
[کے] سامنے پیش کرے اور بعض نے کہا ہے[2] کہ بَنَات
[س]ے ان کی قوم کی عورتیں مراد ہیں اور ان کو بَنَاتِیۡ اس
[ل]ئے کہا ہے کہ ہر نبی اپنی قوم کے لئے بمنزلہ باپ کے
[ہ]وتا ہے بلکہ والدین سے بھی اس کا مرتبہ بڑا ہوتا ہے
جیسا کہ اَبٌ کی تشریح میں گزر چکا ہے اور آیت کریمہ:۔
[وَ]یَجۡعَلُوۡنَ لِلّٰهِ الۡبَنٰتِ (۱۶-۵۷) اور یہ لوگ خدا
[ک]ے لئے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔
[ک]ے معنی یہ ہیں کہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔

(ب ھ ت)

بَهَتَ (س) حیران و ششدر رہ جانا بَهَتَهٗ (ف)
[ا]سے مبہوت کر دیا۔ قرآن میں ہے۔
فَبُهِتَ الَّذِیۡ کَفَرَ (۲-۲۵۸) یہ سن کر کافر حیران
رہ گیا۔ اور آیت کریمہ:۔
هٰذَا بُهۡتَانٌ عَظِيۡمٌ (۲۴-۱۶) یہ تو (بہت) بڑا
بہتان ہے۔ میں بہتان کے معنی ایسے الزام کے ہیں
جسے سن کر انسان ششدر و حیران رہ جائے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَلَا یَاۡتِیۡنَ بِبُهۡتَانٍ یَّفۡتَرِیۡنَهٗ بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِنَّ وَ
اَرۡجُلِهِنَّ (۶۰-۱۲) نہ اپنے ہاتھ پاؤں میں کوئی
بہتان باندھ لائیں گی۔
میں بہتان زنا سے کنایہ ہے۔ بعض نے کہا ہے
نہیں بلکہ اس سے ہر وہ عمل شنیع مراد ہے جسے ہاتھ
اور پاؤں سے سرانجام دیا جائے۔ مثلاً ہاتھ سے کسی
ناروا چیز کو پکڑنا یا کسی عمل شنیع کا ارتکاب کرنے کے
لئے اس کی طرف چل کر جانا۔ جَاءَ بِالۡبُهَيۡتَةِ اس
نے جھوٹ بولا۔

(ب ھ ج)

اَلۡبَهۡجَةُ۔ خوش نمائی۔ فرحت و سرور کا ظہور۔
قرآن میں ہے:۔
حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهۡجَةٍ (۲۷-۶۰) سرسبز باغ۔
بَهُجَ (ک) خوشنما اور تر و تازہ ہونا۔ اور خوشنما چیز
کو بَهِيۡجٌ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔
وَ اَنۡۢبَتۡنَا فِيۡهَا مِنۡ کُلِّ زَوۡجٍۢ بَهِيۡجٍ (۵۰-۷)
اور اس میں ہر طرح کی خوشنما چیزیں اگائیں۔
اور بَهِجٌ بھی صیغہ صفت ہے۔ شاعر نے کہا ہے[3] ع (
(۶۷) ذَاتُ خَلۡقٍ بَهِجٍ
اور اس سے بَهُوۡجٌ بروزن فَعُوۡلٌ استعمال نہیں ہوتا۔
اِبۡتَهَجَ بِکَذَا کسی چیز پر اس قدر خوش اور مسرور ہونا
کہ چہرہ پر خوشی کے آثار ظاہر ہو جائیں۔ اَبۡهَجَهٗ خوش کرنا۔

---

[1] مروی عن قتادۃ (الطبری ۱۲: ۱۹۷) [2] قالہ مجاہد و سعید بن جبیر (الطبری ۱۲: ۱۹۷)

(ب ھ ل)

اَلْبَھْلُ (ف) اس کے اصل معنی کسی چیز کا اس حال میں ہونا ہے کہ اس کی دیکھ بھال نہ کی جائے اسی سے اَلْبَاھِلُ اس اونٹ کو کہتے ہیں جو پایہ بند یا نشان لگائے بغیر آزاد چھوڑ دیا جائے یا وہ اونٹنی جسے تھن باندھے بغیر چھوڑ دیا ہو چنانچہ کسی عورت نے اپنے خاوند سے کہا:۔ اَتَیْتُکَ بَاھِلًا غَیْرَذَاتِ صِرَارٍ کہ تمہیں پوری آزادی ہے جس طرح چاہو لطف اندوزی کرو اور اَلْبَاھِلُ اونٹ کے ساتھ تشبیہ دے کر اَبْھَلْتُ فُلَانًا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی کسی کو اس کی رائے اور ارادہ میں آزاد چھوڑ دینا کے ہیں۔

اَلْبَھْلُ وَالْاِبْتِھَالُ فِی الدُّعَاءِ کھل کر عاجزی سے دعا کرنا قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ نَبْتَھِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ۔ (۳-۶۱) پھر دونوں فریق (خدا سے) دعا والتجا کریں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت بھیجیں۔

جن لوگوں نے یہاں اِبْتِھَال کے معنی لعنت کئے ہیں وہ محض اس بنا پر کئے ہیں کہ یہاں دعا لعنت کے لئے تھے۔ شاعر نے کہا ہے[1] ع (رمل)

(۶۸) نَظَرَ الدَّھْرُ اِلَیْھِمْ فَابْتَھَلْ

یعنی زمانہ ان کی طرف تیزی سے چلا اور انہیں فنا کر دیا[2]

(ب ھ م)

اَلْبُھْمَۃُ کے معنی ٹھوس چٹان کے ہیں اور تشبیہ کے طور پر بہادر آدمی کو بُھْمَۃٌ کہا جاتا ہے نیز ہر وہ حسی یا عقلی چیز جسکا عقل وحواس سے ادراک نہ ہوسکے اسے مُبْھَمٌ کہا جاتا ہے۔

اَبْھَمْتُ کَذَا مبہم کرنا اس کا مطاوع اِسْتَبْھَمَ ہے۔ اَبْھَمْتُ الْبَابَ دروازے کو اس طرح بند کرنا کہ کھل نہ سکے۔

اَلْبَھِیْمَۃُ چوپایہ جانور کیونکہ اس کی صورت مبہم ہوتی ہے۔ مگر عرف میں درند اور پرندہ کے علاوہ باقی جانوروں کو بہیمۃ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

اُحِلَّتْ لَکُمْ بَھِیْمَۃُ الْاَنْعَامِ (۵-۱) تمہارے لئے چار پائے جانور (جو چرنے والے ہیں) حلال کر دیئے گئے ہیں۔

لَیْلٌ بَھِیْمٌ سیاہ رات فَعِیْلٌ بمعنی مُفْعَلٌ ہے۔ اور تاریکی کے باعث اس کا معاملہ بھی چونکہ مبہم ہوتا ہے اس لئے اسے بَھِیْمٌ کہا جاتا ہے یا فَعِیْلٌ بمعنی مُفْعِلٌ ہے چونکہ وہ چیزوں کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے اس لئے اسے بَھِیْمٌ کہا جاتا ہے۔

فَرَسٌ بَھِیْمٌ یک رنگ گھوڑا جس کی اچھی طرح پہچان نہ ہوسکے اسی سے ایک روایت میں ہے:۔[3]

(۱۸) یُحْشَرُ النَّاسُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بُھْمًا کہ قیامت کے دن لوگ ننگے بدن اٹھیں گے بعض نے کہا ہے کہ دنیاوی زیب وزینت اور آرائش سے عاری ہوں گے واللہ اعلم ؎

اَلْبَھْمُ بھیڑ بکری کے بچے۔ واحد بَھْمَۃٌ

اَلْبُھْمٰی ایک قسم کی گھاس جس کے بیوپار ہونے کی وجہ اس کی جڑیں معلوم نہیں ہوسکتیں کہا جاتا ہیں اَبْھَمَتِ الْاَرْضُ زمین میں بُھمٰی گھاس کا بکثرت ہونا۔ جیسا کہ اَعْشَبَتْ وَاَبْقَلَتْ کے معنی گھاس اور سبزی کے بکثرت ہونے کے ہیں۔

---

[1] قال ابو عبیدۃ فی مجازہ (۱: ۹۶) ثم نبتھل ای نلتعن یقال مالہ بھلۃ اللہ یقال علیہ بھلۃ اللہ راجع ایضًا الکشاف والقرطبی ۴/۱۰۵

[2] ہذا عجز بیت للبید وصدرہ فی قروم سادۃ من قومہ نظر دیوانہ ص ۸۰ الطبع لیدن (۱۸۹۱ء) والبیت مما استشہد بہ الطبری فی تفسیرہ (۳ = ۲۹۸) والملی المرتضی (۱: ۵۴) والبحر (۲: ۴۸۰)

[3] وتمام الحدیث حفاۃ عراۃ بھما راجع الفائق (۱/۱۴۰) والنہایۃ واللسان (بہم) ومعنی البھم صحیحۃ الاعضاء کما فی النہایۃ ؎

(ب و ب)

اَلْبَابُ ہر چیز میں داخل ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ دراصل امکنہ جیسے شہر، مکان، گھر وغیرہ میں داخل ہونے کی جگہ کو باب کہتے ہیں۔ اس کی جمع اَبْوَاب ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ قَمِيصَهُ مِنْ دُبُرٍ وَّأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ (۱۲-۲۵) اور دونوں دروازوں کی طرف بھاگے اور عورت نے ان کا کرتہ پیچھے سے پکڑ کر جو کھینچا تو پھاڑ ڈالا۔ اور دونوں کو دروازوں کے پاس عورت کا خاوند مل گیا۔

لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ (۱۲-۶۷) ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ جدا جدا دروازوں سے داخل ہونا۔

اور اسی سے (مجازاً) علم میں بابُ کذا کا محاورہ ہے۔ نیز کہا جاتا ہے هٰذَا الْعِلْمُ بَابٌ إِلَى عِلْمِ كَذَا کہ یعنی یہ علم فلاں علم تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرتؐ نے فرمایا[1] ؛۔ (۴۲)

أَنَا مَدِينَةُ الْعِلْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے[2] (رجز)

(۶۹) أَتَيْتَ الْمُرُوءَةَ مِنْ بَابِهَا

تم نے جوانمردی کو اسی کی جگہ سے حاصل کیا۔

قرآن میں ہے:۔

فَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ (۶-۴۴)

تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔

لَهُ بَابٌ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ (۵۷-۱۳) جس میں ایک دروازہ ہوگا جو اس کی جانب اندرونی ہے اس میں نور رحمت ہے۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اَبْوَابُ جَنَّةٍ اور اَبْوَابُ جہنم سے مراد وہ باتیں ہیں جو ان تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہیں قرآن میں ہے:۔

اُدْخُلُوا أَبْوَابَ جَهَنَّمَ (۳۹-۷۲) کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔

حَتّٰى إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ (۳۹-۷۳) یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے اور اس کے دروازے کھول دیئے جائیں گے۔ تو اس کے داروغہ ان سے کہیں گے کہ تم پر سلام۔

اور جو چیز کسی کام کے لئے صلاحیت رکھتی ہو اس کے متعلق کہا جاتا ہے۔

هٰذَا مِنْ بَابَتِهِ كَذَا۔ کہ یہ اس کے مناسب ہے اس کی جمع بَابَات ہے۔ خلیل کا قول ہے کہ بَابَةٌ کا لفظ حدود (اور حساب میں) استعمال ہوتا ہے[3] بَوَّبْتُ بَابًا۔ میں نے دروازہ بنایا۔

أَبْوَابٌ مُبَوَّبَةٌ بنے ہوئے دروازے قائم کئے ہوئے دروازے۔ اَلْبَوَّابُ دربان تَبَوَّبْتُ بَابًا میں نے دروازہ بنایا۔

بَابٌ اصل میں بَوَبٌ ہے اور اس میں الف واؤ سے مبدل ہے۔

---

[1] مروی عن علیؓ فی الترمذی وابن عباس مرفوعًا فی المستدرک وقال صحیح الاسناد وذکرہ ابن الجوزی فی الموضوعات واوردہ السیوطی فی اللآلی والسنوعب طرقہ وذکر نقود العلماء علی ہذا الحدیث راجع (۱: ۳۲۹ - ۳۳۶) وفی تخریج الاحیاء للعراقی (۲: ۱۹۰) قال ابن حبان لا اصل لہ وقال ابن طاہر موضوع ہذا فی الفتح الکبیر (۱: ۲۷۶) عن (عد طب ک) عن ابن عباس (عد ک) عن جابر وفی الترمذی عن علیؓ انا دار الحکمۃ وعلی بابہا وقال غریب [2] قد مر فی (اتی) [3] قال المتنبی: وبابۃ کل غلام عتی ؏

(ب و ر)

اَلْبَوَارُ (ن) اصل میں بَارَ الشیٔ یبور بُوْرًا وَبَوَارًا کے معنی کسی چیز کے بہت زیادہ مندا پڑنے کے ہیں اور چونکہ کسی چیز کی کساد بازاری اس کے فساد کا باعث ہوتی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کَسَدَ حَتّٰی فَسَدَ اس لئے بَوَار بمعنی ہلاکت استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن میں ہے۔

تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ (۳۵-۲۹) اس تجارت (کے فائدے) کے جو کبھی تباہ نہیں ہوگی۔

وَمَكْرُ اُولٰٓئِكَ هُوَ يَبُوْرُ (۳۵-۱۰) اور ان کا مکر نابود ہو جائیگا۔

ایک روایت میں ہے[1] (۴۳) نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ بَوَارِ الْاَيِّمِ کہ ہم بیوہ کے مندا پن سے پناہ مانگتے ہیں یعنی یہ کہ اس کے لئے کہیں سے پیغام نکاح نہ آئے۔

اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۱۴-۲۸) اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر اتارا۔

رَجُلٌ حَائِرٌ بَائِرٌ مرد سرگشتہ خود رائے۔ جمع کے لئے حُوْرٌ بُوْرٌ کہا جاتا ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًا بُوْرًا (۲۵-۱۸) یہاں تک کہ وہ تیری یاد کو بھول گئے اور یہ ہلاک ہونے والے لوگ تھے۔

میں بُوْرٌ بَائِرٌ کی جمع ہے[2] بعض نے کہا ہے کہ بُوْرٌ مصدر ہے اور واحد و جمع دونوں کی صفت واقع ہوتا ہے جیسے۔ رَجُلٌ بُوْرٌ وَ قَوْمٌ بُوْرٌ شاعر نے کہا ہے[3] ع (خفیف)

(۷۰) يَا رَسُوْلَ الْمَلِيْكِ اِنَّ لِسَانِيْ
رَاتِقٌ مَا فَتَقْتُ اِذْ اَنَا بُوْرٌ

اے اللہ کے رسول جو گناہ میں نے کفر کی حالت میں کئے اب ان سے تائب ہوتا ہوں۔

بَارَ الْفَحْلُ النَّاقَةَ کے اصل معنی نر شتر کا مادہ کو یہ معلوم کرنے کے لئے سونگھنا کہ آیا حاملہ ہے یا نہیں اور استعارۃً کسی چیز کا امتحان کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔ بُرْتُ كَذَا میں نے فلاں چیز کو آزما دیکھا۔

(ب و ء)

اَلْبَوَاءُ۔ کے اصل معنی کسی جگہ کے اجزا کا مساوی (اور سازگار (موافق) ہونے کے ہیں۔ یہ نَبْوَةٌ کی ضد ہے جس کے معنی اجزاء کی ناہمواری

---

[1] انظر للحدیث، للسان (بوسا والنہایۃ ۱/۹۰ وغریب القرآن للقتبی ۱۳۱ والصغیر للطبرانی ۲۱۸ وفیہ تفرد بنف کنز العمال ۲/رقم ۲۲۳۸ عن ابن عباس (ز ن)، و ۳۸۱/۳ عن مجاہد مرفوعا [2] قال تعالیٰ: وکنتم قوماً بورا (الفتح ۱۲) ای ہلکی عن ابن عباس ومجاہد وغیر واحد وقیل فوقًا فاسدین عن قتادۃ (الطبری ۲۶-۵۰) وابن کثیر (۴: ۱۸۹) [3] قالہ عبد اللہ بن الزبعری السہمی القرشی وفی اللسان (بور) الالہ بدل الملیک والبیت من کلمۃ قالہا حین قدم علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم مسلما وکان لہ رباس فی الجزاں قال السہیلی رتقت) ای فی الدین نحل اثم فتق وکل توبۃ رتق۔ اذ انا بور یریدا ذانا کافر ہالک اھ راجع الروض (۲: ۲۷۹) والمؤتلف ۱۴۲ والسمط ۸۴۸-۹۰۳، ۸۳۳ واصلاح المنطق ۱۲۵ والسیرۃ (جوتنجن ۸۲۷) والطبری (۳۰:۱۲/۳۰/۲: ۲۶۶) وتاریخ الطبری (۲: ۳۲۹) فی اربعۃ ابیات وفی (۳: ۱۲۲) والجمہرۃ (۱: ۲۰۵) والقرطبی (۱۳=۱) والطبرسی (۲۶: ۵۸) واللسان والتاج والمقاییس (بور) ومجاز القرآن لابی عبیدۃ (۱: ۴۰ رقم ۳۹۰) والاتباع لابی الطیب ۲۲ والمخصص (۳: ۸۴) والاغانی (۱: ۳۳/۱۷: ۳۰) والامالی (۱: ۱۴۰) والاقتضاب ۱۱ والشریشی (۲: ۳۱۸) وابن خالویہ ۲۳ وغریب القرآن للقتبی ۳۱ وشرح السبع لابن الانباری ۳۸۹، ۵۹ واسد الغابۃ (۳: ۱۶۰) فی ستۃ ابیات ×

(ناسازگاری) کے ہیں۔ لہٰذا مَکَانٌ بَوَاءٌ اس مقام کو کہتے ہیں۔ جو اس جگہ پر اترنے والے کے سازگار اور موافق ہو۔

بَوَّأْتُ لَہٗ مَکَانًا میں نے اس کے لئے جگہ کو ہموار اور درست کیا اور تَبَوَّأْتُ اس کا مطاوع ہے جس کے معنی کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں قرآن میں ہے: وَاَوْحَيْنَا اِلٰى مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا (۱۰-۸۷) اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے لوگوں کے لئے مصر میں گھر بناؤ۔

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ (۱۰-۹۳) اور ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کو عمدہ جگہ دی۔

تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ (۳-۱۲۰) ایمان والوں کو لڑائی کے لئے مورچوں پر (موقع بموقع) متعین کرنے لگے۔

يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ (۱۲-۵۶) وہ اس ملک میں جہاں چاہتے تھے رہتے تھے۔

ایک روایت میں ہے[1] (۴۵) اِنَّهٗ كَانَ عَلَيْهِ السَّلَامُ يَتَبَوَّأُ لِبَوْلِهٖ كَمَا يَتَبَوَّأُ لِمَنْزِلِهٖ کہ آنحضرت پیشاب کرنے کے لئے ہموار اور مناسب جگہ تلاش کرتے جیسے کوئی شخص اقامت کے لئے جگہ تلاش کرتا ہے۔

بَوَّأْتُ الرُّمْحَ میں نے مناسب جگہ پر نیزہ مارا۔ ایک حدیث میں ہے[2]: (۴۶)

مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ جو عمداً مجھ پر جھوٹ لگائے اس کا ٹھکانا جہنم ہے الراعی نے اونٹوں کی صفت میں کہا ہے[3]: ع (۴۷) لَهَا اَمْرُهَا حَتّٰى اِذَا مَا تَبَوَّأَتْ
بِاَخْفَافِهَا مَاْوًى تَبَوَّاَ مَضْجَعًا

یعنی چرواہا اونٹ چھوڑ دیتا ہے یہاں تک کہ جب وہ چرنے کے لئے جگہ ہموار پالیتے ہیں تو وہ اپنی آرام گاہ پر آکر سوجاتا ہے۔

اور تَبَوَّأَ فُلَانٌ (کنایہ) کے معنی نکاح کرنے کے ہیں جیسا کہ بَنٰى بِاَهْلِهٖ وغیرہ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے اور بَوَاءٌ کا لفظ مصاہرت یا قصاص میں برابر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے فُلَانٌ بَوَاءٌ لِفُلَانٍ۔ وہ فلاں کا ہمسر ہے یعنی رشتہ مصاہرت میں اس کا کفو ہے یا قصاص میں اس کے مساوی ہے۔ اور آیت کریمہ: فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (۸-۱۶) کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسی جگہ پر اترا کہ اس کے ساتھ اللہ کا غضب یعنی عقوبت ہے۔ تو یہاں بِغَضَبٍ موضع حال میں ہے جیسے خَرَجَ بِسَيْفِهٖ میں ہے اور مَرَّ بِزَيْدٍ کی طرح مفعول نہیں ہے۔ اور بِغَضَبٍ پر باء لاکر تنبیہ کی ہے کہ موافق جگہ میں

---

[1] رواہ فی (طس۔ عن ابی ہریرۃ) راجع کنز العمال (۵/۱ رقم ۱۹۶) [2] من حدیث ابی ہریرۃ رواہ احمد ۲/۵۰۱ رقم ۱۰۵۲۰ وابن ماجۃ ایضا والحدیث باختلاف الفاظ فی مسلم ۱/۵ والحاکم ۱/۱۰۲-۱۰۳ ومسند احمد رقم ۸۲۴۹ و ۸۷۶۱ و ۹۳۰۵ و ۹۳۲۹ و ۹۷۵۰ و ۱۰۰۳۹ و ۷۳۹-۲/۳۲۱، ۳۶۵، ۴۱۰، ۴۱۳، ۴۶۹، ۵۱۹ والشافعی فی الرسالۃ ۱۰۹۱۔ راجع لتخریجہ ایضا کنز العمال ۵/۳۵ - ۳۵۷ رقم ۳۱۰۰ و ۳۱۱۰ ولا تجد فی غیرہ [3] قالہ الراعی واسمہ عبید بن حصین بن معاویۃ من بنی نمیر یکنی ابا جندل شاعر اسلامی وقبلہ: تخذا بل ان یتبع الزوج مرۃ یدعہا ویخف الصوت حتی تریعا راجع للبیت اللآلی ۵۰ والسمط ۵۰۷ والامالی (۲/۱۳۷) وفی روایۃ لاخفافہا مرعی بدل باخفافہا ماوی وامالی المرتضی (۱/۲۲۲) والفائق (۱/۴۲) فیہ قصۃ الشعبی مع السائل حین سئل عن رجل لطم عین رجل فشرقت بالدم فتمثل البیت فسر بہ مثلا للعین المضروبۃ ای لادیۃ فیہا حتی یذہب ضوئہا

ہونے کے باوجود وہ غضب الٰہی میں گرفتار رہے تو
ناموافق جگہ میں یا الاولیٰ اس پر غضب ہوگا۔ لہٰذا
یہ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ کی مثل ہے اور آیت کریمہ:۔
إِنِّي أُرِيدُ أَنْ تَبُوءَ بِإِثْمِي وَإِثْمِكَ (۵-۲۹)
میں تَبُوءَ بِإِثْمِي کے معنی یہ ہیں کہ تو اس حالت
کے ساتھ ہمیشہ رہے شاعر نے کہا ہے[۱] (طویل)
(۴۲) "أَنْكَرْتُ بَاطِلَهَا وَبُؤْتُ بِحَقِّهَا"
میں نے اس کے باطل کا انکار کیا اور اس کے حق
پر اقرار کیا۔
جن لوگوں نے اس کے معنی اقررت بحقها (یعنی
اس کے حق کا اقرار کیا) کئے ہیں تو یہ تفسیر مقتضی
لفظ کے مطابق نہیں ہے۔ اَلْبَاءَةُ۔ کنایہ از جماع
خلف الاحمر سے منقول ہے کہ حَيَّاكَ اللّٰهُ وَ
بَيَّاكَ اللّٰهُ میں بَيَّاكَ اصل میں بَوَّءَكَ مَنْزِلًا
ہے جیسا کہ اَتَيْتُهُ الْغَدَايَا وَالْعَشَايَا میں ہے
یعنی عشایا کی مناسبت سے غدایا کہا جاتا ہے۔

(ب ی ت)

اَلْبَيْتُ اصل میں بیت کے معنی انسان کے
رات کے ٹھکانہ کے ہیں۔ کیونکہ بَاتَ کا لفظ رات
کو کسی جگہ اقامت کرنے پر بولا جاتا ہے جیسے ظَلَّ
کے معنی دن گزارنے کے ہیں۔ لیکن اس کے بعد یہ
لفظ مطلق مسکن اور مکان کے معنوں میں استعمال
ہونے لگا ہے عام اس سے کہ وہ مٹی یا پتھر سے
بنایا گیا ہو یا اون اور بالوں کا بنا ہوا ہے اس کی جمع
بُيُوْتٌ اور ابیات آتی ہے مگر پہلی جمع مسکن کے
مختص ہے اور دوسری بیت بمعنی شعر کے ساتھ ۔
قرآن میں ہے:۔
فَتِلْكَ بُيُوتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوا (۲۷-۵۲)
یہ ان کے گھر ان کے ظلم کے سبب خالی پڑے ہیں۔
وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً (۱۰-۸۷) اور اپنے
گھروں کو قبلہ (یعنی مسجدیں) ٹھہراؤ۔
لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ (۲۴-۲۷)
دوسروں لوگوں کے گھر میں .... داخل نہ ہوا کرو۔
اور تشبیہ کے طور پر ایک شعر کو بیت کہہ دیتے ہیں۔
اور ہر چیز کے مکان کو (مجازاً) اس کا بیت کہا
جاتا ہے
اور اَهْلُ الْبَيْتِ کا لفظ آل النبی صلی اللہ علیہ وسلم
میں متعارف ہو چکا ہے اور آنحضرت نے (۴۱)
سَلْمَانُ مِنَّا أَهْلَ الْبَيْتِ (سلمان ہمارے اہل
بیت سے ہے) فرما کر تنبیہ کر دیا ہے[۲] کہ غلام کی نسبت
اس کے آقا کی طرف ہوتی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے[۳]
(۴۲) مَوْلَى الْقَوْمِ مِنْهُمْ وَابْنُهُ مِنْ أَنْفُسِهِمْ
کہ کسی قوم کا غلام انہی میں سے ہے اور اس کا لڑکا بھی
ان ہی سے ہے۔
بَيْتُ اللّٰهِ وَالْبَيْتُ الْعَتِيقُ کعبہ قرآن میں ہے:۔
وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ (۲۲-۲۹) اور خانہ
قدیم (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔

---

[۱] قالہ لبید وعجزہ: عندی، ولم یفخر علی کرامہا۔ والبیت فی اللسان والتاج والصحاح (بوء) [۲] الحدیث رواہ الطبرانی فی الکبیر والحاکم فی المستدرک عن عمرو بن عوف الفتح الکبیر ۲/ ۱۵۹ [۳] وفی روایۃ "من انفسہم" راجع لرحم، د، ن، حب، ک، ت عن ابی رافع ح، عن انس، واحمد من حدیث عتبۃ بن غزوان وابی موسٰی والطبرانی من حدیث ابی سعید فتح الباری ۵/ ۱۳۱ وطب۔ عن مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وطب والبیہقی۔ عن ابن عباس والبغوی والباوردی وابن عساکر عن طہمان مولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کنز العمال ۷: ۱۹۲۸، ۱۹۳۰، ۱۹۳۷، ۱۹۴۲، ۱۹۵۱ واما لفظ "وابنہ من انفسہم" فلم اجدلہ فی شیء من المراجع ؛

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ (۳-۹۶)
پہلا بیت جو لوگوں (کے عبادت کرنے) کے لئے مقرر کیا گیا تھا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔
وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ (۲-۱۲۷) اور جب ابراہیم ۔ ۔ ۔ ۔ بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَى (۲-۱۸۹) اور نیکی اس بات میں نہیں ہے کہ (احرام کی حالت میں) گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ۔
ان لوگوں کے متعلق نازل ہوئی ہے جو احرام کے بعد اپنے گھروں میں ان کے دروازوں سے داخل ہونے سے پرہیز کرتے اور اسے احرام کے منافی سمجھتے تھے لہذا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں متنبہ فرمایا کہ اس قسم کی رسوم بِرّ کے منافی ہیں اور آیت کریمہ۔
وَالْمَلٰئِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلَامٌ (۱۳-۲۳-۲۴) اور فرشتے (بہشت کے) ہر ایک دروازے سے ان کے پاس آئیں گے (اور کہیں گے) تم پر سلامتی ہو۔
میں مِنْ كُلِّ بَابٍ سَلَامٌ سے ہر قسم کی مسرتیں مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللّٰهُ أَنْ تُرْفَعَ (۲۴-۳۶) (ان گھروں میں (ہے) جن کے بارے میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ بلند کئے جائیں۔
میں بقول بعض اس سے بیوت نبوی مراد ہیں۔ جیسا کہ آیت:۔
لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ (۳۳-۵۳) پیغمبر کے گھروں میں نہ جایا کرو مگر اس صورت میں کہ تم کو اجازت دی جائے۔
میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ فِي بُيُوتٍ سے آپؐ کے اہل بیت اور قوم مراد ہے۔ اور بعض کے نزدیک قلب یعنی دل کی طرف اشارہ ہے۔ بعض حکماء نے حدیث (۲۴) لَا تَدْخُلُ الْمَلٰئِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ[1] کے تحت لکھا ہے کہ یہاں بیت سے مراد دل اور کالب سے مراد حرص ہے۔ کیوں کہ كَلِبَ فُلَانٌ کے معنی بہت زیادہ حرص کرنے کے ہیں اور کتا حرص میں ضرب المثل ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے فُلَانٌ أَحْرَصُ مِنَ الْكَلْبِ (فلاں کتے سے زیادہ حریص ہے) اور آیت:۔ وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ (۲۲-۲۶) جب ہم نے ابراہیم کے لئے خانہ کعبہ کو مقام مقرر کیا۔
میں مَكَانَ الْبَيْتِ سے مراد مکہ مکرمہ ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ (۶۶-۱۱) اے میرے پروردگار میرے لئے بہشت میں اپنے پاس ایک گھر بنا۔ میں جنت میں گھر بنانے کے معنی یہ ہیں کہ جنت میں داخل ہونا میرے لئے آسان کر دے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَأَوْحَيْنَا إِلَى مُوسَى وَأَخِيهِ أَنْ تَبَوَّآ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتًا وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً (۱۰-۸۷) اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے لوگوں کے لئے

---

[1] متفق علیہ من حدیث ابی طلحۃ زید بن سہل الانصاری وابن ماجۃ من حدیث علیؓ ایضاً فی سنن ابی داؤد والنسائی وزاد ابن حبان رقم ۴۸۴ لکن بزیادۃ لفظ "ولا جنب" وہذہ الزیادۃ وردت بطرق ضعاف عون المعبود ۱/۹۰ ۔

مصر میں گھر بناؤ اور اپنے گھروں کو قبلہ ٹھہراؤ۔
یہں گھروں کو قبلہ ٹھہرانے کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اندر مسجد اقصیٰ کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرتے رہو۔ اور آیت کریمہ:۔
فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (۵۱-۳۶) اور اس میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔
یہں ایک گھر سے ایک خاندان مراد ہے جو ایک گھر میں سکونت پذیر تھے۔ جیسا کہ قریہ بول کر اہل قریہ مراد لیے جاتے ہیں۔
اَلْبَيَاتُ وَالتَّبْيِيْتُ کے معنی رات میں دشمن پر حملہ کرنے یعنی شبخون مارنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَائِمُوْنَ۔ (۷-۹۷) کیا بستیوں کے رہنے والے اس سے بے خوف ہیں کہ ان پر ہمارا عذاب رات کو واقع ہو اور وہ بے خبر سو رہے ہوں۔
بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَائِلُوْنَ (۷-۴) (رات کو) آتا تھا جب کہ وہ سوتے تھے یا (دن کو) جب وہ قیلولہ (یعنی دن کو آرام) کرتے تھے۔
اَلْبَيُّوْتُ وہ معاملہ جس پر رات بھر غور و خوض کیا گیا ہو۔ قرآن میں ہے:۔
بَيَّتَ طَائِفَةٌ مِّنْهُمْ (۴-۸۱) ان میں بعض لوگ رات کو مشورے کرتے ہیں۔
اور بَيَّتَ الْاَمْرَ کے معنی ہیں رات کے وقت کسی کام کی تدبیر کرنا۔ چنانچہ فرمایا:۔
اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ (۴-۱۰۸) حالانکہ جب وہ راتوں کو ایسی باتوں کے مشورے کیا کرتے ہیں جن کو وہ پسند نہیں کرتا۔
اسی طرح ایک روایت میں ہے[1] (۴۸):
لَا صِيَامَ لِمَنْ لَّمْ يُبَيِّتِ الصِّيَامَ مِنَ اللَّيْلِ کہ جو شخص رات سے روزہ کی پختہ نیت نہ کرے اس کا روزہ نہیں ہوگا۔ اور بَاتَ فُلَانٌ يَفْعَلُ كَذَا کے معنی رات بھر کوئی کام کرنا کے ہیں جیسا کہ ظَلَّ کے معنی دن بھر کام کرنا آتے ہیں اور یہ دونوں افعال عادات سے ہیں[2]۔

(ب ی د)

بَادَ (ض) الشَّيْءُ يَبِيْدُ بَيَادًا کے اصل معنی بَيْدَاءُ یعنی بیابان میں کسی چیز کے متفرق اور پراگندہ ہونے کے ہیں اور اسی اعتبار سے کامل تباہی اور بربادی کے متعلق یہ لفظ استعمال ہوتا ہے قرآن میں ہے:۔
مَا اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖ اَبَدًا (۱۸-۳۵) کہ میں نہیں خیال کرتا کہ یہ باغ کبھی تباہ ہو۔
اَلْبَيْدَاءُ کے معنی لق و دق صحرا کے ہیں اس کی جمع بِيْدٌ ہے اور مادہ خر وحشی کو اَتَانٌ بَيْدَانَةٌ کہا جاتا ہے۔

(ب ی ض)

اَلْبَيَاضُ سفیدی۔ یہ سَوَادٌ کی ضد ہے۔ کہا جاتا ہے اِبْيَضَّ، اِبْيِضَاضًا وَّبَيَاضًا فَهُوَ مُبْيَضٌّ۔ قرآن میں ہے:۔
يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ (۳-۱۰۶) جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے منہ سیاہ۔

---

[1] والحديث بلفظ في النسائي عن حفصة راجع تخريج الكشاف ۲۱ والفائق ۱/۳۳۲ رفع رواية لمن لم يبيت واصحاب السنن من حديث حفصة بلفظ لمن لم يجمع وباختلاف الفاظ في (ن) عن حفصة (وقط وهق) عن عائشة وبمعناه في (ص، حم ۱/۳) عن حفصة ([2] في المطبوع ههنا هو جاج والتسديد من المراجع :

وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ (۳-۱۰۷) اور جن کے منہ سفید ہوں گے۔

اور اَبْيَضُ ایک رگ کا نام بھی ہے جو سفید رنگ ہونے کی وجہ سے ابیض کہلاتی ہے۔

اہل عرب کے ہاں چونکہ سفید رنگ تمام رنگوں میں بہتر خیال کیا جاتا تھا جیسے کہا گیا ہے۔ اَلْبَيَاضُ اَفْضَلُ وَالسَّوَادُ اَهْوَلُ وَالْحُمْرَةُ اَجْمَلُ وَالصُّفْرَةُ اَشْكَلُ۔ اس لئے بیاض بول کر فضل و کرم مراد لیا جاتا ہے اور جو شخص ہر قسم کے عیب سے پاک ہو اسے اَبْيَضُ الْوَجْهِ کہا جاتا ہے اس بنا پر آیت مذکورہ میں اِبْيِضَاضُ الْوُجُوْهِ سے مسرت اور اِسْوِدَادُ الوجوہ سے غم مراد ہوگا جیسے دوسری جگہ فرمایا:۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا (۱۶-۵۸) حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خبر ملتی ہے تو اس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے۔

اور جیسے اِبْيَاضُ الْوُجُوْهِ خوشی سے کنایہ ہوتا ہے اسی طرح آیت:۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ (۷۵-۲۲) اس روز بہت سے منہ رونق دار ہوں گے۔ اور آیت:۔ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ (۸۰-۳۸) اور کتنے منہ اس روز چمک رہے ہوں گے خوش اور مسرور نظر آئیں گے۔ میں بھی نَضْرَةٌ اور اِسْفَار سے مراد مسرت ہی ہوگی۔ شاعر نے کہا ہے[1] (منسرح)

(۴۲) اُمُّكَ بَيْضَاءُ مِنْ قُضَاعَةَ

یعنی تم عفیف اور سخی مرد ار ہو۔

اسی معنی میں فرمایا:۔ بَيْضَاءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ (۳۷-۴۶) جو رنگ کی سفید اور پینے والوں کے لئے (سراسر) لذت ہوگی۔

اَلْبَيْضُ یہ بَيْضَةٌ کی جمع ہے اور انڈے کے سفید ہونے کی وجہ سے بَيْضَة کہا جاتا ہے۔ انڈا اسفید اور پروں کے نیچے محفوظ رہتا ہے اس لئے تشبیہ کے طور بَيْضَةٌ بول کر خوبصورت عورت مراد لی جاتی ہے۔[2] بَيْضَةُ الْبَلَدِ یہ لفظ تعریف اور مذمت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ جب کلمہ تعریفی ہو تو اس سے رئیس شہر مراد ہوتا ہے۔

اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے[3]:۔ (کامل)

(۴۳) كَانَتْ قُرَيْشٌ بَيْضَةً فَتَفَلَّقَتْ ... فَالْمُخُّ خَالِصُهٗ لِعَبْدِ مُنَافِ

قریش ایک انڈے کی مثل تھے۔ جو ٹوٹا تو عبد مناف کے حصہ میں خالص مخ آئی۔

---

[1] قالہ ابن قیس الرقیات وتمامہ: ..... فی الہ بیت الذی یستظل فی طنبہ۔ راجع اللسان (بیض) وشرح دیوان زہیر ۲۷۵ و دیوانہ ۹۲ واضداد ابی الطیب ۱۳ بغیر عزو وذکر بعضہم تکملتہ: ... فاتمت لہا الوالدات والنفقہ۔ راجع معانی اللبیہ للقتیبی ۳۴۵ والمرزوقی ۱۵۰ وفیہ یستکن بدل یستظل وص ۱۹۴ عزاہ فی حواشی المرزوقی لابن قیس الرقیات والشد بہ ایضا [2] مثل عند الجرجانی ۱۰۹ والعسکری ۲:۶۲/۱۶۴ والمیدانی ۱: ۸۴،۸۴،۸۷ والکلام علیہ مستوفی فی الاضداد لابن الانباری ۶۴ والسجتانی ۱۱۷ وذکر فی السمط کلا المعنیین ۵۹۴

[3] البیت فی اللسان والتاج والصحاح (مخ) والسیرۃ (۱:۴۹۹) وابن ابی الحدید (۳:۴۵۳) والعینی (۴:۴۰۱) منسوب الی ابن الزبعری وفی اکثر الروایات فالیخ ربالمہاتہ ادفی روایۃ اللسان وحدہا "خالصہا" راجع الامالی للمرتضی (۲:۸) و۲۸۴ ونسبہ الی مطرود بن کعب الخزاعی وفی ۴۵ وذکر قصتہ وتاریخ الطبری (۲:۱۴) فی ترجمۃ ابن عبد مناف واضداد ابن الانباری ۸۷ وابی الطیب ۵۵ والتنبیہ للبکری ۷۵ ومثلہ لحسان بن ثابت (دیوانہ ۴۱ طبع دار صادر) لکن فیہ عبد الدار بدل عبد مناف ۲؛

اور جب مذمت کے لئے استعمال ہو تو اس سے ذلیل آدمی مراد لیا جاتا ہے جیسے جنگل میں پڑے ہوئے انڈے کی طرح ہر ایک توڑ سکتا ہے اور شکل و رنگ میں مشابہت کی وجہ سے خصیتین کو بَیْضَتَا الرَّجُل کہا جاتا ہے۔ بَاضَتِ الدَّجَاجَۃُ مرغی کا انڈے دینا۔ بَاضَ کَذَا کسی جگہ پر متمکن ہونا۔ شاعر نے کہا ہے [۱] ( )

(۴۷) بَدَا مِنْ ذَوَاتِ الضِّغْنِ یَأْوِیْ
صُدُوْرَھُمْ فَعَشَّشَ ثُمَّ بَاضَا

بَاضَ الْحَرُّ گرمی سخت ہونا۔
بَاضَتْ یَدُ الْمَرْأَۃِ عورت کے ہاتھ پر انڈے کی طرح ورم ہونا۔ دَجَاجَۃٌ بَیُوْضٌ انڈے دینے والی مرغی ج بُیُضٌ۔

(ب ی ع)

اَلْبَیْعُ کے معنی بیچنے اور شِرَاءٌ کے معنی خریدنے کے ہیں۔ لیکن یہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں اور یہ قیمت اور مبیع کے لحاظ سے ہوتا ہے اسی معنی میں فرمایا:۔ وَشَرَوْہُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاھِمَ (۱۲-۲۰) اور اس کو تھوڑی سی قیمت یعنی معدودے چند درہموں پر بیچ ڈالا۔
اور علیہ السلام نے فرمایا [۲] (۴۸)
لَا یَبِیْعَنَّ اَحَدُکُمْ عَلٰی بَیْعِ اَخِیْہِ کہ کوئی اپنے بھائی کی خرید پر خرید نہ کرے۔
اَبَعْتُ الشَّیْءَ کسی چیز کو بیع کے لئے پیش کرنا۔ شاعر نے کہا ہے [۳] (کامل)

(۴۹) فَرَسًا فَلَیْسَ جَوَادُنَا بِمُبَاعٍ

یعنی ہم عمدہ گھوڑی فروخت کے لئے پیش نہیں کریں گے۔
اَلْمُبَایَعَۃُ وَالْمُشَارَاۃُ خرید و فروخت کرنا۔
وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (۲-۲۷۵) حالانکہ سودے کو خدا نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام
وَذَرُوا الْبَیْعَ (۶۲-۹) اور (خرید و فروخت ترک کردو)
لَا بَیْعٌ فِیْہِ وَلَا خِلٰلٌ (۱۴-۳۱) جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہوگا نہ دوستی (کام آئے گی)
بَایَعَ السُّلْطَانَ (بادشاہ کی بیعت کرنا) اس قلیل مال کے عوض جو بادشاہ عطا کرتا ہے اس کی اطاعت کا اقرار کرنا۔ اس اقرار کو بَیْعَۃٌ یا مُبَایَعَۃٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔
فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ (۹-۱۱۱) تو جو سودا تم نے اس سے کیا ہے اس سے خوش رہو۔ میں بیعت رضوان کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر کہ آیت:۔
لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ (۴۸-۱۸) (اے پیغمبر) جب مؤمن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا۔ اور آیت کریمہ:۔
اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ اَلْاٰیَۃ (۹-۱۱۱) میں پایا جاتا ہے۔
اَلْبَاعُ (دونوں بازوؤں کے پھیلانے کی مقدار

---

[۱] لم اجدہ فی المراجع ؛

[۲] رواہ مسلم عن ابی ہریرۃ ط، خ، ف، ۷۔ عن ابن عمر وعنہ الصارحم، ق، د، ت، [۳] وادلہ: فرضیت آلا ر الکمیت فمن یبع۔ والبیت فی اللسان (بیع) والاقتضاب ۲۰۸ واصلاح یعقوب ۳۴۳ وحواشی الکالیس (۱: ۲۷) قالہ اجدع بن مالک الہمدانی وفی روایۃ اذ لا ءالکمیت بدل آلا ر الکمیت وراجع ترجمۃ الشاعر الاشتقاق ۱۲۱، ۴۲۵ والمؤتلف ۴۱ ؛

جو تقریباً ۱۰ فٹ ہوتی ہے) یہ مادہ داوی سے ہے کیونکہ بَاعَ فِی السَّیْرِ یَبُوْعُ کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی گھوڑے کے لمبے لمبے قدم رکھنا کے ہیں[1]۔

(ب ی ل)

اَلْبَالُ اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جس کی فکر یا پرواہ کی جائے اور یہ مَا بَالَیْتُ بِکَذَا بَالَۃً کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی پرواہ نہ کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
کَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷-۲) ان سے ان کے گناہ دور کر دیئے اور ان کی حالت سنوار دی۔
فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى (۲۰-۵۱) تو پہلی جماعتوں کا کیا حال[2]
اور انسان کے دل اور دل میں گذرنے والے خیال کو بھی بَالٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔
خَطَرَ کَذَا بِبَالِیْ میرے دل میں یہ بات کھٹکی۔

(ب ی ن)

اَلْبَیْنُ کے معنی دو چیزوں کا درمیان اور وسط کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا (۱۸-۳۲) اور ان کے درمیان کھیتی پیدا کر دی تھی۔
محاورہ ہے بَانَ کَذَا کسی چیز کا الگ ہو جانا اور جو کچھ اس کے تحت پوشیدہ ہو، اس کا ظاہر ہو جانا۔ چونکہ اس میں ظہور اور انفصال کے معنی ملحوظ ہیں اس لئے یہ کبھی ظہور اور کبھی انفصال کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور گہرے کنویں کو بَیُوْنٌ کہا جاتا ہے کیونکہ پانی نیچے اتر جانے کے سبب اس سے پانی نکالتے وقت رسی کو ہاتھ سے جدا کرنا پڑتا ہے تو اس میں انفصال کا معنی ملحوظ ہے۔
بَانَ الصُّبْحُ صبح نمودار ہو گئی اور آیت کریمہ:۔
لَقَدْ تَقَطَّعَ بَيْنَكُمْ (۶-۹۴) آج تمہارے آپس کے سب تعلقات منقطع ہو گئے۔
میں بَیْنٌ کے معنی رشتہ اور تعلق کے ہیں اور معنی یہ ہیں کہ تمہارے اموال قبیلہ اور اعمال جن پر تم اعتماد کرتے تھے سب ضائع ہو گئے جسکی طرف کہ آیت:۔
يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے سکے گا اور نہ بیٹے۔ (۲۶-۸۸)
میں اشارہ پایا جاتا ہے اور یہی معنی آیت:۔
وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى (۶-۹۴) الآیۃ ایسے ہی آج اکیلے اکیلے ہمارے پاس آئے۔ کے ہیں۔
واضح رہے کہ لفظ بَیْنَ کبھی اسم بن کر استعمال ہوتا ہے اور کبھی ظرف چنانچہ آیت مذکورہ میں دو قراء ہیں جو اسے اسم قرار دیتے ہیں وہ بَیْنُکُمْ (بضمہ نون) پڑھتے ہیں اور جن کے نزدیک ظرف ہے وہ بَیْنَکُمْ (بفتح نون) پڑھتے ہیں اور ظرف غیر متمکن ہونے کی بنا پر اسے مفتوح رہنے دیتے ہیں[3]۔ چنانچہ آیات:۔
لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۴۹-۱) (کسی بات کے جواب میں) خدا اور اس کے رسول سے پہلے نہ بول اٹھا کرو۔ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (۵۸-۱۲) تو بات کہنے سے پہلے (مساکین کو) کچھ خیرات دے دیا کرو۔
فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ (۳۸-۲۲) تو آپ ہم میں

---

[1] وایضاً البیعۃ معبد النصاری۔ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ (۲۲-۴۰) [2] وایضاً فما بال النسوۃ التی قطعن ایدیہن (۱۲-۵۰) [3] قراءۃ الرفع منسوب الی حمزۃ الکوفی احد القراء السبعۃ والفتح قراءۃ نافع الکسائی وحفص (راجع اضداد ابی الطیب ۲/۸۳ والبحر المحیط لابی حیان ۴/۱۸۲)

انصاف کا فیصلہ کر دیجئے۔ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ (۴-۹۲) اور اگر مقتول ایسے لوگوں میں سے ہو جن میں اور تم میں صلح کا عہد ہو۔ میں بَيْنَ ظرف واقع ہوا ہے اور آیت:۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا (۱۸-۶۱) جب ان کے ملنے کے مقام پر پہنچے۔

میں بَيْنَ کا لفظ اسم ظرف بھی ہو سکتا ہے اور بمعنی مصدر بھی یعنی جب وہ ان کے الگ ہونے کے مقام پر پہنچے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ بَيْنَ کا لفظ یا تو وہاں استعمال ہوتا ہے۔ جہاں مسافت پائی جائے جیسے بَيْنَ الْبَلَدَيْنِ (دو شہروں کے درمیان) یا جہاں دو یا دو سے زیادہ چیزیں موجود ہوں جیسے بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ بَيْنَ الْقَوْمِ اور واحد کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں بَيْنَ کو مکرر لانا ضروری ہوتا ہے[1]۔ جیسے فرمایا:۔

وَمِنْ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ (۴۱-۵) اور ہمارے اور تمہارے درمیان پردہ ہے۔

فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا (۲۰-۵۸) تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کر لو۔

اور کہا جاتا ہے:۔ هٰذَا الشَّيْءُ بَيْنَ يَدَيْكَ یعنی یہ چیز تیرے قریب اور سامنے ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:۔

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ (۷-۱۷) پھر ان کے آگے۔۔۔ (غرض ہر طرف سے) آؤں گا۔

لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا (۱۹-۶۴) جو کچھ ہمارے آگے ہے اور جو پیچھے۔۔۔ سب اسی کا ہے۔

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا (۳۶-۹) اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنا دی۔ اور ان کے پیچھے بھی۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ (۵-۴۶) جو اپنے سے پہلے کی کتاب تورات کی تصدیق کرتے تھے۔

اَءُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْ بَيْنِنَا (۳۸-۸) کیا ہم سب میں سے اسی پر نصیحت (کی کتاب) اتری ہے اور آیت کریمہ:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ (۳۴-۳۱) اور جو کافر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نہ تو اس قرآن کو مانیں گے اور نہ ان کتابوں کو جو اس سے پہلے کی ہیں۔

میں بَيْنَ يَدَيْهِ سے انجیل اور دیگر کتب سماویہ مراد ہیں اور آیت کریمہ:۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ (۸-۱) خدا سے ڈرو اور آپس میں صلح رکھو۔

کے معنی یہ ہیں کہ صلہ رحمی، قرابت، دوستی وغیرہ باہمی رشتوں کا لحاظ کرو جو باہم تم سب کے درمیان مشترک ہیں اور بَيْنَ کے بعد مَا یا الف[2] کا اضافہ کر کے حین کے معنی میں استعمال کر لیتے ہیں جیسے بَيْنَمَا زَيْدٌ يَفْعَلُ كَذَا وَبَيْنَا نَفْعَلُ یعنی در آنحالیکہ زید یہ کام کر رہا تھا۔ شاعر نے کہا ہے[3] ع (کامل)

(۷۶) بَيْنَا تَعَنُّقِهِ الْكُمَاةَ وَرَوْغِهِ
يَوْمًا اُتِيْحَ لَهٗ جَرِيْءٌ سَلْفَعُ

اس حال میں کہ وہ ایک روز بہادروں سے مقابلہ اور مراوغہ کر رہا تھا کہ اس کے لئے ایک دلیر بہادر مقصد ہو گیا۔

---

[1] واما آیۃ لانفرق بین احد من رسلہ ففیہا القطۂ احد بمعنی الجمیع فلا اعتراض (لودی ار۲) [2] وقیل ہذہ الف الکافۃ وقیل بعض الکافۃ وقیل اشباع وبین مضافۃ الی الجملۃ (المغنی لابن ہشام ار۴۱۱) [3] قالہ (البقیہ صفحہ ۳۷ پر دیکھو)

بَانَ وَاسْتَبَانَ وَتَبَيَّنَ کے معنی ظاہر اور واضح ہو جانے کے ہیں اور بَيَّنْتُهُ کے معنی کسی چیز کو ظاہر اور واضح کر دینے کے۔ قرآن میں ہے۔

وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ (۱۴-۴۵) اور تم پر ظاہر ہو چکا تھا کہ ہم نے ان لوگوں کے ساتھ کس طرح (کا معاملہ) کیا تھا۔

وَقَدْ تَبَيَّنَ لَكُمْ مِنْ مَسَاكِنِهِمْ (۲۹-۳۸) چنانچہ ان کے (ویران) گھر تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ (۶-۵۵) اور اس لئے کہ گنہگاروں کا رستہ ظاہر ہو جائے۔

قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (۲-۲۵۶) ہدایت صاف طور پر ظاہر (اور) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔

قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ (۳-۱۱۸) ہم نے تم کو اپنی آیتیں کھول کھول کر سنا دی ہیں۔

وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ نیز اس لئے کہ بعض باتیں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو تم کو سمجھا دوں (۴۳-۶۳)

أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (۱۶-۴۴) ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دو۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ (۱۶-۳۹) تاکہ جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دے۔

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ (۳-۹۷) اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ (۲-۱۸۵) (روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے۔

اور بیان کرنے والے کے اعتبار سے آیت کو مُبَيِّنَة بھی کہا جاتا ہے جیسے آيَةٌ مُبَيِّنَةٌ و مُبَيِّنَاتٌ و مُبَيَّنَاتٌ۔ اَلْبَيِّنَةُ کے معنی واضح دلیل کے ہیں۔ خواہ وہ دلالت عقلیہ ہو یا محسوسۃ اور شَاهِدَانِ (دو گواہ) کو بھی بَيِّنَة کہا جاتا ہے جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے۔[۴۷]

اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِي وَالْيَمِينُ عَلَى مَنْ أَنْكَرَ کہ مدعی پر گواہ لانا ہے اور مدعا علیہ پر حلف۔

قرآن میں ہے:۔

أَفَمَنْ كَانَ عَلَى بَيِّنَةٍ مِنْ رَبِّهِ (۱۱-۱۷) بھلا جو لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے دلیل (روشن) رکھتے ہیں۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸-۴۲) تاکہ جو مرے بصیرت پر (یعنی یقین جان کر) مرے اور جو جیتا رہے وہ بھی بصیرت پر (یعنی حق پہچان کر) جیتا رہے۔

بقیہ[۱۳۶] ابوذؤیب الحضرمی فی رثاء بنیہ والشطر الاول فی المطبوع مصحف والتسدید من المراجع والبیت فی اللسان والتاج (بین) والمغنی لابن ہشام رقم ۸۶۹ والسیوطی ۹۲، ۲۶۷ وفی روایتہم جمیعًا تعانقہ بدل تعنقہ والبیت فی الخزانۃ (۳: ۱۸۳) والتبریزی شرح الحماسۃ (۴: ۲۹) والمرزوقی ۴۸/۱ واستشہد بہ الاصمعی وکثیر من النحاۃ بان لفظۃ بینا و بینما یأتیان للمفاجاۃ فلا یلزم ان تقع بعدہما اذا و اذ بخلاف ما ذہب الیہ سیبویہ راجع للبحث الکتاب لسیبویہ والبیت ایضًا فی الاشباہ والنحویہ (۱: ۱۷۶) والجمہرۃ ۲۴۷ فی ۲۶ بیتًا و دیوان الہذلیین (۱: ۸) وشرح الدرۃ للخفاجی ۹۷ [۴۷] رواہ الترمذی عن ابن عمرو ولکن لفظہ والیمین علی المدعی علیہ و فی البیہقی و ابن عساکر عن ابن عمرو علی من انکر (راجع الفتح الکبیر ۲/۲۰)

جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ (۷-۱۰۱) ان کے پاس ان کے پیغمبر نشانیاں لے کر آئے۔
اَلْبَيَانُ کے معنی کسی چیز کو واضح کرنے کے ہیں اور یہ نطق سے عام ہے۔ کیونکہ نطق انسان کے ساتھ مختص ہے اور کبھی جس چیز کے ذریعہ بیان کیا جاتا ہے۔ اسے بھی بَيَانٌ کہہ دیتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ "بَيَانٌ" دو قسم پر ہے۔ ایک بیان بِالتَّنْجِيزِ یعنی وہ اشیاء جو اس کے آثار صنعت میں سے کسی حالت پر دال ہوں دوسرے بیان بالاختیار اور یہ یا تو زبان کے ذریعہ ہوگا اور یا بذریعہ کتابت اور اشارہ کے چنانچہ بیان حالت کے متعلق فرمایا۔
وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطَانُ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ۔ (۴۳-۶۲) اور (کہیں) شیطان تم کو (اس سے) روک نہ دے وہ تو تمہا را علانیہ دشمن ہے۔ یعنی اس کا دشمن ہونا اس کی حالت اور آثار سے ظاہر ہے۔ اور بیان بالاختیار کے متعلق فرمایا:۔
فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ (۱۶-۴۳-۴۴) اگر تم نہیں جانتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔ اور ان پیغمبروں (کو) دلیلیں اور کتابیں دے کر بھیجا تھا۔

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (۱۶-۴۴) اور ہم نے تم پر بھی یہ کتاب نازل کی ہے تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کردو۔
اور کلام کو بیان کہا جاتا ہے کیونکہ انسان اس کے ذریعہ اپنے ما فی الضمیر کو ظاہر کرتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
هَٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ (۳-۱۳۸) یہ (قرآن) لوگوں کیلئے بیان صریح ہے۔
اور مجمل مبہم کلام کی تشریح کو بھی بیان کہا جاتا ہے جیسے ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (۷۵-۱۹) پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔
بَيَّنْتُهُ وَأَبَنْتُهُ کسی چیز کی تشریح کرنا۔ جیسے فرمایا:۔
لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ (۱۶-۴۴) تاکہ جو (ارشادات) لوگوں پر نازل ہوئے ہیں وہ ان پر ظاہر کردو۔
نَذِيرٌ مُّبِينٌ (۶۷-۲۶) کھول کر ڈرانے والا ہوں۔
إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْبَلَاءُ الْمُبِينُ (۳۷-۱۰۶) بلا شبہ یہ صریح آزمائش تھی۔
وَلَا يَكَادُ يُبِينُ۔ (۴۳-۵۲) اور صاف گفتگو بھی نہیں کر سکتا۔
وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ۔ (۴۳-۱۸) اور جھگڑے کے وقت بات نہ کر سکے۔

کتابُ التَّاءِ

(ت) (حرف جار)

شروع کلمہ میں قسم کے معنوں میں آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ۔ (۲۱-۵۷) اور خدا کی قسم ..... میں تمہارے بتوں سے ایک چال چلوں گا۔

(۲) فعل مستقبل کے شروع میں مخاطب پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ۔ (۱۰-۹۹) تو کیا تم لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہو۔ نیز صیغہ تانیث ہونا ظاہر کرتا ہے جیسے فرمایا:۔ تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (۴۱-۳۰) ان پر فرشتے اتریں گے۔

(۳) اور آخر کلمہ میں یا تو زائدہ علامت تانیث کے طور پر آتا ہے۔ اور یہ کبھی تو حالت وقف میں ھا بن جاتا ہے۔ جیسے "قَائِمَةٌ" اور کبھی وقف اور وصل دونوں حالتوں میں ثابت رہتا ہے۔ جیسے اُخْتٌ وَبِنْتٌ اور (۲) یا جمع مؤنث سالم کے آخر میں الف کے بعد آتی ہے جیسے مُسْلِمَاتٌ وَمُؤْمِنَاتٌ۔

(۴) فعل ماضی کے آخر میں جب مضموم ہو تو ضمیر متکلم کہلاتی ہے جیسے فرمایا:۔ وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا (۷۴-۱۲) اور جس کو ہم نے مال کثیر دیا۔

اور مفتوح ہونے کی صورت میں ضمیر مذکر مخاطب ہوتی ہے جیسے فرمایا:۔ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (۱-۶) جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا۔

اور مکسور ہو تو واحد مؤنث حاضر کی ضمیر پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا (۱۹-۲۷) یہ تو تم نے برا کام کیا۔

(ت ب ب)

اَلتَّبُّ وَالتَّبَابُ (ض) کے معنی مسلسل خسارہ میں رہنے کے ہیں کہا جاتا ہے تَبًّا لَهٗ (اللہ اسے خائب وخاسر کرے) تَبَّ لَهٗ وَتَبَّبْتُهٗ کسی سے "تَبًّا لَكَ" کہنا۔ قرآن میں ہے۔

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ (۱۱۱-۱) ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں یعنی وہ ہمیشہ خسارے میں رہے۔ یہی مفہوم ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (۲۲-۱۱) میں پایا جاتا ہے۔

وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ (۱۱-۱۰۱) نقصان میں ڈالنے (یعنی تباہ کرنے) کے سوا ان کے حق میں اور کچھ نہ کرسکے۔

وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ۔ (۴۰-۳۷) اور فرعون کی تدبیر تو بیکار تھی۔

(ت ب ت)[1]

اَلتَّابُوْتُ کے معنی صندوق کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ (۲-۲۴۸)

---

[1] والانسب ذکرہ فی (ت و ب) لانہ وزنہ فعلوت لان فاعولا قلیل وغیر معروف فہو اذاً فعلوت من التوب وہو الرجوع ملخصا من الکشاف (۱: ۲۹۳ ج ۱) لکن صاحب اللسان رجح کونہ (ت ب ت) کما ذکرہ المؤلف وقال الصواب ان وزنہ فاعول لان تاءہ اصلیۃ ۱۲

کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ وہ صندوق لکڑی کا تھا جس میں حکمت کی کتابیں تھیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ تابوت سے مراد دل ہے اور اس میں سکینت سے مراد علم ہے اسی لئے دل کو سَفَطُ الْعِلْمِ وَ بَیْتُ الْحِکْمَۃِ وَ تَابُوْتُ الْعِلْمِ وَ صندوقہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے:۔
اِجْعَلْ سِرَّكَ فِیْ وِعَاءٍ غَیْرِ سَرِبٍ۔ کہ اپنے بھید کو ایسے برتن میں رکھو جو ٹپکتا نہ ہو اور دل کا نام تابوت ہونے کی وجہ سے حضرت عمرؓ نے عبد اللہ بن مسعودؓ کے متعلق فرمایا (۷۸)
ھُوَ کُنَیْفٌ مُلِئَ عِلْمًا وہ ایک ایسا برتن ہے جو علم سے پُر ہے۔

ت ب ع

تَبِعَهُ وَاتَّبَعَهُ کے معنی کسی کے نقش قدم پر چلنا کے ہیں یہ کبھی اطاعت اور فرمانبرداری سے ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۲-۳۸) تو جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ غمناک ہونگے۔
قَالَ یَا قَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ اتَّبِعُوْا مَنْ لَا یَسْأَلُکُمْ اَجْرًا (۳۶-۲۰:۲۱) کہنے لگا کہ اے میری قوم پیغمبروں کے پیچھے چلو ایسے کے جو تم سے صلہ نہیں مانگتے اور وہ سیدھے رستے پر ہیں۔ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ (۲۰-۱۲۳) تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ (۷-۳) (لوگو) جو (کتاب) تم پر تمہارے پروردگار کے ہاں سے نازل ہوئی ہے اس کی پیروی کرو۔
وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ (۲۶-۱۱۱) اور تمہارے پیرو تو ذلیل لوگ ہوتے ہیں۔ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ (۱۲-۳۸) اور اپنے باپ دادا ... کے مذہب پر چلتا ہوں
ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰی شَرِیْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۵-۱۸) پھر ہم نے تم کو دین کے کھلے رستے پر (قائم) کر دیا ہے تو اسی (رستے) پر چلے چلو اور نادانوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلنا۔
وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ (۲-۱۰۲) اور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو ... شیاطین پڑھا کرتے تھے۔
وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ (۲-۱۶۸) اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔
وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰی فَیُضِلَّكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ (۳۸-۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں خدا کے رستے سے بھٹکا دے گی۔
هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓی اَنْ تُعَلِّمَنِ (۱۸-۶۶) اگر آپ اس میں سے مجھے سکھائیں تو میں آپکے ساتھ رہوں۔
وَاتَّبِعْ سَبِیْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ (۳۱-۱۵) اور جو شخص میری طرف رجوع لائے اسکے رستے پر چلنا۔
اَتْبَعَهُ کسی کے پیچھے چلنا اور اسے پالینا۔ قرآن میں ہے: فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِیْنَ (۲۶-۶۰) تو انہوں نے سورج نکلتے ہی جا لیا۔
ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا (۱۸-۸۹) پھر اس نے دوسرا رستہ پایا
وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا لَعْنَةً (۲۸-۴۲) اور اس دنیا میں ہم نے ان کے ساتھ لعنت لگا دی۔
فَاَتْبَعَهُ الشَّیْطٰنُ (۷-۱۷۵) اس نے اسے پالیا۔
فَاَتْبَعْنَا بَعْضَهُمْ بَعْضًا (۲۳-۴۴) تو ہم بھی بعض

۱؎ قارن مجاز القرآن لابی عبیدۃ (۲: ۲۰۹) وزاد وموضع تبع الجاہلیۃ موضع الخلیفۃ فی الاسلام وھم ملوک العرب الاعاظم (ایضاً فتح الباری ۸ / ۹ ۴۴)

کو بعض کے پیچھے لگاتے (یعنی ہلاک کرتے) رہے۔
اُتْبِعَتْ عَلَیْہِ (قرض) دوسرے کے حوالہ کرنا۔
دوسرے پر اتارنا۔ احاطہ کرنا۔ اُتْبِعَ فُلَانٌ بِمَالٍ
مال اس پر حوالہ کیا گیا۔
اَلتَّبِیْعُ بچھڑا جو ابھی تک گائے کے پیچھے پیچھے چلتا ہو۔
اَلتُّبَّعُ۔ چارپائے کی ٹانگ۔ گویا دوڑتے وقت اس
کی ٹانگیں اُن لوگوں کی طرح معلوم ہوتی ہیں جو طلب
انتقام میں ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہوتے ہیں۔
اَلْمُتْبِعُ۔ وہ چوپایہ جس کا بچہ اس کے پیچھے پیچھے رہتا ہو۔
تُبَّعٌ۔ رؤسائے یمن کا لقب تھا کیونکہ وہ سیاست
و ریاست میں ایک دوسرے کی اتباع کرتے تھے۔
بعض نے کہا ہے کہ تُبَّعٌ ایک بادشاہ کا لقب
ہے جس کی رعیت اس کی مطیع اور فرمانبردار تھی اس
کی جمع تَبَابِعَۃٌ ہے[1] قرآن میں ہے:۔
اَھُمْ خَیْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ (۴۴-۳۷) بھلا یہ
اچھے ہیں یا تبع کی قوم۔ اَلتُّبَّعُ (ایضًا) سایہ کیونکہ
وہ دھوپ کے پیچھے لگا رہتا ہے۔

(ت ب ر)

اَلتَّبْرُ (ض)، کے معنی توڑ دینے اور ہلاک
کر دینے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ تَبَرَہٗ و تَبَّرَہٗ
اس نے اسے ہلاک کر ڈالا۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا ھُمْ فِیْہِ (۷-۱۳۹) یہ لوگ
جس (شغل) میں (پھنسے ہوئے) ہیں وہ برباد ہونے والا ہے۔
وَکُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِیْرًا (۱۷-۷) اور جس چیز پر غلبہ
پائیں اسے تباہ کر دیں۔
وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ اِلَّا تَبَارًا (۷۱-۲۸) اور
ظالم لوگوں کے لئے اور زیادہ تباہی بڑھا۔

(ت ت ر ی)

تَتْرٰی۔ یہ مُوَاتَرَۃ سے فَعْلٰی کے وزن پر
ہے جس کے معنی کسی چیز کے یکے بعد دیگرے آنے
کے ہیں۔ اصل میں یہ وَتْرٰی واؤ کے ساتھ ہے[2]
تُرَاث اور تُجَاہ کی طرح اس کی واؤ تاء سے تبدیل
ہو گئی ہے[3] جن کے نزدیک یہ منصرف ہے وہ الف
زائدہ بتاتے ہیں[4] اور جن کے نزدیک غیر منصرف
ہے۔ اِن کے نزدیک الف تانیث ہے[5]
قرآن میں ہے:۔
ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا (۲۳-۴۴) پھر
ہم پے در پے اپنے پیغمبر بھیجتے رہے۔
قراء کہتے ہیں کہ رفعی اور جری حالت میں تَتْرٰی
اور نصبی حالت میں تَتْرًا ہے اور الف تنوین
کے عوض میں آیا ہے۔ ثعلب کے نزدیک یہ تَفْعَلُ
کے وزن پر ہے۔ ابوعلی الفسوی کہتے ہیں[6] کہ یہ سراسر
غلط ہے کیونکہ صفت کا کوئی صیغہ تَفْعَلُ کے
وزن پر نہیں آتا۔

(ت ج ر)

تَجَرَ (ن)، تَجْرًا و تِجَارَۃً کے معنی نفع کمانے
کے لئے راس المال کو کاروبار میں لگانے کے ہیں۔
صیغہ صفت تَاجِرٌ و تَجْرٌ جیسے صَاحِبٌ و صَحْبٌ
یاد رہے۔ کہ عربی زبان میں اس کے سوا اور کوئی لفظ

---

[1] ولذا ذکرہ المؤلف ایضًا فی (وتر) [2] ای علی خلاف القیاس ومثلہا فی احد واناۃ والسمار [3] ان کانت للالحاق کما فی ارطی نیون نکرۃ لا معرفۃ وان کانت اصلیۃ ینون وانما [4] وفی شرح الکتاب للسیرافی (۲: ۹) وجعل بعضہم الفہا للتانیث فیقر بغیر تنوین وہی قراءۃ الجمہور وقرا ابن کثیر وابوعمرو بالتنوین فوزنہ فعل والفہ بدل من التنوین وخط المصحف یؤید الانصراف والتنوین [5] والفراء

ایسا نہیں ہے۔ جس میں تاء اصلی کے بعد جیم ہو۔ رہا تجاہ تو اصل میں وجاہ ہے اور تجوب وغیرہ میں تاء اصلی نہیں ہے بلکہ فعل مضارع کی ہے۔ اور آیت کریمہ :۔

هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ (۶۱-۱۰) میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دے۔

میں لفظ تجارۃ کی تفسیر خود قرآن نے بعد کی آیت: تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ الآیہ میں بیان فرمادی ہے۔

نیز فرمایا۔ اِشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ (۲-۱۶) ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی تو نہ ان کی تجارت ہی نے کچھ نفع دیا۔

اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ (۴-۲۹) ہاں اگر آپس کی رضامندی سے تجارت کا لین دین ہو اور اس سے مالی فائدہ حاصل ہو جائے تو وہ جائز ہے)

تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ (۲-۲۸۲) سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو۔

ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ فُلَانٌ تَاجِرٌ بِكَذَا کے معنی ہیں کہ فلاں اس چیز میں ماہر ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا جانتا ہے۔

(ت ح ت)

تَحْتُ (اسم ظرف) یہ فوق کی ضد ہے قرآن میں ہے۔

لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (۵-۶۶) تو ان پر رزق مینہ کی طرح برستا کہ اپنے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۲-۲۵) (نعمت کے) باغ میں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ (۹-۲۴) اس وقت ان کے نیچے کی جانب سے آواز دی۔

تحت اور اسفل میں فرق یہ ہے کہ تحت اس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری کے نیچے ہو مگر اسفل کسی چیز کے نچلا حصہ کو جیسے :۔ اَلْمَالُ تَحْتَهُ (مال اس کے نیچے ہے) اَسْفَلُهُ اَغْلَظُ مِنْ اَعْلَاهُ (اس کا نچلا حصہ اعلیٰ حصہ سے سخت ہے)

حدیث میں ہے[1] (۴۸) لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَظْهَرَ التُّحُوْتُ کہ قیامت قائم نہیں ہوگی۔ تاوقتیکہ کمینے لوگ غلبہ حاصل نہ کرلیں۔ بعض نے کہا ہے کہ حدیث میں آیت کریمہ :۔

وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ (۸۴-۴) اور جب یہ زمین ہموار کردی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے اسے نکال کر باہر ڈال دے گی۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] كلمة من حديث طويل ذكره ابن حبان في زوائده في امارات الساعة انتشار حديث ابي هريرة رقم ۱۸۸۷ والحافظ في الفتح ۱۷/۱۲۱ من الطبراني في الاوسط وايضاً من طريق الى علقمة عن ابي هريرة وعبد الله بن مسعود وراجع الزمخشري في الفائق ۱/۹۹ (تحت) قال وذكره مثلا للارذل ۔

(ت خ ذ)

تَخِذَ (س) بمعنی أَخَذَ یعنی پکڑنے کے آتا ہے شاعر نے کہا ہے[۱] ع (طویل)

(۷۷) وَقَدْ تَخِذَتْ رِجْلِي إِلَى جَنْبِ غَرْزِهَا
نَسِيْفًا كَأُفْحُوصِ الْقَطَاةِ الْمُطَرِّقِ

اس کے رکاب کے پہلو میں انڈا دینے والی قطا کے گڑھے جیسے نشان کو میرے پاؤں چھو رہے تھے۔

اسی سے اِتَّخَذَ (افتعال) ہے۔ قرآن میں ہے:

أَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِي (۱۸-۵۰) کیا تم اس کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا دوست بناتے ہو۔

قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا (۲-۸۰) ان سے پوچھو کیا تم نے خدا سے اقرار لے رکھا ہے۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى (۲-۱۲۵) جس مقام پر ابراہیم کھڑے ہوئے تھے اس کو نماز کی جگہ بنا لو۔

لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ أَوْلِيَاءَ (۶۰-۱) تم میرے اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ۔

لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْرًا (۱۸-۷۷) اگر آپ چاہتے تو ان سے (اس کا) معاوضہ لیتے تاکہ کھانے کا کام چلتا)

(ت ر ب)

اَلتُّرَابُ کے معنی مٹی کے ہیں۔ قرآن میں ہے:

إِنْ خَلَقَكُمْ مِنْ تُرَابٍ (۳۰-۲۰) کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔

يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرَابًا (۷۸-۴۰) کہ اے کاش کہ میں مٹی ہوتا۔

تَرِبَ کے معنی فقیر ہونے کے ہیں کیونکہ فقر بھی انسان کو خاک آلودہ کر دیتا ہے۔ فرمایا:

أَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ (۹۰-۱۶) یا فقیر خاکسار کو یعنی جو بوجہ فقر و فاقہ کے خاک آلودہ رہتا ہے۔

أَتْرَبَ (افعال) کے معنی مال دار ہونے کے ہیں۔ گویا اس کے پاس مٹی کی طرح مال ہے نیز تُرَابٌ کے معنی زمین کے بھی آتے ہیں اور اس میں اَلتَّيْرَابُ[۲] تَيَارِبُ اور اَلتَّوْرَابُ وَالتَّوْرَبُ وَالتَّوْرَابُ وغیرہ دس لغات ہیں[۲]

رِيْحٌ تَرِبَةٌ خاک اڑانے والی ہوا۔ اسی سے آنحضرت کا فرمان ہے[۳] (۵۰) عَلَيْكَ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ کہ شادی کے لئے دیندار عورت تلاش کر۔ تیرے ہاتھ خاک آلود ہوں۔ اس میں تنبیہ ہے کہ دیندار عورت تیرے ہاتھ سے نہ جانے پائے ورنہ تمہارا مقصد حاصل

---

[۱] و غریب ابی عبید ۳/ ۲۱۲ قالہ المرزق العبدی واسمہ شاس بن نہار۔ البیت فی اللسان (طرق) وفی روایتہ لقد بدل دقد راجع ایضًا التاج واللسان (تخذ، فحص، طرق، نسف) والصحاح (طرق) والمحکم (فحص) والاصمعیات ۷۴ والجمہرۃ (۲: ۶۷ ۴۲۳ ۱۱ ۲ ۳/ ۳۲۳: ۹ ۴م) والعینی (۴: ۵۹۰) ومجاز القرآن لابی عبیدۃ (۱: ۴۱۱) والطبری (۱۵: ۱۹۲) وشواہد الکشاف والسیوطی ۳۴۴ و الاشباہ والنحویہ (۱: ۱۰۹/ ۳: ۴۱) والشاعر جاہلی قدیم ترجم لہ فی الشعراء ۲۳۶ والمؤتلف ۱۸۵ والمرزبانی ۴۹۵ والاشتقاق ۱۹۶ والبیت ایضًا فی الحیوان (۵: ۵۸۱) والقطاۃ المطرق التی حان خروج بیضہا والنسیف اثر رکض الرجل بجنبی البعیر اذا فحص عنہ الوبر وفی المطبوع المطوق بالواو بدل الراء تصحیف والبیت یستشہد بہ علی ان تخذ یاتی بمعنی اخذ [۲] راجع المعاجم [۳] راجع للحدیث النہایہ (ترب) واللسان (ترب) وامالی ابی الطیب ۱۲۶ واختلف فی تادیلہ انظر اعراب ابن خالویہ ۹۳ واصل الحدیث متفق من حدیث ابی ہریرۃ راجع تخریج العراقی علی الاحیاء ۲/ ۳۴ ونیل الاوطار للشوکانی ۶/ ۱۱۲-۱۱۳، وشرح الترمذی للشیخ المبارکفوری وادب الدنیا والدین للماوردی ۴۲۷ وفی روایۃ ابی سعید الخدری تربت یمینک کما فی زوائد ابن حبان رقم ۱۲۳۱۔

نہیں ہوگا اور تم غیر شعوری طور پر فقیر ہو جاوگے۔[۱]
بَارِحٌ تَرِبٌ خاک اڑانے والی ہوا۔
تَرَائِبُ سینہ کی پسلیاں (مفرد تَرِیْبَۃٌ) قرآن میں ہے:۔
یَخْرُجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ اَبْکَارًا عُرُبًا اَتْرَابًا۔ (۵۶-۳۷) کنواریاں، اور شوہروں کی پیاریاں اور ہم عمر۔ وَکَوَاعِبَ اَتْرَابًا (۷۸-۳۳) اور ہم عمر نوجوان عورتیں۔
وَعِنْدَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ (۳۸-۵۲) اور ان کے پاس نیچی نگاہ رکھنے والی (اور) ہم عمر (عورتیں) ہوں گی۔ میں اتراب کے معنی ہیں ہم عمر جنہوں اکٹھی تربیت پائی ہوگی گویا وہ عورتیں اپنے خاوندں کے اس طرح مساوی اور مماثل یعنی ہم مزاج ہوں گی جیسے سینوں کی ہڈیوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے اور یا اس لئے کہ گویا زمین پر یک وقت واقع ہوئی ہیں اور بعض نے یہ وجہ بھی بیان کی ہے کہ وہ اکٹھی مٹی میں ایک ساتھ کھیلتی رہی ہیں۔

(ت ر ث)

تُرَاثٌ (ورثہ) یہ اصل میں وِرَاثٌ مثال واوی ہے۔ (جیسا کہ ورث میں بیان ہوگا۔
قرآن میں ہے:۔
وَتَاْکُلُوْنَ التُّرَاثَ اَکْلًا لَّمًّا (۸۹-۱۹) اور میراث کے مال کو سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔

(ت ر ف)

اَلتُّرْفَۃُ۔ عیش و عشرت میں فراخی اور وسعت کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: اُتْرِفَ فُلَانٌ فَھُوَ مُتْرَفٌ وہ آسودہ حال اور کثرت دولت کی وجہ سے بدمست ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَاَتْرَفْنٰھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (۲۳-۳۳) اور دنیا کی زندگی میں ہم نے اس کو آسودگی دے رکھی تھی۔
وَاتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَا اُتْرِفُوْا فِیْهِ (۱۱-۱۱۶) اور جو ظالم تھے وہ ان ہی باتوں کے پیچھے لگے رہے۔ جن میں عیش و آرام تھا۔
وَارْجِعُوْا اِلٰی مَا اُتْرِفْتُمْ فِیْهِ (۲۱-۱۳) اور جن (نعمتوں) میں تم عیش و آسائش کرتے تھے ان کی طرف لوٹ جاؤ۔ اَخَذْنَا مُتْرَفِیْھِمْ بِالْعَذَابِ (۲۳-۶۴) ہم نے ان میں سے آسودہ حال لوگوں کو پکڑ لیا۔ اَمَرْنَا مُتْرَفِیْھَا (۱۷-۱۶) تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو بڑھا دیتے ہیں۔ اور یہاں وہ مترفین ہیں جن کے متعلق دوسری جگہ فرمایا:۔
فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَکْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ (۸۹-۱۵) مگر انسان عجیب مخلوق ہے کہ جب اس کا پروردگار اس کو آزماتا ہے کہ اسے عزت دیتا ہے اور نعمت بخشتا ہے۔

(ت ر ق)

اَلتَّرْقُوَۃُ کے معنی ہنسلی کی ہڈی کے ہیں[۲] (ج)

---

[۱] قال الثعالبی فی الذیل وحمله اکثر العلماء علی التنبیه والاغرار وان کان لفظ الدعاء (علیه) وراجع اضداد ابی الطیب ۱۱۶-۱۱۸ اوالذیل (۵) ومن حمله علی الدعاء علیه قال معناه: ان اخترت غیر ذات الدین وخالفت الوصیة۔ وههنا محل آخر للحدیث وهو ان اترب من الاضداد یاتی بمعنی الفقر وبمعنی الغنی فمعناه والدعاء له بالغنا اذا قبل وصیته ۱۲ [۲] ذکره بعض اصحاب اللغة فی (ر ق ی) والصحیح انه من (ت ر ق) کما هلنا قال فی اللسان (ت ر ق) علی وزن فعلوۃ

اَلتَّرَاقِیْ قرآن میں ہے :-
كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ (۷۵-۲۶) دیکھو جب جان گلے تک پہنچ جائے ۔

(ت ر ك)

تَرْكُ الشَّيْءِ کے معنی کسی چیز کو چھوڑ دینا کے ہیں[1] خواہ وہ چھوڑنا ارادہ و اختیار سے ہو اور خواہ مجبوراً چنانچہ ارادۃً اور اختیار کے ساتھ چھوڑنے کے متعلق فرمایا :-
وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ (۱۸-۹۹) اس روز ہم ان کو چھوڑ دیں گے کہ وہ روئے زمین پر پھیل کر) ایک دوسرے میں گھس جائیں
وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (۴۴-۲۴) اور دریا سے (کہ) خشک (ہو رہا ہوگا) پار ہو جاؤ ۔
اور بحالت مجبوری چھوڑنے کے متعلق فرمایا :-
كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ (۴۴-۲۵) وہ لوگ بہت سے باغ چھوڑ گئے ۔
اسی سے جب کوئی شخص اپنی موت کے بعد مال چھوڑ جاتا ہے تو اس کو تَرِكَة کہا جاتا ہے ۔ اور کبھی ہر عمل کے متعلق جو کسی حالت پر منتہی ہو، تَرَكْتُهُ كَذَا یا اس کے ہم معنی جَعَلْتُهُ کا محاورہ استعمال کر لیتے ہیں جیسے :- تَرَكْتُ فُلَانًا وَحِيْدًا کہ میں نے اسے اس حال میں چھوڑا کہ وہ اکیلا تھا ۔
اَلتَّرِيْكَةُ کے اصل معنی جنگل میں پڑے ہوئے انڈا کے ہیں اور (مجازاً) عورت کے خود کو بھی تَرِيْكَة کہا جاتا ہے ۔ جیسا کہ اس پر بَيْضَة کا لفظ بولا جاتا ہے ۔

(ت س ع)

تِسْعَةٌ (نو) اور تِسْعُوْنَ (نوے) اسماء عدد سے ہیں ۔ قرآن میں ہے :-
تِسْعَةُ رَهْطٍ (۲۷-۴۸) نو شخص ۔ تِسْعٌ وَّ تِسْعُوْنَ نَعْجَةً (۳۸-۲۳) ننانوے دنبیاں ۔
عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ (۷۴-۳۰) اس پر انیس داروغے ہیں ۔ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا (۱۸-۲۵) نو اوپر تین سو سال ۔
اَلتِّسْعُ (ایضاً) نو دن کے پیاسے اونٹ ۔ اَلتُّسْعُ ہر ماہ کی ساتویں، آٹھویں اور نویں تاریخ (ان تین دنوں کو تُسَعٌ کہا جاتا ہے ۔ تَسَعْتُ الْقَوْمَ قوم کے مال سے نواں حصہ وصول کرنا یا ان میں نواں ہونا

(ت ع س)

اَلتَّعْسُ ۔ اصل میں تعس کے معنی پاؤں پھسل کر لغزش کھا کر گرنا اور پھر اٹھ نہ سکنا ۔ پستی میں گر کر کسی چیز کا ٹوٹ جانا[2] اور یہ تَعِسَ (س) تَعْسًا وَتَعْسَةً کا مصدر ہے[3] ۔ قرآن میں ہے :-
فَتَعْسًا لَّهُمْ (۴۷-۸) ان کے لئے ہلاکت ہے[4] ۔

(ت ف ث)

اَلتَّفَثُ کے اصل معنی ناخن وغیرہ کی میل کچیل کے ہیں جسے بدن سے دور کیا جاتا ہے ۔ قرآن میں ہے :-
ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ (۲۲-۲۹) پھر چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں ۔
یہاں لْيَقْضُوْا قَضَى الشَّيْءَ سے ہے جس کے معنی

---

[1] قد یاتی فی معنی البقی کما فی الآیۃ: وترکنا علیہ فی الآخرین (۳۷-۷۸) ای ابقینا الثنا علیہ ۱۲ [2] تعس ۔ [3] الفعل منہ تعس مثل منع کما فی القاموس [3] وتعسا منصوب علی المصدر بفعل یجب اضمارہ (راجع الکشاف) وقال الخفاجی فی الدرۃ ۱۲ [4] یقال فی الدعاء علی العاثر والفعل منہ بکسر العین ۱۲

کسی چیز کو قطع اور زائل کرنے کے ہیں ایک اعرابی کا قول ہے۔ مَا اَتْفَثَكَ وَمَا اَدْرَنَكَ - تو کس قدر میلا کچیلا ہے۔

(ت ق و)

اَلتَّقْوٰی - تقوٰی کی تاء واؤ سے مبدل ہے اس پر اس کے باب (وق ی) میں بحث آئیگی۔

(ت ك ء)

اَلْمُتَّكَاُ (اسم مکان) سہارہ لگانے کی جگہ۔ تکیہ جس پر ٹیک لگائی جائے اور آیت کریمہ:- وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً (۱۲-۳۱) اور ان کے لئے ایک محفل مرتب کی۔ میں مُتَّكَاً کے معنی ترنج کے ہیں[1] اور بعض نے کہا ہے کہ مراد کھانا اور یہ اِتَّكَاَ عَلٰی كَذَا فَاكَلَهٗ کے محاورہ سے مشتق ہے۔ قرآن میں ہے:- هِيَ عَصَايَ اَتَوَكَّاُ عَلَيْهَا (۲۰-۱۸) یہ میری لاٹھی ہے جس پر میں ٹیک لگاتا ہوں۔ مُتَّكِـِٔيْنَ عَلٰی سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ (۵۲-۲۰) تختوں پر جو برابر برابر بچھے ہوئے ہیں تکیہ لگائے ہوئے۔ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ (۳۶-۵۶) تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ مُتَّكِـِٔيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ (۵۶-۱۶) آمنے سامنے تکیہ لگائے ہوئے۔

(ت ل ل)

اَلتَّلُّ - اصل میں تَلٌّ کے معنی بلند جگہ یعنی ٹیلے کے ہیں اور تَلِيْلٌ گردن کو کہتے ہیں اور تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ (۳۷-۱۰۳) کے معنی ٹیلے پر لٹا دینے کے ہیں جیسے تَرَّبَهٗ (کسی کو زمین پر گرانا۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی تَلِيْل یعنی گردن اور رخسار کے بل لٹا دینا ہیں جیسا کہ جبین (پیشانی) کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہے۔ مِتَلٌّ نیزہ وغیرہ جسے مار کر کسی کو پچھاڑا جاتا ہے (سید ھا اور سخت نیزہ)

(ت ل و)

تَلَاهُ (ن) کے معنی کسی کے پیچھے پیچھے اس طرح چلنا کے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی اجنبی کو چیز حائل نہ ہو یہ کہیں تو جسمانی طور ہوتا ہے اور کہیں اس کے احکام کا اتباع کرنے سے اس معنی میں اس کا مصدر تُلُوٌّ اور تُلْوٌ آتا ہے اور کبھی یہ متابعت کسی کتاب کی قراءت (پڑھنے) اور اس کے معانی سمجھنے کے لئے غور و فکر کرنے کی صورت میں ہوتی ہے اس معنی کے لئے اس کا مصدر تِلَاوَةٌ آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:- وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا (۹۱-۲) اور چاند کی قسم جب وہ سورج کا اتباع کرتا ہے۔ میں سورج کا اتباع بلحاظ اقتداء اور مرتبہ مراد ہے اور یہ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ چاند سورج سے روشنی حاصل کرتا ہے اور وہ سورج کے لئے بمنزلہ خلیفہ کے ہے۔ چنانچہ بعض نے کہا ہے کہ آیت کریمہ:- جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا (۱۰-۵) میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ضیاء بنسبت نُوْر کے زیادہ روشن ہوتی ہے۔ اور

---

[1] قال القتبی المتکأ الطعام قال ابو عبیدۃ فی مجازہ (۱: ۳۰۹) وزعم قوم انہ لاترج وھذا ابطل باطل فی الارض فکس ردعلیہ ابو عبید فی غریبہ وقال القتباء اعلم بالتابل منہ قال الشربی تلکن الصحیح ما قال ابو عبیدۃ واخذہ البخاری راجع فتح الباری (۸: ۲۷۰) ۱۲

لفظ ضِیَاء کے اندر نور کا مفہوم تو پایا جاتا ہے
مگر نُوْر کے اندر ضِیَاء کا مفہوم نہیں آتا۔
اور آیت کریمہ:۔ وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ (۱۱-۱۷)
اور ان کے ساتھ ایک (آسمانی) گواہ بھی اس کی
جانب سے ہو۔ کے معنی یہ ہیں کہ ایسا شاہد جو اس
کی پیروی کرتا ہے اور اس کے حکم کے مطابق عمل
کرتا ہے۔ يَتْلُوْنَ آيَاتِ اللهِ (۳-۱۱۳) وہ
آیات الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں۔
اَلتِّلَاوَةُ۔ بالخصوص خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل
شدہ کتابوں کے اتباع کو تِلَاوَةٌ کہا جاتا ہے
کبھی یہ اتباع ان کی قراءت (پڑھنے) کی صورت میں
ہوتی ہے اور کبھی ان کے اوامر و نواہی (احکام)
ترغیب و ترہیب اور جو کچھ ان سے سمجھا جا سکتا
ہے ان کی اتباع کی صورت میں، مگر یہ لفظ قرأت
(پڑھنے) سے خاص ہے یعنی تِلَاوَةٌ کے اندر قراءۃ
کا مفہوم تو پایا جاتا ہے مگر تِلَاوَة کا مفہوم قِرَاءَة
کے اندر نہیں آتا چنانچہ کسی کا خط پڑھنے کے لئے
تَلَوْتُ رُقْعَتَكَ نہیں بولتے بلکہ یہ لفظ صرف
قرآن پاک سے کچھ پڑھنے پر بولا جاتا ہے کیونکہ اس
کے پڑھنے سے اس پر عمل کرنا واجب ہو جاتا ہے
اور آیت کریمہ:۔
هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ (۱۰-۳۰)
وہاں ہر شخص (اپنے) اعمال کی، جو اس نے
آگے بھیجے ہوں گے آزمائش کرلے گا۔ میں ایک
قرأت تَتْلُوْا بھی ہے یعنی وہاں ہر شخص اپنے
عمل نامے کو پڑھ کر اس کے پیچھے چلے گا۔
وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا (۵۴-۲۵) اور ان
کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں۔
أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ
عَلَيْهِمْ (۲۹-۵۱) کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی
نہیں کہ ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو ان کو پڑھ
کر سنائی جاتی ہے۔
قُلْ لَّوْ شَاءَ اللهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ (۱۰-۱۶)
(یہ بھی) کہہ دو کہ اگر خدا چاہتا (تو) میں ہی یہ کتاب
تم کو پڑھ کر نہ سناتا۔
وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيْمَانًا
(۸-۲) اور جب انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی
جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔
یہاں تِلَاوَة بمعنی قرأت کے ہے اور یہی معنی
آیات ذیل میں ہیں۔
وَاتْلُ مَا أُوْحِيَ إِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ (۱۸-۲۷)
اور اپنے پروردگار کی کتاب کو جو تمہارے پاس
بھیجی جاتی ہے پڑھتے رہا کرو۔
وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ ابْنَيْ آدَمَ بِالْحَقِّ (۵-۲۷)
اور (اے محمدؐ) ان کو آدم کے دو بیٹوں (ہابیل
قابیل) کے حالات (جو بالکل سچے ہیں) پڑھ کر سنا دو۔
فَالتَّالِيَاتِ ذِكْرًا (۳۷-۳) پھر ذکر (یعنی قرآن)
پڑھنے والوں کی۔
اور آیت کریمہ:۔ يَتْلُوْنَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ (۲-۱۲۱)
وہ اس کو (ایسا) پڑھتے ہیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا
حق ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسے پڑھ کر سمجھتے اور
اس پر عمل کرتے ہیں اور آیت کریمہ:۔ ذٰلِكَ
نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ
(۳-۵۸) یہ ہم تم کو (خدا کی) آیتیں اور حکمت
بھری نصیحتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔ میں
نَتْلُوْهُ کے معنی نازل کرنا کے ہیں کیونکہ جب
اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی
نازل کرنا ہی ہوتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِيْنُ (۲-۱۰۲) اور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو... شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ میں شیاطین کے پڑھنے کو تلاوت کہنا ان کے اس ادعا کی بنا پر ہے کہ جو کچھ وہ پڑھ کر سناتے وہ کتب الٰہیہ کا حصہ ہے۔

اَلتِّلَاوَۃُ وَالتَّلِیَّۃُ (قرض وغیرہ کا) باقی ماندہ حصہ جسے وصول کرنے کے لئے پیچھا کرنا پڑتا ہے۔

اَتْلَیْتُہٗ کے معنی کسی کے پیچھے لگانے کے ہیں جیسے اَتْلَیْتُ فُلَانًا عَلٰی فُلَانٍ بِحَقٍّ یعنی میں نے اس کا قرضہ فلاں کے حوالہ کر دیا فلان یتلوا علی فلان وَیَقُوْلُ عَلَیْہِ یعنی وہ فلاں پر جھوٹ بولتا اور اس پر غلط بیانی کرتا ہے جیسے فرمایا:۔

وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ (۳-۷۸) اور خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ لَا دَرَیْتَ وَلَا اَتْلَیْتَ اَوْلَاتَلَیْتَ وَلَا دَرَیْتَ تو یہاں پر تَلَیْتَ اصل میں تَلَوْتَ ہے قانون مزاوجت کی وجہ سے تَلَیْتَ کر دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ مَازُوْرَاتٍ غَیْرَ مَاجُوْرَاتٍ میں ہے کہ اصل میں مَوْزُوْرَاتٍ ... ہے یعنی وہ بغیر اجر کے گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے لوٹیں[1]۔

(ت م م)

تَمَامُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کے اس حد تک پہنچ جانے کے ہیں جس کے بعد اسے کسی خارجی شے کی احتیاج باقی نہ رہے اس کی ضد ناقص ہے

یعنی وہ جو اپنی ذات کی تکمیل کے لئے ہنوز خارجی شے کی محتاج ہو اور تمام کا لفظ معدودات کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے اور مقدار وغیرہ پر بھی بولا جاتا ہے مثلاً عَدَدٌ تَامٌّ وَکَیْلٌ تَامٌّ قرآن میں ہے:۔

وَتَمَّتْ کَلِمَۃُ رَبِّکَ (۷-۱۳۷) (۶-۱۱۵) (۱۱-۱۱۹)

اور تمہارے پروردگار کا وعدہ پورا ہوا۔

وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ (۶۱-۸) حالانکہ خدا اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا۔

وَاَتْمَمْنٰھَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّہٖ (۷-۱۴۲) اور دس (راتیں) اور ملا کر اسے پورا (چلہ) کر دیا تو اس کے پروردگار کی ... میعاد پوری ہو گئی[2]۔

(ت و ب)

اَلتَّوْبُ (ن) کے معنی گناہ کے باحسن وجوہ ترک کرنے کے ہیں اور یہ معذرت کی سب سے بہتر صورت ہے کیونکہ اعتذار کی تین ہی صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ عذر کنندہ اپنے جرم کا سرے سے انکار کر دے اور کہہ دے لَمْ اَفْعَلْہُ کہ میں نے کیا ہی نہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے لئے وجہ جواز تلاش کرے اور بہانے تراشنے لگ جائے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اعتراف جرم کے ساتھ آئندہ نہ کرنے کا یقین بھی دلائے افرض اعتذار کی یہ تین ہی صورتیں ہیں اور کوئی چوتھی صورت نہیں ہے اور اس آخری صورت کو توبہ

---

[1] کما فی الاتباع لابی الطیب (۳۰) ثنی الفائق (۱-۲۷) و فی حدیث المنکر فیقول لا دریت ولا تلیت ومعناہ لا قرأت ولا درست قال فی النہایۃ (تلا) والمحدثون یروون کذالک والصواب لا ائتلیت والکلمۃ افتعال من الوت ... وذکرہا من اغلاط الازدواج ایضاً حدیث غیر خزایا ولا ندامی (راجع فتح الباری (۱-۱۴۰) والغدایا والعشایا والانتضاب (۲۷۸) والبحث فی ابن جنی علی تصریف المازنی ۱۱۶-۱۱۷ وشرح الدرۃ للخفاجی ۹۷ و فی الشریشی (۲: ۲۳۱) ان التشدید فی یا رب الشیخی للمزاوجۃ مع الخلی والکلام علی الازدواج - ابن الطیب علی الاقتراح ۱۲۸۷

[2] ایضاً تمام (۷-۱۴۵) والقند (۱۱-۱۴۰) (۲۷-۱۳۰)

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

کہا جاتا ہے مگر شرعًا اسے توبہ جب کہیں گے کہ گناہ
کو گناہ سمجھ کر چھوڑ دے اور اپنی کوتاہی پہ نادم ہو
اور دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔ اگر ان
گناہوں کی تلافی ممکن ہو تو حتی الامکان تلافی کی
کوشش کرے پس توبہ کی یہ چار شرطیں ہیں جن
کے پائے جانے سے توبہ مکمل ہوتی ہے۔

تَابَ اِلَى اللّٰهِ ان باتوں کا تصور کرنا جو انابت الی
اللہ کی مقتضی ہوں۔ قرآن میں ہے:۔

وَتُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا (۲۴-۳۱) سب خدا
کے آگے توبہ کرو۔

اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ (۵-۷۴) توبہ کیوں خدا
کے آگے توبہ نہیں کرتے۔

تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِ اللہ نے اس کی توبہ قبول کی
اسی سے فرمایا:۔

لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ (۹-۱۱۷)
بے شک خدا نے پیغمبر پر مہربانی کی اور مہاجرین پر۔

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا (۹-۱۱۸) پھر خدا
نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ (۲-۱۸۷) سو اس
نے تم پر مہربانی کی اور تمہاری حرکات سے در
گزر فرمائی۔

اَلتَّائِبُ (اسم فاعل) توبہ کرنے والا۔ توبہ قبول
کرنے والا بندہ خدا کے سامنے توبہ کرتا ہے اور اللہ
توبہ قبول فرماتا ہے اس لئے تَائِبٌ کا لفظ اللہ
اور بندے دونوں پر بولا جاتا ہے۔

اَلتَّوَّابُ یہ بھی اللہ تعالیٰ اور بندے دونوں پر
بولا جاتا ہے۔ جب بندے کی صفت ہو تو اس کے
معنی کثرت سے توبہ کرنے والا کے ہوتے ہیں۔
یعنی وہ شخص جو یکے بعد دیگرے گناہ چھوڑتے
چھوڑتے بالکل گناہوں کو ترک کر دے اور جب
تواب کا لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت ہو تو اس کے معنی
ہوں گے وہ ذات جو کثرت سے بار بار بندوں کی
توبہ قبول فرماتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ (۲-۳۷) بیشک
وہ بار بار توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔ اور
آیت کریمہ:۔

وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى
اللّٰهِ مَتَابًا (۲۵-۷۱) کے معنی یہ ہیں کہ گناہ ترک
کر کے عمل صالح کا نام ہی مکمل توبہ ہے۔

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ (۱۳-۳۰) میں
اسی پر بھروسا رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع
کرتا ہوں۔

(ت و ر)

اَلتَّوْرَاةُ آسمانی کتاب جو حضرت موسیٰ علیہ
السلام پر نازل کی گئی یہ وَرْیٌ سے مشتق ہے اور
تاء واؤ سے مبدل ہے علمائے کوفہ کے نزدیک
یہ وَوْرَاةٌ بروزن تَفْعَلَةٌ ہے اور بعض کے
نزدیک تَفْعَلُ کے وزن پر ہے جیسے تَتْفُلُ
لیکن کلام عرب میں تَفْعَلُ کے وزن پر اسم کا
صیغہ نہیں آتا۔

علماء بصرہ کے نزدیک یہ وَوْرَی بروزن فَوْعَلَ
ہے جیسے حَوْقَلَ قرآن میں ہے:۔

اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ
(۵-۴۴) بے شک ہم نے تورات نازل فرمائی
جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ
(۴۸-۲۹) ان کے یہی اوصاف تورات میں (مرقوم)
ہیں اور یہی اوصاف انجیل میں ہیں۔

(ت ا ر ۃ)

تَارَۃ کے معنی ایک مرتبہ کے ہیں قرآن میں ہے:
ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ تَارَۃً اُخْرٰی (۲۰-۵۵) پھر تم دوسری مرتبہ نکالیں گے۔
بقول بعض یہ تَارَ الْجُرْحُ سے مشتق ہے جس کے معنی زخم کا بھر جانا اور مندمل ہو جانا کے ہیں۔

(ت ی ن)

وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ (۹۵-۱) انجیر کی قسم اور زیتون۔ بعض کے نزدیک تین اور زیتون دو پہاڑوں کے نام ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کھانے کی دو چیزیں ہیں ان کے مقام ورود اور اختصاص کی تحقیق اس کتاب کے بعد بیان ہو گی۔

انشاء اللہ تعالیٰ۔

(ت ی ہ)

تَاہَ (ض) کے معنی متحیر ہونے کے ہیں اور یہ باب تَاہَ یَتُوْہُ (واوی) بھی آتا ہے قصہ بنی اسرائیل میں فرمایا:-
اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً یَتِیْھُوْنَ فِی الْاَرْضِ (۵-۲۶) چالیس برس تک ...... اور (جنگل کی) زمین میں سرگرداں پھرتے رہیں گے۔
تَوَّھَہٗ وَتَیَّھَہٗ حیران کرنا اور پھینک دینا۔
وَقَعَ فِی التِّیْہِ وَالتُّوْہِ در طہ حیرت میں پھنس گیا۔
مَفَازَۃٌ تَیْھَاءُ وہ جنگل جس میں مسافر بھٹک جائیں۔

کتاب الثاء

(ث ب ت)

اَلثَّبَاتُ یہ زوال کی ضد ہے اور ثَبَتَ (ن) ثَبَاتًا کے معنی ایک حالت پر جمے رہنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا (۸-۴۵) مومنو جب (کفار کی) کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو۔
رَجُلٌ ثَبْتٌ وَثَبِیْتٌ فِی الْحَرْبِ لڑائی میں ثابت قدم رہنے والا مرد۔ اَثْبَتَ السَّھْمَ فِیْہِ اس میں تیر آر پار کر دیا۔ اور ثَابِتٌ کا لفظ اس پر بھی بولا جاتا ہے جو نظروں کے سامنے موجود ہو اور اس پر بھی جو کسی دلیل سمعی کی رو سے صحیح ہو مثلاً:۔
فُلَانٌ ثَابِتٌ عِنْدِیْ فلاں حکم میرے نزدیک دلیل کی رو سے صحیح ہے۔ نُبُوَّةُ النَّبِیِّ (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ) ثَابِتَةٌ آنحضرت کی نبوت ثابت ہے یعنی از روئے دلائل صحیح ہے۔
اَلْاِثْبَاتُ وَالتَّثْبِیْتُ (افعال وتفعیل) کے معنی کبھی تو کسی چیز کو فی الواقع موجود کرنے کے ہوتے ہیں مثلاً اَثْبَتَ اللہُ کَذَا (اللہ تعالیٰ نے فلاں چیز کو موجود کر دیا) اور کبھی ثبوت حکمی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اَثْبَتَ الْحَاکِمُ عَلٰی کَذَا (قاضی نے فلاں پر یہ حکم لگایا) اور کبھی اثبات باعتبار قول مراد ہوتا ہے۔ خواہ وہ بات نفس الامر میں حق ہو یا باطل جیسے:۔
اَثْبَتَ التَّوْحِیْدَ وَصِدْقَ النُّبُوَّةِ اس نے توحید اور صدق نبوت کو دلائل سے ثابت کیا۔
فُلَانٌ اَثْبَتَ مَعَ اللہِ اِلٰھًا اٰخَرَ فلاں نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود ثابت کیا اور آیت کریمہ:۔
لِیُثْبِتُوْكَ اَوْ یَقْتُلُوْكَ (۸-۳۰) تاکہ تم کو قید کر دیں یا جان سے مار ڈالیں۔
میں لِیُثْبِتُوْا کے معنی قید کرنے یا ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
یُثَبِّتُ اللہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (۱۴-۲۷) خدا مومنوں (کے دلوں) کو (صحیح اور پکی) بات سے دنیا کی زندگی میں بھی مضبوط رکھتا ہے۔
میں "قول ثابت" سے دلائل قویہ مراد ہیں اور آیت:۔
وَلَوْ اَنَّھُمْ فَعَلُوْا مَا یُوْعَظُوْنَ بِہٖ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِیْتًا (۴-۶۶) اور اگر یہ اس نصیحت پر کاربند ہوتے جو ان کو کی جاتی ہے تو ان کے حق میں بہتر اور (دین میں) زیادہ ثابت قدمی کا موجب ہوتا۔
میں اَشَدَّ تَثْبِیْتًا کے معنی علم وایمان کے لحاظ سے مضبوطی بھی مراد ہو سکتی ہے[1] اور اعمال کی پائیداری اور ان کا ثمرہ حاصل کرنے کے لحاظ سے بھی تثبیت مراد ہو سکتی ہے۔ یعنی یہ ان لوگوں کی طرح نہیں ہوں گے جن کے اعمال کی ناپائیداری بیان کرتے ہوئے قرآن نے کہا ہے:۔
وَقَدِمْنَآ اِلٰی مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰہُ ھَبَآءً مَّنْثُوْرًا (۲۵-۲۳) اور جو انہوں نے عمل کئے ہوں گے

---

[1] کما قال السدی راجع ابن کثیر (۱: ۵۲۲)

ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک کر دینگے۔

محاورہ ہے:۔ ثَبَّتُّہٗ۔ میں نے اسے استحکام بخشا، ثابت قدم رکھا۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ ...(۱۷-۷۴) اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رہنے دیتے۔

فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۸-۱۲) تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔

وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ (۲-۲۶۵) اور خلوص نیت سے۔[1]

وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا (۳-۱۴۷) اور ہم کو ثابت قدم رکھ۔

(ث ب ر)

اَلثُّبُوْرُ (مصدر ن) کے معنی ہلاک ہونے یا زخم کے خراب ہونے کے ہیں اور اَلْمُثَابِرُ کسی کام کو مسلسل کرنے والا) ثَابَرَ عَلَی الْاَمْرِ سے (اسم فاعل کا صیغہ) ہے۔ جس کے معنی کسی کام کو مسلسل کرنا کے ہیں قرآن میں ہے:۔

دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۝ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا (۲۵-۱۳-۱۴) تو وہاں ہلاکت کو پکاریں گے آج ایک ہی ہلاکت کو نہ پکارو، بہت سی ہلاکتوں کو پکارو۔

اور آیت کریمہ:۔

وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا (۱۷-۱۰۲) اے فرعون میں خیال کرتا ہوں کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے۔

میں ابن عباسؓ نے مَثْبُوْرًا کے معنی ناقص العقل کئے ہیں کیونکہ نقصانِ عقل سب سے بڑی ہلاکت ہے۔

ثَبِیْرٌ۔ مکہ کی ایک پہاڑی کا نام

(ث ب ط)

ثَبَّطَهُ الْمَرَضُ وَاَثْبَطَهٗ: اسے مرض نے روک دیا اور اسے لازم ہوگئی قرآن میں ہے:۔

فَثَبَّطَهُمْ (۹-۴۶) تو ان کو ہلنے چلنے نہ دیا۔

(ث ب ی (و)

ثُبَةٌ کے معنی ایک جماعت کے ہیں اس کی جمع ثُبَاتٌ وَ ثُبِیْنَ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا (۴-۷۱) پھر یا تو جماعت جماعت ہو کر نکلا کرو یا سب اکٹھے کوچ کیا کرو۔

شاعر نے کہا ہے[2] (الوافر)

(۷۸) وَقَدْ اَغْدُوْ عَلٰی ثُبَةٍ کِرَامِ

اور میں شریف لوگوں کی جماعت کے پاس جاتا ہوں اور اسی لیے ثَبَّيْتُ عَلٰی فُلَانٍ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی کے متفرق محاسن بیان کرنے کے ہیں۔

ثُبَةٌ کی تصغیر ثُبَيَّةٌ ہے لہٰذا اس میں یاء محذوف ہے۔[3] لیکن ثُبَةُ الْحَوْضِ جس کے معنی وسطِ حوض ہیں جہاں پانی جمع ہوتا ہے یہ اجوف سے ہے اور اس میں عین کلمہ محذوف ہے۔[4]

(ث ج ج)

ثَجَّ (ن) ثُجُوْجًا۔ اَلْمَاءُ پانی کا زور سے بہنا

---

[1] ای مقرین بانہما یثیب اللہ علیہا (الزجاج) [2] زہیرہ تمامہ بنشاوی واجدین لما نشلو۔ راجع دیوانہ مع شرح الاعلم الشنتمری ۱۵۸ طبعہ لیدن، والعقد الثمین ۷۷ والطبری (۵ / ۱۶۴) واللسان بلشو، مجاز القرآن رقم ۱۵۶ ومختار الشعر الجاہلی ۲۵ (علیہ) وابن الانباری ۴۰۰ ومجموعۃ المعانی ۱۹۸ ومعاہد التنصیص (۱ / ۳۰۵) وفی روایۃ علی شرب بدل ثبۃ فلا شاہد [3] والمختار عند المحققین انہ ثبۃ من الواو واصلہا ثبوۃ وبہ قال ابن جنی والمؤلف انہ من الیاء [4] ذہب الجوہری وبعض علماء اللغۃ انہا من ثبۃ الحوض والذاہبۃ الواو من وسطہ وبہ قال ابو اسحاق بدلیل ثویبۃ لکن الاکثر علی النقض ۱۲

یا برسنا محاورہ ہے:۔ اَتَی الْوَادِیْ بِثَجِیْجِہٖ زبردست سیلاب آنا۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا (۷۸-۱۴)

اور نچڑتے بادلوں سے موسلادھار مینہ برسایا۔

حدیث میں ہے[1]:۔ (ن ۵)

اَفْضَلُ الْحَجِّ الْعَجُّ وَالثَّجُّ یعنی افضل حج وہ ہے جس میں زور زور سے لبیک پکارا جائے اور کثرت سے قربانی کا خون بہایا جائے۔

(ث خ ن)

ثَخُنَ (ک) الشَّیْءُ کے معنی ہیں کسی چیز کا گاڑھا ہو جانا اس طرح کہ بہنے سے رک جائے اسی سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

اَثْخَنْتُہٗ ضَرْبًا وَاسْتِخْفَافًا میں نے اسے اتنا پیٹا کہ وہ اپنے مقام سے حرکت نہ کر سکا قرآن میں ہے۔

مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ (۸-۶۷) پیغمبر کو شایاں نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی رہیں جب تک (کافروں کو قتل کر کے) زمین میں کثرت سے خون (نہ) بہا دے۔

حَتّٰی اِذَا اَثْخَنْتُمُوْھُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (۴۷-۴) جب ان کو خوب قتل کر چکو تو (جو زندہ پکڑے جائیں ان کو) مضبوطی سے قید کر لو۔

(ث ر ب)

اَلتَّثْرِیْبُ (تفعیل) کے معنی ہیں کسی کو اس کی غلطی پر سرزنش اور زجر و توبیخ کرنا قرآن میں ہے:

لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ (۱۲-۹۲) یوسف نے کہا کہ آج کے دن (سے) تم پر کچھ عتاب (و ملامت) نہیں ہے۔

ایک روایت میں ہے[2]:۔ (ن ۵)

اِذَا زَنَتْ اَمَۃُ اَحَدِکُمْ فَلْیَجْلِدْھَا وَلَا یُثَرِّبْھَا۔ کہ جب کوئی لونڈی زنا کرے تو اسے کوڑے لگائے اور صرف ملامت پر اکتفا نہ کرے۔

اور عربی زبان میں اس سے صرف ثَرْبٌ کا لفظ معروف ہے جس کے معنی باریک اور پتلی سی چربی کے ہیں (جو انتڑیوں کے ساتھ ہوتی ہے) اور آیت کریمہ:۔

یَا اَھْلَ یَثْرِبَ (۳۳-۱۳) اے اہل مدینہ۔

میں ہو سکتا ہے کہ یَثْرِبَ اسی مادہ سے ہو اور اس میں یا زائدہ ہو[3]۔

(ث ع ب)

ثَعَبَ (ف) ثَعْبًا۔ الْمَاءَ کے معنی ہیں اس نے پانی بہایا فَانْثَعَبَ اس کا مطاوع ہے جس کے معنی ہیں چنانچہ وہ بہ نکلا۔ اسی سے ثُعُبُ الْمَطَرِ ہے (جس کے معنی بارش کا بہتا ہوا پانی یا برساتی نالہ کے ہیں) اور ہو سکتا ہے کہ آیت کریمہ:۔

فَاِذَا ھِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ (۲۶-۳۲) تو وہ اسی وقت صریح اژدہا بن گئی۔

میں ثُعْبَانٌ (اژدہا) بھی ثَعَبْتُ الْمَاءَ کے محاورہ سے ماخوذ ہو سانپ بھی چونکہ زمین پر اس طرح چلتا

---

[1] الترمذی والنسائی من حدیث عمرو ابن ماجۃ من حدیث محمد بن المنکدر عن جابر کرحق عن ابی بکر۔ ع۔ عن ابن مسعود راجع کنز العمال ۵ رقم وراجع لشرحہ غریب ابی عبید ۳/۱۴۰ [2] اصل الحدیث متفق علیہ رواہ احمد وابوداؤد من حدیث ابی ہریرۃ ولفظ الحدیث کما فی المراجع اذا زنت امۃ احدکم فتبین زنا ہا فلیجلدھا الحد ولایثرب علیہا وفی روایۃ النسائی ولایعنفہا" [3] وفی الحدیث ان المنافق یؤخر العصر حتی اذا صارت الشمس کثرب البقرۃ صلاہا [4] اسم قدیم للمدینۃ باسم اول من سکنہا من ولد سام بن نوح وقد نہی النبی ان یقال لہا یثرب وسماہا طیبۃ وطابۃ لان فی مادۃ ثرب معنی الفساد ۱۲

ہے۔ جیسے پانی بہ رہا ہوتا ہے اسلئے اسے ثعلب کہا گیا ہو۔ ثُعْبَۃٌ خبیث قسم کا گرگٹ ج ثُعَبٌ یہ بھی چونکہ شکل وصورت میں سانپ کے مشابہ ہوتا ہے اس لئے اسے ثُعْبَۃٌ کہا جاتا ہے اور جسم میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے اس کے لفظ میں اختصار کر لیا گیا ہے۔

(ث ق ب)

اَلثَّاقِبُ اتنا روشن کہ جس چیز پر اس کی کرنیں پڑیں اس میں چھید کرتی پار گزر جائیں۔ قرآن میں ہے:۔ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۳۷-۱۰) تو جلتا ہوا انگارہ ان کے پیچھے لگتا ہے۔

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الطَّارِقُ النَّجْمُ الثَّاقِبُ (۸۶-۱،۲،۳) آسمان اور رات کے وقت آنے والے کی قسم، اور تم کو کیا معلوم کہ رات کے وقت آنے والا کیا ہے؟ وہ تارا ہے چمکنے والا۔ اَلثَّاقِبُ اصل میں ثُقْبَۃٌ سے ہے جس کے معنی سوراخ کے ہیں۔ اَلْمِثْقَبُ پہاڑ میں سخت اور دشوار گزار راستہ گویا وہ سوراخ کی مثل ہے۔ ابوعمرو کا قول ہے کہ صحیح لغت مَثْقَبٌ (بفتح المیم) ہے[1] محاورہ ہے ثَقَّبْتُ النَّارَ میں نے آگ بھڑکائی۔

(ث ق ف)

اَلثَّقْفُ (س ک) کے معنی ہیں کسی چیز کے پالینے یا کسی کام کے کرنے میں حذاقت اور مہارت سے کام لینا۔ اسی سے اَلْمُثَاقَفَۃُ کا لفظ مستعار ہے۔ (جس کے معنی ہتھیاروں کے ساتھ باہم کھیلنے کے ہیں اور سیدھے نیزے کو رُمْحٌ مُثَقَّفٌ کہا جاتا ہے۔

اور اَلثِّقَافُ اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے نیزوں کو سیدھا کیا جاتا ہے۔

ثَقِفْتُ کَذَا کے اصل معنی مہارت نظر سے کسی چیز کا نگاہ سے ادراک کر لینا کے ہیں۔ پھر مجازاً محض کسی چیز کے پالینے پر بولا جاتا ہے خواہ اسکے ساتھ نگاہ کی مہارت شامل ہو یا نہ۔ قرآن میں ہے:۔ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ (۲-۱۹۱) اور ان کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِى الْحَرْبِ (۸-۵۷) اگر تم ان کو لڑائی میں پاؤ۔

مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا (۳۳-۶۱) پھٹکارے ہوئے، جہاں پائے گئے پکڑے گئے۔ اور جان سے مار ڈالے گئے۔

(ث ق ل)

اَلثِّقَلُ یہ خِفَّۃٌ کی ضد ہے اور اس کے معنی بھاری اور انبار ہونا کے ہیں اور ہر وہ چیز جو وزن یا اندازہ میں دوسری پر بھاری ہو اسے ثَقِيْلٌ کہا جاتا ہے۔ اصل (وضع) کے اعتبار سے تو یہ اجسام کے بھاری ہونے پر بولا جاتا ہے لیکن (مجازاً) معانی کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے:۔ اَثْقَلَهُ الْغُرْمُ وَالْوِزْرُ اسے تاوان یا گناہ کے بوجھ نے دبا لیا۔ قرآن میں ہے:۔ اَمْ تَسْئَلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (۵۲-۴۰) (اے پیغمبر) کیا تم ان سے صلہ مانگتے ہو کہ ان پر تاوان کا بوجھ پڑ رہا ہے۔

---

[1] راجع التاج (ثقب) لکن معناہ الطریق ۱۲

اور عرف میں انسان کے متعلق ثقیل کا لفظ عام طور تو بطور مذمت کے استعمال ہوتا ہے اور کبھی بطور مدح بھی آجاتا ہے[1] جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2]۔ (الوافر)

(۹۷-۹۸) تَخِفُّ الْاَرْضُ اِذَا مَا زُلْتَ عَنْهَا
وَتَبْقٰی مَا بَقِیْتَ بِهَا ثَقِیْلَا
حَلَلْتَ بِمُسْتَقَرِّ الْعِزِّ مِنْهَا
فَتَمْنَعُ جَانِبَیْهَا اَنْ تَمِیْلَا

کہ جس سرزمین سے تم چلے جاؤ وہ ہلکی ہو جاتی ہے اور وہ اسی وقت تک بھاری رہتی ہے جب تک تم اس پر رہو۔ تم زمین میں عزت کے مقام پر فروکش ہو اور تمہاری وجہ سے اس میں توازن قائم ہے کہا جاتا ہے۔

فِیْ اُذُنِهٖ ثِقْلٌ یعنی اس کی قوت سماعت کمزور ہے ر ضد فِیْ اُذُنِهٖ خِفَّةٌ گویا جو بات اس سے کی جاتی ہے اس کو سمجھنے میں گرانی محسوس کرتا ہے اور کسی بات کا سننا ناگوار محسوس ہو تو کہا جاتا ہے ثَقُلَ الْقَوْلُ... چنانچہ اسی معنی میں قیامت کے متعلق فرمایا:۔

ثَقُلَتْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۷-۱۸۷) وہ آسمان اور زمین میں ایک بھاری بات ہوگی۔

اور آیت کریمہ:۔ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا (۹۹-۲) اور زمین اپنے (اندر کے) بوجھ نکال ڈالے گی۔ میں بعض نے کہا ہے کہ زمین کے دفینے مراد ہیں اور بعض نے حشر کے روز قبروں سے زندہ ہو کر نکلنا مراد لیا ہے اور آیت کریمہ:۔ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ (۱۶-۷) اور وہ تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ میں اثقال سے بھاری بوجھ مراد ہیں اور آیت:۔

وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (۲۹-۱۳) اور یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور لوگوں کے بوجھ بھی۔ میں گناہوں کے بوجھ مراد ہیں جو انہیں ثواب سے روک دیں گے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔

لِیَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ (۱۶-۲۵) (اے پیغمبر ان کو بکنے دو) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ اٹھائیں گے اور جن کو یہ بے تحقیق گمراہ کرتے ہیں ان کے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔

اور آیت کریمہ:۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا (۹-۴۱) تم سبکسار ہو یا گرانبار گھروں سے نکل آؤ۔ میں بعض نے خفاف اور ثقال سے جوان اور بوڑھے مراد لئے ہیں اور بعض نے خفاف سے نادار اور ثقال سے غنی لوگ مراد لئے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ ان سے غریب الوطن اور مقیم لوگ مراد ہیں۔ اور بعض نے خفاف سے چست اور ثقال سے سست مراد لئے ہیں۔ لیکن آیت اپنے عموم کے اعتبار سے ان جملہ معانی کو شامل ہے کیونکہ قرآن کا مقصد جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دینا ہے کہ تنگی کی حالت ہو یا فراخی کی ہر حال میں تمہیں جہاد کے لئے چل کھڑے ہونا چاہیئے[3]۔

اَلْمِثْقَالُ ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے کسی چیز کا وزن کیا جائے چنانچہ ہر باٹ کو مثقال

---

[1] ومنہ قولہ تعالیٰ: اَیُّهَ الثَّقَلٰنِ (۵۵-۳۱) للجن والانس لما خصا بہ من العقل والتمیز من سائر الحیوان (راجع اللسان ثقل) [2] قالہ زہیر بن ابی سلمی والشطر الثانی فی الثانی من اجاز ذ ابنہ کعب فیہ قصۃ راجع امالی المرتضی (۱: ۹۷) وفیہا الاول: تزال الارض اذا امامت خِفا وتحیٰ ما حییتَ بہا ثقیلا وفیہ نزلت بدل حللت دیوانہ والعقد الثمین ۱۷۳ محاضرات المؤلف وفی روایۃ اختلاف یسیر [3] قال العاد (۲: ۳۵۹) والاولی حملہ علی العموم ۱۲

کہہ سکتے ہیں قرآن میں ہے :۔
فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ۔ (۹۹-۷،۸) توجس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لیگا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہو گی وہ اسے دیکھ لے گا اور آیت کریمہ :۔
وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ (۱۰۱-۸) اور جس کے وزن ہلکے نکلیں گے۔
میں وزن کے ہلکا نکلنے سے اعمال حسنہ کے کم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔
ثقیل اور خفیف کے الفاظ دو طرح استعمال ہوتے ہیں ایک بطور مقابلہ کے یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے اعتبار سے ثقیل یا خفیف کہہ دیا جاتا ہے چنانچہ مذکورہ بالا آیت میں یہی معنی مراد ہیں اور دوسرے یہ کہ جو چیزیں (طبعًا) نیچے کی طرف مائل ہوتی ہیں انہیں ثقیل کہا جاتا ہے جیسے حجر مدر وغیرہ اور جو چیزیں (طبعًا) اوپر کو چڑھتی ہیں جیسے آگ اور دھواں انہیں خفیف کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ :۔
اِثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ (۹-۳۸) تو تم زمین پر گرے جاتے ہو۔ میں زمین پر گرنا دوسرے معنی کے اعتبار سے ہے۔

(ث ل ل)

اَلثَّلَّةُ (بفتح الثاء) کے اصل معنی اون کے ڈھیر کے ہیں اس لئے بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کو بھی ثَلَّة کہا جاتا ہے[1] اور معنی اجتماع کے اعتبار سے آدمیوں کی جماعت کو ثُلَّةٌ۔ قرآن میں ہے :۔
ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ۔ (۵۶-۳۹-۴۰) (یہ) بہت سے تو اگلے لوگوں میں سے ہیں اور بہت سے پچھلوں میں سے۔
ثَلَلْتُ كَذَا میں نے اس سے کافی مقدار لی۔ ثَلَّ عَرْشَهٗ اس کی حکومت برباد کردی۔ اس کی عزت ضائع کردی۔ اَلثَّلَلُ دانتوں کا گرنا۔ اسی سے اُثِلَّ فَمُهٗ کا محاورہ ہے جس کے معنی دانت گرنے کے ہیں۔ تَثَلَّلَتِ الرَّكِيَّةُ کنواں منہدم ہوکر پٹ گیا۔

(ث ل ث)

اَلثَّلَاثَةُ تین (مؤنث) ثَلَاثُوْنَ تیس (مذکر و مؤنث) اَلثَّلَاثُمِائَةِ تین سو (مذکر و مؤنث) ثَلَاثَةُ اٰلَافٍ تین ہزار (مذکر و مؤنث) اَلثُّلُثُ تہائی (تثنیہ ثُلُثَانِ اور جمع اَثْلَاثٌ قرآن میں ہے :۔
فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ (۴-۱۱) تو ایک تہائی مال کا حصہ
وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً (۷-۱۴۲) اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کی میعاد مقرر کی۔
مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ۔ (۵۸-۷) (کسی جگہ) تین (شخصوں) کا (مجمع) سرگوشی نہیں کرتا مگر وہ ان میں چوتھا ہے۔
اور آیت کریمہ :۔ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ لَّكُمْ (۲۴-۵۸) (یہ) تین (وقت) تمہارے پردے (کے) ہیں۔ کے معنی یہ ہیں کہ یہ تین اوقات ستر کے ہیں۔
وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ (۱۸-۲۵) اور اصحاب کہف اپنے غار میں (نو اوپر) تین سو سال رہے۔
بِثَلٰثَةِ اٰلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ۔ (۳-۱۲۴) تین ہزار فرشتے نازل کرکے تمہیں مدد دے۔
اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ (۷۳-۲۰) تمہارا پروردگار

---

[1]: فی المطبوع: للمقیم مصحف والصحیح للغنم کما فی التاج (ثلل)

خوب جانتا ہے کہ تم ..... کبھی (دو تہائی کے قریب اور کبھی) آدھی رات اور کبھی (تہائی رات قیام کرتے ہو۔
مَثْنٰی وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ (۴-۳) دو دو یا تین تین یا چار چار۔
ثَلَّثْتُ الشَّیْءَ تین حصوں میں تقسیم کر دیا۔
ثَلَثْتُ الْقَوْمَ میں نے قوم کے مال سے ایک تہائی حصہ وصول کیا۔ اَثْلَثْتُھُمْ دو میں شامل ہو کر تین بنا دیا۔ مال سے تہائی حصہ وصول کیا۔ اَثْلَثْتُ الدَّرَاھِمَ تین درم کر دیئے (یعنی دو سے تین کر دیئے)
اَثْلَثَ الْقَوْمُ وہ تین ہو گئے۔ حَبْلٌ مَثْلُوْثٌ تین بٹوں سے بٹی ہوئی رسی۔ رَجُلٌ مَثْلُوْثٌ جس کے مال سے تہائی لے لی گئی ہو۔ ثَلَّثَ الْفَرَسُ وَ رَبَّعَ (دوڑ میں) گھوڑے کا تیسرے یا چوتھے نمبر پر آنا محاورہ ہے :۔
اَثُلَاثَۃٌ وَ ثَلَاثُوْنَ عِنْدَكَ اَوْ ثَلَاثٌ وَثَلَاثُوْنَ یعنی کیا تمہارے پاس ۳۳ مرد ہیں یا عورتیں ہیں؟ جاؤ
ثَلَثَ وَ مَثْلَث وہ تین تین آئے نَاقَۃٌ ثَلُوْث جس کے تین تھنوں سے دودھ دوہا جائے۔
اَلثُّلَاثَاءُ منگلوار (اسی طرح) اَلْاَرْبِعَاءُ بدھوار ان میں الف ھا کے عوض ہے (جیسے حَسَنَۃٌ وَ حَسْنَاءُ) اور یہ ایام کے ساتھ مخصوص ہیں۔
ثَلَّثَ الْبُسْرُ گدر کھجوریں دو تہائی پک گئیں۔ اسی طرح ثَلَّثَ الْعِنَبُ کا محاورہ ہے یعنی انگور دو تہائی پختہ ہو گئے۔ ثَوْبٌ ثُلَاثِیٌّ تین گز کپڑا۔

(ث م م)

ثُمَّ[1] یہ حرف عطف ہے اور پہلی چیز سے دوسری کے متاخر ہونے دلالت کرتا ہے خواہ یہ تاخیر بالذات ہو یا باعتبار مرتبہ اور یا باعتبار وضع کے ہو جیسا کہ قبلُ اور اول کی بحث میں بیان ہو چکا ہے۔ قرآن میں ہے :۔
اَثُمَّ اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ آٰلْئٰنَ وَ قَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ (۱۰-۵۱) کیا جب وہ آ واقع ہو گا تب اس پر ایمان لاؤ گے (اس وقت کہا جائے گا کہ) اور اب (ایمان لائے) اس کے لئے تم جلدی مچایا کرتے تھے۔
ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (۱۰-۵۲) پھر ظالم لوگوں سے کہا جائیگا۔
ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ (۲-۵۲) پھر اس کے بعد ہم نے تم کو معاف کر دیا۔
ثُمَامَۃٌ ایک قسم کی گھاس جو نہایت چھوٹی ہوتی ہے اور ثَمَّتَ الشَّاۃُ کے اصل معنی بکری کے ثُمَامَۃ گھاس چرنا کے ہیں جیسے درخت چرنے کے لئے شَجَّرَتْ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے پھر ہر قسم کی گھاس چرنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔
ثَمَمْتُ الشَّیْءَ اس چیز کو اکٹھا اور درست کیا۔ اسی سے محاورہ ہے۔ كُنَّا اَهْلَ ثُمِّهٖ وَرُمِّهٖ ہم اس کی اصلاح و مرمت کے اہل تھے۔
اَلثُّمَّۃُ خشک گھاس کا مٹھا۔
ثَمَّ[2] وہاں، اسم اشارہ بعید کے لئے آتا ہے اور اس کے بالمقابل ھُنَالِكَ اسم اشارہ قریب کے لئے استعمال ہوتا ہے اور یہ دونوں لفظ دراصل اسم ظرف ہیں[3] اور آیت کریمہ :۔
وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا (۷۶-۲۰)

---

[1] حرف عطف یقتضی ثلاثۃ امور، التشریک فی الحکم والترتیب والمھلۃ وفی کل منھا خلاف راجع المغنی (۱: ۱۲ھم) [2] قال الطبری بمعناہ اَھنالک ولیست ثم التی تاتی للعطف قال ابن ہشام و ہذا وھم منہ [3] ای ظرف لایتصرف ۱۲

اور بہشت میں (جہاں) آنکھ اٹھاؤ گے کثرت سے نعمت . . . دیکھو گے۔ میں ثَمَّ مفعول واقع ہوا ہے۔[1]

(ث م د)

ثَمُوْدُ (حضرت صالحؑ کی قوم کا نام) بعض اسے معرب بتاتے ہیں اور قوم کا علم ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے اور بعض کے نزدیک عربی ہے اور ثَمَدٌ سے مشتق ہے (بروزن فَعُوْلٌ) اور ثَمَدٌ (بارش کے) تھوڑے سے پانی کو کہتے ہیں جو جاری نہ ہو۔

اسی سے رَجُلٌ مَثْمُوْدٌ کا محاورہ ہے یعنی وہ آدمی جس میں عورتوں سے کثرت جماع کے سبب مادہ منویہ باقی نہ رہے۔ نیز مَثْمُوْد اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جسے سوال کرنے والوں نے مفلس کر دیا ہو۔

(ث م ر)

اَلثَّمَرُ اصل میں درخت کے ان اجزاء کو کہتے ہیں جن کو کھایا جا سکے اس کا واحد ثَمَرَةٌ اور جمع ثِمَارٌ وَ ثَمَرَات آتی ہے قرآن میں ہے :۔

وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ (۲-۲۲) اور آسمان سے مینہ برسا کر تمہارے کھانے کے لئے انواع و اقسام کے میوے پیدا کئے۔

وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ (۱۶-۶۷) اور کھجور اور انگور کے میووں سے بھی۔

اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ (۶-۹۹) ان کے پھلنے اور پکنے پر غور کرو۔[2]

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ (۱۳-۳، ۱۶-۱۱) اور ہر طرح کے میوے۔

ثَمَر اور ثِمَار کے ایک ہی معنی ہیں بعض نے کہا ہے۔ کہ ثِمَارٌ، ثَمَرٌ کی جمع ہے پھر بطور کنایہ ثمر کا لفظ ہر قسم کے کمائے ہوئے مال پر بولا جاتا ہے چنانچہ آیت کریمہ :۔

وَكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ . . . (۱۸-۳۴) (اس طرح) اس (شخص) کو (ان کی) پیداوار (ملتی رہتی) تھی۔ میں ابن عباسؓ نے ثمر کے یہی معنی کئے ہیں۔

محاورہ ہے ثَمَّرَ اللّٰهُ مَالَهٗ اللہ تعالیٰ اس کا مال بڑھائے اور مجازاً ہر چیز کے نفع پر ثمر کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے کہا جاتا ہے ثَمَرَةُ الْعِلْمِ الْعَمَلُ الصَّالِحُ کہ علم کا ثمرہ نیک عمل ہیں۔ وَثَمَرَةُ الْعَمَلِ الصَّالِحِ الْجَنَّةُ۔ اور نیک عمل کا ثمرہ جنت ہے۔

اور صوری مشابہت اور نیچے کی طرف لٹکنے کے اعتبار سے چابک کے سر کی گرہ کو بھی ثَمَرَةُ السَّوْطِ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی اسی طرح چابک سے نیچے لٹکتی ہوئی نظر آتی ہے جیسے درخت سے پھل کا گچھا لٹک پڑتا ہے۔

اَلثَّمِيْرَةُ مکھن کے بلبلے جو دودھ کو بلونے سے اس پر نظر آتے ہیں۔ صوری تشابہ کی وجہ سے ان کو ثَمِيْرَةُ اللَّبَنِ کہا جاتا ہے اور پھر وہ دودھ سے حاصل بھی ہوتا ہے جیسے پھل درخت سے۔

(ث م ن)

اَلثَّمَنُ اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو خرید کرنے والا اپنی چیز کے عوض خریدار سے وصول کرتا ہے خواہ وہ زر نقد ہو یا سامان۔ قرآن میں ہے :۔

---

[1] قال ابن ہشام وغلط من اعربہ مفعولا لرأیت فی ہذا الآیۃ ۱۲
[2] وفی النسخ المطبوعۃ القدیمۃ والکلّیّۃ " کلوا من ثمرہ" مصحف ۱۲ ۱۲

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ (۱۲-۲۰) اور اسے تھوڑی سی قیمت یعنی چند درہموں پر بیچ ڈالا۔ اور وہ کچھ جو کسی چیز کے عوض میں حاصل ہو وہ اس کا ثمن کہلاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (۳-۷۷) جو لوگ خدا کے اقراروں اور اپنی قسموں (کو) بیچ ڈالتے ہیں اور ان (کے عوض) تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا (۱۶-۹۵) اور خدا سے جو تم نے عہد کیا تھا (اس کو مت بیچو اور) اس کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لو۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا (۵-۴۴) اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہ لینا۔

محاورہ میں اَثْمَنْتُ الرَّجُلَ بِمَتَاعِهٖ وَاَثْمَنْتُ لَهٗ کے معنی کسی چیز کی زیادہ قیمت دینے کے ہیں۔

اور قیمتی چیز کو شَیْئٌ ثَمِیْنٌ کہا جاتا ہے۔

ثَمَانِیَۃٌ آٹھ (مذکر) ثَمَانُوْنَ۔ اسی (مذکر و مؤنث) اَلثُّمُنُ آٹھواں حصہ۔

ثَمَنْتُهٗ آٹھواں ہونا۔ کسی شخص کے مال سے آٹھواں حصہ لینا۔ قرآن میں ہے:۔ ثَمَانِیَۃَ اَزْوَاجٍ (۶-۱۴۳) یہ بڑے چھوٹے چارپائے آٹھ قسم کے ہیں۔

سَبْعَۃٌ وَّثَامِنُهُمْ کَلْبُهُمْ (۱۸-۲۲) وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔

عَلٰٓی اَنْ تَاْجُرَنِیْ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ (۲۸-۲۷) اس (عہد) پر کہ تم آٹھ برس میری خدمت کرو۔

اَلثَّمِیْنُ بمعنی ثُمُن یعنی آٹھواں حصہ۔ شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۸۱) فَمَا صَارَ لِیْ فِی الْقَسْمِ اِلَّا ثَمِیْنُهَا

اس مقاسمہ میں میرا آٹھواں حصہ تھا۔

قرآن میں ہے

فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَکْتُمْ (۴-۱۲) تو جو مال تم (مرد) چھوڑ مرو تو اس میں ان کا آٹھواں حصہ ہے۔

(ث ن ی)

اَلثِّنٰی وَالْاِثْنَانُ یہ دونوں ان تمام کلمات کی اصل ہیں جو اس مادہ سے بنتے ہیں یہ کبھی معنی عدد کے اعتبار سے استعمال ہوتے ہیں اور کبھی تکرار معنی کے لحاظ سے جو ان کے اصل مادہ میں پایا جاتا ہے اور کبھی ان میں عدد و تکرار دونوں ملحوظ ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

ثَانِیَ اثْنَیْنِ (۹-۴۰) دو میں دوسرا۔

اِثْنَتَا عَشْرَۃَ عَیْنًا (۲-۶۰) بارہ چشمے۔

مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (۴-۳) دو دو یا تین تین یا چار چار۔ کہا جاتا ہے ثَنَیْتُهٗ تَثْنِیَۃً میں دوسرا تھا میں[2] نے اسکا نصف مال لے لیا[3] ایک چیز کے ساتھ دوسری چیز کو ملا کر دو کر دینا۔

اَلثِّنٰی۔ جس کا دو مرتبہ اعادہ ہو حدیث میں ہے[4]۔ (۵۲)

---

[1] قالہ یزید بن الطثریہ (والطثریہ امہ وهو احد الشعراء الذین اشتہروا بامہاتہم واسم ابیہا الصمۃ) واولہ: والقیت سہمی وسطہم حین اوخشوا والبیت فی اللسان (ثمن) والاقتضاب ۵۰م فی خمسۃ ابیات وتہذیب الالفاظ ۵۸۹ والدرۃ مع الخفاجی ۸۹ وادب الکاتب ۵۰م وقبلہ:۔ اری صبیۃ یسعون للوصل کلہم۔ لعند لیلی دینۃ یستدینہا۔ ومعنی اوخشوا ردوا سہام المیسر فی خریطتہا (۲) القسم بمعنی المقاسمۃ ۱۲ (۳) والحدیث فی الصحاح (ثنی) والفائق ۱/۸۳ والدیلمی والنہایۃ واموال ابی عبید عن علیؓ وراجع کنز العمال ۷ رقم ۱۹۹۵ و۱۳۲۲ وغریب ابی عبید ۱/۹۸

لَا ثِنیٰ فِی الصَّدَقَةِ ... یعنی صدقہ سال میں
دو مرتبہ نہ لیا جائے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)
(۸۲) "...... لَقَدْ کَانَ مَلَامَتُهَا ثِنیٰ"
بے شک اس نے بار بار ملامت کی۔
اِمْرَأَةٌ ثِنْیٌ جس عورت نے دو بچے جنے ہوں
اس دوسرے بچہ کو ثِنْیٌ کہا جاتا ہے۔
حَلَفَ یَمِیْنًا فِیْهَا ثِنْیٌ وَّ ثَنْوٰی وَ ثَنِیَّةٌ
وَمَثْنَوِیَّةٌ اس نے استثنا کے ساتھ قسم اٹھائی۔
ثَنَا (ض) ثَنْیًا۔ اَلشَّیْءَ کسی چیز کو موڑنا، دوسرا
کرنا لپیٹنا قرآن میں ہے:۔
اَلَا اِنَّهُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ (۱۱-۵) دیکھو
یہ اپنے سینوں کو دوہرا کرتے ہیں۔
حضرت ابن عباسؓ کی قرأت یَثْنَوْنِیْ صُدُوْرُهُمْ
ہے۔ جو اِثْنَوْنَیْتُ کا مضارع ہے[2]
اور آیت کریمہ:۔ ثَانِیَ عِطْفِهٖ (۲۲-۹) (اور
تکبر سے) گردن موڑ لیتا ہے۔
میں گردن موڑنے سے مراد تکبر اور اعراض کرنا ہے
جیسا کہ لَوَیٰ شِدْقَهٗ وَ نَأَیٰ بِجَانِبِهٖ کا محاورہ ہے۔
اَلثَّنِیُّ (وایضا بکری) جو دوسرے سال میں داخل
ہو (اونٹ) جس کے ثنیہ دانت گر گئے ہوں اور
اس معنی میں فعل اَثْنیٰ ہے

ثَنَیْتُ الشَّیْءَ اَثْنِیْهِ۔ کسی چیز کو تنا بین رسی
کے ساتھ باندھنا۔ یہ غیر مہموز ہے بعض نے اس
کے غیر مہموز ہونے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ یہ کلمہ
تثنیہ ہی استعمال ہوتا ہے اور اس کا واحد ثِنَاءٌ
نہیں بولا جاتا[3]
اَلْمَثْنَاةُ دوسری رسی۔
اَلثُّنْیَانُ سادات کے شمار کے وقت دوسرے درجہ
کا سردار۔
ثَنْیَةٌ فرمایہ محاورہ ہے فُلَانٌ ثَنْیَةُ اَهْلِ
بَیْتِهٖ فلاں اپنے اہل میں ثنیہ یعنی سب سے کم
مرتبہ ہے۔
ثَنِیَّةٌ وہ پہاڑ جسے عبور کرتے وقت اوپر چڑھنا
اور نیچے اترنا پڑے گویا دوہرا سفر کرنا پڑتا ہے
شکل و صورت اور صلابت کے لحاظ سے پہاڑ کے
ساتھ تشبیہ دے کر سامنے کے چار دانت (دو از
فوق دو از تحت) میں سے ہر ایک کو ثَنِیَّةٌ
کہا جاتا ہے (جمع ثنایا)
اَلثُّنْیَا۔ (مِنَ الْجَزُوْرِ) ذبح کئے گئے اونٹ کا سر
اور صلب جو قصاب اپنے لئے مستثنیٰ کر لیتا ہے[4]
اور ان کو ثَنْوَیٰ بھی کہا جاتا ہے۔
اَلثَّنَاءُ۔ کے معنی بار بار کسی کی خوبیاں بیان کرنے

---

[1] قاله کعب بن زهیر فی امرأته حین لامته فی بکر وتکملة البیت۔ أفی جنب بکر قطعتنی ملامةً ۔ لعمری ...... والبیت فی اللسان (ثنی) ودیوانه ۶۸ والبحر ۵:۲۰۵ ونسبه الصاحبی ۱۳۳ الی اوس بن حجر وجمعه الدکتور محمد یوسف نجم فی مختلط شعره راجع دیوانه ۱۳۱ وفی روایة خزانة بدل ملامة وضبطه الجامع بالرفع والصواب النصب علی التمییز وفاعل قطعتنی امرأته وقبله وهو مطلع القصیدة: - الا بکرت عرسی توائم من لحی۔ واقرب باحلام النساء من الرومی

[2] راجع ابن کثیر ۲/۴۳۶ وهو من اثنونی (افعوعل) کما احلولی من الحلاوة۔

[3] ذکره الجوهری فی الصحاح وکذا فی النهایة فی شرح حدیث عمرو بن دینار رأیت ابن عمر ینحر بدنته وهی بارکة مثنیة بثنایین ...... وبعده: قال الاصمعی وان مده مادٌّ لکان صوابًا یجوز الاصمعی ثناآن کما تقول کساآن لکن النحاة اتفقوا علی ترک الهمزة فی الثنایین وتورد الازهری بالبسط فی تهذیبه علی من همزه مختصرًا ۱۲

[4] ومافی المعاجم من الراس والقوائم وذکر بعضهم معهما لفظ الصلب ۱۲

کے ہیں اور اَثْنیٰ عَلَیْہِ کے معنی کسی کی ثنا کرنے کے ہیں۔

تَثَنّیٰ (تفعل) فِی مِشْیَتِہٖ تکبر سے لڑکھڑا کر چلنا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ (۱۵-۸۷)

اور ہم نے تم کو سات مثانی (سورتیں) عطا کیں۔ میں قرآن کی سورتوں کو مثانی کہا ہے[۱]۔ کیونکہ مرور ایام کے ساتھ بار بار ان کا ذکر اور اعادہ ہوتا رہیگا۔ لیکن زمانہ کے گزرنے کے ساتھ نہ تو ان میں کسی قسم کا تغیر آئے گا اور نہ ہی دوسری اشیاء کی طرح یہ زوال پذیر ہیں۔ اسی بنا پر فرمایا:۔

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ۔ (۳۹-۲۳) خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب (جس کی آیتیں باہم) ملتی جلتی (ہیں) اور دوہرائی جاتی ہیں۔

اور قرآن کو مثانی کہنے کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ بار بار اعادہ سے اس کے عجائب وغرائب منقطع نہیں ہوتے اور ہر بار نئے حقائق سامنے آتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے وصف میں ایک روایت مروی ہے[۲] لَا یَعْوَجُّ فَیُقَوَّمُ وَلَا یَزِیْغُ فَیُسْتَعْتَبُ وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُہٗ۔ کہ اس میں کجی نہیں آئے گی کہ اسے سیدھا کرنے کی ضرورت پیش آئے اور اس میں زیغ پیدا ہوگا کہ اس کا ازالہ کرنا پڑے اور اس کے عجائب وغرائب کبھی منقطع نہیں ہوں گے۔

اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مَثَانِی ثناء سے مشتق ہو تو اس سے اس امر پر متنبہ کیا ہے کہ قرآن پاک سے ہمیشہ ایسے مضامین ظاہر ہوتے رہیں گے جو اس کی، اس کو پڑھنے والوں، اس کا علم حاصل کرنے والوں، اور اس پر عمل کرنے والوں، کی تعریف کا موجب ہوں گے اور اسی معنی میں قرآن کو آیت:۔ اِنَّہٗ لَقُرْاٰنٌ کَرِیْمٌ (۵۶-۷۷) کہ یہ بڑے رتبے کا قرآن ہے۔ میں کرم کے ساتھ متصف کیا ہے اور آیت:۔

بَلْ ھُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ (۸۵-۲۱) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے۔ اس کے وصف میں مجید کا لفظ ذکر کیا ہے۔

اَلْاِسْتِثْنَاءُ کے معنی کلام میں ایسا لفظ لانے کے ہیں جو پہلے عام حکم سے بعض افراد کی تخصیص یا اس عام حکم کے کلیۃ مرتفع ہونے کا فائدہ دے چنانچہ عموم حکم سے بعض افراد کی تخصیص کے متعلق فرمایا۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُہٗٓ اِلَّآ اَنْ یَّکُوْنَ مَیْتَۃً (الآیہ) (۶-۱۴۵) کہو کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں میں ان میں کوئی چیز جسے کھانے والا کھائے۔ حرام نہیں پاتا بجز اس کے کہ وہ مرا ہوا جانور ہو۔

اور یہی کلام کی کلیۃ نفی جیسے:۔

وَاللّٰہِ لَاَفْعَلَنَّ کَذَا اِنْ شَاءَ اللّٰہُ۔ میں یہ کام ضرور کروں گا انشاء اللہ۔

امْرَاَتُہٗ طَالِقٌ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ اس کی عورت کو طلاق ہے انشاء اللہ۔

عَبْدُہٗ عَتِیْقٌ اِنْ شاء اللہ اس کا غلام آزاد ہے ان شاء اللہ اور آیت کریمہ:۔

اِذْ اَقْسَمُوْا لَیَصْرِمُنَّھَا مُصْبِحِیْنَ وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ (۶۸-۱۷-۱۸) جب انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا

---

[۱] راجع للبحث علی المثانی التاج (ثنی) وغریب ابی عبید ۳ر ۱۴۵-۱۴۷ [۲] کلمہ من حدیث طویل فی فضل القرآن راجع المصاحف لابن الانباری ک حمد ب عن ابن مسعود و ش محمد بن نصر) کنز العمال ار رقم ۲۳۵۰

کہ صحیح ہوتے ہوتے ہم اس کا میوہ توڑ لیں گے۔ اور انشاء اللہ کہا۔ میں وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ سے بھی یہی مراد ہیں۔

(ث و ب)

ثَوْبٌ کا اصل معنی کسی چیز کے اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ آنا کے ہیں یا غور و فکر سے جو حالت مقدر اور مقصود ہوتی ہے اس تک پہنچ جانے کے ہیں۔ چنانچہ حکماء کے اس قول اَوَّلُ الْفِکْرَۃِ اٰخِرُ الْعَمَلِ میں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے یعنی آغاز فکر ہی انجام عمل بنتا ہے۔ چنانچہ اول معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ ثَابَ فُلَانٌ اِلٰی دَارِہٖ۔ فلاں اپنے گھر کو لوٹ آیا ثَابَتْ اِلَیَّ نَفْسِیْ میری سانس میری طرف لوٹی اور کنوئیں کے منہ پر جو پانی پلانے کی جگہ بنائی جاتی ہے اسے مَثَابَۃٌ کہا جاتا ہے اور غور و فکر سے حالت مقدرہ مقصود تک پہنچ جانے کے اعتبار سے کپڑے کو ثَوْبٌ کہا جاتا ہے کیونکہ سوت کاتنے سے غرض کپڑا بننا ہوتا ہے لہذا کپڑا بن جانے پر گویا سوت اپنی حالت مقصودہ کی طرف لوٹ آتا ہے یہی معنی ثواب العمل کا ہے۔ اور ثَوْبٌ کی جمع اَثْوَابٌ وَثِیَابٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:

وَثِیَابَكَ فَطَهِّرْ (۷۴-۴) اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔ میں بعض نے ثِیَاب سے اس کے حقیقی معنی یعنی کپڑے پاک رکھنا مراد لیا ہے[۱] اور بعض نے کہا ہے کہ ثِیَاب سے رکنایۃ) نفس مراد ہے[۲] (یعنی نفس کو رذائل سے پاک رکھنا مراد ہے) جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[۳]۔ (طویل)

(۸۳) ثِیَابُ بَنِیْ عَوْفٍ طَهَارٰی نَقِیَّۃٌ

کہ بنی عوف کے نفوس پاک و صاف ہیں۔

اسی طہارت نفسانی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا (۳۳-۳۳) (اے پیغمبر کے اہل بیت خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دور کردے اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے۔

اَلثَّوَابُ انسان کے عمل کی جو جزا انسان کی طرف لوٹتی ہے اسے ثواب کہا جاتا ہے اس تصور پر کہ وہ جزا گویا عین عمل ہی ہے حتی کہ اللہ تعالیٰ نے آیت:

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْرًا یَّرَهٗ (۹۹-۷) تو جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لیگا۔ میں جزا کو نفس عمل ہی قرار دیا ہے اس لئے یہاں یَرَ جَزَاءَهٗ نہیں کہا حالانکہ مراد یہی ہے۔

گو لغوی اعتبار سے ثَوَابٌ کا لفظ خیر و شر دونوں قسم کی جزا پر بولا جاتا ہے لیکن اکثر اور متعارف استعمال نیک اعمال کی جزا پر ہے چنانچہ فرمایا:۔

ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ

---

[۱] تفسیر ابن کثیر (۴: ۴۴۰) الی محمد بن سیرین ورجحہ ابن جریر [۲] نقل عن ابن عباس واکثر التابعین ویؤیدہ کلام العرب [۳] قالہ امرؤ القیس فی مدح بنی عوف وتمامہ: واوجہہم بیض المسافر غران (معقبا النقائیہ من کامنہ ۱۶ بیتا ولا توجد تامۃ عند غیر ابن الانباری ۲۳۴ و فی روایۃ والسمط (۹) یوم الکریہۃ بدل بیض المسافر والبیت فی اللسان والصحاح (ثوب عزر) و دیوانہ ۱۵ والعقد الثمین ۱۶۱ وایام العرب ۵۰ و شرح السبع لابن الانباری ۶ وہو فیہ عند الشاہد بدل بیض المسافر والمعانی للقبتی ۴۸۵-۸۱ والسیوطی ۱۲۹ والصناعتین ۳۰۳ ومختار الشعر ۲۱۳ والعمدۃ (۱: ۱۸۸) فی اربعۃ ابیات والشطر فی حواشی تہذیب الالفاظ ۴۸۳ والبحر (۲: ۱۶۸) والشطر الثانی فی البحر (۳-۴۴۴/۸-۳۷۱) ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

الثَّوَابِ (۳-۱۹۵) یہ خدا کے ہاں سے بدلہ ہے اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔
فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ (۳-۱۴۸) تو خدا نے ان کو دنیا میں بھی بدلہ دیا اور آخرت میں بھی بہت اچھا بدلہ دیگا۔
اسی طرح لفظ مَثُوْبَةٌ بھی زیادہ تر جزائے خیر پر بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ (۵-۶۰) کہو کہ میں تمہیں بتاؤں کہ خدا کے ہاں اس سے بھی بدتر جزا پانے والے کون ہیں۔
میں جزائے بد کے لئے مَثُوْبَةً کا بطور استعارہ استعمال ہوا ہے جیسا کہ عذاب کے متعلق بشارت کا لفظ استعمال ہوتا ہے چنانچہ جزائے خیر کے متعلق فرمایا۔
وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ (۲-۱۰۳) اور اگر وہ ایمان لاتے اور پرہیز گاری کرتے تو خدا کے ہاں سے بہت اچھا صلہ ملتا۔
اَلْاِثَابَةُ (افعال) کے معنی بھی اچھی جزا دینے کے ہیں جیسے فرمایا:۔
فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۵-۸۵) تو خدا نے ان کو ان کے کہنے کے عوض (بہشت کے) باغ عطا فرمائے جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ (۳-۱۵۲) تو خدا نے تم کو غم پر غم پہنچایا۔ میں بری جزا کو ثواب قرار دینا بطور استعارہ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔
اَلتَّثْوِيْبُ (تفعیل) قرآن میں یہ لفظ صرف بری جزا کے لئے استعمال ہوا ہے جیسے فرمایا:۔ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ (۸۳-۳۶) تو کافروں کو پورا پورا بدلہ مل گیا۔ اور آیت کریمہ:۔ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ (۲-۱۲۵) اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے جمع ہونے کی جگہ مقرر کیا۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ مَثَابَةٌ کے معنی جائے ثواب کے ہیں اور خانہ کعبہ کو مَثَابَةٌ اس لئے کہا ہے کہ وہاں ثواب اعمال لکھا جاتا ہے۔
اَلثَّيِّبُ۔ بیوہ یا مطلقہ عورت کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی خاوند سے جدا ہو کر گویا پہلی حالت کی طرف لوٹ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا (۶۶-۵) بن شوہر اور کنواریاں۔
اَلتَّثْوِيْبُ کے معنی بار بار منادی کرنے کے ہیں اس سے تَثْوِيْبٌ فِي الْاَذَانِ ہے (یعنی فجر کی اذان میں حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ کے بعد اَلصَّلٰوةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کہنا)
ثَوْبَاءُ (غشی) کیونکہ وہ بھی دورہ کے ساتھ بار بار طاری ہوتی ہے۔
اَلثُّبَةُ۔ جماعت کیونکہ اس کے افراد بھی بظاہر ایک دوسرے کی طرف لوٹتے ہیں قرآن میں ہے۔
فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا (۴-۷۱)
شاعر نے کہا ہے[1] (الوافر)

وَقَدْ اَغْدُوْ عَلٰى ثُبَةٍ كِرَامٍ

ثُبَةُ الْحَوْضِ حوض کا وسط جس کی طرف پانی لوٹ کر آتا ہے اور یہ پہلے گزر چکا ہے۔

(ث و ر)

ثَارَ (ن) ثَوْرًا وَثَوَرَانًا۔ اَلْغُبَارُ وَالسَّحَابُ کے معنی غبار یا بادل کے اوپر اٹھنے اور پھیلنے کے ہیں قرآن میں ہے:۔

---

[1] تقدم تخریجہ فی (ث ب و)

فَتُثِيْرُ سَحَابًا (۳۰-۴۸) تو وہ بادل کو اوپر اٹھاتی ہیں۔
اَثَارُوا الْاَرْضَ وَعَمَرُوْهَا (۳۰-۹) انہوں نے زمین کو جوتا اور اس کو ۔۔۔۔ آباد کیا۔
اور غبار کے منتشر ہونے کے ساتھ تشبیہ دیکر ثَارَتِ الْحَصْبَةُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کنکر کے پھیل جانے کے ہیں اور اسی طرح (یعنی مجازاً) ثَوَّرَ شَرًّا (شر کی آگ بھڑکانا) کہا جاتا ہے۔
ثَارَ ثَائِرُهٗ (کنایہ) یعنی وہ غضب ناک ہوگیا۔
ثَاوَرَهٗ اس پر حملہ کردیا۔
اَلثَّوْرُ بیل کیونکہ اس سے زمین جوتی جاتی ہے۔ یہ اصل میں مصدر بمعنی فاعل ہے جیساکہ ضَيْفٌ وَطَيْفٌ بمعنی ضائف وَطَائِفٌ استعمال ہوتا ہے محاورہ ہے۔
سَقَطَ ثَوْرُ الشَّفَقِ۔ یعنی شفق کی سرخی غروب ہوگئی۔
اَلثَّأْرُ کے معنی "خون کا بدلہ" کے ہیں یہ اصل میں مہموز العین ہے اور اس مادہ سے نہیں ہے۔

(ث و ی)

اَلثَّوَاءُ (ض) کے اصل معنی کسی جگہ پر مستقل طور پر اقامت کرنا کے ہیں کہا جاتا ہے ثَوٰی يَثْوِیْ ثَوَاءً وہ اقامت پذیر ہوگیا۔ قرآن میں ہے۔
وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِیْ اَهْلِ مَدْيَنَ (۲۸-۴۵)
اور نہ تم مدین والوں میں رہ رہے تھے۔
أَلَيْسَ فِیْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ (۳۹-۶۰)
کیا غرور والوں کا ٹھکانا دوزخ میں نہیں ہے۔
وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷-۱۲) اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔
اُدْخُلُوْا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (۴۰-۷۶) (اب) جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ۔ ہمیشہ اسی میں رہو گے۔ متکبروں کا کیسا برا ٹھکانا ہے۔
قَالَ النَّارُ مَثْوٰكُمْ (۶-۱۲۸) خدا فرمائے گا (اب) تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے۔
مَنْ اُمُّ مَثْوَاكَ (کنایہ) تمہارا میزبان کون ہے۔
اَلثَّوِيَّةُ بھیڑ بکریوں کے باڑہ کو کہتے ہیں۔
(وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ)

کتابُ الجیمِ

(ج ء ر)

اَلْجُؤَار (ف) کے اصل معنی وحشیات جیسے ہرن وغیرہ کے گھبراہٹ کے وقت زور سے آواز نکالنے اور چیخنے کے ہیں پھر تشبیہ کے طور پر دعا اور تضرع میں افراط اور مبالغہ کرنے پر بولا جاتا ہے قرآن میں ہے۔

فَاِلَیْہِ تَجْئَرُوْنَ (۱۶-۵۳) تو اسی کے سامنے آہ وگریہ کرتے ہو۔ اِذَا ھُمْ یَجْئَرُوْنَ (۲۳-۶۴) تو اس وقت چلائیں گے۔ لَا تَجْئَرُوا الْیَوْمَ (۲۳-۶۵) آج مت چلاؤ۔

(ج ب ب)

اَلْجُبُّ کنواں جو پختہ یا لپا ہوا نہ ہو۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَلْقُوْہُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ (۱۲-۱۰) کسی گہرے گڑھے میں ڈال دو۔

اور اس کنوئیں کو جُبٌّ یا تو اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ جُبُوْب یعنی سخت زمین میں کھدا ہوا تھا اور یا اس لئے کہ وہ گہرا گڑھا سا تھا۔

اصل میں اَلْجَبُّ (ن) کے معنی کسی چیز کو اس کے اصل سے کاٹ دینے کے ہیں جیسے جَبُّ النَّخْلِ کھجور کو گابھا دینا اور زَمَنَ الصِّرَام کی طرح زَمَنَ الْجَبَاب کا محاورہ بھی مشہور ہے جس کے معنی کھجور کو گابھنے کا موسم کے ہیں۔

بَعِیْرٌ اَجَبُّ شتر کوہان برید اور ناقہ جَبَّاء جیسا کہ مرد مقطوع الید کو رَجُلٌ اَقْطَعُ کہا جاتا ہے اور ایسی عورت کو قَطْعَاءُ کہتے ہیں۔

مَجْبُوْبٌ وہ مرد جس کا آلۂ تناسل جڑ سے قطع کردیا گیا ہو۔ اسی سے جُبَّۃٌ (نوعے از پیراہن) ہے اور تشبیہ کے طور پر نیزہ کے اس پور کو بھی جُبَّۃ کہا جاتا ہے جس میں بھالا پیوست ہوتا ہے۔

اَلْجُبَابُ کلک شیر شتر کہ بسکہ ماند جَبَّتِ الْمَرْءَۃُ النِّسَاءَ حُسْنًا حسن میں برتر ہونا غالب رہنا یہ بھی جَبٌّ بمعنی قطع سے مستعار ہے جیسا کہ منازعت (بحث ومباحثہ) میں غالب ہونے کے لئے قَطَعْتُہٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جَبْجَبَۃٌ جس کے معنی طبل یا چرمیں زنبیل کے ہیں اس مادہ سے نہیں ہے بلکہ محض اس صوت کی وجہ سے اسے جَبْجَبَۃ کہا جاتا ہے جو اس سے مسموع ہوتی ہے۔

(ج ب ت)

اَلْجِبْتُ جِبْتٌ اور جِبْسٌ اس ردی چیز کو کہتے ہیں جو کسی کام کا نہ ہو اور بعض نے کہا ہے کہ دراصل جِبْسٌ کے سین کو تاء سے تبدیل کرلیا گیا ہے۔ تاکہ معنی مبالغہ

ؔ علی اثنی عشر میلا من طبریہ ادبین سنجل ونابلس (التاج)

پر دلالت کرے شاعر نے کہا ہے[1]۔ (رجز)

(۸۴) عمرو بن یربوع شرار النّات

یعنی عمرو بن یربوع تمام لوگوں سے ناکام ہے۔ نیز ہر وہ چیز جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے وہ جِبْتٌ کہلاتی ہے اور ساحر کاہن کو بھی جِبْت کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ (۴-۵۱) کہ یہ اہل باتوں اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں۔

(ج ب ر)

اَلْجَبْرُ اصل میں جبر کے معنی زبردستی اور دباؤ سے کسی چیز کی اصلاح کرنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے جَبَرْتُهٗ (ن)، فَانْجَبَرَ وَاجْتَبَرَ بعض نے جَبَرْتُهٗ فَجَبَرَ بھی نقل کیا ہے یعنی جَبَرَ فعل لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2] (رجز)

(۸۵) قَدْ جَبَرَ الدِّيْنَ الْإِلٰهُ فَجَبَرَ۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے دین کو درست کیا تو وہ درست ہوگیا۔ یہی قول اکثر ائمہ لغت کا ہے لیکن بعض اہل لغت نے کہا ہے کہ شعر مذکور میں فَجَبَرَ (انفعال) یعنی لازم نہیں ہے بلکہ متعدی ہے اور تکرار سے اصلاح اور اس کی تکمیل پر تنبیہ کرنا مقصود ہے اور معنی یہ ہیں کہ اللہ نے دین کی اصلاح کی ابتدا کی اور پھر اسے تکمیل تک پہنچا دیا کیونکہ فَعَلَ کا صیغہ جس طرح کسی کام کو شروع کرنے کا معنی دیتا ہے اسی طرح اس کے معنی کسی کام کو سرانجام دے کر اس سے فارغ ہو جانا بھی آتے ہیں اور اس سے مبالغہ کے معنی یا تکلف کو ظاہر کرنے کے لئے تَجَبَّرَ (تفعل) کا صیغہ استعمال ہوتا ہے شاعر نے کہا ہے[3] (طویل)

(۸۶) تَجَبَّرَ بَعْدَ الْأَكْلِ فَهُوَ نَمِيْصُ

گھاس چرانے کے بعد دوبارہ ہری ہو گئی ہے۔ پھر جبر کا لفظ کبھی صرف اصلاح کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ حضرت علیؓ کا قول ہے۔ (۵۴)

يَا جَابِرَ كُلِّ كَسِيْرٍ وَمُسَهِّلَ كُلِّ عَسِيْرٍ اے ہر شکستہ کی اصلاح کرنے والے اور ہر مشکل آسان کرنے والے اور اسی معنی میں روٹی کو جَابِرُ بْنُ حَبَّةَ کہا جاتا ہے۔ اور یہ لفظ کبھی محض استبداد کے

---

[1] انشد فی الامالی (۲: ۶۷) ثلاثة اشطار عن القراء: یاقبح اللہ بنی السعلات - عمرو بن یربوع شرار النات - لیسوا اعفاء ولا اکیات راجع للشطر النوادر لابی زید ۴۰ و فیہ الاتاقل اللہ بدل یا قبح اللہ والجمہرۃ لابن درید (۳: ۲۳) قال الاستاذ المیمنی فی طرتہ علی اللالی والاشعار فی الثعلب ایضا وراجع ابدال ابی الطیب (۱: ۱۷) واللسان (نات) والخصائص لابن جنی (۲) وسر الصناعة ۱۱۹ والمخصص لابن سیدہ (۳: ۳۶) ومبادی اللغة للاسکافی وتفسیر الطبری (۵: ۲۲۲) والصاحبی ۱۰۹ وفیہ عمرو بن مسعود والمفصل ۳۶۸ والشطر منسوب لعلباء بن ارقم الیشکری کما فی اللالی واللسان (نا) وہو شاعر جاہلی قدیم [2] نصف مطلع من ارجوزة العجاج فی نحو مائتی اشطار وہی موثوقة مقیدة یمدح بہا عمر بن عبد اللہ بن معمر وکان عبد الملک وجہہ لتقتال ابی فدیک الخارجی فاوقع بہ وباصحابہ فذالک ذکر انجبار الدین ولبعدہ: وعور الرحمان من ولی العور وقد جمع الشاعر بین اللازم والواقع راجع الخزانة (۱: ۱۰۳) والطبری (۲: ۴۱۷) والعمدة (۱: ۸۹) واصلاح لیعقوب ۲۸۸ واللسان (جبر) والاقتضاب ۴۰۷ [3] قالہ امرؤ القیس فی قصیدة ۵۲ بیتا مطلعہا: امن ذکر سلمی اذ نأتک تنوص - فتقصر عنہا خطوة وتبوص وصدر البیت: ویاکلن من قو لعاعا وربة وفی روایة الدیوان نمیص بدل نمیص وکما فی بعض الطباعة، وہو مصحف والتصویب من المراجع وہی موافقة لما فی اللسان (جبر - نمص) قال السندوبی ونمیص ذاہب الشعر وفی اللسان: النمیص: النبات حین طلع ورقہ راجع للبیت اللسان (جبر) والعقد الثمین ۱۲۶ ودیوانہ ۸۰ (صنعة السندوبی) والجمہرة لابن درید (۳: ۸۹) وابدال ابی الطیب (۲: ۳۸۸) وغریب ابی عبید ۱۶۷۔

معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ علیہ السلام کا فرمان ہے[۵۵] لَا جَبْرَ وَلَا تَفْوِيْضَ۔ کہ انسان نہ تو مجبور محض ہے نہ کلی طور پر مختار۔

علم ریاضی کی اصطلاح میں الجبر کے معنی ہیں کسی چیز کی اصلاح کے لئے اس کے ساتھ کچھ الحاق کرنا اور اَلْجَبْرُ بمعنی بادشاہ بھی آتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[۵۶] (الکامل)

(۸۷) وَانْعِمْ صَبَاحًا اَيُّهَا الْجَبْرُ

(کہ اے بادشاہ سلامت تم خوش رہو۔

بادشاہ کو جبر اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے ارادہ کے مطابق لوگوں کو مجبور کر لیتا ہے یا اس لئے کہ وہ ان کے امور کی اصلاح کرتا ہے۔

اَلْاِجْبَارُ (افعال) اس کے اصل معنی کسی کو مجبور کرنا کہ وہ دوسرے کی اصلاح کرے۔ لیکن عرف میں محض اکراہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اَجْبَرْتُهٗ عَلٰى كَذَا (کسی کام پر مجبور کرنا) اور جن لوگوں کا یہ دعوٰی ہے کہ اللہ تعالٰی انسان کو گناہ پر مجبور کرتا ہے انہیں متکلمین کی اصطلاح میں مُجْبِرَة کہا جاتا ہے اور متقدمین انہیں جَبْرِيَّه یا جَبَرِيَّه کہتے ہیں[۵۷]

اَلْجَبَّارُ انسان کی صفت ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ناجائز تعلّی سے اپنے نقص کو چھپانے کی کوشش کرنا۔ بدیں معنی اس کا استعمال بطور مذمت ہی ہوتا ہے۔ جیسے قرآن میں ہے:۔

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (۱۴-۱۵) تو ہر سرکش ضدی نامراد رہ گیا۔

وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا (۱۹-۳۲) اور مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔

اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ (۵-۲۲) وہاں تو بڑے زبردست لوگ (رہتے) ہیں۔

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ (۴۰-۳۵) ۔۔۔۔ اسی طرح خدا ہر متکبر سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے۔

یعنی جو شخص قبول حق اور اس پر ایمان لانے سے بالاتر ہونے کا دعوٰی کرتا ہے۔

کبھی کبھی محض دوسرے پر استبداد کرنے والے کو جَبَّار کہا جاتا ہے اسی معنی میں فرمایا:۔

وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ (۵۰-۴۵) اور تم ان پر زبردستی کرنے والے نہیں ہو۔

اور ہمسروں پر تعلّی کے معنی کے لحاظ سے بلند کھجور یا اونٹنی کو جَبَّارَة کہا جاتا ہے اور حدیث میں آیا ہے[۵۸] ( )

ضِرْسُ الْکَافِرِ مِثْلُ اُحُدٍ وَكَثَافَةُ جِلْدِهٖ اَرْبَعُوْنَ ذِرَاعًا بِذِرَاعِ الْجَبَّارِ کہ دوزخ میں کافر کی ڈاڑھ کا حجم مثل احد کے ہوگا اور اس کی کھال کی کثافت جبار کے چالیس ذراع کے برابر ہوگی ۔۔۔ تو اس حدیث

---

[۵۵] ورد من علی موقوفًا فی خطبة طویلة انظر (حل) کنز العمال رقم ۶۸ ۱۵ رواه الشافعی [۵۶] قاله ابن احمر وأوله: واسلم براوق حبیت به قال ابن جنی ولم یسمع بالجبر الملک الا فی شعر ابن احمر والبیت فی اللسان (جبر) والمعانی للقتبی ۴۵۵ قال والجبر الرجل اصله سریانی [۵۷] خلاف القدریة قال الحافظ فی تبصیر وہو طریق منعلی الشافعیه وفی البصائر وہذا قول المتقدمین واما فی عرف المتکلمین فیقال لہم المجبرة وکذا فی التاج) ابو عبید ہو کلام مولد وہم فرقة اہل ہوا منسوبون الی شیخہم الحسین بن محمد النجار البصری (فی التاج) قلت ہو ابو عبد اللہ الحسین بن محمد بن عبد اللہ النجار وکان جملة المجبرة ومتکلمیہم ولہ مع النظام مجالس ومناظرات وکتب فی القضاء والقدر وراجع الفہرست لابن الندیم ۲۵۴ والجواہر المضیئة ۲۱۴ وایضا التبصیر ص ۶۱ [۵۸] فی روایة الترمذی عن ابی ہریرة اثنان واربعون ذراعًا ولیس فیہ ذکر ذراع الجبار وفی مسند احمد من حدیث ابی عمر سبعون ذراعًا واما لفظ ضرس الکافر مثل احد فرواہ مسلم وفیہ غلظ جلده مسیرة ثلاث راجع تخریج الاحیاء للعراقی ۴/۴۳۵ وذکر ذراع الجبار و (فی الفائق ۱/۸۶ وفیہ کان ہذا الملک من ملوک العجم تام الذراع وکذا قال القتبی (راجع التاج)۔

کی تفسیر میں ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ یہاں جَبَّارٌ سے مراد بادشاہ ہے اور اس ذراع کو ذِرَاعُ الْجَبَّار کہا جاتا تھا[1]

اور جب الجبار باری تعالیٰ کی صفت ہو جیسے فرمایا:۔ اَلْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ (۵۹-۲۳) غالب زبردست بڑائی والا - تو اس کے اشتقاق میں اہل لغت سے دو قول منقول ہیں بعض نے کہا ہے کہ یہ جَبَرْتُ الْفَقِیْرَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی فقیر کی حالت کو درست کرنے اور اسے بے نیاز کر دینا کے ہیں اور باری تعالیٰ بھی چونکہ اپنے فیضانِ نعمت سے لوگوں کی حالتیں درست کرتا اور ان کے نقصانات پورے فرماتا ہے اس لئے اسے اَلْجَبَّار کہا جاتا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادہ کے سامنے مقہور کر لیتا ہے اس لئے اسے الجبار کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

لیکن بعض ارباب لغت نے بحیثیت لفظ اور صیغہ کے اس معنی پر اعتراض کیا ہے کہ اَفْعَلْتُ سے صیغہ فَعَّال (مبالغہ) قیاساً نہیں آتا۔ لہٰذا اَلْجَبَّار کا صیغہ اِجْبَار (افعال) سے نہیں بن سکتا[2]۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جَبْر سے بنا ہے نہ کہ اِجْبَارٌ سے اور جَبْر کے معنی بھی مجبور کرنا آجاتے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے[3]:۔ لَاجَبْرَ وَلَا تَفْوِیْضَ۔ (کہ نہ مجبور کرنا ہے اور نہ سونپ دینا)

اور معتزلہ کی ایک جماعت نے معنوی لحاظ سے اسے تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ کی شان اس سے بلند ہے کہ بندوں کو مجبور کرے حالانکہ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر بندوں کو بہت سی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے جن سے رہائی پانا ان کے اختیار سے باہر ہے اور جبر کے یہ معنی مقتضائے حکمت الٰہیہ کے عین مطابق ہیں نہ کہ اس کے خلاف جیسا کہ جاہل اور گمراہ لوگوں کا خیال ہے مثلاً مرض، موت بعث بعد از موت وغیرہ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو خاص صنعت اور اعمال و اخلاق میں کوئی طریقہ اختیار کرنے پر مسخر کر رکھا ہے اور اسے مجبور بصورت مختار بنایا ہے کہ ہر انسان جس دھن میں لگا ہے اس میں مگن ہے یا اس سے بیزار ہے لیکن بادل نخواستہ اسے کئے چلا جا رہا ہے کہ گویا اس کے بدلہ میں کوئی اور کام اسے نظر ہی نہیں آتا۔ اسی بنا پر ارشاد ہے:۔

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ زُبُرًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (۲۳-۵۳) تو پھر آپس میں اپنے کام کو متفرق کر کے جدا جدا کر دیا جو چیز جس فرقے کے پاس ہے وہ اسی سے خوش ہو رہا ہے۔ نیز فرمایا:۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَهُمْ مَّعِیْشَتَهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا (۴۳-۳۲) ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا۔

اس معنی میں الجبار اللہ تعالیٰ کی صفت ہونا ظاہر ہے کیونکہ اگر وہ کسی پر جبر کرتا ہے تو تفضلاً

---

[1] کذا فی التاج (جبر) [2] قالہ القلیبی کما فی التاج ؎ جوزہ الفراء وقال: لم اسمع فعال الامن افعل الا فی حرفین ؎ ہو جبار من اجبرت و دراک من ادرکت وایضاً وافقہ الازہری [3] قدمر الان تخریجہ وایضاً الشاہد فی ارجوزۃ العجاج دسباقی من قول علیؓ۔

حکمت کے مطابق کرتا ہے جیسا کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے[1] (۵۶)

یَا بَارِئَ النَّسَمَاتِ وَ جَبَّارَ الْقُلُوْبِ عَلٰی فِطْرَتِهَا وَ شَقِیِّهَا وَ سَعِیْدِهَا کہ اے روحوں کو پیدا کرنے والے اور دلوں کو ان کی اچھی یا بری فطرت پر جوڑنے والے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دلوں کو علم و عرفان کے لحاظ سے ان کی اصلی فطرت پر جوڑ دیا ہے اور یہ ما تقدم کے عموم میں داخل ہے۔

اَلْجَبَرُوْتُ (قدرت) طاقت عظمت، یہ تجبر و تفعل سے فَعَلُوْتٌ کے وزن پر ہے۔

اِسْتَجْبَرْتُ حَالَهٗ میں نے اس کی حالت درست کرنے کے لئے اس کی دیکھ بھال کی۔

اَصَابَتْهُ مُصِیْبَةٌ لَا یُجْتَبَرُ اسے اتنی بڑی مصیبت پہنچی کہ وہ اس کے جبر کا قصد نہیں کرسکتا۔

اور جَبْرُ الْعَظْمِ ہڈی کو جوڑنا ہے اَلْجَبِیْرَةُ مشتق ہے جس کے معنی اس پٹی کے ہیں جو ٹوٹی ہوئی ہڈی پر باندھی جاتی ہے اور اَلْجِبَارَةُ اس لکڑی کو کہتے ہیں جو ٹوٹی ہوئی ہڈی پر باندھی جاتی ہے اَلْجَبِیْرَةُ کی جمع اَلْجَبَائِرُ آتی ہے نیز تشبیہ کے طور پر کنگن اور بازو بند کو بھی جِبَارَةٌ کہا جاتا ہے اور اَلْجُبَارُ جس کی دیت ساقط ہو[2]

(ج ب ل)

اَلْجَبَلُ پہاڑ ج اَجْبَالٌ وَ جِبَالٌ

قرآن میں ہے: . اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهَادًا. وَ الْجِبَالَ اَوْتَادًا (۷۸ - ۶، ۷) کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟ اور پہاڑوں کو اس کی میخیں نہیں ٹھہرایا؟

وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا (۷۹ - ۳۲) اور اس پر پہاڑوں کا بوجھ رکھ دیا۔

وَ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْ بَرَدٍ (۲۴ - ۴۳) ۔۔۔ اور آسمان میں جو اولوں کے پہاڑ ہیں ان سے اولے نازل کرتا ہے۔

وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا۔ (۳۵ - ۲۷) اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات ہیں۔

وَ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ یَنْسِفُهَا رَبِّیْ نَسْفًا۔ (۲۰ - ۱۰۵) اور تم سے پہاڑوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ خدا ان کو اڑا کر بکھیر دے گا۔

وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ (۲۶ - ۱۴۹) اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر گھر بناتے ہو۔

اور پہاڑ کی مختلف صفات کے اعتبار سے استعارۃ ہر صفت کے مطابق اشتقاق کر لیتے ہیں مثلاً معنی ثبات کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ جَبَلٌ لَا یَتَزَحْزَحُ کہ فلاں نہ ہلنے والا پہاڑ ہے۔

جَبَلَهُ اللّٰهُ عَلٰی کَذَا۔ اس کی فطرت ہی ایسی ہے یعنی تبدیل نہیں ہوسکتی۔ فُلَانٌ ذُوْ جَبَلَةٍ فلاں بھدے جسم کا ہے۔ ثَوْبٌ جَیِّدُ الْجَبْلَةِ عمدہ اور مضبوط بنا ہوا کپڑا۔

---

[1] وفی الفائق ار ۱۹۳ عن سلامۃ الکندی کان علیؓ یعلمنا الصلوۃ علی النبی ونقله تماما تقریبا فی سبعۃ اسطر ۱۲ [2] وفی الحدیث المعدن جبار والبئر جبار والعجماء جبار ۔ ای الجرح والدم فی ہذہ الثلاثۃ ہدر لاارش فیہا بذوفی المشروع من الارض مکان من الارض مصحف والتسدید من المراجع ۱۲

اور بڑائی وعظمت کے معنیٰ کا اعتبار کرتے ہوئے بڑی جماعت کو جِبِلٌّ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا (۳۶-۶۲) اور اس نے تم میں سے بہت سی خلقت کو گمراہ کر دیا تھا۔

ایک قرأت میں جُبُلًّا تشدید کے ساتھ ہے۔ تَوَّزِیْ نے کہا ہے کہ جُبْلًا وَجَبْلًا وَجُبُلًّا وَجِبِلًّا کے ایک ہی معنیٰ ہیں[1]

اور دوسرے علماء نے کہا ہے جِبِلًّا جِبِلَّةٌ کی جمع ہے اور اسی سے آیت:۔ وَاتَّقُوا الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِیْنَ (۲۶-۱۸۴) میں جبلۃ سے مراد ان کے وہ احوال ہیں جن پر ان کو پیدا کیا تھا اور وہ راستے جن پر چلنے کے وہ فطرۃً پابند تھے۔ جس کی طرف آیت کریمہ:۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ (۱۷-۸۴) کہدو کہ ہر شخص اپنے طریق کے مطابق عمل کرتا ہے۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے جَبُلَ فُلَانٌ فلاں پہاڑ کی طرح غلیظ الجسم ہے۔

(ج ب ن)

اَلْجَبِیْنُ پیشانی کا کنارہ۔ اور پیشانی کے دونوں طرف کے کناروں کو جَبِیْنَانِ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔ وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ (۳۷-۱۰۳) اور باپ نے بیٹے کو پٹ پڑی کے بل لٹالیا۔

اَلْجُبْنُ (بزدلی) دل کا ایسے موقع پر کمزوری کا اظہار کرنا جہاں اسے قوت کا مظاہرہ کرنا چاہیئے تھا۔ جَبَانٌ بزدل (مذکر ومؤنث)، اَجْبَنْتُهٗ بزدل پانا کسی پر بزدلی کا حکم لگانا۔ اَلْجُبْنُ (ایضًا) پنیر تَجَبَّنَ اللَّبَنُ دودھ پنیر بن گیا یا پنیر کی طرح جم گیا۔

(ج ب ہ)

اَلْجَبْهَةُ (ماتھا، پیشانی) سر کا وہ حصہ جو سجدہ کی حالت میں زمین پر لگتا ہے اس کی جمع جِبَاہ آتی ہے جیسے فرمایا:۔ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ (۹-۳۵) پھر ان سے ان (بخیلوں) کی پیشانیوں اور پہلوؤں کو داغا جائیگا۔ اور جَبْهَةٌ کے معنیٰ ثریا ستارہ کے بھی آتے ہیں گویا وہ بھی برج اسد کے لئے بمنزلہ پیشانی کے ہے۔ جَبْهَةُ الْقَوْمِ سرداران قوم جیسا کہ انہیں وُجُوْهُ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے اور جَبْهَة کے معنیٰ گھوڑے بھی آتا ہے جیسا کہ مروی ہے[2]: اَنَّهٗ لَيْسَ فِی الْجَبْهَةِ صَدَقَةٌ یعنی گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں ہے۔

(ج ب ی)

جَبَى (ض) جِبَايَةً۔ اَلْمَاءَ فِی الْحَوْضِ حوض میں پانی جمع کیا اور بڑے حوض کو جَابِيَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع جَوَابٍ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] ففیہ اربع قرارت جُبُلًّا نسبہ الطبری الی سدح وزید وخال وہو قراءۃ الحسن والاعرج والزہری راجع الطبرسی ۲۲/۲/۴-۲ والتیسیر للدانی ۱۸۴ والتوزی ہو ابو محمد عبداللہ بن محمد التوزی من علماء البصرۃ (۔ ۲۳۰) راجع البغیہ ۲۹۰ والانباہ ۲/۲۶ ۱۲ ؞

[2] وفی الفائق ۱/۱۸۷ وسمیت بذالک لانہا خیار البہائم والحدیث باختلاف الفاظہ فی البیہقی عن ابی ہریرۃ والحاکم فی الکنی عن الحسن عن عبدالرحمان بن سمرۃ وفی مراسلہ والبیہقی ایضا عن الحسن مرسلا وابو عبید فی غریبہ راجع لتخریجہ (زخیل) ؞ ؞

وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ (۳۴-۱۳) اور لگن جیسے بڑے بڑے حوض۔ اور اسی سے بطور استعارہ جَبَیْتُ الْخَرَاجَ جِبَایَةً کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی مال خراج جمع کرنے کے ہیں۔

قرآن میں ہے:۔

يُجْبَىٰ إِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ (۲۸-۵۷) جہاں ہر قسم کے میوے پہنچائے جاتے ہیں۔

اَلْاِجْتِبَاءُ (افتعال) کے معنی انتخاب کے طور پر کسی چیز کو جمع کرنے کے ہیں لہذا آیت کریمہ:۔ وَإِذَا لَمْ تَأْتِهِمْ بِآيَةٍ قَالُوا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا (۷-۲۰۳) اور جب تم ان کے پاس (کچھ دنوں تک) کوئی آیت نہیں لاتے تو کہتے ہیں کہ تم نے (اپنی طرف سے) کیوں نہیں بنا لی۔ میں لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا کے معنی یہ ہوں گے کہ تم خود ہی ان کو تالیف کیوں نہیں کر لیتے دراصل کفار یہ جملہ طنزاً کہتے تھے کہ یہ آیات اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ بلکہ تم خود ہی اپنے طور بنا لیتے ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کا کسی بندہ کو چن لینا کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اسے اپنے فیض کے لئے برگزیدہ کر لیتا ہے جسے گونا گوں نعمتیں جدوجہد کے بغیر حاصل ہو جاتی ہیں یہ انبیاء کے ساتھ خاص ہے اور صدیقوں اور شہیدوں کے لئے جو ان کے قریب درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جیساکہ یوسف کے متعلق فرمایا:۔ وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ (۱۲-۶) اور اسی طرح خدا تمہیں برگزیدہ (وممتاز) کرے گا۔

فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ (۶۸-۵۰) پھر پروردگار نے ان کو برگزیدہ کر کے نیکوکاروں میں کر لیا۔

وَاجْتَبَيْنَاهُمْ وَهَدَيْنَاهُمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۶-۸۷) ان کو برگزیدہ بھی کیا تھا اور سیدھا رستہ بھی دکھایا تھا۔

ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ (۲۰-۱۲۲) پھر ان کے پروردگار نے ان کو نوازا تو ان پر مہربانی سے توجہ فرمائی اور سیدھی راہ بتائی۔

يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَن يُنِيبُ (۴۲-۱۳) جس کو چاہتا ہے اپنی بارگاہ کا برگزیدہ کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرے اسے اپنی طرف رستہ دکھا دیتا ہے۔

اس اجتباء کو دوسرے مقام پر اخلاص سے تعبیر فرمایا ہے۔ إِنَّا أَخْلَصْنَاهُم بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ (۳۸-۴۶) ہم نے ان کو ایک (صفت) خاص (آخرت کے) گھر کی یاد سے ممتاز کیا تھا۔

(ج ث ث)

جَثَّهٗ (ن) جَثًّا کے معنی کسی چیز کو جڑ سے اکھاڑ دینے کے ہیں اور اِنْجَثَّ اس کا مطاوع آتا ہے جیساکہ جَثَّ کا مطاوع اِجْتَثَّ آتا ہے قرآن میں ہے[1]:۔

اُجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ (۱۴-۲۶) زمین کے اوپر ہی سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے۔

اَلْمِجَثَّةُ ہر وہ آلہ جس سے درخت کو اکھاڑا یا کھودا جائے۔

جُثَّةُ الشَّيْءِ کے معنی کسی کے ابھرے ہوئے شخص کے ہیں اور اَلْجُثُّ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو زمین سے بلند ہو جائے جیسے ٹیلہ وغیرہ۔

---

[1] وفی الحدیث قال رجل لنبی صلی اللہ علیہ وسلم ماہذہ الکمأۃ الا الشجرۃ التی اجتثت من فوق الارض فقال لابل ہی من المن (التاج) ۱۲

اَلْجُثْبُثَۃُ کھجور کا پودا جو اکھاڑ کر لگایا گیا ہو۔
اَلْجُثْجَاثُ ایک قسم کا گھاس۔ ایک کڑوا خوشبودار زرد درخت جس میں بابونہ کی طرح پھول ہوتے ہیں۔

(ج ث م)

جَثَمَ (ض ن) جَثْمًا وَجُثُوْمًا۔ الطائر پرندکا زمین پر سینہ کے بل بیٹھنا اور اس کے ساتھ چمٹ جانا۔ اسی سے استعارہ کے طور پر فرمایا:۔
فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِھِمْ جَاثِمِیْنَ (۷-۹۱) اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔
اَلْجُثْمَانُ بیٹھے ہوئے انسان کا شخص۔ رَجُلٌ جُثَمَۃٌ وَجَثَّامَۃٌ بہت سونے والا سست آدمی۔

(ج ث و)

جَثَا (ن) جُثُوًّا وَجِثِیًّا۔ الرَّجُلُ گھٹنوں کے بل بیٹھنا یہ عَتَا (ن) عَتُوًّا وَعِتِیًّا کی طرح (باب نصر سے آتا ہے) جَاثٍ (صیغہ صفت) ج جُثِیٌّ جیسے بَاكٍ وَبُكِیٌّ۔ اور آیت کریمہ:۔
وَنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْھَا جِثِیًّا (۱۹-۷۲) اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل پڑا ہوا چھوڑ دیں گے۔ میں جِثِیًّا، جَاثٍ کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور مصدر بمعنی اسم فاعل بھی اور آیت کریمہ:۔
وَتَرٰی كُلَّ اُمَّۃٍ جَاثِیَۃً (۴۵-۲۸) اور تم ہر ایک فرقے کو دیکھو گے کہ گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوگا۔ میں "جَاثِیَۃً" جمع کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جیسے جَمَاعَۃٌ قَائِمَۃٌ اَوْ قَاعِدَۃٌ۔

(ج ح د)

جَحَدَ (ف) جَحْدًا وَجُحُوْدًا (جان بوجھ کر انکار کر دینا) کے معنی دل میں جس چیز کا اقرار ہو اس کا انکار اور جس کا انکار ہو اس کا اقرار کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَجَحَدُوْا بِھَا وَاسْتَیْقَنَتْھَا اَنْفُسُھُمْ (۲۷-۱۴) اور ان سے انکار کیا کہ انکے دل انکو مان چکے تھے۔
بِاٰیٰتِنَا یَجْحَدُوْنَ (۷-۵۱) اور ہماری آیتوں سے منکر ہو رہے تھے۔ کہا جاتا ہے:۔
رَجُلٌ جَحِدٌ یعنی کنجوس اور قلیل الخیر آدمی جو فقر کو ظاہر کرے۔
اَرْضٌ جَحْدَۃٌ خشک زمین جس میں روئیدگی نہ ہو۔
محاورہ ہے:۔ جَحْدًا لَهٗ وَنَكَدًا (اسے خیر حاصل نہ ہو۔
اَجْحَدَ۔ (افعال) انکار کرنا۔ منکر ہونا۔

(ج ح م)

اَلْجَحْمَۃُ آگ بھڑکنے کی شدت اسی سے اَلْجَحِیْمُ (فعیل) ہے جس کے معنی دوزخ یا دہکتی ہوئی آگ کے ہیں۔
اور جَحُمَتِ النَّارُ سے بطور استعارہ جَحِمَ (س) وَجْھُهٗ مِنْ شِدَّۃِ الْغَضَبِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی غصہ سے چہرہ جل بھن جانے کے ہیں کیونکہ غصہ کے وقت بھی حرارت قلب بھڑک اٹھتی ہے کہا جاتا ہے:۔
جَحَمَ (ف) اَلْاَسَدُ بِعَیْنَیْهِ شیر نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا کیونکہ شیر کی آنکھیں بھی آگ کی طرح روشن ہوتی ہیں۔

(ج د د)

اَلْجَدُّ (مصدر ض) کے اصل معنی ہموار زمین پر چلنے کے ہیں۔ اسی سے جَدَّ فِیْ سَیْرِہٖ

ما فی المطبوع "بعد طعنہ" مصحف والصحیح بعد قلعہ کما فی المعاجم

ہے جس کے معنی تیز روی کے ہیں اور جب کوئی شخص اپنے معاملہ میں محنت اور جانفشانی سے کام کرے تو کہا جاتا ہے جَدَّ فِی اَمْرِہٖ۔
اور اَجَدَّ (افعال) کے معنی صاحب جِد ہونے کے ہیں اور جَدَدْتُ الْاَرْضَ سے کسی چیز کو کاٹنے کا معنی لیا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے جَدَدْتُہٗ (میں نے درست کرنے کے لئے اسے کاٹا) اور ثَوْبٌ جَدِیْدٌ کے اصل معنی قطع کئے ہوئے کپڑا کے ہیں اور چونکہ جس کپڑے کو کاٹا جاتا ہے وہ عموماً نیا ہوتا ہے اس لئے ہر نئی چیز کو جَدِیْدٌ کہا جانے لگا ہے اس بنا پر آیت:۔
بَلْ ھُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ (۵۰-۱۵)
میں خلق جدید سے نشاۃ ثانیہ یعنی مرنے کے بعد دوبارہ نئے سرے سے پیدا ہونا مراد ہے کیونکہ کفار اس کا انکار کرتے ہوئے کہتے تھے۔
أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ۔
(۵۰-۳) بھلا جب ہم مر گئے اور مٹی ہو گئے (تو پھر زندہ ہوں گے؟) یہ زندہ ہونا (عقل سے) بعید ہے۔
اور جدید (نیا) خلق یعنی پرانا کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے اسی اعتبار سے رات دن کو جَدِیْدَانِ اور اَجَدَّانِ کہا جاتا ہے۔ اور آیت:۔
وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِیْضٌ (۳۵-۲۷) اور پہاڑوں میں سفید رنگ کے قطعات ہیں۔
میں جُدَدٌ کا واحد جُدَّۃٌ ہے جس کے معنی کھلے راستہ کے ہیں اور یہ طَرِیْقٌ مَجْدُوْدٌ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی وہ راستہ جس پر چلا جائے اسی سے جَادَّۃُ الطَّرِیْقِ ہے (جس کے معنی شاہراہ یا ہموار اور راستہ کے درمیانی حصہ کے ہیں جس پر عام طور پر آمد ورفت ہوتی رہتی ہے)
اَلْجَدُوْدُ وَالْجَدَّاءُ خشک تھنوں والی بھیڑ بکری اور سب وشتم کے طور پر کہا جاتا ہے۔
جُدَّ ثَدْیُ اُمِّہٖ اس کی ماں کے پستان خشک ہو جائیں اور جَدٌّ کا لفظ فیض الٰہی پر بھی بولا جاتا ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَاَنَّہٗ تَعَالٰی جَدُّ رَبِّنَا (۷۲-۳) اور یہ کہ ہمارے پروردگار کا فیضان بہت بڑا ہے۔
میں جَدٌّ بمعنی فیض الٰہی ہی کے ہے بعض کے نزدیک اس کے معنی عظمت کے ہیں[1] لیکن اس کا مرجع بھی معنی اول کی طرف ہی ہے اور اللہ تعالٰے کی طرف اس کی اضافت اختصاص مِلک کے طریق سے ہے اور حظوظ دنیوی جو اللہ تعالٰے انسان کو بخشتا ہے پر بھی جَدٌّ کا لفظ بولا جاتا ہے جس کے معنی بخت ونصیب کے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے جُدِدْتُ وَحُظِظْتُ خوش قسمت اور صاحب نصیب ہو گیا اور حدیث (۵۸)
وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ[2]۔ کے معنی یہ ہیں کہ دنیاوی مال وجاہ سے آخرت میں ثواب حاصل نہیں ہو سکے گا بلکہ اُخروی ثواب کے حصول کا ذریعہ صرف طاعت الٰہی ہے۔ جیسا کہ آیت:۔
مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَاءُ الآیۃ کے بعد فرمایا:۔
وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا
(۱۷-۱۹) اور جو شخص آخرت کا خواستگار ہو اور

---

[1] راجع غریب القرآن للقتیبی ۱۹ [2] اخرجہ مسلم فی صحیحہ ۱/۱۹۰ من حدیث ابی سعید الخدری وابن عباس (باب الدعاء بعد الرکوع) والنسائی عن معاویہ: (ما یقول اذا انصرف من الصلوۃ کنز العمال ۲ رقم ۲۰۸۹) ۱۲

اور اس میں اتنی کوشش کرے۔ جتنی اسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔

نیز اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔ یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوۡنَ (۲۶-۸۸) جس دن نہ مال ہی کچھ فائدہ دے گا اور نہ بیٹے۔

اَلْجَدُّ (ایضًا) دادا۔ نانا۔

بعض نے کہا ہے کہ لَا یَنۡفَعُ ذَا الۡجَدِّ کے معنی یہ ہیں کہ اسے آبائی نسب فائدہ نہیں دے گا اور جس طرح کہ آیت لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوۡنَ۔ میں اولاد کے فائدہ بخش ہونے کی نفی کی ہے اسی طرح حدیث میں آباؤ اجداد کے نفع بخش ہونے کی نفی کی گئی ہے۔

(ج د ث)

جَدَثٌ۔ قبر ج اَجۡدَاثٌ قرآن میں ہے:۔ یَوۡمَ یَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ سِرَاعًا (۷۰-۴۳) اس دن یہ قبر سے نکل کر (اس طرح) دوڑیں گے۔

اور سورۃ یٰسٓ میں ہے:۔ فَاِذَا هُمۡ مِّنَ الۡاَجۡدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمۡ یَنۡسِلُوۡنَ (۳۶-۵۱) یہ قبروں سے نکل کر اپنے پروردگار کی طرف دوڑیں گے۔ اور قبر کو جَدَفٌ بھی کہا جاتا ہے[1]۔

(ج د ر)

اَلْجِدَارُ کے معنی حائِط (دیوار) ہی کے ہیں لیکن اس اعتبار سے کہ وہ زمین سے اونچی اور بلند ہوتی ہے اسے جدار کہا جاتا ہے اور اس اعتبار سے کہ احاطہ کئے ہوئے ہوتی ہے اسے حائط کہا جاتا ہے۔ جدار کی جمع جُدُرٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

وَاَمَّا الۡجِدَارُ فَکَانَ لِغُلٰمَیۡنِ (۱۸-۸۲) اور وہ جو دیوار تھی سو دو یتیم لڑکوں کی تھی۔

جِدَارًا یُّرِیۡدُ اَنۡ یَّنۡقَضَّ فَاَقَامَهٗ (۱۸-۷۷) ایک دیوار دیکھی جو (جھک کر) گرا چاہتی تھی خضر نے اس کو سیدھا کر دیا۔

اَوۡ مِنۡ وَّرَآءِ جُدُرٍ (۵۹-۱۴) یا دیواروں کی اوٹ میں۔ اور حدیث میں ہے (۵۹)

حَتّٰی یَبۡلُغَ الۡمَآءُ الۡجُدُرَ جب تک کہ پانی دیوار تک نہ پہنچ جائے[2]۔

جَدَّرْتُ الۡجِدَارَ دیوار کو اونچا کر دیا۔

اور اسی میں معنی ارتفاع کے اعتبار سے جَدَرَ الشَّجَرُ کہا جاتا ہے جس کے معنی ہیں چنے کے دانے کی طرح درخت کے کونپل نکل آئے اسی طرح اس طرح وہ روئیدگی جو زمین پر ظاہر ہو۔ اسے جَدۡرٌ کہا جاتا ہے اس کا واحد جِدۡرَةٌ ہے اور اَجۡدَرَتِ الۡاَرۡضُ کے معنی ہیں زمین سبزہ زار ہو گئی۔

جَدَرَ (ن) الصَّبِیُّ وَجُدِرَ بچے کو چیچک نکل آئی۔ یہ محاورہ درخت کے کونپل کے ساتھ تشبیہا بولا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اَلۡجُدۡرِیُّ وَالۡجَدَرَةُ کے معنی غدود یا آبلہ کے ہیں جو جسم پر ظاہر ہوتا ہے اس کی جمع اَجۡدَارٌ ہے۔ شَاةٌ جَدۡرَاءُ گوسپند آبلہ زدہ۔

---

[1] راجع کتاب الابدال لابی الطیب ۱/۱۹۲ [2] قال صلی اللہ علیہ وسلم فی شراج الحرۃ حین اختصم الیہ الزبیر بن العوام وحاطب بن ابی بلتعۃ فقال یا زبیر اسق ثم ارسل الماء الی جارک فغضب الانصاری وقال: ان کان ابن عمتک فقال صلی اللہ علیہ وسلم اسق یا زبیر ثم احبس الماء حتی یرجع الی الجدر الحدیث (الکشاف ۱/۲۷۸) وابن ابی حاتم عن سعید بن المسیب فی الصحیحین من طریق الزہری عن عروۃ وراجع تخریج الکشاف ۴۵ رقم ۲۷۲ وغریب ابی عبید ۱۴ : ۲۰۱) (الفائق ۱/۱۹۵)

اَلْجَیْدَرُ کوتاہ قد یہ بھی جدار سے مشتق ہے لیکن بطور تحکم اس میں یاء زائدہ کر دی گئی ہے حقارت کو ظاہر کرنے کے لئے اس میں یا بڑھا دی گئی ہے۔ جیسا کہ ہم اپنی کتاب "اصول الاشتقاق" میں بیان کر چکے ہیں۔

اَلْجَدِیْرُ (سزاوار) اس کے معنی منتہیٰ کے ہیں۔ کیونکہ اس تک کسی امر کی انتہا ہوتی ہے جیسا کہ دیوار تک پہنچ کر کوئی چیز رک جاتی ہے اور جَدَرَ رک، بکذا کے معنی کسی چیز کے لائق ہونے کے ہیں اس سے صیغہ صفت جَدِیْرٌ آتا ہے۔

مَا اَجْدَرَہٗ وَ اَجْدِرْ بِہٖ (صیغہ تعجب) وہ اسکے لئے کس قدر زیبا ہے۔

(ج د ل)

اَلْجِدَالُ (مفاعلۃ) کے معنی ایسی گفتگو کرنا کے ہیں جسمیں طرفین ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کریں اصل میں یہ جَدَلْتُ الْحَبْلَ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں رسی کو مضبوط بٹنا اسی سے بٹی ہوئی رسی کو اَلْجَدِیْلُ کہا جاتا ہے جَدَلْتُ الْبِنَاءَ مضبوط عمارت بنانا۔ دِرْعٌ مَجْدُوْلَۃٌ مضبوط زرہ۔

اَلْاَجْدَلُ شکرا۔ کیونکہ اس کا بدن بھی گٹھا ہوا ہوتا ہے۔

اَلْمِجْدَلُ مضبوط محل

اسی سے اَلْجِدَالُ (جھگڑنا) ہے کیونکہ جھگڑنے والے بھی ایک دوسرے کو اس کی رائے سے اس طرح پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ رسی کو پیچ دیا جاتا ہے۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ اصل میں جِدال کے معنی صِرَاع یعنی ایک دوسرے کو جَدَالَۃ یعنی سخت زمین پر پچھاڑ دینا کے ہیں قرآن میں ہے۔

وَجَادِلْہُمْ بِالَّتِیْ ہِیَ اَحْسَنُ (۱۶-۱۲۵) اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو۔

اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْ اٰیَاتِ اللّٰہِ (۴۰-۳۵) جو لوگ ... خدا کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں۔

وَاِنْ جَادَلُوْکَ فَقُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ (۲۲-۶۸) اور اگر یہ تم سے جھگڑا کریں تو کہدو کہ .... خدا ان سے خوب واقف ہے۔

قَدْ جَادَلْتَنَا فَاَکْثَرْتَ جِدَالَنَا (۱۱-۳۲) تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور جھگڑا بھی بہت کیا۔ ایک قرأت میں جَدَلَنَا بھی ہے۔

مَا ضَرَبُوْہُ لَکَ اِلَّا جَدَلًا (۴۳-۵۸) انہوں نے (عیسیٰ کی) جو مثال بیان کی ہے تو صرف جھگڑنے کو۔

وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا (۱۸-۵۴) لیکن انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔

وَھُمْ یُجَادِلُوْنَ فِی اللّٰہِ (۱۳-۱۳) اور وہ خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔

یُجَادِلُنَا فِیْ قَوْمِ لُوْطٍ (۱۱-۷۴) وہ قوم لوط کے بارے میں لگے ہم سے بحث کرنے۔

وَجَادَلُوْا بِالْبَاطِلِ (۴۰-۵) اور بیہودہ (شبہات سے) جھگڑتے رہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ (۲۲-۳) اور بعض لوگ ایسے ہیں جو خدا کی شان میں .... جھگڑتے .... ہیں۔

وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ (۲-۱۹۷) تو حج کے دنوں میں .... نہ کسی سے جھگڑے۔

(ج ذ ذ)

اَلْجَذُّ (ن) کے معنی کسی چیز کو توڑنے اور

ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں اور پتھر یا سونے کے ریزوں کو جُذَاذ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:۔
فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا (۲۱-۵۸) پھران کو توڑ کر ریزہ ریزہ کردیا۔
عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ (۱۱-۱۰۸) یہ (خدا کی) بخشش ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی۔
محاورہ ہے۔
مَا عَلَيْهِ جُذَّةٌ یعنی اس کے بدن پر چیتھڑا بھی نہیں ہے۔

(ج ذ ع)

اَلْجِذْعُ درخت کا تنہ۔ ج جُذُوْعٌ
قرآن میں ہے:۔ فِي جُذُوْعِ النَّخْلِ (۲۰-۷۱)
جَذَعَهُ (ف) شاخ یا تنے کی طرح کاٹ ڈالنا۔
اَلْجَذَعُ (من الابل) شتر بسال پنجم (من الشاة) گوسپند بسال دوم اور چوپایوں کے ساتھ تشبیہ دے کر زمانہ کو بھی جَذَعٌ کہا جاتا ہے کیونکہ زمانہ بھی کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔

(ج ذ و)

اَلْجَذْوَةُ وَالْجُذْوَةُ (انگارہ) جلنے اور شعلہ ختم ہوجانے کے بعد جو ایندھن باقی رہ جاتا ہے اسے جَذْوَۃ کہا جاتا ہے ج جِذًی وجُذًی
قرآن میں ہے:۔
اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ (۲۸-۲۹) یا آگ کا انگارہ۔
خلیل نے کہا ہے کہ جَذَا اور جَثَا ہم معنی ہیں یعنی چمٹ جانا مگر جَذَا میں شدت لزوم کے معنی پائے جاتے ہیں چنانچہ محاورہ ہے:۔
جَذَا الْقُرَادُ فِي جَنْبِ الْبَعِيْرِ کہ چچڑی اونٹ کے پہلو میں سختی کے ساتھ چمٹ گئی۔
اَجْذَتِ (افعال) الشَّجَرَةُ درخت کا جڑ پکڑ لینا۔ حدیث میں ہے [۱]۔ (۶۰)
كَمَثَلِ الْاَرْزَةِ الْمُجْذِيَةِ اس کی مثال مضبوط جڑ والے صنوبر کے درخت کی ہے (یعنی جو ہوا کے جھکولوں سے ادھر ادھر نہیں جھکتا)
رَجُلٌ جَاذٍ مرد کوتاہ دست وکوتاہ ارش مونث جَاذِيَةٌ کوتاہ ہوتے ہیں اس کے دونوں ہاتھ گویا پارۂ آتش ہیں۔

(ج ر ح)

جَرَحَهُ (ف) جَرْحًا زخمی کرنا صفت مفعول جَرِيْحٌ وَمَجْرُوْحٌ (زخمی) جُرْح (اسم) ج جُرُوْحٌ
قرآن میں ہے:۔
وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ (۵-۴۵) اور سب زخموں کا اسی طرح بدلہ ہے۔
اور زخم کے ساتھ تشبیہ دے کر گواہ پر بحث کرنے کو بھی جَرْح کہا جاتا ہے اور کتے چیتے اور پرندے شکاری جانور کو جَارِحَۃ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع جَوَارِح ہے اور شکاری جانوروں کو جَوَارِح یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ شکار کو زخمی کرتے ہیں اور یا اس لئے کہ وہ کما کر لاتے ہیں ان ہر دو وجوہ میں سے کسی ایک کی بنا پر اعضاء کاسبہ یعنی ہاتھ پاؤں کو جَوَارِح کہا جاتا ہے۔
قرآن میں ہے۔

---

[۱] راجع الفائق ۱/۱۸۶ ولفظۃ الحدیث متفق علیہ من حدیث کعب بن مالک فی اثنا (حدیث) مثل المؤمن الحدیث (راجع المسلم مع النووی ۲/۳۷۵ طبقۃ الہند وضبط النووی المجذیۃ بالیاء (ن) اجذب والبخاری (مرضی توحید و "دی" افاق رحم) ۲/۵۲۳-۲/۸۴۵-۵/۱۴۲ وغریب ابی عبید ج ۱ ص ۱۱۶ - ۱۱۷) ؎

وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ (۵-۴)
اور وہ شکار بھی حلال ہے) جو تمہارے شکاری جانوروں نے پکڑا ہو جن کو تم نے سدھا رکھا ہے۔
اَلْاِجْتِرَاحُ (جرائم کا ارتکاب کرنا) اصل میں جَرَاحَۃ سے ہے جیسا کہ اِقْتِرَاف کا لفظ قَرَفَ الْقَرْحَۃَ سے مشتق ہے جس کے معنی زخم کو چھیلنے کے ہیں۔
قرآن میں ہے:۔
اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ (۴۵-۲۱)
جو لوگ برے کام کرتے ہیں کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں۔

(ج ر د)

اَلْجَرَادُ۔ ٹڈی اس کا واحد جَرَادَۃٌ ہے۔
قرآن میں ہے:۔
فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ (۷-۱۳۳) ہم نے اِن پر طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں ...... بھیجیں۔
كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ (۵۴-۷) الغرض جَرَادٌ کے معنی ٹڈی کے ہیں۔ اس میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اصل ہو اور اس سے جَرَدَ الْاَرْضَ مشتق ہو جس کے معنی ہیں ٹڈی زمین پر سے گھاس چٹ کر گئی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جراد خود جَرْدٌ سے مشتق ہو جس کے معنی ننگا کرنے کے ہیں اور چونکہ ٹڈی زمین کی روئیدگی کو کھا کر اسے ننگا اور صاف کر دیتی ہے اس لئے ٹڈی کو جراد کہا گیا ہے اور اَرْضٌ مَجْرُوْدَۃٌ اس زمین کو کہا جاتا ہے جس کی نباتات کو ٹڈیوں نے کھا کر صاف کر دیا ہو۔

فَرَسٌ اَجْرَدُ بے بال یا چھوٹے بالوں والا گھوڑا۔ ثَوْبٌ جَرْدٌ پرانا کپڑا۔ کیونکہ اس کی روئیں جھڑ جاتی ہے اور کمزور ہو جاتا ہے۔ تَجَرَّدَ عَنِ الثَّوْبِ ننگا ہونا کپڑے اتار دینا جَرَّدْتُہٗ (عن الثیاب) ننگا کرنا۔
اِمْرَءَۃٌ حَسَنَۃُ الْمُتَجَرَّدِ یعنی خوب صورت بدن است وقت برہنگی ایک روایت میں ہے[1]
جَرِّدُوا الْقُرْاٰنَ قرآن کو علیحدہ رکھو یعنی اس کے ساتھ کوئی چیز خلط ملط نہ کرو۔
اِنْجَرَدَ بِنَا السَّيْرُ۔ دراز گردید سفر۔
جَرِدَ الْاِنْسَانُ خراج برآرد پوست انسان از خوردن ملخ یعنی ملخ کے کھانے سے جسم پر پھنسی اچھلنا۔

(ج ر ز)

جُرُزٌ۔ وہ زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہوتا ہو (فرمایا)۔
صَعِيْدًا جُرُزًا (۱۸-۸) بنجر میدان ... یعنی جس پر گھاس درخت وغیرہ کوئی چیز نہ ہو۔
اَرْضٌ مَجْرُوْزَۃٌ زمین جس سے گھاس چر کر ختم کر دیا گیا ہو۔
اَلْجَرُوْزُ جو دستر خوان کو صاف کر ڈالے۔ مثل مشہور ہے:۔ لَا تَرْضٰى شَانِئَۃٌ اِلَّا بِجَرْزَۃٍ یعنی اس کے دشمن اس کا استیصال کئے بغیر خوش نہیں ہوں گے۔
اَلْجَارِزُ سخت کھانسی (اس میں معنی جرز کا تصور پایا جاتا ہے)
اَلْجَرَازُ تلوار سے کاٹنا۔ سَيْفٌ جُرَازٌ شمشیر بران

[1] موقوفا علی ابن مسعود وتمامہ لیربو فیہ صغیرکم ولا ینائی عنہ کبیرکم فان الشیطان یخرج من بیت تقرء فیہ سورۃ البقرۃ الفائق (۱/۱۹۶) وفی تاویلہ قولان: اراد رضی اللہ عنہ تجریدہ عن النقط والعشور لئلا نشا نشوء فیری انہا من القرآن وقیل ہو حث علی ان لا یتعلم غیرہا الی حصرہ بالتعلم غریب ابی عبیدہ ۴/۴۲-۴۹ ۔ ۱۲

(ج ر ع)

جَرَعَ (ف)، جَرْعًا۔ اَلْمَاءُ گھونٹ گھونٹ کرکے پانی پینا۔ اور بقول بعض جرع (س) آتا ہے۔
تَجَرَّعَهٗ (تفعل) تکلف سے گھونٹ گھونٹ کرکے پی گیا۔ گویا اس کا پینا طبیعت پر ناگوار گذر رہا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
یَتَجَرَّعُهٗ وَلَا یَکَادُ یُسِیْغُهٗ (۱۴-۱۷) وہ اس کو گھونٹ گھونٹ پئے گا اور گلے سے نہیں اتار سکیگا۔
جُرْعَةٌ ایک مرتبہ گھونٹ سے نگلنا مثل مشہور ہے[1]
اَفْلَتَ بِجُرَیْعَةِ الذَّقَنِ وہ ہلاکت کے قریب پہنچ کر بچ نکلا۔
نُوْقٌ مَجَارِیْعُ وہ اونٹنیاں جن کا دودھ تقریباً خشک ہوگیا ہو۔
اَلْجَرَعُ وَالْجَرْعَاءُ ریگستان جس میں کچھ نہ اُگے گویا وہ بیج کو نگل لیتا ہے۔

(ج ر ف)

قرآن میں ہے: عَلٰی شَفَا جُرُفٍ هَارٍ (۹-۱۰۹) گر جانے والی کھائی کے کنارے پر۔ اَلْجُرُفُ دریا کے اس کنارے کو کہتے ہیں جو کٹ کٹ کر نیچے گر رہا ہو۔ محاورہ ہے:۔ جَرَفَ الدَّهْرُ مَالَهٗ حوادث زمانہ نے اس کے مال کو تباہ کر دیا۔
رَجُلٌ جُرَافٌ مرد بسیار جماع شادماں۔ گویا وہ اس شغل میں بہہ رہا ہے۔

(ج ر م)

اَلْجَرْمُ (ض) اس کے اصل معنی درخت سے پھل کاٹنے کے ہیں یہ صیغہ صفت جَارِمٌ ج جِرَامٌ۔ تَمْرٌ جَرِیْمٌ خشک کھجور۔ جُرَامَةٌ ردی کھجوریں جو کاٹتے وقت نیچے گر جائیں یہ نُفَایَةٌ کے وزن پر ہے (جو کہ ہر چیز کے ردی حصہ کے لئے استعمال ہوتا ہے)
اَجْرَمَ (افعال) جرم دالا ہونا جیسے اَثْمَرَ اَتْمَرَ وَاَلْبَنَ اور استعارہ کے طور پر اس کا استعمال اکتساب مکروہ پر ہوتا ہے۔ اور پسندیدہ کسب پر بہت کم بولا جاتا ہے۔ اس کا مصدر جَرْمٌ ہے شاعر نے عقاب کے متعلق کہا ہے[2] (الوافر)

(۸۸) جَرِیْمَةُ نَاهِضٍ فِیْ رَأْسِ نِیْقٍ

جیسا کہ (عقاب) بلند پہاڑ کی چوٹی پر اپنے بچوں کے لئے روزی کما کر ان کو کھلاتا ہے۔
یہاں شاعر کا "شاہیں کے اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کو جَرم کہنا" یا تو اس بنا پر ہے کہ وہ پرندوں کا شکار کرکے لاتا ہے اور یا اس کو ایسا شخص فرض کیا ہے جو اپنی اولاد کی خاطر گناہ کرتا ہے جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ ہر صاحب اولاد خواہ بہائم ہی کیوں نہ ہوں اپنی اولاد کے لئے ضرور ہی جرائم کا ارتکاب کرتا ہے
قرآن مجید میں اِجْرَام (افعال) اور جَرْم (ض) دونوں فعل استعمال ہوئے ہیں چنانچہ اجرام کے

---

[1] افلت یکون لازما ومتعدیا والبا بمعنی مع وجریعۃ تصغیر جرعۃ والمراد منہ النفس ای خلص مع جریعۃ الذقن ای فیہ بقیۃ لوجہ بقدر جرعۃ فی الفم راجع لتفصیلہ المیدانی ۶۹-۷۰ وابدال ابی الطیب ۳/ ۲۷۳-۲۷۴ واللسان (جرع) [2] قالہ ابو خراش الہذلی یصف عقابا تمامہ: ترسہ بما ترزق فرخہا تمامہ: تری لعظام ما جمعت صلیبا وفی اللسان (جرم، صلب) والاساس (جرع) ناہض بدل ناہص والبیت فی الاقتضاب ۳۱۷ والمعانی للقتبی ۲۸، ۴۱ وغریب القرآن للقتبی ۱۲۹ واصلاح یعقوب وادب الکاتب ۴۶ والدر دالجرد (۳: ۲۱۳) والحیوان (۵: ۳۴۳) واشعار الہذلیین (۲: ۵۷)

متعلق فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا کَانُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یَضْحَکُوْنَ (۸۳-۲۹) جو گنہگار (یعنی کفار) ہیں وہ دنیا میں (مومنوں سے ہنسی کیا کرتے تھے۔

کُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِیْلًا اِنَّکُمْ مُّجْرِمُوْنَ (۷۷-۴۶) (اے جھٹلانے والو) تم کسی قدر کھالو اور فائدے اٹھالو تم بیشک گنہگار ہو۔

اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (۵۴-۴۷) بیشک گنہگار لوگ گمراہی اور دیوانگی میں (مبتلا) ہیں۔

اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ (۴۳-۷۴) اور جَرَمَ (ض) کے متعلق فرمایا:

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شِقَاقِیْۤ اَنْ یُّصِیْبَکُمْ (۱۱-۸۹) میری مخالفت تم سے کوئی ایسا کام نہ کرا دے کہ .... تم پر واقع ہو۔

یہاں اگر یَجْرِمَنَّکُمْ فتحہ یا کے ساتھ پڑھا جائے تو بَغَیْتُهٗ مَالًا کی طرح ہوگا اور اگر ضمہ یا کے ساتھ پڑھا جائے تو اَبْغَیْتُهٗ مَالًا (یعنی میں نے مال سے اس کی مدد کی) کے مطابق ہوگا۔

لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعْدِلُوْا (۵-۸) اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے۔ کہ انصاف چھوڑ دو۔ اور آیت کریمہ:

فَعَلَیَّ اِجْرَامِیْ (۱۱-۳۵) تو میرے گناہ کا وبال مجھ پر۔ میں ہو سکتا ہے کہ اِجْرَام (بکسر الہمزہ) باب افعال سے مصدر ہو اور اگر اَجْرَام (بفتح الہمزہ) پڑھا جائے تو جَرْمٌ کی جمع ہوگی[1]۔

اور جرم بمعنی قطع سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

جَرَمْتُ صُوْفَ الشَّاةِ میں نے بھیڑ کی اُون کاٹی تَجَرَّمَ اللَّیْلُ رات ختم ہوگئی۔

اَلْجِرْمُ (جسم) اصل میں یہ بمعنی مَجْرُوْمٌ ہے یعنی قطع کیا ہوا جیسے نِقْضٌ وَنِقْضٌ بمعنی منقوض ومنقوض کے آتا ہے۔

پھر یہ جسم پر بولا جاتا ہے اور فُلَانٌ حَسَنُ الْجِرْمِ کے معنی ہیں کہ خوبصورت ہے جیسا کہ حَسَنُ السَّخَا کا محاورہ ہے اور حَسَنُ الْجِرْمِ کے معنی حسن صوت بھی آتے ہیں اور اس میں درحقیقت جرم سے محل صوت کی طرف اشارہ ہوتا ہے نہ کہ نفس صوت کی طرف لیکن اس سے آواز کی خوبصورتی بیان کرنا مقصود ہوتی ہے اس لئے اس کے معنی حسن صوت کر دیئے جاتے ہیں جیسا کہ اسی معنی میں طَیِّبُ الْحَلْقِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے کہ حلق سے صوت مراد لی جاتی ہے نہ کہ بذات خود حلق مراد ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:

لَا جَرَمَ (۱۶-۱۰۹) کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے لَا اصل میں محذوف پر داخل ہوا ہے جیسا کہ لَا اُقْسِمُ میں لا آتا ہے اور جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2] ع (متقارب)

(۸۹) لَا وَاَبِیْكِ ابْنَةَ الْعَامِرِیِّ

اور جَرَمَ فعل ماضی ہے جس کے معنی کَسَبَ یا جَنٰی کے ہیں اس کے بعد اَنَّ لَهُمُ النَّارَ (جملہ) موضع مفعول میں ہے اور معنی یہ ہیں کہ اس نے اپنے لئے (دوزخ کی) آگ حاصل کی۔

بعض نے کہا ہے کہ جَرَمَ اور جُرْمٌ کے ایک ہی

---

[1] قال الزمخشری وتغیر الجمع ان فسرﺀ الاوبون بآثامی (الکشاف ۲۹۲ ج ۲) [2] قاله امرؤ القیس یخاطب ابنة عمه فاطمة والبیت من قطعة نصبه وعدتها ۴۴ بیتا وتمامه ..... لا یدعی القوم انی افر۔ والبیت فی الحماسة مع المرزوقی۔ راجع الخزانة ۱/ ۳۲۷-۴، ۹۹ والعینی ۱: ۹۹ او شرح المفضلیات العلاف لابن الانباری ۴۴ والعقد الثمین ۱۲۶ والسیوطی ۲۱۷ والطبری ۲۷: ۱۳۱) والفخر ۳: ۲۱۴ والبیت ایضا من شواہد الکشاف ۴۵ قال المحب وقیل البیت لربیعة بن جشم الیمنی والیضا المغنی ۱/ ۲۷۶ ودیوانه ۹۴ ﭩ

معنی ہیں۔ لیکن لا کے ساتھ جَرَمَ آتا ہے جیسا کہ قسم کے ساتھ عَمْرو کا لفظ مختص ہے اگرچہ عَمْرٌو و عُمُرٌ کے معنی ایک ہی ہیں اور معنی یہ ہے کہ ان کے لئے آگ کا ہونا کسی کا جُرم نہیں ہو گا بلکہ یہ ان کے عملوں کی سزا ہوگی اور انہوں نے خود ہی اسے اپنے لئے حاصل کیا ہوگا جیسا کہ آیت: وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا۔ (۴۱-۴۶) اور جو بُرے کام کرے گا۔ تو اس کا ضرر اسی کو ہو گا۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

اس کی تفسیر میں اور بھی بہت سے اقوال منقول ہیں[1]۔ لیکن ان میں سے اکثر تحقیق کی رو سے صحیح نہیں ہیں اور اسی معنی کے لحاظ سے فرمایا:

فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (۱۶-۲۲-۲۳) تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل انکار کر رہے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں خدا ضرور اس کو جانتا ہے۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۶-۱۰۹) کچھ شک نہیں کہ یہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والے ہوں گے۔

(ج ر ی)

جَرَى (ض) جِرْيَةً وَجَرْيًا وَجَرَيَانًا کے معنی تیزی سے چلنے کے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ پانی اور پانی کی طرح چلنے والی چیزوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ (۴۳-۵۱) اور یہ نہریں جو میرے (محلوں کے) نیچے بہ رہی ہیں۔ (میری نہیں ہیں)۔

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۲-۲۵) باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں۔

وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ (۳۰-۴۶) اور تاکہ... کشتیاں چلیں

فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ (۸۸-۱۲) اس میں چشمے بہ رہے ہوں گے اور آیت کریمہ:۔

اِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَاۗءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ (۶۹-۱۱) جب پانی طغیانی پر آیا تو ہم نے تم (لوگوں) کو کشتی میں سوار کر لیا۔

میں جَارِيَةٌ سے مراد کشتی ہے اس کی جمع جَوَارٍ آتی ہے جیسے فرمایا: اَلْجَوَارِ الْمُنْشَاٰتُ (۵۵-۲۴) اور جہاز جو... اونچے کھڑے ہوتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ (۴۲-۳۲) اور اسی کی نشانیوں میں سے سمندر کے جہاز ہیں (جو) گویا پہاڑ ہیں۔

اور پرندکے سنگدانہ کو جِرِّيَّةٌ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ کھانا چل کر وہاں پہنچتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ طعام کا مجریٰ بنتا ہے۔ اَلْاِجْرِيَّا عادت جس پر انسان چلتا ہے۔

اَلْجَرِيُّ وکیل۔ یہ لفظ رسول اور وکیل سے اخص ہے۔

---

[1] وقیل: اَنَّ ذو موضع رفع وجَرَمَ بمعنی وجب ان لہم النار وانہم مفرطون بحث القالی فی نوادرہ فی لاجرم ومنہ اخذ ابن الانباری وغیرہم معظم ہذا الباب ولم یخرج المؤلف مما ہنالک وذکروا فیہ وجوہ ذہب الفراء تبعًا للکسائی ان جرم اسم لا وذہب سیبویہ فی الکتاب بانہ فعل ماضی راجع للبحث النوادر ۲۱۲-۲۱۳ الخزانۃ ۴ر۳۱۱ والصحاح والتاج (جرم) وامالی المرتضیٰ ار۱۱۰ والفاخر لابی طالب ۱۹۹ واعراب القرآن المنسوب الی الزجاج ۱۱۷-۱۱۸ وفی ابن کثیر (۳: ۸۰) قال السدی وابن جریج لاجرم معنا حقًا وقال الضحاک لاکذب وقال علی بن طلحہ عن ابن عباس لاجرم معنا ولی ....

[2] فی التاج ... وما یجری جرتہ فی المطبوع ... وما یجری بجریہ ۱۲

اور جَرَّیْتُ جَرِیًّا کے معنی وکیل بنا کر بھیجنے کے ہیں اور حدیث میں ہے۔ (۶۲)

لَا یَسْتَجْرِیَنَّکُمُ الشَّیْطَانُ یہاں یہ لفظ اپنے اصل معنی پر بھی محمول ہو سکتا ہے یعنی شیطان اپنے حکم کی بجا آوری اور اطاعت میں بہہ جانے پر تمہیں برانگیختہ نہ کرے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جَرِیٌّ بمعنی رسول یا وکیل سے مشتق ہو اور معنی یہ ہونگے کہ شیطان کی وکالت اور رسالت کے سرپرست نہ بنو گویا یہ آیت کریمہ۔

فَقَاتِلُوْا اَوْلِیَاءَ الشَّیْطَانِ (۴-۷۶) شیطان کے مددگاروں سے لڑو۔

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے اور فرمایا: اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیْطَانُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَاءَہٗ (۳-۱۷۵) یہ خوف دلانے والا تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے۔

(ج ز ء)

جُزْءُ الشَّیْءِ چیز کا وہ ٹکڑا جس سے وہ چیز [illegible]ل کرنے۔ جیسے اَجْزَاءُ السَّفِیْنَةِ اَجْزَاءُ الْبَیْتِ اور حساب میں اَجْزَاءُ الْجُمْلَةِ (یعنی کل مجموعہ کے اجزاء) وغیرہ محاورات بولے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا (۲-۲۶۰) پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر ایک پہاڑ پر رکھوا دو۔

لِکُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ (۱۵-۴۴) ہر ایک دروازے کے لئے ان میں ایک حصہ تقسیم کر دیا گیا ہے۔

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا (۴۳-۱۵) اور انہوں نے اس کے بندوں میں سے اس کے لئے اولاد مقرر کی۔ میں بعض نے کہا ہے کہ جُزْءًا سے مراد اَنَاثٌ ہیں میں انہوں نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیا اور یہ اَجْزَأَتِ الْمَرْأَةُ کے محاورہ سے مشتق ہے جس کے معنی مادہ اولاد کو جنم دینا کے ہیں۔

جَزِءَ الْاِبِلُ مَجْزَءً وَجَزْءًا اونٹ تر گھاس کھانے کی وجہ سے پانی سے بے نیاز ہو گئے محاورہ ہے:۔ اَللَّحْمُ السَّمِیْنُ اَجْزَءُ مِنَ الْمَهْزُوْلِ موٹا گوشت دبلے گوشت سے زیادہ کفایت کرنے والا ہوتا ہے۔

جُزْءَةُ السِّکِّیْنِ چھری کا دستہ کیونکہ وہ اس کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

(ج ز ع)

اَلْجَزَعُ بے صبری۔ قرآن میں ہے:۔

سَوَاءٌ عَلَیْنَا اَجَزِعْنَا اَمْ صَبَرْنَا (۱۴-۲۱) اب ہم گھبرائیں یا صبر کریں۔ ہمارے حق میں برابر ہے۔ یہ حزن سے خاص ہے کیونکہ جَزَعٌ خاص کر اس غم کو کہتے ہیں جو انسان کو جس چیز کے وہ درپے ہو اس سے پھیر دے اور اس سے تعلق قطع کر دے۔

اصل میں جَزْعٌ (ف) کے معنی رسی کو نصف سے کاٹ دینے کے ہیں اور اِنْجَزَعَ (انفعال) اس کا مطاوع آتا ہے جیسے جَزَعْتُهٗ فَانْجَزَعَ میں نے اسے کاٹا چنانچہ کٹ گیا۔ اور معنی انقطاع کے تصور کی بنا پر وادی کے موڑ کو جِزْعُ الْوَادِیْ کہا جاتا ہے اور نغیر سے بھی چونکہ اصل

---

(۶۲) الحدیث فی النہایۃ وقبلہ قولوا القولکم ...... وذالک انہم مدحوہ فکرہ لہم المبالغۃ فی المدح ای لا تتکلفوا فی المدح فیتخذکم الشیطان جریا ای وکیلا ذاریہ ۲۶

رنگ کٹ جاتا ہے اس لئے متلون خربوزے کو
جَزْعٌ کہتے ہیں اسی سے لَحْمٌ مُجَزَّعٌ کا محاورہ
مستعار ہے جس کے معنی دو رنگ کے گوشت
کے ہیں اور نیم پختہ کھجور کو مُجَزَّعٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْجَاذِعُ شہتیر کو کہتے ہیں جو چھت کے وسط میں
ڈالا جاتا ہے اور دونوں طرف سے چھوٹے شہتیر
آآکر اس پر مل جاتے ہیں تو اسے جاذع یا تو اس
لئے کہا جاتا ہے کہ بوجھ اٹھانے کی وجہ سے گویا وہ
بے صبر ہو رہا ہے اور یا اس لئے کہ کمرے کے درمیان
میں ہونے کی وجہ سے گویا وہ اسے دو حصوں میں
قطع کر دیتا ہے۔

(ج ز ی)

اَلْجَزَاءُ (ض) کافی ہونا۔ قرآن میں ہے:۔
لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا۔ (۲-۴۸) کوئی
کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔
لَا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِہٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ ھُوَ
جَازٍ عَنْ وَّالِدِہٖ شَیْئًا۔ کہ نہ تو باپ اپنے بیٹے
کے کچھ کام آئے اور نہ بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آسکیگا۔
اَلْجَزَاءُ (اسم) کسی چیز کا بدلہ جو کافی ہو جیسے خیر
کا بدلہ خیر سے اور شر کا بدلہ شر سے دیا جائے۔ کہا
جاتا ہے۔ جَزَیْتُہٗ کَذَا بِکَذَا میں نے فلاں
کو اس کے عمل کا ایسا بدلہ دیا قرآن میں ہے:۔
وَذٰلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَکّٰی (۲۰-۷۶) اور یہ اس
شخص کا بدلہ ہے جو پاک ہوا۔
فَلَہٗ جَزَاءُ نِ الْحُسْنٰی (۱۸-۸۸) اس کے لئے
بہت اچھا بدلہ ہے۔
وَجَزَاءُ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا (۴۲-۴۰) اور برائی کا
بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے۔
وَجَزَاھُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّۃً وَّحَرِیْرًا۔
(۷۶-۱۲) اور ان کے صبر کے بدلے ان کو بہشت
(کے باغات) اور ریشم (کے ملبوسات) عطا کریگا۔
جَزَاءُ کُمْ جَزَاءً مَّوْفُوْرًا (۱۷-۶۳) اور
وہ پوری پوری جزا ہے۔
اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَۃَ بِمَا صَبَرُوْا (۲۵-۷۵)
ان (صفات) کے لوگوں کو ان کے صبر کے بدلے
اونچے اونچے محل دیے جائیں گے۔
وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۳۷-۳۹)
اور تم کو بدلا ویسا ہی ملے گا جیسے تم کام کرتے تھے۔
اَلْجِزْیَۃُ وہ ٹیکس جو ذمیوں سے وصول کیا جاتا
ہے۔ اور اسے جزیہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ
ان کے جان و مال کی حفاظت کے بدلہ میں ہوتا ہے۔
قرآن میں ہے۔
حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ عَنْ یَّدٍ وَّھُمْ صٰغِرُوْنَ
(۹-۲۹) یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔
محاورہ ہے:۔ جَازِیْكَ فُلَانٌ یعنی فلاں تجھے
کافی ہے۔
جَزَیْتُہٗ بِکَذَا وَجَازَیْتُہٗ میں نے اسے بدلہ دیا۔
قرآن نے جَزٰی (ض) کا لفظ استعمال کیا ہے
اور جَازٰی (مفاعلہ) استعمال نہیں کیا کیونکہ مجازاۃ
کے معنی مکافات کے ہوتے ہیں یعنی کسی کے احسان
(نعمت) کے بدلے میں اسی قسم کا احسان کرنا۔ یہ
چیز دو آدمیوں کے درمیان تو باہم مشترک ہوسکتی
ہے لیکن نعمت الٰہی کی کوئی شخص مکافات نہیں
کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے
میں مکافات کا لفظ نہیں بولا جاتا ہے یہ بات
بالکل واضح ہے (جس کی دلیل کی ضرورت نہیں)

(ج س س)

اَلْجَسُّ کے اصلی معنی ہیں رگ کو چھونا اور

نبض دیکھ کر معلوم کرنا کہ بیمار ہے یا تندرست۔ یہ تحسّس سے خاص ہے۔ کیونکہ تحسّس کے معنی قوۃ احساس سے کسی چیز کا ادراک کرنا کے ہیں۔ لیکن تجسّس کسی اندرونی حالت کے معلوم کرنے کو کہتے ہیں اور لفظ تجسّس سے جاسوس کا لفظ مشتق ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَا تَجَسَّسُوا (۴۹-۱۲) اور ایک دوسرے کے اندرونی حالات کا تجسس نہ کیا کرو۔

(ج س د)

اَلْجَسَدُ (اسم) جسم ہی کو کہتے ہیں مگر یہ جسم سے اخص ہے خلیل فرماتے ہیں کہ جسد کا لفظ انسان کے علاوہ دوسری مخلوق پر نہیں بولا جاتا نیز جسد رنگ (جسم) کو کہتے ہیں مگر جسم کا لفظ بے لون اشیاء مثلاً پانی ہوا وغیرہ پر بھی بولا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔
وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ (۲۱-۸) کہ ہم نے ان کے ایسے جسم نہیں بنائے تھے کہ کھانا نہ کھاتے ہوں ــــ سے خلیل کے قول کی تائید ہوتی ہے۔
نیز قرآن میں ہے:۔ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُوَارٌ (۲۰-۸۸) ایک بچھڑا (یعنی قالب جس کی آواز گائے کی سی تھی۔ وَأَلْقَيْنَا عَلَىٰ كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ (۳۸-۳۴) اور ان کے تخت پر ہم نے ایک دھڑ ڈال دیا چنانچہ انہوں نے خدا کی طرف رجوع کیا اور رلون کے اعتبار سے زعفران کو جساد کہا جاتا ہے اور زعفران سے رنگے ہوئے کپڑے کو ثَوْبٌ مُجَسَّدٌ کہتے ہیں۔
اَلْمُجَسَّدُ۔ کپڑا جو بدن سے متصل ہو اَلْجَسَدُ وَالْجَاسِدُ وَالْجَسِدُ۔ خشک خون۔

(ج س م)

اَلْجِسْمُ وہ ہے جس میں طول، عرض اور عمق پایا جائے اور اجزاء جسم خواہ کتنے ہی لطیف کیوں نہ ہوں اجسام ہی کہلاتے ہیں قرآن میں ہے زَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲-۲۴۷) (اس نے اسے علم بھی بہت سا بخشا ہے اور تن و توش بھی (بڑا عطا کیا ہے)
اور آیت کریمہ:۔
وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ (۶۳-۴) اور جب تم ان (کے تناسب اعضا) کو دیکھتے ہو تو ان کے جسم (تمہیں کیا ہی) اچھے معلوم ہوتے ہیں۔
میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ بظاہر ان کی شکل و صورت اگرچہ جاذب نظر آتی ہے لیکن ان کے اندر کسی قسم کی صلاحیت نہیں ہے۔
اَلْجُسْمَانُ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی چیز کا شخص کے ہیں لیکن کسی شخص کے اجزاء ضروری نہیں کہ تقطیع اور تجزیہ کے بعد بھی ان کو شخص ہی کہا جائے مگر جسم کے اجزا کو خواہ کتنا ہی باریک کیوں نہ کر دیا جائے وہ جسمیت سے خارج نہیں ہوتے۔

(ج ع ل)

جَعَلَ (ف) یہ لفظ ہر کام کرنے کے لئے بولا جا سکتا ہے اور فَعَلَ وَصَنَعَ وغیرہ افعال کی بنسبت عام ہے۔ اور یہ پانچ طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) بمعنی صَارَ وَ طَفِقَ اس صورت میں متعدی نہیں ہوتا جیسے جَعَلَ زَیْدٌ یَقُوْلُ کَذَا (یعنی زید یوں کہنے لگا) شاعر نے کہا ہے (وافر)

(۹۶) فَقَدْ جَعَلَتْ قَلُوْصُ بَنِیْ سُہَیْلٍ
مِنَ الْاَکْوَارِ مَرْتَعُہَا قَرِیْبٌ[1]

اب بنی سہیل کی اونٹنی اکوار (جمع کور) کے قریب چرنے لگی ہے۔

(۲) بمعنی اَوْجَدَ (یعنی ایجاد و پیدا کرنا) اس صورت میں یہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔ وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّوْرَ (۶-۱) اور اندھیرے اور روشنی بنائی۔ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ (۱۶-۷۸) اور اس نے تم کو کان اور آنکھیں اور دل (اور اس کے علاوہ اور اعضاء) بخشے۔

(۳) ایک شے کو دوسری شے سے پیدا کرنا اور بنانا جیسے فرمایا:۔ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا (۴۲-۱۱) اسی نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کے جوڑے بنائے۔

وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَکْنَانًا (۱۶-۸۱) اور پہاڑوں میں غاریں بنائیں۔ وَجَعَلَ لَکُمْ فِیْہَا سُبُلًا (۴۳-۱۰) اور اس میں تمہارے لئے رستے بنائے۔

(۴) بمعنی تصییر یعنی کسی شے کو ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل کر دینا جیسے فرمایا:۔ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا (۲-۲۲) جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا ..... بنایا۔

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلَالًا (۱۶-۸۱) اور خدا ہی نے تمہارے (آرام کے) لئے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے سائے بنائے۔

وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْہِنَّ نُوْرًا (۷۱-۱۶) اور چاندکو ان میں (زمین کا) نور بنایا۔

اِنَّا جَعَلْنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا (۴۳-۳) کہ ہم نے اس کو قرآن عربی بنایا ہے۔

(۵) کسی چیز پر کسی چیز کے ساتھ حکم لگانا عام اس سے کہ وہ حکم حق ہو یا باطل حق کی مثال جیسے: اِنَّا رَادُّوْہُ اِلَیْکِ وَجَاعِلُوْہُ مِنَ الْمُرْسَلِیْنَ۔ (۲۸-۷) ہم ان کو تمہارے پاس واپس پہنچا دیں گے اور (پھر) اسے پیغمبر بنا دیں گے۔

اور باطل کی مثال جیسے:۔ وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا (۶-۱۳۶) اور (یہ لوگ) خدا ہی کی پیدا کی ہوئی چیزوں یعنی کھیتی اور چوپایوں میں خدا کا بھی ایک حصہ مقرر کرتے ہیں۔

وَیَجْعَلُوْنَ لِلّٰہِ الْبَنَاتِ (۱۶-۵۷) اور یہ لوگ خدا کے لئے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ (۱۶-۹۱) یعنی قرآن کو (کچھ ماننے اور کچھ نہ ماننے سے) ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

اَلْجُعَالَۃُ چولہے سے دیگ اتارنے کا چیتھڑا یا منذیا اتارنے کا رومال۔

اَلْجُعْلُ وَالْجُعَالَۃُ وَالْجَعِیْلَۃُ جو چیز کسی شخص کے لئے کسی کام کے عوض مقرر کیا جائے۔ یہ

---

[1] قالہ رجل من بحتر بن عتود والبیت فی الحماسۃ رقم ۹۹ مع المرزوقی فی ثلاثۃ بغیر عزو والبیت من شواہد الخزانۃ (۴: ۹۲) وفی روایۃ ابی زیاد" ولم ار احد من الشراح نسبہا الی قائلہا وجدت نسبتہا عند الصاغانی فی العباب (الخیال) والبیت فی اللسان (جعل) والعینی والخزانۃ (۲: ۳۳۶) ۱۲ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

اُجرت اور ثواب سے اعم ہے۔
کَلْبٌ یُجْعِلُ (کنایہ) کتے کا جفتی کی خواہش کرنا[1]۔
اَلْجُعَلُ گبریلا۔ سیاہ بھونرا ج جِعْلَانٌ۔

(ج ف ن)

اَلْجَفْنَۃُ پیالہ۔ خاص کر کھانے کے برتن کو کہتے ہیں ج جِفَانٌ قرآن میں ہے:۔
وَجِفَانٍ کَالْجَوَابِ (۳۴-۱۳) اور لگن جیسے بڑے حوض۔ حدیث میں ہے[2] (۶۳)
وَاَنْتَ الْجَفْنَۃُ الْغَرَّاءُ تم سخی سردار ہو۔ اور لگن کے ساتھ تشبیہ دے کر چھوٹے کنوئیں کو بھی جَفْنَۃٌ کہا جاتا ہے:۔
اَلْجَفْنُ اس کے معنی خاص کر تلوار کی نیام یا آنکھ کے پپوٹے کے آتے ہیں ج اَجْفَانٌ اور انگور کی بیل کو بھی جَفْنٌ کہا جاتا ہے گویا وہ انگور کے لئے بمنزلہ برتن کے ہے۔

(ج ف و)

اَلْجُفَاءُ وہ کوڑا کرکٹ جو وادی کے دونوں کناروں پر رہ جاتا ہے یا ہانڈی کا میل کچیل جو ابال آنے سے ادھر ادھر گر جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے: اَجْفَأَتِ الْقِدْرُ بِزَبَدِھَا ہنڈیا نے اپنا ابال کو پھینک دیا۔ قرآن میں ہے:۔
فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْھَبُ جُفَاءً (۱۳-۱۷)
سو جھاگ تو سوکھ کر زائل ہو جاتا ہے اور بے فائدہ اور بے کار چیز کو بھی جُفَاءٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی مفہوم کے اعتبار سے کہا جاتا ہے:۔
اَجْفَأَتِ الْاَرْضُ زمین جُفا یعنی جھاگ کی طرح ناکارہ اور بے خیر ہو گئی۔
بعض کہتے ہیں کہ یہ اصل میں ناقص واوی ہے۔ لہٰذا جَفَتِ الْقِدْرُ وَ اَجْفَتْ کہا جائے گا اور اسی سے اَلْجَفَاءُ بمعنی ظلم ہے۔ اور جَفَاہُ (ن) جَفْوَۃً وَجَفَاءً کے معنی ہیں کسی پر ظلم کرنا اور اسی سے محاورہ ہے جَفَا السَّرْجَ عَنْ ظَھْرِ الدَّابَّۃِ (گھوڑے کی پشت سے زین کو اٹھا دیا۔

(ج ل ل)

اَلْجَلَالَۃُ کے معنی ہیں عظیم القدر یعنی قدر و منزلت میں بڑا یعنی بلند مرتبہ ہونا کے ہیں اور (ۃ) کے بغیر اَلْجَلَالُ کہا جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں عظمت کی آخری حد جس کے بعد اور مرتبہ نہ ہو۔ اسی لئے یہ اللہ تعالیٰ کی وصف کے ساتھ مختص ہے۔ اور دوسروں کے حق میں استعمال نہیں ہوتا چنانچہ قرآن میں ہے:۔
ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ (۵۵-۲۷) صاحب جلال و عظمت۔
اَلْجَلِیْلُ" اور یہ باری تعالیٰ کے ساتھ مختص نہیں ہے" اللہ تعالیٰ کو اَلْجَلِیْلُ یا تو اس لئے کہا جاتا

---

[1] راجع التاج والمعروف مجعل والفعل اجعل (افعال) والبحث فی الحیوان للجاحظ ۵/۲۵۰ ÷ [2] النہایۃ انانت الجفنۃ الغراء فی الکامل للمبرد: قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انا الجفنۃ الغراء وفی النہایۃ واللسان انہ قیل لہ انت کذا وانت کذا و انت الجفنۃ الغراء وفی الفائق ۱/۲۰۲ من قول عبداللہ بن الشخیر حین قدم علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذا فی التاج وراجع النہایۃ و اللسان (جفن) قال فی حاشیۃ الکامل ولم ار ہذا الحدیث ۷۷۹ فی المطبوع وانت الجفنۃ الغراء ای الطعام مصحف والتسدید المراجع والجملۃ من تحیۃ الجاہلیۃ لملوکہم [3] ورد فی القرآن: تتجافی جنوبہم عن المضاجع (۳۲-۱۶) ÷ ÷ ÷ ÷

ہے کہ اس نے بڑی بڑی عظیم الشان چیزوں کو پیدا کیا ہے جن سے اس کی ذات بابرکت پر استدلال ہو سکتا ہے اور[1] یا اللہ تعالیٰ کی ذات اَلْجَلِیْل اس لئے ہے کہ وہ احاطہ سے بلند ہے اور[2] یا اس لئے کہ حواس کے ذریعہ اس کا ادراک نہیں ہو سکتا۔

اصل وضع کے اعتبار سے جَلِیْل کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے جو جسامت کے اعتبار سے بڑی بھی ہو اور غلیظ یعنی موٹی اور سخت بھی پھر معنیٰ غلظت کے اعتبار سے یہ دقیق کے مقابلہ میں استعمال ہونے لگا ہے اور عظیم کا لفظ صغیر کے مقابلہ میں، چنانچہ کہا جاتا ہے جلیل و دقیق و عظیم و صغیر اور باہم مقابلہ کے اعتبار سے اونٹ کو جلیل اور بھیڑ بکری کو حقیر کہا جاتا ہے چنانچہ محاورہ ہے[3] مَالہ جَلِیْل وَلَا دَقِیْق کہ اس کے پاس نہ اونٹ ہے اور نہ بھیڑ بکری) مَا اَجَلَّنِیْ وَلَا اَدَقَّنِیْ (اس نے مجھے نہ اونٹ دیئے اور نہ بھیڑ بکری) — یہ اس کے اصل معنی ہیں — پھر یہ لفظ ہر بڑی اور چھوٹی چیز پر بولا جاتا ہے۔

اَلْجَلَالَۃُ خاص کر کلاں جسم اونٹنی کو کہتے ہیں اور اَلْجِلَّۃُ کلاں سال کو۔ اَلْجَلَل۔ ہر بڑی چیز کار بزرگ جَلَلْت کذا میں نے اس کا بڑا حصہ لے لیا۔ تجللت البعیر[4] میں نے کلاں جسم اونٹ یا ان کی بڑی مقدار لی۔ اَلْجَلَل[5] (ایضًا) جو بھنگنی اٹھائی جائے۔ اسی سے کنایۃً ہر حقیر چیز کو جلل کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے[6]۔

(۹۱) "کُلُّ مُصِیبَۃٍ بَعْدَہٗ جَلَل

کہ ہر مصیبت اس کے بعد حقیر ہے۔

اَلْجُلُّ کے معنی مصحف کے غلاف کے ہیں پھر اس سے مصحف کو مُجَلَّۃ کہا جانے لگا ہے[7]۔ اَلْجُلْجُلَۃ جس کے معنی حکایت صوت کے ہیں وہ اس مادہ سے نہیں ہے اور اسی سے سَحَابٌ مُجَلْجِلٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی گرجنے والے بادل کے ہیں۔ ہاں سَحَابٌ مُجَلِّلٌ کا محاورہ اس مادہ سے ہے۔ جس کے معنی عام بارش برسانے والے بادل کے ہیں۔ گویا وہ پانی اور نباتات سے زمین کو چھپا دیتا ہے۔

(ج ل ب)

اَلْجَلْبُ (ن ض) اس کے اصل معنی کسی چیز کو ہنکانے اور چلانے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[8]۔

(۹۲) وَقَدْ یَجْلِبُ الشَّیْءَ الْبَعِیْدَ الْجَوَابُ

---

[1] الزیادۃ " من التاج قد سقط فی المطبوع [2] وفی التاج مالہ جلیلۃ ولا دقیقۃ ولا اجلنی ولا احشانی [3] فی المطبوع تجللت البقر خلاف جمیع الاصول وفی التاج قال الراغب تجللت البعیر اھ وعلیہ اعتمدنا [4] وفی المطبوع الجلل التنادل من البقر وفی التاج قال الراغب: ... من البقر تصحف والاسف ان المفردات للراغب لم یطبع الی الآن طبعًا محققًا مقابلًا ... بالاصول وانما اکلت جوادی فی تسدیدہ وسخرومہ والحمد للّٰہ علیٰ ذالک [5] لم اجدہ ومثلہ یوجد فی شعر امرء القیس: الا کل شیء سواہ جلل وفی المزرد قی (ہم : ۱۰۲۰) قال زہیر بن معرث .... فکل الذی لاقیت من بعد جلل وایضًا انشد ابن درید: فعظیم کل مصیبۃ جلل [6] وفی التاج قال الراغب الجُلُّ مکان الجلل والمصحف مکان الصحف وعلیہ اعتمدنا لان الجلل بالفک لم یرد فی الاصول بہذا المعنی [7] لم اجدہ ویہ جلع

کبھی جواب دور کی چیز کو کھینچ کر لے آتا ہے۔
اَجْلَبَ (انعال) عَلَیْہِ کسی پر چلا کر زبردستی اسے آگے بڑھا نا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَاَجْلِبْ عَلَیْهِمْ بِخَیْلِكَ وَرَجِلِكَ (۱۷-۶۴) اور ان پر اپنے سواروں اور پیادوں کو چڑھا کر لا تا رہ۔
اور حدیث[1] (۶۲) لَا جَلَبَ (یعنی جلب جائز نہیں ہے) کے دو معنی بیان کئے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ مصدق یعنی زکوٰۃ جمع کرنے والا چراگاہ سے کہیں دور بیٹھ جائے اور وہاں جانوروں کو حاضر کرنے کا حکم دے اور گھڑ دوڑ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص دوڑ میں اپنے گھوڑے پر چیخنے کے لئے ایک آدمی کو مقرر کرے تاکہ وہ آگے بڑھ جائے۔
اَلْجُلْبَۃُ پوست جراحی کہ خشک شدہ باشد۔
اَلْجُلَبُ۔ پتلا سا بادل جو زخم کے پردہ کی طرح ہوتا ہے۔
اَلْجَلَابِیْبُ اس کا واحد جِلْبَابٌ ہے جس کے معنی چادر یا قمیص کے ہیں۔

(ج ل ت)

جَالُوْتُ یہ اسم عجمی ہے عربی میں اس کی اصل نہیں ہے قرآن میں ہے:۔
وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ (۲-۲۵۰) اور جب وہ لوگ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابل میں آئے۔

(ج ل د)

اَلْجِلْدُ کے معنی بدن کی کھال کے ہیں اس کی جمع جُلُوْدٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا (۴-۵۶) جب ان کی کھالیں گل (اور جل) جائیں گی تو ہم اور کھالیں بدل دیں گے۔ اور آیت کریمہ:۔
اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (۳۹-۲۳) اور خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب (جس کی آیتیں باہم) ملتی جلتی (ہیں) اور دہرائی جاتی (ہیں) جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں ان کے بدن کے اس سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور دل نرم (ہوکر) خدا کی یاد کی طرف (متوجہ) ہو جاتے ہیں۔
میں جُلُوْدٌ سے مراد ابدان اور قلوب سے مراد نفوس ہیں اور آیت کریمہ:۔
حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَیْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَیْنَا۔۔ (۴۱-۲۰،۲۱) یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچ جائیں گے تو ان کے کان اور آنکھیں اور چمڑے (یعنی دوسرے اعضا) ان کے خلاف ان کے اعمال کی شہادت دیں گے اور وہ اپنے چمڑوں (یعنی اعضا) سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی۔
میں بعض نے کہا ہے کہ جُلُوْدٌ سے فروج یعنی شرمگاہیں مراد ہیں[2]۔

---

[1] الحدیث فی الفائق ۱ر ۲۰۱ (النسائی والضیاء عن ابن عمرو (حم، ت، ن) وابن حبان (زوائدہ رقم ۱۷۰) عن عمران بن حصین والطبرانی عن انس (ش) عن عطاء (مرسلا) (ش) عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ راجع کنز العمال ۲ رقم ۱۳۲۹ و ۱۳۱۸ و ۱۳۲۷ و ۱۳۲۹ [2] وفی غریب القرآن للقتبی ۳۸۹ وهذا رأی السدی والفراء وغیرهما ۱۲

جَلَدَہٗ (ض) کسی کے چمڑے پر مارنا۔ جیسے بَطَنَہٗ وَظَھَرَہٗ اور اس کے دوسرے معنی دُرّے لگانا بھی آتے ہیں جیسے عَصَاہُ (یعنی لاٹھی کے ساتھ مارنا) چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَاجْلِدُوْھُمْ ثَمَانِیْنَ جَلْدَۃً (۲۴-۴) تو ان کے اسی درّے مارو۔
اَلْجَلَدُ وَالْجِلْدُ اونٹنی کے بچہ کی بھس بھری ہوئی کھال۔
جَلُدَ (ک) جَلَدًا کے معنی قوی ہونے کے ہیں۔ صیغہ صفت جَلْدٌ وَجَلِیْدٌ ہے اور اس کے اصل معنی اکتساب الجلد قوۃ یعنی بدن میں قوت حاصل کرنے کے ہیں۔ محاورہ ہے:۔
مَالَہٗ مَعْقُوْلٌ وَلَا مَجْلُوْدٌ اس میں نہ عقل ہے نہ قوت۔ اور تشبیہ کے طور پر سخت زمین کو اَرْضٌ جَلَدَۃٌ کہا جاتا ہے اس طرح قوی اونٹنی کو نَاقَۃٌ جَلَدَۃٌ کہتے ہیں۔
جَلَدْتُ کَذَا میں نے اس کی جلد باندھی۔
فَرَسٌ مَجْلَدٌ مار سے نہ ڈرنے والا گھوڑا یہ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے کیونکہ مُجَلَّد اس شخص کو کہتے ہیں جسے مارنے سے درد نہ ہو۔
اَلْجَلِیْدُ پالا، یخ گویا صلابت میں چمڑے کے متشابہ۔

(ج ل س)

اَلْجَلْسُ اس کے اصل معنی سخت زمین کے ہیں۔ اسی لحاظ سے نَجْدٌ یعنی بلند زمین کو جَلْسٌ کہا جاتا ہے ایک روایت میں ہے[1] (۴۳) اَعْطَاھُمُ الْمَعَادِنَ الْقَبَلِیَّۃَ غَوْرِیَّھَا وَجَلْسِیَّھَا ۔۔۔ کہ آنحضرت نے انہیں (بلال بن حارث) قبلیۃ کا نشیبی اور بلند سب کی سب (بطور جاگیر) عطا کردیں۔
اصل میں جَلَسَ کے معنی انسان کے اپنی مقعد کو سخت زمین پر رکھنے کے ہیں۔ پھر محض بیٹھنے کو جُلُوْس اور بیٹھنے کی جگہ کو مَجْلِسٌ کہا جاتا ہے اور مَجْلِسٌ کی جمع مَجَالِسُ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ (۵۸-۱۱) جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھا کرو خدا تم کو کشادگی بخشے گا۔

(ج ل و)

اَلْجُلُوْ (ن) کے اصل معنی کسی چیز کے نمایاں طور پر ظاہر ہو جانا کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
اَجْلَیْتُ الْقَوْمَ عَنْ مَنَازِلِھِمْ فَجَلَوْا عَنْھَا (یعنی میں نے انہیں جلاوطن کیا تو وہ چلے گئے اور جَلَاہُ (متعدی) بھی استعمال ہوتا ہے[2]۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[3] ع (طویل)
(۹۲) فَلَمَّا جَلَاھَا بِالْاِیَامِ تَحَیَّرَتْ
ثُبَاتٍ عَلَیْھَا ذُلُّھَا وَاکْتِئَابُھَا
(جب انگبین گیرندہ نے شہد کی مکھیوں کو دھواں

---

[1] وفی الفائق ۱/۲۰۴ اعطی بلال بن الحارث معادن القبلیۃ جلسیھا وغوریھا والحدیث فی د ق کرعن ابن عباس ر د ق کثیر بن عبداللہ المزنی عن ابیہ عن جدہ رطب ک عن بلال بن الحارث راجع کنز العمال ۲ رقم ۳۹۸۷ [2] وفی التاج: واجلی یتعدی ولا یتعدی کلاھما ومن اشتقاق النعی ہی حدیث الحوض فیجلون عنہ ای ینفون ویطردون [3] قالہ ابو ذؤیب الہذلی یصف مشتار او فی روایۃ تحیرت و بالراء المہملۃ والبیت فی اللسان (جلا، ایم) والاقتضاب ۴۰۰ والمعانی ۲۹۱ وفی روایۃ الدیوان الیضاً تحیرت قال فی التاج ویروی: فلما اجتنا ہا سکان جلاہا۔

کے ذریعہ سے دور ہٹایا تو وہ ٹکڑیاں ہو کر غم واندوہ کے ساتھ ایک طرف سکڑ گئیں۔

قرآن میں ہے:۔ وَلَوْلَا أَنْ كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا (۵۹-۳)۔ اور اگر خدا نے ان کے بارے میں جلا وطن کرنا نہ لکھ دیا ہوتا۔ تو ان کو دنیا میں بھی عذاب دے دیتا۔

اسی سے جَلَا لِي خَبَرٌ (کسی خبر کا ظاہر ہونا) وَخَبَرٌ جَلِيٌّ (واضح خبر) وَقِيَاسٌ جَلِيٌّ (اور واضح قیاس) کے محاورات ہیں اور صیغہ صفت (فاعل) جالٍ مسموع نہیں ہے۔

جَلَوْتُ الْعَرُوسَ جَلْوَةً وَجِلَاءً: دلہن کو بنا و سنگار کر کے پیش کرنا۔

جَلَوْتُ السَّيْفَ جِلَاءً: تلوار کو صیقل کیا

اَلسَّمَاءُ جَلْوَاءُ آسمان بے ابر اور صاف ہے

رَجُلٌ أَجْلَى وہ شخص جس کے سر کے بال اڑ گئے ہوں

اَلتَّجَلِّي کے معنی ہیں ظاہر ہونا اور ہویدا ہونا اور جلوہ بار ہونا اور یہ (تجلی) کبھی بالذات ہوتی ہے جیسے: وَالنَّهَارِ إِذَا تَجَلَّى (۹۲-۲) اور دن کی جب نمایاں طور پر روشنی ہو جائے۔

اور کبھی بذریعہ امر اور فعل کے ہوتی ہے جیسے فرمایا: فَلَمَّا تَجَلَّى رَبُّهُ لِلْجَبَلِ (۷-۱۴۳) جب ان کا پروردگار پہاڑ پر جلوہ افروز ہوا۔

کہا جاتا ہے:۔

فُلَانٌ ابْنُ جَلَا ... یعنی فلاں مشہور و معروف ہے[1]

اَجْلَوْا عَنْ قَتِيلٍ وہ مقتول سے الگ ہو گئے اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

(ج م م)

اَلْجَمُّ کے معنی ہر چیز کی کثرت اور زیادتی کے ہیں یہ جُمَّةُ الْمَاءِ سے ماخوذ ہے اور جُمَّةُ الْمَاءِ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی بہت بڑی مقدار میں جمع ہو جاتا ہو قرآن میں ہے:۔ وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا (۸۹-۲۰) اور مال کو بہت ہی عزیز رکھتے ہو۔

اصل میں یہ اَلْجَمَامُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں راحت کے لئے کسی جگہ پر ٹھہر جانا اور محنت و مشقت چھوڑ دینا

جُمَامُ الْمَكُّوكِ دَقِيقًا آٹے سے لبالب بھرا ہوا مکوک جس میں مزید گنجائش نہ ہو۔ اور معنی کثرت کے لحاظ سے جُمَّةٌ کا لفظ لوگوں کی اس بڑی جماعت پر بولا جاتا ہے جو کسی مصیبت کا بوجھ اٹھانے کے لئے جمع ہوں نیز جُمَّةٌ کے معنی ہیں پیشانی کے مجتمع بال۔

جُمَّةُ الْبِئْرِ پانی سے بھرا ہوا کنواں گویا کئی دنوں سے اس میں پانی جمع ہو رہا ہے اور متواتر اور سخت دوڑنے والے گھوڑے کو جَمُوْمُ الشَّدِّ کہا جاتا ہے۔

اَلْجَمَّاءُ الْغَفِيرُ وَالْجَمُّ الْغَفِيرُ ہجوم۔ لوگوں کی بڑی جماعت شَاةٌ جَمَّاءُ بے سینگ کے بکری یہ جُمَّةُ النَّاصِيَةِ سے ہے۔

(ج م ح)

جَمَحَ (ف) جَمْحًا وَجِمَاحًا وَجُمُوحًا گھوڑے کا تیزی کے ساتھ دوڑتے جانا اور سوار کے قابو میں نہ رہنا یہ نشاط اور مرح سے زیادہ بلیغ ہے۔ پھر کسی آدمی کے سرکشی کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] وقال الزجاج ان ظہر وبان وتد مذہب اہل السنۃ والمؤلف مال الی الناد بل فراغ [1] قال سحیم بن وثیل الریاحی انا ابن جلا وطلاع الثنایا متی اضع العمامۃ تعرفونی وقد تمثل الحجاج بقولہ ۔

وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ (۹-۵۷) تو ۔۔۔رسیاں تڑاتے ہوئے ۔۔۔
اَلْجُمَّاحُ بے پھل کا تیر جس سے بچے کھیلتے ہیں اس کے سرے پر غلیلہ سا لگا ہوتا ہے ۔

(ج م ع)

اَلْجَمْعُ (ف) کے معنی ہیں متفرق چیزوں کو ایک دوسرے کے قریب لاکر ملا دینا ۔ محاورہ ہے :۔ جَمَعْتُهٗ فَاجْتَمَعَ میں نے اسے اکٹھا کیا چنانچہ وہ اکٹھا ہوگیا ۔ قرآن میں ہے :۔
وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ (۷۵-۹) اور سورج اور چاند جمع کردیئے جائیں گے ۔ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى (۷۰-۱۸) اور مال جمع کیا اور بند رکھا ۔
جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ (۱۰۴-۲) مال جمع کرتا ہے اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے ۔ يَجْمَعُ بَيْنَنَا رَبُّنَا ثُمَّ يَفْتَحُ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ط (۳۴-۲۶) ہمارا پروردگار ہم کو جمع کرے گا پھر ہمارے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کریگا ۔ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (۳-۱۵۷) تو جو (مال و متاع) لوگ جمع کرتے ہیں اس سے خدا کی بخشش اور رحمت کہیں بہتر ہے ۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْجِنُّ وَالْاِنْسُ (۱۷-۸۸) کہدو کہ اگر انسان اور جن اس بات پر مجتمع ہوں ۔ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا (۱۸-۹۹) تو ہم سب کو جمع کرلیں گے ۔ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ (۴-۱۴۰) کچھ شک نہیں کہ خدا منافقوں ۔۔۔۔۔ کو جمع کرنے والا ہے ۔
اور آیت کریمہ :۔

وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ (۲۴-۶۲) ۔۔۔۔۔ اور جب کبھی ایسے کام کے لئے جو جمع ہوکر کرنے کا ہو پیغمبر خدا کے پاس جمع ہوں ۔ میں امر جامع کے معنی اہم معاملہ کے ہیں جس کے لئے لوگ جمع ہوں تو گویا اس معاملے نے ان کو جمع کرلیا ہے ۔
ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ (۱۱-۱۰۳) یہ وہ دن ہوگا جس میں سب لوگ اکھٹے کئے جائیں گے ۔ جیسے فرمایا :۔
يَوْمَ الْجَمْعِ (۴۲-۷) قیامت کے دن کا ۔
يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ۔ (۶۴-۹) جس دن وہ تم کو اکھٹا ہونے (یعنی قیامت) کے دن اکٹھا کرے گا ۔
اور مَجْمُوْعٌ ، جَمْعٌ ، جَمِيْعٌ اور جَمَاعَةٌ کے ایک ہی معنی ہیں ۔ قرآن میں ہے :۔
وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (۳-۱۶۶) اور جو مصیبت تم پر دونوں جماعتوں کے مقابلہ کے دن واقع ہوئی ۔
وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (۳۶-۳۲) اور سب کے سب ہمارے روبرو حاضر کئے جائینگے ۔
اَلْجُمَّاعُ مختلف قبائل کے لوگ جو ایک جگہ جمع ہوں ۔ شاعر نے کہا ہے[1] : (سریع)
(۹۳) بِجَمْعِ غَيْرِ جُمَّاعٍ
ایسا مجمع جو مختلف قسم کے لوگوں پر مشتمل نہ تھا ۔
اور اَجْمَعْتُ كَذَا عام طور پر اس عزم وارادہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس تک غور وفکر سے پہنچا جائے ۔ جیسے فرمایا :۔

---

[1] قالہ ابو قیس بن الاسلت السلمی یصف الحرب واولہ : حتی انتہینا ولنا غایۃ ۔۔۔۔ وفی روایۃ اللسان (عم) من بین جمع ۔ مدل بجمیع وثم تجلت ولنا غایۃ انتہینا والبیت من کلمۃ مفضلیۃ (۲۵:۷۵) فی ۱۲ بیتا وراجع للبیت الملک المرزوقی ۱۰۸۶ وا الاقتضاب ۸ ۳۵ وتہذیب الالفاظ ۳۲۷ و المحکم (جمع) والجمہرۃ ۲۳۵ وفیہ حتی التقفینا وفی الفائق (۱:۱۱۰) من بین وغیر جماع

فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ (۱۰-۷۱) تم اپنے شریکوں کے ساتھ مل کر ایک کام (جو میرے بارے میں کرنا چاہو) مقرر کر لو۔

اور شاعر نے کہا ہے:۔ (رجز)

(۹۴) هَلْ اَغْدُوَنْ يَوْمًا وَاَمْرِىْ مُجْمَعٌ

کیا میں کسی روز جنگ کروں گا اور میرا سامان حرب فراہم ہو گا۔ قرآن میں ہے:۔

فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ (۲۰-۶۴) تو تم (جادو کا) سامان اکٹھا کرو۔

اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ عَلٰى كَذَا کسی معاملہ پر امت مسلمہ کا متفق ہو جانا۔ نَهْبٌ مُجْمَعٌ لوٹ جو نہایت فکر و تدبیر سے حاصل کی جائے۔ اور آیت کریمہ:۔

اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ (۳-۱۷۳) کے بعض نے یہی معنی کئے ہیں کہ انہوں نے تمہارے خلاف تدبیر پر اتفاق کر لیا ہے۔ اور بعض نے لشکر کثیر جمع کرنا مراد لیا ہے۔

جَمِيْعٌ وَ اَجْمَعُ وَ اَجْمَعُوْنَ یہ تینوں الفاظ کسی امر پر اجتماع کی توکید کے لئے استعمال ہوتے ہیں لیکن اَجْمَعُوْنَ کا لفظ ہمیشہ اسم معرفہ کی صفت بن کر استعمال ہوتا ہے اور کبھی بھی حال بن کر منصوب نہیں ہوتا جیسے فرمایا:۔ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ (۳۸-۷۳) تو تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ وَاْتُوْنِىْ بِاَهْلِكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۱۲-۹۳) اور اپنے تمام اہل و عیال کو میرے پاس لے آؤ۔

اور جَمِيْعٌ کا لفظ کبھی منصوب علی الحال ہو کر توکید کا فائدہ دیتا ہے جیسے فرمایا:۔ اِهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا (۲-۳۸) تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ فَكِيْدُوْنِىْ جَمِيْعًا (۱۱-۵۵) تم سب مل کر میرے بارے میں (جو تدبیر کرنی چاہو) کر لو۔

اور جمعہ کے دن کو يَوْمُ الْجُمُعَةِ اس لئے کہا جاتا ہے۔ کہ اس میں لوگ نماز کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

اِذَا نُوْدِىَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ (۶۲-۹)۔۔۔۔ جب جمعہ کے دن نماز کے لئے اذان دی جائے تو خدا کی یاد (یعنی نماز) کے لئے جلدی کرو۔

اور مسجد الجامع کی اصل مَسْجِدُ الْاَمْرِ الْجَامِعِ او الوقت الجامع ہے لہذا یہاں جامع مسجد کی صفت نہیں ہے جَمَّعُوْا کے معنی نماز جمعہ ادا کرنے یا جامع یا جماعت میں حاضر ہونے کے ہیں۔ اَتَانٌ جَامِعٌ حاملہ گدھی قِدْرٌ جَامِعٌ بڑی دیگ اِسْتَجْمَعَ الْفَرَسُ جَرْيًا کے معنی ہیں گھوڑا سرپٹ دوڑا پوری قوت سے بھاگا۔ اس میں جمع کے معنی ظاہر ہیں مَاتَتِ الْمَرْأَةُ بِجُمْعٍ[1] حمل کی حالت میں مر گئی یہ محاورہ بھی عورت اور اس کے حمل میں اجتماع کے تصور پر استعمال ہوتا ہے۔ هِىَ مِنْهُ بِجُمْعٍ[2] (وہ اپنے خاوند سے ابھی حالت دوشیزگی میں ہے۔ پس یہ محاورہ اس وقت بولتے ہیں جب اس کے خاوند نے مجامعت کر کے اس کے پردہ بکارت کو زائل نہ کیا ہو۔

---

[1] قالہ الراجز و اولہ یالیت شعری والمنی لا تنفع۔ فی اللسان (جمع، وفیہ اغدون بدل اغزون راجع الطبری (۱۶: ۱۸۳/۱: ۱۸۱) والسیوطی ۲۷۴ وشرح السبع لابن الانباری ۵۲ لم یخبو اہد الکشاف (۰۷) وفی اصلاح ابعقوب (۲۶۳) غیر منسوب والامالی المرتضی (۱: ۵۵۹) والبحر (۵: ۱۷۹) [2] و فی الحدیث: ای امرأة ماتت بجمع ایلم تطمث دخلت الجنة راجع النھایة ۱/ ۲۰۷ والفائق ۱/ ۲۱۱ واللسان (جمع) وغریب ابی عبید ۱/ ۱۲۵ والحدیث فی (د) جنائز (ن) جنائز (حم) ۵/ ۳۰۵ [3] و فی اضداد ابی الطیب ۱۷۸: ومنہ قول الدھقا بنت مسحل: انی منہ بجمع

ضَرَبَهٗ بِجُمْعِ كَفِّهٖ اس نے اسے مکا مارا۔
اَعْطَاهُ مِنَ الدَّرَاهِمِ جُمْعَ الْكَفِّ اسے مٹھی بھر درہم دیئے۔ اَلْجَوَامِعُ زنجیر۔ طوق کیونکہ اس سے ہاتھ پاؤں باندھے جاتے ہیں۔

(ج م ل)

اَلْجَمَالُ کے معنی حسن کثیر کے ہیں اور یہ دو قسم پر ہے۔

(۱) وہ خوبی جو خاص طور پر بدن یا نفس یا عمل میں پائی جاتی ہے۔

(۲) وہ خوبی جو دوسرے تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہے اسی معنی میں مروی ہے کہ آنحضرت نے فرمایا (۶۶) اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ۔ کہ اللہ جمیل ہے اور جمال کو محبوب رکھتا ہے۔ یعنی اللہ تعالےٰ سے خیرات کثیرہ کا فیضان ہوتا ہے لہٰذا جو اس صفت کے ساتھ متصف ہوگا۔ وہی اللہ تعالےٰ کو محبوب ہوگا۔ اور قرآن میں ہے:۔

وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ (۱۶-۱۶) اور جب شام کو انہیں جنگل سے لاتے ہو۔۔۔ تو ان سے تمہاری عزت وشان ہے۔

اور جَمِيْلٌ وَجُمَالٌ وَجُمَّالٌ مبالغہ کے صیغے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ (۱۲-۱۸) اچھا صبر (کہ وہی) خوب ہے) فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا (۷۰-۵) تو تم (کافروں کی باتوں کو) حسن صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہو۔

جَامَلْتُهٗ فُلَانًا۔ کسی کے ساتھ اچھا معاملہ کرنا تواضع سمر قندی سے پیش آنا۔ اَجْمَلْتُ فِي كَذَا کسی کام کو عمدگی سے سرانجام دینا اعتدال اختیار کرنا جَمَالَكَ یعنی اعتدال سے کام لو۔

پھر اس سے کثرت کے معنی کا اعتبار کر کے ہر مجموعہ اشیاء کو جملہ کہتے ہیں اسی سے مجموعی حساب کو بھی جس کی تفصیل نہ کی گئی ہو جملۃ کہا جاتا ہے اور جس کلام کی تفصیل بیان نہ کی گئی ہو اسے مُجْمَلٌ کہا جاتا ہے اور اَجْمَلْتُ الْحِسَابَ وَاَجْمَلْتُ فِي الْكَلَامِ کے معنی حساب یا کلام کو اجمال سے بیان کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (۲۵-۳۲) اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہ اتارا گیا۔

اور فقہا نے مجمل کی تعریف میں جو یہ کہا ہے کہ اَلْمُجْمَلُ مَا يَحْتَاجُ اِلَى الْبَيَانِ کہ مجمل وہ ہوتا ہے جو بیان کا محتاج ہو تو یہ مُجْمَلٌ کی تحدید یا تفسیر نہیں ہے بلکہ صرف اس کی ایک حالت کا ذکر ہے جو بعض لوگوں کو پیش آتی ہے اور شے کی تحدید میں اس کے کسی ایسے ذاتی وصف کا بیان کرنا ضروری ہوتا ہے جس سے وہ ممتاز ہو جائے اور مجمل درحقیقت وہ ہے جو بہت سی اشیاء کے ایسے مجموعہ پر مشتمل ہو جن کی تلخیص نہ کی گئی ہو۔

اَلْجَمَلُ جوان اونٹ جو کم از کم پانچ سال کا ہو۔ اس کی جمع جِمَالٌ وَاَجْمَالٌ وَجِمَالَةٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ (۷-۴۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے۔ اور آیت کریمہ:۔

---

(۶۶) النہایۃ ۱/ ۱۵۰ والحدیث باختلاف الفاظہ البیہقی وابو یعلی عن ابی سعید ومسلم والترمذی من روایۃ عبداللہ ابن مسعود والطبرانی عن ابی امامۃ وغیرہ، عن ابن عمر راجع للتفصیل الفتح الکبیر نبہانی ۱/ ۳۳۱ وتخریج الکشاف ص ۱۴۲ رقم ۳۷۰ وکنز العمال۔

كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ (۷۷-۳۳) گویا زرد رنگ کے اونٹ ہیں۔
یہں جِمٰلَتٌ، جِمَالَۃٌ کی جمع ہے اور جِمَالَۃٌ جَمَلٌ کی اور ایک قرأت میں جُمَالَاتٌ بضمہ جیم ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی جوان اونٹنیوں کے ہیں۔
اَلْجَامِلُ اونٹوں کا گلہ جن کے ساتھ ان کا چرواہا بھی ہو یہ بَاقِرٌ کی طرح ہے اور اِتَّخَذَ اللَّیْلَ جَمَلًا (کہ اس نے رات کو اونٹ بنالیا) محاورہ مجاز پر محمول ہے جس کے معنی ہیں اپنے ساری رات سفر کیا۔ جیسا کہ رَكِبَ اللَّیْلَ کا محاورہ ہے اور اونٹ کو جَمَلٌ کہنے کی یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ عرب لوگ اونٹ کو اپنے لئے باعث زینت اور فخر سمجھتے تھے جیسا کہ آیت :۔
وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔
جَمَلْتُ الشَّحْمَ چربی پگھلانا اور پگھلائی ہوئی چربی کو اَلْجَمِيْلُ کہا جاتا ہے اور اِجْتِمَالٌ کے معنی چربی کو بطور تیل ملنے کے ہیں۔ ایک عورت نے اپنی لڑکی سے کہا :۔
تَجَمَّلِيْ وَتَعَفَّفِيْ یعنی چربی پگھلا کر کھایا کرو اور عُفَافَہ یعنی تھنوں میں باقی ماندہ دودھ پیا کرو۔

(ج ن ن)

اَلْجَنُّ (ن) کے اصل معنی کسی چیز کو حواس سے پوشیدہ کرنے کے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے :۔
جَنَّهُ اللَّیْلُ وَاَجَنَّهٗ اسے رات نے چھپالیا۔ جُنَّ عَلَیْهِ اسے جنون ہوگیا۔
پس جَنَّهٗ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ اور اَجَنَّهٗ کے معنی چھپانے کے لئے کوئی چیز دینے کے ہیں جیسے :۔ قَبَرْتُهٗ وَاَقْبَرْتُهٗ وسَقَیْتُهٗ وَاَسْقَیْتُهٗ جَنَّ عَلَیْهِ كَذَا ۔ کسی چیز نے اسے چھپالیا۔
قرآن میں ہے :۔
فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ اللَّیْلُ رَاٰى كَوْكَبًا (۶-۷۶) جب رات نے ان کو پردۂ تاریکی سے چھپا دیا تو ابراہیم نے ایک ستارہ دیکھا۔
اَلْجَنَانُ دل کیونکہ وہ حواس سے مستور ہوتا ہے۔
اَلْمِجَنُّ وَالْمِجَنَّۃُ ڈھال۔ کیونکہ اس سے انسان اپنے آپ کو بچاتا اور چھپاتا ہے۔
قرآن میں ہے :۔ اِتَّخَذُوْا اَيْمَانَهُمْ جُنَّۃً (۶۳-۲) انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے۔
اور حدیث میں ہے[1] :۔ (۶۷)
اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ کہ روزہ ڈھال ہے۔
اَلْجَنَّۃُ ہر وہ باغ جس کی زمین درختوں کیوجہ سے نظر نہ آئے جنت کہلاتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔
لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ اٰيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِيْنٍ وَّشِمَالٍ (۳۴-۱۵) (اہل) سبا کے لئے ان کے مقام بود و باش میں ایک نشانی تھی (یعنی دو باغ ایک دائیں طرف اور (ایک) بائیں طرف۔
وَلَوْلَا اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ (۱۸-۳۹) اور (بھلا) جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو ..... کیوں نہ ۔
بعض کہا ہے کہ ان گنجان درختوں کو بھی جنت

---

[1] ای یقی صاحبہ من الشہوات انظر للحدیث النہایۃ ۱/۳۰۴/۲ واللسان (جنن) و زوائد ابن حبان ۔ عن کعب بن عجرۃ انظر رقم ۲۰۵۳ و ۲۶۱ و ۱۵۶۹ ÷ ÷ ÷

کہا جاتا ہے جو زمین کو چھپائے ہوئے ہوں اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے[1] (بسیط)

(۹) مِنَ النَّوَاضِحِ تَسْقِي جَنَّةً سُحُقًا

اور نخلستان کو سیراب کرنے والی سدھائی ہوئی اونٹنی پر رکھے ہوتے ہیں۔

اور بہشت کو جنت یا تو دنیوی باغات سے تشبیہ دے کر کہا گیا ہے، اگرچہ دونوں میں بون بعید ہے اور یا اس لئے کہ بہشت کی نعمتیں ہم سے مخفی رکھی گئی ہیں جیسا کہ فرمایا:۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ (۳۲-۱۷) کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان کے لئے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے۔

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ جَنَّاتٍ جمع لانے کی وجہ یہ ہے کہ بہشت سات ہیں[2]۔

(۱) جَنَّةُ الْفِرْدَوْس (۲) جَنَّةُ عَدْنٍ (۳) جَنَّةُ النَّعِيم (۴) دَارُ الْخُلْدِ (۵) جَنَّةُ الْمَأْوٰى (۶) دَارُ السَّلَام (۷) عِلِّيِّيْنَ۔

اَلْجَنِيْنُ۔ بچہ جب تک ماں کے پیٹ میں ہو اسے جنین کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَجِنَّةٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَإِذْ أَنتُمْ أَجِنَّةٌ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ (۵۳-۳۲) اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچے تھے۔

اور یہ یعنی جنین فعیل بمعنی مفعول سے ہے یعنی چھپا ہوا۔ اَلْجَنِيْنُ قبر کو بھی کہتے ہیں۔ فعیل بمعنی فاعل ہے یعنی چھپانے والی۔

اَلْجِنُّ۔ جن (اس کی جمع جِنَّةٌ آتی ہے اور) اس کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے۔

(۱) انسان کے مقابلہ میں ان تمام روحانیوں کو جن کہا جاتا ہے جو حواس سے مستور ہیں۔ اس صورت میں جن کا لفظ ملائکہ اور شیاطین دونوں کو شامل ہوتا ہے لہذا تمام فرشتے جن ہیں لیکن تمام جن فرشتے نہیں ہیں۔ اسی بنا پر ابو صالح نے کہا ہے کہ سب فرشتے جن ہیں۔

(۲) بعض نے کہا ہے کہ نہیں بلکہ جِنّ روحانیوں کی ایک قسم ہیں کیونکہ روحانیات تین قسم ہیں۔

(۱) اَخْيَار (نیک) اور یہ فرشتے ہیں۔

(۲) اَشْرَار (بد) اور یہ شیاطین ہیں۔

(۳) اَوْسَاط جن میں بعض نیک اور بعض بد ہیں اور یہ جن ہیں چنانچہ سورت جن کی ابتدائی آیات:۔

قُلْ أُوحِيَ إِلَيَّ ۔۔۔ وَأَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِنَّا الْقَاسِطُونَ (۷۲: ۱-۱۴) اور یہ کہ ہم بعض فرمانبردار ہیں اور بعض (نافرمان) گنہگار ہیں۔

اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جنوں میں بعض نیک اور بعض بد ہیں۔

اَلْجِنَّةُ جنوں کی جماعت۔ قرآن میں ہے:۔

مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ (۱۱۴-۶) (خواہ وہ) جنات سے (ہو) یا انسانوں میں سے۔ وَجَعَلُوا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا (۳۷-۱۵۸) اور انہوں نے خدا میں اور جنوں میں رشتہ مقرر کیا۔

اَلْجِنَّةُ (ایضا) جنون۔ دیوانگی۔ قرآن میں ہے:۔

مَا بِصَاحِبِكُم مِّن جِنَّةٍ (۷-۱۸۴) کہ ان کے

---

[1] قالہ زہیر بن ابی سلمی وادرہ۔ کان عینی فی غربی مقتلة۔ والبیت فی دیوانہ مع شرح الاعلم الشنتمری ۱۷ (طبع لیدن ۱۳۰۶ھ) والعقد الثمین ۹۴ ومطالع دمثل، شواہد الکشاف ۸۲ ومختار الشعر الجاہلی ۱: ۱۷۱ والبحر ۳۰۰/۱ ۳۴/۷ [2] وفی الفتح ۴/۲۸:۔ ملح المؤلف (البخاری) ہہنا باسماء الجنۃ وہا عشرۃ او تزید سبق المذکورۃ (۸) دار المقامۃ (۹) المقام الامین (۱۰) مقعد صدق (۱۱) الحسنی وکلہا فی القرآن وزاد بعضہم دار الحیوان وفی الاخیر نظر۔

رفیق (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو (کسی طرح کا بھی) جنون ... نہیں ہے۔

اور دیوانگی کو جنون اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ انسان کے دل اور عقل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔

جُنَّ فُلَانٌ۔ اسے جن لگ گیا۔

امراض کے معانی میں دوسرے افعال کی طرح یہ بھی فعل مجہول ہی استعمال ہوتا ہے جیسے زُكِمَ (اسے زکام ہوگیا) لُقِيَ (اسے لقوہ ہوگیا) حُمَّ (اسے بخار ہوگیا) وغیرہ۔ بعض نے کہا ہے کہ جُنَّ فُلَانٌ کے معنی ہیں۔ اس کے قلب کو عارضہ ہوگیا اور بعض نے کہا کہ دیوانگی نے اس کی عقل کو چھپا لیا اور آیت کریمہ مُعَلَّمٌ مَّجْنُونٌ (۴۴-۱۴) کے معنی یہ ہیں کہ اسے وہ جن چمٹا ہوا ہے جو اسے تعلیم دیتا ہے اور یہی معنی آیت :-

أَئِنَّا لَتَارِكُوا آلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُونٍ (۳۷-۳۶) کہ بھلا ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے کہیں اپنے معبودوں کو چھوڑ دینے والے ہیں۔ میں شاعر مجنون کے ہیں۔

جُنَّ التِّلَاعُ وَالْآفَاقُ یعنی ٹیلوں اور ان کے گرد و نواح کو گھاس نے چھپا لیا۔ اور آیت کریمہ :-

وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَارِ السَّمُومِ (۱۵-۲۷) اور جان کو اس سے بھی پہلے بے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔

میں جَانّ سے بھی جنوں کی ایک قسم مراد ہے[1]۔ لیکن آیت کریمہ :- كَأَنَّهَا جَانٌّ (۲۷-۱۰) میں جَانّ سے ایک قسم کا سانپ مراد ہے۔

(ج ن ب)

اَلْجَنْبُ اصل میں اس کے معنی پہلو کے ہیں اس کی جمع جُنُوبٌ ہے۔ قرآن میں ہے :-

قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَى جُنُوبِهِمْ (۳-۱۹۱) جو کھڑے اور بیٹھے اور پہلوؤں پر لیٹے ہوئے۔

فَتُكْوَى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ (۹-۳۵) پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو ..... داغے جائیں گے۔

تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ (۳۲-۱۶) ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں۔

پھر بطور استعارہ پہلو کی سمت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسا کہ یمین، شمال اور دیگر اعضا میں عرب لوگ استعارات سے کام لیتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[2] (الکامل)

(۹۶) مِنْ عَنْ يَمِينِي مَرَّةً وَأَمَامِي

کبھی دائیں جانب سے اور کبھی سامنے سے۔

اسی سے جَنْبُ الْحَائِطِ وَجَانِبُهُ کا محاورہ ہے۔ یعنی دیوار کی جانب۔

اور اَلصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ (۴-۳۶) کے معنی قریبی دوست کے ہیں۔ اور آیت کریمہ :-

يَا حَسْرَتَى عَلَى مَا فَرَّطْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ (۳۹-۵۶) کہ ہائے ہائے اس تقصیر پر افسوس ہے جو میں نے خدا کے حق میں کی۔

---

[1] الجان ابو الجن عن ابن عباس والحسن عن قتادة وعند البعض ابو الشیاطین ابلیس راجع ترانٰ (۴ر ۳-۵) [2] البیت لقطری بن فجاءة المازنی احد زعماء الخوارج فی زمان مصعب بن الزبیر ﷺ وسنة ۷۸ واسمہ جعونة بن مازن وصدرہ: فلقد ارانی للرماح دریئة ..... والبیت فی الحماسة مع المرزوقی رقم ۲۰ والشعری (۱: ۴۰۲) (۲۲۹) والقالی (۲: ۸۶) والخزانة (۴: ۲۵۸) وابن عقیل (۱: ۲۴۳) وابن ہشام رقم ۲۷۵ واستشہد بہ النحاة علی ان لفظۃ "عن" قد تکون اسما بمعنی جانب قال ابن ہشام وذالک متعین فی ثلاثة مواضع احدہا: ان یدخل علیہا من وہو کثیر کقول الشاعر ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

میں جَنْبِ اللّٰہِ سے خداتعالیٰ کے اوامر حدود مراد ہیں جو اس نے ہمارے لئے مقرر فرما دیئے ہیں۔

سَارَ جَنِیْبَہٗ وَجَنِیْبَتَہٗ وَجَنَابَیْہِ وَجَنَابَتَیْہِ اس کے پہلو پر چلا وَجَنَبْتُہٗ میں نے اس کے پہلو پر مارا جیسے کَبَدْتُہٗ میں نے اسکے کلیجے پر مارا فَاَدْتُہٗ میں نے اس کے فُواد یعنی دل پر مارا۔ جُنِبَ الرَّجُلُ ..... پہلو کے درد میں مبتلا ہونا جیسے کُبِدَ وَ فُئِدَ اور جَنُبَ سے فعل دو معنوں کے لئے استعمال ہوتا ہے ایک کسی کی سمت مخالف کو جانا یا اس سے دور ہونا۔ دوم سمت موافق کو آنا یا اس کے قریب ہونا۔ اول معنی کی مثال جیسے جَنَبْتُہٗ وَاَجْنَبْتُہٗ میں نے اسے جانب مخالف یعنی دور کر دیا۔ اسی سے اَلْجَارِ الْجُنُبِ (۴۔۳۶) ہے جس کے معنی اجنبی یعنی دور کے ہمسایہ کے ہیں شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۹۷) فَلَا تَحْرِمَنِّیْ نَائِلًا عَنْ جَنَابَۃٍ

تو مجھ جیسے غریب الوطن کو دور ہی سے عطا سے محروم نہ کر۔ رَجُلٌ جَنِبٌ وَجَانِبٌ اجنبی آدمی۔

اَلْاِجْتِنَابُ (افتعال) بچنا، یکسو رہنا، پہلو تہی کرنا۔ قرآن میں ہے:۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَائِرَ مَا تُنْہَوْنَ عَنْہُ (۴۔۳۱) اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے جس سے تم کو منع کیا جاتا ہے۔ اجتناب رکھو گے۔

اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبَائِرَ الْاِثْمِ (۵۳۔۳۲) جو..... بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲۔۳۰) اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ (۳۹۔۱۷) میں بتوں سے اجتناب کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے طاغوت کی عبادت یکسر ترک دی اس طرح وہ طاغوت سے دور رہے۔ نیز فرمایا:۔

فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۵۔۹۰) سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔ اور یہ یعنی اِجْتَنِبُوْا بنسبت اُتْرُکُوْہُ کے زیادہ بلیغ ہے۔

جَنَّبَ بَنُوْ فُلَانٍ بے شیر شدن قوم

جَنَبَ فُلَانٌ خَیْرًا۔ فلاں خیر سے محروم ہو گیا۔

جَنَبَ شَیْئًا۔ وہ شر سے دور رہا۔ چنانچہ قرآن میں نار جہنم کے متعلق ہے:۔

وَسَیُجَنَّبُہَا الْاَتْقَی الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَہٗ یَتَزَکّٰی (۹۲: ۱۷۔۱۸) اور جو بڑا پرہیزگار ہے وہ اس (نار) سے بچا لیا جائے گا۔ جو اپنا مال دیتا ہے تاکہ پاک ہو۔ لیکن اگر مطلق یعنی بغیر کسی متعلق کے جُنِبَ فُلَانٌ کہا جائے تو اس کے معنی خیر سے محروم ہونا ہی ہوتے ہیں۔ اسی طرح دعائے خیر کے لئے بھی یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (۱۴۔۳۵) اور مجھے اور میری اولاد کو اس بات سے کہ بتوں کی پرستش کرنے لگیں بچائے رکھ۔

میں اُجْنُبْنِیْ جَنَبْتُہٗ عَنْ کَذَا سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی چیز سے دور رکھنے اور بچانے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ جَنَبْتُ الْفَرَسَ کے محاورہ

---

[1] قالہ علقمۃ بن عبدۃ التمیمی المعروف بعلقمۃ الفحل صاحب امرء القیس یخاطب بالحارث بن جبلۃ یمدحہ وکان قد اسر خاہ شاسا فی تسعین رجلا من بنی تمیم وتمامہ:..... فانی امرء وسط القباب غریب والبیت فی دیوانہ من الستۃ ۱۰۷ والمفضلیات (۲: ۴۹۱) والکامل ۲۲۷ والزجاج (۱: ۱۷ب مخطوطۃ) والشنتمری (۲: ۳۰۴) والقرطبی (۵: ۱۸۳ و ۱۳/۱: ۲۵۷) واللسان والتاج (جنب) ابو عبیدۃ (۲: ۹۸/۱: ۱۲۶) وشواہد الشافیہ ۴۹۴ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۳۲۳) والبحر (۳: ۲۴۰) وامالی الشجریۃ (۱: ۴۱) والعمدۃ (۱: ۷۵) والعقد الثمین ۱۰۷ وایام العرب ۵۸

سے ماخوذ ہے جس کے معنی کوتل ہا نکنا کے ہیں۔ تو گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ وہ اپنے لطف و کرم اور اسباب مخفیہ کے ذریعہ اسے شرک کی جانب سے کھینچ لائے اور اسی طرح اس سے دور رکھے۔

اَلْجَنَبُ (ایضًا) پیدائشی طور پر پاؤں کا ایک دوسرے سے دور ہونا اور آیت کریمہ:۔
وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا (۵-۶) کے معنی یہ ہیں کہ جب تم حالت جنابت میں ہوا کرو تو غسل کر لو[۱]۔ اور شرعًا جَنَابَةٌ کا لگنا یا تو انزال یعنی خروج منی سے ثابت ہوتا ہے اور یا دو ختنوں کے التقاء یعنی مرد کے عضو تناسل کے عورت کی شرم گاہ میں داخل ہونے[۱] سے اور جنبی ہونے کے معنی میں جَنَبَ (ک ن س) وَتَجَنَّبَ وَاجْتَنَبَ تینوں باب استعمال ہوتے ہیں اور جَنَابَةٌ کو جنابت اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ شرعًا نماز سے دور رہنے کا سبب بنتی ہیں۔

اَلْجُنُوْبُ (جنوبی ہوا) اس میں کعبہ کی جانب سے آنے اور اس کی جانب جانے دونوں معنی کا اعتبار ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس میں یہ دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ جَنُوْبٌ سے جُنِبَتِ الرِّيْحُ کا محاورہ لیا گیا ہے جس کے معنی جنوبی ہوا چلنے کے ہیں۔ اَجْنَبْنَا ہم جنوب میں داخل ہوئے۔ جُنِبْنَا ہمیں جنوبی ہوا لگی۔ سَحَابَةٌ مَجْنُوْبَةٌ وہ بادل جسے جنوبی ہوا چلا کر لائی ہو۔

(ج ن ح)

اَلْجَنَاحُ پرند کا بازو۔ اسی سے جَنَحَ الطَّائِرَ کا محاورہ ماخوذ ہے جس کے معنی اس کا بازو توڑ دینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ (۶-۳۸) یا دو پروں سے اڑنے والا جانور ہے۔

پھر کسی چیز کے دونوں جانب کو بھی جَنَاحَيْن کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً جَنَاحَا السَّفِيْنَةِ (سفینہ کے دونوں جانب)، جَنَاحَا الْعَسْكَرِ (لشکر کے دونوں جانب)، اسی طرح جَنَاحَا الْوَادِيْ وادی کے دونوں جانب اور انسان کے دونوں پہلوؤں کو جَنَاحَا الْاِنْسَانِ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ (۲۰-۲۲) اور اپنا ہاتھ اپنے پہلو سے لگا لو۔ اور آیت:۔
وَاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ (۲۸-۳۲) اور خوف دور ہونے (کی وجہ) سے اپنے بازو کو اپنی طرف سکیڑ لو۔

میں جَنَاحٌ بمعنی يَدٌ کے ہے۔ کیونکہ پرند کا بازو اس کے لئے بمنزلہ ہاتھ کے ہوتا ہے اسی لئے جَنَاحَا الطَّيْرِ کو يَدَا الطَّيْرِ بھی کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (۱۷-۲۴) اور عجز و نیاز سے انکے آگے جھکے رہو۔

میں ذُلٌّ کے لئے جَنَاحٌ بطور استعارہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ذُلٌّ یعنی ذلت و انکساری دو قسم پر ہے ایک ذلت وہ ہے جو انسان کو اس کے مرتبہ سے گرا دیتی ہے اور دوسری وہ ہے جو انسان کے مرتبہ کو بلند کر دیتی ہے اور یہاں چونکہ ذلت کی دوسری قسم مراد ہے۔ جو انسان کو اس کے مرتبہ سے گرانے

---

[۱] وایضًا مجنب بمعنی بعید کما فی قولہ تعالیٰ فبصرت بہ عن جنب (۲۸-۱۱) ای عن بعد ۱۲ [۱] وفی الحدیث عن عائشۃ: اذا مس الختان الختان فقد وجب الغسل وفی روایۃ جاوز وانہ یوضح المراد راجع العون ۱/ ۱۲

کی بجائے بلند کر دیتی ہے اس لئے جناح کا لفظ بطور استعارہ (یعنی معنی رفعت کی طرف اشارہ کے لئے) استعمال کیا گیا ہے گویا اسے حکم دیا گیا ہے کہ رحمت الٰہی حاصل کرنے کے لئے ان کے سامنے ذلت کا اظہار کرتے رہو اور یا یہ معنی ہیں کہ ان پر رحمت کرنے کے لئے ذلت کا اظہار کرو۔

جَنَحَتِ الْعِيْرُ فِيْ سَيْرِهَا قافلہ تیزی سے چلا۔ گویا وہ اپنے دونوں بازوؤں سے اُڑ رہا ہے۔ جَنَحَ اللَّيْلُ مرات کی تاریکی چھا گئی۔ اَلْجُنْحُ رات کا سیاہ حصہ۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (۸-۶۱) اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ۔

میں جَنَحُوْا کے معنی مائل ہونے کے ہیں یہ جَنَحَتِ السَّفِيْنَةُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کشتی کے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ اسی لئے ہر وہ گناہ جو انسان کو حق سے مائل کر دے اسے جُنَاحٌ کہا جاتا ہے۔ پھر عام گناہ کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن میں متعدد مواضع پر لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ آیا ہے۔

جَوَانِحُ الصَّدْرِ وہ پسلیاں جن کے سرے سینے کے وسط میں باہم متصل ہوتے ہیں اس کا واحد جَانِحَۃٌ ہے اور ان پسلیوں کو جوانح اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ان میں میلان یعنی خم ہوتا ہے۔

(ج ن د)

اَلْجُنْدُ کے اصل معنی سنگستان کے ہیں معنی غلظت اور شدت کے اعتبار سے لشکر کو جُنْدٌ کہا جانے لگا ہے۔ اور مجازاً ہر گروہ اور جماعت پر جُنْدٌ پر لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے (حدیث میں ہے) اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُّجَنَّدَةٌ[1] کہ ارواح کے بھی گروہ اور جماعتیں ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُوْنَ (۳۷-۱۷۳) اور ہمارا لشکر غالب رہے گا۔

اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ (۴۴-۲۴) (تمہارے بعد) ان کا تمام لشکر ڈبو دیا جائے گا۔

اور جُنْدٌ کی جمع اَجْنَادٌ وَجُنُوْدٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ (۲۶-۹۵) اور شیطان کے لشکر سب کے سب داخل جہنم ہوں گے)

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (۷۴-۳۱) اور تمہارے پروردگار کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور آیت کریمہ:۔

اُذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَاءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا (۳۳-۹) خدا کی اس مہربانی کو یاد کرو جو (اس نے) تم پر (اس وقت کی) جب فوجیں تم پر (حملہ کرنے کو) آئیں تو ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر (نازل کئے) جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے۔ میں پہلے جُنُوْد سے مراد کفار کی فوجیں ہیں اور

---

[1] وتمامہ: فما تعارف منہا ائتلف وما تناکر منہا اختلف (محاضرات المؤلف ۲/۵۳) والحدیث اخرجہ مسلم من حدیث ابی ہریرۃ والبخاری تعلیقاً من حدیث عائشۃ والطبرانی من حدیث ابن مسعود وبعضاد اخرجہ الطبرانی فی الاوسط من حدیث علی وفیہ قصۃ امرأتین المکیۃ والمدنیۃ اخرجہ الحسن بن سفیان فی مسندہ بسند حسن والدیلمی والخرائطی فی اعتلال القلوب من علی وسد ومن عمرو بمعناہ السلفی فی انتخاب حدیث الفراء راجع تخریج الاحیاء للعراقی ۲/۱۶۷-۱۶۲ وادب الدنیا والدین للماوردی ۱۹ باشرح خان زادہ وکنز العمال ۹ رقم ۲۳، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۹۲۱، ۹۲۳ ÷

دوسرے سے فرشتوں کے لشکر مراد ہیں جو انہیں نظر نہیں آتے تھے۔

(ج ن ف)

اَلْجَنَفُ اس کے اصل معنی فیصلہ میں ایک طرف مائل ہونے یعنی جانبداری اظہار کرنے کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا (۲-۱۸۲) اگر کسی کو وصیت کرنے والے کی طرف سے کسی وارث کی طرفداری کا اندیشہ ہو۔ میں صریح طور پر جانبداری مراد ہے اسی طرح فرمایا:۔
غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ (۵-۳) بشرطیکہ گناہ کی طرف مائل نہ ہو۔

(ج ن ی)

جَنَيْتُ (ض) جَنْيًا۔ الثَّمَرَةَ وَاجْتَنَيْتُهَا میں نے درخت سے پھل توڑا۔
اَلْجَنِيُّ وَالْجَنَى چنے ہوئے پھل، چھتہ سے نکالا ہوا شہد لیکن عام طور پر جَنِيٌّ تازہ پھل کو کہتے ہیں جو حال ہی میں توڑا گیا ہو۔ قرآن میں ہے:۔
تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (۱۹-۲۵) تم پر تازہ کھجوریں جھڑ پڑیں گی۔
وَجَنَى الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ (۵۵-۵۴) اور دونوں باغوں کے میوے قریب (جھک رہے) ہیں۔
اَجْنَى الشَّجَرُ درخت کے پھل پک گئے توڑنے کے قابل ہوگئے اَجْنَتِ الْاَرْضُ زمین زیادہ پھلوں والی ہوگئی۔ اسی سے یعنی پھل توڑنے کے معنی سے بطور استعارہ جَنٰى فُلَانٌ جِنَايَةً گناہ کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اِجْتَرَمَ کا محاورہ بطور استعارہ اس معنی میں آتا ہے۔

(ج ھ د)

اَلْجَهْدُ وَالْجُهْدُ کے معنی وسعت و طاقت اور تکلیف و مشقت کے ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اَلْجَهْدُ (فتح جیم) کے معنی مشقت کے ہیں اور اَلْجُهْدُ (بضم جیم) طاقت اور وسعت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اَلْجُهْدُ کا لفظ صرف انسان کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ (۹-۷۹) اور جنہیں اپنی محنت و مشقت (کی کمائی) کے سوا کچھ میسر نہیں ہے۔
اور آیت کریمہ:۔ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ (۱۶-۳۸) کے معنی یہ ہیں کہ وہ بڑی زور زور سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ وہ اس میں اپنی انتہائی کوشش صرف کریں گے۔
اَلْاِجْتِهَادُ (افتعال) کے معنی کسی کام پر پوری طاقت صرف کرنے اور اس میں انتہائی مشقت اٹھانے پر طبیعت کو مجبور کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے جَهَدْتُ رَاْيِيْ وَاَجْهَدْتُهٗ میں نے غور و فکر سے اپنی رائے کو مشقت اور تعب میں ڈالا۔
اَلْجِهَادُ وَالْمُجَاهَدَةُ دشمن کے مقابلہ اور مدافعت میں اپنی انتہائی طاقت اور وسعت خرچ کرنا اور جہاد تین قسم پر ہے (۱) ظاہری دشمن یعنی کفار سے جہاد کرنا (۲) شیطان اور (۳) نفس سے مجاہدہ کرنا اور آیت کریمہ:۔
وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (۲۲-۷۸) کہ اللہ کی راہ میں پوری طرح جہاد کرو۔۔۔ تینوں

قسم کے جہاد پر مشتمل ہے۔ نیز فرمایا:۔
وَجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۹-۴۱) کہ خدا کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرو۔ اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۹-۲۰) جو لوگ ایمان لائے اور وطن چھوڑ گئے اور خدا کی راہ میں اپنے مال وجان سے جہاد کرتے رہے۔

اور حدیث میں ہے[66] (۶۶)
جَاهِدُوْا اَهْوَاءَكُمْ كَمَا تُجَاهِدُوْنَ اَعْدَاءَكُمْ کہ جس طرح اپنے دشمن سے جہاد کرتے ہو اسی طرح اپنی خواہشات سے بھی جہاد کیا کرو۔

اور مجاہدہ ہاتھ اور زبان دونوں کے ساتھ ہوتا ہے چنانچہ آنحضرت نے فرمایا[67] (۶۷)
جَاهِدُوا الْكُفَّارَ بِاَيْدِيْكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ کہ کفار سے ہاتھ اور زبان دونوں کے ذریعہ جہاد کرو۔

(ج ھ ر)

اَلْجَهْرُ (ف) اس کے اصل معنی کسی چیز کا حاسہ سمع یا بصر میں افراط کے سبب پوری طرح ظاہر اور نمایاں ہونے کے ہیں چنانچہ حاسہ بصر یعنی نظروں کے سامنے کسی چیز کے ظاہر ہونے کے متعلق کہا جاتا ہے رَاَيْتُهٗ جِهَارًا کہ میں نے اسے کھلم کھلا دیکھا قرآن میں ہے:۔
لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً (۲-۵۵) کہ جب تک ہم خدا کو سامنے نمایاں طور پر نہ دیکھ لیں تم پر ایمان نہیں لائیں گے۔
اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً (۴-۱۵۳) ہمیں نمایاں اور ظاہر طور پر خدا دکھا دو۔

اور اسی معنی سے جَهَرَ الْبِئْرَ وَاجْتَهَرَهَا ہے جس کے معنی ہیں اس نے کنواں دکو صاف کرکے، اس کا پانی ظاہر کر دیا۔ محاورہ ہے مَا فِي الْقَوْمِ اَحَدٌ يَجْهَرُ عَيْنِيْ۔ قوم میں کوئی ایسا نہیں ہے۔ جو میری نظر میں بڑا معلوم ہوتا ہو۔
اَلْجَوْهَرُ یہ بھی اسی مادہ سے فَوْعَلٌ کے وزن پر ہے اور جوہر اسے کہتے ہیں جس کے بطلان سے اس کے جملہ محمولات کا بطلان لازم آتا ہو اور اسے جوہر اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حاسۂ بصر یعنی نظر کے سامنے ظاہر ہوتا ہے۔

اور حاسہ کے سامنے ظاہر ہونے کے متعلق فرمایا:۔
سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ (۱۳-۱۰) کہ تم میں سے کوئی چپکے سے بات کہے یا آواز بلند پکار کر (اس کے نزدیک) دونوں برابر ہیں وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى (۲۰-۷) تم پکار کر بات کہو وہ تو چھپے بھید اور نہایت پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔
وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ (۶۷-۱۳) اور تم پوشیدہ بات کرو یا ظاہر۔
وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ (۴۹-۲) اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے کے سامنے زور سے بات کرتے ہو (اسی طرح) ان کے روبرو زور سے نہ بولا کرو۔
كَلَامٌ جَهْوَرِيٌّ۔ بلند گفتگو اور بلند آواز شخص کو جَهِيْرٌ کہا جاتا ہے نیز جَهِيْرٌ کے معنی ہیں وہ شخص جو اپنے حسن وجمال سے نظر کو خیرہ کر دے۔

---

[66] الحديث باختلاف لفظه في الدارمي عن انس وايضاً ابن حبان والنسائي وصححه ورجال اسناده رجال الصحيح ۱۲

(ج ھ ز)

اَلْجَھَازُ۔ ساز و سامان جو تیار کر کے رکھا جائے۔ قرآن میں ہے:۔ فَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ۔ (۱۲۔ ۵۹) جب ان کے لئے ان کا سامان تیار کر دیا۔

اَلتَّجْھِیْزُ (تفعیل) تیار کردہ سامان کو لادنا یا بھیجنا ضَرَبَ الْبَعِیْرُ بِجَھَازِہٖ۔ اونٹ نے اپنا سامان (پالان اور بوجھ) نیچے پھینک دیا اور بدک کر بھاگ گیا۔ جَھِیْزَۃٌ ایک احمق عورت[1] نیز مادہ گرگ جو دوسرے کے بچے کو دودھ پلاتی ہو اسے بھی جَھِیْزَۃٌ کہا جاتا ہے[2]۔

ج ھ ل

اَلْجَھْلُ۔ (جہالت، نادانی) جہالت تین قسم پر ہے (۱) انسان کے ذہن کا علم سے خالی ہونا اور یہی اس کے اصل معنی ہیں اور بعض متکلمین نے کہا ہے کہ انسان کے وہ افعال جو نظام طبعی کے خلاف جاری ہوتے ہیں ان کا مقتضی بھی یہی معنی جہالت ہے۔ (۲) کسی چیز کے خلاف واقع یقین و اعتقاد قائم کر لینا۔ (۳) کسی کام کو جس طرح سرانجام دینا چاہیے اس کے خلاف سرانجام دینا عام ہے کہ اس کے متعلق اعتقاد صحیح ہو یا غلط مثلاً کوئی شخص دیدہ و دانستہ نماز ترک کر دے چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے آیت:۔ اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا قَالَ اَعُوْذُ بِاللهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ (۲۔ ۶۷) میں هُزُوًا کو جہالت قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ فَتَبَيَّنُوْا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ (۴۹۔ ۶) تو خوب تحقیق کر لیا کرو (مبادا) کہ تم کسی قوم کو نادانی سے نقصان پہنچا دو۔

اور جاہل کا لفظ عموماً بطور مذمت بولا جاتا ہے۔ مگر کبھی بطور مذمت نہیں بھی آتا۔ چنانچہ آیت:۔ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (۲۔ ۲۷۳) کہ نہ مانگنے کی وجہ سے ناواقف شخص ان کو غنی خیال کرتا ہے۔ میں الجاہل سے مراد وہ لوگ ہیں جو ان کی حالت سے ناواقف ہیں لہذا یہاں یہ لفظ مذمت کے لئے نہیں ہے[3]۔

اَلْمَجْھَلُ (سبب جہالت) ہر وہ معاملہ یا عادت یا زمین جو کسی چیز کے متعلق واقع کے خلاف اعتقاد قائم کر لینے کا سبب بنے اسے مَجْھَلٌ کہا جاتا ہے۔

اِسْتَجْھَلَتِ الرِّیْحُ الْغُصْنَ۔ ہوا نے شاخ کو اس طرح زور سے ہلایا گویا وہ اسے جہالت پر مجبور کر رہی ہے۔ یہ کس قدر عمدہ استعارہ ہے۔

(ج ھ ن م)

جَھَنَّمُ۔ دوزخ کا نام ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اصل میں فارسی لفظ جہنام سے معرب ہے واللہ اعلم۔

---

[1] مثل یضرب عند اظہار النفور من شيء، راجع المیدانی رقم ۲۸۰ وفیہ جہازہ وفی من ھذا المعنی ای مصعا ثراً فی جہازہ [2] وفی المثل قطعت جہیزۃ قول کل خطیب انظر المثل والقصۃ المیدانی رقم ۳۰۸۲ [3] وفی الحیوان (۱/۳۷۴) والعیون ۲/۹۷ یقال فی واحمق من جہیزۃ لانہا تترک ولدہا وترضع ولد الضبع راجع للمثل المعانی للقتیبی ۲۱۲ واللسان (جہز) وجمہرۃ الامثال (۱/۳۶) [3] والعثا الایۃ الجاہلیۃ الاولی (۳۳۔۳۳) فیقال علی العادات التی کانت فیہم قبل الاسلام وفی الایۃ (۲۵۔ ۶۳) جاء لفظۃ الجاہلون فی مقابلۃ عباد الرحمٰن ۱۲

÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

(ج و و)

اَلْجَوُّ کے معنی فضا کے ہیں قرآن میں ہے:۔
فِیْ جَوِّ السَّمَاءِ مَا یُمْسِکُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ (۱۶-۷۹) کہ فضا میں ..... ان کو خدا ہی تھامے رکھتا ہے۔
اور یمامۃ کو جوٌّ بھی کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

(ج و ب)

اَلْجَوْبُ (ض) اس کے اصل معنی جَوْبَۃٌ قطع کرنے کے ہیں اور یہ پست زمین کی طرح (زمین میں گڑھا سا) ہوتا ہے۔ پھر ہر طرح زمین کے قطع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ (۸۹-۹) اور ثمود کے ساتھ کیا کیا جو وادی (قریٰ) میں پتھر تراشتے (اور مکانات بنانے تھے۔
وَالْجَائِبَۃُ۔ پھیلنے والی) محاورہ ہے ھَلْ عِنْدَكَ مِنْ جَائِبَۃِ خَبَرٍ۔ کیا تمہارے پاس کوئی نشر ہونے والی خبر ہے۔
جَوَابُ الْکَلَامِ اور کسی کلام کے جواب کو بھی جواب اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ قائل کے منہ سے نکل کر فضا کو قطع کرتا ہوا سامع کے کان تک پہنچتا ہے مگر عرف میں ابتدائے کلام کرنے کو جواب نہیں کہتے بلکہ کلام کے لوٹانے پر جواب کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَمَا کَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا (۲۷-۵۶) توان کی قوم کے لوگ (بولے تو) یہ بولے اور اس کے سوا ان کا جواب نہ تھا۔
پھر جواب کا لفظ سوال کے مقابلہ میں بھی استعمال ہوتا ہے اور سوال دو قسم پر ہے (۱) گفتگو کا طلب کرنا اس کا جواب گفتگو ہی ہوتی ہے (۲) طلب عطا یعنی خیرات طلب کرنا اس کا جواب یہ ہے کہ اسے خیرات دے دی جائے چنانچہ اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا:۔
اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ (۴۶-۳۱) خدا کی طرف سے بلانے والے کی بات قبول کرو۔ وَمَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰہِ (۲۶-۳۲) اور جو شخص خدا کی طرف بلانے والے کی بات قبول نہ کرے۔
اور دوسرے معنی کے اعتبار سے فرمایا:۔
قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُکُمَا فَاسْتَقِیْمَا (۱۰-۸۹) کہ تمہاری دعا قبول کرلی گئی تو ہم ثابت قدم رہنا
اَلْاِسْتِجَابَۃُ بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی اِجَابَۃٌ (افعال) کے ہے اصل میں اس کے معنی جواب کے لئے تحری کرنے اور اس کے لئے تیار ہونے کے ہیں لیکن اسے اِجَابَۃٌ سے تعبیر کر لیتے ہیں کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔ قرآن میں ہے:۔ اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ (۸-۲۴) کہ خدا اور اس کے رسول کا حکم قبول کرو۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (۴۰-۶۰) کہ تم مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا) قبول کرونگا۔ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ (۳-۱۹۵) تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول کرلی۔ وَیَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۴۲-۲۶) اور جو ایمان لائے اور عمل نیک کئے ان کی (دعا) قبول فرماتا۔ وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ (۴۲-۳۸) اور جو اپنے پروردگار کا فرمان قبول کرتے ہیں۔ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ (۲-۱۸۶) اور اے پیغمبر جب تم سے میرے بندے میرے

بارے میں دریافت کریں تو (کہہ دو کہ) میں تو (تمہارے) پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو ان کو چاہیئے کہ میرے حکموں کو مانیں۔ اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ (۳-۱۷۲) جنہوں نے باوجود زخم کھانے کے خدا اور رسول کے حکم کو قبول کیا۔

(ج و د)

اَلْجُوْدِیُّ۔ اس پہاڑی کا نام ہے جو موصل اور جزیرہ کے درمیان واقع ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ (۱۱-۴۴) اور کشتی کوہ جودی پر جا ٹھہری۔ یہ دراصل اَلْجُوْدُ کی طرف منسوب ہے اور اَلْجُوْدُ کے معنی مقتنیات (ذخائر) کو صرف اور خرچ کرنے کے ہیں عام اس سے کہ وہ ذخیرہ علم ہو یا ذخیرہ مال کا ہو۔ رَجُلٌ جَوَادٌ سخی آدمی فَرَسٌ جَوَادٌ (تیز رفتار عمدہ گھوڑا) جو دوڑنے میں اپنی پوری طاقت صرف کردے اس کی جمع اَلْجِيَادُ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ (۳۸-۳۱) (جب ان کے سامنے) شام کو خاصے کے گھوڑے (پیش کئے گئے)

جَوْدٌ۔ زیادہ بارش۔ اور گھوڑے میں جو تیز رفتاری کی صفت ہوتی ہے اسے جُوْدَةٌ کہتے ہیں اور سخاوت مال کو جُوْدٌ کہا جاتا ہے۔

جَادَ (ن) اَلشَّيْءُ جَوْدَةً کسی چیز کا عمدہ اور جید ہونا اس سے صیغہ صفت جَيِّدٌ آتا ہے اشیاء میں جو عمدگی (جودۃ) پائی جاتی ہے اس پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:۔ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (۲۰-۵۰) کہ اس نے ہر چیز کو اس کی (مناسب) شکل وصورت بخشی اور پھر راہ دکھائی۔

(ج و ر)

اَلْجَارُ (پڑوسی۔ ہمسایہ) ہر وہ شخص جس کی سکونت گاہ دوسرے کے قریب میں ہو وہ اس کا جَارٌ کہلاتا ہے یہ "اسماء متضایفہ" یعنی ان الفاظ سے ہے جو ایک دوسرے کے تقابل سے اپنے معنی دیتے ہیں جیسا کہ اَخٌ اور صَدِیْقٌ کے الفاظ (میں ذکر اخوت اور صداقت دونوں جانب سے ہوتی ہے) کیونکہ کسی کا پڑوسی ہونا اسی وقت متصور ہوسکتا ہے جب دوسرا بھی اسکا پڑوسی ہو۔ چونکہ ہمسائے کا حق عقلاً اور شرعاً بہت بڑا حق سمجھا گیا ہے اس بنا پر ہر وہ شخص جس کا حق بڑا ہو یا وہ کسی دوسرے کے حق کو بڑا خیال کرتا ہو اسے اس کا "جارٌ" کہہ دیتے ہیں قرآن میں ہے۔ اَلْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ (۴-۳۶) اور رشتہ دار ہمسایہ اور اجنبی ہمسایوں۔

اِسْتَجَرْتُهٗ فَاَجَارَنِیْ (میں نے اس سے پناہ طلب کی چنانچہ اس نے مجھے پناہ دے دی[1]۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔ وَاِنِّیْ جَارٌ لَّكُمْ (۸-۴۸) اور میں تمہارا حامی اور مددگار رہوں میں جارٌ اسی معنی پر محمول ہے نیز فرمایا:۔ وَهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ (۲۳-۸۸) اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے بالمقابل کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔

---

[1] وفی التنزیل وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ (۹-۶) قل لن یجیرنی من اللہ احد (۷۲-۲۲) فمن یجیر الکافرین (۶۷-۲۸)

اور جَائِزٌ میں معنی قرب کے تصور کی بنا پر جَاوَرَہٗ وَجَاوَرَہٗ وَتَجَاوَرَ (انفعال) استعمال ہونے لگے ہیں یعنی کسی کے قرب وجوار میں رہنا قرآن میں ہے:۔
لَا يُجَاوِرُونَكَ فِيهَا إِلَّا قَلِيلًا (۳۳-۶۰) وہ اس (شہر) میں عرصہ قلیل کے سوا تمہارے ہمسایہ بن کر نہیں رہ سکیں گے۔ وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُتَجَاوِرَاتٌ (۱۳-۴) اور زمین میں ایک دوسرے سے متصل قطعات ہیں۔
اور معنی قرب کے اعتبار سے جَارَ عَنِ الطَّرِيقِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی (صلہ عن کی وجہ سے راستہ سے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں پھر مطلقاً حق سے عدول کرنے کے لئے اس کو اصل قرار دے کر اس سے اَلْجَوْرُ بمعنی ظلم بنایا گیا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَمِنْهَا جَائِرٌ (۱۶-۹) اور بعض راستے سیدھی راہ سے ایک جانب مائل ہو رہے ہیں (جو باری تعالیٰ تک نہیں پہنچتے)۔
بعض نے کہا ہے کہ اَلْجَائِرُ (جَوْرٌ سے صیغہ فاعل) انسانوں میں سے ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو احکام شریعت کے التزام سے رک جائے (اور اسی کا نام ظلم ہے)۔

(ج و ز)

جَوْزُ الطَّرِيقِ کے معنی راستہ کے وسط کے ہیں اسی سے جَازَ الشَّيْءُ ہے جو کسی چیز کے جائز یا خوشگوار ہونے کی ایک تعبیر ہے گویا۔ اس نے وسط طریق کو لازم پکڑا۔
جَوْزُ السَّمَاءِ وسط آسمان۔ اَلْجَوْزَاءُ آسمان کے ایک برج کا نام ہے کیونکہ وہ بھی وسط آسمان میں ہے۔ شَاةٌ جَوْزَاءُ۔ سیاہ بھیڑ جس کے وسط میں سفیدی ہو۔
(جَاوَزَہٗ کسی چیز کے وسط سے آگے گزر جانا) قرآن میں ہے۔ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ (۲-۲۴۹) پھر جب وہ (حضرت طالوت) اس دریا کے وسط سے آگے گزر گئے یعنی پار ہو گئے۔ وَجَاوَزْنَا بِبَنِي إِسْرَائِيلَ الْبَحْرَ (۱۰-۹۰) اور ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار کر دیا۔
جُزْتُ الْمَكَانَ کسی جگہ میں گزرنا۔ اَجَزْتُهٗ میں نے اسے نافذ کر دیا اس کو پیچھے چھوڑ دیا[1]۔
اِسْتَجَزْتُ فُلَانًا فَاَجَازَنِیْ (میں نے اس سے (جانوروں یا کھیتی کے لئے) پانی طلب کیا چنانچہ اس نے مجھے دے دیا۔ یہ بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ اور کسی لفظ کا حقیقی معنی وہ ہوتا ہے جو اپنے وضعی معنی میں استعمال ہو اور اس سے تجاوز نہ کرے[2] اور اسے مجاز کہتے ہیں)

(ج و س)

آیت کریمہ:۔ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ (۱۷-۵) میں جَاسُوا کے معنی ہیں کہ وہ تمہارے دیار کے اندر گھس گئے اور (ان میں خوب پھرے (غارت گری اور قتل سے کنایہ ہے) اور وَاسُوا کے معنی بھی اسی (جَاسُوا) کے قریب قریب ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ اَلْجَوْسُ کے معنی کسی چیز کو استقصار کے ساتھ طلب کرنا کے ہوتے ہیں۔
اَلْمَجُوْسُ۔ ایک معروف فرقے کا نام ہے۔

---

[1] وفی حدیث الصراط فاکون انا وامتی اول من یجیز علیہ [2] ھہنا التسامح فتفکر۔ ۱۲

(ج و ع)

اَلْجُوْعُ ۔ وہ تکلیف جو کسی حیوان کو معدہ کے طعام سے خالی ہونے کی وجہ پہنچتی ہے ۔ اَلْمَجَاعَۃُ خشک سالی کا زمانہ۔ کہا جاتا ہے ۔ رَجُلٌ جَائِعٌ بھوکا آدمی اور جب بہت زیادہ بھوکا ہو تو اسے جَوْعَانٌ کہا جاتا ہے۔

(ج و ل)

جَالُوْتُ ۔ ایک سرکش بادشاہ کا نام ہے جسے حضرت داود علیہ السلام نے قتل کیا تھا چنانچہ آیت :۔ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ (۲-۲۵۱) میں اسی کا ذکر کیا گیا ہے ۔

(ج ی ء)

جَاءَ (ض) جِیْئَۃً وَ مَجِیْئًا یہ اِلْاِتْیَان کے ہم معنی ہے جس کے معنی آنا کے ہیں لیکن مَجِیْئٌ کا لفظ اِتْیَان سے زیادہ عام ہے کیونکہ اِتْیَان کا لفظ خاص کر کسی چیز کے بسہولت آنے پر بولا جاتا ہے نیز اِتْیَان کے معنی کسی کام کا قصد اور ارادہ کرنا بھی آجاتے ہیں گو اس کا حصول نہ ہو ۔ لیکن مَجِیْئٌ کا لفظ اس وقت بولا جائیگا جب وہ کام واقعہ میں حاصل بھی ہو چکا ہو نیز جَاءَ کے معنی مطلق کسی چیز کی آمد کے ہوتے ہیں ۔ خواہ وہ آمد بالذات ہو یا بالامر اور پھر یہ لفظ اعیان واعراض دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور اس شخص کے لئے بھی بولا جاتا ہے جو کسی جگہ یا کام یا وقت کا قصد کرے قرآن میں ہے :۔ وَجَاءَ مِنْ اَقْصَی الْمَدِیْنَۃِ رَجُلٌ یَّسْعٰی (۳۶-۲۰) اور شہر کے پرلے کنارے سے ایک شخص دوڑتا

ہوا آپہنچا۔ وَلَقَدْ جَاءَکُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ (۴۰-۳۴) اور پہلے یوسف بھی تمہارے پاس نشانیاں لے کر آئے تھے۔ وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِھِمْ (۱۱-۷۷) اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے سے غمناک ہو گئے۔ فَاِذَا جَاءَ الْخَوْفُ (۳۳-۱۹) پھر جب خوف کا وقت آئے فَاِذَا جَاءَ اَجَلُھُمْ (۳۵-۴۵) جب ان کی موت کا وقت آجاتا ہے۔ بَلٰی قَدْ جَاءَتْکَ اٰیٰتِیْ (۳۹-۵۹) کیوں نہیں میری آیتیں تیرے پاس پہنچ گئی تھیں۔

اور آیت : فَقَدْ جَاءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا (۲۵-۴) کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے یہ بات کہہ کر ظلم اور جھوٹ کا قصد کیا ہے اور حد سے تجاوز کیا ہے ۔ تو یہاں پر ظلم اور زور کے متعلق مَجِیْئٌ کا لفظ استعمال کرنا ایسے ہی ہے جیسا ان کے متعلق اَلْقَصْد کا لفظ استعمال ہوتا ہے ۔

اِذْ جَاءُوْکُمْ مِّنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ (۳۳-۱۰) جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی طرف سے تم پر چڑھ آئے۔

اور آیت کریمہ :۔ وَجَاءَ رَبُّکَ وَالْمَلَکُ صَفًّا صَفًّا (۸۹-۲۲) میں پروردگار کے آنے سے اس کے حکم کا آجانا مراد ہے ۔ یہی قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے اور یہی معنی آیت فَلَمَّا جَاءَھُمُ الْحَقُّ (۱۰-۷۶) میں الحق کے آنے کے ہیں ۔

جَاءَہٗ بِکَذَا وَاَجَاءَہٗ (متعدی بحرف جار و ہمزہ) وہ اسے لے آیا۔ قرآن میں ہے :۔ فَاَجَاءَھَا الْمَخَاضُ اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَۃِ (۱۹-۲۳)

تو درد زہ ان کو کھجور کے تنے کی طرف لے آیا۔ بعض نے یہاں اَجَاءَ کے معنی اَلْجَاءَ یعنی مجبور اور لاچار کرنا بھی کئے ہیں مگر یہ جَاءَ سے ہمزہ تعدیہ، متعدی بنا یا گیا ہے۔ چنانچہ اسی سے مثل مشہور[1] ہے:۔ شَرٌّ مَا اَجَاءَكَ اِلٰى مُخَّةِ عُرْقُوْبٍ یعنی انتہائی فقر ہی تمہیں عرقوب سے مخ چوسنے کے لئے لے آیا ہے شاعر نے کہا ہے[2] (الوافر)

(۹۸) " اَجَاءَتْكَ الْمَخَافَةُ وَالرَّجَاءُ "

اسے امید و بیم تمہارے پاس لے آئی ہے

جَاءَ بِكَذَا۔ اس نے اسے لا حاضر کیا۔ قرآن میں ہے:۔

لَوْلَا جَاءُوْ عَلَيْهِ بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ (۲۴-۱۳) یہ افترا پرداز اپنی بات کی تصدیق کے لیے چار گواہ کیوں نہیں لائے۔

وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ يَّقِيْنٍ (۲۷-۲۲) اور میں تمہارے پاس شہر سبا سے ایک سچی خبر لیکر آیا ہوں۔

اور جو چیز لائی جاتی ہے اس کے اعتبار سے جَاءَ بِكَذَا کے معنی بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

(ج ی ب)

اَلْجَيْبُ کے معنی گریبان کے ہیں (مجازاً سینہ) اس کی جمع اَلْجُيُوْبُ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (۲۴-۳۱) ان کو چاہیئے کہ اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھا کریں۔

---

[1] راجع للمثل المیدانی رقم ۱۹۷۷ وفیہ یجیئک بدل اجاک وا للسان (عرقب) ویضرب للمضطر جدا وذالک لان العرقوب لا مخ لہ والعرقوب ایضا اسم رجل وھوا عید عرقوب مثل فی خلف الوعد [2] قالہ زہیر بن ابی سلمی واولہ وجار سار معتمدا الیکم قال الفراء واصلہ من جئت وقد جعلتہ بمعنی الجأ راجع اللسان والتاج (جیأ) والبیت من شواہد الطبری (۱۶-۴۳) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۹۶) والبحر (۶: ۱۸۲) والعقد الثمین ۷۷ ومحاضرات المؤلف (۱ = ۲۶۸) ومجاز القرآن ۲ = ۲ ودیوانہ ۷۷ والقرطبی (۱۱ = ۹۲) ۱۲ ج

کِتَابُ الْحَاءِ

(ح ب ب)

اَلْحَبُّ وَالْحَبَّۃُ (بفتحہ حاء) گندم جو وغیرہ مطعومات کے دانہ کو کہتے ہیں۔ اور خوشبودار پودوں اور پھولوں کے بیج کو حِبٌّ وَحِبَّۃٌ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔

کَمَثَلِ حَبَّۃٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ کُلِّ سُنْبُلَۃٍ مِّائَۃُ حَبَّۃٍ (۲-۲۶۱) (اس کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک بالی میں سو سو دانے ہوں۔

وَلَا حَبَّۃٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ (۶-۵۹) اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ ایسا نہیں ہے

اِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی (۶-۹۵) بے شک خدا ہی دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر (ان سے درخت اگاتا ہے)

اور آیت کریمہ:۔ فَاَنْبَتْنَا بِہٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِیْدِ (۵۰-۹) اور اس باغ سے دلبستان اگائے اور اناج۔ میں حَبَّ الْحَصِیْدِ سے گندم وغیرہ مراد ہے جو کاٹا جاتا ہے اور حدیث میں ہے[1] کَمَا تَنْبُتُ الْحِبَّۃُ فِیْ حَمِیْلِ السَّیْلِ۔ جیسے گھاس پات کے بیج جو سیلاب کے بہاؤ میں اگ آتے ہیں۔

اَلْحِبُّ (محبوب۔ عاشق) جس کی محبت حد سے بڑھ جائے دانوں کے ساتھ تشبیہ دیکر حَبَبُ الْاِنْسَانِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی دانتوں کی ہمواری اور موزونیت کے ہیں۔ اسی طرح شکل وصورت میں حبوب کے ساتھ تشبیہ دے کر پانی کے بلبلہ کو حَبَابُ الْمَاءِ کہا جاتا ہے۔

حَبَّۃُ الْقَلْبِ۔ سویدائے قلب۔ یہ بھی ہیئت میں تشبیہ کے اعتبار سے ہے۔

حَبَبْتُ فُلَانًا۔ اس کے اصل معنی ہیں میں نے اس کے حَبَّۃُ الْقَلْبِ پر مارا۔ جیسا کہ کَبَدْتُہٗ فَأَدْتُہٗ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

اَحْبَبْتُ فُلَانًا اصل معنی تو یہ ہیں کہ میں نے اپنا دل اس کی محبت کے لئے پیش کیا مگر عرف میں مُحِبٌّ کی جگہ پر محبوب کا لفظ رکھ لیا جاتا ہے اور اُحِبُّ کی بجائے حَبَبْتُ بھی استعمال ہوتا ہے۔

اَلْمَحَبَّۃُ کے معنی کسی چیز کو اچھا سمجھ کر اس کا ارادہ کرنے اور چاہنے کے ہیں اور محبت تین قسم پر ہے:۔

(۱) محض لذت اندوزی کے لئے جیسے مرد کسی عورت سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ آیت:۔ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا (۷۶-۸) میں اسی نوع کی محبت کی طرف اشارہ ہے۔

(۲) محبت نفع اندوزی کی خاطر جیسا کہ انسان کسی نفع بخش اور مفید شے سے محبت کرتا ہے چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَہَا نَصْرٌ مِّنَ

---

[1] قطعۃ من حدیث طویل ورد فی اہل النار بعد ما یخرجون منہا فیلقون فی نہر الحیاۃ راجع البخاری مع الفتح ۱۱/۳۸۵ وفی روایۃ مسلم النضارۃ بدل الحبۃ وحمئۃ السیل بدل حمیل السیل والحدیث فی الفائق ۲/۲۶۲ وغریب ابی عبیدۃ وہناک تخریجہ ۱۲

اللّٰہِ وَ فَتۡحٌ قَرِیۡبٌ (۶۱-۱۳) اور ایک چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو یعنی تمہیں خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح حاصل ہوگی۔

(۳) کبھی یہ محبت بہ محض فضل و شرف کی وجہ سے ہوتی ہے جیسا کہ اہل علم و فضل آپس میں ایک دوسرے سے محض علم کی خاطر محبت کرتے ہیں۔

اور بعض نے مثل آیت: فِیۡہِ رِجَالٌ یُّحِبُّوۡنَ اَنۡ یَّتَطَہَّرُوۡا (۹-۱۰۸) میں محبت کی تفسیر ارادہ سے بھی کی ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ لفظ محبت میں بنسبت ارادہ کے معنوی طور پر زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے کیونکہ ہر محبت میں ارادہ تو پایا جاتا ہے مگر ہر ارادے کو محبت نہیں کہہ سکتے۔ اور آیت کریمہ:۔

اِنِ اسۡتَحَبُّوا الۡکُفۡرَ عَلَی الۡاِیۡمَانِ (۹-۲۳) کے معنی یہ ہیں کہ اگر وہ کفر کو ایمان پر ترجیح دیں اور پسند کریں۔ اصل میں اِسۡتِحۡبَابٌ کے معنی کسی چیز میں ایسا معنی تلاش کرنے کے ہیں جس کی بنا پر اس سے محبت کی جائے مگر یہاں عَلٰی (صلہ) کی وجہ سے اس میں ایثار اور ترجیح کے معنی پیدا ہو گئے ہیں اسی طرح آیت کریمہ:۔

وَ اَمَّا ثَمُوۡدُ فَہَدَیۡنٰہُمۡ فَاسۡتَحَبُّوا الۡعَمٰی عَلَی الۡہُدٰی (۴۱-۱۷) کے معنی بھی یہ ہیں کہ انہوں نے اندھا پن کو ہدایت پہ ترجیح دی۔ اور آیت کریمہ:۔

فَسَوۡفَ یَاۡتِی اللّٰہُ بِقَوۡمٍ یُّحِبُّہُمۡ وَ یُحِبُّوۡنَہٗۤ (۵-۵۴) تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے گا اور جسے وہ دوست رکھیں گے۔

میں اللہ تعالیٰ کے ان سے محبت کرنے سے مراد ان پر انعام کرنا ہے اور بندوں کے اللہ تعالیٰ سے محبت کے معنی ہیں "بندہ تقرب الٰہی حاصل کرنے کی طلب میں لگا ہے"۔ اور آیت کریمہ:۔

اِنِّیۡۤ اَحۡبَبۡتُ حُبَّ الۡخَیۡرِ عَنۡ ذِکۡرِ رَبِّیۡ (۳۸-۳۲) کے معنی یہ ہیں کہ میں نے گھوڑوں سے اس طرح محبت کی جس طرح کہ مجھے خیر سے محبت ہے۔ (اس طرح میں اللہ کی یاد سے غافل ہو گیا) اور آیت کریمہ:۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیۡنَ وَ یُحِبُّ الۡمُتَطَہِّرِیۡنَ (۲-۲۲۲) میں اللہ تعالیٰ کے توابین اور متطہرین سے محبت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ثواب دیگا اور ان پر فضل و کرم فرمائیگا اور آیت کریمہ:۔

وَ اللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ (۲-۲۷۶)

اور آیت:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرٍ (۵۷-۲۳) (۳۱-۱۸) کہ خدا کسی اترانے والے خود پسند کو پسند نہیں کرتا۔

میں اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ گناہوں کے ارتکاب سے انسان اس قدر سرکش ہو جاتا ہے کہ توبہ کرنے کا نام نہیں لیتا اور جب توبہ نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے ان معنوں میں محبت نہیں کرتا جن معنوں میں کہ وہ توابین اور متطہرین سے محبت کرتا ہے یعنی انعام و افضال کرنا اور ثواب سے نوازنا۔

حَبَّبَ اللّٰہُ اِلَیَّ کَذَا فلاں چیز خدا نے مجھے عزیز کر دی۔ قرآن میں ہے:۔

وَ لٰکِنَّ اللّٰہَ حَبَّبَ اِلَیۡکُمُ الۡاِیۡمَانَ (۴۹-۷) لیکن خدا نے تم کو ایمان عزیز بنا دیا۔

اَحَبَّ الۡبَعِیۡرُ اونٹ کا ماندہ اور بیمار ہو کر ایک جگہ پڑے رہنا گویا اسے اس جگہ سے محبت ہے۔

حَبَابُکَ اَنۡ تَفۡعَلَ کَذَا یعنی تیری انتہائی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ تم ایسا کرو۔

(ح ب ر)

اَلْحِبْرُ۔ وہ نشان جو عمدہ اور خولصورت معلوم ہو حدیث میں ہے[۱] (۶۵) یَخْرُجُ مِنَ النَّارِ رَجُلٌ قَدْ ذَهَبَ حِبْرُهُ وَسِبْرُهُ کہ آگ سے ایک آدمی نکلے گا جس کا حسن وجمال اور چہرے کی رونق ختم ہو چکی ہو گی اسی سے رونمائی کو حِبْرٌ کہا جاتا ہے[۲]۔ شَاعِرٌ مُحَبِّرٌ عمدہ گو شاعر شِعْرٌ مُحَبَّرٌ عمدہ شعر۔ ثَوْبٌ حَبِيْرٌ ملائم اور نیا کپڑا۔ اَرْضٌ مِحْبَارٌ جلد سرسبز ہونے والی زمین (والجمع محابیر) اَلْحَبِيْرُ (من السحاب) خوبصورت بادل۔

حُبِرَ فُلَانٌ اس کے جسم پر زخم کا نشان باقی ہے۔ اَلْحَبْرُ عالم کو کہتے ہیں اسلئے کہ لوگوں کے دلوں پر اس کے علم کا اثر باقی رہتا ہے۔ اور افعال حسنہ میں لوگ اس کے نقش قدم پر چلتے ہیں اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علی رضؓ نے فرمایا (۶۶) کہ علماء تاقیامت باقی رہیں گے اگرچہ ان کی شخصیتیں اس دنیا سے فنا ہو جاتی ہیں لیکن ان کے آثار لوگوں کے دلوں پر باقی رہتے ہیں۔ حَبْرٌ کی جمع اَحْبَارٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (۹-۳۱) انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ ... کو اللہ کے سوا خدا بنا لیا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔ فِيْ رَوْضَةٍ يُّحْبَرُوْنَ (۳۰-۱۵) کے معنی یہ ہیں کہ وہ جنت میں اس قدر خوش ہوں گے کہ وہاں کی نعمتوں کی تر وتازگی کا اثر ان کے چہروں پر ہویدا ہو گا۔

(ح ب س)

اَلْحَبْسُ (ض) کے معنی کسی کو اٹھنے سے روک دینا کے ہیں قرآن میں ہے:۔ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلٰوةِ (۵-۱۰۶) تو ان کو (عصر کی) نماز کے بعد روک لو۔

نیز حَبْسٌ اس جگہ کو بھی کہتے ہیں جو پانی روکنے کے لئے بنائی گئی ہو۔ اس کی جمع اَحْبَاسٌ ہے

اَلتَّحْبِيْسُ ہمیشہ کے لئے وقف کرنا کہا جاتا ہے۔ هٰذَا حَبِيْسٌ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہ اللہ کی راہ میں وقف ہے۔

(ح ب ط)

اَلْحَبْطُ (ش) کے معنی کسی کام کا اکارت اور ضائع ہو جانا کے ہیں) قرآن میں ہے:۔ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (۲-۲۱۷) جن کے اعمال ضائع ہو گئے۔ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (۶-۸۸) اور اگر وہ لوگ شرک کرتے تو جو عمل وہ کرتے تھے سب ضائع ہو جاتے۔ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ (۳۹-۶۵) تو تمہارے عمل برباد ہو جائینگے۔ اَحْبَطَ (افعال) اکارت کر دینا) قرآن میں ہے:۔ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ (۴۷-۳۲) اور خدا ان کا سب کیا کرایا اکارت کر دے گا۔

---

[۱] في الفائق ۱/۲۵۱ الحبر والسبر بالکسر وقد یروی فیہما الفتح ایضاً راجع غریب ابی عبید ۱: ۸۵-۸۶ وایضاً اصلاح یعقوب ۱۰

[۲] ومنہ سمی کعب الاحبار لانہ کان صاحب کتب وہو کعب بن ماتع الحمیری ابو اسحاق التابعی مخضرم توفی ۳۲ھ فی خلافۃ عثمان وقد جاوز المأۃ وفی القاموس کعب الحبر ولا تقل الاحبار لکن رده العلماء راجع مشارق عیاض وتہذیب النووی [۳] قال الاصمعی: وکان یقال لطفیل الغنوی فی الجاہلیۃ المحبر لانہ کان یحسن الشعر غریب ابی عبید ۱: ۸۶ [۴] راجع نقول علی احقد ۲/۲۰۲ وفیہ واشباہ بدل واشخاصہم کذا فی ابن الحدید ۱۲

فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ (۴۷-۲۸) تو اس نے بھی ان کے عملوں کو برباد کر دیا۔

حبطِ عمل کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) اول یہ کہ وہ اعمال دنیوی ہوں اس لئے قیامت کے دن کچھ کام نہیں آئیں گے اسی کیطرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

وَقَدِمْنَا اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (۲۵-۲۳) اور جو انہوں نے عمل کئے ہوں گے ہم ان کی طرف متوجہ ہوں گے تو ان کو اڑتی خاک کر دیں گے۔

(۲) اعمال تو اخروی ہو لیکن انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے نہ کیا گیا ہو جیسا کہ مروی ہے (۶۹)

اَنَّهٗ يُؤْتٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِرَجُلٍ فَيُقَالُ لَهٗ بِمَا كَانَ اشْتِغَالُكَ قَالَ بِقِرَاءَةِ الْقُرْاٰنِ فَيُقَالُ لَهٗ قَدْ كُنْتَ تَقْرَءُ لِيُقَالَ هُوَ قَارِئٌ وَقَدْ قِيْلَ ذٰلِكَ فَيُؤْمَرُ بِهٖ اِلَى النَّارِ

کہ قیامت کے دن ایک آدمی کو لایا جائے گا اور اس سے پوچھا جائے گا کہ تو کس قسم کے عمل کرتا رہا وہ جواب دے گا کہ میں قرآن پاک پڑھتا رہا تو اس سے کہا جائے گا کہ تو نے قرآن اس لئے پڑھا تھا کہ تجھے قاری کہا جائے سو لوگ تجھے قاری کہتے رہے حکم ہوگا کہ اسے دوزخ میں لے جاؤ۔

(۳) تیسری صورت یہ ہے کہ اعمال صالحہ کئے ہوں گے لیکن ان کے بالمقابل گناہ کا بار اسقدر ہوگا کہ اعمال صالحہ بے اثر ہو کر رہ جائیں گے اور گناہوں کا پلہ بھاری رہے گا اسی کی طرف خفۃ المیزان سے اشارہ فرمایا گیا ہے[۱]۔

اصل میں حَبَط کا لفظ حَبَطٌ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کہ جانور اتنا زیادہ کھا جائے کہ اس کا پیٹ اپھر جائے[۲]۔ حدیث میں ہے (۷۰)

اِنَّ مِمَّا يُنْبِتُ الرَّبِيْعُ مَا يَقْتُلُ حَبَطًا اَوْ يُلِمُّ

بعض اوقات موسم ربیع کی گھاس یا پیٹ میں اپھار کی وجہ سے قتل کر دیتی ہے اور یا بیمار کر دیتی ہے۔ ایک شخص حارث کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ وہ نفخ بطن سے مر گیا تھا تو اس کا نام الحارث الحَبِط پڑ گیا اور اس کی اولاد کو حَبِطات کہا جاتا ہے[۳]۔

(ح ب ك)

اَلْحَبِيْكَةُ وَالْحِبَاكُ کے معنی راستہ کے ہیں (ج) اَلْحُبُكُ۔ آیت کریمہ:۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (۵۱-۷) اور آسمان کی قسم جس میں رستے ہیں۔

میں بعض نے الحبك سے ستاروں اور کہکشاں کے محسوس راستے مراد لئے ہیں اور بعض نے عقلی راستے مراد لئے ہیں۔ جن کا تعلق بصیرت سے ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا (الآیۃ) (۳-۱۹۱)

میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔

اصل میں یہ بَعِيْرٌ مَّحْبُوْكُ الْقُوٰى۔ کے محاورہ سے مشتق ہے یعنی وہ اونٹ جس کے جوڑ بند نہایت مضبوط ہوں۔

اَلْاِحْتِبَاكُ (انفعال) کس کر اور مضبوطی سے باندھنا۔

---

[۱] الحدیث باختلاف الفاظہ فی مسلم ۲ ر ۱۴۰) — من حدیث ابی ہریرۃ [۲] ای فی الآیۃ (۱۰۱ = ۸ ر ۹) وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ۔
[۳] راجع للحدیث کنز العمال ۳ رقم ۴ر۱۱۰) ۵۵ بجمیع مخارجہ وفیہ مثل للمفرط من جمع الدنیا ومنعہا من حقہا المیدانی ۳ : فی روایۃ ما یقتل حبطا اوغریب ابی عبید بخاری جہاد ، زکاۃ مسلم زکاۃ النائق ار ۵۶ [۳] وہم خمسۃ عامر ، سعد ، ربیعہ ، انمار ، عمرو (التاج) ۱۲

(ح ب ل)

اَلْحَبْلُ ۔ کے معنی رسی کے ہیں قرآن میں ہے۔ فِیْ جِیْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ (۱۱۱-۵) اس کے گلے میں کھجور کی رسی ہوگی۔

پھر جو مکہ رگ بھی شکل وصورت میں رسی سے ملتی جلتی ہے اس لئے شہ رگ کو حَبْلُ الْوَرِیْدِ (۵۰-۱۶) اور حَبْلُ الْعَاتِقِ کہتے ہیں اور ریت کے لمبے ٹیلے کو حَبْلُ الرَّمْلِ کہا جاتا ہے استعارۃً حَبْلٌ کے معنی ملا دینا بھی آتے ہیں اور ہر وہ چیز جس سے دوسری چیز تک پہنچ جائے حَبْلٌ کہلاتی ہے اس لئے آیت کریمہ:۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا (۳-۱۰۳) اور سب مل کر خدا کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوط پکڑے رہنا۔ میں حَبْلُ اللّٰهِ سے مراد قرآن پاک اور عقل سلیم وغیرہما اشیاء ہیں جن کے ساتھ تمسک کرنے سے انسان اللہ تعالیٰ تک پہنچ جاتا ہے اور عہد وپیمان کو بھی حَبْلٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔

ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ اَیْنَمَا ثُقِفُوْا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ (۳-۱۱۲) یہ جہاں نظر آئیں گے ذلت کو دیکھو گے کہ ان سے چمٹ رہی ہے بجز اس کے کہ یہ خدا اور (مسلمان) لوگوں کے عہد (معاہدہ) میں آجائیں۔ میں تنبیہ کیا گیا ہے کہ کافر کو اپنی جان ومال کی حفاظت کے لئے دو قسم کے عہد وپیمان کی ضرورت ہے ایک عہد الٰہی اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص اہل کتاب سے ہو اور کسی سماوی کتاب پر ایمان رکھتا ہو۔ ورنہ تو اسے اس کے دین پر قائم رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور نہ ہی اسے ذمہ اور امان مل سکتا ہے دوسرا عہدنامہ ہے جو لوگوں کی جانب سے اسے حاصل ہو۔

اَلْحِبَالَةُ خاص کر صیاد کے پھندے کو کہا جاتا ہے اس کی جمع حَبَائِل ہے۔ ایک حدیث میں ہے[1] (۷۱) اَلنِّسَاءُ حَبَائِلُ الشَّیْطَانِ کہ عورتیں شیطان کے جال ہیں۔

اَلْمُحْتَبِلُ وَالْحَابِلُ پھندا لگانے والا۔ ضرب المثل ہے[2]۔ وَقَعَ حَابِلُهُمْ عَلٰی نَابِلِهِمْ یعنی انہوں نے آپس میں شر وفساد پیدا کر دیا یا ان کا اول آخر پر گھوم آیا۔

اَلْحُبْكَةُ

(ح ت م)

اَلْحَتْمُ کے معنی قضاء مقدر کے ہیں[3]۔

اَلْحَاتِمُ کالا کوا جو اہل عرب کے خیال کے مطابق کائیں کائیں کر کے جدائی ڈال دیتا ہے۔

حَتّٰی (حرف)

کبھی تو الی کی طرح یہ حرف جر کے طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن اس کے مابعد غایت ماقبل کے حکم میں داخل ہوتا ہے اور کبھی عاطفہ ہوتا ہے اور کبھی استیناف کا فائدہ دیتا ہے۔ جیسے اَكَلْتُ السَّمَكَةَ حَتّٰی رَأْسَهَا (عاطفہ) رَأْسِهَا (جارہ) رَأْسُهَا (مستانفہ) قرآن میں ہے:۔ لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰی حِیْنٍ (۱۲-۳۵) کچھ عرصہ کے لئے

---

[1] قالہ ابن مسعود راجع المیدانی ۲/۲۴۰ وفی الاحیاء ۳/۹۶ مرفوعًا وتمامہ: ولولا ہذہ الشہوۃ لما کان للنساء سلطنۃ علی الرجال قال العراقی فی تخریجہ الاصفہانی فی الترغیب والترہیب من حدیث خالد بن زید الجہنی باسناد فیہ جہالۃ [2] راجع للمثل اللسان والصحاح (حبل) [3] وفی التنزیل: وکان علی ربک حتمًا مقضیا (۱۹-۷۱)

نہیں قید ہی کردیں۔

حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ (۹۷-۵) طلوع صبح تک۔۔۔۔

جب یہ فعل مضارع پر داخل ہو تو اس پر رفع اور نصب دونوں جائز ہوتے ہیں اور ان میں ہر ایک کی دو وجہ ہو سکتی ہیں نصب کی صورت میں حَتّٰی بمعنی (۱) اِلٰی اَنْ یا (۲) کَیْ ہوتا ہے اور مضارع کے مرفوع ہونے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ حتّٰی سے پہلے فعل ماضی آجائے جیسے:۔

مَشَیْتُ حَتّٰی اَدْخُلَ الْبَصَرَۃَ (یعنی میں چلا حتی کہ بصرہ میں داخل ہوا) دوسری صورت یہ ہے کہ حتّٰی کا مابعد حال واقع ہو جیسے مَرِضَ حَتّٰی لَا یَرْجُوْنَہٗ (وہ بیمار ہوا اس حال میں کہ سب اس سے ناامید ہو گئے) اور آیت کریمہ:۔

حَتّٰی یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ (۲-۲۱۴) یہاں تک کہ پیغمبر۔۔۔۔ پکار اٹھے۔ میں یَقُوْلَ پر رفع اور نصب دونوں منقول ہیں اور ان ہر دو قراءت میں دونوں معنی بیان کئے گئے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ حتّٰی کا مابعد اس کے ماقبل کے خلاف ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا (۴-۴۳) اور جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے پاس نہ جاؤ) جب تک کہ غسل (نہ) کر لو۔ ہاں اگر حالت سفر رستے چلے جا رہے ہو (اور غسل نہ کر سکو تو تیمم سے نماز پڑھ لو۔

مگر کبھی اس طرح نہیں بھی ہوتا جیسے مروی ہے[1] (۴۱):

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی لَا یَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوْا۔ پس اس حدیث کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تمہارے تھک جانے کے بعد ذات باری تعالیٰ بھی تھک جاتی ہے۔ بلکہ معنی یہ ہیں کہ ذات باری تعالیٰ کو کبھی ملال لاحق نہیں ہوتا۔

(ح ج ج)

اَلْحَجُّ (ن) کے اصل معنی کسی کی زیارت کا قصد اور ارادہ کرنے کے ہیں شاعر نے کہا[2] (طویل) (۹۹)

یَحُجُّوْنَ سِبَّ الزِّبْرِقَانِ الْمُعَصْفَرَا

وہ زبرقان کے زرد رنگ کے عمامہ کی زیارت کرتے ہیں۔

اور اصطلاح شریعت میں اقامت نسک کے ارادہ سے بیت اللہ کا قصد کرنے کا نام حج ہے اَلْحَجُّ (بفتح الحا) مصدر ہے اور اَلْحِجُّ (بکسر الحا) اسم ہے اور آیت کریمہ:۔

یَوْمَ الْحَجِّ الْاَکْبَرِ (۹-۳) میں حج اکبر سے مراد یوم نحر یا یوم عرفہ ہے۔ ایک روایت میں ہے[3] (۴۲):

اَلْعُمْرَۃُ الْحَجُّ الْاَصْغَرُ عمرہ حج اصغر ہے۔

اَلْحُجَّۃُ اس دلیل کو کہتے ہیں جو صحیح مقصد کی وضاحت کرے اور نقیضین میں سے ایک کی صحت کی مقتضی ہو۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] قطعۃ من حدیث طویل لعائشۃ متفق علیہ وفی المؤطا بلاغا راجع لشرحہ الزرقانی ۱/۳۴۲ ح ۴۴۲ [2] قالہ المخبل السعدی کما فی السان الکبیر للقتبی (۱: ۸۷۴) واصلاح لیعقوب ۳۷۴ وصدرہ واشہد من عوف حلالا کثیرۃ وفی اللسان (سب) والطبری (۲: ۴۱۹) المزعفر بدل المعصفر قال فی ذیلہ ہکذا ورد البیت فی الاصول المطبوعۃ والمخطوطۃ لکن استدرک مصحح اللسان علی قول "بیت" وقال الصواب "سب" بسین مہملۃ مکسورۃ وباء موحدۃ ومعناہ العمامۃ وہو المناسب لقولہ المزعفر او المعصفر وقال قطرب معناہ الاست لانہ کان مقروفا بالابنۃ راجع الجمہرۃ (۱: ۳۱) والخزانۃ (۳: ۲۸۴) وفیہ خلاف انظر السہیلی (۲: ۲۳۵) وتہذیب الالفاظ ۳۰۴ والبیت فی الغریب للقتبی ۲۴ والساجی ۱۸ لغیر عزو والبیان (۳: ۵۱) والسمط (۹) والصحاح والاساس والمحکم (حج) والتاج واللسان (سب)
[3] رواہ الشافعی فی الام (راجع الشوکانی ۱/)

قُلْ فَلِلّٰہِ الْحُجَّۃُ الْبَالِغَۃُ (۶ - ۱۴۹) کہہ دو کہ خدا ہی کی حجت غالب ہے۔

لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَیْکُمْ حُجَّۃٌ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْھُمْ (۲-۱۵۰) (یہ تاکید) اس لئے (کی گئی ہے) کہ لوگ تم کو کسی طرح کا الزام نہ لگا سکیں۔ مگر ان میں سے جو ظالم ہیں (وہ الزام دیں تو دیں)۔

اس آیت میں ظالموں کے احتجاج کو حجۃ سے مستثنیٰ کیا ہے گو اصولاً وہ حجت میں داخل نہیں ہے، پس یہ استشہاد ایسا ہی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۱۰۰) وَلَا عَیْبَ فِیْھِمْ غَیْرَ اَنَّ سُیُوْفَھُمْ
بِھِنَّ فُلُوْلٌ مِّنْ قِرَاعِ الْکَتَائِبِ

ان میں صرف یہ عیب پایا جاتا ہے کہ لشکروں کے ساتھ لڑنے سے ان کی تلواروں پر دندانے پڑے ہوئے ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے اس احتجاج کو حجت قرار دینا ایسا ہی ہو۔ جیسا کہ آیت:۔

وَالَّذِیْنَ یُحَاجُّوْنَ فِی اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَہٗ حُجَّتُھُمْ دَاحِضَۃٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ... (۴۲-۱۶) اور جو لوگ خدا (کے بارے) میں بعد اس کے کہ اسے (مومنوں نے) مان لیا ہو جھگڑتے ہیں ان کے پروردگار کے نزدیک ان کا جھگڑا لغو ہے۔ میں ان کے باطل جھگڑے کو حجت قرار دیا گیا ہے اور آیت کریمہ:۔

لَا حُجَّۃَ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ (۴۲ - ۱۵) اور ہم میں اور تم میں کچھ بحث و تکرار نہیں ہے۔ کے معنی یہ ہیں کہ ظہور بیان کی وجہ سے بحث و تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

اَلْمُحَاجَّۃُ۔ اس جھگڑے کو کہتے ہیں جس میں ہر ایک دوسرے کو اس کی دلیل اور مقصد سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

قرآن میں ہے:۔

وَحَاجَّہٗ قَوْمُہٗ قَالَ اَتُحَاجُّوْنِّیْ فِی اللّٰہِ (۶ - ۸۰) اور ان کی قوم ان سے بحث کرنے لگی تو انہوں نے کہا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں (کیا) بحث کرتے ہو۔

فَمَنْ حَاجَّکَ فِیْہِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَکَ مِنَ الْعِلْمِ (۳-۶۱) پھر اگر یہ عیسیٰ کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں اور تم کو حقیقت الحال تو معلوم ہو ہی چکی ہے۔

لِمَ تُحَاجُّوْنَ فِیْ اِبْرٰھِیْمَ (۳- ۶۵) تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔

ھٰاَنْتُمْ ھٰؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِیْمَا لَکُمْ بِہٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّوْنَ فِیْمَا لَیْسَ لَکُمْ بِہٖ عِلْمٌ (۳- ۶۶) دیکھو ایسی بات میں تو تم نے جھگڑا کیا ہی تھا جس کا تمہیں کچھ علم تھا بھی مگر ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تم کو کچھ بھی علم نہیں۔

وَاِذْ یَتَحَاجُّوْنَ فِی النَّارِ (۴۰- ۴۷) اور جب وہ

---

[1] قالہ النابغۃ فی مدح ملوک غسان وہذا البیت مشہور اوردہ العلماء فی تصانیفہم وقد اوردہ العلماء البدیع شاہداً لتاکید المدح بما یشبہ الذم انظر لکلمۃ الفصل علی البیت الخزانۃ (۳ : ۲۹۹) واللسان (فلل) وشواہد الکشاف ۱۰ والکامل للمبرد (۴۸، ۳۰۰) والعمدۃ (۲: ۱۱۴) وذیلہ (۱: ۲۱۶) ودیوانہ ۶ والصناعتین ۴۰۸ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۸۰) والبحر (۵: ۷۲/۶ : ۳/۲۰۲ : ۵۱۶) والکتاب (۱/ ۳۶۷) ومحاضرات المؤلف (۳: ۱۵۶) والحیوان (۵: ۴۷۲) والعقد الثمین ۳ والصاحبی ۲۶۷ والمعانی الکبیر ۲۰۶ والسیوطی ۲۱ (شواہد مبینہ) ۱۲ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊ ❊

دوزخ میں جھگڑیں گے۔

اور حَجٌّ کے معنی زخم کی گہرائی ناپنا بھی آتے ہیں شاعر نے کہا ہے [1] ع (البسیط)

یَحُجُّ مَأْمُوْمَۃً فِیْ قَعْرِھَا لَجَفٌ

وہ سر کے زخم کو سلائی سے ناپتا ہے جس کا قعر نہایت وسیع ہے۔

(ح ج ب)

اَلْحَجْبُ وَالْحِجَابُ (ن) کسی چیز تک پہنچنے سے روکنا اور درمیان میں حائل ہوجانا اور وہ پردہ جو دل اور پیٹ کے درمیان حائل ہے اسے "حجاب الجوف" کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔ وَبَیْنَھُمَا حِجَابٌ (۷-۴۶) اور ان دونوں (بہشت اور دوزخ) کے درمیان پردہ حائل ہوگا۔ میں حجاب سے وہ پردہ مراد نہیں ہے جو ظاہری نظر کو روک لیتا ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ آڑ ہے جو جنت کی لذتوں کو اہل دوزخ تک پہنچنے سے مانع ہوگی اسی طرح اہل جہنم کی اذیت کو اہل جنت تک پہنچنے سے روک دے گی جیسے فرمایا:۔ فَضُرِبَ بَیْنَھُمْ بِسُوْرٍ بَاطِنُہٗ فِیْہِ الرَّحْمَۃُ وَظَاھِرُہٗ مِنْ قِبَلِہِ الْعَذَابُ (۵۷-۱۳) پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی اس کے باطن میں رحمت ہوگی اور بظاہر اس طرف عذاب ہوگا۔ اور آیت کریمہ:۔

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ (۴۲-۵۱) اور کسی آدمی کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام (کے ذریعے) سے یا پردے کے پیچھے سے۔ میں پردے کے پیچھے سے کلام کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جس سے اللہ تعالیٰ کلام کرتے ہیں وہ ذات الٰہی کو دیکھ نہیں سکتا اور آیت کریمہ:۔

حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ (۳۸-۳۲) کے معنی ہیں حتیٰ کہ سورج غروب ہوگیا۔

اَلْحَاجِبُ دربان کو کہتے ہیں کیونکہ وہ بادشاہ تک پہنچنے سے روک دیتا ہے۔

اور حَاجِبَانِ (تثنیہ) بھویں کو کہتے ہیں کیونکہ وہ آنکھوں کے لئے بمنزلہ سلطانی دربان کے ہوتی ہیں۔

حَاجِبُ الشَّمْسِ سورج کا کنارہ اسلئے کہ وہ بھی بادشاہ کے دربان کی طرح پہلے پہل نمودار ہوتا ہے اور آیت کریمہ:۔

کَلَّآ اِنَّھُمْ عَنْ رَّبِّھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (۸۳-۱۵) کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کے روز تجلی الٰہی کو ان سے روک لیا جائیگا (اس طرح وہ دیدار الٰہی سے محروم رہیں گے) جس کے متعلق آیت کریمہ:۔ فَضُرِبَ بَیْنَھُمْ بِسُوْرٍ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

(ح ج ر)

اَلْحَجَرُ سخت پتھر کو کہتے ہیں اس کی جمع

---

[1] قالہ غدارۃ بن ورقۃ الطائی وتمامہ: فاست الطبیب قذاہا کالمغاریدہ۔ انظر التاج واللسان والمحکم (حج) والکامل للمبرد (۹۸، ۲۲۴) والمعجم للیاقوت (۱۵: ۳۷-۴۷) حیث الکلام طویل علی البیت والحیوان (۳: ۴۲) والمخصص ۱۳: ۱۸۲ والمعنی بالجزاء الطبیب یجزع من ہولہا فالقذی یتساقط من استۃ کالمغاریدہ وہو جمع مغرود ومعناہ کماۃ صغار وقال القتبی فی المعانی ۹۷۶ یحج ای یصلح ولجف ان یذہب فی احدالنا حیتین فالطبیب مما یری من ہولہا تقذی استۃ کالمغاریدو ہذا آخر ما قیل فی شرح البیت ۱۲

أَحْجَارٌ وَحِجَارَۃٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:۔
وَقُوْدُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ (۲-۲۴) جس کا
ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ میں بعض نے کہا
ہے کہ وہ پتھر گندھک کے ہوں گے۔ اور بعض
نے یہی پتھر مراد لئے ہیں اور اس سے اس آگ
کی ہولناکی پر تنبیہ کی ہے کہ وہ پتھروں اور انسانوں
سے بھڑکائی جائے گی بخلاف دنیا کی آگ کے کہ
یہ جلنے کے بعد پتھروں پر تھوڑا بہت اثر کرتی ہے
لیکن انہیں جلانے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔
بعض نے کہا ہے کہ اس سے ایسے لوگ مراد
ہیں جو حق کے قبول کرنے میں ایسے سنگدل ہیں
جیسے پتھر چنانچہ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا ہے:۔
فَھِیَ کَالْحِجَارَۃِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً (۲-۷۴) گویا
وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت۔
اَلْحَجْرُ وَالتَّحْجِیْرُ کے معنی کسی جگہ پر پتھروں
سے احاطہ کرنا کے ہیں کہا جاتا ہے۔ حَجَرْتُہٗ
حَجْرًا فَھُوَ مَحْجُوْرٌ وَحَجَّرْتُہٗ تَحْجِیْرًا
فَھُوَ مُحَجَّرٌ اور جس جگہ کے ارد گرد پتھروں
سے احاطہ کیا گیا ہو۔ اسے حِجْرٌ کہا جاتا ہے
اس لئے حطیم کعبہ اور دیار ثمود کو حِجْرٌ کہا گیا
ہے[1]۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَقَدْ کَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِیْنَ (۱۵-۸۰)
اور (وادی) حجر کے رہنے والوں نے بھی پیغمبروں
کی تکذیب کی۔ اور حِجْرٌ (پتھروں سے احاطہ کرنا)
سے حفاظت اور روکنے کے معنی لے کر عقل انسانی
کو بھی حِجر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی انسان کو نفسانی
بے اعتدالیوں سے روکتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
ھَلْ فِیْ ذٰلِکَ قَسَمٌ لِّذِیْ حِجْرٍ (۸۹-۵)
(اور) بے شک یہ چیزیں عقلمندوں کے نزدیک
قسم کھانے کے لائق ہیں۔
مبرد (لغوی) نے کہا ہے کہ گھوڑی کو بھی حِجْرٌ
کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پیٹ کے اندر حمل روکے
رکھتی ہے۔ اور حِجْرٌ حرام چیز کو بھی کہتے ہیں
کیونکہ اس کا تناول ممنوع ہوتا ہے قرآن میں ہے:۔
وَقَالُوْا ھٰذِہٖ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ (۶-۱۳۸)
اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ چوپائے اور کھیتی حرام ہیں۔
اور آیت کریمہ:۔ وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا
(۲۵-۲۲) میں حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ایک محاورہ
ہے جاہلیت کا دستور تھا جب کسی کے سامنے کوئی
ایسا شخص آجاتا جس سے اذیت کا خوف ہوتا
تو حِجْرًا مَّحْجُوْرًا کہدیتا (یعنی ہم تمہاری
پناہ چاہتے ہیں) یہ الفاظ سن کر دشمن اسے کچھ نہ
کہتا، تو قرآن نے یہاں بیان کیا کہ کفار بھی (عذاب
کے) فرشتوں کو دیکھ کر (حسب عادت) یہ الفاظ
کہیں گے کہ شاید عذاب سے پناہ مل جائے[2]۔
اور آیت کریمہ:۔
وَجَعَلَ بَیْنَھُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا
(۲۵-۵۳) اور دونوں کے درمیان ایک آڑ
اور مضبوط اوٹ بنادی۔
میں حِجْرًا مَّحْجُوْرًا سے مراد ایسی مضبوط
رکاوٹ ہے جو دور نہ ہوسکے۔
کَانَ فِیْ حِجْرِ فُلَانٍ وہ فلاں کے زیر نگرانی

---

[1] ناحیۃ الشام عند وادی القریٰ وہم قوم صالح النبی صلی اللہ علیہ وسلم واما حَجْرٌ (بفتحہ جیم مصروف) فقصبتہٗ الیمامۃ۔ [2] وبھذا فسر اللیث وابن جریج ورد الازہری وقال ان علماء التفسیر الذی یعتمدون، علی خلاف ذالک وقالوا ان ذالک کلہ من قول الملائکۃ راجع الطبری (۱۹: ۳) والتاج واللسان (حجر)۔

ہے یعنی اس کی طرف سے اس کے مال اور دیگر اختیارات پر پابندی ہے اس کی جمع حُجُورٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ (۴-۲۳)

اور وہ لڑکیاں جنہیں تم پرورش کرتے ہو۔

حَجْرُ الْقَمِيصِ یعنی قمیص کا اگلا حصہ جس میں کوئی چیز رکھ لی جاتی ہے۔ اور حجر سے احاطہ کے معنی لے کر کہا جاتا ہے۔

حُجِرَتْ عَيْنُ الْفَرَسِ یعنی گھوڑے کی آنکھ کے گرداگرد داغ دیا گیا۔ حُجِرَ الْقَمَرُ۔ چاند کے گرد ہالہ ہونا۔

اَلْحَجُورَةُ ایک قسم کا بچوں کا کھیل جو وہ خط مستدیر کھینچ کر کھیلتے ہیں۔ اسی سے مَحْجِرُ الْعَيْنِ کا محاورہ ہے جس کے معنی خانۂ چشم کے ہیں۔

تَحَجَّرَ كَذَا کسی چیز کا پتھر کی طرح سخت ہوجانا

اَلْاَحْجَارُ بنی تمیم کے چند بطون (جو اس نام سے مشہور ہوئے) اَلْاَحْجَارُ کیونکہ ان کے بزرگوں کے نام جندل، جُحَر اور صخر وغیرہ تھے[1]۔

(ح ج ز)

اَلْحَجْزُ (ن ض) کے معنی دو چیزوں کے درمیان روک اور حد فاصل بنانے کے ہیں کہا جاتا ہے حَجَزَ بَيْنَهُمَا ان کے درمیان حد فاصل قائم کردی جیسے فرمایا:۔

وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا (۲۷-۶۱) اور (کس نے) دو دریاؤں کے بیچ اوٹ بنادی۔

اور حِجاز کو بھی حجاز اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ شام اور بادیہ کے درمیان حائل ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

فَمَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ (۶۹-۴۷)

پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہیں ہے۔ میں حَاجِزِينَ، اَحَدٍ کی صفت ہے کیونکہ احد کا لفظ معنی جمع ہے۔ نیز حجاز اس رسی کو کہتے ہیں جو اونٹ کی کلائی میں ڈال کر اسے اس کی کمر کے ساتھ باندھ دیتے ہیں (تاکہ ہل نہ سکے) پھر حجز میں معنی منع کے پیش نظر اِحْتَجَزَ فُلَانٌ عَنْ كَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کے رک جانے کے ہیں اِحْتَجَزَ بِاِزَارِهٖ تہبند باندھنا۔ اسی سے حُجْزَةُ السَّرَاوِيلِ ہے جس کے معنی ازار بند کے نیفہ کے ہیں[2]۔ مشہور محاورہ ہے۔ اِنْ اَرَدْتُمُ الْمُحَاجَزَةَ فَقَبْلَ الْمُنَاجَزَةِ یعنی ایک دوسرے کو روکنے اور صلح کا موقعہ لڑائی سے قبل ہوتا ہے[3]۔

حَجَازَيْكَ یعنی ان کے درمیان حائل ہوجائیے

(ح د د)

اَلْحَدُّ جو دو چیزوں کے درمیان ایسی روک جو ان کو باہم ملنے سے روک دے۔ حَدَدْتُ كَذَا میں نے فلاں چیز کے لئے حد تمیز مقرر کردی۔ حَدُّ الدَّارِ مکان کی حد جس کی وجہ سے وہ دوسرے مکان سے ممیز ہوتا ہے۔ حَدُّ الشَّيْءِ کسی چیز کا وہ وصف جو دوسروں

---

[1] كذا في اللسان والتاج (حجر) قال وإياهم عنى الشاعر بقوله: وكل انثى حملت احجارا [2] ومنه الحديث: وانا آخذ بحجزكم [3] كذا في التاج (حجز) وفي الميداني المثل يروى عن اكثم بن صيفي قال ابو عبيد معناه: انج بنفسك قبل لقاء من لا تقاومه (الميداني رقم ۱۴۹) ۱۲

سے اسے ممتاز کردے اور زنا و شراب کی سزا کو بھی حد اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اس کا دوبارہ ارتکاب کرنے سے انسان کو روکتی ہے۔ اور دوسروں کو بھی اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے سے روک دیتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ (۶۵-۱).....) اور یہ خدا کی حدیں ہیں۔ جو خدا کی حدود سے تجاوز کرے گا۔
تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا (۲-۲۲۹) یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں ان سے تجاوز مت کرو۔ اور آیت کریمہ:۔
اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَنْ لَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ (۹-۹۷) دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور اس قابل ہیں کہ جو احکام (شریعت) خدا نے نازل فرمائے ہیں ان سے واقف (ہی) نہ ہوں۔
میں بعض نے حدود کے معنی احکام کئے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ حقائق و معانی مراد ہیں۔
جملہ حدود الٰہی چار قسم پر ہیں (۱) ایسے حکم جن میں نقص و زیادہ دونوں ناجائز ہوتے ہیں جیسے فرض نمازوں میں تعداد رکعات کو جو شارع علیہ السلام نے مقرر کردی ہیں ان میں کمی بیشی قطعًا جائز نہیں ہے (۲) وہ احکام جن میں اضافہ تو جائز ہو لیکن کمی جائز نہ ہو (۳) وہ احکام جو اس دوسری صورت کے برعکس ہیں یعنی ان میں کمی تو جائز ہے لیکن ان پر اضافہ جائز نہیں ہے۔ (۴)
اور آیت کریمہ:۔
اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۵۸-۲۰) جو لوگ خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں۔

میں يُحَآدُّوْنَ کے معنی اللہ رسول کی مخالفت کے ہیں اور اس مخالفت کو يُحَآدُّوْنَ کہنا یا تو رد کرنے کے اعتبار سے ہے اور یا الحدید کے استعمال یعنی جنگ کی وجہ سے حَدِيْدٌ لوہا۔ قرآن میں ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (۵۷-۲۵) اور لوہا پیدا کیا اس میں (اسلحہ جنگ کے لحاظ سے) خطر بھی شدید ہے۔
حَدَّدْتُ السِّكِّيْنَ میں نے چھری کی دھار تیز کی۔ اور اَحْدَدْتُهٗ اس کے لئے حد مقرر کردی پھر ہر وہ چیز جو بلحاظ خلقت یا بلحاظ معنی کے ایک ہو۔ جیسے نگاہ اور بَصِيْرَة اس کی صفت میں الحدید کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے:۔
هُوَ حَدِيْدُ النَّظَرِ (وہ تیز نظر ہے) هُوَ حَدِيْدُ الْفَهْمِ (وہ تیز فہم ہے) قرآن میں ہے:۔
فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (۵۰-۲۲) تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔ اور جب زبان بلحاظ تیزی کے لوہے کی سی تاثیر رکھتی ہو تو صَارِمٌ وَمَاضٍ کی طرح اس کی صفت حاد بھی آجاتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ (۳۳-۱۹) تو تیز زبانوں کے ساتھ تمہارے بارہ میں تیز زبانی کریں۔ اور روکنے کے معنی کے پیش نظر دربان کو حَدَّادٌ کہا جاتا ہے اور بدنصیب اور محروم آدمی کو رَجُلٌ مَحْدُوْدٌ کہہ دیتے ہیں۔

(ح د ب)

حَدِبَ (س) حَدَبًا۔ اَلرَّجُلُ وَاحْدَبَ واحْدَوْدَبَ کبڑا ہونا۔ ہوسکتا ہے کہ حَدَبُ الظهر کا لفظ اس مادہ میں بنیاد کی حیثیت رکھتا

حوحِس کے معنی کُبڑی پیٹھ کے ہیں۔ پھر تشبیہ کے طور پر الاعزاز ونشیٰ کو حس کے سرینوں کی ہڈیاں نمایاں ہوں، ناقۃ حَدْبَاءُ کہہ دیتے ہیں اور اسی سے (مجازاً) بلند اور سخت زمین کو حَدَبٌ کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ (۲۱-۹۶)
اور وہ (یاجوج ماجوج) بلندی سے دوڑتے ہوں گے۔

(ح د ث)

اَلْحُدُوْثُ (ن) کے معنی ہیں کسی ایسی چیز کا وجود میں آنا جو پہلے نہ ہو عام اس سے کہ وہ جوہر ہو یا عرض اور اِحْدَاث کے معنی ایجاد یعنی وجود میں لانا ہیں جواہر کا اِحْدَاث صرف ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ مُحْدَثٌ (صیغہ صفت مفعول) ہر وہ چیز جو عدم سے وجود میں آئی ہو اور کسی چیز کا اِحْدَاث کبھی تو نفس شے کے اعتبار سے ہوتا ہے اور کبھی اس شخص کے اعتبار سے ہوتا ہے جسے وہ حاصل ہوئی ہو۔ جیسے: اَحْدَثْتُ مِلْكًا میں نے نیا ملک حاصل کیا، چنانچہ آیت کریمہ:۔
مَا يَاْتِيْهِمْ مِنْ ذِكْرٍ مِنْ رَبِّهِمْ مُحْدَثٍ (۲۱-۲) ان کے پاس کوئی نئی نصیحت ان کے پروردگار کی طرف سے نہیں آتی۔ میں اسی دوسرے معنی کے اعتبار ذکر کو محدث کہا گیا ہے، اور ہر وہ قول و فعل جو نیا نیا ظہور پذیر ہوا ہو اسے بھی حدث کہہ دیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
حَتّٰى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا۔ (۱۸-۷۰)
جب تک میں خود ہی پہل کرکے تجھ سے بات نہ کروں۔

لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (۶۵-۱) شاید خدا اس کے بعد کوئی (رجعت کی) سبیل پیدا کردے۔
ہر وہ بات جو انسان تک سماع یا وحی کے ذریعہ پہنچے اسے حدیث کہا جاتا ہے عام اس سے کہ وہ وحی خواب میں ہو یا بحالت بیداری، قرآن میں ہے:
وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا (۶۶-۳) اور (یاد کرو) جب پیغمبر نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی۔
هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ (۸۸-۱) بھلا تم کو ڈھانپ لینے والی (یعنی قیامت کا) حال معلوم ہوا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَعَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ (۱۲-۱۰۱) اور خوابوں کی تعبیر کا علم بخشا۔ میں احادیث سے رؤیا مراد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کو بھی حدیث کہہ کر پکارا ہے، چنانچہ فرمایا:۔
فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖ (۵۲-۳۴) تو ایسا کلام بنا لائیں۔
اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ (۵۳-۵۹) (اے منکرین خدا) کیا تم اس کلام سے تعجب کرتے ہو۔
فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا (۴-۷۸) ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات بھی نہیں سمجھ سکتے؟۔
حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ (۶-۶۸) یہاں تک کہ اور باتوں میں مصروف ہو جائیں۔
فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ (۴۵-۶) تو یہ خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔
وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا۔ اور خدا سے

بڑھ کر بات کا سچا کون ہے۔

اور حدیث میں ہے[1] (۷۴) اِنْ یَّکُنْ فِیْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ مُحَدَّثٌ فَھُوَ عُمَرُ۔ کہ اگر اس امت میں کوئی محدّث ہے تو وہ عمرؓ ہے اور محدّث سے آپ کی مراد وہ شخص ہے جس کے دل پر ملأ اعلیٰ کی طرف سے القاء ہوتا ہو۔ اور آیت کریمہ:۔

فَجَعَلْنٰھُمْ اَحَادِیْثَ (۳۴-۱۹) تو ہم نے (انہیں نابود کرکے) ان کے افسانے بنا دیئے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی داستانیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ جو بطور مثال کے ذکر کی جاتی ہیں

اَلْحَدِیْثُ (ایضًا) تازہ پھل رَجُلٌ حَدُوْثٌ یعنی خوش گفتار آدمی۔ ھُوَ حِدْثُ النِّسَاءِ وہ عورتوں سے باتیں کرنے کا عادی ہے۔ حَادَثْتُہٗ وَتَحَدَّثْتُہٗ وَتَحَادَثُوْا باہم بات چیت کرنا صَارَ اُحْدُوْثَۃً وہ افسانہ بن چکا ہے۔ رَجُلٌ حَدَثٌ وَحَدِیْثُ السِّنِّ نوعمر آدمی۔ حَادِثَۃٌ مصیبت۔ اس کی جمع حَوَادِثُ آتی ہے

(ح د ق)

اَلْحَدِیْقَۃُ (مرغزار) وہ قطعہ زمین جس میں پانی جمع ہو اور ھیئت وصورت اور پانی کے ہونے کی وجہ سے اسے حَدَقَۃُ الْعَیْنِ (آنکھ کی پتلی) کے ساتھ تشبیہ دے کر اس پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس کی جمع حَدَائِقُ آتی ہے قرآن میں ہے حَدَائِقَ ذَاتَ بَھْجَۃٍ (۲۷-۶۰) پر سبز باغ۔ اور حَدَقَۃٌ کی جمع حِدَاقٌ وَاَحْدَاقٌ آتی ہے۔ حَدَّقَ اَنْظَرَہٗ گھور دیکھنا نظر جما کر دیکھنا

حَدَقُوْا بِہٖ وَاَحْدَقُوْا۔ انہوں اس کے گرد احاطہ کرلیا یہ معنی بھی حدقۃ العین کے گھماتے سے لئے گئے ہیں۔

(ح ذ ر)

اَلْحَذَرُ (س) خوف زدہ کرنے والی چیز سے دور رہنا کہا جاتا ہے حَذِرَ حَذَرًا وَحَذِرْتُہٗ میں اس سے دور رہا۔ قرآن میں ہے:۔

یَحْذَرُ الْاٰخِرَۃَ (۳۹-۹) آخرت سے ڈرتا ہو۔

وَاِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ (۲۶-۵۶) اور ہم سب باساز وسامان ہیں۔

ایک قرأت میں حَذِرُوْنَ ہے۔

ھُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْھُمْ (۶۳-۴) یہ تمہارے دشمن ہیں ان سے محتاط رہنا۔

اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِکُمْ وَاَوْلَادِکُمْ عَدُوًّا لَّکُمْ فَاحْذَرُوْھُمْ (۶۴-۱۴) تمہاری عورتوں اور اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن (بھی) ہیں سو ان سے بچتے رہو۔

حَذَّرَ۔ کسی امر سے محتاط رہنے کے لئے کہنا۔ قرآن میں ہے:۔

وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ (۳-۲۸) اور خدا تم کو اپنے (غضب) سے محتاط رہنے کی تلقین کرتا ہے

اَلْحِذْرُ بچاؤ۔ اور آیت کریمہ:۔

خُذُوْا حِذْرَکُمْ (۴-۷۱) (جہاد کے لئے) ہتھیار لے لیا کرو۔ میں حِذْرٌ سے مراد اسلحہ جنگ وغیرہ ہیں جن کے ذریعہ دشمن سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے

حِذَارِ (اسم فعل بمعنی امر) بچو جیسے مَنَاعِ بمعنی اِمْنَعْ

---

[1] اخرجہ البخاری من حدیث ابی ہریرۃ ولفظہ: لقد کان فیما قبلکم من الامم محدثون فان یک فی امتی احد فانہ عمرؓ رواہ مسلم من حدیث عائشۃ لہ الفتح ۶: ۴۰ والصغانی مناقب عمر وھناک الکلام علیہ وتخریج الاحیاء ۳/ ۲۴ وبمعناہ المستدرک للحاکم ۳/ ۸۶ عن عائشۃ والفائق (۱/ ۲۴۳)

(ح ر ر)

اَلْحَرَارَةُ یہ بُرُوْدَۃٌ کی ضد ہے اور حرارت دو قسم پر ہے (۱) وہ حرارت جو گرم اجسام سے نکل کر ہوا میں پھیل جاتی ہے جیسے سورج اور آگ کی گرمی (۲) وہ حرارت جو عوارض طبعیہ سے بدن میں پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے محموم (بخار زدہ) کے بدن کا گرم ہونا کہا جاتا ہے۔

حَرَّ (س) حَرَارَۃً الیومُ اوالرِّیحُ دن یا ہوا گرم ہو گئی۔ ایسے دن کو مَحْرُوْرٌ کہا جاتا ہے اسی طرح حَرَّ الرَّجُلُ کا محاورہ ہے قرآن میں ہے۔ لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَہَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا (۹ - ۸۱) کہ گرمی میں مت نکلنا (ان سے) کہہ دو کہ دوزخ کی آگ اس سے کہیں زیادہ گرم ہے۔

اَلْحَرُوْرُ گرم ہوا۔ لو۔ ارشاد ہے: وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُوْرُ (۳۵ - ۲۱) اور نہ سایہ اور نہ دھوپ کی تپش۔ اِسْتَحَرَّ الْقَیْظُ گرمی سخت ہو گئی۔ اَلْحَرَرُ یبوست جو شدت پیاس کی وجہ سے جگر میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اَلْحَرَّۃُ (اسم مرۃ از حرّ) کہا جاتا ہے[1] (مثل)

حَرَّۃٌ تَحْتَ قَرَّۃٍ یعنی سخت پیاس سردی کے ساتھ (بددعا)۔ اَلْحَرَّۃُ (ایضًا) پتھر جو گرمی کی شدت سے سیاہ ہو جائے۔ اسی سے اِسْتَحَرَّ الْقَتْلُ کا محاورہ مستعار ہے جس کے معنی کشت و خون کا معرکہ گرم ہونے کے ہیں۔

حَرُّ الْعَمَلِ کام کی شدت۔ صعوبت عمل۔ مشہور ہے (مثل)۔ اِنَّمَا یَتَوَلّٰی حَارَّہَا مَنْ تَوَلّٰی قَارَّہَا .... جس نے اس کی ٹھنڈک سے فائدہ اٹھایا ہے۔ وہی اس کی گرمی برداشت کرے۔

اَلْحُرُّ عبدٌ کی ضد کہا جاتا ہے حُرٌّ بَیِّنُ الْحُرُوْرِیَّۃِ اوالْحُرُوْرَۃِ وہ آدمی جس کی شرافت نمایاں ہو۔ حُرِّیَّۃٌ (آزادی)۔ یعنی آزادی دو قسم پر ہے۔

(۱) جو کسی کا غلام نہ ہو۔ جیسے فرمایا:۔ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ (۲ - ۱۷۸) کہ آزاد کے بدلے آزاد (۲) جسے صفات ذمیمہ یعنی حرص لالچ دنیوی مال ومتاع کا غلام نہ بنا دیں۔

ضد عبودیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا (۲۷) تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْہَمِ تَعِسَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ درہم ودینار کا بندہ ہلاک ہو۔ شاعر نے کہا ہے[2] (ع)

(۱۰۲) وَرِقُّ ذَوِی الْاَطْمَاعِ رِقٌّ مُخَلَّدٌ

حریص اور لالچی لوگ ہمیشہ غلام رہتے ہیں۔ مثل مشہور ہے (مثل)

عَبْدُ الشَّہْوَۃِ اَذَلُّ مِنْ عَبْدِ الرِّقِّ کہ شہوت کا بندہ غلام سے زیادہ ذلیل ہوتا ہے۔

اَلتَّحْرِیْرُ کے معنی کسی انسان کو آزاد کرنے کے ہیں چنانچہ حریت کے اول معنی کے پیش نظر فرمایا:۔ فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ تو ایک مسلمان غلام آزاد کرنا چاہئے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے فرمایا: نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا (۳ - ۳۵) جو (بچہ) میرے پیٹ میں ہے میں اس کو تیری نذر کرتی ہوں۔ چنانچہ بعض نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ اپنے اس لڑکے سے کسی قسم کا دنیوی فائدہ حاصل نہیں کریں گی جس کی طرف آیت:۔ بَنِیْنَ وَحَفَدَۃً (۱۶ - ۷۲) اس میں اشارہ پایا جاتا ہے بلکہ یہ خالص عبادت الٰہی کے لئے وقف رہے گا۔ اسی بنا پر شعبیؒ نے مُحَرَّرًا کے معنی مخلصًا کئے ہیں اور مجاہد نے مُحَرَّرًا کے معنی خادم متعبد کئے ہیں۔ امام جعفر نے کہا ہے۔

---

[1] انظرنی (ق رر)، [2] ہو تمحیفی (بعید؟) لم اجدہ فی المراجع ۱۲

کر امور دنیوی سے آزاد ہوگا لیکن مآل کے لحاظ سے سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔
حَرَرْتُ الْقَوْمَ میں نے انہیں قید خانہ سے رہا کر دیا۔
حُرُّ الْوَجْهِ وہ شخص جو احتیاج کے پنجہ میں گرفتار نہ ہوا ہو۔
حُرُّ الدَّارِ گھر کا درمیان
اَحْرَارُ الْبَقْلِ وہ ترکاریاں جو کچی کھائی جاتی ہیں۔
اور شاعر کا قول ؎ (الکامل)
(۱۰۳) جَادَتْ عَلَيْهِ كُلُّ بِكْرٍ حُرَّةٍ
موسم بہار کی پہلی موسلا دھار بارشیں اس پر سخاوت کی ہے۔
بَاتَتِ الْمَرْأَةُ بِلَيْلَةٍ حُرَّةٍ (شب زفاف کہ شوہر دراں بکارت مخواں زائل کرد) یہ سب استعارات ہیں۔
اَلْحَرِيْرُ (ریشمی کپڑا) ہر ایک باریک کپڑے کو حریر کہا جاتا ہے فرمایا:۔
وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ (۲۲ - ۲۳) وہاں ان کا لباس ریشمی ہوگا۔

(ح ر ب)

اَلْحَرْبُ جنگ کارزار۔ اور قتیہ راء کے ساتھ لڑائی میں کسی کا مال چھیننے کے ہیں پھر ہر قسم کے سلب کو حَرَبٌ کہا جاتا ہے اور حَرَبٌ معنوی لحاظ سے حَرْب سے مشتق ہے کہا جاتا ہے۔
حُرِبَ الرَّجُلُ اس کا سامان چھین لیا گیا فَهُوَ حَرِيْبٌ یعنی لٹا ہوا۔ اَلتَّحْرِيْبُ لڑائی کا بھڑکانا۔ رَجُلٌ مِحْرَبٌ جنگجو گویا وہ لڑائی بھڑکانے کا آلہ ہے۔
اَلْحَرْبَةُ برچھا۔
اصل میں یہ حَرْبٌ یا حِرَابٌ سے فَعْلَةٌ کے وزن پر ہے اور مسجد کے محراب کو محراب یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ شیطان اور خواہشات نفسانی سے جنگ کرنے کی جگہ ہے اور یا اس لئے کہ اس جگہ میں کھڑے ہو کر عبادت کرنیوالے پر حق یہ ہے کہ دنیوی کاروبار اور پریشان خیالی سے یک سو ہو جائے۔
بعض کہتے ہیں کہ اصل میں محراب البیت صدر مجلس کو کہتے ہیں اسی بنا پر جب مسجد میں امام کی جگہ بنائی گئی تو اسے بھی محراب کہہ دیا گیا۔
اور بعض نے اس کے برعکس محراب المسجد کو اصل اور محراب البیت کو اس کی فرع مانا ہے اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ (۳۴-۱۳) وہ جو چاہتے یہ ان کے لئے بناتے یعنی محراب اور مجسمے۔
اَلْحِرْبَاءُ گرگٹ کیونکہ وہ سورج کے سامنے اس طرح بیٹھ جاتی ہے گویا اس سے جنگ کرنا چاہتی ہے نیز زرہ کے حلقہ یا میخ کو بھی صوری مشابہت کی بنا پر حِرْبَاءٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ ضَبٌّ اور كَلْبٌ کے ساتھ مشابہت کی

ا ۔ قالہ عنترۃ وتمامہ: فتترکن کل قرارۃ کالدرہم۔ وفی روایۃ الامالی (۲: ۷۹) عینٌ قرۃ بدل بکر حرۃ وحدیقۃ بدل قرارۃ وکذا فی معلقۃ والعشر للتبریزی ۸ ۲۶ ۲) وفی شرح التبریزی۔ ۸ اکما ہہنا والسمط ۵ ۴ ۹ والصحاح والسان (حر) والمحکم (حدق) والکامل ۲ والصناعتین ۲۸۲ والمختار الشعر الجاہلی (۱: ۲ ۸ ۲) ونقدہ ۲ والبحر (۵: ۴۲ ۵) (۱: ۱۴۰) (۷: ۲ ۱۷) والحیوان (۲: ۳۱۲) والعقد الثمین ۵۴ وطراز المجالس ۶ ۱ وفی البیت بحث یتعلق بلفظ کل والبیت فی دیوانہ ۵ ۴ وابن ہشام (۱: ۲۱۷) بحث کل و المعجزۃ ۳ ۱ وابن الانباری ۲ ۱ ۳ وشرح ذا الشواہد المغنی للقرشی ۵ والمعدا فی ۵

وجہ سے اس کے بعض حصوں کو ضَبَّۃٌ اور کَلْبٌ کہہ دیتے ہیں۔

(ح ر ث)

اَلْحَرْثُ (ن) کے معنی زمین میں بیج ڈالنے اور اسے زراعت کے لئے تیار کرنے کے ہیں اور کھیتی کو بھی حَرْث کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ اَنِ اغْدُوْا عَلٰی حَرْثِکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صَارِمِیْنَ۔ (۶۸-۲۲) کہ اگر تم کو کاٹنا ہے تو اپنی کھیتی پر سویرے ہی جا پہنچو۔ اور کھیتی سے زمین کی آبادی ہوتی ہے اس لئے حرث بمعنی آبادی آجاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ مَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَۃِ نَزِدْ لَہٗ فِیْ حَرْثِہٖ وَمَنْ کَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا نُؤْتِہٖ مِنْھَا وَمَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ نَّصِیْبٍ (۴۲-۲۰) جو شخص آخرت کی کھیتی کا طلبگار ہے اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

اور ہم اپنی کتاب مکارم الشریعہ میں دنیا کے کھیتی اور لوگوں کے کسان ہونے اور اس میں بیج بونے کی کیفیت تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔

ایک روایت میں ہے[1] (۲۷) اَصْدَقُ الْاَسْمَآءِ الْحَارِثُ کہ سب سے سچا نام حارث ہے کیونکہ اس میں کسب کے معنی پائے جاتے ہیں ایک دوسری روایت میں ہے[2] (۲۵) اُحْرُثْ فِیْ دُنْیَاکَ لِاٰخِرَتِکَ کہ اس دنیا میں آخرت کے لئے کاشت کر لو۔

حَرْثُ الْاَرْضِ زمین کاشت کرنا اسے تہییج بھڑکانا کے معنی کے پیش نظر حَرَثْتُ النَّارَ کہا جاتا ہے یعنی میں نے آگ بھڑکائی اور جس لکڑی سے آگ کریدی جاتی ہے اسے مِحْرَث کہا جاتا ہے۔ کسی کا قول ہے[3]۔ اُحْرُثِ الْقُرْاٰنَ یعنی قرآن کی خوب تحقیق سے کام لو۔ حَرَثَ نَاقَتَہٗ اونٹنی کو کام اور محنت سے دبلا کر دیا۔

حضرت معاویہ نے انصار سے دریافت کیا کہ تمہارے پانی کھینچنے والے اونٹ کیا ہوئے تو انہوں نے جواب دیا[4]:۔ حَرَثْنَاھَا یَوْمَ بَدْرٍ کہ ہم نے بدر کے دن انہیں دبلا کر دیا۔ اور آیت کریمہ:۔ نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ۔ (۲-۲۲۳) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ۔ میں استعارۃً عورتوں کو حرث کہا ہے کہ جس طرح زمین کی کاشت پر افراد انسانی کی بقا کا مدار ہے اس طرح نوع انسان اور اس کی نسل کا بقا عورت پر ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ یُھْلِکَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ (۲-۲۰۵) اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کر دے۔ دونوں قسم کی کھیتی کو شامل ہے۔

(ح ر ج)

اَلْحَرَجُ وَالْحَرَاجُ (اسم) کے اصل معنی اشیاء کے مجتمع یعنی جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور جمع ہونے میں چونکہ تنگی کا تصور موجود ہے اسلئے تنگی اور گناہ کو بھی حَرَج کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے

---

[1] النہایہ (حرث) [2] الحدیث ورد بالفاظ مختلفہ راجع النہایہ ۱ر۳۵۱ [3] عن حدیث عبداللہ بن مسعود دالنہایہ ۱ر۳۵۹ [4] راجع النہایہ

ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا (۴-۶۵) اور ... اپنے دل میں تنگ نہ ہوں۔

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (۲۲-۷۸) اور تم پر دین (کی کسی بات) میں تنگی نہیں کی۔

حَرِجَ (س) حَرَجًا۔ صَدْرُہٗ: سینہ تنگ ہو جانا۔ قرآن میں ہے:۔

یَجْعَلْ صَدْرَہٗ ضَیِّقًا حَرَجًا (۶-۱۲۵) اس کا سینہ تنگ اور گھٹا ہوا کر دیتا ہے۔

ایک قرأت میں حَرِجًا ہے[1] یعنی کفر کی وجہ سے اس کا سینہ گھٹا رہتا ہے اس لئے کہ عقیدہ کفر کی بنیاد ظن پر ہوتی ہے جس کی وجہ سے انسان کو کبھی سکون نفس حاصل نہیں ہوتا اور بعض کہتے ہیں کہ اسلام کی وجہ سے اس کا سینہ تنگ ہو جاتا ہے جیسا کہ آیت خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (۲-۷) سے مفہوم ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

فَلَا یَکُنْ فِیْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ (۷-۲) اس سے تم کو تنگ دل نہیں ہونا چاہیئے۔

میں لَا یَکُنْ فعل نہی کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے اور ...... جملہ دعائیہ بھی۔ بعض نے اسے جملہ خبریہ کے معنی میں لیا ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ:۔ اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (۹۴-۱) سے مفہوم ہوتا ہے۔

اَلْمُتَحَرِّجُ (صفت فاعلی) گناہ اور تنگی سے دور رہنے والا جیسے مُتَحَوِّبٌ۔ حُوْبٌ (یعنی گناہ) سے بچنے والا۔

(ح ر د)

اَلْحَرْدُ (ض) تیزی اور غصہ کے ساتھ کسی چیز کو روکنا۔ قرآن میں ہے۔ وَغَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قَادِرِیْنَ (۶۸-۲۵) اور کوشش کے ساتھ سویرے ہی جا پہنچے (گویا کھیتی پر) قادر ہیں۔

یعنی وہ اس بات پر قدرت رکھتے تھے کہ مسکینوں کو اپنے باغ میں آنے سے روک دیں۔

نَزَلَ فُلَانٌ حَرِیْدًا یعنی فلاں قوم سے الگ تھلگ اترا۔ هُوَ حَرِیْدُ الْمَحَلِّ یعنی الگ تھلگ رہنے والا ہے۔ حَارَدَتِ السَّنَةُ یعنی امسال بارش نہیں ہوئی۔

حَارَدَتِ النَّاقَةُ اونٹنی نے دودھ روک لیا۔ (یعنی اس کا دودھ کم یا خشک ہو گیا) حَرِدَ (س) غضبناک ہونا۔ حَرَّدَہٗ کَذَا فلاں چیز نے اسے غضبناک کر دیا۔ بَعِیْرٌ اَحْرَدُ اونٹ جس کی اگلی ٹانگ کا پٹھا ڈھیلا ہو۔ اَلْحُرْدِیَّةُ سرکنڈے کا باڑہ۔

(ح ر س)

اَلْحَرَسُ وَالْحُرَّاسُ (جمع) پاسبان۔ اس کا واحد حَارِسٌ ہے[2]۔ قرآن میں ہے:۔

فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا (۷۲-۸) تو اس کو مضبوط چوکیداروں ...... سے بھرا ہوا پایا۔

اَلْحَرْسُ (ض) اور اَلْحَرْزُ کے جس طرح الفاظ ملتے جلتے ہیں ایسے ہی ان کے معنی بھی قریب قریب ایک ہی ہیں ان میں فرق صرف اتنا ہے کہ حِرْزٌ

---

[1] قراءۃ ابن عباس وعمرؓ [2] قال فی التاج: والحرس ولا تقل حارس لانہ قد صار اسم جنس الا ان یذہب بہ الی معنی الحراستہ ۱۲

کا استعمال زیادہ تر نقدی اور سامان کی حفاظت کے لئے آتا ہے شاعر نے کہا ہے[1] (الکامل)

(۱۰۴) فَبَقِيتُ حَرَسًا قَبْلَ مُجْرَى دَاحِسٍ
لَوْكَانَ لِلنَّفْسِ اللَّجُوجِ خُلُوْدُ

میں داحس کی دوڑ سے پہلے اس کی حفاظت کرتا رہا کاش سرکش نفس کے لئے ہمیشہ رہنا ہوتا

بعض نے کہا ہے کہ شعر میں حَرَسًا کے معنی دَهْرًا کے ہیں ہم کہتے ہیں کہ اگر صرف اس شعر کی بنا پر حرس کے معنی زمانہ کے گئے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ شعر مذکور میں ہوسکتا ہے کہ حرس مصدر بمعنی فاعل موضع حال میں ہو ای بقیت حارسًا اب رہا اس کا زمانہ یا مدت کے معنی پر دلالت کرنا تو یہ لفظ حرس کے اصل معنی نہیں ہیں بلکہ مقتضائے کلام سے مفہوم ہوتے ہیں۔

اَحْرَسَ صاحب حراست ہونا اس میں صاحب ماخذ ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں جیسا کہ باب افعال کا خاصہ ہے۔

حَرِيسَةُ الْجَبَلِ وہ مال جو رات کے وقت پہاڑ میں حفاظت کے لئے رکھا جاتا ہے[2]۔ ابوعبیدہ کا قول ہے کہ الحریسۃ بمعنی مَحْرُوْسَۃ ہے نیز اَلْحَرِيسَة بمعنی مسروقۃ بھی آجاتا ہے یعنی چوری کیا ہوا مال اور اس معنی میں باب حَرَسَ (ض) يَحْرِسُ حَرْسًا آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اَلْحَرِيسَة سے بنا ہے کیونکہ اہل عرب سے الحریسۃ کے بمعنی سَرِقَہ یعنی چوری بھی منقول ہے۔

(ح ر ص)

اَلْحِرْصُ شدت آز یا فرط ارادہ۔ قرآن میں ہے:۔

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ (۱۶-۳۷) یعنی ان کی ہدایت کے لئے تمہارے دل میں شدید آرزو اور خواہش ہو۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ (۲-۹۶) بلکہ ان کو تم اور لوگوں سے زندگی پر کہیں زیادہ حریص دیکھو گے۔

وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ (۱۲-۱۰۳) اور بہت سے آدمی گو تم کتنی ہی خواہش کرو ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

اصل میں یہ حَرَصَ الْقَصَّارُ الثَّوْبَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں دھوبی نے کپڑے کو پتھر پر مار مار کر اسے پھاڑ دیا۔ اَلْحَارِصَةُ وہ زخم جو جلد کو پھاڑ ڈالے۔ اَلْحَارِصَةُ وَالْحَرِيصَةُ اس بادل کو کہتے ہیں جو اپنی بارش سے زمین کی بالائی سطح کو کھرچ ڈالے۔

(ح ر ض)

اَلْحَرَضُ اس چیز کو کہتے ہیں جو نکمی ہو جائے اور در خور اعتناء نہ رہے اس لئے جو چیز قریب بہ ہلاکت ہو جائے اس کے متعلق حَرِضَ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا (۱۲-۸۵) یا تو قریب بہ ہلاکت

---

[1] قالہ لبید کما فی اللسان والتاج (حرس) والعمرین ۲۳ وفی روایۃ وغنیت سبتًا بدل بقیت حرسًا وفی مجاز القرآن ار ۲۸۹ رقم ۳۲۲ والمحکم والمزروقی ۱۷۸ وعمرت حرسا والبیت فی ولیا نزد ۱: ۲۵) واصلاح یعقوب۔ وتہذیب الاصلاح (۱: ۱۶) مع آخرقبلہ والبحر (۱: ۴۰۲) [2] ومنہ فی الحدیث فی حریسۃ الجبل (التاج) لانہ لیس فی حرز:

ہو جاؤ گے۔ اور اَحْرَضَہٗ کے معنی گھلا دینے اور قریب بہ ہلاکت کر دینے کے ہیں۔
شاعر نے کہا ہے [1]

(۱۰۵) اِنِّیْ امْرُؤٌ نَابَنِیْ ھَمٌّ فَاَحْرَضَنِیْ
میں وہ آدمی ہوں جسے تمہارے غم نے گھلا دیا ہے
اَلْحُرْضَۃُ گھٹیا قسم کا آدمی جو خود ایک دام بھی خرچ نہ کرے بلکہ جیئے بازی کا گوشت مفت کھانے کا عادی ہو۔
اَلتَّحْرِیْضُ کے معنی ازالہ حرض کے ہیں یعنی کسی چیز سے بگاڑ اور خرابی کو دور کر دینا جیسے کہ مَرَّضْتُہٗ اور قَذَّیْتُہٗ کے معنی مرض اور تنکے کو دور کرنے کے ہوتے ہیں۔
تَحْرِیْضٌ کے معنی کسی کو مزین کر کے اور بہت آسان صورت میں پیش کر کے اس پر برانگیختہ کرنے کے ہیں [2]
اَحْرَضْتُہٗ (افعال) کسی چیز میں خرابی پیدا کر دینا جیسے :۔ اَقْذَیْتُہٗ (کسی چیز کو قذا آلود کرتا ہوتے ہیں۔

(ح ر ف)

حَرْفُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز کے کنارہ کے ہیں حَرْفٌ کی جمع اَحْرُفٌ وَحُرُوْفٌ آتی ہے اور پہاڑ، کشتی اور تلوار کے کنارہ کو حرف کہا جاتا ہے اور حُرُوْفُ الْھِجَا کے معنی اطراف کلمہ کے ہیں اور اصطلاح نحاۃ میں اَلْحُرُوْفُ الْعَوَامِلُ ان حروف کو کہا جاتا ہے جو کلموں کے اطراف میں واقع ہوتے ہیں اور ان کو باہم مرتبط کرتے ہیں اور حَرْفُ الْجَبَلِ یعنی پہاڑ کے کنارے اور با۔یکی میں حرف کے ساتھ تشبیہ دے کر لاغر اونٹنی کو حرف کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ :۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰہَ عَلٰی حَرْفٍ (۲۲-۱۱) اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں۔ جو کنارے پر (کھڑا) ہو کر) خدا کی عبادت کرتے ہیں ـــــ میں عَلٰی حَرْفٍ کے معنی خود قرآن نے ہی بعد میں فَاِنْ اَصَابَہٗ خَیْرُ ۨ الآیۃ سے بیان کر دیئے ہیں یعنی جب تک اطاعت و عبادت میں کچھ دنیاوی فائدہ نظر آتا ہے کرتا رہتا ہے اور جب کوئی تکلیف نظر آتی ہے تو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ اور یہی معنی آیت :۔
مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ (۴-۱۴۳) کے ہیں۔
اِنْحَرَفَ عَنْ كَذَا اور تَحَرَّفَ کسی چیز سے کنارہ کرنا ایک جانب مائل ہونا۔ اَلْاِحْتِرَافُ کوئی پیشہ اختیار کرنا
اَلْحِرْفَۃُ (فعلۃ) پیشہ، پیشے کی حالت جیسے قِعْدَۃٌ وَجِلْسَۃٌ۔
اَلْمُحَارَفُ۔ وہ شخص جو خیر سے محروم اور اس کے کنارہ پر ہو (کم نصیب)
اَلتَّحْرِیْفُ (الشیء) کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک جانب مائل کر دینا جیسے تَحْرِیْفُ الْقَلَمِ قلم کو ٹیڑھا قط لگانا۔
اور تَحْرِیْفُ الْكَلَامِ کے معنی ہیں کلام کو اس

---

[1] قالہ العرجی عبداللہ بن عمر بن عبداللہ تمامہ حتی بلیت وحتی شفنی السقم۔ والبیت فی اللسان ۸ والصحاح والتاج (حرض) ومجاز القرآن ۱: ۲۱۷ رقم ۳۶۶ والطبری (۱۲۳: ۴۲) وفی روایۃ لج لی حب بدل نابنی ہم والقرطبی (۹: ۲۵۰) والشطر فی فتح الباری (۸: ۲۷۳) ولجمع الترجمۃ الشاعر الاغانی (۱: ۳۸۳) والاشتقاق ۸۴ والسمط ۲۲۴ والبحر (۵: ۳۳۷) [2] وفی التنزیل حرض المؤمنین علی القتال (۸-۶۵)

کے موقع و محل سے پھیر دینا کہ اس میں دو احتمال پیدا ہو جائیں۔ قرآن میں ہے:۔

یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ (۵-۱۳) یہ لوگ کلمات (کتاب) کو اپنے مقامات سے بدل دیتے ہیں۔ اور دوسرے مقام پر مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ (۵-۴۱) ہے یعنی ان کے محل اور صحیح مقام پر ہونے کے بعد۔

وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ (۲-۷۵) (حالانکہ) ان میں سے کچھ لوگ کلام خدا (یعنی تورات) کو سنتے پھر اس کے سمجھ لینے کے بعد اس کو (جان بوجھ کر) بدل دیتے ہیں۔

اَلْحِرِّیْفُ۔ وہ چیز جس میں تلخی اور حرارت ہو گویا وہ حلاوت اور حرارت سے پھیر دی گئی ہے۔

طَعَامٌ حِرِّیْفٌ چرچراہٹ والا کھانا۔ ایک روایت میں ہے[1] (۷۶)

نَزَلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ کہ قرآن سات حروف پر نازل ہوا ہے۔

اس کی تحقیق ہمارے رسالہ المنبهة علی فوائد القرآن میں ملے گی[2]۔

(ح ر ق)

اَحْرَقَ کَذَا۔ (کسی چیز کو جلانا) اِحْتَرَقَ (جلنا) اَلْحَرِیْقُ (آگ) قرآن میں ہے:۔

ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ (۳-۱۸۱) کہ عذاب (آتش) سوزاں کے مزے چکھتے رہو۔

فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ (۲-۲۶۶) تو (ناگہاں) اس باغ پر آگ کا بھرا ہوا بگولا چلے اور وہ جل (کر راکھ کا ڈھیر ہو) جائے۔

قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْاۤ اٰلِهَتَكُمْ (۲۱-۶۸) (تب) وہ کہنے لگے ..... تو اس کو جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔

لَنُحَرِّقَنَّهٗ (۲۰-۹۷) ہم اسے جلا دیں گے۔ ایک قرأت میں لَنَحْرُقَنَّهٗ ہے۔ پس حَرْقُ الشَّیْءِ کے معنی کسی چیز میں بغیر اشتعال کے جلن پیدا کرنے کے ہیں جیسے دھوبی کے پٹخنے سے کپڑے کا پھٹ جانا۔

حَرَقَ (ن) الشَّیْءَ ریتی سے رگڑنا اسی سے حَرَقَ النَّابَ کا محاورہ ہے جس کے معنی دانت پیسنے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔ یَحْرُقُ عَلَیَّ الْاُرَّمَ یعنی وہ مجھ پر دانت پیستا ہے۔

حَرِقَ الشَّعْرُ۔ بالوں کا منتشر ہونا۔

مَاءٌ حُرَاقٌ بہت کھاری پانی جو کھاری پن سے جلا ڈالے۔ اَلْاِحْرَاقُ کسی چیز کو جلانا اسی سے استعارۃً جب کہ بہت زیادہ ملامت کرکے اذیت پہنچائے تو کہا جاتا ہے۔

اَحْرَقَنِیْ بِلَوْمِهٖ یعنی اس نے مجھے ملامت سے جلا ڈالا۔

---

[1] کذا فی غریب ابی عبید ۳/۱۵۹-۱۶۲ وتمامه کلها شاف کاف۔ وبعضهم یرویه فاقرؤا کما علمتم راجع الفائق ۱/۲۴۱ والصحیح انزل بدل نزل والحدیث باختلاف الفاظه فی (حم ت) عن عباس والسجزی فی الابانة عن زید بن ثابت (وهب) عن عمرو بن العاص (د ن) عن ابی بن کعب (حم طب) عن عبادة بن الصامت (حم م ک) عن ابی بکرة وعمر (حم) عن ابی جهیم (حم ف) عن ابی (حم) عن حذیفة وطب عن معاذ وعن ابن مسعود وابی الضریس عن ابن عباس وابن جریر عن ابن مسعود وابن عمر (حم) وابن جریر (طب) و ابو نصر السجزی فی الابانة راجع کنز العمال ۲۲۰:۲-۱۸۶-۲۲۵ وفی بعضها ثلاثة احرف وفی بعضها اربعة احرف لکن حدیث سبعة اکثر واصح فلها الاعتبار۔

[2] وهی تلاوة تکمل۔

(ح ر ک)

اَلْحَرَکَۃُ یہ سکون کی ضد ہے اور جسم کے ساتھ مخصوص ہے یعنی جسم کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کو حرکت کہا جاتا ہے اور کبھی کسی چیز میں تغیر ہونے یا اس کے اجزاء میں کمی بیشی واقع ہونے پر بھی تحرک کذا کہہ لیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ (۷۵-۱۶) اور (اے محمد) وحی کے پڑھنے کے لئے اپنی زبان نہ چلایا کرو۔

(ح ر م)

اَلْحَرَامُ وہ ہے جس سے روک دیا گیا ہو خواہ یہ ممانعت تسخیری یا جبری، یا عقل کی رو سے ہو اور یا پھر شرع کی جانب سے ہو اور یا اس شخص کی جانب سے ہو جو حکم شرع کو بجا لاتا ہے پس آیت کریمہ:۔

وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ (۲۸-۱۲) اور ہم نے پہلے ہی سے اس پر (دودھ پلانے والیوں کے) دودھ حرام کر دیئے تھے۔ میں حرمت تسخیری مراد ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَحَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا (۲۱-۹۵) اور جس بستی (والوں) کو ہم نے ہلاک کر دیا محال ہے کہ (وہ دنیا کی طرف رجوع کریں۔

کو بھی اسی معنی پر حمل کیا گیا ہے اور بعض کے نزدیک آیت فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً (۵-۲۶) کہ وہ ملک ان پر چالیس برس تک کے لئے حرام کر دیا گیا۔

میں بھی تحریم تسخیری مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ منع جبری پر محمول ہے اور آیت کریمہ:۔

إِنَّهُ مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ (۵-۷۲) جو شخص خدا کے ساتھ شرک کرے گا۔ خدا اس پر بہشت کو حرام کر دے گا۔

میں بھی حرمت جبری مراد ہے اسی طرح آیت:۔

إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكَافِرِينَ (۷-۵۰) کہ خدا نے بہشت کا پانی اور رزق کافروں پر حرام کر دیا ہے۔

میں تحریم بواسطہ منع جبری ہے اور حرمت شرعی جیسے (۷۷) آنحضرت نے طعام کی طعام کے ساتھ بیع میں تفاضل کو حرام قرار دیا ہے[1]۔ اور آیت کریمہ:۔

وَإِنْ يَأْتُوكُمْ أُسَارَىٰ تُفَادُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ (۲-۸۵) اور اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلا دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم پر حرام تھا۔

میں بھی تحریم شرعی مراد ہے کیونکہ ان کی شریعت میں یہ چیزیں ان پر حرام کر دی گئی تھیں۔ نیز تحریم شرعی کے متعلق فرمایا:۔

قُلْ لَا أَجِدُ فِي مَا أُوحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلَىٰ طَاعِمٍ يَطْعَمُهُ (۶-۱۴۵) الآیۃ کہو کہ جو احکام مجھ پر نازل ہوئے ہیں ان میں کوئی چیز جسے کھانے والا حرام نہیں پاتا۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفُرٍ (۶-۱۴۶) اور یہودیوں پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے۔

---

[1] متفق علیہ من حدیث عمر بن الخطاب و رواہ النسائی و ابن ماجۃ و ابو داؤد من حدیث عبادۃ بن الصامت (راجع النیل ۵/۲۰۲)۔

سَوْطٌ مُحَرَّمٌ بے دباغت چمڑے کا کوڑا۔ گویا دباغت سے وہ حلال نہیں ہوا اور حدیث[1] کُلُّ إِهَابٍ دُبِغَ فَقَدْ طَهُرَ کا مقتضی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مُحَرَّمٌ اس کوڑے کو کہتے ہیں جو نرم نہ کیا گیا ہو۔

اَلْحَرَمُ کو حرام اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے اس کے اندر بہت سی ایسی چیزیں حرام کر دی ہیں جو دوسری جگہ حرام نہیں ہیں اور یہی معنی الشهر الحرام کے ہیں رَجُلٌ حَرَامٌ وَ مُحْرِمٌ یعنی وہ شخص جو حالت احرام میں ہو اس کے بالمقابل رَجُلٌ حَلَالٌ وَ مُحِلٌّ ہے اور آیت کریمہ۔ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ (۶۶-۱) کے معنی یہ ہیں کہ تم اس چیز کی تحریم کا حکم کیوں لگاتے ہو جو اللہ نے حرام نہیں کی کیونکہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے حرام نہ کی ہو وہ کسی کے حرام کرنے سے حرام نہیں ہو جاتی جیسا کہ آیت:۔ وَأَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُورُهَا الآيَة (۶-۱۳۸) اور (بعض) چارپائے ایسے ہیں کہ ان کی پیٹھ پر چڑھنا حرام کر دیا گیا ہے۔ میں مذکور ہے۔

اور آیت کریمہ:۔ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ (۶۹-۲۷) بلکہ ہم (برگشتہ نصیب) بے نصیب ہیں ان کے محروم ہونے سے بدنصیبی مراد ہے۔

اور آیت کریمہ: لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ (۵۱-۱۹) مانگنے والے اور نہ مانگنے (دونوں) میں محروم سے مراد وہ شخص ہے جو خوشحالی اور وسعت رزق سے محروم ہو اور بعض نے کہا ہے المحروم سے کتا مراد ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ محروم کتے کو کہتے ہیں جیسا ان کی تردید کرنے والوں نے سمجھا ہے بلکہ انہوں نے کتے کو بطور مثال ذکر کیا ہے کیونکہ عام طور پر کتے کو لوگ دور ہٹاتے ہیں اور اسے کچھ نہیں دیتے۔

اَلْمَحْرُمَةُ وَالْمَحْرَمَةُ کے معنی حرمت کے ہیں۔ اِسْتَحْرَمَتِ الْمَاعِزُ بکری نے نر کی خواہش کی یہ حُرْمَةٌ سے ہے جس کے معنی بکری کی جنسی خواہش کے ہیں۔

(ح ر ی)

حَرَى (ض) الشَّيْءَ وَتَحَرَّاهُ کے معنی کسی چیز کے حری یعنی جانب کا قصد کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ فَأُولَٰئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا (۷۲-۱۴) یہی لوگ ہیں جنہوں نے سیدھی راہ کا قصد کیا۔ اور حَرَى الشَّيْءُ حَرْيًا کے معنی کسی چیز کے کم ہونے کے ہیں گویا وہ ایک جانب پڑی رہی اور بیچ میں نہیں شاعر نے کہا ہے[2] (الکامل)

(۱۰۶) وَالْمَرْءُ بَعْدَ تَمَامِهِ يَحْرِي۔

---

[1] أخرجه بهذا اللفظ الطبراني عن ابن عباس والمعروف من لفظ الحديث ايما بدل كل راجع رحم، ت، ن، ه والمسلم عن ابن عباس وكذا في مسند احمد ورواه الشافعي وابن حبان والدارقطني ورواه الخطيب في تلخيص المتشابه من حديث جابر وفي رواية الدارقطني عن عائشة مرفوعا طهور كل اديم دباغها راجع النيل (۱: ۷۵) وكنز العمال ۹ رقم ۲۱۴۴، ۲۱۲۹ بالفاظ وطرق

[2] لسلمة بن عوية بن ربيعة الضبي من قصيدة طويلة وصدره حتى كانى خاتل قنصا ونسبه المرتضى (۱: ۲۴۴) عن الجاحظ لذي الاصبع ونسبه القالي (۲: ۱۶۶) ۲ ابياتا السلمي بن عزيه قال الاستاذ الميمني وهو غوية بن سلمي انظر السمط ۳۲۲ ومجالس ثعلب (۱: ۲۴۵) واللآلي ۹۷ وقد ذكره المرزباني في معجمه في حرف العين المهملة وقال لا يقال غوية بالمعجمة وفي البحتري ۲۹۶ لغزية بن سلمي *

انسان کامل ہونے کے بعد ڈھلنا شروع ہوجاتا ہے
رَمَاہُ اللّٰہُ بِاَفْعٰی حَارِیَۃٍ [1] (ش)
واللہ تعالیٰ اس پر بوڑھا اژدہا مسلط کرے۔

(ح ز ب)

اَلْحِزْبُ وہ جماعت جس میں سختی اور شدت پائی جائے۔ قرآن میں ہے:۔
اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰی لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا (۱۸-۱۲)
دونوں جماعتوں میں سے اس کی مقدار کس کو خوب یاد ہے۔
اُولٰٓئِکَ حِزْبُ الشَّیْطٰنِ (۵۸-۱۹) یہ جماعت شیطان کا لشکر ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ (۳۳-۲۲)
اور جب مومنوں نے کافروں کے لشکر کو دیکھا۔
میں احزاب سے وہ لوگ مراد ہیں جو مختلف قبائل سے آنحضرت کے خلاف جنگ کے لئے جمع ہوگئے تھے اور آیت کریمہ:۔
فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْغٰلِبُوْنَ (۵-۵۶)
اور خدا کی جماعت ہی غلبہ پانے والی ہے۔
میں حزب اللہ سے انصار اللہ یعنی دین الٰہی کی مدد کرنے والے لوگ مراد ہیں۔
یَحْسَبُوْنَ الْاَحْزَابَ لَمْ یَذْھَبُوْا وَاِنْ یَّاْتِ الْاَحْزَابُ یَوَدُّوْا لَوْ اَنَّھُمْ بَادُوْنَ فِی الْاَعْرَابِ (۳۳-۲۰) خوف کے سبب خیال کرتے ہیں کہ فوجیں نہیں گئیں اور اگر لشکر آجائیں تو تمنا کریں کہ کاش گنواروں میں جا رہیں۔

اس کے بعد تھوڑا سا آگے چل کر فرمایا:۔
وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ (۳۳-۲۲)

(ح ز ن)

اَلْحُزْنُ وَالْحَزَنُ کے معنی زمین کی سختی کے ہیں۔ نیز غم کی وجہ سے جو بیقراری سے طبیعت کے اندر پیدا ہوجاتی ہے اسے بھی حُزْنٌ یا حَزَنٌ کہا جاتا ہے اس کی ضد فَرَحٌ ہے اور غم میں چونکہ خشونت کے معنی معتبر ہوتے ہیں اس لئے غم زدہ ہونے کے لئے خَشَنَتْ بِصَدْرِہٖ بھی کہا جاتا ہے۔
حَزِنَ (س) غمزدہ ہونا۔ حَزَنَہٗ (ن) وَاَحْزَنَہٗ غمگین کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
لِکَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ (۳-۱۵۳)
تاکہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے...... اس سے تم اندوہناک نہ ہو۔
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵-۳۴) کہ خدا کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا۔
تَوَلَّوْا وَّاَعْیُنُھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا (۹-۹۲) تو وہ لوٹ گئے اور ...... ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔
اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ (۱۲-۸۶) کہ میں تو اپنے غم و اندوہ کا اظہار خدا سے کرتا ہوں۔
اور آیت کریمہ:۔
وَلَا تَحْزَنُوْا (۳-۱۳۹) اور نہ کسی طرح کا غم کرنا۔
اور لَا تَحْزَنْ (۹-۴۰) کہ غم نہ کر۔

---

[1] انظر السمط ۔ ۹۴ والقالی ۲/۲/۱۷۴، ۱۷۰ وذیل اللآلی ۵ د فی مبحث "دعاء العرب" قال والجاریۃ التی رجع سمہا فیہا فالحرتہا فہو اشد لضربتہا والمیدانی ۱/۲۷۱، ۲۰۸، ۲۸۲ والحیوان ۴/۲۴۴ والمثل فی جل العاجم

میں اندوہگین ہونے سے منع نہیں کیا ہے اسلئے کہ مغموم ہونا کسی انسان کا اختیاری فعل نہیں ہے۔ جس سے منع کرنے کی ضرورت پیش آئے بلکہ یہاں دراصل ان کاموں کے کرنے سے منع کرنا مقصود ہے جو غم واندوہ کا باعث بنتے ہیں اسی معنی کیطرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا ہے[۱] ع (

(۱۰۸) مَنْ سَرَّهٗ اَنْ لَا یَرٰی مَا یَسُوْءُهٗ
فَلَا یَتَّخِذْ شَیْئًا یُبَالِیْ لَهٗ فَقْدًا

(جسے یہ اچھا لگتا ہے کہ کوئی چیز اسے غمگین نہ کرے تو وہ ایسی چیز حاصل نہ کرے جس کے گم ہونے کا اندیشہ ہو نیز انسان کو دنیا کے نظام پر غور کرنا چاہیئے (کہ یہاں کس طرح سلسلۂ اضداد قائم ہے) تاکہ جب اس پر اچانک کوئی مصیبت آپڑے تو اس سے زیادہ پریشان نہ ہو اور یہ بھی ضروری ہے کہ انسان معمولی مصیبتیں برداشت کرنے کا عادی بن جائے تاکہ بڑے مصائب کو بھی برداشت کرسکے

(ح س س)

اَلْحَاسَّةُ اس قوۃ کو کہتے ہیں جس سے عوارض حِسِّیہ کا ادراک ہوتا ہے اس کی جمع حَوَاسٌّ ہے جس کا اطلاق مشاعر خمسہ (یعنی سمع، بصر، شم، ذوق اور لمس) پر ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے:۔

حَسَسْتُ (ن) وَحَسِیْتُ وَاَحْسَسْتُ محسوس کرنا اور اَحْسَسْتُ (افعال) دو طرح استعمال ہوتا ہے۔

(۱) قوت حس سے کسی چیز تک پہنچنا (محسوس کرنا) جیسے عِنْتُهٗ وَرُعْتُهٗ۔

(۲) کسی کے حاسہ پر مارنا۔ جیسے کَبَدْتُهٗ وَفَادْتُهٗ۔ اور حاسہ پر مار لگنے سے کبھی انسان قتل ہوجاتا ہے۔ اس لیے حَسَسْتُهٗ بمعنی قَتَلْتُهٗ آجاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ (۳-۱۵۲) جب کہ تم کافروں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے۔

اور حَسِیْسٌ بمعنی قتیل بھی آتا ہے اور اسی سے پکی ہوئی جراد کو جَرَادٌ مَحْسُوْسٌ کہا جاتا ہے۔ عرب لوگ کہتے ہیں حَسَّ الْبَرْدُ النَّبَاتَ پالے نے نبات کو جلا ڈالا۔ اِنْحَسَّتْ اَسْنَانُهٗ اس کے دانت گر گئے۔ اور حَسِسْتُ (س) فَهِمْتُ وَعَلِمْتُ کے ہم معنی ہے مگر یہ صرف اسی چیز کے متعلق بولا جاتا ہے جو بذریعہ حواس کے معلوم ہو۔ اور حَسِیْتُ میں ایک سین کو یاء سے تبدیل کر دیا گیا ہے اور اَحْسَسْتُهٗ کے اصل معنی بھی کسی چیز کو محسوس کرنے کے ہیں اور اَحَسْتُ بھی اَحْسَسْتُ ہی ہے مگر اس میں ایک سین کو تخفیفاً حذف کر دیا گیا ہے جیسا کہ ظَلْتُ (میں ایک لام محذوف ہے) اور آیت کریمہ:۔

فَلَمَّا اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْکُفْرَ (۳-۵۲) جب عیسیٰ (علیہ السلام) نے ان کی طرف سے نافرمانی (اور نیت قتل) دیکھی۔

میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے اسقدر برملا طور پر کفر کیا کہ عقل وفہم کی بجائے وہ ہر ایک کو محسوس ہورہا تھا اور یہی معنی آیت:۔

فَلَمَّا اَحَسُّوْا بَاْسَنَا اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَرْکُضُوْنَ۔ (۲۱-۱۲) جب انہوں نے ہمارے (مقدمہ) عذاب کو دیکھا تو لگے اس سے بھاگنے۔

میں مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

---

[۱] قالہ عبداللہ بن عبداللہ بن طاہر وعدہ الثعالبی فی خاص الخاص ص۱۰۷ من ظرائف شعرہ وقبلہ الم تران الدہر یہدم مابنی ۔ ویاخذنا اعطی ویفسد ما اسدی؟

هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِنْ اَحَدٍ (۲۰-۹۸) کے معنی یہ ہیں کہ کیا تم کسی کو بھی ان میں سے محسوس کر سکتے ہو۔ اَلْحَسِيْسُ وَالْحِسُّ۔ حرکت، آہٹ کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا (۲۱-۱۰۲) (یہاں تک کہ اس کی آہٹ بھی تو نہیں سنیں گے۔

اَلْحُسَاسُ سوء خلق یہ زکام وسُعال کی طرح (فعال) کے وزن پر ہے (جو بیماری یا عیب کے معنی کے ساتھ خاص ہے)۔

(ح س ب)

اَلْحِسَابُ کے معنی گننے اور شمار کرنے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ حَسَبْتُ (ض) اَحْسِبُ حِسَابًا وَحُسْبَانًا۔ قرآن میں ہے:۔

لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ (۱۷-۱۲) اور برسوں کا شمار اور حساب جان لو۔

وَجَاعِلُ الَّيْلِ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا[1] (۶-۹۶) اور اسی نے رات کو (موجب) آرام (ٹھہرایا) اور سورج اور چاند کو (ذرائع) شمار بنایا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ ان کے حُسْبَان ہونے کی حقیقت خدا ہی جانتا ہے اور آیت کریمہ:۔

وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاءِ (۱۸-۴۰) اور وہ (تمہارے باغ) پر آسمان سے آفت بھیج دے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ حُسْبَانًا کے معنی آگ اور عذاب کے ہیں اور حقیقت میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس پر محاسبہ کیا جائے اور پھر اس کے مطابق بدلہ دیا جائے۔ حدیث میں ہے[2] (۷۷) آنحضرت نے آندھی کے متعلق فرمایا:۔

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْهَا عَذَابًا وَّحُسْبَانًا کہ الٰہی! اسے عذاب یا حُسْبَان نہ بنا اور آیت کریمہ:۔

فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا (۶۵-۸) تو ہم نے ان کو سخت حساب میں پکڑ لیا۔ میں حدیث[3] (۷۸) مَنْ نُوْقِشَ فِي الْحِسَابِ عُذِّبَ (کہ جس سے حساب میں سختی کی گئی اسے ضرور عذاب ہوگا) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ (۲۱-۱) لوگوں کا حساب (اعمال کا وقت) نزدیک آ پہنچا (اپنے مضمون میں) وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ کی طرح ہے اور آیت کریمہ:۔ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ (۶۹-۲۶) اور مجھے معلوم نہ ہوتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ اور آیت:۔ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ (۶۹-۲۰) مجھے یقین تھا کہ مجھ کو میرا حساب (و کتاب) ضرور ملے گا۔

میں ہ، وقف کی ہے جیسا کہ مَالِيَهْ وَسُلْطَانِيَهْ میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۱۵-۵۱) بیشک خدا جلد حساب لینے والا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

---

[1] ہی قراءۃ الاکثر وفی قراءۃ الکوفۃ جعل (فعل ماضی)، وکلاہما قراءتان مستفیضتان (الطبری ۷/۲۸۳ والداني ۵-۱۰۵) (حُسْبانا جمع حساب مثل شہاب وشہبان قالہ الاخفش (الفتح للشوکانی ۲ والیضًا ابوعبیدۃ فی مجازہ ۱/۲۰۱) وقیل ہو مصدر (الطبرسی ۷/۱۳۸)

[2] راجع غریبہ ابی عبید ۱/۲۰۱ وابوداؤد (جنائز) والترمذی (فی التفسیر) والمستدرک ۶/۲۸۴) [3] من حدیث عائشۃ وفی المطبوع معذب والتصحیح من الاصول راجع للحدیث ومحاورۃ عائشۃ رضی اللہ عنہا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الفتح للحافظ ۱۱/۱۹۱-۱۹۳ و الحدیث فی الفائق ۲/۸۸ والنہایۃ واصلہ من الصحیحین ۱۲ ؛

جَزَاءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَاءً حِسَابًا (۷۸-۳۶)
یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے صلہ ہے انعام
کثیر۔ میں بعض نے کہا ہے کہ حِسَابًا کے
معنی کافیًا کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ
آیت :۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى
(۵۳-۳۹) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

اور آیت کریمہ :۔
وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲-۲۱۲)
اور خدا جس کو چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔
میں بغیر حساب کی متعدد توجیہات ہو سکتی ہیں۔

(۱) استحقاق سے زیادہ عطا فرماتا ہے۔

(۲) جسے چاہے عطا فرماتا ہے اور پھر اس سے
واپس نہیں لیتا۔

(۳) اس قدر عطا فرماتا ہے کہ انسان کے لئے اس
کا احصاء ممکن نہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے (
(۱۰۹) عَطَايَاهُ يُحْصٰى قَبْلَ اِحْصَائِهَا الْقَطْرُ
کہ بارش کے قطروں سے بھی اس کے عطایا زیادہ
ہو جاتے ہیں۔

(۴) بغیر کسی تنگی کے دیتا ہے اور یہ حَاسَبْتُهٗ
سے ہے جس معنی ضَايَقْتُهٗ یعنی تنگی کرنا آتے ہیں۔

(۵) لوگوں کے عام اندازہ سے کہیں زیادہ دیتا ہے۔

(۶) اپنی مصلحت کے مطابق عطا فرماتا ہے نہ کہ
لوگوں کے حساب کے مطابق جیسا کہ آیت :۔
وَلَوْلَا اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا
لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ (الآية) (۴۳-۳۳)
اور اگر یہ خیال نہ ہوتا کہ سب لوگ ایک ہی
جماعت ہو جائیں گے تو جو لوگ خدا سے انکار
کرتے ہیں۔ میں تنبیہ فرمائی ہے۔

(۷) مومن کو جو کچھ دیتا ہے اس پر محاسبہ نہیں کریگا
اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن دنیا میں بقدر کفایت
حاصل کرتا ہے اور وہ بھی جائز طریقہ سے اور
حسب ضرورت اور اسی طریق سے خرچ کرتا ہے
اور ساتھ ہی اپنے آپ پر محاسبہ بھی کرتا رہتا ہے۔
اس لئے اللہ تعالیٰ اس سے اس طرح حساب نہیں
لے گا جس سے کہ اسے نقصان پہنچے جیسا کہ حدیث
میں ہے (۹۷) مَنْ حَاسَبَ نَفْسَهٗ فِي الدُّنْيَا
لَمْ يُحَاسِبْهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ کہ جو شخص دنیا
میں اپنے نفس پر محاسبہ کرتا رہے گا۔ قیامت کے
دن اللہ تعالیٰ اس سے حساب نہیں لے گا (یعنی
جس سے کہ اسے نقصان پہنچے)

(۸) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کے
استحقاق سے زیادہ بدلہ عطا فرمائیگا۔ جیسے فرمایا :۔
مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا
فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً (۲-۲۴۵)
کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کے
بدلے اس کو کئی حصے زیادہ دے گا۔

اور آیت کریمہ :۔
فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ
فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ (۴۰-۴۰) تو ایسے لوگ
بہشت میں داخل ہوں گے وہاں ان کو بے شمار
رزق ملے گا۔
بھی ان مذکورہ وجوہ (ثمانیہ) پر محمول ہو سکتی ہے۔

اور آیت کریمہ :۔
هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ بِغَيْرِ
حِسَابٍ (۳۸-۳۹) یہ ہماری بخشش ہے
(چاہو تو احسان کرو یا رکھ چھوڑو
(تم سے) کچھ حساب نہیں ہے۔
میں بغیر حساب کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اس

میں اس شخص کی طرح تصرف کرو جسے محاسبہ کا خوف نہ ہو۔ یعنی (مومن کی طرح) واجب طریق سے بوقت ضرورت اور بقدر کفایت لیا کرو اور پھر اسی طریق سے خرچ کرتے رہو۔ اَلْحَسِیْبُ وَالْمُحَاسِبُ کے اصل معنی حساب لینے والا یا حساب کرنے والا کے ہیں۔ پھر حساب کے مطابق بدلہ دینے والے کو بھی حَسِیْب کہا جاتا ہے۔ (اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کے حسیب ہونے کے ہیں) اور آیت کریمہ:۔

وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (۴-۶) تو خدا ہی (گواہ اور) حساب لینے والا کافی ہے۔ میں حسیب بمعنی رقیب ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کی نگہبانی کے لئے کافی ہے جو ان سے محاسبہ کرے گا۔

حَسْبُ (اسم فعل) بمعنی کافی۔ جیسے فرمایا:۔

حَسْبُنَا اللّٰهُ (۹-۵۹) ہمیں خدا کافی ہے۔

حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ (۹-۶۸) ان کو دوزخ ہی کی سزا کافی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (۶-۵۲) ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت:۔

عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵-۱۰۵) اپنی جانوں کی حفاظت کرو جب تم ہدایت پر ہو تو کوئی گمراہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ اور آیت:۔

وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّيْ (۲۶-۱۱۲-۱۱۳) مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کرتے ہیں ان کا حساب (اعمال) میرے پروردگار کے ذمے ہے۔ کے مفہوم کے مطابق ہے بعض نے آیت مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ کے یہ معنی کئے ہیں کہ ان کو کافی ہونا تمہارا کام نہیں ہے۔ بلکہ تیرے اور ان کے لئے اللہ ہی کافی ہے۔ جیسا کہ آیت:۔ عَطَاءً حِسَابًا (۷۸-۳۶) میں حساب بمعنی کافی ہے اور یہ حَسْبِيْ كَذَا کے محاورہ سے لیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ مِنْ حِسَابِهِمْ سے ان کے اعمال مراد ہیں یعنی ان کے اعمال کی وجہ سے تجھ پر گرفت نہیں ہوگی اور اعمال کو بلحاظ مآل کے حساب کہا گیا ہے۔

اِحْتَسَبَ ابْنًا لَهٗ یعنی اس نے اپنے بیٹے کی موت پر یہ سمجھ کر صبر کیا کہ اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ملے گا۔ اور اس کے عمل کو حِسْبَةٌ کہا جاتا ہے اور آیات:۔

الٓمّٓ اَحَسِبَ النَّاسُ (۲۹-۲) کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ (۲۹-۴) کیا وہ لوگ جو برے کام کرتے ہیں یہ سمجھے ہوئے ہیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ (۱۴-۴۲) اور (مومنو) مت خیال کرنا کہ یہ ظالم جو عمل کر رہے ہیں خدا ان سے بے خبر ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ (۱۴-۴۷) تو ایسا خیال نہ کرنا کہ خدا نے جو اپنے پیغمبروں سے وعدہ کیا ہے اس کے خلاف کرے گا۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ (۲-۲۱۴) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ (یوں ہی) جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

میں سب کا مصدر اَلْحِسْبَان ہے اور اَلْحِسْبَان کے معنی یہ ہیں کہ نقیضین میں سے کسی ایک کے بارے میں اس طرح حکم لگایا جائے کہ دوسری

کا دل میں خیال تک بھی نہ آنے پائے اسی کو گنتی میں لائے اور اس پر ہی انگلی کو گرہ لگائے مگر اس میں شک وشبہ کی گنجائش ہو اور یہی معنی تقریباً ظن کے ہیں مگر ظن کی صورت میں دونوں نقیضوں کا خیال لایا جاتا ہے اور پھر ایک کو دوسری پر غلبہ دیکر حکم لگایا جاتا ہے

(ح س د)

اَلْحَسَدُ (ن) کسی مستحق نعمت سے اس نعمت کے زائل ہونے کی تمنا کرنے کا نام حسد ہے۔ بسا اوقات اس میں اس مقصد کے لئے کوشش کرنا بھی شامل ہوتا ہے ایک روایت میں ہے (۱) اَلْمُؤْمِنُ یغبط والمنافق یحسد کہ مومن رشک کرتا ہے اور منافق حسد کرتا ہے

قرآن میں ہے:۔

حَسَدًا مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِھِمْ (۲-۱۰۹) اپنے دل کی جلن سے۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ۔ (۱۱۳-۵) اور حسد کرنے والے کی برائی سے جب حسد کرنے لگے۔

(ح س ر)

اَلْحَسْرُ (ن ض) کے معنی کسی چیز کو ننگا کرنے اور اس سے پردہ اٹھانے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ حَسَرْتُ عَنِ الذِّرَاعِ میں نے آستین چڑھائی

اَلْحَاسِرُ بغیر زرہ یا بغیر خود کے۔

اَلْمِحْسَرَۃُ

فُلَانٌ کَرِیْمُ الْمَحْسِرِ کنایہ یعنی نَاقَۃٌ حَسِیْرٌ تھکی ہوئی اور کمزور اونٹنی۔ جس کا گوشت اور قوت زائل ہوگئی ہو اس کی جمع حَسَرٰی ہے۔

اَلْحَاسِرُ۔ تھکا ہوا۔ کیونکہ اس کے قوی ظاہر ہو جاتے ہیں عاجز اور درماندہ کو حَاسِرٌ بھی کہتے ہیں اور مَحْسُوْرٌ بھی حَاسِرٌ تو اس تصور کے پیش نظر کہ اس نے خود اپنے قوی کو ننگا کر دیا اور مَحْسُوْرٌ اس تصور پر کہ درماندگی نے اس کے قوی کو ننگا کر دیا۔ اور آیت کریمہ:۔

یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّھُوَ حَسِیْرٌ (۶۷-۴) تو نظر (ہر بار) تیرے پاس ناکام اور تھک کر لوٹ آئے گی۔

میں حَسِیْرٌ بمعنی حَاسِرٌ بھی ہو سکتا ہے اور مَحْسُوْرٌ بھی فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا (۱۷-۲۹) کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔

اَلْحَسْرَۃُ۔ غم۔ جو چیز ہاتھ سے نکل جائے اس پر پشیمان اور نادم ہونا گویا وہ جہالت اور غفلت جو اس کے ارتکاب کی باعث تھی وہ اس سے دور ہوگئی یا فرط غم سے اس کے قوی ننگے ہوگئے یا اس کوتاہی کے تدارک سے اسے درماندگی نے پالیا قرآن میں ہے:۔

لِیَجْعَلَ ذٰلِکَ حَسْرَۃً فِیْ قُلُوْبِھِمْ (۳-۱۵۶) ان باتوں سے مقصود یہ ہے کہ خدا ان لوگوں کے دلوں میں افسوس پیدا کر دے۔

وَاِنَّہٗ لَحَسْرَۃٌ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (۶۹-۵۰) نیز یہ کافروں کے لئے (موجب) حسرت ہے۔

یٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰہِ (۳۹-۵۶) اس تقصیر پر افسوس ہے جو میں نے خدا کے حق میں کی۔

---

(۱) کذا ذکرہ الغزالی فی الاحیاء مرفوعًا قال العراقی فی تخریجہ (۳/۱۸۹) لم اجد لہ اصلا مرفوعًا وانما ھو من قول الفضیل بن عیاض ذکرہ ابن ابی الدنیا فی ذم الحسد راجع لمعنی الحسد والغبطۃ النہایۃ تحت حدیث لاحسد فی اثنتین الخ (ا/۳۸۲) ۱۲

كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ (۲-۱۶۷) اسی طرح خدا ان کے اعمال انہیں حسرت بنا کر دکھائے گا۔

يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ (۳۶-۳۰) بندوں پر افسوس ہے۔
اور فرشتوں کے متعلق فرمایا:۔

لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ (۲۱-۱۹) وہ اس کی عبادت سے نہ کنیاتے ہیں اور نہ درماندہ ہوتے ہیں۔ اس میں لَا يَحْسِرُوْنَ سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔

(ح س م)

اَلْحَسْمُ (ض)، کے معنی کسی چیز کے نشان کو زائل کرنے اور مٹا دینے کے ہیں کہا جاتا ہے:۔
قَطَعَهٗ فَحَسَمَهٗ یعنی اسے قطع کیا اور پھر اس کا نشان تک مٹا دیا۔ پھر اس اعتبار سے تلوار کو حُسَام کہا جاتا ہے۔
حَسْمُ الدَّاءِ زخم کو مسلسل داغ دے کر اس کے نشان کو مٹا دینا اور جب نحوست انسان کے نشان کو مٹا ڈالے تو کہا جاتا ہے نَالَ الْحُسُوْمُ
اور آیت کریمہ:۔
ثَمَانِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا (۶۹-۷) آٹھ دن لگاتار۔
میں بعض نے کہا ہے کہ ان کے گھروں کے نشانات مٹا دینے والی ریح مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ نام و نشان مٹا دینے والی مراد ہے اور بعض نے ان کی عمروں کو قطع کر دینے والی مراد لی ہے اور یہ سب معانی حُسُوْمٌ کے مفہوم میں داخل ہیں۔

(ح س ن)

اَلْحَسَنُ ہر خوش کن اور پسندیدہ چیز کو حَسَنٌ کہا جاتا ہے اس کی تین قسمیں ہیں۔
(۱) وہ چیز جو عقل کے اعتبار سے مستحسن ہو۔
(۲) وہ جو خواہش نفسانی کی رو سے پسندیدہ ہو۔
(۳) صرف نگاہ میں بھلی معلوم ہو۔
اَلْحَسَنَةُ ہر وہ نعمت جو انسان کو اس کے نفس یا بدن یا اس کی کسی حالت میں حاصل ہو کر اس کے لئے مسرت کا سبب بنے حَسَنَةٌ کہلاتی ہے اس کی ضد سَيِّئَةٌ ہے اور یہ دونوں الفاظ مشترکہ کے قبیل سے ہیں اور لفظ "حیوان" کی طرح مختلف انواع کو شامل ہیں چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ (۴-۷۸) اور ان لوگوں کو اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور اگر کوئی گزند پہنچتا ہے۔
میں حَسَنَة سے مراد فراخ سالی، وسعت اور کامیابی ہے اور سَيِّئَة سے قحط سالی، تنگی اور ناکامی مراد ہے اور یہی معنی آیت:۔
فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ (۷-۱۳۱) تو جب ان کو آسائش حاصل ہوتی تو کہتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں میں مراد ہیں اور آیت:۔
مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (۴-۷۹) (اے آدم زاد) تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی (شامت اعمال کی) وجہ سے ہے۔
میں حَسَنَة سے ثواب اور سَيِّئَة سے عذاب مراد ہے۔
اَلْحَسَنُ وَالْحَسَنَةُ اور الْحُسْنٰى یہ تین لفظ ہیں۔

زبان) میں فرق یہ ہے کہ حَسَنٌ اعیان و اغراض دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اسی طرح حَسَنَۃٌ جب بطور صفت استعمال ہو تو دونوں پر بولا جاتا ہے اور اسم ہو کر استعمال ہو تو زیادہ تر اَحْدَاث (احوال) میں استعمال ہوتا ہے اور حُسْنیٰ کا لفظ صرف احداث کے متعلق بولا جاتا ہے۔ اَعْیَان کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ اور اَلْحُسْنُ کا لفظ عرف عام میں اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو بظاہر دیکھنے میں بھلی معلوم ہو جیسے کہا جاتا ہے رَجُلٌ حَسَنٌ حُسَّان وَامْرَءۃٌ حَسَنَۃٌ وَحَسَّانَۃٌ لیکن قرآن میں حَسَنٌ کا لفظ زیادہ تر اس چیز کے متعلق استعمال ہوا ہے جو عقل و تدبیر کی رو سے اچھی ہو اور آیت کریمہ :۔

اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ (۳۹-۱۸) جو بات کو سنتے اور اچھی باتوں کی پیروی کرتے ہیں۔ میں اَحْسَنُ سے وہ بات مراد ہے جو شک و شبہ سے دور (اور بالا) ہو جیسا کہ آنحضرت ؐ نے فرمایا (۱) اِذَا شَكَكْتَ فِيْ شَيْءٍ فَدَعْ کہ جس چیز میں تجھے شبہ ہو اسے ترک کردے۔ اور آیت کریمہ :۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (۲-۸۳) اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا۔ میں حسن سے اچھی بات مراد ہے۔ اسی طرح فرمایا :۔

وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ حُسْنًا (۲۹-۸)

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَا اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ (۹-۵۲) کہدو کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ایک کے منتظر ہو۔ اور آیت کریمہ :۔

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵-۵۰) اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لئے خدا سے اچھا حکم کس کا ہے ؟ -

میں اگر اعتراض کیا جائے کہ اللہ کا حکم تو ہر حال اچھا ہے۔ خواہ کوئی یقین کرے یا نہ کرے تو پھر "لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ" کی تخصیص کیوں کی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں بلکہ ظہور حسن کا قصد اور اس پر مطلع ہونا مراد ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ حکم الٰہی کا حسن اسی شخص کے سامنے ظاہر ہوگا جو پاکیزہ نفس ہو اور حکمت الٰہی پر اس کی نظر ہو۔ ورنہ جہال پر تو یہ راز منکشف نہیں ہو سکتا۔

اَلْاِحْسَان (افعال) دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے اول یہ کہ دوسروں پر انعام کرنا۔ کہا جاتا ہے۔ اَحْسَنَ اِلٰى فُلَانٍ اس نے فلاں پر انعام کیا۔ دوم یہ کہ اپنے فعل میں حسن پیدا کرنا اور یہ چیز حسن علم اور حسن عمل سے پیدا ہوتی ہے اسی معنی میں امیر المومنین نے فرمایا (۲) اَلنَّاسُ اَبْنَاءُ مَا يُحْسِنُوْنَ یعنی لوگ اپنے علم و فضل اور اعمال حسنہ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔

قرآن میں ہے :۔

اَلَّذِیْ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ (۳۲-۷) جس نے ہر چیز کو اچھی طرح بنایا (یعنی) اسکو پیدا کیا۔

اِحْسَان انعام سے اعم ہے قرآن میں ہے :

---

(۱) وہ لم اجدہ بہذا اللفظ وحدیث دع ما یریبک معروف وسیاتی فی (ریب) نادروہ الغزالی فی احیاءہ ۹۵ وقد عقدہ الشافعی مع ثلاثۃ : اخسوا اتق الشبہات وازھد ودع ما لیس یعنیک واعملن بالنیۃ (العاہر ۲ ر ۸) (۲) انظر فی ادب الدنیا والدین للماوردی قال الشارح معناہ ای ابناء ما ینسبون الیہ من العلوم والصنائع فیقال مثلاً فلان العالم وفلان الجاہد فی معناہ قول عائشۃ راجع المحضرات للمؤلف ص ۴۱

اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ (۱۷-۷) اگر تم نیکو کاری کرو گے تو اپنی جان کے لئے کرو گے۔
اور آیت کریمہ: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ (۱۶-۹۰) خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے کا حکم دیتا ہے۔ میں اشارہ ہے کہ احسان عدل سے بڑھ کر چیز ہے کیونکہ دوسرے کا حق پورا ادا کر دینا اور اپنا حق پورا لے لینے کا نام عدل ہے لیکن احسان یہ ہے کہ دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دیا جائے اور اپنے حق سے کم لیا جائے لہذا احسان کا درجہ عدل سے بڑھ کر ہے۔ اور انسان پر عدل وانصاف سے کام لینا تو واجب اور فرض ہے مگر احسان مندوب ہے۔ اسی بنا پر فرمایا:۔
وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (۴-۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکو کار بھی ہے۔ اور فرمایا:۔
وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ (۲-۱۷۸) اور پسندیدہ طریق سے (قرار داد کی) پیروی (یعنی مطالبہ خونبہا کرنا)۔
یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محسنین کے لئے بہت بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (۲۹-۶۹) اور خدا تو نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۲-۱۹۵) بیشک خدا نیکی کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔
مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ (۹-۹۱) نیکوکاروں پر کسی طرح کا الزام نہیں ہے۔
لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ (۳۹-۱۰) جنہوں نے اس دنیا میں نیکی کی ان کے لئے بھلائی ہے۔

(ح ش ر)

اَلْحَشْرُ (ن) کے معنی لوگوں کو ان کے ٹھکانہ سے مجبور کرکے نکال کر لڑائی وغیرہ کی طرف لے جانے کے ہیں۔ ایک روایت میں ہے[1] (۸۳) اَلنِّسَآءُ لَا يُحْشَرْنَ کہ عورتوں کو جنگ کے لئے نہ نکالا جائے اور یہ انسان اور غیر انسان سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ حَشَرَتِ السَّنَةُ مَالَ بَنِيْ فُلَانٍ یعنی تحط سالی نے مال کو ان سے زائل کر دیا اور حَشْرٌ کا لفظ صرف جماعت کے متعلق بولا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔
وَابْعَثْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ (۲۶-۳۶) اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیجئے۔
وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً (۳۸-۱۹) اور پرندوں کو بھی کہ جمع رہتے تھے۔
وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (۸۱-۵) اور جب وحشی جانور اکٹھے ہو جائیں گے۔
مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا لِاَوَّلِ الْحَشْرِ (۵۹-۲) حشر اول کے وقت تمہارے خیال میں بھی نہ تھا کہ نکل جائیں گے۔
وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ (۲۷-۱۷) اور سلیمان کے لئے جنوں اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کئے گئے اور قسم وار کئے جاتے تھے۔
اور قیامت کے متعلق فرمایا:۔
وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً (۴۶-۶)

---

[1] راجع للحدیث النہایۃ ۱ر ۲۸۹ وفیہ: لایحشرن ولایعشرن ۱۲

اور جب لوگ جمع کئے جائیں گے تو وہ ان کے دشمن ہوں گے۔
فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ جَمِيعًا (۴-۱۷۲) تو خدا سب کو اپنے پاس جمع کرلے گا۔
وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا (۱۸-۴۷) اور ان (لوگوں) کو ہم جمع کرلیں گے تو ان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔
اور قیامت کے دن کو یَوْمُ الْحَشْرِ بھی کہا جاتا ہے جیسا کہ اسے یَوْمُ الْبَعْثِ اور یَوْمُ النُّشُوْرِ کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔
رَجُلٌ حَشْرُ الْأُذُنَيْنِ لطیف اور باریک کانوں والا۔

(ح ص ص)

حَصْحَصَ الْحَقُّ (۱۲-۵۲) کے معنی ہیں کہ حق بات جو کسی دباؤ کی وجہ سے چھپی ہوئی اب اس دباؤ کے دور ہونے کی وجہ واضح ہو کر سامنے آگئی اور حَصَّ وحَصْحَصَ (ثلاثی و رباعی) دونوں طرح آتا ہے۔ جیسے کَفَّ وَکَفْکَفَ وکَبَّ وَکَبْکَبَ۔
حَصَّةٌ (ن) کسی چیز سے ایک حصہ کاٹ لینا۔ یہ کاٹنا خواہ حقیقی طور پر ہو یا حکمی طور پر۔ حقیقی کی مثال جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ع (سریع)
(۱۱۹) "قَدْ حَصَّتِ الْبَيْضَةُ رَأْسِي"
(یعنی مسلسل خود پہنے رہنے کی وجہ سے میرے سر کے بال جھڑ گئے۔
اسی سے رَجُلٌ أَحَصُّ کا محاورہ ہے (یعنی مرد موئے رفتہ از سر) مؤنث حَصَّاءُ رَجُلٌ أَحَصُّ منحوس مرد، جو اپنی نحوست کی وجہ سے لوگوں سے خیرات کو قطع کردے۔
اَلْحِصَّةُ کے معنی کل میں سے ایک ٹکڑہ کے ہیں اور بمعنی بہرہ یعنی نصیب کے استعمال ہوتا ہے۔

(ح ص د)

اَلْحَصْدُ وَالْحَصَادُ کے معنی کھیتی کاٹنے کے ہیں اور زَمَنُ الْحَصَادِ وَالْحِصَادِ یہ زَمَنُ الْجَدَادِ وَالْجِدَادِ کی طرح (بکسرہ حاء وفتحہا) دونوں طرح آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ (۶-۱۴۱) اور جس دن (پھل توڑو اور کھیتی) کاٹو تو خدا کا حق بھی اس میں سے ادا کرو۔
میں وہ کھیتی مراد ہے جو اس کے صحیح وقت میں کاٹی گئی ہو۔ مگر آیت:
حَتَّى إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَنْ لَمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ (۱۰-۲۴) یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہوگئی اور زمین والوں نے خیال کیا کہ وہ اس پر پوری دسترس رکھتے ہیں ناگہاں رات

لہ قالہ اخوالاوس ابوالقیس بن الاسلت وتمامہ ... . نعاس — الطعم نوما غیر تہجاع وفی روایۃ النضی غمضا بدل نوما والبیت من کلمۃ مفضلیۃ (۲: ۸۴) فی ۲۴ بیتا جمہرۃ (۲۳۳-۲۳۶) یتقدم وتانیرو البیت فی اللسان والصحاح والتاج والمحکم (حصص) طالموشح ۲۰۲ والکامل ۱۵۵ وابن اثیر (۱: ۲۸۴) والاغانی والخزانۃ (۲: ۸۴، ۵۳۴) والتنبیہ للبکری والکنز اللغوی ۱۷۰ والمرزوقی (۱: ۱۰۷) والجمحی ۸۸ والحماسۃ للبحتری ۳۴ وشواہد الکشاف ۲۰۷ ومحاضرات المؤلف ۲ / ۱۴۶ ، ۳۳۵) والحیوان للجاحظ (۲: ۲۱۹) وایام العرب ۹۲
سلہ و فی المطبوع المحمود مصحف والصواب المحصود ۱۲

گویا ان کو ہمارا حکم (عذاب) آپہنچا تو ہم نے اس کو کاٹ (کر ایسا کر) ڈالا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ یہاں حصید سے مراد وہ کھیتی ہے جو بوقت افساد اور تباہی کی غرض سے کاٹی گئی ہو۔ اور اسی سے حَصَدَهُمُ السَّيْفُ کا استعارہ ہے یعنی تلوار نے انہیں تباہ کر دیا اور آیت کریمہ:۔

مِنْهَا قَائِمٌ وَحَصِيدٌ (۱۱-۱۰۰) ان میں سے بعض تو باقی ہیں اور بعض کا تہس نہس ہو گیا۔

میں حَصِيدٌ سے تباہ و برباد کی ہوئی بستیاں مراد ہیں۔ جیساکہ آیت کریمہ:۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا (۶-۴۵) میں اشارہ پایا جاتا ہے اور حَبَّ الْحَصِيدِ (۵۰-۹) سے مراد اناج ہے اور حدیث میں ہے۔[1] (۹۴)

وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ عَلَىٰ مَنَاخِرِهِمْ فِي النَّارِ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ لوگوں کو دوزخ میں اوندھے منہ صرف وہی گرائے گا جو ان کی زبانوں نے کاٹا ہوگا۔ یہاں زبان کے ساتھ حصائد کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے۔ اور اسی سے حَبْلٌ مَحْصُودٌ (رسن محکم تافتہ)

وَدِرْعٌ حَصْدَاءُ (زرہ تنگ حلقہ و محکم تافتہ) وَشَجَرَةٌ حَصْدَاءُ (درخت بسیار برگ) کے محاورات ہیں۔

تَحَصَّدَ الْقَوْمُ لوگوں کا جمع ہو کر ایک دوسرے سے قوت حاصل کرنا۔

(ح ص ر)

اَلْحَصْرُ (ن) کے معنی تضییق یعنی تنگ کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔ وَاحْصُرُوهُمْ (۹-۵) اور گھیر لو یعنی انہیں تنگ کرو۔

اور آیت کریمہ:۔

وَجَعَلْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ حَصِيرًا (۱۷-۸) اور ہم نے جہنم کو کافروں کیلئے قیدخانہ بنا رکھا ہے۔ میں حَصِيرٌ کے معنی روکنے والا کے ہیں۔ حسنؒ نے کہا ہے کہ حصیر کے معنی مہاد یعنی بچھونے کے ہیں گویا ان کے نزدیک اس سے حصیر مرمول یعنی چٹائی مراد ہے اور چٹائی کو حصیر اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے ریشے ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوتے ہیں۔ اور لبید کے شعر[2] (الکامل)

(۱۱۰) وَمَقَامَةٍ غُلْبِ الرِّقَابِ كَأَنَّهُمْ
جِنٌّ لَدَىٰ بَابِ الْحَصِيرِ قِيَامُ

اور بہت سے موٹی گردنوں والے بہادر ہیں جو بادشاہ کے دروازے پر کھڑے ہوئے جنات معلوم ہوتے ہیں میں حصیر کے معنی بادشاہ کے ہیں۔ اور بادشاہ کو حصیر یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ محصور رہتا ہے جیساکہ اسے مُحْتَجِبٌ کہا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ جسے چاہے اسے اپنے پاس آنے سے روک سکتا ہے اور آیت کریمہ:۔

وَسَيِّدًا وَحَصُورًا (۳-۳۹) اور سردار ہوں گے

---

[1] اخرجه الترمذی وصححه وابن ماجة والحاکم من حدیث معاذ بن جبل وقال صحیح علی شرط الشیخین راجع تخریج الاحیا للعراقی ۲ر۱۰۹ [2] وفی روایة تماقم بدل ومقامة وہی جمع تماقم (بضمة القاف) ومعناه الرئیس الجواد والبیت فی الطبری (۱۵-۴۵) والسمط ۹۵۵ فی ثلاثة ابیات والامالی (۲: ۳۰۸) والقرطبی (۱۰: ۲۲۴) والصحاح واللسان والتاج (حصر) ومجاز القرآن (۱: ۳۷۰) رقم ۳۴۳ والبحر (۶: ۱۱) (۲: ۶۰) وفی روایة الدیوان (۲: ۳۹) طرف الحصیر بدل باب الحصیر قال فی الصحاح وہذه روایة غیر ابی عبیدة وفی المطبوع (مصر و کراتشی) ومعالم وہذ تصحیف فی تماقم ۱۰ ؛

اور عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والے۔

یں حصوراً کے معنی عورتوں سے رغبت نہ رکھنے والا کے ہیں خواہ یہ نامردی کی وجہ سے ہو اور خواہ عفت اور ازالۂ شہوت میں مجاہدہ اور ریاضت کی بنا پر مگر یہاں دوسرے معنی زیادہ مناسب ہیں کیونکہ یہ لفظ ان (یحیٰی علیہ السلام) کے لئے بطور مدح کے استعمال ہوا ہے۔

اَلْحَصْرُ وَالْاِحْصَارُ دونوں کے معنی حج سے روک دینے کے ہیں۔ مگر احصار ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی رکاوٹ کے متعلق بولا جاتا ہے جیسے دشمن کا آڑے آکر روک دینا یا مرض وغیرہ کی وجہ سے رک جانا مگر جب وہ رکاوٹ باطنی اسباب جیسے مرض وغیرہ کی بنا پر ہو تو اس موقع پر حَصْرٌ ہی بولا جاتا ہے۔ پس آیت کریمہ:

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ (۲-۱۹۶) اور اگر (راستے میں) روک لئے جاؤ تو جیسی قربانی میسر ہو (کردو)

میں دونوں قسم کی رکاوٹیں مراد ہیں۔ اسی طرح آیت:

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ اُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ (۲-۲۷۳) ان حاجت مندوں کے لئے جو خدا کی راہ میں رکے بیٹھے ہیں۔ میں بھی احصار کے عام معنی مراد ہیں

اور آیت کریمہ:

اَوْ جَاءُوكُمْ حَصِرَتْ صُدُورُهُمْ (۴-۹۰) یا اس حال میں کہ ان کے دل ..... رک گئے ہوں تمہارے پاس آجائیں۔

یں بخل بزدلی وغیرہ کی وجہ سے سینوں کا تنگ ہونا مراد ہے اور ان کو حصر کے ساتھ تعبیر کرنا ایسے ہی ہے جیسا کہ ان معانی کو ضیق الصدر کے لفظ سے تعبیر کر لیتے ہیں اور ان کے اضداد جود و سخا شجاعت وغیرہ پر الشرح اور السعۃ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

(ح ص ن)

اَلْحِصْنُ (قلعہ) اس کی جمع حُصُونٌ آتی ہے قرآن میں ہے:

مَانِعَتُهُمْ حُصُونُهُمْ مِنَ اللّٰهِ (۵۹-۲) کہ ان کے قلعے ان کو خدا کے عذاب سے بچا لیں گے۔

اور آیت کریمہ:

لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا اِلَّا فِي قُرًى مُحَصَّنَةٍ (۵۹-۱۴) یہ سب جمع ہو کر بھی تم سے (بالمواجہ) نہیں لڑ سکیں گے مگر بستیوں کے قلعوں میں۔

میں مُحَصَّنَةٍ سے مراد وہ بستیاں ہیں جو قلعوں کی طرح محفوظ اور محکم بنائی گئی ہوں۔

تَحَصَّنَ کے اصل معنی تو قلعہ کو مسکن بنا لینا کے ہیں مگر مجازاً ہر قسم کا بچاؤ حاصل کرنے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اسی سے دِرْعٌ حَصِينَةٌ (زرہ محکم) اور فَرَسٌ حِصَانٌ (اسپ نر نجیب) کا محاورہ ہے۔ کیونکہ زرہ بدن کے لئے اور گھوڑا اپنے سوار کے لئے ایک طرح سے بمنزلہ قلعہ کے ہوتا ہے۔ اس بنا پر شاعر نے کہا ہے[1] (الکامل)

---

[1] العجز للاشعر بن حمران الجعفی فاربعدما اخذتا ... ابیہ واتخذ الخیل یذکر فضلها ولد : ولقد علمت علی توقی الردی ... دفی روایۃ الاصمعی علی تجنب الردی" راجع اللسان (حصن) والبیت من الشواہد الکشاف ۲۸ وفی المطبوع من القری والتسدید من المراجع والبیت من کلمۃ اصمعیۃ فی الوحشیات رقم ۸۵ فی ۳۵ بیتا والطبری (۱۲: ۲۴۲) والمحاضرات للمؤلف (۲: ۳۳۹) والحیوان للجاحظ (۱: ۳۴۱) وکتاب الخیل معمر بن المثنی الی ثمانیۃ ابیات وکتاب العرب للقتبی ۳۴۹ ضمن رسائل البلغا (صنعۃ کرد علی)

(۱۱۱) إِنَّ الْحُصُوْنَ الْخَيْلُ لَا مُدُنُ الْقُرٰى
کہ حقیقی قلعے تو نجیب گھوڑے ہیں نہ کہ شہر اور قصبے۔ اور آیت کریمہ:۔
إِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ (۱۲-۴۸) صرف وہی تھوڑا سا رہ جائیگا جو تم احتیاط سے رکھ چھوڑو گے۔
میں تُحْصِنُوْنَ سے مراد یہ ہے کہ جو کچھ قلعے جیسی محفوظ جگہوں میں حفاظت سے رکھ چھوڑو۔
کہا جاتا ہے:۔
اِمْرَأَةٌ حَصَانٌ وَحَاصِنٌ (عفیفہ عورت)
حَصَانٌ کی جمع حُصُنٌ اور حَاصِنٌ کی جمع حَوَاصِنُ آتی ہے اور حَصَانٌ کے معنی پاکدامن یا معزز عورت کے ہوتے ہیں[1]۔ قرآن میں ہے:۔
وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (۲۹-) اور (دوسری) عمران کی بیٹی مریم کی جنہوں نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔
اَحْصَنَتْ وَحَصَنَتْ کے ایک ہی معنی ہیں۔
فَإِذَآ أُحْصِنَّ (۴-۲۵) یعنی جب نکاح کرلیں اور أُحْصِنَّ (مجہول) ہو تو نکاح کردی جائیں۔
اَلْحَصَانُ کے معنی مُحْصَنَۃ عورت کے ہیں خواہ وہ اَحْصَان پاکدامنی کی وجہ سے ہو یا کسی کے ساتھ نکاح کرلینے کی وجہ سے اور یا اپنے شرف اور حریت کی وجہ سے محفوظ ہو اور عورت کو مُحْصِنٌ (بصیغہ فاعل) بھی کہا جاتا ہے اور مُحْصَنٌ (بصیغہ مفعول) بھی اول یعنی صیغہ فاعل اس تصور کی بنا پر ہے کہ وہ خود اپنی ذات کی حفاظت کرتی ہے اور اسم مفعول دوسرے کی جانب سے حفاظت کی وجہ سے ہے اور آیت کریمہ:۔
وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ ... فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (۴-۲۵) اور دستور کے مطابق ان کا مہر بھی ادا کردو۔ بشرطیکہ عفیفہ ہوں نہ ایسی کھلم کھلا بدکاری کریں ... پھر اگر نکاح میں آکر بدکاری کا ارتکاب کر بیٹھیں تو جو سزا آزاد عورتوں (یعنی بیبیوں) کے لئے ہے اس کی آدھی ان کو دی جائے۔
میں اول مُحْصَنٰت سے شوہر والی عورتیں مراد ہیں گویا خاوند ان کی حفاظت کرتے ہیں اور قرآن میں جہاں کہیں بھی مُحْصَنٰت کا لفظ آیا ہے وہاں فتحہ اور کسرہ صاد دونوں طرح پڑھنا صحیح ہے لیکن جہاں حُرِّمَتْ کے بعد آیا ہے وہاں صرف فتحہ صاد کے ساتھ ہی پڑھا جائیگا کیونکہ شوہردار عورتوں کے ساتھ ہی نکاح حرام ہے نہ کہ عفائف کے ساتھ۔

(ح ص ل)

اَلتَّحْصِيْلُ (تفعیل) کے معنی چھلکے سے گودا اور مغز نکالنے کے ہیں مثلاً معدن کے پتھروں سے سونا نکالنا یا بھوسے سے گندم کے دانوں کو الگ الگ کرنا۔ پس آیت کریمہ:۔
وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُوْرِ (۱۰۰-۱۰) کے معنی یہ ہیں کہ جو بھید سینوں میں ہیں وہ اس طرح نکال کر جمع کردیئے جائیں گے جس طرح کہ چھلکے سے مغز الگ کرلیا جاتا ہے۔ یا جیسے حساب کا حاصل ظاہر کیا جاتا ہے اور حُثَالَةٌ (یعنی بھان

[1] وقال حسان فی عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حصان رزان ما تزن بریبۃ وتصبح غرثی من لحوم الغوافل ۱۲

وغیرہ) کو حصیل کہا جاتا ہے۔
حَصَلَ الْفَرَسُ گھوڑے کا حثالہ وغیرہ کھانے کی وجہ سے پیٹ کے درد میں مبتلا ہونا۔ اور پرند کے پوٹے یا سنگدانے کو حَوْصَلَۃُ الطَّیْرِ کہا جاتا ہے۔

(ح ص ی)

اَلْاِحْصَاءُ (افعال) کے معنی عدد کو حاصل کرنا کہا جاتا ہے اَحْصَیْتُ کَذَا میں نے اسے شمار کیا۔ اصل میں یہ لفظ حَصًی (کنکریاں) سے مشتق ہے اور اس سے گننے کا معنی اس لئے لیا گیا ہے کہ عرب لوگ گنتی میں کنکریوں پر اس طرح اعتماد کرتے تھے جس طرح ہم انگلیوں پر کرتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا (۷۲-۲۸) یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو گن رکھا ہے۔ اور اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ایک حدیث میں ہے[1] (۸۵) مَنْ اَحْصَاھَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ کہ جو شخص ان (اسمائے حسنیٰ) کا احصاء کرلیگا (یعنی یاد کرلے گا) وہ جنت میں داخل ہوگا۔ نیز آنحضرت نے فرمایا[2] (۸۶) نَفْسٌ تُنْجِیْھَا خَیْرٌ لَکَ مِنْ اِمَارَۃٍ لَا تُحْصِیْھَا کہ ایک جان کو ہلاکت سے بچالینا اس امارت سے بہتر ہے جسے تم نباہ نہ سکو۔ قرآن میں ہے:۔
عَلِمَ اَنْ لَنْ تُحْصُوْہُ (۷۳-۲۰) اس نے معلوم کیا کہ تم اس کو نباہ نہ سکو گے۔ ایک اور روایت میں ہے[3] (۸۷) اِسْتَقِیْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا کہ سیدھے رہو اور تم پوری طرح استقامت حاصل نہیں کرسکو گے۔
استقامت کے احصاء اور تحصیل کے متعذر اور مشکل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حق صرف ایک ہے اور باطل کی بے شمار قسمیں ہیں بلکہ حق کی مثال بنسبت باطل کے دائرہ کے اجزا میں ایک نقطہ کی ہے یا کسی ہدف میں نشانہ لگانے کی جگہ کی ہو اس لئے اسے حاصل کرنا نہایت کٹھن کام ہے اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت نے فرمایا[4] (۸۸) مجھے سورہ ہود اور اس کی مثل دوسری سورتوں نے بوڑھا کردیا تو صحابہ نے عرض کی کہ ان میں کونسی آیت ہے جس نے آپ کو بوڑھا کردیا تو آنحضرت نے فرمایا وہ آیت:۔
فَاسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ (۱۱-۱۱۲) ہے۔ یعنی جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اس کے مطابق پوری استقامت سے رہو۔
اہل لغت نے یہاں لَنْ تُحْصُوْا کے معنی لَا تُحْصُوْا ثَوَابَہٗ کئے ہیں یعنی تم اس ثواب کو شمار میں نہیں لاسکو گے۔

---

[1] الحدیث متفق علیہ والترمذی عن ابی ہریرۃ وابن عساکر عن عمر وایضا ابن مردویہ وابوالشیخ معًا فی التفسیر وابونعیم فی الاسماء الحسنیٰ راجع کنزالعمال رقم ۴۴-۱۹۱۰-۴ [2] ذکرہ الغزالی فی الاحیاء فی محادثۃ علی بن عبداللہ بن عباس مع ابی جعفر المنصور فقال قد سأل جدک العباس النبی صلی اللہ علیہ وسلم امارۃ مکۃ والطائف فقال صلی اللہ علیہ وسلم یا عباس یا عم النبی . . . اخرجہ ابن ابی الدنیا ہکذا معضلا بغیر اسناد ورواہ البیہقی من حدیث جابر متصلا من روایۃ المنکدر مرسلا وقال ہذا ہو المحفوظ مرسلا راجع تخریج العراقی ۲/۳۰۵ وادب الدنیا للماوردی بشرح خانزادہ ۳۸۲ وفی العقد ۱/۴۴ تحییہا وولایۃ بدل امارۃ وہم ۱۳/۳ فی خطبۃ عبداللہ بن مسعود [3] الحدیث فی ابن ماجہ والحاکم والدارمی والطبرانی فی الصغیر ۲۱۰ والبزار عن ثوبان وفی بعض طرقہ انقطاع الکافی ۹۵ والنہایۃ ۱/۲۲۴-۲۳۵ واللسان (قوم) والفتح الکبیر ۱/۱۸۱ وابن قتیبہ فی غریبہ ۳۸۹ وفی کنزالعمال باستیعابہ ۳/۴۴۳ وایضا تخریج الکشاف للحافظ ۹۵ [4] الحدیث باختلاف الفاظہ فی الترمذی والدارقطنی والدلائل للبیہقی وابن سعد فی الطبقات وابن عدی فی الکامل راجع ایضا فی (۲/۴۵) ۱۲

(ح ض ض)

اَلْحَضُّ (ن) کے معنی حَثٌّ کی طرح کسی کام پر ابھانے اور برانگیختہ کرنے کے ہیں۔ مگر حَثٌّ کا لفظ سواری وغیرہ کو تیز چلانے کے لئے آتا ہے۔ اور حَضٌّ کا لفظ سواری ہانکنے کے علاوہ دوسرے کاموں پر برانگیختہ کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اصل میں حَضٌّ کے معنی جانور کو الحضیض یعنی نشیب زمین کی طرف ہانکنے کے ہیں پھر ابھارنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے، قرآن میں ہے:۔

وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۶۹-۳۴)(۱۰۷-۳)[1]

اور نہ فقیر کے کھانا کھلانے پر آمادہ کرتا تھا۔

(ح ض ب)

اَلْحَضَبُ کے معنی ایندھن کے ہیں اور آگ کریدنے کی لکڑی کو مِحْضَبٌ کہا جاتا ہے اور حَصَبُ جَهَنَّمَ (۲۱-۹۸) میں ایک قرأت حَضَبُ جَهَنَّمَ (دوزخ کا ایندھن) بھی ہے۔

(ح ض ر)

اَلْحَضَرُ یہ البدو کی ضد ہے اور اَلْحَضَارَةُ حاد کو فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ آتا ہے جیسا کہ بَدَاوَةٌ و بِدَاوَةٌ اس کے اصل شہر میں اقامت کے ہیں۔ پھر کسی جگہ پر یا انسان وغیرہ کے پاس موجود ہونے پر حَضَارَةٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔

قرآن میں ہے:۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ (۲-۱۸۰)

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آجائے۔

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ (۴-۸) اور جب تم میراث کی تقسیم کے وقت ... آموجود ہوں۔

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ (۴-۱۲۸) اور طبائع میں بخل ودیعت کر دیا گیا ہے۔

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ (۸۱-۱۴) تب ہر شخص معلوم کرلے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ (۲۳-۹۸) میں کنایہ ہے کہ اے پروردگار میں پناہ مانگتا ہوں کہ جن وشیاطین میرے پاس آحاضر ہوں۔

اور بطور کنایہ مجنون اور قریب المرگ شخص کو مُحْتَضَرٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ آیت:۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰-۱۶)

اور آیت کریمہ:۔ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ میں اس معنی پر متنبہ کیا گیا ہے اور آیت کریمہ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ج (۳-۳۰) کے معنی یہ ہیں کہ انسان جو نیکی بھی کرے گا۔ قیامت کے دن اس کا اس طرح مشاہدہ اور معاینہ کرلے گا جیسا کہ کوئی شخص سامنے موجود ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ (۷-۱۶۳) اور ان سے اس گاؤں کا حال پوچھو جو لب دریا پر واقع تھا۔ میں حَاضِرَةَ الْبَحْرِ کے معنی دریا کے قریب (یعنی ساحل کے ہیں) اور آیت کریمہ:۔

تِجَارَةً حَاضِرَةً (۲-۲۸۲) میں حَاضِرَةً

---

[1] وفی التنزیل: ولا تحاضون علی طعام المسکین (۸۹-۱۸) ÷

کے معنی نقد کے ہیں۔ نیز فرمایا:۔
وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (۳۶-۳۲)
اور سب کے سب ہمارے روبرو حاضر کئے جائیں گے۔
فِي الْعَذَابِ مُحْضَرُوْنَ (۳۰-۱۶) وہ عذاب میں ڈالے جائیں گے۔ اور آیت کریمہ:۔
كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ (۵۴-۲۸) ہر باری والے کو اپنی باری پر آنا چاہیے۔ میں پانی کی باری کے محتضر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ باری والے اس گھاٹ پر موجود ہوں۔
اَلْحُضْرُ۔ خاص کر گھوڑے کی تیز دوڑ کو کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔ اَحْضَرَ الْفَرَسُ گھوڑا تیز دوڑا۔ اِسْتَحْضَرْتُ الْفَرَسَ میں نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا۔ حَاضَرْتُهُ مُحَاضَرَةً وَحِضَارًا باہم جھگڑنا۔ مباحثہ کرنا۔ یہ یا تو حضور سے ہے گویا ہر فریق اپنی دلیل حاضر کرتا ہے اور یا حُضْر سے ہے جس کے معنی تیز دوڑ کے ہوتے ہیں جیسا کہ... جَارَيْتُهُ کہا جاتا ہے۔
اَلْحَضِيْرَةُ لوگوں کی جماعت جو جنگ میں حاضر کی جائے اور کبھی اس سے پانی پر حاضر ہونے والے لوگ بھی مراد لئے جاتے ہیں۔ اَلْمَحْضَرُ (اسم مکان) حاضر ہونے کی جگہ اور حَضَرْتُ (فعل) کا مصدر بھی بن سکتا ہے۔

(ح ط ط)

اَلْحَطُّ (ن) کے معنی کسی چیز کو اوپر سے نیچے اتارنے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے حَطَطْتُ الرَّحْلَ (میں نے سواری سے پالان اتار کر نیچے رکھ دیا) جَارِيَةٌ مَّحْطُوْطَةُ الْمَتْنِ (دختر نیست شکم کہ پشت وی دراز و ہموار باشد) اور آیت کریمہ: وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ اور حطة کہنا (۲-۵۸) میں بنی اسرائیل کو یہ کلمہ کہنے کا حکم دیا گیا تھا جس کے معنی ہیں اے اللہ ہمارے گناہ ہم سے اتار دے[1] بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی قُوْلُوْا صَوَابًا کے ہیں یعنی صحیح بات کہنا۔

(ح ط ب)

اَلْحَطَبُ (ایندھن) ہر وہ چیز جو آگ جلانے کے لئے تیار کی جائے حَطَبٌ کہلاتی ہے اور حَطَبَ (ض) حَطْبًا و اِحْتَطَبَ کے معنی ایندھن جمع کرنا کے ہیں۔ قرآن میں فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (۷۲-۱۵) تو وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔
اپنی گفتگو میں رطب و یابس ملانے والے کو حَاطِبُ لَيْلٍ کہا جاتا ہے کیونکہ رات کو لکڑی جمع کرنے والا بھی یہ نہیں دیکھتا کہ رسی میں کیا باندھ رہا ہے۔
حَطَبْتُ لِفُلَانٍ حَطْبًا کسی کے لئے کام کرنا۔ مَكَانٌ حَطِيْبٌ وہ جگہ جہاں بہت لکڑیاں ہوں (صفت از حَطِبَ الْمَكَانُ)
نَاقَةٌ مُحَاطِبَةٌ (ناقہ کہ خار خشک خورد)
اور آیت کریمہ:۔ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ (۱۱۱-۴) جو ایندھن سر پر اٹھائے پھرتی ہے۔ میں سخن چینی سے استعارہ ہے۔ اور حَطَبَ فُلَانٌ بِفُلَانٍ کے معنی کسی کی چغلی کھانا کے ہیں۔

---

[1] وہی مصدر من حط عنا ذنوبنا رفع حکایۃ راجع الطبری (۱-۲۳۰) و مجاز ابی عبیدۃ (۱:۱۴) و فتح الباری

۱۲ : ۲۲۹/۸

اسی طرح کہا جاتا ہے فُلَانٌ یُوْقِدُ بِالْحَطَبِ الْجَزْلِ (مثل) فلاں بہت بڑا چغل خور ہے۔

(ح ط م)

اَلْحَطْمُ کے اصل معنی کسی چیز کو توڑنے کے ہیں جیسا کہ اَلْهَشِيْمُ وغیرہ الفاظ اسی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ پھر کسی چیز کو ریزہ ریزہ کر دینے اور روندنے پر حَطْم کا لفظ بولا جاتا ہے۔

قرآن میں ہے۔

لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُوْدُهٗ (۲۷-۱۸) ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تم کو کچل ڈالیں۔

کہا جاتا ہے حَطَمْتُهٗ فَانْحَطَمَ (میں نے اسے توڑا چنانچہ وہ چیز ٹوٹ گئی)

سَائِقٌ حُطَمٌ بے رحم چرواہا۔ جو اونٹوں کو سخت ہنکا کر ان پر ظلم کرے[1] اور دوزخ کو حُطَمَة کہا گیا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فِي الْحُطَمَةِ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ (۱۰۴-۴،۵) حطمہ میں ... اور تم کیا سمجھے کہ حُطَمَہ کیا ہے۔

اور تشبیہ کے طور پر بہت زیادہ کھانے والے کو بھی حُطَمَةٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ شاعر نے پیٹ کو تنور کے ساتھ تشبیہ دی ہے[2] ع (   )

(   ) كَأَنَّمَا فِي جَوْفِهٖ تَنُّوْرٌ

گویا اس کے پیٹ میں تنور ہے۔

دِرْعٌ حُطَمِيَّةٌ زرہ بننے والے یا استعمال کرنے والے کی طرف منسوب ہے اور حَطِيْم وَزَمْزَم (حرم میں) دو جگہوں کے نام ہیں۔

اَلْحُطَامُ جو خشک ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔

قرآن میں ہے :۔

ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا (۳۹-۲۱) پھر وہ خشک ہو جاتی ہے تو تم اس کو دیکھتے ہو کہ زرد ہو گئی ہے پھر اسے چورا چورا کر دیتا ہے۔

(ح ظ ظ)

اَلْحَظُّ کے معنی معین حصہ کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ حَظِظَ وَاَحَظَّ فَهُوَ مَحْظُوْظٌ

حَظٌّ کی جمع اَحَاظٍ وَاَحُظٌّ آتی ہے قرآن میں ہے۔

فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ مگر انہوں نے بھی اس نصیحت کا جو ان کو کی گئی تھی ایک حصہ فراموش کر دیا (۵-۱۴)

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ (۴-۱۱) کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔

(ح ظ ر)

اَلْحَظْرُ (ن) کے معنی کسی چیز کو حَظِيْرَه یعنی احاطہ میں جمع کرنے کے ہیں اور ممنوع کو مَحْظُوْر کہا جاتا ہے۔ اَلْمُحْتَظِرُ باڑہ بنانے والا۔ قرآن میں ہے :۔

فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ (۵۴-۳۱) تو وہ ایسے ہو گئے جیسے باڑ والے کی سوکھی اور ٹوٹی ہوئی باڑ۔

جَاءَ فُلَانٌ بِالْحَظِرِ الرَّطْبِ (مثل) یعنی اس نے بہت قبیح جھوٹ بولا۔

---

[1] ومنہ الحدیث شر الرعاء الحطمة وفی روایۃ بغیر ھاء (النہایہ) [2] لم اجدہ

(ح ف ف)

(الحَفُّ) (ن) کے معنی کسی چیز کو صافتین یعنی دونوں جانب سے گھیرنے یا احاطہ کرنے کے ہیں، قرآن میں ہے:۔

وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ (۱۸-۳۲) اور ان کے گردا گرد کھجوروں کے درخت لگا دیئے تھے۔

وَتَرَى الْمَلٰئِكَةَ حَافِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ (۳۹-۷۵) اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔

یعنی اس کے دونوں جانب کو گھیرے ہوئے ہیں ایک حدیث میں ہے[1]:۔ (۸۹)

تَحُفُّهُ الْمَلَائِكَةُ بِاَجْنِحَتِهَا اسکو فرشتے اس پر اپنے پروں کے ساتھ گھیرا ڈال لیتے ہیں

شاعر نے کہا ہے[2] ع (طویل)

(۱۱۳) لَهُ لَحَظَاتٌ فِي حَفَافَيْ سَرِيْرِهِ

اس کی نظریں اس کے تخت کے دونوں جانب لگی رہتی ہیں۔

حَفَافٌ کی جمع اَحِفَّةٌ ہے۔ کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ فِي حَفَفٍ مِنَ الْعَيْشِ یعنی تنگ حال ہے[3]۔ گویا وہ خوشحالی سے ایک جانب میں ہے۔

اس کے برعکس خوشحالی کے لئے کہا جاتا ہے۔

هُوَ فِي قَرَاسِطَةٍ مِنَ الْعَيْشِ اسی سے محاورہ ہے[4] (مثل)

مَنْ حَفَّنَا اَوْرَفَّنَا فَلْيَقْتَصِدْ - یعنی جو شخص ہماری تعریف کرے اسے چاہیئے کہ درمیانہ روی سے کام لے (نہایہ)

حَفِيْفُ الشَّجَرِ وَالْجَنَاحِ درخت کے ہلنے یا پرندکے پروں کی سرسراہٹ۔ یہ حکایت صوت ہے۔

اَلْمِحَفَّةُ شادی باندہ زیغ آں (کیونکہ اس سے حرکت کے وقت آواز آتی ہے۔

(ح ف د)

اَلْحَافِدُ - ہر اس شخص کو کہتے ہیں جو تبرعًا تیزی کے ساتھ خدمت بجا لائے خواہ وہ اجنبی ہو یا رشتہ دار۔ اسی کی جمع حَفَدَةٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً (۱۶-۷۲) اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے۔

مفسرین کا قول ہے کہ یہاں حَفَدَةٌ سے

---

[1] الحدیث باختلاف الفاظ فی فضیلۃ مجلس الذکر عن ابی ہریرۃ وغیرہ رواہ مسلم والغزالی فی الاحیاء راجع تخریج العراقی ۱/ ۳۰۲ ونہایۃ ابن الاثیر ۱/ ۴۰۸ [2] قالہ ابراہیم بن ہرمۃ فی مدیح المنصور واجازہ بہ عشرۃ آلاف کما فی ذیل الامالی (۴۸) وتمامہ: .... اذا کر فیہا عقاب ونائل۔ راجع للبیت الحیوان (۳/ ۱۳۴) والاغانی ۴/ ۱۰۹) وعیون الاخبار (۱/ ۲۹) وفی روایتہم جمیعًا عن حفافی وفی العقد (۴: ۳۲۹) عن حفافی سریرہ وفی العمدۃ (۲: ۱۰۹) عن خفافی وفی الحصری (۲: ۲۶۲) من بدل عن وفی العقد (۱: ۳۷۰) عذاب بدل عقاب ولبعدہ: قام الذی امنت آمنۃ الرَّدٰی — دام الذی اوعدت بالشکل تاکل وفی روایۃ حاولت والبیت فی البحر (۷: ۲۷۴) من غیرعزو [3] ومنہ الحدیث انہ علیہ السلام لم یشبع من طعام الاعلٰی حفف ای ضیق وقلۃ (نہایہ ۱/ ۴۰۸) [4] مثل وفی روایۃ فلیترک راجع للمثل المیدانی ۲/ ۱۷۶، ۱۲۲۱، ۲۲۲ والعسکری ۱۸۴، ۲/ ۱۹۱ وشرح الدرۃ للخفاجی ۸۳۔

مراد اَسْبَاط یعنی پوتے نواسے وغیرہم ہیں۔ کیونکہ ان کی خدمت زیادہ سچی ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الکامل)

(۱۱۴) "حَفَدَ الْوَلَائِدُ بَیْنَهُنَّ"

فُلَانٌ مَحْفُوْدٌ فلاں مخدوم ہے۔

الغرض حَفَدَةٌ کا اطلاق سسرال اولاد دونوں طرف کے رشتہ دار دل پر ہوتا ہے۔ اور دعا میں ہے[2]۔ اِلَیْكَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ ہم تیری طرف دوڑتے ہیں۔

سَیْفٌ مُحْتَفِدٌ قاطع تلوار۔

اصمعی کہتے ہیں کہ اصل میں حَفْدٌ کے معنی پھرتی اور جلدی کرنا کے ہیں۔

(ح ف ر)

اَلْحَفْرُ۔ وہ مٹی جو گڑھے سے نکالی جاتی ہے (یہ اسم مفعول کے معنی میں ہے) جیسا کہ نَقْضٌ بمعنی منقوض آجاتا ہے۔

اَلْحُفْرَةُ وَالْحَفِیْرَةُ گڑھا۔ قرآن میں ہے:۔ وَكُنْتُمْ عَلٰی شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ (۳-۱۰۲) اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ چکے تھے۔

اَلْمِحْفَارُ وَالْمِحْفَرُ وَالْمِحْفَرَةُ بیلچہ وغیرہ جس سے گڑھا کھودا جاتا ہے اور تشبیہ کے طور پر گھوڑے کے سم کو حَافِرٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ دوڑتے وقت اپنے سم سے مٹی اڑاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اَئِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَةِ (۷۹-۱۰) کیا ہم الٹے پاؤں پھر لوٹیں گے؟۔

میں مَرْدُوْدٌ فِی الْحَافِرَةِ۔ ایک مثل ہے اور یہ اس شخص کے حق میں بولتے ہیں جو جدھر سے آئے اسی طرف لوٹا دیا جائے ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم مرنے کے بعد پھر زندہ ہوں گے۔ بعض نے کہا ہے کہ حَافِرَةٌ سے مراد وہ زمین ہے جس میں ان کی قبریں بنائی گئی تھیں اور حَافِرَةٌ یہاں موضع حال میں ہے اور معنی یہ ہیں کہ کیا ہم لوٹائے جائیں گے اس حال میں کہ قبروں میں ہوں گے۔ محاورہ ہے۔ رَجَعَ عَلٰی حَافِرَتِهٖ اَوْ رَجَعَ الشَّیْخُ اِلٰی حَافِرَتِهٖ یعنی بوڑھا ہوگیا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے: وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰی اَرْذَلِ الْعُمُرِ (۱۶-۷۰) آیا ہے۔

اور جو چیز نقد فروخت کی جائے اس کے متعلق عرب لوگ کہتے ہیں[3] (مثل) اَلنَّقْدُ عِنْدَ الْحَافِرَةِ۔ اور اصل میں یہ گھوڑے کی بیع کے متعلق بولا جاتا ہے۔ جیسے:۔ لَا یَزُوْلُ حَافِرُهٗ اَوْ یُنْقَدَ ثَمَنُهٗ کہ اس

---

[1] تکملۃ البیت: ۔۔۔۔۔ واُسلمت بأکفهن ازمۃ الاجمال۔ البیت من شواہد ابی عبیدۃ فی مجازہ (۱: ۳۶۴) ونسبہ لجمیل بن عبداللہ العذری والبیت فی الطبری (۱۴: ۱۴۴-۱۴۶) واللسان والتاج (حفد) والانصاف (۷، ۹) والبحر المحیط (۵: ۵۰۰) بغیر عزو والجمہرۃ (۲: ۱۲۳) والقرطبی (۱۰: ۱۴۳) ونسبہ ابن درید الی الفرزدق و مسائل نافع بن الازرق (ترتیب فؤاد عبدالباقی) قال محقق ولا ادری کیف اضبطہ و جمیل ہو جمیل بن عبداللہ الی الثنی العذری من شعراء الدولۃ الامویۃ لہ ترجمۃ فی الشعراء والاغانی (۷: ۷۲) والخزانۃ (۱: ۱۹۰) وغریب ابی عبید (۳، ۴۲۳) ونسبہ الی الاخطل ولیس فی دیوانہ [2] اسکے کلمۃ من دعاء القنوت فی الوتر راجع غریب القرآن للقتبی ۲۴۷ واللسان (حفد) والطبری ج ۱۴ وسنعید التخریجہ فی (قنت) وہناک المصادر ان شاء اللہ [3] کذا فی الالی (۱: ۱۲۱) والثعالبی (۱: ۲۶-۲۷) وفی مجالس ثعلب فقال عند السبق ای عند اول یقع الفرس رجلہ اذا استبق راجع المیدانی ۲، ۲۶۴ نقلاً عن ثعلب وتبعا لصاحب اللسان فی شرحہ (حفد) ۱۲

کا اسم یہاں سے جدا نہیں ہوگا جب تک کہ اس کی قیمت نقدادا نہ کی جائے۔
اَلْحَفَرُ تَاکُلُ الْاَسْنَانَ دانتوں کی زردی ان کو کھا جاتی ہے۔
حُفِرَ فُوْہٗ حَفَرًا اس کے دانت خراب ہوگئے
اَحْفَرَ الْمُھْرُ بچھڑے کے ثنائی یا رباعی دانت گر گئے

(ح ف ظ)

اَلْحِفْظُ کا لفظ کبھی تو نفس کی اس ہیئت (یعنی قوت حافظہ) پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعہ جو چیز سمجھ میں آئے وہ محفوظ رہتی ہے اور کبھی دل میں یاد رکھنے کو حفظ کہا جاتا ہے۔ اس کی ضد نسیان ہے، اور کبھی قوت حافظہ کے استعمال پر یہ لفظ بولا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے۔
حَفِظْتُ کَذَا حِفْظًا یعنی میں نے فلاں بات یاد کر لی۔ پھر ہر قسم کی جستجو نگہداشت اور نگرانی پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ (۱۵-۹) اور ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔
حَافِظُوْا عَلَی الصَّلٰوۃِ (۲-۲۳۸) سب نمازیں... پورے التزام کے ساتھ ادا کرتے رہو۔
وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حَافِظُوْنَ (۲۳-۵) اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔
اور آیت کریمہ:۔
وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحَافِظَاتِ (۳۳-۳۵) اور اپنے ستر کی حفاظت کرنیوالے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں۔ .. میں حفظ فرج عفت اور پاکدامنی ... سے کنایہ ہے۔

اور آیت کریمہ:۔
حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ اور ان کے پیٹھ پیچھے خدا کی حفاظت میں (مال و آبرو کی) خبرداری کرتی ہیں (۴-۳۴) کے معنی یہ ہیں کہ اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں ان کے عہد کی حفاظت کرتی ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ ان کی حفاظت کی جائے[1]۔ اور ایک قرأت میں حَفِظَ اللّٰہَ اللہ پر نصب کے ساتھ ہے اس وقت معنی یہ ہوں گے کہ وہ اللہ کے حق کی نگہبانی کے لئے حفاظت کرتی ہیں نہ کہ کسی قسم کی ریاکاری اور تصنع کے طور پر۔ اور آیت کریمہ:۔
وَمَا اَرْسَلْنٰکَ عَلَیْھِمْ حَفِیْظًا (۴-۸۰) تو اے پیغمبر تمہیں ہم نے ان کا نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔ میں حفیظ بمعنی حافظ یعنی نگہبان کے ہیں جیسا کہ:۔ وَمَا اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِجَبَّارٍ (۵۰-۴۵) اور وَمَا اَنْتَ بِوَکِیْلٍ (۶-۱۰۸) میں فَعَّال اور فَعِیْل بمعنی فَاعِلٌ ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
فَاللّٰہُ خَیْرٌ حَافِظًا (۱۲-۶۴) تو خدا ہی بہتر نگہبان ہے۔
میں ایک قراءت حِفْظًا ہے یعنی اس کی حفاظت دوسروں سے بہتر ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَعِنْدَنَا کِتَابٌ حَفِیْظٌ (۵۰-۴) اور ہمارے پاس تحریری یادداشت بھی ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ کتاب ان کے اعمال کی حفاظت کرنے والی ہے تو یہاں بھی حفیظ بمعنی حافظ ہے جیسا کہ اَللّٰہُ حَفِیْظٌ عَلَیْھِمْ (۴۲-۶) میں ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حفیظ بمعنی محفوظ ہو یعنی وہ کتاب ضائع نہیں ہوگی۔

---

[1] ای فی صورتہن والتزام ازواجہن النفقۃ علیہن قالہ الزجاج (الطبری ۵/۹۵)

جیسے فرمایا:۔
عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى .... (۲۰-۵۲)
اَلْمُحَافَظَةُ وَ الْحِفَاظُ (مفاعلہ) ایک دوسرے کی حفاظت کرنا اور آیت کریمہ:۔
وَالَّذِيْنَ عَلٰى صَلٰوتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ (۷۰-۳۴)
اپنی نماز کی خبر رکھتے ہیں۔
میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ وہ نمازوں کے اوقات اور اس کے ارکان کی حفاظت کرتے ہیں اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کی پابندی کرتے ہیں۔ اور نماز ان کی حفاظت کرتی ہے۔ یعنی وہ انہیں بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے جیسے فرمایا:۔
اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ (۲۹-۴۵) کچھ شک نہیں کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔
اَلتَّحَفُّظُ (تفعل) بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی عقل کی کمی کے ہیں اور اصل میں اس کے معنی قوت حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے تکلف سے کسی چیز کو یاد کرنے کے ہیں۔ اور قوت حافظہ چونکہ اسباب عقل سے ہے اس لئے اس کی تفسیر میں لوگوں نے وسعت سے کام لیا ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔
اَلْحَفِيْظَةُ کے اصل معنی عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے غصہ اور حمیت سے کام لینے کے ہیں۔ پھر یہ لفظ محض غصہ کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے کہا جاتا ہے۔
اَحْفَظَنِيْ فُلَانٌ۔ یعنی فلاں نے مجھے غصہ دلایا۔

(ح ف و)

اَلْاِحْفَاءُ کے معنی کسی چیز کے مانگنے میں اصرار کرنے یا کسی کی حالت دریافت کرنے کے لئے بحث اور کاوش میں لگے رہنے کے ہیں پہلے معنی کے لحاظ سے اَحْفَيْتُ السُّؤَالَ وَ اَحْفَيْتُ فُلَانًا فِي السُّؤَالِ دونوں طرح کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِنْ يَّسْئَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا (۴۷-۳۷)
اگر وہ تم سے مال طلب کرے اور تمہیں تنگ کرے تو تم بخل کرنے لگو۔
اصل میں یہ اَحْفَيْتُ الدَّابَّةَ (راسے سادہ گردانیدم یا پائے ستور را) سے ہے۔ جس کے معنی گھوڑے یا اونٹ کو زیادہ چلا کر اس کے سم یا پاؤں کو گھسا ہوا کر دینے کے ہیں۔ احد حفا حَفًا وَحَفْوَةً کے معنی زیادہ چلنے سے پاؤں کے چھل جانے کے ہیں۔ اسی سے اَحْفَيْتُ الشَّارِبَ (نیک برید بروت را) ہے جس کے موچھوں کو اچھی طرح کاٹ کر صاف کر دینے کے ہیں۔
اَلْحَفِيُّ۔ نیکوکار اور نہایت مہربان۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا (۱۹-۴۷) بے شک وہ مجھ پر نہایت مہربان ہے۔
کہا جاتا ہے اَحْفَيْتُ بِفُلَانٍ وَتَحَفَّيْتُ بِهٖ میں نے اس کے اعزاز و اکرام کے بجا لانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔
اَلْحَفِيُّ (ایضًا) کسی چیز کا اچھی طرح جاننے والا۔[1]

---

[1] وفی التنزیل یَسْئَلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا (۷-۱۸۷) ای کانک عالم بہا۔

(ح ق ق)

اَلْحَقُّ (حق) کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ جیسا کہ دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ استقامت کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے اور لفظ "حق" کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) وہ ذات جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق اشیاء کو ایجاد کرے۔ اسی معنی میں باری تعالیٰ پر حق کا لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ (۶-۶۲) پھر (قیامت کے دن تمام) لوگ اپنے مالک برحق خدا تعالیٰ کے پاس واپس بلائے جائیں گے۔

نیز فرمایا:۔
فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (۱۰-۳۲) یہی خدا تو تمہارا پروردگار برحق ہے اور حق بات کے ظاہر ہونے کے بعد گمراہی کے سوا ہے ہی کیا؟ تو تم کہاں پھرے جاتے ہو۔

(۲) ہر وہ چیز جو مقتضائے حکمت کے مطابق پیدا کی گئی ہو۔ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر فعل حق ہے۔ قرآن میں ہے:۔
هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاۗءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ ..... مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ (۱۰-۵) وہی تو ہے جس نے سورج کو روشن اور چاند کو منور بنایا اور اس کی منزلیں مقرر کیں ..... یہ سب کچھ خدا نے تدبیر سے پیدا کیا ہے۔

اور قیامت کے متعلق فرمایا:۔
وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ۭ قُلْ اِيْ وَرَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ (۱۰-۵۳) اور تم سے دریافت کرتے ہیں کہ آیا یہ سچ ہے کہہ دو ہاں خدا کی قسم سچ ہے
وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ (۳-۷۱) اور حق کو کیوں چھپاتے ہو۔ نیز فرمایا:۔
اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (۳-۶۰) (یہ بات) تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے۔
وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (۲-۱۴۹) بے شبہ وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے۔

(۳) کسی چیز کے بارے میں اسی طرح کا اعتقاد رکھنا جیسا کہ وہ نفس واقع میں ہے چنانچہ ہم کہتے ہیں۔ کہ بعث ثواب وعقاب اور جنت و دوزخ کے متعلق فلاں کا اعتقاد حق ہے۔

قرآن میں ہے:
فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ (۲-۲۱۳) تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھا دی۔

(۴) وہ قول یا عمل جو اسی طرح واقع ہو جس طرح پر کہ اس کا ہونا ضروری ہے اور اسی مقدار اور اسی وقت میں ہو جس مقدار میں اور جس وقت اس کا ہونا واجب ہے چنانچہ اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ کہ تمہاری بات یا تمہارا فعل حق ہے۔

قرآن میں ہے:
كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ (۱۰-۳۳) اسی طرح خدا کا ارشاد ..... ثابت ہو کر رہا۔
حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ (۳۲-۱۳) میری طرف سے یہ بات قرار پاچکی ہے کہ میں دوزخ کو ..... بھر دوں گا۔

اور آیت کریمہ:۔
وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَهُمْ (۲۳-۷۱) اور اگر (خدائے) برحق ان کی خواہشوں پر چلے۔
میں الحق سے مراد ذات باری تعالیٰ بھی ہو سکتی ہے اور وہ حکم بھی ہو سکتا ہے۔ جو حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ کہا جاتا ہے۔
اَحْقَقْتُ كَذَا میں نے اس کا حق ہونا ثابت کر دیا یا اس پر حق ہونے کا حکم لگایا۔ اور آیت کریمہ:۔
لِيُحِقَّ الْحَقَّ (۸-۸) تاکہ سچ کو سچ کر دے۔
پس احقاقِ حق دو طرح ہو سکتا ہے (۱) اولہ اور آیات کے اظہار سے جیسے فرمایا:۔ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا (۴-۹۱)
یعنی ہم نے تمہیں ان پر حجت تو یہ عطا فرمائی (۲) شریعت حقہ کی تکمیل اور لوگوں میں اس کی نشر و اشاعت کے ذریعہ جیسے فرمایا:۔
وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۶۱-۸)
حالانکہ خدا اپنی روشنی کو پورا کر کے رہے گا خواہ کافر ناخوش ہی ہوں۔
هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۶۱-۹)
وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے اور سب دینوں پر غالب کرے۔ اور آیت کریمہ:۔
اَلْحَآقَّةُ مَا الْحَآقَّةُ (۶۹-۱، ۲) سچ مچ ہونے والی، وہ سچ مچ ہونے والی کیا ہے۔
میں قیامت کی طرف اشارہ ہے۔ جیسا کہ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ سے اس کی تفسیر کی گئی ہے۔ اور قیامت کو حاقۃ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں جزائے اعمال واقع ہوگی۔
کہا جاتا ہے:۔ حَاقَقْتُهٗ فَحَقَقْتُهٗ میں نے حق کے متعلق اس سے جھگڑا کیا اور اس پر غالب رہا۔
حضرت عمرؓ کا فرمان ہے[1]۔ (۹۰)
"اِذَا النِّسَاءُ بَلَغْنَ نَصَّ الْحِقَاقِ فَالْعَصَبَةُ اَوْلٰى فِيْ ذٰلِكَ" جب عورتیں بالغ ہو جائیں تو عصبہ زیادہ حقدار ہیں۔
فُلَانٌ نَزِقُ الْحِقَاقِ فلاں معمولی باتوں میں جھگڑا کرتا ہے اور کبھی لفظ حق واجب، لازم اور لائق کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۳۰-۴۷)
اور مومنوں کی مدد ہم پر لازم تھی۔
كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۰-۱۰۳)
اسی طرح ہمارا ذمہ ہے کہ مسلمانوں کو نجات دیں۔
اور آیت کریمہ:۔
حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۔۔۔۔۔ (۷-۱۰۵) مجھ پر واجب ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ کہوں سچ ہی کہوں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ حقیق بمعنی جدیر (یعنی سزاوار) ہے اور بعض نے بمعنی واجب لکھا ہے ایک قرأت میں حَقِيْقٌ عَلَيَّ بھی ہے نیز فرمایا:۔
وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ (۲-۲۲۸)
اور ان کے خاوند۔۔۔۔ (اس مدت) میں ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں۔

---

[1] کذا نسبہ المؤلف الی عمرؓ والذی فی اللسان ومختار الصحاح للرازی ۸ ۲۹ وغریب ابی عبید ۳/۲ ۵۷ ۴ والفائق ۱/۲۷۶ والنہایۃ (حق) انہ من قول علیؓ وفی روایۃ نص الحقائق والمراد بنص الحقاق الادرک یعنی ما دامت الجاریۃ صغیرۃ فامہا اولیٰ بہا فاذا بلغت فالعصبۃ اولیٰ من امہا انظر ایضاً کنز العمال ۱۱ رقم ۱۶۵ ÷

اور اَلْحَقِیْقَۃُ کا لفظ کبھی اس چیز کے بارے میں استعمال ہوتا ہے جیسے ثبات اور وجود حاصل ہو جیسے آنحضرتؐ نے حارثہؓ سے پوچھا تھا (۹۱) کہ لِکُلِّ حَقٍّ حَقِیْقَۃٌ فَمَا حَقِیْقَۃُ اِیْمَانِکَ[1] کہ ہر حق چیز کی کوئی نہ کوئی حقیقت ہوتی ہے۔ تو تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے یعنی یہ کیسے معلوم ہو کہ جس چیز کے تم مدعی ہو وہ حق ہے۔ فُلَانٌ یَحْمِیْ حَقِیْقَتَہٗ یعنی وہ اس چیز کی حفاظت کرتا ہے جس کی حفاظت اس پر واجب ہے۔ کبھی حَقِیْقَۃٌ کا لفظ اعتقاد کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اور کبھی عمل اور قول کے متعلق جیسے کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ لِفِعْلِہٖ حَقِیْقَۃٌ فلاں کا فعل صحیح ہے یعنی وہ ریاکار نہیں ہے۔ وَلِقَوْلِہٖ حَقِیْقَۃٌ یعنی وہ نہ رخصت پر عمل کر رہا ہے اور نہ زیادتی سے کام لے رہا ہے۔ اس کے برعکس معنی میں مُتَجَوِّز، مُتَوَسِّعٌ یا مُتَفَسِّح وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ کہا گیا ہے۔ اَلدُّنْیَا بَاطِلٌ وَالْاٰخِرَۃُ حَقِیْقَۃٌ کہ دنیا فانی ہے اور بقا صرف آخرت کو ہے۔

فقہا اور متکلمین کے نزدیک حقیقت کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی لفظ اصل لغت کے لحاظ سے اپنے معنی موضوع لہ میں استعمال ہو۔

اَلْحِقُّ وہ اونٹ جو باربرداری کے قابل ہو جائے مؤنث حِقَّۃٌ ج حِقَاقٌ اور کہا جاتا ہے۔ أَتَتِ النَّاقَۃُ عَلٰی حِقِّھَا یعنی وہ وقت آ گیا ہے جس میں گزشتہ سال اس پر اونٹ بٹھایا گیا تھا۔

(ح ق ب)

قرآن میں ہے:۔ لٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا ج (۷۸-۲۳) اس میں وہ مدتوں پڑے رہیں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ اَحْقَاب کا واحد حُقُبٌ ہے جس کے معنی زمانہ کے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ حِقْبَۃٌ کا لفظ اسی سال کی مدت پر بولا جاتا ہے[2] اس کی جمع حِقَبٌ آتی ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ مدت غیر معینہ پر بولا جاتا ہے۔

اَلْاِحْتِقَابُ (افتعال) سوار کا اپنے پیچھے حقیبہ یعنی سامان سفر کا تھیلا باندھنا چنانچہ کہا جاتا ہے۔ اِحْتَقَبَہٗ وَاسْتَحْقَبَہٗ اس نے اسے پالان کے پیچھے باندھ لیا۔ حَقِبَ الْبَعِیْرُ شتر کے غلاف نرہ میں اس کے تنگ کے داخل ہونے کی وجہ سے پیشاب کا رک جانا یا تکلیف سے آنا۔

اَلْاَحْقَبُ سرخ رنگ کا گورخر بعض نے کہا ہے کہ احقب اس گورخر کو کہتے ہیں جس کے دونوں پہلو باریک ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ سفید پہلوؤں والے گورخر کو کہا جاتا ہے اس کا مؤنث حَقْبَاءُ ہے۔

(ح ق ف)

اَلْحِقْفُ منحنی تودہ ریت اس کی جمع اَحْقَافٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَہٗ بِالْاَحْقَافِ (۴۶-۲۱) کہ جب

---

[1] وفی تاریخ الطبری قال شیخ من بنی عامر لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکل قول حقیقۃ فانبئنی بحقیقۃ قولک و بدء امرک (۱: ۵۰۷)۔ [2] روی ذالک عن ابن عمرو ابی ہریرۃ وعن الحسن انہ سبعون سنۃ وقال الفراء انہ سنۃ بلغۃ قریش (راجع التاج)۔

انہوں نے اپنی قوم کو سرزمین احقاف میں ہدایت کی۔
ظَبْيٌ حَاقِفٌ وہ ہرن جو ریت کے تودوں میں رہتا ہو
احقوقف ۔ مائل ہو کر ریت کے تودہ کی طرح ہو جانا شاعر نے کہا ہے[1] ع (رجز)

(۱۱۵) سَمَاوَةُ الْهِلَالِ حَتَّى احْقَوْقَفَا

چاند کو راتیں تاریک بنا کر کم کرتی رہتی ہیں حتیٰ کہ وہ کمان کی طرح خمیدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔

(ح ک م)

حَكَمَ کے اصل معنی کسی چیز کی اصلاح کے لئے اسے روک دینے کے ہیں۔ اسی بنا پر لگام کو حَكَمَةُ الدَّابَّةِ کہا جاتا ہے (کیونکہ وہ اسے قابو میں رکھتا ہے) کہا جاتا ہے۔ حَكَمْتُ الدَّابَّةَ میں نے اسے لگام دی ۔ اسی طرح حَكَمْتُ السَّفِيْنَةَ وَاَحْكَمْتُهَا بھی کہا جاتا ہے۔
شاعر نے کہا ہے[2] (الوافر)

(۱۱۶) اَبَنِي حَنِيْفَةَ اَحْكِمُوْا سُفَهَاءَكُمْ

اے بنی حنیفہ اپنے سفہاء کے منہ میں لگام دو۔

قرآن میں ہے

اَحْكَمَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ جس نے ہر چیز کو اچھی طرح بنایا (یعنی) پیدا کیا۔

فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيَاتِهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (۲۲-۵۲) تو جو (وسوسہ) شیطان ڈالتا ہے خدا اس کو دور کر دیتا ہے پھر خدا اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیتا ہے۔

اَلْحُكْمُ کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے کا نام حکم ہے یعنی وہ اس طرح ہے یا اس طرح نہیں ہے خواہ وہ فیصلہ دوسرے پر لازم کر دیا جائے یا لازم نہ کیا جائے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (۴-۵۸) اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔

يَحْكُمُ بِهِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ (۵-۹۵) جیسے تم میں سے دو معتبر شخص مقرر کر دیں۔
شاعر نے کہا ہے[3] ع (البسیط)

(۱۱۷) فَاحْكُمْ كَحُكْمِ فَتَاةِ الْحَيِّ اِذْ نَظَرَتْ
اِلٰى حَمَامٍ سِرَاعٍ وَارِدِ الثَّمَدِ

اس نوجوان عورت کی طرح عدل و انصاف سے فیصلہ کر جس نے پانی پر وارد ہونے والی کبوتروں کی ٹکڑی کو دیکھ کر ان کی صحیح تعداد بتا دی تھی) اور بعض نے اس کے معنی کن حکیما کے ہیں نیز فرمایا۔
اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (۵-۵۰) کیا یہ زمانہ جاہلیت کے حکم کے خواہاں ہیں۔ اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لئے خدا سے اچھا حکم کس کا ہے؟
اور جو لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے اسے حَاكِمٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع حُكَّامٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ (۲-۱۸۸) اور نہ اس کو

---

[1] قالہ العجاج راجع لتخریجہ (زلف) [2] قالہ جریر وتمامہ ...... انی اخاف علیکم ان اغضبا۔ راجع للبیت البحر المحیط (۵: ۲۰۰- ۴/۴: ۳۳۷) و دیوانہ ۷ والفائق (۱: ۱۴۱) والمحکم (حکم) [3] قالہ النابغۃ وقال بعضہم انہ لیس من الحکم فی شیء بل معناہ کن حکیما وانظر للبیت دیوانہ ۳۳ وشرح البطلیوسی وادب الکاتب ۲۲ والاقتضاب ۴۲۹ وشواہد الکشاف ۳۲ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۷۸) والخزانۃ (۱: ۱۹۱) والجمحی ۸۵ والکتاب (۱: ۸۵) والعقد الثمین والعشر للتبریزی ۲۹۷ والمعانی للقتبی ۹۹۲ والعینی ۲/۲۵۴ والسیوطی ۱۱ وذیل الامالی (۱: ۲۲۹) وابن الشجری (۲: ۲۸۹) والصناعتین ۴۷ فی خمسۃ ابیات وفی روایۃ شراع کمافی الحیوان (۳: ۲۲۱) وہی روایۃ الاصمعی کمافی الخزانۃ (۱: ۳۰۰) لکن روایۃ النسب۔

دشوت) حاکموں کے پاس پہنچاؤ۔

اور حَکَمٌ (منصف) ماہر حاکم کو کہا جاتا ہے اس لئے اس میں لفظ حاکم سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔

اَفَغَیْرَ اللّٰہِ اَبْتَغِیْ حَکَمًا (۶-۱۱۴) کیا میں خدا کے سوا اور منصف تلاش کروں۔

اور آیت کریمہ:۔

فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا (۴-۳۵) تو ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو۔

میں حَاکِمًا کی بجائے حَکَمًا کہنے سے اس امر پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ دو منصف مقرر کرنے کی شرط یہ ہے کہ وہ دونوں تفصیلات کی طرف مراجعت کئے بغیر اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ کریں خواہ وہ فیصلہ فریقین کی مرضی کے موافق ہو یا مخالف اور حَکَمٌ کا لفظ واحد جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔

تحاکمنا الی الحاکم ہم حاکم کے پاس فیصلہ لے گئے قرآن میں ہے:۔

یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْا اِلَی الطَّاغُوْتِ (۴-۶۰) اور چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جاکر فیصلہ کرائیں۔

حَکَّمْتُ فُلَانًا کسی کو منصف ماننا۔ قرآن میں ہے:۔

حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ (۴-۶۵) جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں۔

جب یہ کہا جاتا ہے حَکَمَ بِالْبَاطِلِ تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس نے باطل کو بطور حکم کے جاری کیا اَلْحِکْمَۃُ کے معنی علم وعقل کے ذریعہ حق بات دریافت کر لینے کے ہیں۔ لہٰذا حکمت الٰہی کے معنی اشیاء کی معرفت اور پھر نہایت احکام کے ساتھ انکو موجود کرنا ہیں اور انسانی حکمت موجودات کی معرفت اور اچھے کاموں کو سرانجام دینے کا نام ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا لُقْمَانَ الْحِکْمَۃَ (۳۱-۱۲) اور ہم نے لقمان کو دانائی بخشی۔

میں حکمت کے یہی معنی مراد ہیں جو کہ حضرت لقمان کو عطا کی گئی تھی۔ لہٰذا جب اللہ تعالےٰ کے متعلق حکیم کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے وہ معنی مراد نہیں ہوتے جو کسی انسان کے حکیم ہونے کے ہوتے ہیں اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے متعلق فرمایا ہے۔

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ (۹۵-۸) کیا سب سے بڑا حاکم نہیں ہے؟

اور قرآن پاک کو حکیم یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حکمت کی باتوں پر مشتمل ہے جیسے فرمایا،

الٓرٰ تِلْکَ اٰیَاتُ الْکِتَابِ الْحَکِیْمِ (۱۰-۱) یہ بڑی دانائی کی کتاب کی آیتیں ہیں۔

نیز فرمایا:۔

وَلَقَدْ جَاءَھُمْ مِّنَ الْاَنْبَاءِ مَا فِیْہِ مُزْدَجَرٌ حِکْمَۃٌ بَالِغَۃٌ (۵۴-۴، ۵) اور ان کو ایسے حالات (سابقین) پہنچ چکے ہیں جن میں عبرت ہے اور کامل دانائی (کی کتاب بھی)۔

اور بعض نے کہا ہے کہ قرآن پاک کے وصف میں حکیم بمعنی محکم ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔

اُحْکِمَتْ اٰیَاتُہٗ (۱۱-۱) جس کی آیتیں مستحکم ہیں۔

اور یہ دونوں قول صحیح ہیں کیونکہ قرآن پاک کی آیات مُحْکَم بھی ہیں اور ان میں پراز حکمت احکام بھی ہیں لہٰذا ان ہر دو معانی کے لحاظ سے

قرآن محکم ہے۔

حکم کا لفظ حکمۃ سے عام ہے ہر حکمت کو حکم کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ہر حکم حکمت نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ حکم کے معنی کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے کے ہوتے ہیں کہ وہ یوں ہے یا یوں نہیں ہے۔

آنحضرت نے فرمایا[1] (۹۲) اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً۔ کہ بعض اشعار مبنی بر حکمت ہوتے ہیں جیسا کہ لبید نے کہا ہے[2] (رمل)

(۱۱۸) اِنَّ تَقْوٰى رَبِّنَا خَيْرُ نَفَلْ

کہ خدائے تعالیٰ کا تقویٰ ہی بہترین توشہ ہے۔

قرآن میں ہے:۔

وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (۱۹-۱۲) اور ہم نے ان کو لڑکپن میں ہی دانائی عطا فرمائی تھی۔

اور آنحضرت نے فرمایا[3] ۹۳ اَلصَّمْتُ حُكْمٌ وَّقَلِيْلٌ فَاعِلُهٗ کہ خاموشی بھی حکمت ہے۔ لیکن بہت تھوڑے لوگ اسے اختیار کرتے ہیں۔

یہاں (آیت اور حدیث میں) حکم کے معنی حکمت کے ہیں۔[4] قرآن میں ہے:۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲-۱۲۹) اور (ان لوگوں) کو کتاب اور دانائی سکھایا کرے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ (۳۳-۳۴) اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں ان کو یاد رکھو۔

میں حکمت سے مراد تفسیر قرآن ہے یعنی جس بہ کہ قرآن نے آیت اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ..... میں تنبیہ کی ہے کہ اللہ جس چیز کو چاہتا ہے حکمت بنا دیتا ہے تو اس میں ترغیب ہے کہ لوگوں کو اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہیئے۔

ابن عباس فرماتے ہیں[5] کہ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ میں حکمت سے ناسخ منسوخ محکم اور متشابہات کا علم مراد ہے۔ اور ابن زید کہتے ہیں کہ آیات سے حکم کا علم مراد ہے۔ سدی نے کہا ہے کہ حکمت سے سنت نبوی مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ حقائق قرآن کا فہم مراد ہے۔ کیونکہ بعض حقائق کا

---

[1] انظر الحدیث (حم ق د ہ) عن ابی (ت عن ابن مسعود (طب عن عمرو بن عوف (عق) عن ابی بکرۃ (حل) عن ابی ہریرۃ (خط) عن عائشۃ عن حسان بن ثابت (ابن عساکر عن عمر) (ق عن ابن عباس) (عسکری عن عائشۃ) (کر عن عائشۃ) (وفی کلہا حکمۃ بدون اللام ولبعضہا فی بعضہا حکما وفی بعضہا لحکما انظر کنز العمال لعلی المتقی (۳/۳۲۲) ثم ذکر (۳۲ و ۷۱) عن احمر بن بکر الاسدی وفیہ لحکمۃ کما رواہ الاکثر ۱۲ [2] قال لبید بن ربیعۃ العامری وتمامہ: وباذن اللہ ریثی وعجل۔ البیت فی دیوانہ ۳۹ وامالی المرتضی (۱: ۲۱) والعقد (۲: ۳۷۸) والمشکل للقتیبی ۲ وغریبہ ۷۷ وجمہرۃ الاشعار ۷۰ والکامل (۲: ۲۴۴) ونظام الغریب ۲۳۷ والبحر (۴: ۵۵۴) واللسان (نفل) وشواہد الکشاف ۲۲۹ والطبری (۹: ۱۷) والقرطبی (۷: ۳۶۱) ومجاز القرآن رقم ۲۷۲ وفی کنز العمال (۳: ۸۹۴) ان عمر بن الخطاب کان یامر بروایۃ ہذہ القصیدۃ (دیکھ)۔ [3] اخرجہ ابو منصور الدیلمی فی مسند الفردوس من حدیث ابن عمر بسند ضعیف والبیہقی فی الشعب والقضاعی من حدیث انس ان لقمان قال الخ کما فی البیہقی وروضۃ العقلاء ۲۸ بسند صحیح عن انس راجع کنز العمال ۳/۲۰۰ رقم ۵۲۷ وتخریج الاحیاء للعراقی ۳/۱۸ وفی الاحیاء الصمت حکمۃ غلط، غلط فیہ عثمان بن سعید الراوی [4] راجع الطبری (۱: ۴۷۴) وقول السدی ہو المنقول عن قتادۃ راجع فتح القدیر للشوکانی ۱۲

بیان اولوالعزم پیغمبروں کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے اور اس معاملہ میں دوسرے انبیاء ان کے تابع ہوتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
یَحْکُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ الَّذِیْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِیْنَ هَادُوْا (۵-۴۴) اسی کے مطابق انبیاء جو (خدا کے) فرمانبردار تھے۔ یہودیوں کو حکم دیتے رہے ہیں۔ میں یَحْکُمُ کے معنی اس حکمت کے بیان کرنے کے ہیں جو انبیاء کے ساتھ مختص ہوتی ہے اور یا یہ حکم ہی سے ماخوذ ہے یعنی فیصلہ کرتے رہے ہیں اور آیت کریمہ:۔
مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (۳-۷) جس کی بعض آیتیں محکم ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ ہیں۔ میں محکمات سے وہ آیات مراد ہیں جن میں لفظی اور معنوی اعتبار سے کسی قسم کا اشتباہ نہ پایا جاتا ہو اور تشابہ کی چند قسمیں ہیں جنہیں ان کے باب (ش ب ہ) میں بیان کیا جائیگا انشاء اللہ تعالے۔ حدیث میں ہے (۹۹) کہ جنت مُحَکَّمِیْن کے لئے ہے بعض نے کہا ہے کہ مُحَکَّمِیْن سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں کہا جائے کہ یا تو مرتد ہو جاؤ ورنہ قتل کر دیئے جاؤ گے تو وہ قتل ہونا پسند کریں اور بعض نے کہا ہے کہ محکمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو حکمت کے ساتھ متخصص ہیں۔

ح ل ل

اَلْحَلُّ اصل میں حَلٌّ کے معنی گرہ کشائی کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ (۲۰-۲۷) اور میری زبان کی گرہ کھول دے۔
میں یہی معنی مراد ہیں اور حَلَلْتُ کے معنی کسی جگہ پر اترنا اور فروکش ہونا بھی آتے ہیں۔ اصل میں یہ حَلُّ الْاَحْمَالِ عند النزول سے ہے جس کے معنی کسی جگہ اترنے کے لئے سامان کی رسیوں کی گرہیں کھول دینا کے ہیں پھر محض اترنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ لہٰذا حَلَّ (ن) حُلُوْلًا کے معنی کسی جگہ پر اترنا ہیں اور اَحَلَّهٗ کے معنی اتارنے کے۔ قرآن میں ہے:۔
اَوْ تَحُلُّ قَرِیْبًا مِّنْ دَارِهِمْ (۱۳-۳۱) یا ان کے مکانات کے قریب نازل ہوتی رہے گی۔
وَاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ (۱۴-۲۸) اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر اتارا۔
حَلَّ الدَّیْنُ قرض کی ادائیگی کا وقت قریب آ پہنچا۔
اَلْحِلَّةُ منازل ہونے والی قوم (اسی سے کہا جاتا ہے حَیٌّ حِلَالٌ جبکہ لوگ ایک دوسرے کے جوار میں مقیم ہوں اَلْمَحَلَّةُ (اترنے کی جگہ) اور حَلَّ الْعُقْدَةَ (گرہ کھولنا) سے بطور استعارہ۔ حَلَّ (ض) اَلشَّیْءُ حِلًّا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی چیز کے حلال ہونا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا (۵-۸۸) اور جو حلال طیب روزی خدا نے تم کو دی ہے اسے کھاؤ۔
هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ (۱۶-۱۱۶) کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔
اور اَلْحُلُوْلُ سے اَحَلَّتِ الشَّاةُ کا محاورہ ہے جس کے معنی بکری کے تھنوں میں دودھ اترانا کے ہیں۔ مگر اَحَلَّ اللّٰهُ كَذَا کے معنی کسی چیز

لہ والمحکمین علی صیغۃ المفعول وبکسر الکاف معناہ المنصف من نفسہ راجع للحدیث الفائق ار ۲۸۱ والسان والنہایہ (حکم)

کو حلال کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ (۵-۱) تمہارے لئے چوپائے جانور (جو چرنے والے ہیں) حلال کر دیئے گئے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ اَزْوَاجَكَ الّٰتِيْۤ اٰتَيْتَ اُجُوْرَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ مِمَّاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلَيْكَ وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ (الاحزاب ۳۳-۵۰) اے پیغمبر! ہم نے تمہارے لئے تمہاری بیویاں جن کو تم نے ان کے مہر دے دیئے ہیں۔ حلال کر دی ہیں اور تمہاری لونڈیاں جو خدا نے تم کو (کفار سے بطور مال غنیمت) دلوائی ہیں اور تمہارے چچا کی بیٹیاں اور تمہاری پھوپھیوں کی بیٹیاں۔
میں ازواج مطہرات کی حلت لوٹنا ہر ہے کہ وہ آپؐ کے عقد میں تھیں اور بنات العم وغیرہ کی حلت سے حلت نکاح مراد ہے۔
بَلَغَ الْاَجَلُ مَحِلَّهٗ ادائیگی فرض کا وقت قریب آپہنچا قرآن میں ہے:۔
حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ (۲-۱۹۶) جب تک قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے۔

رَجُلٌ حَلَالٌ وَّمُحِلٌّ جو احرام کھول دے یا وہ آدمی جو حدود حرم سے باہر چلا جائے قرآن میں ہے:۔
وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا (۵-۲) اور جب احرام اتار دو تو پھر شکار کرو۔
وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ (۹۰-۲) اور تم اسی شہر میں تو رہتے ہو۔
اور آیت کریمہ:۔
قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ (۶۶-۲) خدا نے تم لوگوں کے لئے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری قسموں کی گرہ کشائی کا کفارہ بیان کر دیا ہے۔ حدیث میں ہے[1] (۹۵)
لَا يَمُوْتُ لِلرَّجُلِ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْاَوْلَادِ فَتَمَسُّهُ النَّارُ اِلَّا تَحِلَّةَ الْقَسَمِ کہ جس مسلمان کے تین بچے مر جائیں (اور وہ صبر کرے) تو اسے دوزخ کی آگ صرف تَحِلَّةَ الْقَسَمِ کی مقدار سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ یعنی جتنی دیر میں کہ انشاء اللہ کہے۔ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے[2] ع (۱۱۹) وَقْعُهُنَّ الْاَرْضَ تَحْلِيْلُ کہ ان کے قدم کا زمین پر پڑنا تحلۃ القسم کی مقدار

---

[1] الحدیث باختلاف الفاظہ فی اللسان (حلل) والفائق ۱/۲۹۴ ولفظہ لایموت لمؤمن وفی ابن کثیر لمسلم وفی روایۃ من مات لہ راجع للحدیث المسند عبد الرزاق وابو داؤد والطیالسی واصلہ فی الصحیحین من حدیث ابی ہریرۃ انظر ابن کثیر ۳/۱۳۲ وکنز العمال ۲/۱۲۳- ۱۲۴ وایضا الاستثناء الا تحلۃ القسم ورد للحارث فی سبیل اللہ فی مسند احمد والروایۃ فی الترمذی والنسائی وابن ماجۃ وتحلۃ القسم مثل فی القلیل المفرط فی القلۃ وقیل اشارۃ الی قولہ تعالٰی وان منکم الا واردھا والذی ذہب الیہ المؤلف ہو اعتبار بالاصل یخالف المنقول فی تفسیرہ) ۱۲ [2] قطعۃ من البیت لکعب بن زہیر السلمی من قصیدۃ جمہریۃ (۲۸۲-۲۸۷) فی ۵۸ بیتًا وصدرہ: تخدی علی یسرات وہی لاحقۃ ذوابل ۔۔۔ وفی روایۃ اللسان لاحقۃ بدل لاحقۃ وباریع بدل ذوابل وفی روایۃ المحکم (حلل) بجانب بدل ذوابل والبیت فی النہایۃ (حلل) والعمدۃ (۲: ۸۸) وجمہرۃ اشعار العرب ۔ ۳۱ ودیوانہ ۱۳ ومثلہ لعبدۃ بن الطبیب من قصیدۃ مفضلیۃ رقم ۲۶ فی ۸۱ بیتًا یذکر ثورا وصدرہ: یخفی التراب باظلاف ثمانیۃ فی اربع ۔۔۔۔ والبیت فی امالی المرتضی والنوادر ۹ ودیوان المعانی (۲: ۱۰۸) واللسان (حلل) لکن فیہ مسھن بدل وقعھن ۱۲

یعنی برائے نام ہے۔

اَلْحَلِیْلُ خاوند۔ مؤنث حَلِیْلَۃٌ میاں بیوی کو حَلِیْلٌ و حَلِیْلَۃٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے لئے اپنی چادر کھولتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اسی لئے جو شخص کسی کے ساتھ ایک ہی مکان میں رہتا ہو وہ اس کا حَلِیْلٌ کہلاتا ہے اور یا یہ حَلَال سے ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے کیلئے حلال ہیں۔ اور حَلِیْلَۃٌ کی جمع اَلْحَلَائِلُ ہے۔ قرآن میں ہے:
وَحَلَائِلُ اَبْنَائِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ (۴-۲۳) اور تمہارے صلبی بیٹوں کی عورتیں بھی۔

اَلْحُلَّۃُ کپڑوں کا جوڑا (اِزار اور رداء اوپر اور نیچے کی چادریں)

اَلْاِحْلِیْلُ پیشاب نکلنے کا سوراخ، کیونکہ پیشاب کے وقت اس کی گرہ کھل جاتی ہے۔

(ح ل ف)

اَلْحِلْفُ عہد و پیمان جو لوگوں کے درمیان ہو۔ اَلْمُحَالَفَۃُ (مفاعلہ) معاہدہ یعنی باہم عہد و پیمان کرنے کو کہتے ہیں۔ پھر محالفت سے لزوم کے معنی لے کر کہا جاتا ہے فُلَانٌ حِلْفُ کَرَمٍ وَحَلِیْفُ کَرَمٍ یعنی وہ کرم سے جدا نہیں ہوتا۔ حَلِیْفٌ جس کے ساتھ عہد و پیمان کیا گیا ہو اس کی جمع اَحْلَافٌ (و حُلَفَاءُ) آتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۱۲۰) تَدَارَکْتُمَا الْاَحْلَافَ قَدْ ثُلَّ عَرْشُھَا
تم نے ان حلیفوں کا تدارک کر دیا جن کے پائے ثبات متزلزل ہو چکے تھے۔

اَلْحَلِفُ اصل میں اس قسم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ ایک دوسرے سے عہد و پیمان کیا جائے اس کے بعد عام قسم کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن میں ہے:
وَلَا تُطِعْ کُلَّ حَلَّافٍ مَّھِیْنٍ (۶۸-۱۰) اور کسی ایسے شخص کے کہے میں نہ آجانا جو بہت قسمیں کھانے والا ذلیل اوقات ہے۔
یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ مَا قَالُوْا (۹-۷۴) یہ خدا کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے (تو کچھ) نہیں کہا۔
وَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ اِنَّھُمْ لَمِنْکُمْ وَمَا ھُمْ مِّنْکُمْ (۹-۵۶) اور خدا کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں ہیں۔
یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَکُمْ لِیُرْضُوْکُمْ (۹-۶۲) یہ لوگ تمہارے سامنے خدا کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو خوش کر دیں۔

شَیْءٌ مُحْلِفٌ (مشکوک چیز) جس کے ثابت کرنے کے لئے قسم کی ضرورت ہو۔

کُمَیْتٌ مُحْلِفٌ گھوڑا جس کے کمیت اور اشقر ہونے میں شک ہو ایک قسم کھائے کہ یہ کمیت ہے اور دوسرا حلف اٹھائے کہ یہ اشقر یعنی سرخ ہے اَلْمُحَالَفَۃُ کے اصل معنی تو ایک دوسرے کے سامنے قسم کھانا کے ہیں اس سے یہ لفظ محض لزوم کے معنی میں استعمال ہونے لگا

---

[1] قالہ زہیر یمدح ہرم بن سنان والحارث بن عوف والاحلاف غطفان وقیس وتمامہ: وذبیان قد زلت باقدامہا النعل۔ وراجع دیوانہ ۱۰۹ وشواہد الکشاف ۰۰ او المعلقات العشر والمختارات ۴۲ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۶۲) والاتباع لابی الطیب ۴ ومہا ضداد ابن الانباری ۲۸۷ واضداد ابی الطیب (۱: ۱۳۴) واللسان (ثلل)

ہے اور جو کسی سے الگ نہ ہوتا ہو اسے اس کا
حِلْفٌ یا حَلِیفٌ کہا جاتا ہے حدیث میں ہے[1] (۹۶)
لَاحِلْفَ فِی الْاِسْلَامِ اسلام میں زمانہ جاہلیت
ایسے معاہدے نہیں ہیں۔
فُلَانٌ حَلِیفُ اللِّسَانِ فلاں چرب زبان ہے
گویا اس نے بولنے سے عہد کر رکھا ہے اور اس سے
ایک لمحہ نہیں رکتا حَلِیفُ الْفَصَاحَۃِ وہ فصیح ہے۔

(ح ل ق)

اَلْحَلْقُ۔ حلق (وہ جگہ جہاں سے جانور کو ذبح
کیا جاتا ہے) حَلَقْتُہٗ (ض) اسکے حلق کو قطع کر ڈالا۔
پھر یہ لفظ بال مونڈنے پر بولا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔
حَلَقَ شَعْرَہٗ اس نے اپنے بال منڈوا ڈالے۔
قرآن میں ہے:-
وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ (۲-۱۹۶) اور۔۔۔
۔۔۔۔ سر نہ منڈواؤ۔
مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ (۴۸-۲۷)
اپنے سر منڈوا کر اور اپنے بال کتروا کر
رَاْسٌ حَلِیْقٌ مونڈا ہوا سر۔
لِحْیَۃٌ حَلِیْقَۃٌ مونڈی ہوئی داڑھی۔
اور کسی انسان کے حق میں بد دعا کے وقت عَقْرٰی
حَلْقٰی کہا جاتا ہے یعنی اسے ایسی مصیبت
پہنچے جس پر عورتیں اپنے سر کے بال منڈوا ڈالیں۔
بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ اللہ تعالے
اس کے حلق کو قطع کر ڈالے۔

اَلْمُحَالِقُ وہ کمبل جو کھردرا ہونے کی وجہ سے
بدن کے بال کاٹ ڈالے۔
حَلَقَۃٌ یا حَلْقَۃٌ۔ جماعت جو دائرہ کی شکل میں
جمع ہو۔ کیونکہ وہ دائرہ ہیئت میں انسان کے
حلق کے مشابہ ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ
حَلَقَۃٌ کا لفظ صرف اس جماعت کے متعلق
استعمال ہوتا ہے جو اپنے سر منڈوا ڈالتے ہیں[2]۔
اِبِلٌ مُحَلَّقَۃٌ شتران کہ بشکل حلقہ داغ بر آنہا
کردہ باشند اور حلقہ میں معنی دوران کا اعتبار
کرکے حَلَّقَ الطَّائِرُ کا محاورہ استعمال ہوتا
ہے۔ جس کے معنی پرندہ کا چکر لگا کر اڑنا کے ہیں[3]۔

(ح ل م)

اَلْحِلْمُ کے معنی ہیں نفس وطبیعت پر
ایسا ضبط رکھنا کہ غیظ وغضب کے موقع
پر بھڑک نہ اٹھے اس کی جمع اَحْلَامٌ ہے۔ اور
آیت کریمہ:- اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ
(۵۲-۳۲) کیا ان کی عقلیں ان کو۔۔۔ سکھاتی ہیں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ احلام سے عقلیں مراد
ہیں اصل میں حلم کے معنی متانت کے ہیں مگر
چونکہ متانت بھی عقل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے
اس لئے حلم کا لفظ بول کر عقل مراد لے لیتے ہیں
جیسا کہ مسبب بول کر سبب مراد لے لیا جاتا ہے۔
حَلُمَ برد بار ہونا۔ حَلَّمَہُ الْعَقْلُ وَتَحَلَّمَ
عقل نے اسے برد بار بنا دیا۔ اَحْلَمَتِ الْمَرْأَۃُ

---

[1] رواہ الحاکم فی المستدرک والمسلم وابوداؤد والنسائی عن جبیر بن مطعم (راجع الفتح للنبہانی ۲/۳۴۲ والحدیث فی النہایۃ (حلف) وغریب ابی عبید)۔ [2] وعلی ہذا فہی جمع حالق وعلی الاول مفرد وجمعہ حَلَقٌ واما الحلقۃ بسکون اللام فجمعہ حِلَق وعند البعض حَلَق علی غیر قیاس (النہایہ)۔ [3] (۶۷-۸۳) میں حلقوم بمعنی حلق آیا ہے وفی التنزیل الحلقوم (۵۶-۸۳)، بمعنی الحلق قال بعضہم المیم فیہ اصلیۃ وعند البعض الواو والمیم زائدتان (النہایہ) ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

عورت کا حلیم بچے جننا۔ قرآن میں ہے:۔
إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ (۱۱-۷۵)
بیشک ابراہیم بڑے تحمل والے، نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔ اور آیت کریمہ:۔
فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ (۳۷-۱۰۱) تو ہم نے ان کو ایک نرم دل لڑکے کی خوشخبری دی۔
کے معنی یہ ہیں کہ اس غلام میں قوت برداشت ..... تھی۔ اور آیت کریمہ:۔
وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنكُمُ الْحُلُمَ (۲۴-۵۹)
اور جب تمہارے لڑکے بالغ ہو جائیں۔
میں حُلُم کے معنی سن بلوغت کے ہیں اور سن بلوغت کو حُلُم اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس عمر میں عام طور پر عقل و تمیز آجاتی ہے کہا جاتا ہے۔
حَلَمَ (ن) فِي نَوْمِهِ خواب دیکھنا مصدر حُلْمٌ اور حُلُمٌ اور حُلْمٌ مثل رُبْعٌ بھی کہا گیا ہے۔ اور یہی معنی تَحَلَّمَ وَاحْتَلَمَ کے ہیں۔
حَلَمْتُ بِهِ فِي نَوْمِي۔ میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ قرآن میں ہے:۔
قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ (۱۲-۴۴) انہوں نے کہا یہ تو پریشان سے خواب ہیں۔
اَلْحَلَمَةُ بڑی چیچڑی۔ کیونکہ وہ ایک جگہ پر جمے رہنے کی وجہ سے حلیم نظر آتی ہے اور پستان کو حَلَمَةُ الثَّدْيِ کہنا محض ہیئت میں چیچڑی کے مشابہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس مجاز کی دلیل یہ ہے کہ سر پستان کو قُرَاد بھی کہہ دیتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] ع (طویل)

(۱۲۱) كَأَنَّ قُرَادَيْ زَوْرِهِ طَبَعَتْهُمَا
بِطِينٍ مِنَ الْجَوْلَانِ كُتَّابُ أَعْجَمِي

(اس کے سینے پر پستانوں کے نشانات اسطرح خوشنما نظر آتے ہیں کہ گویا کسی کاتب نے مٹی کی مہریں لگادی ہیں) حَلِمَ الْجِلْدُ چمڑے کو کیڑا لگ جانا۔ حَلَّمْتُ الْبَعِيرَ میں نے اونٹ سے چیچڑ نکالے۔ حَلَّمْتُ فُلَانًا کسی پر قدرت حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ مدارات سے پیش آنا تاکہ وہ مطمئن رہے جیسا کہ اونٹ سے چیچڑ دور کرنے سے اسے سکون اور راحت محسوس ہوتا ہے اور انسان اس پر پوری طرح قدرت پالیتا ہے۔

(ح ل ی)

اَلْحُلِيُّ (زیورات) یہ حَلْيٌ کی جمع ہے جیسے ثَدْيٌ کی جمع ثُدِيٌّ آجاتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهُ خُوَارٌ اپنے زیور کا ایک بچھڑا (بنا لیا) (وہ) ایک جسم (تھا) جس میں سے بیل کی آواز نکلتی تھی (۷-۱۴۸)
حَلِيَ يَحْلَى (آراستہ ہونا) اور حَلَّى (آراستہ کرنا)

---

[1] قاله عدي بن الرقاع في قصيدة له يمدح فيها عمر بن هبيرة وروي ايضًا للمفضل الجرمي كما في اللسان (قرد عجم) والمعرب للجواليقي ۱۰۵ والحماسة (۲: ۲۵۱ - ۳۵۲) والمرزوقي رقم ۸۱ من خمسة ابيات والاقتضاب ۹۷ والبيت بغير عزو في المخصص (۲: ۸۴) والطبرسي (۱: ۴۹) والجولان بفتح الجيم جبل من نواحي دمشق وطينه مشهور للختم وروى صاحب الاقتضاب ان الجولان اسم للطين الذي يطبع به وفي المطبوع الجولان بالمهملة مصحف والشدا. الجوهري (قرد) لابن ميادة يمدح بعض الخلفاء وفي رواية صدره بدل زوره وعدي بن الرقاع هو عدي بن زيد بن مالك بن عدي بن الرقاع العاملي وكان شاعرًا مقدمًا عند بني امية خاصًا بالوليد بن عبد الملك وعده ابن سلام في الطبقة الثامنة من شعراء الاسلام راجع الاغاني (۸: ۱۷۲-۱۷۷) وابن سلام (۲۰۹-۲۱۳) والمؤتلف ۱۰۶ والمرزباني ۲۵۲

قرآن میں ہے:۔

يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ (۱۸-۳۱) ان کو وہاں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔

حُلُّوا أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ (۷۶-۲۱) اور انہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے۔

اور حلیۃ کے معنی زیور کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

أَوَمَنْ يُنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ (۴۳-۱۸) کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے۔

(ح م م)

اَلْحَمِيمُ کے معنی سخت گرم پانی کے ہیں۔

قرآن میں ہے:۔

وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا (۴۷-۱۵) اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائے گا۔

إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا (۷۸-۲۵) مگر گرم پانی اور بہتی پیپ۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِنْ حَمِيمٍ (۱۰-۴) اور جو کافر ہیں ان کے پینے کو نہایت گرم پانی۔

يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ (۲۲-۱۹) (اور) ان کے سروں پر جلتا ہوا پانی ڈالا جائے گا۔

ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِنْ حَمِيمٍ (۲۲-۱۹) پھر اس (کھانے) کے ساتھ ان کو گرم پانی ملا کر دیا جائے گا۔

هَٰذَا فَلْيَذُوقُوهُ حَمِيمٌ وَغَسَّاقٌ (۳۸-۵۷) یہ گرم کھولتا ہوا پانی اور پیپ (ہے) اب اس کے مزے چکھیں۔

اور گرم پانی کے چشمہ کو حَمَّةٌ کہا جاتا ہے ایک روایت میں ہے۔ [۱] (۹۷)

اَلْعَالِمُ كَالْحَمَّةِ يَأْتِيهَا الْبُعَدَاءُ وَيَزْهَدُ فِيهَا الْقُرَبَاءُ۔ کہ عالم کی مثال گرم پانی کے چشمہ کی سی ہے جس میں نہانے کے لئے دور دور سے لوگ آتے ہیں (اور شفایاب ہو کر لوٹتے ہیں) اور قرب وجوار کے لوگ اس سے بے رغبتی کرتے ہیں (اس لئے اس کے فیض سے محروم رہتے ہیں)

اور تشبیہ کے طور پر پسینہ کو بھی حمیم کہا جاتا ہے اسی سے اِسْتَحَمَّ الْفَرَسُ کا محاورہ ہے جس کے معنی گھوڑے کے پسینہ پسینہ ہونے کے ہیں۔ اور حَمَّام کو حَمَّام یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ پسینہ آور ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ اس میں گرم پانی موجود رہتا ہے۔

اِسْتَحَمَّ فُلَانٌ۔ حمام میں داخل ہونا۔

پھر مجازاً قریبی رشتہ دار کو بھی حمیم کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ انسان اپنے رشتہ داروں کی حمایت میں بھڑک اٹھتا ہے اور کسی شخص کے اپنے خاص لوگوں کو حَامَّتُهُ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اَلْحَامَّةُ وَالْعَامَّةُ خاص وعام کا محاورہ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِينَ وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ (۲۶-۱۰۰-۱۰۱) تو آج نہ کوئی ہمارا سفارش کرنے والا ہے اور نہ گرم جوش دوست۔

نیز فرمایا:۔

وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا (۷۰-۱۰) اور کوئی

---

[۱] الحدیث فی النہایۃ (حمم) والفائق ۱/۱۵۰ وفیہ ویترکھا القرباء وغریب ابی عبید ۳/۲۰۱ والمعاجم (حمم)
قال الحافظ فی تخریج الکشاف لم اجدہ (۴/۲۶)

دوست کسی دوست کا پرسان نہ ہوگا۔
اور اس کی دلیل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انسان کے قریبی مہربانوں کو حُزَامَّتُہٗ بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ اس کے غم میں شریک رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔
اِحْتَمَّ فُلَانٌ لِفُلَانٍ فلاں اس کے لئے غمگین ہوا یا اس کی حمایت کے لئے جوش میں آگیا۔ اس میں باعتبار معنی اِھْتَمَّ سے زیادہ زور پایا جاتا ہے کیونکہ اس میں غمزدہ ہونے کے ساتھ ساتھ جوش اور گرمی کے معنی بھی پائے جاتے ہیں۔
اَحَمَّ الشَّحْمَ چربی پگھلا۔ یہاں تک کہ وہ گرم پانی کی طرح ہو جائے اور آیت کریمہ:۔
وَظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ (۵۶-۴۳) اور سیاہ دھوئیں کے سایے میں۔
میں یَحْمُوْم حمیم سے یفعول کے وزن پر ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کے اصل معنی سخت سیاہ دھوآں کے ہیں۔ اور اسے یَحْمُوْم یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں شدت حرارت پائی جاتی ہے جیسا کہ بعد میں لَا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیْمٍ سے اس کی تفسیر کی ہے اور یا اس میں حُمَمَۃٌ یعنی کوئلے کی سی سیاہی کا تصور موجود ہے۔ چنانچہ سیاہ کو یَحْمُوْم کہا جاتا ہے اور یہ حُمَمَۃٌ (کوئلہ) کے لفظ سے مشتق ہے۔ چنانچہ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔
لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ... (۳۹-۱۶) ان کے اوپر تو آگ کے سائبان ہوں گے اور نیچے (ان کے) فرش ہوں گے۔
اور حِمَام بمعنی موت بھی آجاتا ہے جیسا کہ کسی امر کے مقدر ہونے پر حُمَّ کَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور بخار کو اَلْحُمّٰی کہنا یا تو اس لئے ہے کہ اس میں حرارت تیز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں آنحضرت نے فرمایا:[1] (۹۸)
اَلْحُمّٰی مِنْ فَیْحِ جَهَنَّمَ۔ کہ بخار جہنم کی شدت سے ہے اور یا بخار کو حُمّٰی اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں پسینہ آتا ہے اور یا اس لئے کہ یہ موت کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ جیسا کہ عرب لوگ کہتے ہیں اَلْحُمّٰی بَرِیْدُ الْمَوْتِ (کہ بخار موت کا پیغام بر ہے) اور بعض اسے باب الموت یعنی موت کا دروازہ بھی کہتے ہیں اور اونٹوں کے بخار کو حُمَام کہا جاتا ہے یہ بھی حِمَام (موت) سے مشتق ہے۔ کیونکہ اونٹ کو بخار ہو جائے تو وہ شاذونادر ہی شفایاب ہوتا ہے۔
حَمَّمَ الْفَرْخُ پرند کے بچہ نے بال و پر نکال لئے کیونکہ اس سے اس کی جلد سیاہ ہو جاتی ہے۔
حَمَّمَ وَجْهُهٗ اس کے چہرہ پر سبزہ نکل آیا۔
یہ دونوں محاورے حُمَمَۃٌ سے ماخوذ ہیں۔
اور حَمْحَمَتِ الْفَرَسُ جس کے معنی گھوڑے کے ہنہنانے کے ہیں یہ اس باب سے نہیں ہے۔

(ح م د)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ تَعَالٰی (کے معنی اللہ تعالٰے کی فضیلت کے ساتھ اس کی ثنا بیان کرنے کے

---

[1] متفق علیہ من حدیث بن عمر وعند البخاری عن عائشۃ موصولا وفی الموطا عن عروۃ مرسلا وعند الترمذی عن ثوبان وبمعناہ رواہ الحاکم والنسائی عن ابن عباس وفی روایۃ عن انس ۔ زائد الموت لابن السنی وابو نعیم فی الطب ا ہنا وفی الزہد وابن ابی الدنیا فی المرض والکفالات عن الحسن مرسلا وراجع التخریج بکنز العمال ۳ر رقم ۱۶۱۴ ۔ ۱۶۱۷ ، ۱۶۱۴۳ وج ۱۰ر رقم ۱۷۰ والفتح للنبہانی ۲/۸۲ وایضا الکنز ج ۱۰۷ رقم ۹/۱۵ ، ۲۴۵ ، ۱۶۶ ۔

ہیں۔ یہ مدح سے خاص اور شکر سے عام ہے۔ کیونکہ مدح ان افعال پر بھی ہوتی ہے جو انسان سے اختیاری طور پر سرزد ہوتے ہیں اور ان اوصاف پر بھی جو پیدائشی طور پر اس میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ جس طرح مال کے خرچ کرنے اور علم و سخا پر انسان کی مدح ہوتی ہے اس طرح اسکی درازئ قد و قامت اور چہرہ کی خوبصورتی پر بھی تعریف کی جاتی ہے۔ لیکن حمد صرف افعال اختیاریہ پر ہوتی ہے۔ نہ کہ اوصاف اضطراریہ پر اور شکر تو صرف کسی کے احسان کی وجہ سے اس کی تعریف کو کہتے ہیں۔ لہذا ہر شکر حمد ہے۔ مگر ہر حمد شکر نہیں ہے اور ہر حمد مدح ہے مگر ہر مدح حمد نہیں ہے[1]۔ اور جس کی تعریف کی جائے اسے محمود کہا جاتا ہے۔ مگر مُحَمَّدٌ صرف اسی کو کہہ سکتے ہیں جو بکثرت قابل ستائش خصلتیں رکھتا ہو نیز جب کوئی شخص محمود ثابت ہو تو اسے بھی محمود کہہ دیتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔ اِنَّهٗ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ (۱۱-۷۳) وہ سزاوار تعریف اور بزرگوار ہے۔

پس حمید بمعنی محمود بھی ہو سکتا ہے اور حامد بھی۔ حُمَادَاكَ اَنْ تَفْعَلَ كَذَا یعنی ایسا کرنے میں تمہارا انجام بخیر ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ اور ایک پیغمبر جو میرے بعد آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا ان کی بشارت سناتا ہوں۔ (۶۱-۶) میں لفظ احمد سے آنحضرتؐ کی ذات کی طرف اشارہ ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام احمد ہوگا اسی طرح آپ اپنے اخلاق و اطوار کے اعتبار سے بھی محمود ہوں گے اور عیسٰی علیہ السلام کا اپنی بشارت میں لفظ احمد (صیغہ تفضیل) بولنے سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ آپؐ حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے پیشرو جملہ انبیاء سے افضل ہیں اور آیت کریمہ:۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (۴۸-۲۹) محمد خدا کے پیغمبر ہیں۔

میں لفظ محمد گو من وجہ آنحضرتؐ کا نام ہے لیکن اس میں آنجناب کے اوصاف حمیدہ کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ:۔ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ يَحْيٰى (۱۹-۷) میں بیان ہو چکا ہے کہ ان کا یہ نام معنی حیات پر دلالت کرتا ہے جیسا کہ اس کے مقام پر مذکور ہے۔

(ح م ر)

اَلْحِمَارُ (گدھا) اس کی حُمُرٌ وَحَمِيْرٌ وَاَحْمِرَةٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ (۱۶-۸) اور گھوڑے خچر اور گدھے۔

کبھی حمار کے لفظ سے جاہل اور بے علم آدمی بھی مراد ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (۶۲-۵) ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں۔ كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ (۷۴-۵۰) گویا گدھے ہیں جو بدک جاتے ہیں۔

---

[1] انظر الکشاف ج ۱ ص ۹-۱۰

حِمَارُ قُبَّان ایک قسم کا کیڑا (جسے فارسی میں خرک کہا جاتا ہے) اَلْحِمَارَانِ دو پتھر جن پر پنیر خشک کیا جاتا ہے ہیئت میں حمار سے تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے اور گدھے کے ساتھ جلاوت میں تشبیہ دیکر دوغلی نسل کے گھوڑے کو بھی اَلْمُحَمَّر کہا جاتا ہے۔

اَلْحُمْرَةُ سرخی۔ اَلْاَحْمَرُ وَالْاَسْوَدُ عرب وعجم (اس میں عمومی رنگت کا لحاظ کیا گیا ہے) اور کبھی حَمْرَاءُ الْعِجَان (کنایہ از عجم) بھی کہا جاتا ہے[1]۔

اَلْاَحْمَرَانِ۔ گوشت اور شراب[2] اَلْمَوْتُ الْاَحْمَرُ سخت موت، وہ موت جو قتل سے واقع ہو سَنَةٌ حَمْرَاءُ قحط سالی کیونکہ اس میں فضا کا رنگ سرخ نظر آتا ہے اسی بنا پر سخت گرمی کو حَمَرَّةُ الْقَيْظِ کہا جاتا ہے۔ وَطْاءَةٌ حَمْرَاءُ قدم کا تازہ نشان اس کے بالمقابل مٹے ہوئے نشان کو وَطْاءَةٌ دَهْمَاءُ بولتے ہیں۔

(ح م ل)

اَلْحَمْلُ (ض) کے معنی بوجھ اٹھانے یا لادنے کے ہیں اس کا استعمال بہت سی چیزوں کے متعلق ہوتا ہے اس لئے گو صیغہ فعل یکساں رہتا ہے مگر بہت سے استعمالات میں بلحاظ مصادر کے فرق کیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ بوجھ جو حسی طور پر اٹھائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ کوئی چیز پیٹھ پر لادی جائے اس پر حِمْل (بکسر الحا) کا لفظ بولا جاتا ہے اور جو بوجھ باطن یعنی کوئی چیز اپنے اندر اٹھائے ہوئے ہوتی ہے اس پر حَمْل کا لفظ بولا جاتا ہے جیسے پیٹ میں بچہ۔ بادل میں پانی اور عورت کے حمل کے ساتھ تشبیہ دے کر درخت کے پھل کو بھی حَمْل کہہ دیا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَةٌ اِلٰى حِمْلِهَا لَا يُحْمَلْ مِنْهُ شَيْءٌ (۳۵-۱۸) اور کوئی بوجھ میں دبا ہوا اپنا بوجھ بٹانے کو کسی کو بلائے تو اس میں سے کچھ نہ اٹھائے گا۔

اور حَمَلْتُ کا صیغہ ہر قسم کا بوجھ اٹھانے پر بولا جاتا ہے خواہ وہ بوجھ ظاہری ہو یا باطنی مثلاً کہا جاتا ہے حَمَلْتُ الثِّقْلَ حَمْلًا میں نے بوجھ اٹھایا۔ الرسالۃ پیغام اٹھایا۔ اَلْوِزْرَ گناہ کا بوجھ اٹھایا۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (۲۹-۱۳) یہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور (لوگوں کے) بوجھ بھی۔

وَمَا هُمْ بِحَامِلِيْنَ مِنْ خَطَايَاهُمْ مِّنْ شَيْءٍ (۲۹-۱۲) حالانکہ وہ ان کے گناہوں کا کچھ بوجھ اٹھانے والے نہیں۔

وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَا اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ (۹-۹۲) اور نہ ان (بے سروسامان) لوگوں پر (الزام) ہے کہ تمہارے پاس آئے کہ ان کو سواری دو اور تم نے کہا میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس پر تم کو سوار کر دوں۔

لِيَحْمِلُوْا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ (۱۶-۲۵) یہ قیامت کے دن اپنے (اعمال کے) پورے بوجھ بھی اٹھائیں گے۔ اور آیت کریمہ:۔

---

[1] وفی حدیث علیؓ عارضہ رجل من الموالی فقال: اسکت یا ابن حمراء العجان ای یا ابن الامۃ والعجان ما بین القبل والدبر وہی کلمۃ تقولہا العرب فی السب والذم (النہایہ ا/۴۴۰) [2] والیضا الذہب والزعفران ویقال للماء واللبن الابیضان وللتمر والماء الاسودان (النہایۃ)

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ (۶۲-۵) جن لوگوں (کے سر) پر تورات لدوائی گئی پھر انہوں نے اس (کے بار تعمیل) کو نہ اٹھایا ان کی مثال گدھے کی سی ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں پر احکام تورات کی بجا آوری کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی مگر انہوں نے اسمیں کوتاہی کی۔
کہا جاتا ہے :-
حَمَلْتُهٗ وَحَمَلْتُ عَلَيْهِ كَذَا میں نے اس کے ذمہ فلاں کام لگایا۔ تَحَمَّلَ وَاحْتَمَلَ وَحَمَلَ اس کے مطاوع آتے ہیں۔ قرآن میں ہے :-
فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ (۱۳-۱۷)
پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آ گیا۔
حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ (۶۹-۱۱) تو ہم نے تم (لوگوں) کو کشتی میں سوار کر لیا۔
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ . . . . (۲۴-۵۴) اگر منہ موڑ دو گے تو رسول پر (اس چیز کا ادا کرنا) جو ان کے ذمے ہے اور تم پر (اس چیز کا ادا کرنا) جو تمہارے ذمے ہے۔
وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا (۲-۲۸۶) ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیو جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے پروردگار جتنا بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا ہمارے سر پر نہ رکھیو۔
وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ (۵۴-۱۳) اور ہم نے نوح کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میخوں سے تیار کی گئی تھی سوار کر لیا۔
ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا (۱۷-۳) اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوح کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا بے شک نوح (ہمارے) شکر گذار بندے تھے۔
وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ (۶۹-۱۴) اور زمین اور پہاڑ دونوں اٹھا لئے جائیں گے۔
حَمَلَتِ الْمَرْاَةُ عورت کا حاملہ ہونا۔ اسی طرح حَمَلَتِ الشَّجَرَةُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے حَمْلٌ کی جمع اَحْمَالٌ آتی ہے قرآن میں ہے :-
وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل (یعنی بچہ جننے) تک ہے (۶۵-۴)
وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ . . . . . (۴۱-۴۷) اور نہ کوئی مادہ حاملہ ہوتی اور نہ جنتی ہے مگر اس کے علم سے۔
حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے اور اس کے ساتھ چلتی پھرتی ہے (۷-۱۸۹)
حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهٗ وَفِصَالُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (۴۶-۱۵) اس کی ماں نے اس کو تکلیف سے پیٹ میں رکھا اور تکلیف ہی سے جنا اور اس کا پیٹ میں رہنا اور دودھ چھوڑنا ڈھائی برس میں ہوتا ہے۔
اصل میں حَمْلٌ کے معنی پیٹھ پر بوجھ لادنا کے ہیں پھر بطور استعارہ عورت کے حمل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا اونٹنی کے حاملہ ہونے کے لئے وَسَقَتِ النَّاقَةُ بولا جاتا ہے بعض نے کہا ہے کہ اَلْحَمُوْلَةُ (بالفتح) اسے کہتے ہیں جس پر بوجھ لادا گیا ہو۔ اور یہ قَتُوْبَةٌ اور رَكُوْبَةٌ کی طرح ہے اور جو بوجھ لدا ہوا ہو اسے حُمُوْلَةٌ (بالضم) کہا جاتا ہے اور حَمَلٌ بمعنی محمول آتا ہے اور

یہ خاص کر بھیڑ کے چھوٹے بچے پر بولا جاتا ہے کیونکہ اسے چلنے سے عاجز یا نوزائیدہ ہونے کی وجہ سے اٹھایا جاتا ہے۔ اور حَمَلٌ کی جمع اَحْمَال وَحُمْلَان آتی ہے۔ اور تشبیہ کے طور پر بادل کو حامل کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا (۵۱-۲) اور پانی کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

اَلْحَمِیْلُ بہت پانی والا بادل۔ نیز حَمِیْل اس کوڑا کرکٹ کو بھی کہا جاتا ہے جو سیلاب بہا کر لے آتا ہے اور اجنبی مسافر اور ضامن پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ ضامن بھی مفروض کے ساتھ اس کی ضمانت کا بوجھ اٹھائے ہوتا ہے۔ نیز اَلْحَمِیْل اس بچے کو کہتے ہیں جس کا نسب ثابت نہ ہو۔ چنانچہ میراثُ الحمیل کا مسئلہ ہے یعنی اس شخص کی میراث جس کا نسب متحقق نہ ہو۔[1]

حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کنایۃً چغلخور۔

فُلَانٌ یَحْمِلُ الْحَطَبَ الرَّطْبَ یعنی فلاں چغلی کھاتا ہے۔

(ح م ی)

اَلْحَمْیُ وہ حرارت جو گرم جواہر جیسے آگ، سورج وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی جو بدن میں قوت حارہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فِیْ عَیْنٍ حَامِیَةٍ (۱۸-۸۶) گرم چشمے میں۔ ایک قرأت میں حَمِئَةٍ ہے[2]

یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْهَا فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ (۹-۳۵) جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں خوب گرم کیا جائے گا۔

حَمِیَ النَّهَارُ دن گرم ہو گیا۔ اَحْمَیْتُ الْحَدِیْدَ لوہا گرم کیا گیا۔

حُمَیَّا الْکَاْسِ شراب کی تیزی، اور انسان کی قوت غضبیہ جب جوش میں آجائے اور حد سے بڑھ جائے۔ تو اسے بھی حَمِیَّۃ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے حَمِیْتُ عَلٰی فُلَانٍ میں فلاں پر غصے ہوا قرآن میں ہے:۔

حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ (۴۸-۲۶) اور ضد بھی جاہلیت کی۔ پھر استعارہ کے طور پر حَمَیْتُ الْمَکَانَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے یعنی کسی جگہ کی حفاظت کرنا۔ ایک روایت میں ہے[3] (۹۹)

لَا حِمٰی اِلَّا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ کہ چراگاہ کا محفوظ کرنا صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا حق ہے۔

حَمَیْتُ اَنْفِیْ مَحْمِیَةً میں نے اپنی عزت کی حفاظت کی۔ حَمَیْتُ الْمَرِیْضَ حَمْیًا بیمار کو نقصان دہ چیزوں سے روک دیا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلَا حَامٍ (۵-۱۰۳) اور نہ حام۔

میں بعض کے نزدیک حام سے وہ نر اونٹ مراد ہے جس کی پشت سے دس بچے پیدا ہو چکے ہوں (اس کے متعلق) کہہ دیا جاتا تھا حُمِیَ ظَهْرُهٗ فَلَا یُرْکَبُ اس کی پشت محفوظ ہو [illegible] اس پر کوئی سوار نہ ہو۔

---

[1] وفی حدیث انہ کتب الی شریح: اَلْحَمِیْلُ لا یورث الا ببینۃ (النہایہ) وفی الترمذی ... بمال ابی حمیلا فوثہ مسروق [2] الاول قراءۃ ابن مسعود والحسن والثانی ابن عباس وعلیہ المصحف فی مجاز ابی عبیدۃ: فی عین حمئۃ (۸۶) تقدیرہا فعلۃ وہی مہموزۃ ومجازہا ذات حمأۃ ومن لم یہمز [illegible] جعل مجازہ مجاز فعلۃ من الحر الحامی وموضعہا حامیۃ۔ [3] الحدیث فی النہایہ (حمی) وباختلاف الفاظہ فی معجم الاصبہانی وابن النجار عن ابن عباس (حم خ د) عن الصعب بن جثامۃ راجع کنز العمال ۱۲

اَحْمَاءُ الْمَرْءَةِ خاوند کی طرف سے عورت کے رشتہ دار کیونکہ وہ اس کی حفاظت کرتے ہیں اضافت کے وقت تینوں حالتوں میں حَمَاهَا وَ حَمُوْهَا وَ حَمِيهَا کہا جاتا ہے بعض حَمْءٌ (بہمزہ) بھی بولتے ہیں جیسا کہ کَمْءٌ ہے۔

اَلْحَمَأَةُ وَالْحَمَأُ سیاہ بدبودار مٹی قرآن میں ہے:۔

مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (۱۵-۲۶) سڑے ہوئے گارے سے۔ کہا جاتا ہے حَمَأْتُ الْبِئْرَ میں نے کنوئیں کو صاف کیا۔ اَحْمَأْتُهَا اسے کیچڑ سے بھر دیا۔ ایک قرأت میں عَيْنٍ حَمِئَةٍ (۱۸-۸۶) ہے یعنی سیاہ بدبودار کیچڑ والا چشمہ۔

(ح ن ن)

اَلْحَنِيْنُ کسی چیز کی طرف شفقۃً کھنچنا کہا جاتا ہے۔

حَنَّتِ الْمَرْءَةُ وَالنَّاقَةُ لِوَلَدِهَا عورت اور اونٹنی کا اپنے بچے کا مشتاق ہونا اس اشتیاق کے ساتھ چونکہ کبھی آواز بھی ہوتی ہے اس لئے حنین اس آواز کو کہتے ہیں جس میں اشتیاق اور شفقت پائی جائے یا اشتیاق کی صورت کا تصور کرکے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے چنانچہ حدیث حَنِيْنُ الْجِذْعِ اس معنی پر محمول ہے[1]

رِيْحٌ حَنُوْنٌ سرسراہٹ سے چلنے والی ہوا۔ قَوْسٌ حَنَّانَةٌ آواز نکالنے والی کمان۔ محاورہ ہے (مثل) مَالَهُ حَانَّةٌ وَلَا آنَّةٌ۔ یعنی اسکے پاس نہ اونٹنی ہے۔ اور نہ کوئی موٹی بھیڑ اس میں اونٹنی اور بھیڑ کی یہ صفت ان کے صوت کی بنا پر ہے۔ اور حنین چونکہ معنی شفقت پر مشتمل ہوتا ہے اور شفقت میں ہمیشہ جذبہ رحمت کارفرما ہوتا ہے اس لئے اس سے مراد رحمت لے لی جاتی ہے۔ جیسے فرمایا:۔

وَحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا (۱۹-۱۳) اور اپنے پاس سے شفقت ..... دی تھی۔

اسی سے اسمائے حسنیٰ اَلْحَنَّانُ وَالْمَنَّانُ ہے جس کے معنی بہت زیادہ رحم کھانے والے کے ہیں۔ حَنَانَيْكَ تجھ سے رحم کی التجا کرتا ہوں۔ یہ لَبَّيْكَ وَ سَعْدَيْكَ کی طرح تثنیہ لایا جاتا ہے۔

حُنَيْنٌ (مکہ اور طائف کے درمیان) ایک مشہور مقام کا نام ہے (جہاں ۸ھ کو جنگ حنین ہوئی تھی) قرآن میں ہے:۔

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ (۹-۲۵) اور (جنگ) حنین کے دن جبکہ تم کو اپنی (جماعت کی) کثرت پر غرہ تھا۔

(ح ن ث)

اَلْحِنْثُ گناہ، نافرمانی۔ قرآن میں ہے:۔

وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ (۵۶-۴۶) اور گناہ عظیم پر اڑے ہوئے تھے۔

اسی لئے يَمِيْنٌ غَمُوْسٌ (جھوٹی قسم) کو بھی حنث کہا جاتا ہے۔ اور حَنِثَ فِيْ يَمِيْنِهِ کے معنی قسم توڑنے کے ہیں اور حنث کے معنی سن بلوغت کے بھی آتے ہیں کیونکہ اس عمر میں انسان

---

[1] وفی النہایہ: انہ کان یصلی الی جذع فی مسجدہ فلما عمل لہ المنبر صعد علیہ فحن الجذع الیہ کذا فی النہایۃ وفی روایۃ کان یخطب بدل یصلی ثم حدیث حنین الجذع معروف رواہ جماعۃ من الصحابۃ وفی بعض الروایات فخار کخوار الثور حتی ارتج المسجد فلا معنی لتاویل المؤلف وحملہ علی المجاز راجع للحدیث الدارمی رقم (۳۱-۲۲م)

جوگناہ کریگا اس پراسے مواخذہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے بَلَغَ فُلَانٌ الْحِنْثَ فلاں بالغ ہوگیا۔ اَلْمُتَحَنِّثُ وہ شخص جو اپنے سے گناہ کو دور کرنے کے لئے عبادت کرے جیسے متحرّج اور متأثم کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔

(ح ن ج ر)

اَلْحَنْجَرَةُ (نرخرہ) نائے گلو یعنی بیرونی جانب سے حلقوم کا سرا اس کی جمع حَنَاجِرُ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

لَدَی الْحَنَاجِرِ کَاظِمِیْنَ (۴۰-۱۸) غم سے بھر کر گلو تک آ رہے ہوں گے۔

وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (۳۳-۱۰) اور دل (مارے دہشت کے) گلوں تک پہنچ گئے۔

(ح ن ذ)

اَلْحَنِیْذُ (بھونا ہوا) قرآن میں ہے:۔

اَنْ جَاءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ (۱۱-۶۹) کہ ایک بھونا ہوا بچھڑا لے آئے۔

یعنی وہ بچھڑا جو دو گرم پتھروں کے درمیان رکھ کر کباب کیا گیا تھا اور یہ اس لئے کرتے تھے تاکہ اس سے لزوجت بہ کر نکل جائے۔ یہ حَنَذْتُ الْفَرَسَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پسینہ لانے کے لئے گھوڑے کو ایک دو چکر دوڑا کر اس پر جھول ڈال دینے کے ہیں۔ ایسے گھوڑے کو مَحْنُوْذٌ اور حَنِیْذٌ کہا جاتا ہے۔

حَنَذَتْنَا الشَّمْسُ ہمیں سورج نے جھلس دیا۔ اور پسینہ سے چونکہ معمولی سا پانی نکلتا ہے۔ اس لئے جب کوئی شراب پلائے تو اس سے کہا جاتا ہے اَحْنِذْ یعنی اس میں تھوڑا سا پانی ملالو یعنی پسینہ کی مقدار میں یا اس رطوبت کی طرح جو حَنِیْذ یعنی کباب کیے ہوئے گوشت سے نکلتی ہے۔

(ح ن ف)

اَلْحَنَفُ کے معنی گمراہی سے استقامت کی طرف مائل ہونے کے ہیں۔ اس کے بالمقابل جَنَفٌ ہے جس کے معنی ہیں استقامت سے گمراہی کی طرف مائل ہونا۔

اَلْحَنِیْفُ (بروزن فعیل) جو باطل کو چھوڑ کر استقامت پر آجائے قرآن میں ہے:۔

قَانِتًا لِلّٰهِ حَنِیْفًا (۱۶-۱۲۰) اور خدا کے فرمانبردار تھے جو ایک کے ہو رہے تھے۔

حَنِیْفًا مُّسْلِمًا (۳-۶۷) سب سے بے تعلق ہو کر ایک (خدا) کے ہو رہے تھے۔

حَنِیْفٌ کی جمع حُنَفَاءُ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ (۲۲-۳۰-۳۱) اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو صرف ایک خدا کے ہو کر۔

تَحَنَّفَ فُلَانٌ راہ استقامت کی تلاش کرنا۔ ہر وہ شخص جو بیت اللہ کا حج کرتا اور ختنہ کرواتا عرب کے لوگ اسے حَنِیْف کہہ کر پکارتے تھے یعنی یہ دین ابراہیمؑ کا پابند ہے۔

اَلْاَحْنَفُ جس کے پاؤں میں کجی ہو کبھی تفاؤل کے طور پر کسی کا نام رکھ دیا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ صرف مائل ہونے کے معنی میں بطور استعارہ آتا ہے۔

(ح ن ك)

اَلْحَنَكُ کے معنی انسان یا چوپائے کے تالو کے ہیں اور کوے کی چونچ کو حنک کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اس کے لئے بمنزلہ انسان کے تالو کے ہوتی ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔

اَسْوَدُ مِثْلُ حَنَكِ الْغُرَابِ اوحَلَكِ الْغُرَابِ وہ کوے کی چونچ یا اس کے پروں کی طرح سیاہ ہے، یہاں حنک کے معنی منقار اور حلک کے معنی پروں کی سیاہی کے ہیں اور آیت کریمہ:۔

لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗ اِلَّا قَلِيْلًا تو میں تھوڑے شخصوں کے سوا اس کی (تمام) اولاد کی جڑ کاٹتا رہوں گا (۱۷-۶۲)

میں یہ حَنَكْتُ الدَّابَّةَ سے بھی مشتق ہو سکتا ہے جس کے معنی اس کے منہ میں لگام دینے یا رسی باندھنے کے ہیں۔ پس یہ لَاُلْجِمَنَّ فُلَانًا وَ لَاُرْسِنَنَّهٗ کی طرح ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِحْتَنَكَ الْجَرَادُ الْاَرْضَ سے مشتق ہو جس کے معنی ٹڈی کے زمین کی روئیدگی کو صفاچٹ کر دینے کے ہیں پس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ میں انہیں اس طرح تباہ و برباد کروں گا جیسے ٹڈی زمین پر سے نبات صفاچٹ کر دیتی ہے۔

حَنَّكَهُ الدَّهْرُ زمانہ نے اسے تجربہ کار بنا دیا۔ جیسا کہ نَجَّذَہٗ وَقَرَّعَ سِنَّهٗ وَافْتَرَّہٗ وغیرہ استعارات تجربہ کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔

(ح و ب)

اَلْحَوْبُ (ن) جرم کا ارتکاب کرنا۔ حُوْبٌ (اسم) گناہ۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا (۴-۲) کہ یہ بڑا سخت گناہ ہے۔

ایک روایت میں ہے[1] (۱۰۰)

طَلَاقُ اُمِّ اَيُّوْبَ حُوْبٌ کہ ام ایوب کو طلاق دینا گناہ عظیم ہے اور طلاق کو حوب کہنا اس بنا پر ہے کہ وہ ممنوع عنہ ہے اور یہ حَابَ حُوْبًا وَحَوْبًا وَحِيَابَةً سے ہے جس کے معنی ارتکاب جرم کے ہیں۔ اصل میں حَوْبٌ کا لفظ کلمہ زجر ہے جو اونٹوں کو ڈانٹنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ فُلَانٌ يَتَحَوَّبُ مِنْ كَذَا۔ فلاں گناہ سے بچتا ہے جیسے يَتَاَثَّمُ عرب لوگ کہتے ہیں: (مثل) اَلْحَقَ اللّٰهُ بِهِ الْحَوْبَةَ اللہ اسے مسکنت اور احتیاج میں مبتلا کرے اصل میں حَوْبَۃ اس حاجت کو کہتے ہیں جو انسان کو ارتکاب جرم پر آمادہ کرے کہا جاتا ہے۔ بَاتَ فُلَانٌ بِحِيْبَةِ سُوْءٍ فلاں نے بری حالت میں رات گزاری۔

اَلْحَوْبَاءُ بقول بعض نفس کے معنی میں آتا ہے۔ لیکن اصل میں حَوْبَاء اس نفس کو کہتے ہیں جو گناہ کا مرتکب ہو جیسے قرآن نے اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ (۱۲-۵۳) میں نفس امارہ سے تعبیر کیا ہے۔

---

[1] اخرجہ ابوداؤد فی المرسل وابراہیم الحربی فی الغریب من روایۃ ابن سیرین ورواہ یحیٰی الہمدانی فی مسندہ والطبرانی فی الاوسط عن ابن سیرین عن ابن عباس وزاد: قال ابن سیرین الحوب الاثم وروی الحاکم عن انس لکن فیہ ان طلاق ام سلیم لحوب وراجع للتفصیل ذیل الکشاف ۱/۴۶۶ و تخریج الکشاف ۳۸ رقم ۳۱۶

(ح و ت)

اَلْحُوْتُ بڑی مچھلی کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
نَسِيَا حُوْتَهُمَا (۱۸-۶۱) تو اپنی مچھلی بھول گئے
فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ (۳۷-۱۴۲) پھر مچھلی نے ان کو نگل لیا۔
اس کی جمع حِیْتَانٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِذْ تَاْتِیْهِمْ حِیْتَانُهُمْ یَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا (۷-۱۶۳) اس وقت کہ ان کے ہفتے کے دن مچھلیاں ان کے سامنے پانی کے اوپر آتیں۔
اور مچھلی چونکہ رخ بدلتی رہتی ہے اس لئے کہا جاتا ہے حَاوَتَنِیْ فُلَانٌ اس نے مجھے مچھلی کی طرح دھوکا دیا۔

(ح و ج)

اَلْحَاجَةُ اس چیز کی ضرورت کو کہتے ہیں جس کی دل میں محبت ہو اس کی جمع حَاجَاتٌ و حَوَائِجُ آتی ہے اور حَاجَ (ن) یَحُوْجُ وَ اِحْتَاجَ کے معنی ضرورت مند ہونے کے ہیں۔
قرآن میں ہے:۔
اِلَّا حَاجَةً فِیْ نَفْسِ یَعْقُوْبَ قَضٰهَا (۱۲-۶۸) ہاں وہ یعقوب کے دل کی خواہش تھی جو انہوں نے پوری کی تھی۔
حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا .... (۵۹-۹) اور جو کچھ ان کو ملا اس سے کچھ خواہش۔
اَلْحَوْجَاءُ کے معنی حاجت ہی کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ حَاجٌ ایک قسم کے کانٹے کو کہتے ہیں۔

(ح و ذ)

اَلْحَوْذُ (ن) کے معنی ہیں ہانکنے والا جو اونٹ کے پیچھے اس کے رانوں کے عین بیچ میں چل کر وہاں سے سختی کے ساتھ اسے ہانکے جائے۔
حَاذَ الْاِبِلَ سختی کے ساتھ ہانکنا اور آیت:۔
اِسْتَحْوَذَ عَلَیْهِمُ الشَّیْطٰنُ (۵۸-۱۹) شیطان نے ان کو قابو میں کر لیا ہے۔
میں استحوذ کے معنی ان پر مسلط ہو کر ہانکنے کے ہیں۔ یہ اِسْتَحْوَذَ الْعَیْرُ عَلَی الْاَتَانِ کے محاورہ سے ماخوذ ہے یعنی گدھے کا مادہ خر کی پشت پر چڑھ کر دونوں جانب سے قابو پا لینا (جیسا کہ جفتی کی صورت میں ہوتا ہے) اس میں ایک قرأت اِسْتَحَاذَ بھی ہے جو قیاس کے مطابق ہے آیت میں شیطان کے بنی آدم پر غلبہ پانے کے لئے اِسْتَحْوَذَ کا استعمال بطور استعارہ کے ہے جیسا کہ اِقْتَعَدَهُ الشَّیْطٰنُ وَارْتَكَبَهُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی شیطان نے اسے اپنی سواری بنا لیا۔
اَلْاَحْوَذِیُّ[1] مرد سبک فہم و نیک کارگزار کسی چیز کا ماہر یہ حَوْذٌ بمعنی سَوْقٌ (چلانا) سے مشتق ہے۔

(ح و ر)

اَلْحَوْرُ (ن) کے اصل معنی پلٹنے کے ہیں خواہ وہ پلٹنا بلحاظ ذات کے ہو یا بلحاظ فکر کے اور آیت کریمہ:۔
اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ (۸۴-۱۴) اور خیال کرتا تھا کہ (خدا کی طرف) پھر کر نہیں آئے گا۔

---

[1] وفی ذیل الامالی الرزق والحریۃ المسکنہ ۱۲

میں لَنْ یَّحُوْرَ سے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا مراد ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا:۔

زَعَمَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَنْ لَّنْ یُّبْعَثُوْا قُلْ بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ (۶۴-۷) جو لوگ کافر ہیں ان کا اعتقاد یہ ہے کہ وہ (دوبارہ) ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے۔ کہدو کہ ہاں ہاں میرے پروردگار کی قسم تم ضرور اٹھائے جاؤ گے۔

حَارَ الْمَاءُ فِی الْغَدِیْرِ پانی کا حوض میں گھومنا۔

حَارَ فِیْ اَمْرِہٖ کسی معاملہ میں متحیر ہونا۔

اسی سے مِحْوَرٌ ہے۔ یعنی وہ لکڑی جس پر چرخی گھومتی ہے اور گھومنے کے معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔

سَیْرُ السَّوَانِیْ اَبَدًا لَا یَنْقَطِعُ کہ پانی کھینچنے والے اونٹ ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔

مَحَارَۃُ الْاُذُنِ کان کا گڑھا۔ یہ مَحَارَۃُ الْمَاءِ کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے کیونکہ اس میں آواز سے ہوا اس طرح چکر کاٹتی ہے۔ جیسے گڑھے میں پانی گھومتا ہے۔ اَلْقَوْمُ فِیْ حَوَارٍ یعنی زیادتی کے بعد نقصان کی طرف لوٹ رہے ہیں حدیث میں ہے[1]:۔ (۱۰۱)

نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْکَوْرِ ہم زیادتی کے بعد کمی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ یا کسی کام کا عزم کر لینے کے بعد اس میں تردد سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں اسی طرح کہا جاتا ہے (مثل)

حَارَ بَعْدَ مَا کَارَ زیادہ ہونے کے بعد کم ہوگیا۔

اَلْمُحَاوَرَۃُ وَالْحِوَارُ ایک دوسرے کی طرف کلام لوٹانا اسی سے تَحَاوُرٌ (تبادلہ گفتگو) ہے قرآن میں ہے۔

وَاللّٰہُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَکُمَا (۵۸-۱) اور خدا تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔

کَلَّمْتُہٗ فَمَا رَجَعَ اِلَیَّ حَوَارًا اَوْ حَوِیْرًا اَوْ مَحُوْرَۃً میں نے اس سے بات کی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مَا یَعِیْشُ بِاَحْوَرَ وہ عقلمندی سے زندگی بسر نہیں کر رہا ہے۔ اور آیات کریمہ:۔

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِی الْخِیَامِ (۵۵-۷۲) وہ حوریں ہیں جو خیموں میں مستور ہیں۔

حُوْرٌ عِیْنٌ (۵۶-۲۲) اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں۔

میں حُوْرٌ، اَحْوَرُ اور حَوْرَاءُ کی جمع ہے۔ اور حَوَرٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی بقول بعض آنکھ کی سیاہی میں تھوڑی سی سفیدی ظاہر ہونے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔

اِحْوَرَّتْ عَیْنُہٗ یعنی اس کی آنکھ بہت سیاہی اور سفیدی والی ہے۔ اور یہ آنکھ کا انتہائی حسن سمجھا جاتا ہے جو اس سے مقصود ہو سکتا ہے۔

حَوَّرْتُ الشَّیْءَ کسی چیز کو گھمانا۔ سفید کرنا (کپڑے کا) اسی سے اَلْخُبْزُ الْحُوَّارٰی ہے جس کے معنی میدے کی روٹی کے ہیں عیسٰی علیہ السلام کے انصار و اصحاب کو حَوَارِیِّیْنَ کہا جاتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ قصار یعنی دھوبی تھے اور بعض نے کہا ہے کہ صیاد یعنی شکاری تھے بعض علماء کا خیال ہے کہ ان کو حواری اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو علمی اور دینی فائدہ پہنچا کر گناہوں کی میل سے اپنے آپ کو پاک کرتے تھے جس پاکیزگی کی طرف کہ آیت۔

---

[1] الحدیث فی اللسان (حور، کور، کون) ومجالس ثعلب ۳۵۱ ومجازات القرآن للشریف الرضی ۲۸۳ والمجازات النبویہ واساس البلاغۃ والفائق ۲/۳۱۱ وفیہ بعد الکون وغریب ابی عبید ۱/۲۱۹ والترمذی فی الدعوات والنسائی فی الاستعاذۃ و (حم) ۵: ۸۲-۸۳ والمثل فی جل المعاجم۔

إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا (۳۳-۳۳) میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر انہیں تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قَصَّارٌ کہہ دیا گیا ہے ورنہ اصل میں وہ دھوبی پن کا کام نہیں کرتے تھے اور اس سے وہ شخص مراد لیا جاتا ہے جو معرفت حقائق کی بنا پر عوام میں متداول پیشوں میں سے کوئی پیشہ اختیار نہ کرے اسی طرح ان کو صتیا و اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو حیرت سے نکال کر حق کیطرف لاکر گویا ان کا شکار کرتے تھے۔ آنحضرت نے حضرت زبیر کے متعلق فرمایا[1] (۱۰۲)

الزبیر ابن عمتی وحواریّ۔ کہ زبیر میرا پھوپھی زاد بھائی اور حواری ہے نیز فرمایا (۱۰۳) لکل نبی حواریٌّ وحواریَّ الزبیر۔ کہ ہر نبی کا کوئی نہ کوئی حواری رہا ہے اور میرا حواری زبیرؓ ہے۔ اس روایت میں حضرت زبیرؓ کو حواری کہنا محض نصرت اور مدد کے لحاظ سے ہے۔ جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا۔

مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللّٰهِ۔ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللّٰهِ (۶۱-۱۴) بھلا کون ہیں جو خدا کی طرف (بلانے میں) میرے مددگار ہوں۔ حواریوں نے کہا ہم خدا کے مددگار ہیں۔

ح و ش

حَاشَا (کلمہ استثناء اور تنزیہ ہی) قرآن میں ہے:۔

وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ (۱۲-۳۱) یعنی وہ ہر نقص سے پاک اور دور ہے۔

ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ یہ تنزیہ اور استثناء کیلئے آتا ہے۔ ابو علی الفسویؒ کا قول ہے کہ حاش اسم نہیں ہے۔ کیونکہ اس پر حرف جر داخل نہیں ہوتا۔ اور نہ حرف ہے کیونکہ حرف میں جب تک تضعیف نہ ہو اس میں سے حذف نہیں ہوتا۔ حالانکہ حاش و حاشی دونوں طرح بولتے ہیں۔ پس بعض حاش کو مستقل کلمہ مان کر اسے حُوش بمعنی وَحشی سے مشتق مانتے ہیں اور اسی سے حُوشِيُّ الْكَلَام (وحشی کلام) ہے اور بعض نے کہا ہے کہ حَوش کے معنی مذکر جن کے ہیں اور اسی کی طرف وَحشۃُ الصید منسوب ہے اور اَحشَتہٗ کے معنی ہیں کہ شکار کو ہر طرف سے گھیر کر پھندے کی طرف لایا۔

وَاسْتَوْحَشُوهُ وَتَحَوَّشُوهُ انہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

اَلْحَوْشُ (ن) ایک کنارے سے کھانا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ حتیٰ سے مقلوب ہے اور اسی سے حَاشِيَةٌ ہے جس کے معنی کنارے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[2] (بسیط)

(۱۲۲) وَمَا أُحَاشِي مِنَ الْأَقْوَامِ مِنْ أَحَدٍ

اور لوگوں سے میں کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتا گویا شاعر نے کہا ہے کہ میں کسی کو ایک حشا میں نہیں رکھتا۔ کہ تمہاری فضیلت بیان کرتے وقت

---

[1] اخرجہ النسائی والترمذی والبخاری من حدیث جابر وروت ک عن علی (راجع الفتح مناقب زبیر بن العوام وتخریج الکشاف لابن حجر ۱۲) [2] قالہ النابغۃ واولہ: ولا اری فاعلا فی الناس یشبہہ۔ الشطر فی الاشباہ النحویہ (۲: ۷) والبیت فی مختار الشعر الجاہلی (۱: ۷۷) والعقد الثمین ۷ واللسان (حشی) ودیوانہ ۱۲ والخزانہ (۲: ۴۴) والمغنی لابن ہشام (۱: ۱۳۰) والعینی (۱: ۳۸) والسیوطی ۲۸، ۲۷ اواسرار ابن الانباری ۲۰۸ وشرح العشر للتبریزی ۶ ۲۹ و اسمہ ابو امامہ زیاد بن معاویہ المتوفی (نحو ۱۸ ق) واختلف العلماء فی حاشیٰ ہل ہو فعل او حرف جر واستدل المبرد بہذا البیت علی ان حاشیٰ قد یکون فعلا انظر التفصیل فی البغدادیہ (۲: ۴۴-۴۵)

اسے مستثنیٰ کرنا پڑے۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے۔ (طویل)

(۱۲۳) وَلَا يَتَخَشَّى الْفَحْلُ اِنْ اَعْرَضَتْ بِهٖ
وَلَا يَمْنَعُ الْمِرْبَاعَ مِنْهُ نَصِيْلُهَا

(ح و ط)

اَلْحَائِطُ۔ دیوار جو کسی چیز کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہو اور اِحَاطَة (انفعال) کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے۔

(۱) اجسام کے متعلق جیسے۔ اَحَطْتُ بِمَكَانِ كَذَا یہ کبھی بمعنی حفاظت کے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ اَلَا اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ (۴۱-۵۴) سن رکھو کہ وہ ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یعنی وہ ہر جانب سے ان کی حفاظت کرتا ہے۔ اور کبھی روکنے کے معنی میں آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔ اِلَّا اَنْ يُّحَاطَ بِكُمْ (۱۲-۶۶) مگر یہ کہ تم گھیر لئے جاؤ۔ یعنی تمہیں روک لیا جائے۔ اور آیت کریمہ: اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ (۲-۸۱) اور اس کے گناہ (ہر طرف سے) اس کو گھیر لیں۔ میں بہت بلیغ استعارہ ہے۔ کیونکہ انسان جب کسی صغیرہ کا ارتکاب کرتا ہے اور اسے بار بار کرتا ہے تو یہ اسے کسی بڑے گناہ کے ارتکاب کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ اس طرح وہ برابر گناہوں کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ اور وہ گناہ کو چھوڑ نہیں سکتا۔ تو گویا گناہ نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا۔

(۲) دوم احاطہ بالعلم ہے جیسے فرمایا:۔ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (۶۵-۱۲) اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (۳-۱۲۰) یہ جو کچھ کرتے ہیں خدا اس پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (۱۱-۹۲) میرا پروردگار تو تمہارے سب اعمال پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔

اور کسی چیز پر علم کے ذریعے احاطہ کر لینے کا معنی یہ ہوتا ہے کہ انسان اس چیز کے وجود، جنس، کیفیت، اس کی غرض اور اس کو وجود میں لانے کے مقصد الغرض اس کے مالہ و ما علیہ کو پوری طرح جان لے۔ اور اس طرح کا احاطہ اللہ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن نے مخلوق سے اس قسم کے احاطہ علمی کی نفی کی ہے۔ جیسے فرمایا:۔ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ (۱۰-۳۹) حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے علم پر یہ قابو نہیں پا سکتے اس کو (نادانی سے) جھٹلا دیا۔ اور خضر نے حضرت موسیٰ سے کہا:۔

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا (۱۸-۶۸) اور جس بات کی تمہیں خبر ہی نہیں اس پر صبر کر بھی کیونکر سکتے ہو۔

اس میں تنبیہ ہے کہ جب تک کسی چیز پر پوری طرح احاطہ نہ ہو اس وقت تک کامل صبر بہت مشکل ہوتا ہے اور کسی چیز پر پوری طرح احاطہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نوازش کے بغیر ناممکن ہے۔

اور آیت کریمہ:۔ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ (۱۰-۲۲) اور وہ خیال کرتے ہیں کہ (اب تو) لہروں میں گھر گئے۔ میں احاطہ بالقدرۃ مراد ہے۔ اسی طرح فرمایا:۔ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا۔

لہ قالہ رجل من بنی عکل والبیت فی المعانی للقتیبی ۳۹۲، ۱۲۳۷ واللسان (خشی) ابن الباہلی فی المعانی ۱۲۲۳ ؛ ؛ ؛

(۲۸-۲۱) اور غنیمتیں دیں جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے (اور) وہ خدا ہی کی قدرت میں تھیں۔
اِنِّیٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ مُّحِیْطٍ (۱۱-۸۴) مجھے تمہارے بارے میں ایک ایسے دن کے عذاب کا خوف ہے جو تم کو گھیر کر رہیگا۔
اَلْاِحْتِیَاطُ (افتعال) یعنی ایسے وسائل بروئے کار لانا جن کے ذریعہ کسی (مضر) سے بچاؤ ہو سکے۔

(ح و ل)

اَلْحَوْلُ (ن) دراصل اس کے معنی کسی چیز کے متغیر ہونے اور دوسری چیزوں سے الگ ہونا کے ہیں معنی تغیر کے اعتبار سے حَالَ الشَّیْءُ یَحُوْلُ حُوُوْلًا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی شے کے متغیر ہونیکے ہیں۔ اور اِسْتَحَالَ کے معنی تغیر پذیر ہونے کے لئے مستعد ہونے کے اور معنی انفصال کے اعتبار سے حَالَ بَیْنِیْ وَ بَیْنَکَ کَذَا کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی میرے اور اس کے درمیان فلاں چیز حائل ہو گئی۔ اور آیت کریمہ:۔
اِنَّ اللّٰہَ یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ (۸-۲۴) اور جان رکھو کہ خدا آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔
میں باری تعالیٰ کے مقلب القلوب ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تقاضوں کے مطابق انسان کے دل میں ایسی بات ڈال دیتا ہے جو اسے اس کے مقصد سے پھیر دیتی ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَحِیْلَ بَیْنَہُمْ وَبَیْنَ مَا یَشْتَہُوْنَ (۳۴-۵۴) (ان میں اور ان کی خواہش کی چیزوں کے درمیان پردہ حائل کر دیا گیا) بھی اسی معنی پر محمول ہے۔
بعض نے آیت یَحُوْلُ بَیْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِہٖ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مہلت دے رکھتا ہے۔ تاکہ وہ ارذل عمر کی حد تک پہنچ جائے اور جاننے کے بعد کسی چیز کو بھی نہ جان سکے۔
حَوَّلْتُ الشَّیْءَ کسی چیز کو متغیر کرنا اور پھیر دینا۔ اور یہ تغیر کبھی باعتبار ذات کے ہوتا ہے اور کبھی باعتبار حکم اور قول کے اسی سے کہا جاتا ہے۔ اَحَلْتُ عَلٰی فُلَانٍ بِالدَّیْنِ میں نے فلاں پر قرض کا حوالہ کر دیا۔ حَوَّلْتُ الْکِتَابَ کتاب کو نقل کرنا۔ مثل مشہور ہے[1] (مثل) لَوْ کَانَ ذَا حِیْلَۃٍ لَتَحَوَّلَ اگر صاحب تدبیر ہوتا تو پھر جاتا اور آیت کریمہ:۔
لَا یَبْغُوْنَ عَنْہَا حِوَلًا (۱۸-۱۰۸) اور وہاں سے مکان بدلنا نہ چاہیں گے۔ میں حِوَلًا کے معنی تحول یعنی پھرنے کے ہیں۔
اَلْحَوْلُ سال کو کہتے ہیں اس لئے کہ سال بھر میں سورج اپنی گردش پوری کر لیتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَالْوَالِدَاتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَہُنَّ حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ (۲-۲۳۳) اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔
مَتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ (۲-۲۴۰) کہ ان کو ایک سال تک خرچ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔
اسی سے حَالَتِ السَّنَۃُ تَحُوْلُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں سال گزر گیا۔ حَالَتِ الدَّارُ

---

[1] راجع للمثل المیدانی رقم ۳۲۲۴، ۲۷۱، ۱۳۴

گھر کی حالت متغیر ہوگئی۔
اَحَالَتْ وَاَحْوَلَتْ اس پر ایک سال پورا ہوگیا جیسا کہ اَعَامَتْ وَاَشْهَرَتْ کا محاورہ ہے۔
اَحَالَ فُلَانٌ بِمَكَانٍ كَذَا وہ فلاں جگہ پورا ایک سال رہا۔
حَالَتِ النَّاقَةُ تَحُوْلُ حِيَالًا اونٹنی کا حاملہ نہ ہونا۔ گویا اس کی پہلی حالت متغیر ہوگئی۔
اَلْحَالُ انسان وغیرہ کی وہ حالت جو نفس جسم اور مال کے اعتبار سے بدلتی رہتی ہے اور حَوْل کا لفظ مالی، بدنی اور جسمانی تینوں قسم کی قوت پر بولا جاتا ہے اسی سے کہا جاتا ہے۔
لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ اللہ کے سوا کچھ حیلہ اور قوت نہیں ہے۔
حَوْلُ الشَّيْءِ۔ کسی چیز کی وہ جانب جس کی طرف اسے پھیرنا ممکن ہو حَوْل کہلاتا ہے۔
قرآن میں ہے:۔
اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ (۴۰-۷)
اور جو لوگ عرش کو اٹھائے ہوئے اور جو اس کے گرداگرد (حلقہ باندھے ہوئے) ہیں۔
اَلْحِيْلَةُ وَالْحُوَيْلَةُ اس تدبیر کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز تک پوشیدہ طور سے پہنچا جاسکے۔ عام طور پر اس کا استعمال بری تدبیر کے لئے ہوتا ہے لیکن کبھی ایسی تدبیر کے متعلق بھی ہوتا ہے جس میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے اسی معنی میں اللہ تعالٰے کے وصف ہیں:۔ وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ (۱۳-۱۳) آیا ہے یعنی باری تعالٰی خفیہ سے اس کام کو سرانجام دیتا ہے جس میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے اور اسی معنی میں اللہ تعالٰے کو مکر و کید کے ساتھ متصف کیا جاتا ہے۔ نہ کہ بطور مذمت کے اللہ تعالٰی تو ہر قبح سے پاک اور بالا ہے۔
اور حِيْلَةٌ بھی حَوْل سے مشتق ہے واؤ کا ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے اسے یار سے تبدیل کردیا گیا ہے اور اسی سے رَجُلٌ حُوَلٌ کا محاورہ ہے یعنی بہت چالاک اور ہوشیار ہے۔
اَلْمُحَالُ کے معنی ہیں دو متناقض چیزوں کا ایک جگہ جمع ہونا یہ کبھی قول میں ہوتا ہے جیسے کہا جائے ایک جسم دو جگہوں میں ایک ہی حالت میں پایا جاتا ہے۔ اِسْتَحَالَ الشَّيْءُ کسی چیز کا محال ہونا اور اس چیز کو مُسْتَحِيْل کہا جاتا ہے یعنی محال ہونے لگی۔
اَلْحِوَلَاءُ یعنی سبز سی جھلی جو اونٹنی کے پیٹ سے بچے کے ساتھ نکلتی ہے۔
مثل مشہور ہے[1] (مثل) وَلَا اَفْعَلُ كَذَا مَا اَرْزَمَتْ اُمُّ حَائِلٍ جب تک کہ اونٹنی آواز نکالتی رہے میں اس کام کو نہیں کرونگا اور ام حائل اس شتر بچہ مادینہ کو کہتے ہیں جو ابھی پیٹ سے باہر آیا ہو اور اس میں شبہ نہ رہا ہو نہ کہ یہ مادہ ہے حالت اشتباہ کے دور ہونے کی وجہ سے اسے ام حائل کہا جاتا ہے۔
اَلْحَالُ لغت میں اس صفت کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کوئی چیز موصوف ہوتی ہے اور اہل منطق کی اصطلاح میں سریع الزوال کیفیت کو حالت کہا جاتا ہے۔ جیسے حرارت برودت یبوست اور رطوبت جو کسی چیز کو عارض ہوتی ہے۔

(ح و ی)

اَلْحَوَايَا (انتڑیاں) یہ حَوِيَّةٌ کی جمع ہے

---
[1] ای لا افعلہ ابدا راجع اللسان (حول) والامالی ۱/۲

جس کے معنی آنت کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اَوِ الْحَوَايَا اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ (۶-۱۴۶) یا
انتڑیوں میں ہو یا ہڈی میں ملی ہو۔
اور حَوِيَّةٌ اس کمبل کو بھی کہتے ہیں جو اونٹ
کی کوہان کے ارد گرد لپٹا جاتا ہے۔ یہ اصل میں
حَوَيْتُ (ض) حَيًّا وَ حَوَايَةً سے مشتق ہے۔
جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔
اَلْاَحْوٰى کالا سیاہ مائل بہ سبزی۔ یہ حُوَّةٌ سے
مشتق ہے جس کے معنی سبزی مائل سیاہی ہیں
اور اس کا باب اَحْوَ ٰى يَحْوَوِيْ اِحْوَاءً
آتا ہے جیسے اِدْعَوٰى بعض نے کہا ہے کہ اس وزن
پر یہ دو باب ہی آتے ہیں وَلَا ثَالِثَ لَهُمَا
حَوِيَ حُوَّةً سیاہ سبزی مائل ہونا اسی سے
اَحْوٰى ہے جس کے معنی سخت سیاہ کے ہیں۔

قرآن میں ہے:۔
فَجَعَلَهٗ غُثَاءً اَحْوٰى (۸۷-۵) پھر اس کو
سیاہ رنگ کا کوڑا کر دیا۔
یہاں اَحْوٰى سے مراد ہے وہ گھاس جو پرانی
بوسیدہ ہو کر سیاہ پڑ جائے۔ جس کے متعلق
شاعر نے کہا ہے[1] (   )
(۱۲۴) كَالَ حَبَشِيٍّ بِالدِّيْنِ الْاَسْوَدِ
پرانی خشک اور سیاہ گھاس یعنی بوم سے محسوس
ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ آیت کی ترتیب اصل
یہ ہے[2]۔ وَالَّذِيْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى۔ اَحْوٰى فَجَعَلَهٗ
غُثَاءً یعنی اللہ تعالےٰ سبز چارہ اگاتا ہے پھر
اس کو کوڑا بنا دیتا ہے۔

(ح ی ث)

حَيْثُ (یہ ظرف مکان مبنی بر ضم ہے) اور
مکان مبہم کے لئے آتا ہے جس کی مابعد کے جملہ
سے تشریح ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ (۲-۱۴۴) اور تم جہاں ہوا کرو۔
وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ (۲-۱۴۹) اور تم جہاں سے نکلو۔

(ح ی د)

اَلْحَيْدُ (ض) کے معنی پہلو تہی کرنے اور
دور بھاگنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (۵۰-۱۹) (اے
انسان) یہی (وہ حالت) ہے جس سے تو بھاگتا تھا۔

(ح ی ر)

حَارَ (ض) حَيْرَةً فَهُوَ حَائِرٌ وَ حَيْرَانُ
وَتَحَيَّرَ وَاسْتَحَارَ کے معنی کسی کام سے بھٹکنے اور
متردد ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِيْنُ فِي الْاَرْضِ
حَيْرَانَ (۶-۷۱) جیسے کسی کو جنات نے جنگل
میں بھلا دیا ہو (اور وہ) حیران ہو رہا ہو۔
اَلْحَائِرُ جائے گرداب۔ شاعر نے کہا ہے[3] (   )
(۱۲۵) وَاسْتَحَارَ شَبَابُهَا
اور اس کی جوانی بھرپور ہو گئی۔ اور استحار کے

---

[1] لم اجرہا دیرجل ۱۲ [2] وعلی ہذا التقدیر یکون احوی حالًا کما فی الکشاف ۴: ۲۳۸ وذکرہ ثعلب فی مجالسہ ۳۰۷ فی امثالہ التغلب ۱۲
[3] قالہ ابو ذؤیب الہذلی وتکملتہ ثلاثۃ اعوام فلما تجرمت تقضی شبابی ... والبیت فی اللسان والصحاح والتاج (جرم) والمحکم (جرا
وفی روایتہ احوال بدل اعوام الینا بھون بدل تقضی شبابی ودیوان الہذلیین الستۃ (۱: ۷) والسیوطی ۹ فی روایۃ علینا بھون وکذا
فی (س) ودیوان الہذلیین ۱۲

معنی پانی سے پیٹ کے اس قدر پر ہو جانے کے ہیں کہ اسے حیرت لاحق ہو جائے۔
اَلْحِیْرُ: ایک مقام کا نام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ پانی کے جمع ہونے کی وجہ سے اس مقام کا نام حِیْرَۃٌ پڑ گیا تھا۔

(ح ی ص)

حَاصَ (ض) عن الحق کے معنی حق سے بھاگ کر شدت و مکروہ کی طرف جانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ هَلْ مِنْ مَّحِیْصٍ (۵۰-۳۶) کہ کہیں بھاگنے کی جگہ ہے۔ مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ (۱۴-۲۱) کوئی جگہ گریز اور رہائی ہمارے لئے نہیں ہے۔
یہ اصل میں حَیْصٌ وَبَیْصٌ سے ہے جس کے شدت اور سختی کے ہیں۔ مگر اَلْحَوْصُ (واوی) ہو تو اس کے معنی چیرا اسلنا ہونے ہیں اور اسی سے حُصْتُ عینَ الصَّقْرِ کا محاورہ ہے جس کے معنی صقرہ کی آنکھیں سی دینے کے ہیں۔

(ح ی ض)

اَلْحَیْضُ۔ وہ خون جو مخصوص دنوں میں صفت خاص کے ساتھ عورت کے رحم سے جاری ہوتا ہے اسے حیض کہا جاتا ہے۔ اور مَحِیْضٌ کے معنی حیض، وقت حیض اور مقام حیض کے ہیں۔ کیونکہ فعل سے اس قسم کے مصادر مَفْعَلٌ کے وزن پر آتے ہیں جیسے مَعَاشٌ و مَعَادٌ اور شاعر کے قول[1] ع (الکامل)

(۱۲۶) لَا یَسْتَطِیْعُ بِهَا الْقُرَادُ مَقِیْلًا
(کہ چچڑی اس میں قیلولہ کی جگہ بھی نہیں پاتی) میں مقیلا ظرف ہے یعنی قیلولہ کرنے کی جگہ گو بعض نے کہا ہے کہ یہ مصدر ہے اور کہا جاتا ہے مَا فِی بُرِّكَ مَكِیْلٌ وَ مَكَالٌ کہ تیرے غلہ میں ماپ نہیں ہے۔

(ح ی ف)

اَلْحَیْفُ (ض) فیصلہ کرنے میں ایک جانب کو جھک جانا انصاف نہ کرنا۔ قرآن میں ہے:۔ اَمْ یَخَافُوْنَ اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ بَلْ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۲۴-۵۰) یا ان کو خوف ہے کہ خدا اور اس کا رسول ان کے حق میں ظلم کرینگے (نہیں) بلکہ یہ خود ظالم ہیں۔
کہا جاتا ہے:۔
تَحَیَّفْتُ الشَّیْءَ میں نے اسے کناروں سے پکڑا۔

(ح ی ق)

(اَلْحُیُوْقُ وَالْحَیَقَانُ (ض) کے معنی کسی چیز کو گھیرنے اور اس پر نازل ہونے کے ہیں۔ اور یہ باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ وَلَا یَحِیْقُ الْمَكْرُ السَّیِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (۳۵-۴۳) اور بری چال کا وبال اسکے چلنے والے پر ہی پڑتا ہے۔ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۶-۲۶) اور جس چیز سے استہزاء کیا کرتے تھے اس نے ان کو آ گھیرا۔

---

[1] قالہ الراعی النمیری عبید بن حصین بن جندل الراعی (ابو جندل ہو من فحول الشعراء) وصدرہ: بُنِیَتْ مرافقهن فوق مزلة ۔۔۔۔ والبیت من كلمة جمهرية طويلة (ا/۲۳۱-۲۳۷) وراجع للبیت اللسان (زلل) وامالی المرتضی ا/۲۲۲ والبحر (۲: ۱۶۷) والكتاب (۲: ۲۴۷) مع فرحه للشنتمری المفصل (۹۰: ۱۶/۵۵: ۱۲) والمحكم (حیض) واللسان وفیه مایستطیع والحیوان (۵: ۳۴۷) وفی روایتہ نبتت بدل بنیت وفی بعض الروایات ثبتت ۱۲

(ح ی ن)

اَلْحِیْنُ۔ اس وقت کو کہتے ہیں جس میں کوئی چیز پہنچے اور حاصل ہو۔ یہ ظرف مبہم ہے اور اس کی تعیین ہمیشہ مضاف الیہ سے ہوتی ہے جیسے فرمایا۔ وَلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ (۳۸-۳) اور وہ رہائی کا وقت نہ تھا۔

اور بعض نے حینُ (رفع کے ساتھ) پڑھا ہے پس حین کا استعمال چند وجوہ پر ہوتا ہے۔

(۱) مدت اور اجل کے معنی میں جیسے فرمایا:۔ وَمَتَّعْنَاهُمْ اِلٰى حِيْنٍ (۱۰-۹۸) اور ایک مدت تک (فوائد دنیوی سے) ان کو بہرہ مند رکھا۔

(۲) سال اور برس کے معنی میں جیسے:۔ تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا (۱۴-۲۵) اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہو۔

(۳) ایک ساعت اور گھڑی کے معنی میں جیسے فرمایا:۔ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ (۳۰-۱۷) توجس وقت تم کو شام ہو اور جس وقت صبح ہو۔۔۔

(۴) مطلق زمانہ اور وقت کے معنی میں جیسے فرمایا۔ هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ (۷۶-۱) بیشک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آ چکا ہے۔

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ (۳۸-۸۸) اور تم کو اس کا حال ایک وقت کے بعد معلوم ہو جائیگا۔ اور کسی ایک معنی کی تعیین موقع و محل کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے۔

عَامَلْتُهٗ مُحَايَنَةً" میں نے اس سے وقتاً فوقتاً معاملہ کیا۔

اَحْيَنْتُ بِالْمَكَانِ میں وہاں ایک عرصہ ٹھہر ا رہا۔ حَانَ حِيْنُ كَذَا۔ فلاں چیز کا موسم قریب آ پہنچا۔ حَيَّنْتُ الشَّيْءَ کسی چیز کیلئے وقت مقرر کرنا۔ اور اَلْحَيْنُ (بفتح الحاء) کے معنی موت اور ہلاکت کے ہیں۔

(ح ی ی)

اَلْحَيَاةُ زندگی، جیسا یہ اصل میں حَیِیَ (س) یحییٰ کا مصدر ہے) کا استعمال مختلف وجوہ پر ہوتا ہے۔

(۱) قوت نامیہ جو حیوانات اور نباتات دونوں میں پائی جاتی ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے نبات کو حَیٌّ یعنی زندہ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (۵۷-۱۷) جان رکھو کہ خدا ہی زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے۔

فَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا (۵۰-۱۱) اور اس (پانی) سے ہم نے شہر مردہ (یعنی زمین افتادہ) کو زندہ کیا۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ (۲۱-۳۰) اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔

(۲) دوم حیاۃ کے معنی قوت احساس کے آتے ہیں اور اسی قوت کی بنا پر حیوان کو حیوان کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَاءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ (۳۵-۲۲) اور نہ زندے اور مردے برابر ہو سکتے ہیں۔ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَاءً وَّاَمْوَاتًا (۷۷-۲۵-۲۶) اور آیت کریمہ:۔ اِنَّ الَّذِيْ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

قَدِیْرٌ (۴۱ - ۳۹) توجس نے زمین کو زندہ کیا وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہاں زمین کو زندہ کرنے سے اسے قوت نامیہ عطا کرنا مراد ہے اور مُحْيِ الْمَوْتٰى سے قوت احساس کے عطا کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

(۳) قوت عاقلہ عاملہ کا عطا کرنا مراد ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:۔ اَوَمَنْ کَانَ مَیْتًا فَاَحْیَیْنٰہُ (۶-۱۲۲) بھلا جو پہلے مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کیا۔

اور شاعر نے کہا ہے[1] ( )

(۱۲۷) اَسْمَعْتَ لَوْ نَادَیْتَ حَیًّا
وَلٰکِنْ لَاحَیَاۃَ لِمَنْ تُنَادِیْ

اگر تو کسی زندہ کو پکارتا تو وہ سن لیتا۔ لیکن جس کو تم پکار رہے ہو اس میں زندگی نہیں ہے (یعنی عقل سے محروم ہے)

(۴) غم کا دور ہونا مراد ہوتا ہے۔ اس معنی میں شاعر نے کہا ہے[2] ع (خفیف)

(۱۲۸) لَیْسَ مَنْ مَّاتَ فَاسْتَرَاحَ بِمَیْتٍ
اِنَّمَا الْمَیْتُ مَیِّتُ الْاَحْیَاءِ

جو شخص مر کر راحت کی نیند سو گیا وہ درحقیقت مردہ نہیں ہے۔ حقیقتاً مردے وہ ہیں جو زندہ ہونے کے باوجود مردے بنے ہوئے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ (۳-۱۶۹) جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مرے ہوئے نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ خدا کے نزدیک زندہ ہیں۔

میں شہداء کو اسی معنی میں اَحْیَاءٌ یعنی زندے کہا ہے۔ کیونکہ وہ لذت و راحت میں ہیں۔ جیسا کہ ارواح شہداء کے متعلق بہت سی احادیث مروی ہیں۔

(۵) حیات سے آخرت کی دائمی زندگی مراد ہوتی ہے۔ جو کہ علم و عقل کی زندگی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] البیت فی التاج غیر منسوب والطبرسی (۱: ۹۶) والطبری (۵/۷۸) والبحر (۱: ۳۷۲، ۴۸۶) وتنزیہ القرآن ۱۰ وفیہ تقدیمل وقد البیت لطائف المعارف للبونی ۷۳۳ وفی المطبوع وقد نادیت لو اسمعت حیا مقلوب ثم رأیت فی البلدان (رسم ابیہ) ان قائلہ کثیر یرثی صدیقہ اخنف فانی ۱۹ بیتا ۱۲

[2] البیت مقطوعۃ لعدی بن الرعلاء الغسانی جاہلی وہو الذی یقال لہ کوثی ابن الرعلاء (التاج یکوت، کوث) والنحویون یستشہدون بہ (راجع معالم الاہتداء للزبیدی ص) والبیت فی الاصمعیات ۵ وتہذیب الالفاظ ۴۴ والمعجم للمرزبانی ۸۷ والسمط ۸/۳، ۶ والخزانۃ (۴: ۱۸۷) وابن الشجری ۱۵ والسیوطی ۳۸، ۴/۸۷ والاقتضاب ۸۹ ومجاز القرآن ۹۴ ارقم ۹۷ اوالصناعتین ۳۱۵ والبحر (۱: ۲۰۹) وایام العرب ۵۳ والرسالۃ القشیریۃ ۴۲ والحکم (شعث) فی امثلۃ بیت التشعیث واضداد ابی الطیب (۱: ۸۱۲) ونسبہ البحتری فی الحماسۃ ۴۱۴ الی یاقوت فی الارشاد (۹: ۲۱۹) والمعجم ۲۶۹ الی صالح بن عبدالقدوس قال الاستاذ المیمنی فی ذیل السمط وہو بہ الیط وبمذہبہ اونق والاسف ان الاستاذ حسن کامل الصیرفی نقل تخریج المیمنی بغیر عزو فی تعلیقاتہ علی دیوان البحتری وذکر الجاحظ فی البیان (۱: ۱۳۲) ان الحسن البصری کان یتمثل بہذا البیت فی مجلسہ ومواعظہ راجع الحیوان ۶، ۵۰۷ وکنز العمال رقم ۵۵۱، ۲ للدیلمی عن انس او ابن عباس واضداد ابی الطیب ۸۱۳ ولطائف المعارف للبونی ۳۲۷ وفی المیدانی (۱: ۲۸۹) مثل یضرب بمن یوعظ فلا یقبل ولا یفہم وفی المعجم للمرزبانی واللآلی ان الشاعر قالہا فی وقعہ عین اباغ بین الغساسنۃ بالشام والمناذرۃ بالعراق وانہا کم ترکنا بالعین عین اباغ من ملیک وسوقۃ القاء ولعدالشاہد انما المیت من یعیش ذلیلا کاسفا بالہ قلیل الرجاء وبہذا یتضح المراد ۱۲

اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (۸-۲۴) خدا اور اس کے رسول کا حکم قبول کرو جب کہ رسول خدا تمہیں ایسے کام کے لئے بلاتے ہیں جو تم کو زندگی (جاوداں) بخشتا ہے۔
اسی طرح آیت کریمہ:۔
یٰلَیْتَنِیْ قَدَّمْتُ لِحَیَاتِیْ (۸۹-۲۴) کاش میں نے اپنی زندگی (کی جاودانی کے لئے) کچھ آگے بھیجا ہوتا۔
میں بھی اخروی دائمی زندگی مراد ہے۔

(۶) وہ حیات جس سے صرف ذات باری تعالیٰ متصف ہوتی ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ کی صفت میں حیّ کہا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ ذات اقدس ہوتی ہے جس کے متعلق موت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

پھر دنیا اور آخرت کے لحاظ بھی زندگی دو قسم پر ہے یعنی حیات دنیا اور حیات آخرت چنانچہ فرمایا:۔
فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا (۷۹-۳۷-۳۸) تو جس نے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو مقدم سمجھا۔
اِشْتَرَوُا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ (۲-۸۶) جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔
وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (۱۳-۲۶) اور دنیا کی زندگی آخرت (کے مقابلے) میں (بہت) تھوڑا فائدہ ہے۔ یہاں متاع سے دنیاوی ساز وسامان مراد ہے۔
وَرَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا (۱۰-۷) اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اسی پر مطمئن ہو بیٹھے۔
وَلَتَجِدَنَّھُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَیٰوةٍ (۲-۹۶) بلکہ تم ان کو اور لوگوں سے زندگی پر کہیں حریص دیکھو گے اور آیت کریمہ:۔
وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى.... (۲-۲۶۰) اور جب ابراہیمؑ نے (خدا سے) کہا کہ اے پروردگار مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا۔
میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اخروی زندگی کی کیفیت کا مشاہدہ کرنے کے متعلق سوال کیا تھا۔ جو دنیوی آفات کے شوائب سے پاک ہو گی۔
اور آیت کریمہ:۔
وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ (۲-۱۷۹) اور اے اہل عقل (حکم) قصاص میں (تمہاری) زندگی ہے۔
میں قصاص میں حیات ہونے کے معنی یہ ہیں کہ قصاص کے خوف سے لوگ قتل پر اقدام کرنے سے رکے رہیں گے۔ لہذا اس سے لوگوں کو زندگی حاصل ہو گی۔
وَمَنْ اَحْیَاھَا فَكَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا (۵-۳۲) اور جو اس کی زندگی کا موجب ہوا تو گویا تمام لوگوں کی زندگی کا موجب ہوا۔
یعنی انہیں ہلاکت سے نجات بخشی اور آیت کریمہ:۔
رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ (۲-۲۵۸) میرا پروردگار تو وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے وہ بولا کہ جلا اور مار تو میں بھی کر سکتا ہوں۔
میں بھی یہی معنی مراد ہیں اس کافر کا مطلب یہ تھا کہ میں ایک شخص کو معاف کر کے اسے زندگی بخشتا ہوں۔

اَلْحَیَوَانُ یہ زندگی کا مقام اور مقر ہوتا ہے اور دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) وہ جس میں قوت احساس ہو (۲) وہ جسے دائمی بقا حاصل ہو اور آیت کریمہ:۔
وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ (۲۹-۶۴) اور (ہمیشہ کی) زندگی (کا مقام) آخرت کا گھر ہے۔ کاش یہ (لوگ) سمجھتے۔

میں اسی دوسرے معنی کے لحاظ سے دار آخرت کو حیوان کہا گیا ہے۔ اور لَهِیَ الْحَیَوَانُ کہہ کر تنبیہ کی ہے کہ حقیقی اور سرمدی زندگی تو وہ ہے جس کے بعد فنا نہ آئے نہ کہ وہ جو کچھ مدت کے بعد فنا ہو جائے۔

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ حَیَوَان اور حیاۃ دونوں ہم معنی ہیں بعض کہتے ہیں کہ حَیَوَان وہ ہے جس میں حیاۃ یعنی زندگی ہو اس کے بالمقابل مَوَتَانَ وہ ہے جس میں زندگی نہ ہو۔ اور بارش کو حَیًّا کہا جاتا ہے کیونکہ وہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتی ہے اور آیت :-

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (۲۱-۳۰)

میں اسی معنی کی طرف اشارہ ہے اور آیت کریمہ:-

اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ اِسْمُهٗ یَحْیٰی (۱۹-۷)

میں انہیں یحیٰی کہنے سے صرف یہ مقصود نہیں تھا۔ کہ وہ اس نام سے مشہور ہوں گے۔ کیونکہ اس سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوگا بلکہ اس بات پر تنبیہ کرنا تھا کہ گناہوں سے اس کا دل مردہ نہیں ہوگا جیسا کہ اکثر لوگوں کا حال ہے اور آیت کریمہ :-

یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَیُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ (۳۰-۱۹) وہی زندے کو مردے سے نکالتا ہے اور (وہی) مردے کو زندہ سے نکالتا ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ نطفہ سے انسان پیدا کرتا ہے اور انڈے سے مرغی۔ اسی طرح زمین سے نباتات نکالتا ہے اور انسان سے نطفہ۔ اور آیت کریمہ:-

وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّةٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا (۴-۸۶) اور جب تم کو کوئی دعا دے تو (جواب میں) تم اس سے بہتر (کلمے) سے (اسے) دعا دیا کرو یا انہی لفظوں سے دعا دو۔ نیز:

فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُیُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ تَحِیَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (۲۴-۶۱) اور جب گھروں میں جایا کرو تو اپنے (گھر والوں کو) سلام کیا کرو (یہ) خدا کی طرف سے ... تحفہ ہے۔

میں تَحِیَّة کے معنی کسی کو حَیَّاكَ اللّٰهُ کہنے کے ہیں یعنی اللہ تجھے زندہ رکھے۔ یہ اصل میں جملہ خبریہ ہے لیکن دعا کے طور پر استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے حَیَّا فُلَانٌ فُلَانًا تَحِیَّةً فلاں نے اسے حَیَّاكَ اللّٰهُ کہا۔ اصل میں تَحِیَّة حیات سے مشتق ہے۔ پھر دعائے حیات کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ کیونکہ جملہ اقسام تحیۃ حصول حیاۃ یا سبب حیاۃ سے خارج نہیں ہیں خواہ یہ دنیا میں حاصل ہو یا عقبیٰ میں۔ اسی سے اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰهِ[1] ہے اور آیت کریمہ :-

وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَكُمْ (۲-۴۹) اور بیٹیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔

کے معنی عورتوں کو زندہ چھوڑ دینے کے ہیں۔

اَلْحَیَاءُ کے معنی قبائح سے نفس کے منقبض ہو کر انہیں چھوڑ دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ حَیِیَ فَهُوَ حَیٌّ وَاسْتَحْیَا فَهُوَ مُسْتَحْیٍ۔ اور بعض نے اِسْتَحٰی فَهُوَ مُسْتَحٍ (تخفیف یاء) کے ساتھ بھی نقل کیا ہے۔ قرآن میں ہے:-

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا (۲-۲۶) خدا اس بات

[1] دیلمی التشہد فی الصلوٰۃ والفاظہ وردت فی عدۃ احادیث والمعروف تشہد عبداللہ بن مسعود واخرجہ الائمۃ الستۃ ومنہا تشہد ابن عباس واختارہ الشافعی ومذہب مالک واصحابہ الی تشہد عمرؓ راجع الزرقانی علی الموطا لا: ۱۷۶-۱۷۸) ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

سے عار نہیں کرتا کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز (مثلاً مکھی مکڑی وغیرہ) کی مثال بیان فرمائے۔

وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیِیْ مِنَ الْحَقِّ (۳۳-۵۳) لیکن خدا سچی بات کے کہنے سے شرم نہیں کرتا۔

ایک روایت میں ہے[1]۔

(۱۰۳) اِنَّ اللّٰہَ یَسْتَحْیِیْ مِنْ ذِی الشَّیْبَۃِ الْمُسْلِمِ اَنْ یُعَذِّبَہٗ کہ اللہ تعالیٰ بوڑھے مسلمان کو عذاب دینے سے شرماتا ہے۔

پس اللہ کی طرف جب حیا کی نسبت ہو تو اس کے معنی انقباض نفس کے نہیں ہوتے۔ کیونکہ اس قسم کے اوصاف سے ذات باری تعالیٰ منزہ ہے بلکہ اس سے مراد اسے عذاب نہ کرنا ہے اور ایک دوسری حدیث میں ہے[2]

(۱۰۴) اِنَّ اللّٰہَ حَیِیٌّ کہ اللہ حیی ہے تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ اللہ قبائح کو چھوڑنے والا اور محاسن یعنی افعال حسنہ کو سرانجام دینے والا ہے۔

---

[1] ...

[2] ورد الحدیث بالفاظ مختلفۃ وتمامہ کریم یستحی من عبدہ اذا رفع یدیہ ان یردھما صفرا راجع ابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ من حدیث سلمان والحدیث ایضا فی المستدرک للحاکم من انس وابی یعلی عن جابر ابن عمر من الطبرانی وراجع عون المعبود ار ۵۳ والکافی لابن جریر قم ۳۴ وکنز العمال رقم ۳۴۴۲ و۳۴۴۲ و ۳۲۵۳ و ۳۲۸۴ (عبدالرزاق عن انس) والحکیم الترمذی ایضا عن انس ج ۲ وایضا ۳۸۴-۳۸۴

کتاب الخاء

(خ ب ء)

اَلْخَبْءُ (ف) کسی چیز کے پوشیدہ اور مخفی ذخیرہ کو خبأ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اَلَّذِیْ یُخْرِجُ الْخَبْءَ (۲۷-۲۵) جو چھپے ہوئے خزانے نکالتا ہے۔
اسی سے جَارِیَۃٌ خُبَأَۃٌ (طُلَعَۃٌ) کا محاورہ ہے[1] یعنی وہ لڑکی جو کبھی پردہ میں چلی جاتی ہو اور کبھی باہر نکل آتی ہو۔
اَلْخِبَاءُ وہ نشان جو داونٹنی کے، کسی خفیہ مقام پر لگایا گیا ہو۔

(خ ب ت)

اَلْخَبْتُ نشیبی اور نرم زمین کو کہتے ہیں اور اَخْبَتَ الرَّجُلُ کے معنی نشیبی اور نرم زمین کا قصد کرنے یا وہاں اترنے کے ہیں (جیسے اَسْہَلَ وَاَنْجَدَ) اس کے بعد لفظ اَلْاِخْبَاتُ (افعال) نرمی اور تواضع کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔
قرآن میں ہے۔
وَاَخْبَتُوْا اِلٰی رَبِّہِمْ (۱۱-۲۳) اور اپنے پروردگار کے آگے عاجزی کی۔
وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ۔ (۲۲-۳۴) اور عاجزی کرنے والوں کو خوش خبری سنادو۔
یعنی تواضع کرنے والوں کو جیسا کہ دوسری جگہ انہی لوگوں کے متعلق لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ (۷-۲۰۶) فرمایا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ فَتُخْبِتَ لَہٗ قُلُوْبُہُمْ (۲۲-۵۴) تو ان کے دل اللہ کے سامنے عاجزی کریں۔ میں اخبات کے معنی دلوں کے نرم ہونے اور عاجزی کرنے کے ہیں۔ اور یہاں اس کے معنی قریبًا وہی ہیں جو کہ آیت وَاِنَّ مِنْہَا لَمَا یَہْبِطُ مِنْ خَشْیَۃِ اللّٰہِ (۲-۷۴) اور بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ خدا کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ میں ہبوط کے ہیں۔

(خ ب ث)

اَلْمَخْبَثُ وَالْخَبِیْثُ۔ ہر وہ چیز جو ردی اور خسیس ہونے کی وجہ سے بری معلوم ہو خواہ وہ چیز محسوسات سے ہو یا معقولات (یعنی عقائد وخیالات) سے تعلق رکھتی ہو اصل میں خبیث ردی اور ناکارہ چیز کو کہتے ہیں جو بمنزلہ لوہے کی میل کے ہو۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ع (۱)

(۱۰۹) سَبَکْنَاہُ وَنَحْسِبُہٗ لُجَیْنًا!
فَاَبْدَی الْکِیْرُ عَنْ خَبَثِ الْحَدِیْدِ

ہم نے اسے اس خیال سے ڈھالا کہ یہ چاندی ہے لیکن بھٹی میں ڈالنے سے معلوم ہوا کہ یہ لوہے کا میل ہے۔ اس اعتبار سے یہ اعتقادِ باطل، کذب اور فعل

---

[1] والمعروف فی المثل خباۃ طلعۃ فہہنا سقوط

تبیح سب کو شامل ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (۷-۱۵۷) اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں۔
یعنی محظورات جو طبیعت کے ناموافق ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
وَنَجَّيْنَاهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ (۲۱-۷۴) اور اس بستی سے جہاں کے لوگ گندے کام کرتے تھے بچا نکالا۔
میں عمل خبائث میں لذت اندوزی کے لئے مردوں کی طرف مائل ہونے سے کنایہ ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ (۳-۱۷۹) جب تک خدا ناپاک کو پاک سے الگ نہ کر دیگا۔
میں اعمالِ خبیثہ کو اعمال صالحہ سے اور بدباطن لوگوں کو نفوسِ زکیہ سے تمیز دینا مراد ہے۔ اور آیت:۔
وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ (۴-۲) اور ان کے پاکیزہ (اور عمدہ) مال کو (اپنے ناقص اور) برے مال سے نہ بدلو۔
میں خبیث اور طیب سے حلال اور حرام مراد ہیں اور فرمایا:۔
اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ (۲۴-۲۶) ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لئے ہیں اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لئے۔
یعنی افعال قبیحہ اور آوارہ کام، بدباطن اور آوارہ لوگ ہی کرتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ (۵-۱۰۰) کہدو کہ ناپاک چیزیں اور پاک چیزیں برابر نہیں ہوتیں۔
میں خبیث اور طیب سے کافر اور مومن اور اچھے اور برے اعمال مراد ہیں۔ اور آیت:۔
مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةٍ (۱۴-۲۶) اور ناپاک بات کی مثال ناپاک درخت کی سی ہے۔
میں کفر، جھوٹ، چغلی ہر قسم کی قبیح باتیں داخل ہیں حدیث میں ہے:۔
اَلْمُؤْمِنُ اَطْيَبُ مِنْ عَمَلِهٖ وَالْكَافِرُ اَخْبَثُ مِنْ عَمَلِهٖ۔ کہ مومن اپنے عمل سے پاک اور کافر اپنے عمل سے ناپاک ہے۔
اور خَبِيْث وَمُخْبِثٌ خبث کے مرتکب کو بھی کہا جاتا ہے۔

(خ ب ر)

اَلْخُبْرُ۔ جو باتیں بذریعہ خبر کے معلوم ہو سکیں ان کے جاننے کا نام "خبر" ہے کہا جاتا ہے۔
خَبَرْتُهٗ خُبْرَةً وَاَخْبَرْتُ۔ جو خبر مجھے حاصل ہوئی تھی اس کی میں نے اطلاع دی۔
بعض نے کہا ہے کہ خُبْرَةٌ کا لفظ کسی معاملہ کی باطنی حقیقت کو جاننے پر بولا جاتا ہے۔
اَلْخَبَارُ وَالْخَبْرَآءُ نرم زمین۔ اور کبھی درختوں والی زمین پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔
اَلْمُخَابَرَةُ۔ بٹائی پر کاشت کرنا۔ اسی سے کسان کو "خَبِيْر" کہا جاتا ہے۔
اَلْخُبْرُ۔ چھوٹا توشہ دان۔ تشبیہ کے طور پر زیادہ دودھ دینے والی اونٹنی کو بھی خِبْرٌ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔
وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۵۰-۳) اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اس سے باخبر ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کی حقیقت کو جانتا ہے:۔
اور بعض نے کہا ہے کہ وہ تمہارے باطن امور

سے واقف ہے۔ اور بعض نے خَبِیْرٌ بمعنی مُخْبِرٌ کہا ہے۔ جیسا کہ آیت۔
فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (۶۲-۸)
پھر جو کچھ تم کرتے رہے ہو وہ سب تمہیں بتائیگا سے مفہوم ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ (۴۷-۳۱) اور تمہارے حالات جانچ لیں۔
قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ (۹-۹۴) خدا نے ہم کو تمہارے سب حالات بتادئے ہیں۔ یعنی تمہارے احوال سے ہمیں آگاہ کر دیا گیا ہے۔

(خ ب ز)

اَلْخُبْزُ۔ روٹی۔ قرآن میں ہے:۔
اَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِيْ خُبْزًا (۱۲-۳۶) کہ اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں۔
اَلْخُبْزَةُ۔ نان کوماج۔ اَلْخَبْزُ مصدر ض) روٹی بنانا۔
اِخْتَبَزَ۔ افتعال) روٹی بنانے کا حکم دینا۔
اَلْخِبَازَةُ۔ نانبائی کا پیشہ۔
استعارہ کے طور پر خَبْزٌ کے معنی سخت ہنکانے کے بھی آجاتے ہیں۔ کیونکہ ہانکنے والا بھی اسی طرح ہاتھ مارتا ہے جیسے روٹی بنانے والا کرتا ہے۔

(خ ب ط)

اَلْخَبْطُ (ض) کے معنی کسی چیز کو اندھا دھند بلا استواری کے مارنے کے ہیں۔ جیسے اونٹ کا زمین پر اگلا پاؤں مارنا یا آدمی کا لاٹھی کے ساتھ درخت سے پتے جھاڑنا۔ اور درخت سے جھاڑے ہوئے پتوں کو بھی خَبْطٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ مضروب پر ضَرْبٌ کا لفظ بول لیتے ہیں۔ پھر استعارہ کے طور پر بادشاہ کے ظلم پر بھی خَبْطٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ ظالم بادشاہ کو خَبُوْطٌ کہا جاتا ہے۔
اِخْتِبَاطُ الْمَعْرُوْفِ کے معنی ہیں کسی سے زبردستی احسان کا مطالبہ کرنا یہ محاورہ خَبْطُ الْوَرَقِ (درخت سے پتے جھاڑنا) کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے اور آیت:۔
يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ (۲-۲۷۵)
جیسے کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔ میں يَتَخَبَّطُ کے معنی خَبْطُ الشَّجَرِ سے بھی لئے جا سکتے ہیں۔ اور اختباط سے بھی۔ جس کے معنی احسان کا مطالبہ کے ہیں ایک حدیث میں ہے[1]
اَللّٰهُمَّ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ يَتَخَبَّطَنِيَ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ شیطان مجھے لپٹ کر دیوانہ بنا دے۔

(خ ب ل)

اَلْخَبَالُ وَالْخَبْلُ وَالْخَبَلُ۔ اس فساد یا خرابی کو کہتے ہیں جو کسی جاندار کو لاحق ہو کر اس میں اضطراب اور بے چینی پیدا کر دے۔ جیسے جنون یا وہ مرض جو عقل و فکر پر اثر انداز ہو، کہا جاتا ہے۔ خَبَلَهُ وَخَبَّلَهُ فَهُوَ خَابِلٌ وَالْجَمْعُ خُبَّلٌ رَجُلٌ مُخَبَّلٌ دیوانہ قرآن میں ہے:۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا (۳-۱۱۸) مومنو! کسی غیر مذہب کے آدمی کو اپنا رازدان نہ

[1] رواہ النسائی (۲/۳۲۰) من حدیث ابی الیسر ۱۲

بنانا۔ یہ لوگ تمہاری خرابی اور فتنہ انگیزی کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔
مَا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا (۹-۴۷) تو تمہارے حق میں شرارت کرتے۔
اور حدیث میں ہے[1]:
(۱۰۶) مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ ثَلَاثًا كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ اَنْ يَّسْقِيَهٗ مِنْ طِيْنَةِ الْخَبَالِ جو شخص تین مرتبہ شراب پئے گا تو اللہ تعالیٰ اسے لازمًا دوزخیوں کی پیپ پلائے گا۔
زہیر نے کہا ہے[2] (طویل)
(۱۳۰) هُنَالِكَ اِنْ يُّسْتَخْبَلُوا الْمَالَ يُخْبِلُوا
یعنی ایسے موقعہ پر اگر ان سے مال مانگا جائے تو وہ مال دے دیتے ہیں۔

(خ ب و)

خَبَتِ (ن) النَّارُ آگ کا شعلہ افسردہ ہو گیا اور اس پر راکھ کا خِبَاءٌ یعنی پردہ سا آگیا۔ اصل میں خِبَاءٌ اس پردہ کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز کو ڈھانپا جائے۔ اسی بنا پر جو یا گیہوں کی بالی کے چھلکا کو بھی خِبَاءٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا (۱۷-۹۷) جب اس کی آگ بجھنے کو ہو گی تو ہم ان کو (عذاب دینے کے لئے) اور بھڑکا دیں گے۔

(خ ت ر)

اَلْخَتْرُ اصل میں اس غداری کو کہتے ہیں جسے اس قدر کوشش سے کیا جائے کہ انسان کمزور پڑ جائے اور اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ جائیں قرآن میں ہے:۔
كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ (۳۱-۳۲) جو عہد شکن اور ناشکرے ہیں۔

(خ ت م)

اَلْخَتْمُ وَالطَّبْعُ کے لفظ دو طرح سے استعمال ہوتے ہیں کبھی تو خَتَمْتُ اور طَبَعْتُ کے مصدر ہوتے ہیں اور اس کے معنی کسی چیز پر مہر کی طرح نشان لگانا کے ہیں اور کبھی اس نشان کو کہتے ہیں جو مہر لگانے سے بن جاتا ہے۔
مجازًا کبھی اس سے کسی چیز کے متعلق وثوق حاصل کر لینا اور اس کا محفوظ کرنا مراد ہوتا ہے

---

[1] الحدیث باختلاف الفاظ فی النسائی عن ابن عمرو (حم تی ہ ن عن ابن عمرو (ہ عن ابی ہریرۃ، والطیب عن ابن عمر والترمذی عن ابن عمرو وسودۃ عن ابن عمرو، راجع الفتح الکبیر ج ۳/ ۲۰۱-۲۰۲ ۞ [2] قالہ زہیر بن ابی سلمی المزنی وتمامہ...... وان یسئلوا یعطوا وان ییسروا یغلوا والبیت فی اللسان (خیل خول) وفی روایۃ الطبری (۳۱۱:۱۹۹ر۷: ۲۷۸) وان یستخولوا بدل یستخیلوا ویخولوا بدل یخبلوا وکذا فی روایۃ ابی عبید فی غریبہ والعسکری فی الصناعتین وعدہ من جید المدیح قال فی الامالی (۲: ۱۵۴) ومایبالی مدح بہذین البیتین الایمدح بغیرہما والبیت فی مختار الجاہلی بشرح المصطفی السقا (۱: ۱۲۳) والمختارات ۴۲ والعمدۃ (۲: ۱۲۷) ونقد الشعر ۳۲ فی سبعۃ ابیات والبحر (۲: ۱۴۴) والنقد التمیمی ۹۱ والمعانی الکبیر ۵۳۹ والسیوطی ۱۰۸ قال فی اللسان والاخبال اعطاء البعیر او الناقۃ للرکوب واستخبل ای استعارہ والاصمعی وابوعبیدہ فی روایتہما عن ابی عمرو انکر الاستخبال وغیرہما اثبتہ ودالمعانی للقتبی ۵۴۰ ۞

جیسا کہ کتابوں یا دروازوں پر مہر لگا کر انہیں محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ کہ کوئی چیز ان کے اندر داخل نہ ہو۔ قرآن میں ہے۔
خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (۲-۷) خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا رکھی ہے۔
وَخَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ (۴۵-۲۳) اور اس کے کانوں اور دل پر مہر لگا دی۔
اور کبھی کسی چیز کا اثر حاصل کر لیتے سے کنایہ ہوتا ہے جیسا کہ مہر سے نقش ہو جاتا ہے اور اسی سے خَتَمْتُ الْقُرْآنَ کا محاورہ ہے۔ یعنی قرآن ختم کر لیا۔ اور آیت کریمہ:۔
خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (۲-۷) خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔ اور آیت:۔
قُلْ اَرَاَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِكُمْ (۶-۴۶) (ان کافروں سے) کہو بھلا دیکھو تو اگر خدا تمہارے کان یا آنکھیں چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے۔
میں عادت الہیہ کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان اعتقادِ باطل یا محرمات کے ارتکاب میں حد کو پہنچ جاتا ہے اور کسی طرح حق کی طرف التفات نہیں کرتا تو اس کی ہیئتِ نفسانی کچھ ایسی بن جاتی ہے کہ گناہوں کو اچھا سمجھنا اس کی خو بن جاتی ہے۔ گویا اس طرح اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:۔
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ (۱۶-۱۰۸) یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر خدا نے مہر لگا رکھی ہے۔
اسی طرح آیات کریمہ:۔
وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا (۱۸-۲۸) اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے ..... اس کا کہا نہ ماننا۔
وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ (۱۷-۴۶) اور ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیتے ہیں کہ اسے سمجھ نہ سکیں۔
وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً (۵-۱۳) اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔
میں اِغْفَال کنؔ اور قساوۃؔ سے بھی علی الترتیب یہی معنی مراد ہیں۔
جبائی[1] کہتے ہیں کہ اللہ کے کفار کے دلوں پر مہر لگانے کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انکے دلوں پر ایسی علامت قائم کر دیتے ہیں کہ فرشتے انکے کفر سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور ان کے حق میں دعائے خیر نہیں کرتے۔ لیکن یہ بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ اگر یہ کتابت محسوس ہو تو اصحاب التشریح ( ) کو بھی اس کا ادراک ہونا ضروری ہے اور اگر سراسر عقلی اور غیر محسوس ہے تو ملائکہ ان کے عقائد باطلہ سے مطلع ہونے کے بعد اس قسم کی علامات سے بے نیاز ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مہر لگانے کے معنی ان کے ایمان نہ لانے کی شہادت دینے کے ہیں اور آیت کریمہ:۔
اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰی اَفْوَاهِهِمْ (۳۶-۶۵) آج ہم ان کے موہوں پر مہر لگا دیں گے۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ کلام نہیں کر سکیں گے اور آیت (۳۳-۴۰) میں آنحضرتؐ کو خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ فرمانے کے معنی یہ ہیں کہ آنحضرت نے اپنی آمد سے سلسلہ نبوت کو مکمل کر دیا

---

[1] ہو ابو علی محمد بن عبد الوہاب الجبائی المتوفی ۳۰۳ھ والجبا بلد او کورۃ بخوزستان من نواحی الاہواز بین فارس و واسط والبصرۃ مختصار التاج)۔

ہے (اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا)۔
اور آیت کریمہ:۔
وَخِتٰمُهٗ مِسْكٌ (۸۳-۲۶) جس کی مہر مسک کی ہوگی۔
میں بعض نے کہا ہے کہ خِتَامٌ کے معنی مَا يُخْتَمُ بِهٖ کے ہیں یعنی وہ چیز جس سے مہر لگائی جائے مگر آیت کے معنی یہ ہیں کہ اس کا آخری لطف اور برتن میں باقی ماندہ گھونٹ مسک کی طرح مہکے گا اور بعض نے اس سے یہ مراد لی ہے کہ اس پر کستوری کی مہر لگی ہوئی ہوگی مگر یہ بے معنی سی بات ہے۔ کیونکہ شراب کو بذات خود لذیذ ہونا چاہیئے اگر وہ بذات خود لذیذ نہ ہو تو اس پر مسک کی مہر لگانا چنداں مفید نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اس کی لذت میں اضافہ کا باعث بن سکتا ہے۔

(خ د د)

اَلْخَدُّ وَالْاُخْدُوْدُ کے معنی ہیں زمین میں مستطیل اور گہرا گڑھا اَلْاُخْدُوْدُ کی جمع اَخَادِيْدُ ہے قرآن میں ہے قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ (۸۵-۴) کہ خندقوں کے رکھنے والے ہلاک کر دیئے گئے۔
اصل میں خَدُّ الْاِنْسَانِ کے معنی انسان کے رخسار کے ہیں اور استعارۃً زمین اور دوسری اشیاء کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ لفظ وجہ (چہرہ) ہے۔ تَخَدَّدَ اللَّحْمُ جسم کا لاغر ہو کر جھری دار ہو جانا خَدَّدْتُهٗ کسی کو دبلا کرنا۔ اس کا مطاوع تَخَدَّدَ آتا ہے۔

(خ د ع)

اَلْخِدَاعُ کے معنی ہیں جو کچھ دل میں ہو اس کے خلاف ظاہر کر کے کسی کو اس چیز سے پھیر دینا جس کے وہ درپے ہو اور آیت کریمہ:۔
يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ (۲-۹) یہ (اپنے پندار میں) خدا کو چکمہ دیتے ہیں۔
میں اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینے سے اس کے رسول اور اولیاء کو فریب دینا مراد ہے اور اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آنحضرت کے ساتھ کوئی سا معاملہ کرنا گو اللہ تعالیٰ کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے۔ اس بنا پر فرمایا:۔
اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ۔ (۴۸-۱۰) جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں۔
اور ان کے اس فعل کی شناخت اور آنحضرت اور صحابہ کرام کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے اسے خِدَاع سے تعبیر کیا ہے۔
اور بعض اہل لغت کا یہ کہنا کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور اصل میں يُخَادِعُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ہے۔ پھر مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہے۔ تو اس کے متعلق یہ جان لینا ضروری ہے کہ مضاف محذوف کو ذکر کرنے سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے کہ ایک تو یہاں ان کی فریب کاریوں کی شناخت کو بیان کرنا مقصود ہے کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کو فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دوسرے یہ بتانا ہے کہ آنحضرت کے ساتھ معاملہ کرنا اللہ تعالیٰ سے معاملہ کرنے کے مترادف ہے جیسا کہ آیت اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَ الْاٰيَةَ میں بیان ہو چکا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔

سلہ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (۳۱-۱۸) ای لا تعرض عنہم استکبارًا ۔

وَهُوَ خَادِعُهُمْ (۴-۱۴۲) اور وہ انہیں کو دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔

کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کی فریب کاریوں کا بدلہ دے گا اور بعض نے کہا ہے کہ مقابلہ اور مشاکلہ کے طور پر یہ کہا گیا ہے جیساکہ آیت وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ میں ہے۔

خَدَعَ الضَّبُّ گوہ کا اپنے بل میں داخل ہوجانا اور گوہ کے بل میں چھپ جانے کے لئے خدع کا استعمال اس بنا پر ہے کہ اس کی بل کے دروازے پر ہمیشہ ایک بچھو تیار بیٹھا رہتا ہے۔ جو بل میں ہاتھ ڈالنے والے کو ڈس دیتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے اَلْعَقْرَبُ بَوَّابُ الضَّبِّ کہ بچھو گوہ کا دربان ہے۔

چونکہ اہل عرب کے ہاں ضَبٌّ کی مکاری ضرب المثل تھی اس لئے کہا گیا ہے[1] (مثل) هُوَ اَخْدَعُ مِنَ الضَّبِّ کہ وہ ضب سے زیادہ مکار ہے طَرِيْقٌ خَادِعٌ وَخَيْدَعٌ گمراہ کرنے والا راستہ گویا وہ مسافر کو دھوکا دیتا ہے۔ اَلْمِخْدَعُ بڑے کمرے کے اندر چھوٹا کمرہ۔ گویا اس بڑے کمرے سے چیز اٹھانے والے کو دھوکا دینے کے لئے بنایا ہے۔

خَدَعَ الرِّيْقُ منہ میں تھوک کا خشک ہونا اس میں بھی دھوکے کا تصور پایا جاتا ہے۔ اَلْاَخْدَعَانِ گردن کی دو رگیں کیونکہ وہ کبھی ظاہر اور کبھی پوشیدہ ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے خَدَعْتُهٗ میں نے اس کی اخدع رگ کو کاٹ دیا۔ حدیث میں ہے[2] (۱۰۷) بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ سِنُوْنَ خَدَّاعَةٌ کہ قیامت کے قریب دھوکا دینے والے سال ہوں گے کیونکہ وہ بھی خشک سالی اور خوشحالی سے رنگ بدلتے ہیں گے۔

(خ د ن)

اَلْخِدْنُ۔ کے معنی مصاحب اور رفیق کے ہیں۔ مگر عام طور پر اس مصاحب پر بولا جاتا ہے جو جنسی خواہش پوری کرنے کے لئے کسی کے ساتھ رہتا ہو اسی لئے خِدْنُ الْمَرْأَةِ وَخَدِيْنُهَا کا محاورہ ہے جس کے معنی عورت کے آشنا کے ہیں اَلْخِدْنُ کی جمع اَخْدَانٌ آتی ہے قرآن میں ہے۔ وَلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ اور نہ وہ در پردہ آشنا رکھنے والی ہوں (۴-۲۵) اور شاعر کے قول[3] (ع) (۱۳۱) "خَدِيْنُ الْعُلٰى" وہ بلندیوں کا ساتھی ہے۔

میں بلندیوں کے لئے خَدِيْنٌ کا لفظ بطور استعارہ استعمال ہوا ہے جیساکہ يَعْشَقُ الْعُلٰى (وہ بلندیوں پر عاشق ہے) يُشَبِّبُ بِالنَّدٰى (وہ سخاوت کے ساتھ تشبیب کرتا ہے) يُنَسِّبُ بِالْمَكَارِمِ (اس کا نسب مکارم سے ملتا ہے) وغیرہ استعارات ہیں۔

(خ ذ ل)

قرآن میں ہے:۔

وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا (۲۵-۲۹) اور شیطان انسان کو عین موقعہ پر دغا دینے والا ہے۔

---

[1] راجع للمثل المیدانی رقم ۱۳۰۲ و الحیوان ۶: ۴۳، ۵۴/۴-۱۰ والسان (خدع) [2] الحدیث باختلاف الفاظہ فی النہایہ (خدع) وغریب ابی عبید ( ) وفی تاویلہ اختلاف فی المحکم (خدع) ان قبل الساعۃ سنین خداعۃ واللآلی مع السمط ۱۲۷ و فیہ ان قبل الدجال سنین خداعۃ ای قاطعۃ الزکوٰۃ او قلیل المطر کذا فی الفائق ۲/۱۰۷ و فیہ ایضاً بین یدی الساعۃ سنین غدارۃ ای یکثر فیہا المطر ویقل النبات۔

[3] لم اجدہٗ وبرجیٰ ۱۲

اَلْخَذُوْلُ (صیغہ مبالغہ) بہت زیادہ خُذْلَان یعنی دغا دینے والا۔ اَلْخُذْلَان ایسے شخص کا عین موقعہ پر ساتھ چھوڑ کر الگ ہوجانا جسکے متعلق گمان ہو کہ وہ پوری پوری مدد کریگا۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے:۔
خَذَلَتِ الْوَحْشِيَّةُ وَلَدَهَا وحشی گائے نے اپنے بچہ کو چھوڑ دیا۔ تَخَاذَلَتْ رِجْلَا فُلَانٍ اس کی ٹانگیں کمزور پڑ گئیں اسی سے اعشی نے کہا ہے[1] (الرمل)

(۱۳۲) بَيْنَ مَغْلُوْبٍ تَلِيْلٍ خَدُّهٗ
وَخَذُوْلِ الرِّجْلِ مِنْ غَيْرِ كَسَحٍ

(بعض مغلوب ہوکر رخسارے کے بل گر پڑے ہیں اور بعض کی ٹانگیں بدوں بے حسی کے جواب دے چکی ہیں۔
رَجُلٌ خُذَلَةٌ بے بس آدمی۔

(خ ر ر)

خَرَّ (ن ض) خَرِيْرًا کے معنی کسی چیز کے آواز کے ساتھ نیچے گرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ (۳۴-۱۴) جب عصا گر پڑا تب جنوں کو معلوم ہوا۔
كَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (۲۲-۳۱) تو وہ گویا ایسا ہے جیسے آسمان سے گر پڑے۔ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ (۱۶-۲۶) اور چھت ان پر ان کے اوپر سے گر پڑی۔ اَلْخَرِيْرُ پانی وغیرہ کی آواز کو کہتے ہیں جو اوپر سے گر رہا ہو، اور آیت کریمہ:۔
خَرُّوْا سُجَّدًا (۳۲-۱۵) تو سجدے میں گر پڑتے ہیں خَرُّوْا کا لفظ دو معنوں پر دلالت کرتا ہے یعنی (۱) گرنا اور (۲) ان سے تسبیح کی آواز کا آنا۔ اور اس کے بعد آیت وَسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ سے تنبیہ کی ہے کہ ان کا سجدہ ریز ہونا اللہ تعالیٰ کی تسبیح کے ساتھ تھا نہ کہ کسی اور امر کے ساتھ۔

(خ ر ب)

خَرِبَ الْمَكَانُ خَرَابًا کسی جگہ کا اجاڑ ہونا۔ یہ عِمَارَةٌ (آباد ہونا) کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا (۲-۱۱۴) اور انکی ویرانی میں ساعی۔
اَخْرَبَهٗ وَخَرَّبَهٗ ویران کر دینا، قرآن میں ہے:۔
يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۹-۲) کہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں اور مومنوں کے ہاتھوں سے اجاڑنے لگے۔
وہ اپنے ہاتھوں سے اس لئے ویران کرتے تھے تاکہ آنحضرت اور مسلمانوں کے کام نہ آئیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ بربادی ان کی جلاوطنی کی وجہ سے تھی۔
اَلْخُرْبَةُ کان میں وسیع چھید گویا اس سے کان میں خرابی پیدا ہوگئی اور اَقْطَعُ وَقَطْعَاءُ کی طرح اَخْرَبُ وَخَرْبَاءُ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اور تشبیہ کے طور مشکیزہ کے سوراخ کو بھی خُرْبَةُ الْمَزَادَةِ کہا جاتا ہے جیسا کہ مجازاً اُذُنُ الْمَزَادَةِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور خَارِبٌ کے معنی خاص کر اونٹوں کا چور کے ہیں[2] اَلْخَرَبُ (نر سرخاب) شترمرغ

---

[1] قالہ الاعشیٰ فی قصیدۃ طویلۃ فی دیوانہ (۳۸-۲۴) یمدح فیہا ایاس بن قبیصہ الطائی وفی روایۃ اللسان والمحکم (کسح، خذل) وصدرہ:
کل وضاح کریم جدہ۔ وفی روایۃ ص وس صدرہ بین مغلوب نبیل جدہ کذا رواہ ابن بری واما روایۃ المؤلف فلم ار لہ الا فی بعض حواشی دیوانہ ۲۴ او بردی: تلیل والبیت فی اللسان (خذل) ودیوانہ ۲۴ وغریب ابی عبید (م: ۲۸۲) ۱۲
[2] قالہ الاصمعی والجمع خراب والجوہری)۔

کی قسم کا ایک پرند اس کی جمع خِزْبَانٌ ہے کسی شاعر نے کہا ہے[1] (رجز)

(۱۳۳) اَبْصَرَ خِزْبَانَ فِضَاءٍ فَانْكَدَرْ

کہ وہ فضا میں سرخابوں کو دیکھ کر اس پر ٹوٹ پڑا۔

(خ ر ج)

خَرَجَ (ن) خُرُوْجًا کے معنی کسی کے اپنی قرارگاہ یا حالت سے ظاہر ہونے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ قرارگاہ مکان ہو یا کوئی شہر یا کپڑا ہو اور یا کوئی حالت نفسانی ہو جو اسباب خارجیہ کی بنا پر اسے لاحق ہوئی ہو۔ قرآن میں ہے:۔

فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ (۲۸-۲۱) موسیٰ وہاں سے ڈرتے ڈرتے نکل کھڑے ہوئے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ (۷-۱۳) فرمایا تو بہشت سے اتر جا۔ تجھے شایاں نہیں کہ یہاں غرور کرے۔ پس نکل جا۔

وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرَةٍ مِنْ اَكْمَامِهَا (۴۱-۴۷) اور نہ تو پھل گابھوں سے نکلتے ہیں۔ فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ (۴۰-۱۱) تو کیا نکلنے کی کوئی سبیل ہے۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا (۵-۳۷) (ہر چند) چاہیں گے کہ آگ سے نکل جائیں مگر اس سے نہیں نکل سکیں گے۔ اور اِخْرَاجٌ کا لفظ زیادہ تر اعیان کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ (۲۳-۳۵) تو تم زمین سے نکالے جاؤ گے۔

كَمَا اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ (۸-۵) جس طرح تمہارے پروردگار نے تم کو تدبیر کے ساتھ گھر سے نکالا۔

وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا (۱۷-۱۳) اور قیامت کے روز وہ کتاب اسے نکال دکھائیں گے۔

اَخْرِجُوْا اَنْفُسَكُمْ (۶-۹۳) کہ نکالو اپنی جانیں۔

اَخْرِجُوْا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ (۲۷-۵۶) کہ لوط کے گھر والوں کو اپنے شہر سے نکال دو۔ اور کبھی اِخْرَاج بمعنی تکوین الٰہی بھی آجاتا ہے جیسے فرمایا

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ (۱۶-۷۸) اور خدا ہی نے تم کو ماؤں کے شکم سے پیدا کیا۔

فَاَخْرَجْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى (۲۰-۵۳) پھر اس نے انواع واقسام کی مختلف روئیدگیاں پیدا کیں۔ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ (۳۹-۲۱) اس سے کھیتی اگاتا ہے جس کے طرح طرح کے رنگ ہوتے ہیں۔

اَلتَّخْرِيْجُ (تفعیل) یہ عام طور پر علوم وصناعات کی ایجاد کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اور زمین کی پیداوار اور جو کچھ حیوان کے اوجھ سے نکلتا ہے۔ اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو خَرْجٌ وخَرَاجٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اَمْ تَسْئَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ (۲۳-۷۲) کیا تم ان سے (تبلیغ کے سلسلے میں) کچھ مال مانگتے ہو تو تمہارے پروردگار کا مال بہت اچھا ہے۔

---

[1] قاله العجاج فی منظومته یمدح فیها عمر بن عبید الله بن معمر التیمی وکان قد وجهه عبد الملک الی ابی فدیک الحروری حین خرج علیه فقتله: تقضی البازی اذا البازی کسر. وفی روایة آنس بدل ابصر والشطر فی الطبری (۹: ۷۹) (۱۰ ۳۰: ۶۵) واللسان (کدر) ودیوانه (طبع لیبک ۱۹۰۲ء) رقم البیت ۷ والبیت من شواهد ابی عبیدة فی مجازه تحت قوله واذا النجوم انکدرت (تکویر ۲) والشطر الاول فی ابن الشجری (۱: ۳۸۹) والاقتضاب ۴۱۳ والامالی (۲: ۱۷۱) والشطر فی السمط ۷۰ والبحر (۸: ۴۳۰) وفیه فلاة بدل فضاء ۱۲

ہاں خرج کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ نے اسے لازم و واجب کیا ہے اور خَرْجٌ خَرَاجٌ سے عام ہے کیونکہ خَرْجٌ کا لفظ دَخْلٌ (آمدنی) کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا (۱۸-۹۴) بھلا ہم آپ کے لئے خرچ کا انتظام کر دیں۔

مگر خَرَاجٌ کا لفظ عموماً زمین کے لگان پر بولا جاتا ہے محاورہ ہے۔ اَلْعَبْدُ يُؤَدِّي خَرْجَهٗ غلام اپنی آمدنی سے مقررہ حصہ ادا کرتا ہے۔ وَالرَّعِيَّةُ تُؤَدِّي إِلَى الْأَمِيرِ الْخَرَاجَ رعیت حاکم کو لگان ادا کرتی ہے۔ اَلْخَرْجُ ایضاً بادل کی ایک قسم ہے۔ اس کی جمع خُرُوْجٌ آتی ہے۔ ایک روایت میں ہے[1] (۱۰۷) اَلْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ یعنی مال بائع سے جو فائدہ حاصل ہوگا۔ وہ مبیع کی اس ضمانت کے عوض سمجھا جائے گا جو اس سے ساقط ہو چکی ہے۔

اَلْخَارِجِيُّ وہ شخص جو بذات خود اپنے ہمسروں کی صفات سے باہر نکل جائے اگر یہ خروج کسی اعلیٰ مرتبہ کی طرف ہو تو بطور مدح بولا جاتا ہے اور اگر ادنیٰ مرتبہ کی طرف ہو تو یہ لفظ بطور مذمت کے استعمال ہوتا ہے۔ جس طرح کہ فُلَانٌ لَيْسَ بِإِنْسَانٍ یعنی کسی سے انسانیت کی نفی کبھی بطور مدح ہوتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2] (طویل)

(۱۳۴) فَلَسْتَ لِإِنْسِيٍّ وَلٰكِنْ لِمَلْأَكٍ
تَنَزَّلَ مِنْ جَوِّ السَّمَاءِ يَصُوْبُ

تم انسان نہیں ہو بلکہ فرشتہ کی مثل ہو جو آسمان کی بلندی سے زمین پر اتر آئے۔

اور کبھی مذمت کے لئے۔ جیسے فرمایا:۔

اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ (۲۵-۴۴) یہ تو چوپایوں کی طرح ہیں۔

اَلْخَرَجُ دو رنگ سیاہ و سپید (دورنگ) اسی سے کہا جاتا ہے۔ ظَلِيْمٌ اَخْرَجُ وَنَعَامَةٌ خَرْجَاءُ ابلق شتر مرغ۔ اَرْضٌ مُخْتَرِجَةٌ زمین کہ جائے اناں با گیاہ و جائے بے گیاہ باشد۔ اور اَلْخَوَارِجُ کو خوارج اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ امام کی طاعت سے باغی ہو گئے تھے۔

(خ ر ص)

اَلْخَرْصُ پھلوں کا اندازہ کرنا اور اندازہ کئے ہوئے پھلوں کو خِرْصٌ کہا جاتا ہے یہ بمعنی مَخْرُوْصٌ ہے۔ جیسے نَقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ۔ بعض نے کہا ہے کہ خَرْصٌ بمعنی کذب آجاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔ اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (۴۳-۲۰) یہ تو صرف انکلیں دوڑا رہے ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ يَخْرُصُوْنَ بمعنی يُكَذِّبُوْنَ ہے یعنی وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

---

[1] الحدیث مروی مختصراً ومفصلاً راجع ابوداؤد والترمذی ۲ر۲۷۰-۲۷۱ مع التحفہ والنسائی وابن ماجۃ راجع تخریجہ الرسالۃ رقم ۱۲۳۲ مع التحقیق احمد شاکر وکنز العمال ۴ رقم ۵۰ وابن حبان فی زوائدہ رقم ۱۱۲۵، ۱۱۲۶ [2] اختلفوا فی نسبۃ ہذا البیت قال العینی (۴: ۵۲۴) قائلہ رجل من عبد القیس یمدح النعمان وقیل ہو لابی وجزۃ یمدح عبد اللہ بن الزبیر ونسبۃ الاعلم فی ہامش الکتاب (۲: ۳۷۹) الی علقمۃ والبیت من شواہد الطبری (۱: ۱۴۸، ۱۹۸) وراجع للبیت ایضاً الصحاح والتاج (الک، ملک، صوب) والقرطبی (۹: ۱۸۳) وامالی ابن الشجری (۲: ۲۰۲، ۲۹۲) والاشتقاق ۲۷ والجانۃ لابی عبیدۃ (۱: ۳۰) ومختار الشعر الجاہلی وتہذیب الاصلاح (۱: ۱۲۶) والبحرہ: ۴ر۳۰۴: ۳ر۴۰۴: ۲۳۷ وابن خالویہ ۸۲ وابن الانباری فی السبع ۵۷۲ والبیت من کلمۃ مفضلیۃ من زیادات المرزوقی (۲: ۱۹۴) وصدرہ «ولست بجنی ولکن لملاک» ۱۲ ؎

قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ (۵۱-۱۰) اٹکل کرنے والے ہلاک ہوں۔

کے معنی بقول بعض یہ ہیں کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہو، اصل میں ہر وہ بات جو ظن و تخمین سے کہی جائے اسے خَرْصٌ کہا جاتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ اندازہ غلط ہو یا صحیح۔ کیونکہ تخمینہ کرنے والا نہ تو علم یا غلبہ ظن سے بات کرتا ہے، اور نہ سماع کی بنا پر کہتا ہے۔ بلکہ اس کا اعتماد محض گمان پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ تخمینہ کرنیوالا پھلوں کا تخمینہ کرتا ہے اور اس قسم کی بات کہنے والے کو بھی جھوٹا کہا جاتا ہے۔ خواہ وہ واقع کے مطابق ہی کیوں نہ بات کرے جیسا کہ منافقین کے بارے میں فرمایا:۔

اِذَا جَاءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (۶۳-۱) (اے محمدؐ) جب منافق لوگ تمہارے پاس آتے ہیں تو (ازراہ نفاق) کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ بے شک خدا کے پیغمبر ہیں۔ اور خدا جانتا ہے کہ درحقیقت تم اس کے پیغمبر ہو لیکن خدا ظاہر کئے دیتا ہے کہ منافق (دل سے نہ اعتقاد رکھنے کے لحاظ سے) جھوٹے ہیں۔

(خ ر ط)

اَلْخُرْطُوْمُ اس کے اصل معنی ہاتھی کی سونڈ کے ہیں۔ قرآن نے میں ہے:۔

سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ (۶۸-۱۶) ہم عنقریب اس کی ناک پر داغ لگائیں گے۔

میں انسان کی ناک پر خرطوم کا اطلاق کیا ہے تو یہ محض مذمت کے لئے ہے۔ یعنی اسے نہ مٹنے والی عار لاحق ہوگی یہ جُدِعَتْ اَنْفُهٗ کی طرح کا محاورہ ہے۔

(خ ر ق)

اَلْخَرْقُ (ض) کسی چیز کو بلا سوچے سمجھے بگاڑنے کے لئے پھاڑ ڈالنا۔ قرآن میں ہے:۔

اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا (۱۸-۷۱) کیا آپ نے اس کو اس لئے پھاڑا ہے کہ مسافروں کو غرق کردیں۔

خَرْقٌ خَلْقٌ کی ضد ہے۔ جس کے معنی اندازہ کے مطابق خوش اسلوبی سے کسی چیز کو بنانا کے ہیں۔ اور خرق کے معنی کسی چیز کو بے قاعدگی سے پھاڑ ڈالنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۶-۱۰۰) اور بے سمجھے (جھوٹ بہتان) اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں بنا گھڑی ہیں۔

یعنی بے سوچے سمجھے یہ بات کہتے ہیں۔ پھر معنی قطع کے اعتبار سے کہا جاتا ہے: خَرَقْتُ الثَّوْبَ وَخَرَّقْتُهٗ کپڑے کو پھاڑ ڈالا خَرَقَ الْمَفَاوِزَ ریگستان طے کئے اِخْتَرَقَ الرِّيْحُ ہوا کا تیز چلنا۔

اَلْخَرْقُ وَالْخَرِيْقُ خاص کر کشادہ بیابان کو کہا جاتا ہے اس لئے کہ اس میں ہوائیں تیزی سے چلتی ہیں اور یا اس لئے کہ وہ وسیع ریگستان کی صورت میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔

اَلْخَرْقُ (خاص کر) کپڑے میں سوراخ اور کان میں کشادہ سوراخ۔ صَبِيٌّ اَخْرَقُ وَامْرَأَةٌ خَرْقَاءُ جس کے کان میں کشادہ چھید ہو اور آیت کریمہ:۔

اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ (۱۷-۳۷) کی تفسیر میں دو قول ہیں ایک یہ کہ تو زمین کو طے نہیں کر سکے گا۔

یا یہ کہ تو زمین کو اپنے پاؤں سے پھاڑ نہیں ڈالے گا۔

یہ دوسرا معنیٰ خرق فی الاذن سے ماخوذ ہے اور بے سوچے سمجھے کام کرنے کے اعتبار سے احمق اور نادان شخص کو اَخْرَقُ وَ خَرِقٌ کہا جاتا ہے اس کی مؤنث خرقاء ہے۔ اور تند ہوا کو بھی خرقاء کہہ دیا جاتا ہے۔ ایک روایت میں ہے[1] (۱۰۸)

مَا دَخَلَ الْخُرْقُ فِیْ شَیْءٍ اِلَّا شَانَہٗ جس چیز میں نادانی کا عمل دخل ہو وہ عیب ناک ہو جاتی ہے

اور خرق ہی سے مَخْرَقَۃٌ کا لفظ لیا گیا ہے[2] جس کے معنی کسی کام میں حیلہ جوئی کے لئے بے وقوفی کا اظہار کرنے کے ہیں۔

اَلْمِخْرَاقُ کپڑے کا کوڑا جس سے بچے کھیلتے ہیں گویا اسے بھی کسی چیز کو واقع کے خلاف ظاہر کرنے کے لئے بنایا جاتا ہے۔

خَرِقَ الْغَزَالُ ہرن کا نادانی کی وجہ سے دوڑ نہ سکنا۔

(خ ز ن)

اَلْخَزْنُ کے معنی کسی چیز کو خزانے میں محفوظ کر دینے کے ہیں۔ پھر ہر چیز کی حفاظت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے جیسے بھید وغیرہ کی حفاظت کرنا اور آیت :۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُہٗ (۱۵-۲۱)

اور ہمارے ہاں ہر چیز کے خزانے ہیں۔

وَلِلّٰہِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۶۳-۷)

حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے خدا ہی کے ہیں۔

میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے یا اس معنیٰ کی طرف اشارہ ہے جس کے متعلق آنحضرت ﷺ نے فرمایا :۔[3] (۱۰۹)

فَرَغَ رَبُّکُمْ مِنْ خَلْقِ الْخَلْقِ وَالرِّزْقِ وَالْاَجَلِ

کہ خدا تعالیٰ مخلوق کی پیدائش اس کے رزق اور اجل سے فارغ ہو چکا ہے اور آیت کریمہ :۔

فَاَسْقَیْنٰکُمُوْہُ وَمَا اَنْتُمْ لَہٗ بِخَازِنِیْنَ (۱۵-۲۲)

اور ہم ہی تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں اور تم تو اس کا خزانہ نہیں رکھتے۔

میں بعض نے خَازِنِیْنَ کے معنی حَافِظِیْنَ کئے ہیں۔ یعنی شکر گزاری سے تم اس کی حفاظت نہیں کر سکتے بعض نے کہا کہ یہ آیت کریمہ :۔

اَفَرَءَیْتُمُ الْمَاءَ الَّذِیْ تَشْرَبُوْنَ ءَ اَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْہُ مِنَ الْمُزْنِ الْاٰیَۃَ (۵۶-۶۸-۶۹)

بھلا دیکھو تو سہی کہ جو پانی تم پیتے ہو کیا تم نے اس کو بادل سے نازل کیا ہے۔

کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اَلْخَزَنَۃُ یہ خازن کی جمع ہے چنانچہ جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ وَقَالَ لَہُمْ خَزَنَتُہَا (۳۹-۷۱)

تو اس کے داروغے اس سے کہیں گے۔

اور آیت کریمہ :۔ وَلَا اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَائِنُ اللّٰہِ (۶-۵۰) کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں۔

میں خَزَائِنُ اللّٰہِ سے وہ مقدورات الٰہیہ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں سے روک رکھی ہیں۔ کیونکہ لفظ خزن میں منع کے معنی پائے جاتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وسیع جود اور قدرت مراد ہے۔ اور بعض نے اس سے کلمہ

---

[1] الحدیث فی التاج والنہایۃ (خرق) [2] قال الاصمعی مولد (الجوہری ۱۲۱۳) [3] راجع لحدیث فرغ اللہ باختلاف الفاظہ (والنہایہ ۲ وطس عن ابن مسعود والطبرانی عن ابی الدرداء وکنز العمال ۱/۴۹ والفتح للنبہانی ۲/۲۶۶ ؛

کن مراد لیا ہے خَزَنَ اللَّحْمُ کے اصل معنی تو گوشت کی ذخیرہ اندوزی کے ہیں۔ لیکن کنایۃً گوشت کے بدبودار ہو جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہی معنی خَنِزَ (بہ تقدیم نون) کے ہیں۔

(خ ز ی)

خَزِیَ (س) الرَّجُلُ رسوا ہونا۔ خواہ وہ رسوائی انسان کو خود اس کی ذات سے لاحق ہو یا غیر کی طرف سے پھر جو رسوائی اپنی جانب سے لاحق ہوتی ہے اسے حیائے مفرط کہا جاتا ہے اور اس کا مصدر خَزَایَۃٌ ہے۔ اس سے صیغۂ صفت مذکر خَزْیَانُ اور مؤنث خَزْیٰ ج خَزَایَا حدیث میں ہے[۱] (۱۰۱) اَللّٰھُمَّ احْشُرْنَا غَیْرَ خَزَایَا وَلَا نَادِمِیْنَ اے خدا ہمیں اس حالت میں زندہ نہ کرنا کہ ہم شرم اور ندامت محسوس کرنیوالے ہوں۔
اور جو رسوائی دوسروں کی طرف سے لاحق ہوتی ہے وہ ذلت کی ایک قسم ہے۔ اور اس کا مصدر خِزْیٌ ہے۔ اور رَجُلٌ خِزْیٌ کے معنی ذلیل آدمی کے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔
لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا (۲-۱۱۴) دنیا میں انکی رسوائی ہے۔
اِنَّ الْخِزْیَ الْیَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَی الْکَافِرِیْنَ (۱۶-۲۷) کہ آج کافروں کی رسوائی اور برائی ہے۔
فَاَذَاقَھُمُ اللّٰہُ الْخِزْیَ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (۳۹-۲۶) پھر ان کو خدا نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا۔
لِنُذِیْقَھُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (۴۱-۱۶) تاکہ ان کو دنیا کی زندگی میں ذلت کے عذاب کا مزہ چکھائے۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰی (۲۰-۱۳۴) کہ ہمارے ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے۔
اَخْزٰی (افعال) یہ خِزْیٌ اور خَزَایَۃٌ دونوں سے آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (۶۶-۸) اس دن خدا پیغمبر کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے رسوا نہیں کریگا۔
کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن خِزْیٌ سے بننا انسب معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
رَبَّنَا اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَہٗ (۳-۱۹۲) اے پروردگار جس کو تونے دوزخ میں ڈالا اسے رسوا کیا۔
میں اَخْزَیْتَہٗ خَزَایَۃٌ سے ہے مگر خِزْیٌ سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہی معنی مندرجہ ذیل آیات میں مراد ہیں:۔
مَنْ یَّاْتِیْہِ عَذَابٌ یُّخْزِیْہِ (۳۹-۴۰) کہ کس پر عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کریگا۔
وَلَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (۳-۱۹۴) اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو۔
وَلِیُخْزِیَ الْفَاسِقِیْنَ (۵۹-۵) کہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔
وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ (۱۱-۷۸) اور میرے مہمانوں (کے بارے) میں میری آبرو نہ کھوؤ۔
جس طرح خِزْیٌ دو قسم پر ہے یعنی رسوائی کبھی اپنی ذات کی طرف سے لاحق ہوتی ہے اور کبھی دوسروں کی طرف سے اسی طرح ذُلٌّ وَھَوَانٌ بھی دو قسم پر ہے جو ذلت انسان کو خود اس کی ذات کی جانب سے لاحق ہو اسے ھَوْنٌ وَذُلٌّ

---

[۱] فلینظر من اخرجہ ۱۲

کہا جاتا ہے۔ اور یہ صفات محمودہ سے ہے مگر جو دوسروں کی طرف سے پہنچے اسے ھُوْنٌ، ھَوَان اور ذُلٌّ کہتے ہیں اور یہ مذموم سمجھی جاتی ہے۔

(خ س ء)

خَسَأْتُ الْکَلْبَ خَسْأً: میں نے کتے کو دھتکارا تو وہ دور ہو گیا۔ اور کسی کو دھتکارنے کے لئے عربی میں اِخْسَأْ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں کفار کے متعلق فرمایا:۔

اِخْسَؤُا فِیْھَا وَلَا تُکَلِّمُوْنِ (۲۳-۱۰۸) اسی میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے بات نہ کرو۔ فَقُلْنَا لَھُمْ کُوْنُوْا قِرَدَۃً خَاسِئِیْنَ (۲-۶۵) تو ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل و خوار بندر ہو جاؤ۔

اسی سے خَسَأَ الْبَصَرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں نظر درماندہ ہو کر منقبض ہو گئی۔ قرآن میں ہے:۔

خَاسِئًا وَّھُوَ حَسِیْرٌ (۶۷-۴) کہ وہ نظر درماندہ اور تھک کر لوٹ آئے گی۔

(خ س ر)

اَلْخُسْرُ وَالْخُسْرَانُ: راس المال میں کمی آجانا خسارہ کی نسبت کبھی انسان کی طرف ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے خَسِرَ (س) فُلَانٌ: فلاں نے نقصان اٹھایا۔ اور کبھی فعل کی طرف ہوتی ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے خَسِرَتْ تِجَارَتُہٗ: اس کی تجارت خسارہ میں ہے۔ قرآن میں ہے:۔ تِلْکَ اِذًا کَرَّۃٌ خَاسِرَۃٌ (۷۹-۱۲) یہ لوٹنا تو موجب زیاں ہے۔

عام طور پر اس کا استعمال خارجی ذخائر میں نقصان اٹھانے پر ہوتا ہے۔ جیسے مال وجاہ وغیرہ لیکن کبھی معنوی ذخائر یعنی صحت و سلامتی عقل و ایمان اور ثواب کھو بیٹھنے پر بولا جاتا ہے بلکہ ان چیزوں میں نقصان اٹھانے کو اللہ تعالےٰ نے خسران مبین قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

اَلَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ وَاَھْلِیْھِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَلَا ذٰلِکَ ھُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ (۳۹-۱۵) جنہوں نے اپنے آپ اور اپنے گھر والوں کو نقصان میں ڈالا۔ دیکھو یہی صریح نقصان ہے۔ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲-۱۲۱) اور جو اس کو نہیں مانتے وہ خسارہ پانے والے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللہِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ ...... اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۲-۲۷) جو خدا کے اقرار کو مضبوط کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں... یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

فَطَوَّعَتْ لَہٗ نَفْسُہٗ قَتْلَ اَخِیْہِ فَقَتَلَہٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ (۵-۳۰) مگر اس کے نفس نے اس کو بھائی کے قتل ہی کی ترغیب دی تو اس نے اسے قتل کر دیا اور خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو گیا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ (۵۵-۹) اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول کم مت کرو۔

میں ہو سکتا ہے کہ ماپ تول میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنے اور ظلم ترک کرنے کا حکم ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان افعال کے ارتکاب سے منع کیا ہو جو قیامت کے دن میزان عمل میں کمی

کا موجب ہوں جس کی وجہ سے آدمی ان لوگوں سے ہوجائے جن کے متعلق قرآن نے فَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ (۱۰۱-۸) کہا ہے، یہ دونوں معنی باہم لازم ملزوم ہیں۔ اور جہاں کہیں قرآن میں خسران کا لفظ آیا ہے وہ اسی دوسرے معنی پر محمول ہے۔ دنیوی کاروبار اور دیگر چیزوں میں نقصان اٹھانا مراد نہیں ہے۔

(خ س ف)

اَلْخَسُوْفُ کا لفظ چاند کے بے نور ہونے اور کَسُوْفٌ کا لفظ سورج کے بے نور ہونے پر بولا جاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ خسوف قدرے بے نور ہونے کو کہا جاتا ہے اور کسوف پوری طرح بے نور ہوجانے کو کہتے ہیں، عام اس سے کہ وہ سورج ہو یا چاند کہا جاتا ہے خَسَفَهُ اللّٰهُ اللہ نے اسے زمین میں دھنسا دیا (متعدی) خَسَفَ هُوَ (لازمی) زمین میں دھنس جانا۔

قرآن میں ہے:۔
فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ (۲۸-۸۰) پس ہم نے قارون کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا۔
لَوْلَا اَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا (۲۸-۸۲) اگر خدا ہم پر احسان نہ کرتا تو ہمیں بھی دھنسا دیتا۔
حدیث میں ہے[1] (۱۱۶)
اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ اٰيَتَانِ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ لَا يَخْسِفَانِ لِمَوْتِ اَحَدٍ وَلَا لِحَيَاتِهٖ کہ سورج اور چاند اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جو کسی کی موت یا پیدائش کی وجہ سے بے نور نہیں ہوتے۔ اور عَيْنٌ خَاسِفَةٌ (اندر دھنسی ہوئی آنکھ) کا محاورہ خَسَفَ الْقَمَرُ سے منقول ہے بِئْرٌ مَّخْسُوْفَةٌ وہ کنواں جس کا پانی غائب ہوگیا ہو اور چاند گہن لگنے سے چونکہ ماند پڑ جاتا ہے اس لئے بطور استعارہ خَسْفٌ بمعنی ذلت و رسوائی بھی آجاتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔
تَحَمَّلَ فُلَانٌ خَسْفًا۔ فلاں شخص ذلیل ہوگیا۔

(خ ش ب)

اَلْخَشَبُ (موٹی لکڑی ج خُشُبٌ) اور آیت کریمہ:۔
كَاَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ (۶۳-۴) گویا لکڑیاں ہیں جو دیوار سے لگائی گئی ہیں۔
میں انہیں نکما ہونے میں لکڑیوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور خَشَبٌ کے لفظ سے اشتقاق کے ساتھ کہا جاتا ہے: خَشَبْتُ السَّيْفَ۔ تلوار کو صیقل کرنا اور صیقل کرنے کے آلہ کو مِخْشَبٌ کہا جاتا ہے۔ سَيْفٌ خَشِيْبٌ تلوار جو تازہ صیقل کی گئی ہو۔ جَمَلٌ خَشِيْبٌ نیا اونٹ یعنی جو سدھایا نہ گیا ہو۔
تَخَشَّبَتِ الْاِبِلُ۔ لکڑی کھانا سوکھی گھاس چرنا۔ جَبْهَةٌ خَشْبَاءُ۔ لکڑی کی طرح سخت اور کھردری پیشانی (کنایۃً)، بے حیا۔ جیسا کہ شاعر نے صخر یعنی چٹان کے ساتھ تشبیہ دیکر کہا ہے ع ؎
(۱۳۵) وَالصَّخْرُ هَشٌّ عِنْدَ وَجْهِكَ فِي الصَّلَابَةِ
تیرے چہرے کے مقابلہ میں تو پتھر بھی ہشاش بشاش

---

[1] الحدیث فی الصحیحین وابی داؤد والنسائی عن عائشہ (صلوٰۃ الکسوف) والطیالسی عن انس وایضا البخاری والنسائی عن ابی بکرۃ راجع الفتح اللنبهانی ج ۱ ص ۲۰۵-۳۰۶ ۱۲

معلوم ہوتا ہے۔
اَلْمُخَشَّوبٌ۔ وہ چیز جس میں لکڑی ملائی گئی ہو۔ اور یہ ردی چیز سے کنایہ ہوتا ہے۔

(خ ش ع)

اَلْخُشُوْعُ (ن) کے معنی ضَرَاعَةٌ یعنی عاجزی کرنے اور جھک جانے کے ہیں۔ مگر زیادہ تر خُشُوْعٌ کا لفظ جوارح اور ضَرَاعت کا لفظ قلب کی عاجزی پر بولا جاتا ہے۔ اسی لئے ایک روایت میں ہے:(۱۲)

اِذَا ضَرَعَتِ الْقَلْبُ خَشَعَتِ الْجَوَارِحُ جب دل میں فروتنی ہو تو اسی کا اثر جوارح پر ظاہر ہو جاتا ہے قرآن میں ہے:۔
وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا (۱۷-۱۰۹) اور اس سے ان کو اور زیادہ عاجزی پیدا ہوتی ہے۔
اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (۲۳-۲) جو نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں۔
وَكَانُوْا لَنَا خَاشِعِيْنَ (۲۱-۹۰) اور ہمارے آگے عاجزی کیا کرتے تھے۔
وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ (۲۰-۱۰۸) اور... ...آوازیں پست ہو جائیں گی۔
خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ (۶۸-۴۳) ان کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی۔
اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ (۷۹-۹) اور آنکھیں جھکی ہوئی۔ یہ ان کی نظروں کے مضطرب ہونے سے کنایہ ہے۔ جیسا کہ زمین و آسمان کے متعلق بطور کنایہ کے فرمایا۔
اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (۵۶-۴) جب زمین بھونچال سے لرزنے لگے۔
اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۹۹-۱) جب زمین بھونچال سے ہلا دی جائے گی۔
يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا (۵۲-۹-۱۰) جس دن آسمان لرزنے لگے کپکپا کر۔ اور پہاڑ اڑنے لگیں اڑان ہو کر۔

(خ ش ی)

اَلْخَشْيَةُ۔ اس خوف کو کہتے ہیں جو کسی کی عظمت کی وجہ سے دل پر طاری ہو جائے، یہ بات عام طور پر اس چیز کا علم ہونے سے ہوتی ہے جس سے انسان ڈرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آیت کریمہ:۔
اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵-۲۸) اور خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔ میں خشیت الٰہی کے ساتھ علماء کو خاص کیا ہے۔
وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى (۸۰-۸-۹) اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا اور خدا سے ڈرتا ہے۔
مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (۵۰-۳۳) جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔
فَخَشِيْنَا اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا (۱۸-۸۰) ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ دبڑا ہو کر جو بدکردار ہوتا کہیں) ان کو سرکشی اور کفر میں پھنسا دے۔
فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ (۲-۱۵۰) سو ان سے مت ڈرنا اور مجھ سے ڈرتے رہنا۔
يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً (۴-۷۷) لوگوں سے یوں ڈرنے لگے

لے لم اجدہ ۱۲

جیسے خدا سے ڈرا کرتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ۔
اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ (۳۳-۳۹)
جو خدا کے پیغام (جوں کے توں) پہنچاتے اور اس سے ڈرتے ہیں۔ اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔
وَلْیَخْشَ الَّذِیْنَ (۴-۹) ۔۔۔ اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیئے۔
یعنی ان کو اپنے فقر کے خوف کا احساس ہونا چاہیئے۔
خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ (۱۷-۳۱) مفلسی کے خوف سے یعنی اس اندیشے سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو کہ یہ مفلس ہوکر ذلیل ہو جائے گی۔ اور آیت کریمہ:۔
مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ (۵۰-۳۳)
جو خدا سے بن دیکھے ڈرتا ہے۔
یعنی اس کے دل میں ایسا خوف ہو جو کہ معرفت الٰہی کا تقاضا ہے۔

(خ ص ص)

اَلتَّخْصِیْصُ وَالْاِخْتِصَاصُ وَالْخُصُوْصِیَّۃُ وَالتَّخَصُّصُ کسی چیز کے بعض افراد کو دوسروں سے الگ کرکے ان کے ساتھ خصوصی برتاؤ کرنا یہ۔
اَلْعُمُوْمُ وَالتَّعَمُّمُ وَالتَّعْمِیْمُ کی ضد ہے۔
خُصَّانُ الرَّجُلِ۔ جن پر خصوصی نوازش کرتا ہو۔
اَلْخَاصَّۃُ۔ یہ عامۃ کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَاتَّقُوْا فِتْنَۃً لَّا تُصِیْبَنَّ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْکُمْ خَاصَّۃً (۸-۲۵) اور اس فتنے سے ڈرو جو خصوصیت کے ساتھ انہیں لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں گنہگار ہیں یعنی، بلکہ سب پر واقع ہوگا۔
خَصَّہٗ بِکَذَا وَاخْتَصَّہٗ۔ کسی کو کسی چیز کے ساتھ مختص کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (۲-۱۰۵)
جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے۔
خَصَاصُ الْبَیْتِ مکان میں شگاف کو کہتے ہیں۔
اسی سے خَصَاصَۃٌ اس فقر و احتیاج کو کہتے ہیں جو ختم نہ ہوئی ہو۔ اس قسم کے فقر کو خَلَّۃٌ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ (۵۹-۹) اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔
لہذا آپ اسے خصاص سے ماخوذ قرار دے سکتے ہیں۔
اَلْخُصُّ۔ بانس یا لکڑی کا جھونپڑا اور اسے خُصٌّ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں جھروکے نظر آتے ہیں۔

(خ ص ف)

قرآن میں ہے:۔
وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْہِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّۃِ (۲۰-۱۲۲) یعنی آدمؑ اور حواؑ اپنے اوپر خَصَفَۃٌ یعنی درخت کے پتے چپکانے لگے اسی سے زنبیل کو جو کھجوریں ڈالنے کے لئے کھجور کے پتوں سے بنایا جاتا ہے اور گاڑھے کپڑے کو خَصَفَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع خَصَفٌ (وخِصَافٌ) آتی ہے۔ اور خَصْفَۃٌ (بسکون صاد) چمڑے کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جس کے اوپر اس جیسا دوسرا ٹکڑا رکھ کر۔ جوتا بنایا جا
خَصَفْتُ النَّعْلَ بِالْمِخْصَفِ ستالی کے

ساتھ جوتا سینا۔
ایک روایت میں ہے[1] (۱۱۳)
كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَخْصِفُ نَعْلَهُ
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا جوتا خود ہی مرمت کر لیا کرتے تھے۔
خَصَفْتُ الْخَصَفَةَ۔ زنبیل بننا۔
اَلْاَخْصَفُ وَالْخَصِيْفُ دو رنگ کا کھانا
اصل میں اس دودھ وغیرہ کو کہتے ہیں جو چمڑے کے شکیزے میں ڈالا جائے اور اس چمڑے کا رنگ اسی کے ساتھ مل جائے[2]۔

(خ ص م)

اَلْخَصْمُ۔ یہ خَصَمْتُهٗ کا مصدر ہے جس کے معنی جھگڑنے کے ہیں کہا جاتا ہے خَصَمْتُهٗ وَخَاصَمْتُهٗ مُخَاصَمَةً وَخِصَامًا کسی سے جھگڑا کرنا قرآن میں ہے:۔
وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ (۲-۲۰۴) اور وہ حالانکہ سخت جھگڑالو ہے۔
وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ (۴۳-۱۸) اور جھگڑنے کے وقت بات نہ کر سکے۔
اور مُخَاصِمٌ کو خَصْمٌ کہا جاتا ہے، اور خصم کا لفظ واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر کبھی تثنیہ بھی آجاتا ہے[3]۔
اصل میں خَصْمٌ کے معنی کنارہ کے ہیں۔ اور مخاصمت کے معنی ایک دوسرے کو کنارہ سے پکڑنے کے ہیں۔ اور بوری کو کونے سے پکڑ کر کھینچنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے[4]: (۱۱۴)
نَسِيْتُهَا فِي خُصْمِ فِرَاشِيْ کہ میں اسے اپنے بستر کے کونے میں بھول آیا ہوں خُصْمٌ کی جمع خُصُوْمٌ وَاَخْصَامٌ آتی ہے اور آیت کریمہ:
خَصْمَانِ اخْتَصَمُوْا (۲۲-۹) دو فریق جھگڑتے ہیں۔ میں خَصْمَانِ سے دو فریق مراد ہیں اسی لئے اِخْتَصَمُوْا آیا ہے۔
اَلْاِخْتِصَامُ (افتعال) ایک دوسرے سے جھگڑنا۔ قرآن میں ہے:۔
لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ (۵۰-۲۸) ہمارے حضور رد و کد نہ کرو۔
وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ (۲۶-۹۶) ...... وہ آپس میں جھگڑیں گے۔
اَلْخَصِيْمُ۔ جھگڑالو بہت زیادہ جھگڑا کرنے والا جیسے فرمایا:۔
فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ (۱۶-۴) مگر وہ (اس بارے میں) علانیہ جھگڑنے لگا۔
اَلْخَصِمُ سخت جھگڑالو جس کا شیوہ ہی جھگڑنا ہو۔ قرآن میں ہے:۔
بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ (۴۳-۵۸) حقیقت یہ ہے۔ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو۔

---

[1] کلمة من حدیث عائشة رواه الترمذی وفی کنز العمال (المتفرقات) ۷: رقم ۸۳۴ (حم۔ عن عائشة) وفی تخریج العراقی علی الاحیاء ۲/ ۳۶۷ اخرجه احمد من حدیث عائشة ورجاله رجال الصحیح ورواه ابو الشیخ ایضاً وابن حبان فی زوائده رقم ۲۱۳۳-۲۱۳۵۔
[2] قال الجوهری الخصیف۔ اللبن الحلیب یصب علیه الرائب فان جعل علیه التمر والسمن فهو العوثبانی [3] فقال الجوهری ومن العرب من ثنیه ویجمعه۔ [4] راجع اللسان (خصم) من حدیث ام سلمة قالت یا رسول الله اراک ساهم الوجه، من علة قال لا لکنه من السبعة الدنانیر التی اتینا بها امس فی خصم الفراش فبت ولم اقسمها

(خ ض د)

خَضَدْتُهٗ فَانْخَضَدَ کے معنی ہیں میں نے درخت کے کانٹے توڑے چنانچہ وہ ٹوٹ گئے اور ایسے درخت کو جس کے کانٹے توڑ دیئے گئے ہوں اسے مَخْضُوْد اور خضید کہا جاتا ہے جیسے فرمایا۔
فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (۵۶-۲۸) (یعنی) بے خار کی بیریوں میں۔
اور خُضُدٌ بمعنی مَخْضُوْدٌ آتا ہے جیسے نَقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ اور اسی سے استعارۃً خَضَدَ عُنُقَ الْبَعِیْرِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ یعنی اس نے اونٹ کی گردن توڑ ڈالی۔

(خ ض ر)

قرآن میں ہے:۔
فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً (۲۲-۶۳) تو زمین سرسبز ہو جاتی ہے۔
ثِیَابًا خُضْرًا (۱۸-۳۱) سبز رنگ کے کپڑے۔
خُضْرًا کا واحد اَخْضَرُ ہے اور اَلْخُضْرَۃُ ایک قسم کا رنگ ہوتا ہے جو سفیدی اور سیاہی کے بین بین ہوتا ہے مگر سیاہی غالب ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اَسْوَدُ (سیاہ) اور اَخْضَرُ (سبز) کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۱۳۶) قَدْ اَعْسِفُ النَّازِحَ الْمَجْهُوْدَ مَعْسَفَۃً
فِیْ ظِلِّ اَخْضَرَ یَدْعُوْھَامَۃَ الْبُوْمِ

میں تاریک اور بھیانک راتوں میں دور دراز راستوں میں سفر کرتا ہوں جو بے نشان ہوتے ہیں۔ اور سبزی اور شادابی کی وجہ سے عراق کے ایک حصہ کو سَوَادُ الْعِرَاقِ کہا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔
مُدْھَامَّتٰنِ (۵۵-۶۴) کے معنی سرسبز کے ہیں اور خُضْرَۃ کی جگہ دُھْمَۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی سیاہی کے ہیں۔ حدیث میں ہے[2]:۔ (۱۴۱)
اِیَّاکُمْ وَخَضْرَاءَ الدِّمَنِ تم کوڑی کی سرسبزی سے بچو۔ اور خَضْرَاءَ الدِّمَنِ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے آنحضرت نے فرمایا اَلْمَرْأَۃُ الْحَسْنَۃُ فِیْ مَنْبَتِ السُّوْءِ یعنی خوبصورت عورت جو بد طینت ہو۔
اَلْمُخَاضَرَۃُ سبزیوں اور کچے پھلوں کی بیع کرنا۔
اَلْخَضِیْرَۃُ کھجور کا درخت جس کی سبز او نیم پختہ کھجوریں جھڑ جائیں

(خ ض ع)

اَلْخُضُوْعُ کے معنی خشوع یعنی جھکنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
رَجُلٌ خُضَعَۃٌ وہ شخص جو ہر ایک کے سامنے عاجزی اور انکساری ظاہر کرتا پھرے۔
خَضَعْتُ اللَّحْمَ۔ میں نے گوشت کاٹا۔

---

[1] قالہ ذوالرمۃ ویروی المجہول بدل المجہود ومعسفۃ بدل معسفۃ کما فی اللسان (یوم) والاقتضاب وفی روایۃ اغضف بدل اخضر وہوالمتنی وادب الکاتب ۲۳/۱۹۱ والبیت فی دیوانہ ۵۷۴ واضداد ابن الانباری ۳۴۸ واللسان (خضر، عسف) واضداد ابی الطیب ۲۳۰ والحیوان (۶:۱۷۵) والسیوطی ۱۵۰ والمحکم (عسف) معنی العسف رکوب المفازۃ وقصعھا بغیر قصد ولا ہدایۃ ولا توخی صوب ولا طریق مسلوک ۱۲ [2] رواہ الدار قطنی فی الافراد والرامہرمزی فی الامثال من حدیث الخدری قال الدارقطنی تفرد بہ الواقدی وہو ضعیف (تخریج احیاء للعراقی ۲/۴۱) والحدیث مثل راجع المیدانی ۱/۳۲ والفائق ۱/۱۷۵ وغریب ابی عبید الحصری ۱/۵۹

ظَلِيْمٌ اَخْضَعُ شتر مرغ جس کی گردن میں پستی اور جھکاؤ ہو۔

(خ ط ط)

اَلْخَطُّ (مثل مَدٌّ) جس میں طول ہو اہل ہندسہ کے نزدیک خطوط کئی قسم پر ہیں۔ یعنی مسطوح، مستدیر، مقوس اور ممال وغیرہ اور سر مستطیل علاقہ کو خطٌّ کہہ دیتے ہیں جیسے خطُّ الْیَمَنِ جو یمن کے ایک علاقہ کا نام ہے جس کی طرف خطی نیزے منسوب ہیں اور زمین کا وہ حصہ جو انسان اپنے لئے مخصوص کرے اور کھودے اسے خَطٌّ اور خِطَّةٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْخَطِیْطَةُ وہ زمین جس کے ارد گرد بارش ہوئی ہو اور وہ درمیان میں خط منحرف کی طرح بے بارش کے رہ گئی۔ اور اَلْخَطُّ کے معنی لکھنا، کتابت کرنا بھی ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (۲۹-۴۸) اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ ہی سکتے تھے۔

(خ ط ء)

اَلْخَطَأُ وَالْخَطَاءَةُ کے معنی صحیح جہت سے عدول کرنے کے ہیں۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں۔
(۱) کوئی ایسا کام بالارادہ کرے جس کا ارادہ بھی مناسب نہ ہو۔ یہ خطا تام ہے جس پر مواخذہ ہوگا اس معنی میں فعل خَطِئَ يَخْطَأُ خِطْأً وَخِطْأَةً بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيْرًا (۱۷-۳۱) کچھ شک نہیں کہ ان کا مار ڈالنا بڑا سخت جرم ہے۔
وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ (۱۲-۹۱) اور بلاشبہ ہم خطا کار تھے۔
(۲) ارادہ تو اچھا کام کرنے کا ہو لیکن غلطی سے برا کام سرزد ہو جائے۔ کہا جاتا ہے:۔
اَخْطَأَ يُخْطِئُ اِخْطَاءً فَهُوَ مُخْطِئٌ اس میں اس کا ارادہ تو درست ہوتا ہے مگر اس کا فعل غلط ہوتا ہے اسی قسم کی خطا کے متعلق آنحضرتؐ نے فرمایا ہے[1] (۱۵۰):
رُفِعَ عَنْ اُمَّتِي الْخَطَأُ وَالنِّسْيَانُ کہ میری امت سے خطا اور نسیان اٹھا لئے گئے ہیں۔
نیز فرمایا[2]: (۱۶۱)
مَنِ اجْتَهَدَ فَاَخْطَأَ فَلَهٗ اَجْرٌ جس نے اجتہاد کیا۔ لیکن اس سے غلطی ہوگئی اسے پھر بھی اجر ملے گا۔ قرآن میں ہے:۔
مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ (۴-۹۲) اور جو غلطی سے مومن کو مار ڈالے تو ایک تو .... غلام کو آزاد کر دے۔
(۳) غیر مستحسن فعل کا ارادہ کرے لیکن اتفاق سے مستحسن فعل سرزد ہو جائے۔ اس صورت میں اس کا فعل تو درست ہے مگر ارادہ غلط ہے لہٰذا اس کا قصد مذموم ہوگا مگر فعل بھی قابل ستائش نہیں ہوگا۔ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے[3] ع (   )

(۱۳۷) اَرَدْتَ مَسَاءَتِيْ فَاَجَزْتَ مَسَرَّتِيْ
وَقَدْ يُحْسِنُ الْاِنْسَانُ مِنْ حَيْثُ لَا يَدْرِيْ

(تو نے میری برائی کا ارادہ کیا لیکن مجھے خوشی حاصل ہوگئی کبھی انسان نادانستہ طور پر بھی اچھا کام کر لیتا ہے۔

---

[1] ...... رواية وضع من ابن عدى عن ابى بكرة مرفوعًا رفع الله عن هذه الامة ثلاثا الخ قال الحافظ فى تخريجه ص ۱۳۲ رقم ۲۰۲ انما من منكرات جعفر وفى رواية ابن ماجه و البيهقى وابن حبان عن ابن عباس ان الله تجاوز عن امتى (راجع المشكوٰة واللالئ للسيوطى) [2] لم اجده [3] لم اجده وہ ......

حاصل کلام یہ کہ جس شخص سے اتفاقاً ارادہ کے خلاف فعل صادر ہو جائے۔ تو اس کے متعلق "اَخْطَأَ" کہا جاتا ہے اور اگر ارادہ کے مطابق فعل صادر ہو تو اصاب کہتے ہیں مگر کبھی اَخْطَأَ کا لفظ اس شخص کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے جس نے کسی غیر مستحسن فعل کا ارتکاب کیا ہو یا کسی نازیبا کام کا ارادہ کیا ہو۔ لہٰذا اَصَابَ الْخَطَأَ وَ اَخْطَأَ الصَّوَابَ وَ اَصَابَ الصَّوَابَ وَ اَخْطَأَ الْخَطَأَ ہر طرح کہنا درست ہوگا اور یہ لفظ مشترک ہے جو بہت سے معانی کا محتمل ہوتا ہے اس لئے جو شخص حقائق کا متلاشی ہو اسے اس کے متعلق خوب غور سے کام لینا چاہیئے۔

اَلْخَطِيْئَةُ یہ قریب قریب سَيِّئَةٌ کے ہم معنی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ (۲-۸۱) اور اسکے گناہ ہر طرف سے اس کو گھیر لیں گے۔

لیکن زیادہ تر خَطِيْئَةٌ کا استعمال اس فعل کے متعلق ہوتا ہے جو بذات خود مقصود نہ ہو بلکہ کسی دوسری چیز کا ارادہ اس کے صدور کا سبب بن جائے مثلاً کسی نے شکار کے نشانہ لگایا مگر نشانہ خطا ہو کر کسی انسان کو جا لگا یا کسی مسکر چیز کا استعمال کیا اور نشہ کی حالت میں کسی جرم کا ارتکاب کر بیٹھا یہ سبب دو قسم پر ہے ایک سبب محظور جیسے مسکر چیز پینا اس حالت میں جو فعل سرزد ہوگا وہ قابل گرفت ہوگا۔ دوسرم سبب مباح جیسے شکار کو نشانہ بنایا اس حالت میں جو خطا سرزد ہو گی اس پر گرفت نہیں ہوگی اسی قسم کی غلطی کے متعلق فرمایا:۔

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ (۳۳-۵) اور جو بات تم سے غلطی سے ہو گئی ہو اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں لیکن جو قصد دلی سے کرو اس پر مواخذہ ہے)

اور آیت کریمہ:۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا (۴-۱۱۲) اور جو کوئی قصور یا گناہ خود کرے۔

میں خَطِيْئَةٌ سے وہ فعل مراد ہے جو بلا قصد سرزد ہوا ہو اور اسی قسم کی خطا کے متعلق حضرت ابراہیم نے کہا تھا۔

وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ (۲۶-۸۲) اور وہ جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے گناہ بخشیگا۔

خَطِيْئَةٌ کی جمع خَطِيْئَاتٌ وَخَطَايَا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ۔ مِمَّا خَطِيْٓئٰتِهِمْ (۷۱-۲۴-۲۵) اور ظالم لوگوں کے لئے اور زیادہ تباہی بڑھا (آخر) وہ اپنے گناہ کے سبب ہی۔

اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ (۲۶-۵۱) ہمیں امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہ بخش دے گا۔

وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ (۲۹-۱۲) ہم تمہارے گناہ اٹھا لیں گے حالانکہ وہ ان کے گناہوں کا کچھ بھی بوجھ اٹھانے والے نہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

نَغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ (۲-۵۸) ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔

سے وہ گناہ مراد ہیں جو عمداً کئے ہوں۔

اَلْخَاطِئُ بالارادہ گناہ کرنے والے کو کہتے ہیں جیسے فرمایا:۔

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝ لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا

الْخَاطِئُوْنَ (۶۹-۳۷) اور نہ پیپ کے سوا اس کے لئے) کھانا ہے جس کو گنہگاروں کے سوا کوئی نہیں کھائے گا۔

مگر کبھی نفس گناہ پر بھی خَاطِئَةٌ کا اطلاق ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔

وَالْمُؤْتَفِكَاتُ بِالْخَاطِئَةِ (۶۹-۹) اور وہ جو الٹی بستیوں میں رہتے تھے سب گناہ کے کام کرتے تھے۔

یعنی وہ گناہ عظیم کا ارتکاب کرتے تھے جیسا کہ (بطور مبالغہ) شِعْرٌ شَاعِرٌ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

لیکن جو گناہ بلا قصد سرزد ہو جائے اس کے متعلق آنحضرت نے فرمایا ہے کہ وہ قابل گرفت نہیں ہے[1]۔ مگر آیت کریمہ:۔

نَغْفِرْ لَكُمْ خَطَايَاكُمْ (۲-۵۸) ہم تمہارے گناہ معاف کر دیں گے۔

میں وہی معنی مراد ہیں جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

(خ ط ب)

اَلْخَطْبُ وَالْمُخَاطَبَةُ وَالتَّخَاطُبُ۔

باہم گفتگو کرنا۔ ایک دوسرے کی طرف بات لوٹانا اسی سے خُطْبَةٌ اور خِطْبَةٌ کا لفظ ہے لیکن خُطْبَةٌ وعظ و نصیحت کے معنی میں آتا ہے اور خِطْبَةٌ کے معنی ہیں نکاح کا پیغام۔

قرآن میں ہے:۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ (۲-۱۳۵) اگر تم کنایہ کی باتوں میں عورتوں کو نکاح کا پیغام بھیجو ...... تو تم پر کچھ گناہ نہیں۔

اصل میں خِطْبَةٌ اسی حالت کو کہتے ہیں جو بات کرتے وقت ہوتی ہے جیسا کہ جِلْسَةٌ اور قِعْدَةٌ پھر خُطْبَةٌ سے تو خَاطِبٌ اور خَطِيبٌ دونوں لفظ استعمال ہوتے ہیں مگر خِطْبَةٌ سے صرف خَاطِبٌ کا لفظ ہی بولا جاتا ہے۔ اور خَطَبَ فعل دونوں معنی کے لئے آتا ہے۔

اَلْخَطْبُ۔ اہم معاملہ جس کے بارے میں کثرت سے تخاطب ہو۔ قرآن میں ہے:۔

فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ (۲۰-۹۵) (پھر سامری سے کہنے لگے) کہ سامری تیرا کیا حال ہے۔

فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ (۵۱-۳۱) کہ فرشتو تمہارا مدعا کیا ہے۔

فَصْلَ الْخِطَابِ (۳۸-۲۰) دو ٹوک بات، فیصلہ کن بات جس سے نزاع ختم ہو جائے۔

(خ ط ف)

خَطَفَ يَخْطِفُ خَطْفًا وَاخْتَطَفَ اِخْتِطَافًا کے معنی کسی چیز کو سرعت سے اچک لینا کے ہیں۔ یہ باب (س ض) دونوں سے آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ (۳۷-۱۰) ہاں جو کوئی (فرشتوں کی) بات کو) چوری سے جھپٹ لینا چاہتا ہے۔

طا پر فتحہ اور کسرہ دونوں منقول ہیں اور اس سے مراد وہ شیاطین ہیں جو چوری چھپے ملأ اعلیٰ کی گفتگو سنا کرتے تھے۔ نیز فرمایا:۔

تَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ (۲۲-۳۱) پھر اس کو پرندے اچک لے جائیں یا ہوا کسی دور جگہ اڑا کر پھینک دے۔

---

[1] وقد مر الآن ۱۲

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ (۲-۲۰) قریب ہے کہ بجلی (کی چمک) ان کی آنکھوں (کی بصارت) کو اچک لے جائے۔

وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ (۲۹-۶۷) اور لوگ ان کے گرد نواح سے اچک لئے جاتے ہیں۔ یعنی ان کے گرد و نواح میں قتل و غارت کا سلسلہ جاری ہے۔

اَلْخَطَّافُ۔ (۱) ابابیل کی قسم کا ایک پرندہ جو پرواز کرنے میں کسی چیز کو جھپٹ لیتا ہے۔ (۲) آہن کج جس کے ذریعے کنوئیں سے ڈول نکالا جاتا ہے گویا وہ ڈول کو اچک کر باہر لے آتا ہے (۳) وہ لوہا جس پر کنوئیں کی چرخی گھومتی ہے۔ ج خَطَاطِيفُ بَازٌ مُخْطِفٌ۔ باز جو اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔

اَلْخَيْطَفُ۔ تیز رفتاری۔ اَخْطَفُ الْحَشَا وَمُخْتَطَفَةٌ۔ مرد باریک شکم جس کے دبلاپن کی وجہ سے ایسا معلوم ہو کہ اس کی انتڑیاں اچک لی گئی ہیں۔

(خ ط و)

خَطَوْتُ اَخْطُوْ کے معنی چلنے کے لئے قدم اٹھانے کے ہیں خَطْوَةٌ ایک بار قدم اٹھانا اَلْخُطْوَةُ وہ فاصلہ جو دو قدموں کے درمیان ہو۔ اَلْخُطْوَةُ کی جمع خُطُوَاتٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ۔ (۲-۱۶۸) اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو۔

یعنی شیطان کی اتباع نہ کرو۔ اور یہ آیت کریمہ:۔ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (۳۸-۲۶) اور خواہش کی پیروی نہ کرنا۔ کی طرح ہے۔

(خ ف ف)

اَلْخَفِيْفُ (ہلکا) یہ ثقیل کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ اس کا استعمال کئی طرح پر ہوتا ہے (۱) کبھی وزن میں مقابلہ کے طور یعنی دو چیزوں کے باہم مقابلہ میں ایک کو خفیف اور دوسری کو ثقیل کہہ دیا جاتا ہے جیسے دِرْهَمٌ خَفِيْفٌ وَدِرْهَمٌ ثَقِيْلٌ یعنی وہ درہم ہلکا ہے۔ اور یہ بھاری ہے (۲) اور کبھی تقابل زمانی کے اعتبار سے بولے جاتے ہیں۔ مثلاً (ایک گھوڑا جو فی گھنٹہ دس میل کی مسافت طے کرتا ہو اور دوسرا پانچ میل فی گھنٹہ دوڑتا ہو تو پہلے کو خفیف (سبک رفتار) اور دوسرے کو ثقیل (سست رفتار) کہا جاتا ہے (۳) جس چیز کو خوش آئندہ پایا جائے اسے خفیف اور جو طبیعت پر گراں ہو اسے ثقیل کہا جاتا ہے اس صورت میں خفیف کا لفظ بطور مدح اور ثقیل کا لفظ بطور مذمت استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ آیات کریمہ:۔

اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ (۸-۶۶) اب خدا نے تم پر سے بوجھ ہلکا کر دیا۔

فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ (۲-۸۶) سو نہ تو ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا۔ اسی معنی پر محمول ہیں بلکہ ہمارے نزدیک آیت:۔

حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا (۷-۱۸۹) اسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

(۴) جو شخص جلد طیش میں آجائے اسے خفیف اور جو پروقار ہو اسے ثقیل کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کے اعتبار سے خفیف صفت ذم ہوگی اور ثقیل صفت مدح۔

(۵) جو اجسام نیچے کی طرف جھکنے والے ہوں انہیں ثقیل اور جو اوپر کی جانب چڑھنے والے ہوں انہیں خفیف کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے زمین پانی وغیرہا کو اجسام ثقیلہ اور ہوا، آگ وغیرہا اجسام خفیفہ میں داخل ہوں گے۔

خَفَّ (ض) خَفًّا وَخِفَّةً وَتَخَفَّفَ۔ ہلکا ہونا۔ خَفَّفَهُ تَخْفِيفًا۔ ہلکا کرنا۔ اِسْتَخَفَّهُ۔ ہلکا سمجھنا خَفَّ الْمَتَاعُ سامان کا ہلکا ہونا اسی سے كَلَامٌ خَفِيفٌ عَلَى اللِّسَانِ کا محاورہ مستعار ہے یعنی وہ کلام جو زبان پر ہلکا ہو۔ اور آیت کریمہ:۔

فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهُ فَأَطَاعُوهُ (۴۳-۵۴) غرض اس نے اپنی قوم کی عقل مار دی اور انہوں نے اس کی بات مان لی۔

کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ اس نے اپنی قوم کو اکسایا کہ اس کے ساتھ تیزی سے چلیں اور یا یہ کہ انہیں اجسام وعزائم کے اعتبار سے "ڈھیلا پایا" اور بعض نے یہ معنی بھی کئے ہیں کہ "انہیں جاہل اور کم عقل سمجھا۔ اور آیت کریمہ:۔

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ (۷-۹) اور جن کے وزن ہلکے ہوں گے۔

میں اعمال صالحہ کی کمی کی طرف اشارہ ہے اور آیت کریمہ:۔

وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ (۳۰-۶۰) اور وہ تمہیں اوچھا نہ بنا دیں۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ شبہات پیدا کرکے تمہیں تمہارے عقائد سے متزلزل اور برگشتہ نہ کر دیں۔

خَفُّوا عَنْ مَنَازِلِهِمْ۔ وہ تیزی سے کوچ کر گئے

اَلْخُفُّ۔ موزہ۔ انسان کے موزہ سے تشبیہ دے کر خُفُّ النَّعَامَةِ وَالْبَعِيرِ (پیل شتر وسم شتر مرغ) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

(خ ف ت)

اَلْمُخَافَتَةُ وَالْخَفْتُ پوشیدہ گفتگو کرنا۔ قرآن میں ہے:۔

يَتَخَافَتُونَ بَيْنَهُمْ (۲۰-۱۰۳) وہ آپس میں آہستہ آہستہ کہیں گے۔

وَلَا تُخَافِتْ بِهَا (۱۷-۱۱۰) اور نہ آہستہ۔ کسی شاعر نے کہا ہے[1] ع (   )

(۱۳۷) وَشَتَّانَ بَيْنَ الْجَهْرِ وَالْمَنْطِقِ الْخَفْتِ

کہ بلند اور پوشیدہ گفتگو میں بیّن فرق ہوتا ہے۔

(خ ف ض)

اَلْخَفْضُ۔ یہ رَفْعٌ کی ضد ہے۔ اور خَفْضٌ کے معنی نرم رفتاری اور سکون وراحت بھی آتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ (۱۷-۲۴) اور عجز ونیاز سے ان کے آگے جھکے رہو۔ میں ماں باپ کے ساتھ نرم برتاؤ اور ان کا مطیع اور فرمانبردار ہو کر رہنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ گویا یہ اَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ (کہ مجھ سے سرکشی نہ کرنا) کی ضد ہے اور قیامت کے متعلق فرمایا:۔

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (۵۶-۳) کسی کو پست کرے اور کسی کو بلند۔

کیونکہ وہ بعض کو پست اور بعض کو بلند کر دے گی پس خَافِضَةٌ میں آیت کریمہ:۔ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ (۹۵-۵) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] البیت فی الصحاح واللسان (خفت) بغیر عزو وصدرہ: اخاطب جھرا اذ لھن تخافت ۱۲

(خ ف ی)

خَفِیَ (س) خُفْیَۃً۔ اَلشَّیْءُ پوشیدہ ہونا۔ قرآن میں ہے:۔

اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً (۷-۵۵) اپنے پروردگار سے عاجزی سے اور چپکے چپکے دعائیں مانگا کرو۔

اَلْخَفَاءُ (مثل غِطَاءٌ) کے معنی پردہ کے ہیں۔

خَفَیْتُہٗ۔ میں نے اس سے پوشیدگی دور کر دی یعنی ظاہر کر دیا۔ اَخْفَیْتُہٗ۔ پوشیدہ کرنا۔ چھپانا۔ یہ اِبْدَاءٌ اور اِعْلَانٌ کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا ھِیَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْھَا وَتُؤْتُوْھَا الْفُقَرَآءَ فَھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ (۲-۲۷۱) اگر تم خیرات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے۔ اور اگر پوشیدہ دو اور دو بھی اہل حاجت کو تو وہ خوب تر ہے۔

وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَیْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ (۱-۶۰) جو کچھ تم مخفی طور پر اور جو علی الاعلان کرتے ہو وہ مجھے معلوم ہے۔

بَلْ بَدَا لَھُمْ مَّا کَانُوْا یُخْفُوْنَ (۶-۲۸) ہاں یہ جو کچھ پہلے چھپایا کرتے تھے (آج) ان پر ظاہر ہو گیا ہے۔

اَلْاِسْتِخْفَاءُ۔ چھپنا۔ قرآن میں ہے:۔

اَلَآ اِنَّھُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَھُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْہُ ط (۱۱-۵) دیکھو یہ اپنے سینوں کو دوہرا کرتے ہیں تاکہ خدا سے پردہ کریں۔

اَلْخَوَافِیْ۔ پرندکے بازوؤں کے نیچے چھپے ہوئے پر۔ اس کا مفرد خَافِیَۃٌ ہے اور یہ اَلْقَوَادِمُ کی ضد ہے۔

(خ ل ل)

اَلْخَلَلُ۔ دو چیزوں کے درمیان کشادگی اور فاصلہ کو کہتے ہیں مثلاً بادل اور گھروں کے درمیان کا فاصلہ یا راکھ وغیرہ کا اندرونی حصہ اس کی جمع خِلَالٌ ہے۔ چنانچہ بادل کے متعلق فرمایا:۔

فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلَالِہٖ (۳۰-۴۸) تم دیکھتے ہو کہ اس کے بیچ میں سے بارش برسنے لگتی ہے۔ اور گھروں کے متعلق فرمایا:۔

فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ ط (۱۷-۵) اور وہ شہروں کے اندر پھیل گئے۔

شاعر نے کہا ہے[1] ع (

(۱۳۹) اَرٰی خَلَلَ الرَّمَادِ وَمِیْضَ جَمْرٍ میں راکھ کے اندر آگ کے انگارے کی چمک دیکھتا ہوں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَلَاۡاَوْضَعُوْا خِلٰلَکُمْ (۹-۴۷) اور تم میں دوڑے دوڑے پھرتے۔ یعنی چغل خوری اور

---

(۱) قالہ بعض شعراء الامویین وتمامہ: فیخاف ان یکون لہ ضرام۔ والبیت فی اللسان (ضرم) ونسبہ ابن بری لابی مریم وفی روایتہ خلل الرماد بدل خلال الرماد وفی تاریخ الطبری (۷: ۳۶) کتب نصر بن سیار الی مروان بن محمد وفی العقد (۴: ۴۷۷) الی ہشام بن عبد الملک یخبرہ بخروج ابی مسلم الخراسانی علیہ والبیت ایضاً فی الاخبار الطوال لابی حنیفۃ الدینوری المتوفی ۲۸۲ھ فی خمسۃ ابیات کذا فی مجموعۃ المعانی ۱۱۲ وعزاہ لابی مریم البجلی وفی محاضرات المؤلف (۲: ۷۷) معزوا لابی مہیم والبیت ایضاً فی الاغانی (۹: ۱۲) وفیہ واحربان بدل اما دران وفی ابن عساکر (۴: ۱۹۱) خلیق ان وفی الاغانی (۶: ۱۲۸) انہ ارسل الابیات الی الولید بن یزید وفی العقد (۱: ۱۱) نار بدل جمر کذا فی الاصول سوی العیون (۱: ۱۲۸)

اور فساد سے تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کی کوشش کرتے۔

اَلْخِلَالُ۔ دانت وغیرہ صاف کرنیکا تنکا کہا جاتا ہے۔ خَلَّ سِنَّهٗ (اس نے اپنا دانت صاف کیا) خَلَّ ثَوْبَهٗ (کپڑے میں سوراخ کرنا۔ خَلَّ (ن) لِسَانَ الْفَصِيْلِ (اونٹ کے بچے کی زبان کو چھید کر بھو تفنی نوالنا تاکہ اونٹنی کا دودھ نہ پی سکے۔ خَلَّ الرَّمِيَّةَ بِالسَّهْمِ (نشانہ پر تیر مار کر سوراخ کر دیا) حدیث میں ہے[1] (۱۱)

خَلِّلُوْا اَصَابِعَكُمْ (وضو میں انگلیوں کا خلال کیا کرو۔

اَلْخَلَلُ فِى الْاَمْرِ کسی کام میں خرابی کا پیدا ہو جانا۔ جیسا کہ دو چیزوں کے درمیان رخنہ پڑ جاتا ہے۔ خَلَّ (ض) خَلًّا وَّخِلَالًا۔ لَحْمُهٗ گوشت کا دبلا اور کم ہو جانا۔ شاعر نے کہا ہے[2] : مدید)

(۱۴۰) اِنَّ جِسْمِیْ بَعْدَ خَالِیْ لَخَلُّ

کہ ماموں کے مرنے کے بعد میرا جسم گھل گیا ہے۔

اَلْخَلَّةُ۔ ریگ زار کے اندر راستہ کو کہتے ہیں اور اسے خَلَّۃٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دشوار گزار ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ وہ راستہ ریگ زار کے اندر سے گزرتا ہے۔ نیز ترش سرکہ کو بھی خَلَّۃ کہتے ہیں۔ کیونکہ ترشی اس میں سرایت کئے ہوتی ہے۔

اَلْخِلَّةُ تلوار کی نیام کا چمڑا جو اس کے اوپر منڈھا ہوا ہوتا ہے۔ نیام چونکہ اس کے اندر ہتی ہے اس لئے اس چمڑے کو خِلَّۃ کہا جاتا ہے۔

اَلْخَلَّةُ۔ (ایضًا) طبیعت کی خرابی یا عارضہ جو کسی چیز کی خواہش یا سخت احتیاج کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے اس لئے خَلَّۃٌ کے معنی حاجت اور خصلت بیان کئے جاتے ہیں۔

اَلْخُلَّةُ۔ موّدت، دوستی۔ محبت اور دوستی کو خُلَّۃ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دل کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ اور یا اس لئے کہ وہ دل کے اندر داخل ہو کر اس طرح اثر کرتی ہے جس طرح تیر نشانہ پر لگ کر اس میں نشان ڈال دیتا ہے۔ اور یا اس لئے کہ اس کی سخت احتیاج ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے:۔

خَالَلْتُهٗ مُخَالَّةً وَّخِلَالًا فَهُوَ خَلِيْلٌ

اور آیت کریمہ:۔

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا (۴-۱۲۵) اور خدا نے ابراہیمؑ کو اپنا دوست بنایا تھا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس لئے خلیل کہا ہے کہ وہ ہر حال میں باری تعالیٰ کے محتاج تھے اور یہ احتیاج ویسے ہی ہے۔ جس کی طرف آیت:۔

اِنِّىْ لِمَاۤ اَنْزَلْتَ اِلَىَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيْرٌ (۲۸-۲۴) میں اس کا محتاج ہوں کہ تو مجھ پر اپنی نعمت نازل فرمائے۔

---

[1] راجع (حم) عن ابن عباس و (قط) عن عائشۃ و (قط) عن ابی ہریرۃ (والفتح للنبہانی ج ۲ ص ۹۰) [2] و صدرہ فاسقینہا یا سواد بن عمرو والبیت فی قصیدۃ حماسیۃ لتابط شرا فی رثاء خالہ بعد ان اخذ بثارہ و مطلعہا ان بالشعب الذی دون سلع ۔ لقتیلاً دمہ ما یطل۔ و فی نسبتہ اختلاف کبیر نسبہ ابو تمام فی الحماسۃ لتأبط شراً (۲ : ۳۱۳ - ۳۱۹) المرزوقی۔ والتبریزی الی خلف الاحمر (۲ : ۶۰) و طبقات الشعراء لابن سلام ۹۷ و بعضہم الی ابن اخت تابط شرا ہم اختلف فی ابن اختہ فقیل الشنفری کما فی الاغانی (۵ : ۱۶۲) و امالی المرتضیٰ (۲ : ۱۸۵ و ذیلہ ۱ : ۱۱۰) واللسان (خلل) اقال فی السمط ۹۲۰ قولہ بعد خالی یرید اختیالی وقیل اراد بعد قتل خالی و فی امالی القالی (۲ : ۲۷۸) الخل الرجل النحیف الجسم وعدہ العلامۃ من الاضداد ۱۲

میں اشارہ پایا جاتا ہے۔ اسی معنی میں کہا گیا ہے:[1] (۱۸۱)

اَللّٰھُمَّ اَغْنِنِیْ بِالْاِفْتِقَارِ اِلَیْکَ۔ وَلَا تُفْقِرْنِیْ بِالْاِسْتِغْنَاءِ عَنْکَ۔ اے اللہ مجھے اپنی احتیاج کے ساتھ غنی کر اور اپنی ذات سے بے نیاز کر کے کسی دوسرے کا محتاج نہ بنا۔

بعض نے کہا ہے کہ خَلِیْلٌ خُلَّۃ سے ہے اور اللہ کے حق میں خُلَّۃٌ کے لفظ کے وہی معنی ہیں جو لفظ محبت کے ہیں۔ ابو القاسم البلخی کا کہنا ہے[2] کہ یہ خَلَّۃٌ (احتیاج) سے ہے اور خُلَّۃٌ (دوستی) سے نہیں ہے۔ جو لوگ اسے حبیب پر قیاس کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کسی بندے سے محبت کرنا تو جائز ہے اس لئے کہ محبت اس کی ثنا میں داخل ہے۔ لیکن خُلَّۃٌ (دوستی) جائز نہیں ہے کیونکہ خُلَّۃ کے معنی دوستی کے دل میں سرایت کر جانے کے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[3] ع ( )

(۱۴۱) قَدْ تَخَلَّلْتَ مَسْلَكَ الرُّوْحِ مِنِّیْ
وَبِهٖ سُمِّیَ الْخَلِیْلُ خَلِیْلًا

تم میرے لئے بمنزلہ روح کے ہو اور اسی سبب سے خلیل کو خلیل کہا جاتا ہے اسی بنا پر مشہور محاورہ ہے۔ تَمَازَجَ رُوْحَانَا۔ ہماری روحیں باہم مخلوط ہیں۔

اور محبت کے معنی حبۂ قلب میں دوستی رچ جانے کے ہیں۔ یہ حَبَبْتُہٗ سے مشتق ہے جس کے معنی حبۂ پر مارنے کے ہیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کے متعلق محبت کا لفظ استعمال ہو تو اس سے مراد احسان اور مہربانی کے ہوتے ہیں لہٰذا یہی معنی خُلَّۃ سے مراد ہوں گے۔ کیونکہ اگر ایک میں یہ تاویل صحیح ہے تو دوسرے میں بھی ہو سکتی ہے۔ مگر حُبٌّ سے حَبَّۃُ الْقَلْبِ مراد لینا اور خُلَّۃ سے اللہ تعالیٰ کے حق میں تخلل کا معنی لینا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ذات باری تعالیٰ ان باتوں سے بلند ہے[4]۔ اور آیت کریمہ:۔

لَا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خُلَّةٌ (۲-۲۵۴) جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہوگا اور نہ دوستی کام آسکے گی۔ کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کے دن نہ تو حسنات کی خرید و فروخت ہوگی اور نہ ہی یہ مودت کے ذریعہ حاصل ہو سکیں گی تو گویا یہ آیت:۔

وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے) کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

لَا بَیْعٌ فِیْهِ وَلَا خِلٰلٌ (۱۴-۳۱) جس میں نہ (اعمال کا) سودا ہوگا اور نہ دوستی کام آئیگی۔ میں بعض نے کہا ہے کہ خِلَال باب مفاعلہ سے مصدر ہے۔ اور بعض کے نزدیک یہ خلیل کی جمع ہے۔ کیونکہ اس کی جمع اَخِلَّۃٌ وَخِلَالٌ دونوں آتی ہیں اور یہ پہلی آیت کے ہم معنی ہے۔

(خ ل د)

اَلْخُلُوْدُ (ن) کے معنی کسی چیز کے فساد کے عارضہ سے پاک ہونے اور اپنی اصلی حالت پر قائم

---

[1] [illegible]
[2] راجع لاحالہ فی (ذ ور ۶)
[3] قالہ بشار بن برد۔ الاعمٰی والبیت فی ادب الدنیا والدین للماوردی ۲۹۰ والبحر (۳: ۳۴۸) ومحاضرات المؤلف (۲: ۱۳)
[4] قال البغدادی فی لباب التاویل (۱: ۵۰۲) وخلۃ اللہ للعبد ہی تمکینہ من طاعتہ وعصمتہ وتوفیقہ وستر خللہ ونصرہ والثناء علیہ ۱۲

رہنے کے ہیں۔ اور جب کسی چیز میں عرصہ دراز تک تغیر و فساد پیدا نہ ہو اہل عرب اسے خلود کے ساتھ متصف کر دیتے ہیں۔ مثلاً چولہے کے ان تین پتھروں کو جن پر دیگ چڑھائی جاتی ہے۔ "خَوَالِدُ" کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ دیر تک ایک جگہ پڑے رہتے ہیں نہ اس لئے کہ ان کو دوام بقا حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے:۔

خَلَدَ يَخْلُدُ خُلُوْدًا عرصہ دراز تک رہنا

قرآن میں ہے:۔

لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ (۲۶-۱۲۹) شاید تم ہمیشہ رہو گے۔ اور خَلَدٌ انسان کے اس حصہ کو کہا جاتا ہے جو تا زندگی ایک حالت پر قائم رہتا ہے اور دوسرے اعضاء کی طرح اس میں تغیر نہیں ہوتا۔

اصل میں مُخَلَّدٌ اسے کہتے ہیں جو عرصہ دراز تک باقی رہے اس بنا پر جس شخص میں باوجود بڑی عمر کے بڑھاپا نہ آئے اسے "مُخَلَّدٌ" کہا جاتا ہے۔ اور جس جانور کے (رباعی) دانت نکلنے تک ثنایا دانت قائم رہیں اسے مُخَلَّدَةٌ کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ ہمیشہ رہنے والی چیز کے متعلق خلود کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

جنت میں خلود کے معنی یہ ہیں کہ اس میں تمام چیزیں اپنی اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں گی اور ان میں تغیر پیدا نہیں ہوگا۔ قرآن میں ہے:۔

أُولٰئِكَ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۱۱-۲۳) یہی صاحب جنت ہیں ہمیشہ اسمیں رہیں گے۔

أُولٰئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۲-۸۱) تو ایسے لوگ دوزخ (میں جانے) والے ہیں۔ (اور) وہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا (۴-۹۳) اور جو شخص مسلمان کو قصداً مار ڈالے گا۔ تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا۔ اور آیت کریمہ:۔

يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (۵۶-۱۷) نوجوان خدمت گار جو ہمیشہ (ایک ہی حالت میں) رہیں گے ان کے آس پاس پھریں گے۔

کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ علیٰ حالہ قائم رہیں گے اور ان کی حالت تبدیل نہیں ہوگی اور بعض نے اس کے معنی مُقَرَّطُوْنَ بِالْخِلَدَةِ کئے ہیں یعنی بالیاں پہنے ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ خَلَدَةٌ ایک قسم کی بالی کو کہتے ہیں۔

اَلْإِخْلَادُ کے معنی کسی چیز کو باقی رکھنے یا اس پر بقا کا حکم لگانے کے ہیں اسی معنی میں فرمایا:۔

وَلٰكِنَّهٗٓ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ (۷-۷۶) یعنی زمین کی طرف مائل ہو گیا یہ خیال کرکے کہ وہ اس پر ہمیشہ رہیگا۔

(خ ل ص)

اَلْخَالِصُ (خالص) اور اَلصَّافِیْ دونوں مترادف ہیں مگر الصافی کبھی ایسی چیز کو بھی کہہ دیتے ہیں جس میں پہلے ہی سے آمیزش نہ ہو اور خالص اسے کہتے ہیں جس میں پہلے آمیزش ہو مگر اس سے صاف کرلیا گیا ہو۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔

خَلَّصْتُهٗ فَخَلَصَ۔ میں نے اسے صاف کیا تو وہ صاف ہو گیا اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے[1] ( )

(۱۴۲) خَلَاصَ الْخَمْرِ مِنْ نَسْجِ الْفِدَامِ

جیسے شراب صافی سے صاف ہو کر نکل آتی ہے

---

[1] قال المتنبی یصف حمی نالتہ بمصر فی ذی الحجۃ سنۃ ثمان واربعین وثلاث مائۃ فی قصیدہ ۱۴ بیتہ وصدرہ: وضاقت خطۃ فخلصت منہا راجع دلہ ا: ۲۷۷ ہندیہ بمصر ۱۹۲۳ء

قرآن میں ہے :-
وَقَالُوْا مَا فِیْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا (۶-۱۳۹) اور یہ بھی کہتے ہیں جو بچہ ان چارپایوں کے پیٹ میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لئے ہے۔
محاورہ میں هٰذَا خَالِصٌ وَخَالِصَةٌ (مذکر ومؤنث) دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جیسے دَاهِیَةٌ وَدَاهِیَةٌ اور آیت کریمہ :-
فَلَمَّا اسْتَیْئَسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِیًّا (۱۲-۸۰) جب وہ اس سے ناامید ہو گئے تو الگ ہو کر صلاح کرنے لگے۔
میں خَلَصُوْا کے معنی دوسروں سے الگ ہونا کے ہیں اور آیت کریمہ :-
وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ (۲-۱۳۹) اور ہم خالص اس کی عبادت کرنے والے ہیں۔
اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ (۱۲-۲۴) بے شک وہ ہمارے خالص بندوں میں سے تھے۔
میں مخلص بندہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ نہ تو یہود کی طرح تشبیہ کا عقیدہ رکھتے تھے اور نہ ہی عیسائیوں کی طرح تثلیث کے قائل تھے چنانچہ تثلیث کے متعلق فرمایا :-
لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ وہ لوگ (بھی) کافر ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے اور مسلمانوں کے متعلق فرمایا۔
مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ (۹۸-۵) کہ اخلاص کیسا تھ۔
وَاَخْلَصُوْا دِیْنَهُمْ لِلّٰهِ (۴-۱۴۶) اور خالص خدا کے فرمانبردار ہو گئے۔
نیز موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا :-
اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا۔ (۱۹-۵۱) بے شک وہ (ہمارے) برگزیدہ اور پیغمبر مرسل تھے۔
اور حقیقتاً اخلاص ماسوی اللہ سے بیزار ہونیکا نام ہے۔

(خ ل ط)

اَلْخَلْطُ (ن) کے معنی دو یا دو سے زیادہ چیزوں کے اجزا کو جمع کرنے اور ملا دینے کے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ چیزیں سیال ہوں یا جامد یا ایک مائع ہو اور دوسری جامد اور یہ مَزْجٌ سے اعم ہے کہا جاتا ہے اِخْتَلَطَ الشَّیْءُ (کسی چیز کا دوسری کے ساتھ مل جانا) قرآن میں ہے :-
فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ (۱۰-۲۴) پھر اس کے ساتھ سبزہ ...... مل کر نکلا۔
خَلِیْطٌ کے معنی دوست پڑوسی یا کاروبار میں شریک کے ہیں۔ اسی سے کتب فقہ میں خلیطان کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کا مال اکٹھا ہو۔ قرآن میں ہے :-
وَاِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَیَبْغِیْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۳۸-۲۴) اور اکثر شرکاء ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں۔
اور خَلِیْطٌ کا لفظ واحد اور جمع دونوں پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے[1] ع (البسیط)
(۱۴۳) بَانَ الْخَلِیْطُ وَلَمْ یَاْوُوْا لِمَنْ تَرَكُوْا
ساتھی جدا ہو گئے اور انہوں نے جن کو چھوڑا ان پر رحم نہ کھایا۔
قرآن میں ہے :- خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا (۹-۱۰۲) انہوں نے اچھے اور برے عملوں

---

[1] قالہ زہیر فی مطلع قصیدۃ فی ۳۳ بیتًا وتمامہ : وزودوک اختبیا مآ ایۃ سلکوا والبیت فی النقائض ۱۶۹ و دیوانہ والعقد الثمین ۸۶-۷۴

کو ملا جلا دیا تھا۔
یعنی نیک اور بد دونوں قسم کے عمل کرتے رہے

محاورہ ہے:۔
اَخْلَطَ فُلَانٌ فِیْ کَلَامِہٖ (فلاں نے بکواس کی)
اَخْلَطَ الْفَرَسُ فِیْ جَرْیِہٖ۔ گھوڑے کا دوڑنے میں کوتاہی کرنا۔

(خ ل ع)

اَلْخَلْعُ اس کے معنی اتار دینے کے ہیں اور یہ انسان کا اپنے کپڑے وغیرہ اور گھوڑے کا جھول اور پوزی وغیرہ اتارنے پر بولا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔
فَاخْلَعْ نَعْلَیْكَ (۲۰-۱۲) تو اپنی جوتیاں اتار دو۔
بعض نے کہا ہے کہ یہاں لفظی معنی مراد ہیں اور انہیں جوتا اتارنے کا حکم اس لئے دیا گیا تھا کہ وہ مردار گدھے کے چمڑے سے بنا ہوا تھا بعض صوفیہ نے کہا ہے کہ یہ دراصل تمثیل ہے کہ یہاں اطمینان سے اقامت پذیر ہو جاؤ جیسا کہ جب کسی کو یہ کہنا ہوتا ہے کہ یہاں جم کر بیٹھ جاؤ تو اس کے لئے اِنْزِعْ ثَوْبَكَ اور خُفَّكَ وغیرہ محاورات استعمال کئے جاتے ہیں کبھی اس کا صلہ علیٰ لاکر اس سے بخشش کے معنی بھی لئے جاتے ہیں۔ جیسے
خَلَعَ فُلَانٌ عَلٰی فُلَانٍ فلاں نے اسے خلعت دی
یاد رہے کہ علیٰ (صلہ) کی وجہ سے عطا کے معنی مفہوم ہوتے ہیں ورنہ اس کے بغیر یہ معنی صحیح نہیں ہوتے۔

(خ ل ف)

خَلْفٌ (پیچھے) یہ قدام کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے۔
یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ (۲-۲۵۵) جو کچھ ان کے روبرو ہو رہا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہو چکا ہے اسے سب معلوم ہے۔
لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ (۱۳-۱۱) اس کے آگے اور پیچھے خدا کے چوکیدار ہیں۔
فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً (۱۰-۹۲) تو آج ہم تیرے بدن کو دریا سے نکال لیں گے تاکہ تو پچھلوں کے لئے عبرت ہو۔
اور خَلَفَ کے معنی پیچھے رہ جانے اور کسی کا جانشین ہونے کے ہیں یہ تَقَدَّمَ اور سَلَفَ کی ضد ہے اور جو مرتبہ میں گرا ہوا ہو اسے بھی خَلْف کہا جاتا ہے اسی بنا پر ردی چیز کو خَلْفٌ کہتے ہیں اور خلف کے معنی متاخر اور جانشین کے بھی آتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ (۷-۱۶۹) پھر ان کے بعد ناخلف ان کے قائم مقام ہوئے۔
امثال عرب میں ہے[1] (مثل)
سَكَتَ اَلْفًا وَّنَطَقَ خَلْفًا کہ وہ ہزار باتوں سے خاموش رہا اور آخر بات کی تو بے ہودہ اور ردی۔
خُلْفَةٌ مسرین جب اس سے گوز نکل جائے کم عقل جو بے ہودہ بات کرے۔
تَخَلَّفَ فُلَانٌ عَنْ فُلَانٍ کسی سے پیچھے رہ جانا کسی کا جانشین ہونا۔ اس کا مصدر خِلَافَةٌ ہے جس کے معنی جانشینی کے ہیں مگر خَلَافَةٌ (بفتح الخاء) کے معنی کم عقل ہونے کے ہیں اور کم عقل آدمی کو خَالِفٌ کہا جاتا ہے۔
اور کبھی خَلْفٌ[2] سے ناخلف بھی مراد ہوتا ہے۔

---

[1] المثل فی المیدانی رقم ۱۷۷۲ فالاشتقاق ۱۳۷ وفی جل المعاجم ۱۲

جیسے فرمایا :-

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ پھر ان کے بعد چند ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو چھوڑ دیا گویا سے) کھو دیا۔ (۱۹-۵۹)

اور جو کسی کا جانشین اور قائم مقام ہو اسے خَلَفٌ (بفتح اللام) کہا جاتا ہے۔ خِلْفَةٌ ایک کا دوسرے کے بعد آنا قائم مقام ہونا قرآن میں ہے :-

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً (۲۵-۶۲)

اور وہی تو ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے والا بنایا۔

کہا جاتا ہے :-

اَمْرُهُمْ خِلْفَةٌ یعنی ایک کے بعد دوسرا آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۱۴۴) بِهَا الْعِیْنُ وَالْاٰرَامُ یَمْشِیْنَ خِلْفَةً

اس میں گاداں وحشی اور ہرنیاں ایک دوسرے کے پیچھے چلتی ہیں۔

اَصَابَتْهُ خِلْفَةٌ : پیچش لگ جانا۔

خَلَفَ فُلَانٌ فُلَانًا۔ وہ اس کا جانشین ہوا خواہ اس کی موجودگی میں ہو یا بعد میں۔ قرآن میں ہے :-

وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً فِی الْاَرْضِ یَخْلُفُوْنَ (۴۳-۶۰) اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتے بنا دیتے جو تمہاری جگہ زمین میں رہتے۔

اَلْخِلَافَةُ کے معنی دوسرے کا نائب بننے کے ہیں۔ خواہ وہ نیابت اس کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو یا موت کے سبب ہو اور یا اس کے عجز کے سبب سے ہو اور یا محض نائب کو شرف بخشنے کی غرض سے ہو اس آخری معنی کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو زمین میں خلافت بخشی ہے چنانچہ فرمایا :-

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ (۶-۱۶۵)

اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ (۳۵-۳۹) وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا۔

وَیَسْتَخْلِفُ رَبِّیْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ (۱۱-۵۷)

اور میرا پروردگار تمہاری جگہ اور لوگوں کو لا بسائیگا۔

اَلْخَلَائِفُ کا واحد خَلِیْفَةٌ ہے اور خُلَفَاءُ کا خَلِیْفٌ قرآن میں ہے :-

یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ (۳۸-۲۶)

اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ (۱۰-۷۳) اور انہیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔

اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ (۷-۶۹)

جب اس نے تم کو قوم نوح کے بعد سردار بنایا۔

اَلْاِخْتِلَافُ وَالْمُخَالَفَةُ کے معنی کسی حالت یا قول میں ایک دوسرے کے خلاف طریق کار اختیار کرنے کے ہیں۔ اور خِلَافٌ کا لفظ ان دونوں سے اعم ہے کیونکہ ضدین کا مختلف ہونا تو

---

[1] قالہ زہیر فی معلقتہ وتمامہ - واطلاؤہا ینہضن من کل مجثم والبیت فی دیوانہ ۵ وشرح القصائد العشر للتبریزی ۱۰۱ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۵۱) وتفسیر الطبری (۲: ۱۹/۶۳: ۳۲) واللسان (خلف طلی) والاقتضاب ۱۶۱ ومحاضرات المؤلف (۴: ۴۴۳) والجمہرۃ ۵۰ وغریب القرآن ۳۱۴ والمعانی الکبیر ۶۹۹ والقرطبی (۳: ۶۵) ومجاز القرآن (۲: ۸۰) والعقد الثمین ۹۴ وایام العرب ۱۷۰ وشرح المعلقات لابن الانباری ۲۳۹۰۷۱ والسیوطی ۲۵۵

ضروری ہوتا ہے مگر مختلفین کا ضدین ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ پھر لوگوں کا باہم کسی بات میں اختلاف کرنا عموماً نزاع کا سبب بنتا ہے۔ اس لئے استعارۃً اختلاف کا لفظ نزاع اور جدال کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ (۴۳-۶۵) پھر کتنے فرقے ..... پھٹ گئے۔

وَلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ (۱۱-۱۱۸) لیکن وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔

وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ (۳۰-۲۲) اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا۔

عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ o عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ (۷۸-۳) (یہ لوگ) کس چیز کی نسبت پوچھتے ہیں؟ (کیا) بڑی خبر کی نسبت؟ جس میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔

اِنَّکُمْ لَفِیْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ (۵۱-۸) (اے اہل مکہ) تم ایک متناقض بات میں (پڑے ہوئے) ہو۔

مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ (۱۶-۶۹) جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ (۳-۱۰۵) اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو متفرق ہو گئے اور احکام بیّن کے آنے کے بعد ایک دوسرے سے (خلاف) اختلاف کرنے لگے۔

فَهَدَی اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ (۲-۲۱۳) تو جس امر حق میں وہ اختلاف کرتے تھے خدا نے اپنی مہربانی سے مومنوں کو اس کی راہ دکھا دی۔

وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (۱۰-۱۹) اور (سب) لوگ (پہلے) ایک ہی امت (یعنی ایک ہی دین پر) تھے۔ پھر جدا جدا ہو گئے۔

وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ فَمَا اخْتَلَفُوْا حَتّٰی جَآءَهُمُ الْعِلْمُ اِنَّ رَبَّکَ یَقْضِیْ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا کَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ (۱۰-۹۳) اور ہم نے بنی اسرائیل کو رہنے کی بڑی عمدہ جگہ دی اور کھانے کو پاکیزہ چیزیں عطا کیں۔ لیکن وہ باوجود علم حاصل ہونے کے اختلاف کرتے رہے۔ بے شک جن باتوں میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں تمہارا پروردگار قیامت کے دن ان میں ان باتوں کا فیصلہ کر دے گا۔

اور قیامت کے دن کے متعلق فرمایا:۔

وَلَیُبَیِّنَنَّ لَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ مَا کُنْتُمْ فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ (۱۶-۹۲) اور جن باتوں میں تم اختلاف کرتے ہو قیامت کو اس کی حقیقت تم پر ظاہر کر دے گا۔

لِیُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِیْ یَخْتَلِفُوْنَ فِیْهِ (۱۶-۳۹) تاکہ جن باتوں میں یہ اختلاف کرتے ہیں وہ ان پر ظاہر کر دے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِی الْکِتٰبِ (۲-۱۷۶)۔ اور جن لوگوں نے اس کتاب میں اختلاف کیا۔

میں بعض نے اِخْتَلَفُوْا بمعنی خَلَفُوْا کیا ہے۔ جیسے کَسَبَ وَاکْتَسَبَ اور بعض نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے خلاف اس میں ردوبدل کر دیا۔ اور آیت کریمہ:۔

لَاخْتَلَفْتُمْ فِی الْمِیْعٰدِ (۸-۴۲) تو وقت معین (پر جمع ہونے) میں تقدیم و تاخیر ہو جاتی۔

میں اِخْتَلَفْتُمْ کا لفظ خلاف سے بھی ہوسکتا ہے اور خُلْفٌ سے بھی۔ نیز فرمایا:۔
وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللّٰهِ (۴۲-۱۰) اور تم جس بات میں اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ خدا کی طرف (ہوگا)
فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ۔ (۳-۵۵) تو جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے ... ان کا فیصلہ کردوں گا۔ اور آیت کریمہ:۔
إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ (۱۰-۶) رات اور دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں۔
میں (اختلاف سے انکا یکے بعد دیگرے آنا مراد ہے۔
اَلْخُلْفُ ۔ کے معنی وعدہ شکنی کے ہیں محاورہ ہے:۔
وَعَدَنِيْ فَأَخْلَفَنِيْ ۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا مگر اسے پورا نہ کیا۔ قرآن میں ہے۔
بِمَا أَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ (۹-۷۷) کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا اسکے خلاف کیا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (۳-۹) بیشک خدا خلاف وعدہ نہیں کرتا۔
فَأَخْلَفْتُمْ مَوْعِدِيْ قَالُوْا مَا أَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا (۲۰-۸۶، ۸۷) تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا (اس کے) خلاف کیا۔ وہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے اختیار سے تم سے وعدہ خلافی نہیں کی۔
أَخْلَفْتُ فُلَانًا میں نے فلاں کو وعدہ خلاف پایا۔
اَلْاِخْلَافُ ۔ ایک دوسرے کے بعد پانی پلانا۔
أَخْلَفَ الشَّجَرُ پت جھڑ کے بعد درخت کا دوبارہ سرسبز ہونا۔
أَخْلَفَ اللّٰهُ عَلَيْكَ اللہ تعالیٰ تجھے ضائع شدہ چیز کا نعم البدل عطا فرمائے۔
خَلَفَ اللّٰهُ عَلَيْكَ ۔ اللہ کی جانب سے تیرا خلیفہ ہو۔ اور آیت کریمہ:۔
لَا يَلْبَثُوْنَ خَلْفَكَ (۱۷-۷۶) تمہارے پیچھے یہ بھی نہ رہتے۔
میں خلف کے معنی بعد کے ہیں ایک قراءت میں خِلَافَكَ ہے یعنی تیری مخالفت کرکے۔
اور آیت کریمہ:۔
أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيْهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ۔ (۵-۳۳) یا ان کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں۔ یعنی ایک سیدھی جانب سے اور دوسرا الٹی جانب سے۔ خَالَفْتُهُ ۔ میں نے اسے پیچھے چھوڑا۔ قرآن میں ہے:۔
فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُوْلِ اللّٰهِ۔ (۹-۵۱) جو لوگ (غزوہ تبوک میں) پیچھے رہ گئے وہ پیغمبر خدا کی (مرضی) کے خلاف بیٹھ رہنے سے خوش ہوئے ... نبی پیغمبر خدا کے مخالف ہوکر۔
وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا (۹-۱۱۸) اور ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا۔
قُلْ لِلْمُخَلَّفِيْنَ (۴۸-۱۶) ... جو ... پیچھے رہ گئے تھے ان سے کہدو۔
اَلْخَالِفُ ۔ نقصان یا کوتاہی کی وجہ سے پیچھے رہنے والا اور یہی معنی مُتَخَلِّفٌ کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخَالِفِيْنَ (۹-۸۳) پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔
اَلْخَالِفَةُ ۔ خیمے کا پچھلا ستون بطور کنایہ اس سے مراد عورت لی جاتی ہے کیونکہ یہ مجاہدین سے پیچھے رہ جاتی ہیں۔ اس کی جمع خَوَالِفُ ہے

قرآن میں ہے :۔

رَضُوْا بِاَنْ یَّکُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ (۹ - ۸۷) یہ اس بات سے خوش ہیں کہ عورتوں کے ساتھ جو پیچھے رہ جاتی ہیں (گھروں میں) بیٹھ رہیں۔

وَجَدْتُ الْحَیَّ خُلُوْفًا یعنی مرد گئے ہوئے ہیں صرف عورتیں موجود ہیں[1]۔

اَلْخَلْفُ (اَیْضًا)۔ کلہاڑی کی دھار۔ پہلو کی سب سے چھوٹی پسلی جو پیٹ کے جانب سب سے آخری ہوتی ہے۔ اَلْخِلَافُ۔ بید کی قسم کا ایک درخت کیونکہ وہ امید کے خلاف اگتا ہے۔ یا اس کا باطن ظاہر کے خلاف ہوتا ہے:۔

مُخْلِفُ عَامٍ اَوْ عَامَیْنِ۔ شتر کہ از نہ سالگی یک یا دو سال درگذشتہ باشد۔ اَلْخِلِّیْفٰی۔ خلافت۔ حضرت عمرؓ کا قول ہے[2] (۸ ا ا)

لَوْلَا الْخِلِّیْفٰی لَاَذَّنْتُ۔ اگر بار خلافت نہ ہوتا تو میں خود ہی اذان دیا کرتا (اذان کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے)

(خ ل ق)

اَلْخَلْقُ۔ اصل میں خلق کے معنی (کسی چیز کو بنانے کے لئے) پوری طرح اندازہ لگانا کے ہیں۔ اور کبھی خلق بمعنی ابداع بھی آجاتا ہے یعنی کسی چیز کو بغیر مادہ کے اور بغیر کسی کی تقلید کے پیدا کرنا چنانچہ آیت کریمہ:۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۱۶ - ۳) اسی نے آسمانوں اور زمین کو مبنی برحکمت پیدا کیا۔ میں خلق بمعنی ابداع ہی ہے کیونکہ دوسرے مقام پر اسی کو بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲ - ۱۱۷) سے تعبیر کیا ہے۔ نیز ایک چیز کو دوسری شے سے بنانے اور ایجاد کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا :۔

خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ۔ (۴ - ۱) تم کو ایک شخص سے پیدا کیا۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ (۱۶ - ۴) اسی نے انسان کو نطفے سے بنایا۔

خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ (۲۳ - ۱۲) ہم نے انسان کو خلاصے سے پیدا کیا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰکُمْ (۷ - ۱۱) اور ہمیں نے تم کو (ابتداء میں مٹی سے) پیدا کیا۔

خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ۔ (۵۵ - ۱۵) اور جنات کو ۔ ۔ ۔ ۔ شعلے سے پیدا کیا۔

خیال رہے کہ خلق بمعنی ابداع ذات باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ ذات باری تعالیٰ اور دوسروں کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

اَفَمَنْ یَّخْلُقُ کَمَنْ لَّا یَخْلُقُ اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ۔ (۱۶ - ۱۷) تو جو (اتنی مخلوقات) پیدا کرے کیا وہ ویسا ہے جو کچھ بھی پیدا نہ کر سکے۔ تو پھر تم غور کیوں نہیں کرتے۔

البتہ خلق جو بصورت استحالہ کے ہوتا ہے بعض اوقات ذات باری تعالیٰ دوسروں کو بھی اس کا

---

[1] ومنہ حدیث المرۃ والمزادتین: والحی خلوف ای رجالنا غُیَّبٌ (النہایہ خلف)، [2] دفی الفائق (۱: ۱۸۲) ولفظہ لو اطیق الاذان مع الخلیفٰی لاذنت وہو مصدر ومعناہ کثرۃ جہدہ فی ضبط امور الخلافۃ وتصریف اعنتہا کذا فی النہایہ (خلف) ولفظہ لو اطقت قال وہو مصدر مثل الرمّیّا والدلیلا وفی غریب ابی عبید (۳: ۳۱۹) اسم علی وزن ہِجّیرا ومعناہ الخلافۃ و امثالہ معدودۃ ۱۲

اختیار دے دیتی ہے۔ جیسے عیسیٰ علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمائیں گے:۔

إِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ (۵-۱۱۰)

اور جب تم میرے حکم سے مٹی کا جانور بنا کر۔

اور عام لوگوں کے لئے خَلَق کا لفظ صرف دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (۱) اندازہ کرنا جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] ع (الکامل)

(۵۳۱) وَلَأَنْتَ تَفْرِي مَا خَلَقْتَ
وَبَعْضُ الْقَوْمِ يَخْلُقُ ثُمَّ لَا يَفْرِي

تم جو سوچتے ہو کر گزرتے ہو۔ اور بعض لوگ تجاویز کرتے رہتے ہیں مگر انہیں عملی جامہ نہیں پہنا سکتے۔ (۲) جھوٹ بولنے کے معنی میں فرمایا:۔

وَتَخْلُقُونَ إِفْكًا (۲۹-۱۷) اور طوفان باندھتے ہو۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ آیت کریمہ:۔

فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔ (۲۳-۱۴)

تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔ بڑا بابرکت ہے۔

سے معلوم ہوتا ہے کہ خلق کے ساتھ خدا تعالےٰ کے سوا دوسرے بھی متصف ہو سکتے ہیں، تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہاں أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ بمعنی أَحْسَنُ الْمُقَدِّرِينَ ہے یعنی اللہ تعالیٰ سب سے بہتر اندازہ کرنے والا ہے (اور خلق بمعنی تقدیر دوسروں کی صفت بھی آجاتا ہے)

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالےٰ پر أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ کا اطلاق کفار کے اعتقاد کے اعتبار سے ہے۔ ان کا زعم یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے بھی پیدا کرتے ہیں تو پھر بھی ذات باری تعالیٰ ان کے اعتقاد کے بموجب ان سب سے بہتر پیدا کرنے والی ٹھہری جیسے فرمایا:۔

خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ (۱۳-۱۶) کیا انہوں نے خدا کی سی مخلوقات پیدا کی ہے جس کے سبب ان پر مخلوقات مشتبہ ہو گئی ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ (۴-۱۱۹) اور (یہ بھی) کہتا رہوں گا کہ وہ خدا کی بنائی ہوئی صورتوں کو بدلتے رہیں۔

میں بعض نے کہا ہے کہ خَلْقَ اللَّهِ کی تغییر سے مراد خصا (یعنی خصی ہونا) اور نتف اللحیة (ڈاڑھی کے بال اکھاڑنا) وغیرہ کے ذریعہ (فطرتی صلاحیتوں اور) صورتوں کو تبدیل کرنا مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ احکام الٰہی میں تحریف و تبدیل کرنا مراد ہے[2] (اس صورت میں خلق اللہ سے مراد دین الٰہی ہوگا) اور آیت کریمہ:۔

لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ (۳۰-۳۰) خدا کی بنائی ہوئی (فطرت) میں تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

---

[1] البیت لزہیر بن ابی سلمیٰ من قصیدۃ یمدح ہرمانی ۲۱ بیتا راجع دیوانہ ۹۴ والحفد التبیین ۸۲ والمعانی للقتیبی ۱/۳۲۱، ۵۳۹ والاضداد لابن السکیت ۲۰۵ والاصمعی ۵۵ وابن الانباری ۱۵۹ وابی الطیب ۲۱۱ وشرح شواہد الشافیہ ۲۳۹ والکتاب (۲: ۲۸۹) و مقاییس اللغۃ (۲: ۲۱۴) والحیوان (۳: ۳۸۳) واللسان (خلق فری) والطبری (۱۸: ۹) والبحر المحیط (۱: ۲/۹۳، ۴۶۵ / ۶: ۳۹۸) والمشکل للقتیبی ۳۸۸ والصناعتین (۳۸۶، ۴۴۴) وفیہ ما ورد بک بدل ولانت وفی مختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۹۰) فلا بدل ولا والبیت ایضًا فی ثلاثین لابن خالویہ ۴۵ ۔ [2] ولکلا القولین محمل وکل منہما منقول عن السلف راجع ابن کثیر ۱: ۵۵۶ ومعالم التنزیل للبغوی ۱/ ۴۹۹ ۔

میں بعض نے "خَلْقُ اللہِ" سے قضاء و قدر الٰہی مراد لی ہے اور بعض نے تغییر خلقت یعنی شکل وصورت کا بدلنا مراد لیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَتَذَرُوْنَ مَاخَلَقَ لَکُمْ رَبُّکُمْ (۲۶-۱۶۶)
اور تمہارے پروردگار نے جو تمہارے لیے (بیبیاں) پیدا کی ہیں ان کو چھوڑ دیتے ہو۔
میں "مَاخَلَقَ" سے کنایۃً عورتوں کی شرمگاہیں مراد ہیں۔

اور وہ ہر مقام جہاں خلق کا لفظ کلام کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ اس سے جھوٹ ہی مراد ہے۔ اس بنا پر اکثر لوگ قرآن کے تعلق خلق کا لفظ استعمال نہیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا:۔
اِنْ ھٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِیْنَ۔ (۲۶-۱۳۷)
یہ تو اگلوں کے ہی طریق ہیں اور ایک قراءت میں
اِنْ ھٰذَآ اِلَّا خَلْقُ الْاَوَّلِیْنَ (۲۶-۱۳۷)
بھی ہے یعنی یہ تو پہلے لوگوں کی ایجاد واختراع ہے۔
مَاسَمِعْنَا بِھٰذَا فِی الْمِلَّۃِ الْاٰخِرَۃِ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ۔ (۳۸-۷) یہ پچھلے مذہب میں ہم نے کبھی سنی ہی نہیں۔ یہ بالکل بنائی ہوئی بات ہے۔

خَلْقٌ۔ کا لفظ مخلوق کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ خَلْقٌ اور خُلُقٌ اصل میں دونوں ایک ہی ہیں جیسے شَرْبٌ وَشُرْبٌ وصَرْمٌ وَصُرْمٌ مگر ان میں اتنا فرق ہے کہ خَلْق بمعنی خلقت یعنی اس شکل وصورت پر بولا جاتا ہے جس کا تعلق ادراک بصر سے ہوتا ہے اور خُلُق کا لفظ قویٰ باطنہ اور عادات وخصائل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جن کا تعلق بصیرت سے ہے[1] قرآن میں ہے:۔
وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (۶۸-۴) اور اخلاق تمہارے بہت (عالی) ہیں۔

اَلْخَلَاقُ۔ وہ فضیلت جو انسان اپنے اخلاق سے حاصل کرتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَمَالَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ مِنْ خَلَاقٍ (۲-۲۰۰)
ایسے لوگوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔
فُلَانٌ خَلِیْقٌ بِکَذَا۔ فلاں اس کا اہل ہے گویا وہ خوبی اس میں پیدا کی گئی ہے جیسا کہ فُلَانٌ مَجْبُوْلٌ عَلٰی کَذَا اَوْمَدْعُوٌّ اِلَیْہِ مِنْ جِھَۃِ الْخُلُقِ کا محاورہ ہے۔
خَلَقَ الثَّوْبُ وَاَخْلَقَ کپڑے کا پرانا ہو جانا اور پرانے کپڑے کو خَلَقٌ وَمُخْلَقٌ وَاَخْلَاقٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ حَبْلٌ اَرْمَامٌ وَاَرْمَاثٌ کا محاورہ ہے اور کپڑے کے پرانا ہونے سے ملائم اور چکنا ہونے کا معنی لیا جاتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے:۔
جَبَلٌ اَخْلَقُ وَصَخْرَۃٌ خَلْقَآءُ (چکنا پہاڑ یا چکنا پتھر)
خَلَّقْتُ الثَّوْبَ۔ میں نے کپڑے کو پرانا کیا
اِخْلَوْلَقَ السَّحَابُ اَنْ تُمْطِرَ امید ہے کہ بارش ہوگی۔
یہ یا تو خَلَّقْتُ الثَّوْبَ سے ماخوذ ہے اور یا ھُوَخَلِیْقٌ بِکَذَا کے محاورہ سے لیا گیا ہے۔
اَلْخَلُوْقُ۔ ایک قسم کا خوشبو۔

---

[1] و العلماء دونوا الاخلاق علی حدۃ وصنفوا فیہا الکتب ومنہا تہذیب الاخلاق لیحیٰ ابن عدی وکتب الامام الغزالی انفع للشریعۃ فی ہذا الباب۔

(خ ل و)

اَلْخَلَاءُ۔ خالی جگہ جہاں عمارت و مکان وغیرہ نہ ہو اور اَلْخُلُوُّ کا لفظ زمان و مکان دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ زمانہ میں مُضِیٌّ (گذرنا) کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لئے اہل لغت خَلَا الزَّمَانُ کے معنی زمانہ گذر گیا کر لیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (۳-۱۴۴) اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو صرف (خدا کے) پیغمبر ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر ہو گزرے ہیں۔

وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلَاتُ (۱۳-۶) حالانکہ ان سے پہلے عذاب (واقع) ہو چکے ہیں۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ (۲-۱۳۴) یہ جماعت گذر چکی۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ (۳-۱۳۷) تم لوگوں سے پہلے بھی بہت سے واقعات گذر چکے ہیں۔

اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ (۳۵-۲۴) مگر اس میں ہدایت کرنے والا گذر چکا ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ (۲-۲۱۴) ..... تم کو پہلے لوگوں کی سی۔

وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ (۳-۱۱۹) اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ (۱۲-۹) پھر اباکی توجہ تمہاری طرف ہو جائے گی۔ کے معنی یہ ہیں کہ پھر تمہارے ابا کی محبت اور توجہ صرف تمہارے ہی لئے رہ جائے گی۔

خَلَا الْاِنْسَانُ۔ تنہا ہونا۔ خَلَا فُلَانٌ بِفُلَانٍ کسی کے ساتھ تنہا ہونا۔

خَلَا اِلَيْهِ کسی کے پاس خلوت میں پہنچنا۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ (۲-۱۴) اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں۔

خَلَّيْتُ فُلَانًا کے اصل معنی کسی کو خالی جگہ میں چھوڑ دینے کے ہیں۔ پھر عام چھوڑ دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ فرمایا:۔

فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ (۹-۵) تو ان کی راہ چھوڑ دو۔

نَاقَةٌ خَلِيَّةٌ۔ اونٹنی کو دودھ دوہنے سے آزاد چھوڑ دینا۔ اِمْرَاَةٌ خَلِيَّةٌ مطلقہ عورت جو خاوند کی طرف سے آزاد چھوڑ دی گئی ہو اور جو کشتی ملاحوں کے بغیر چل رہی ہو اسے بھی خَلِيَّةٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْخَلِيُّ جو غم سے خالی ہو۔ جیسا کہ مُطَلَّقَةٌ کا لفظ سکون و اطمینان کے معنی میں آجاتا ہے۔ چنانچہ شاعر نے[1] (طویل)

(۱۴۶) تَطَلَّقَهُ طَوْرًا وَطَوْرًا تُرَاجِعُ

میں کبھی اسے سکون ہو جاتا ہے اور کبھی وہ عود کر آتی ہے ایں۔ تطلقہ کا لفظ اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

اَلْخَلَاءُ خشک گھاس کہا جاتا ہے:۔

خَلَيْتُ الْخَلَاءَ۔ میں نے خشک گھاس کاٹی۔

---

[1] قال النابغۃ الذبیانی وصدرہ: تناذرہا الراقون من سوء سمہا۔ وفی المطبوع مطلقہ محرف والبیت فی اللسان (طلق) [illegible] والکامل ۲ ۸۵ و مختار الشعر الجاہلی (۱: ۸۲) والبحر (۵: ۲۲۴) والعمدۃ (۱: ۲۳۸) والمخصص (۹: ۴۵) و دیوانہ ۵۲ والحیوان (۴: ۲۴۸) والعقد الثمین ۱۹

خَلَيْتُ الدَّابَّةَ۔ جانور کو خشک گھاس ڈالی۔
سَیْفٌ مُخْتَلٍ۔ تیز تلوار جو گھاس کی طرح ہر چیز کو کاٹ ڈالے۔

(خ م د)

خَمَدَتِ (ن) النَّارُ۔ آگ کے شعلوں کا ساکن ہو جانا (جب کہ اس کا انگارہ نہ بجھا ہو) اور اسی سے بطور استعارہ خَمَدَتِ الْحُمّٰی کا محاورہ ہے جس کے معنی بخار کا جوش کم ہو جانے کے ہیں۔ اور کبھی بطور کنایہ خُمُوْدٌ بمعنی موت بھی آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
جَعَلْنٰهُمْ حَصِیْدًا خٰمِدِیْنَ (۲۱-۱۵) ہم نے ان کو (کھیتی کی طرح) کاٹ کر (آگ کی طرح) بجھا کر ڈھیر کر دیا۔
فَاِذَا هُمْ خٰمِدُوْنَ (۳۶-۲۹) سو وہ اسی سے ناگہاں بجھ کر رہ گئے۔

(خ م ر)

اَلْخَمْرُ (ن) اصل میں خَمْرٌ کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں اسی طرح خِمَارٌ اصل میں ہر اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے کوئی چیز چھپائی جائے مگر عرف میں خِمَارٌ کا لفظ صرف عورت کی اوڑھنی پر بولا جاتا ہے جس کے ساتھ وہ اپنے سر کو چھپاتی ہے۔ اس کی جمع خُمُرٌ آتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ (۲۴-۳۱) اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں۔

کہا جاتا ہے:۔
اِخْتَمَرَتِ الْمَرْءَةُ وَتَخَمَّرَتْ عورت نے سر پر اوڑھنی ڈال لی۔
خَمَّرْتُ الْاِنَاءَ۔ میں نے برتن ڈھانپ دیا ایک روایت میں ہے[۱] (۱۲۱)
خَمِّرُوْا اٰنِیَتَکُمْ۔ کھانے کے برتن ڈھانپ کر رکھا کرو)
اَخْمَرْتُ الْعَجِیْنَ۔ گوندھے ہوئے آٹے میں خمیر ملانا اور خَمِیْرَۃٌ کو خمیر اسی لئے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ پہلے مَخْمُوْرٌ ہوتا ہے
دَخَلَ فِیْ خُمَارِ النَّاسِ۔ لوگوں کے ہجوم میں داخل ہو کر چھپ گیا۔
اَلْخَمْرُ۔ شراب۔ نشہ۔ کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے بعض لوگوں کے نزدیک ہر نشہ آور چیز پر خمر کا لفظ بولا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک صرف اسی چیز کو خمر کہا جاتا ہے۔ جو انگور یا کھجور سے بنائی گئی ہو۔ کیونکہ ایک روایت میں ہے[۲] (۱۲۲)
اَلْخَمْرُ مِنْهَا تَیْنِ الشَّجَرَتَیْنِ النَّخْلَةِ وَالْعِنَبَةِ (کہ خمر (شراب حرام) صرف وہی ہے جو ان دو درختوں یعنی انگور یا کھجور سے بنائی گئی ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ "خمر" صرف غیر مطبوخ یعنی اسی کو کہتے ہیں جو پکائی نہ گئی ہو۔ پھر اس بارے میں فقہاء مختلف ہیں کہ کس حد تک پکانے کے بعد اس پر خمر کا اطلاق نہیں ہوتا۔
اَلْخُمَارُ۔ بیماری جو شراب نوشی سے لگ جاتی ہے یہ بھی زُکَامٌ اور سُعَالٌ کی طرح

---

[۱] وتمامہ واوتوا السقیتکم واجیفوا ابوابکم واطفئوا مصابیحکم واکفتوا ابناءکم الخ الحدیث فی الفائق (۱: ۱۸۴)
[۲] رواہ الدارمی (۲-۳۸) من حدیث ابی ہریرۃ والحدیث فی مسلم والاربعۃ واحمد فی مسندہ)

فُعَالٌ کے وزن پر ہے جو کہ بیماری کے معنیٰ کے لئے مخصوص ہے۔

خَمْرَةُ الطِّیْبِ خوشبو خَامَرَہٗ وَخَمَرَہٗ کسی سے گھل مل جانا اس سے الگ نہ ہونا۔ اسی سے بطور استعارہ شاعر نے کہا ہے[1]۔ (طویل)

(۱۴۷) "خَامِرِیْ اُمَّ عَامِرٍ"

کہ اے ام عامر چھپ جا۔

(خ م س)

اَلْخَمْسُ۔ (پانچ) اصل میں یہ لفظ اسم عدد ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَیَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ کَلْبُهُمْ (۱۸-۲۲)

اَلْخَمْسِیْنَ (پچاس) قرآن میں ہے:۔

فَلَبِثَ فِیْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِیْنَ عَامًا (۲۹-۱۴) تو وہ ان میں پچاس برس کم ہزار برس رہے۔

اَلْخَمِیْسُ۔ جامہ پانچ گزی۔ روز پنجشنبہ۔

رُمْحٌ مَخْمُوْسٌ نیزہ پانچ گزی۔ اَلْخِمْسُ پیاسے اونٹ جو چوتھے روز پانی پر وارد ہوں۔

خَمَسْتُ الْقَوْمَ (ن) پانچواں حصہ لینا۔

خَمَسْتُهُمْ (ض) پانچواں ہونا۔

(خ م ص)

اَلْمَخْمَصَةُ۔ ایسی بھوک جس سے پیٹ پچک جائے۔ قرآن میں ہے:۔

فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ (۵-۳) ہاں جو شخص بھوک میں ناچار ہو جائے۔ کہا جاتا ہے۔

رَجُلٌ خَامِصٌ پچکے ہوئے پیٹ والا اَخْمَصُ الْقَدَمِ پاؤں کے تلوے کا گڑھا۔

(خ م ط)

اَلْخَمْطُ۔ درخت بے خار۔ بعض نے کہا کہ خَمْطٌ۔ پیلو کے درخت کو کہتے ہیں۔

اَلْخَمْطَةُ۔ ترش شراب تَخَمَّطَ غضبناک ہونا۔ کہا جاتا ہے۔ تَخَمَّطَ الْفَحْلُ۔ سانڈ کا مستی سے بربرانا۔

(خ ن ز ر)

اَلْخِنْزِیْرُ کے معنی سور کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِیْرَ (۵-۶۰)

اور (جن کو) ان میں سے بندر اور سور بنا دیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ خاص کر سور ہی مراد ہیں اور بعض کے نزدیک اس سے وہ لوگ مراد ہیں

---

[1] قطعة من البیت وتکملته: فلا تدفنونی ان دفنی محرم۔ علیکم ولکن ۔ ۔ ۔ ۔ قال المرتضی (۲: ۳۷) البیت لتأبط شرا ویروی للشنفری (صاحب لامیة العرب التی شرحها الزمخشری باعجب العجاب) وللاستاذ المیمنی حقق بذا فی الطرائف (۱/ ۳۶) راجع البیت و قصته الاغانی (۲۱: ۱۳۶) وطبقات الشعراء لابن سلام (۱: ۴۷) والحیوان (۶: ۵۰) والمعانی الکبیر ۲۱۲ وامالی ابن الشجری (۱: ۳۶) والحماسة بالتبریزی (۲: ۴۲) وذیل الامالی ۳۶ والصناعتین ۳۸۸ والصاحبی ۲۲۴ والبحر (۳: ۳۷۷) ومجمع البیان (۱: ۴۷) والمحاضرات للمؤلف (۳: ۳۹۸) وابن ابی الحدید (۱: ۷۵) واللسان (عمر) وفی روایة الشنفری بدل خامری۔ قال صاحب العقد (۱: ۱۱۸ - ۱۱۹/ ۴: ۲۱۹) ان روایة خامری بعید عن المعنی۔ راجع الازمنة والامکنة ومعنی البیت لاتدفنونی بل دعونی للتی یقال لها اذا صیدت خامری ام عامر ای للضبع قاله الخلیل ونقل عنه سیبویه فی الکتاب والخفاجی فی شرح الدرة (ص ۱۵۰) وصدرا لاماضی فعلی ہذا لیس فی البیت التفات کما ذہب الیہ البعض والقطعة ایضا فی بیت الاخطل اللسان (وخط) والمرزوقی والقطعة مثل راجع الجرجانی ۹۰ والعسکری والمیدانی ۱۲

جن کے افعال وعادات بندر اور سور جیسے ہو گئے تھے۔ نہ کہ وہ بلحاظ صورت کے بندر اور سور بن گئے تھے۔[1] مگر زیر بحث آیت میں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں کیونکہ مروی ہے کہ ایک قوم کی صورتیں مسخ ہو گئی تھیں اور وہ بندر اور سور بن گئے تھے۔ اسی طرح انسانوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو شکل وصورت کے لحاظ سے گو انسان نظر آتے ہیں۔ لیکن اخلاق وعادات کے اعتبار سے بندر اور سور بنے ہوئے ہیں۔

(خ ن س)

اَلْخُنُسُ (ن) کے معنی پیچھے ہٹنے اور سکڑ جانے کے ہیں اسی سے شیطان کو خنّاس کہا جاتا ہے کیونکہ وہ ذکر الٰہی سے پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور وسوسہ انداز نہیں ہو پاتا۔ قرآن میں ہے :۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ (۱۱۴-۴) شیطان وسوسہ انداز کی برائی سے جو (خدا کا نام سن کر) پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ :۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ (۸۱ - ۱۵) ہم کو ان ستاروں کی قسم جو پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

میں خُنَّس سے وہ ستارے مراد ہیں جو دن کو الٹی رفتار چلتے ہیں یہ خَانِسٌ کی جمع ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے زحل، مشتری اور مریخ مراد ہیں۔ کیونکہ یہ الٹی چال چلتے رہتے ہیں۔

اَخْنَسْتُ عَنْہُ حَقَّہٗ میں نے اس کے حق کو مؤخر کر دیا۔ روک لیا۔

(خ ن ق)

اَلْمُنْخَنِقَۃُ (۵-۳) جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے۔

اَلْمِخْنَقَۃُ۔ کے معنی قلاوہ کے ہیں۔

(خ و ر)

اَلْخُوَارُ۔ دراصل یہ لفظ گائے بیل کی آواز کے ساتھ مختص ہے۔ پھر استعارۃً اونٹ کی آواز پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔

عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ (۲۰-۸۸) ایک بچھڑا (یعنی اس کا) قالب جس کی آواز گائے کی سی تھی۔

اَرْضٌ خَوَّارَۃٌ دو بلندیوں کے درمیان پست زمین۔

رُمْحٌ خَوَّارٌ۔ کمزور نیزہ۔

اَلْخَوْرَانُ۔ بہائم کی آواز۔ جانوروں کے گوبر کرنے کا راستہ۔

(خ و ض)

اَلْخَوْضُ (ن) کے معنی پانی میں اترنے اور اس کے اندر چلے جانے کے ہیں بطور استعارہ کسی کام میں مشغول رہنے پر بولا جاتا ہے قرآن میں اس کا زیادہ تر استعمال فضول کاموں میں لگے رہنا پر ہوا ہے چنانچہ فرمایا :۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوْضُ وَنَلْعَبُ (۹ - ۶۵) اور اگر تم ان سے (اس بارے میں) دریافت کرو تو کہیں گے کہ ہم تو یوں ہی بات چیت اور دل لگی کرتے تھے۔

وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا (۹ - ۶۹) اور جس طرح وہ باطل میں ڈوبے رہے اسی طرح تم باطل میں ڈوبے رہے۔

ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ (۶ - ۹۱)

---

[1] ذہب الجمہور الی ان المسخ کان عقوبۃ وحقیقیۃ وقال مجاہد بالقول الثانی والاول المسخ علی تغییر الاخلاق واللّٰہ اعلم (راجع التفاسیر)

پھر ان کو چھوڑ دو کہ اپنی بیہودہ بکواس میں کھیلتے رہیں۔
وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ (۶-۶۸) اور جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو ہماری آیتوں کے بارے میں بیہودہ بکواس کر رہے ہیں تو ان سے الگ ہو جاؤ۔ یہاں تک کہ اور باتوں میں مشغول ہو جائیں۔
کہا جاتا ہے :۔
اَخَضْتُ دَابَّتِيْ فِي الْمَاءِ۔ میں نے اپنی سواری کو پانی میں ڈال دیا۔
تَخَاوَضُوْا فِي الْحَدِيْثِ۔ باہم باتوں میں مشغول ہو گئے۔

(خ و ف)

اَلْخَوْفُ (س) کے معنی ہیں قرائن و شواہد سے کسی آنے والے خطرہ کا اندیشہ کرنا۔ جیسا کہ رَجَاءٌ اور طَمَعٌ کا لفظ قرائن و شواہد کی بنا پر کسی فائدہ کی توقع پر بولا جاتا ہے۔ خوف کی ضد امن آتی ہے۔ اور یہ امور دنیوی اور اخروی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔
وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ (۱۷-۵۷) اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں۔
وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ (۶-۸۱) بھلا میں ان چیزوں سے جن کو تم (خدا کا) شریک بناتے ہو کیونکر ڈروں جب کہ تم اس سے نہیں ڈرتے کہ خدا کے ساتھ شریک بناتے ہو۔
تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا۔ (۳۲-۱۶) ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں۔ (اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف اور امید سے پکارتے ہیں۔
وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا (۴-۳) اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ ... انصاف نہ کر سکو گے۔
اور آیت کریمہ :۔
وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا (۴-۳۵) اور اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں ان بن ہے۔ میں بعض نے خِفْتُمْ کے معنی عَلِمْتُمْ کئے ہیں یعنی اگر تمہیں معلوم ہو مگر اس کے اصل معنی یہی ہیں کہ اگر حالات سے واقفیت کی بنا پر تمہیں اندیشہ ہو کہ
اَلْخَوْفُ مِنَ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ سے ڈرنے) کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ جس طرح انسان شیر کے دیکھنے سے ڈر محسوس کرتا ہے۔ اسی قسم کا رعب اللہ تعالیٰ کے تصور سے انسان کے قلب پر طاری ہو جائے بلکہ خوف الہٰی کے معنی یہ ہیں کہ انسان گناہوں سے بچتا رہے۔ اور طاعات کو اختیار کرے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ جو شخص گناہ ترک نہیں کرتا وہ خائف یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا نہیں ہو سکتا۔
اَلتَّخْوِيْفُ (تفعیل) ڈرانا) اللہ تعالیٰ کے لوگوں کو ڈرانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگوں کو بری کاموں سے بچتے رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور آیت کریمہ :۔
ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ (۳۹-۱۶) بھی اسی معنی پر محمول ہے اور باری تعالیٰ نے شیطان سے ڈرنے اور اس کی تخویف کی پرواہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :۔
اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

(۳-۱۷۵) یہ خوف دلانے والا تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے لہذا اگر تم مومن ہو تو ان سے مت ڈرو اور مجھی سے ڈرتے رہنا۔
یعنی شیطان کا حکم مت بجا لاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہو کر رہو۔ اور آیت کریمہ:-
وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ (۱۹-۵)
اور میں اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے ڈرتا ہوں۔
میں خوف کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کو اپنے مال کی فکر تھی کہ موالی اس کے وارث بن جائیں گے جیسا کہ بعض جہلاء نے سمجھا ہے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا درجہ اس سے کہیں بلند ہوتا ہے کہ وہ دنیوی مال و اسباب کی فکر کریں بلکہ موالی سے انہیں یہ اندیشہ تھا کہ وہ ان کے مرنے کے بعد شریعت کی رعایت اور نظام دین کی حفاظت نہیں کریں گے۔
اَلْخِیْفَۃُ کے معنی خوف کی حالت کے ہیں۔ قرآن میں ہے:
فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی قُلْنَا لَا تَخَفْ (۲۰-۶۷) (اس وقت) موسیٰ نے اپنے دل میں خوف معلوم کیا۔
اور کبھی خِیْفَۃٌ بمعنی خوف بھی آجاتا ہے جیسے فرمایا۔
وَالْمَلٰٓئِکَۃُ مِنْ خِیْفَتِہٖ (۱۳-۱۳) اور فرشتے سب اس کے خوف سے۔
تَخَافُوْنَھُمْ کَخِیْفَتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ (۳۰-۲۸)
(اور کیا) تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح اپنوں سے ڈرتے ہو۔
یہاں خوف کی بجائے خِیْفَۃٌ کا لفظ لانے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خوف ان کی حالت لازمہ بن چکی تھی جو ان پر ہر آن طاری رہتی تھی۔
اَلتَّخَوُّفُ (تفعل) کسی انسان کا اظہار خوف کرنا
تَخَوَّفْنَاھُمْ۔ ہم نے انہیں اتنا کم کیا جسقدر کہ خوف اس کا مقتضی تھا۔ قرآن میں ہے:-
اَوْ یَاْخُذَھُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ (۱۶-۴۷) یا جب ان کو عذاب کا ڈر پیدا ہو گیا ہو اس وقت پکڑ لے۔

(خ و ل)

اَلتَّخْوِیْلُ (تفعیل) کے اصل معنی خَوَلٌ یعنی حشم و خدام عطا کرنے کے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اس کے معنی ایسی چیزیں عطا کرنے کے ہیں جو انسان کو خَوَلٌ کا کام دے اور بقول بعض ایسی چیزیں عطا کرنا جن کی نگہداشت کی ضرورت پڑے۔ اور یہ فُلَانٌ خَالُ مَالٍ اَوْ خَائِلُ مَالٍ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ یعنی فلاں مال کی خوب نگہداشت کرنے والا ہے۔ قرآن میں ہے:-
وَتَرَکْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰکُمْ وَرَآءَ ظُھُوْرِکُمْ (۶-۹۴) اور (جاہ و مال و متاع) ہم نے تمہیں عطا فرمایا تھا وہ سب اپنی پیٹھ پیچھے چھوڑ آئے۔
اور اَلْخَالُ" اس کپڑے کو کہا جاتا ہے جو وحشی جانوروں کو ڈرانے کے لئے کھیت میں لٹکا دیا جاتا ہے۔ نیز خَالٌ کے معنی تل یعنی بدن پر سیاہ نشان کے بھی آتے ہیں[1]۔

(خ و ن)

اَلْخِیَانَۃُ۔ خیانت اور نفاق دونوں ہم معنی ہیں مگر خیانت کا لفظ عہد اور امانت کا پاس نہ

---

[1] وذہب الفراوانی ان معناہ التنقص والزجاج الی معنی الاخافۃ راجع التاج واللسان (خوف)، [2] وایضا الخال والخالۃ اخو الام واختہا وفی التنزیل خالاتکم (۳۳-۵۰) او بیوت اخوالکم او بیوت خالاتکم (۲۴-۶۱) خالاتک (۳۳-۵۰) خالاتکم (۴-۲۳)

کہنے پر بولا جاتا ہے اور نفاق دین کے متعلق بولا جاتا ہے۔ پھر ان میں تداخل ہو جاتا ہے پس خیانت کے معنی خفیہ طور پر عہد شکنی کر کے حق کی مخالفت کے آتے ہیں اس کا ضد امانت ہے۔ اور محاورہ میں خُنْتُ فُلَانًا وَ اَمَانَۃَ فُلَانٍ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔
لَا تَخُوْنُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِکُمْ (۸-۲۷) نہ تو خدا اور رسول کی امانت میں خیانت کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو۔
ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰھُمَا (۶۶-۱۰) خدا نے کافروں کے لئے نوحؑ کی بیوی اور لوطؑ کی بیوی کی مثال بیان فرمائی ہے دونوں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں اور دونوں نے ان کی خیانت کی۔
اور آیت کریمہ :۔
وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَۃٍ مِّنْھُمْ (۵-۱۳) اور ...... ہمیشہ تم ان کی (ایک نہ ایک) خیانت کی خبر پاتے رہتے ہو۔
کے معنی بعض نے عَلٰی جَمَاعَۃٍ خَآئِنَۃٍ مِّنْھُمْ کئے ہیں یعنی خَآئِنَۃٍ کو جَمَاعَۃٍ کی صفت مانا ہے اور بعض نے اس کے معنی عَلٰی رَجُلٍ خَائِنٍ کئے ہیں یعنی اسے رَجُلٍ کی صفت مانا ہے اور کہا ہے رَجُلٌ خَائِنٌ وَخَائِنَۃٌ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ رَاوِیَۃٌ (روایت کرنے والا) دَاھِیَۃٌ کے الفاظ میں۔
بعض نے کہا ہے کہ خَائِنَۃٌ یہاں مصدر کی جگہ پر استعمال ہوا ہے جیسا کہ قُمْ قَائِمًا کا محاورہ ہے اور آیت کریمہ :۔ یَعْلَمُ خَآئِنَۃَ الْاَعْیُنِ (۴۰-۱۹) وہ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے۔
بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور فرمایا :۔
وَاِنْ یُّرِیْدُوْا خِیَانَتَکَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰہَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْکَنَ مِنْھُمْ (۸-۷۱) اور اگر یہ لوگ تم سے دغا کرنا چاہیں تو یہ پہلے ہی خدا سے دغا کر چکے ہیں تو اس نے ان کو (تمہارے) قبضے میں دے دیا۔
اور آیت کریمہ :۔
عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمْ کُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَکُمْ (۲-۱۸۷) خدا جانتا ہے کہ تم اپنے حق میں خیانت کرنا چاہتے تھے۔
میں اِخْتِیَانٌ کے معنی خیانت کے لئے حیلہ کرنے کے ہیں۔ اس بنا پر تَخُوْنُوْنَ اَنْفُسَکُمْ نہیں کہا کیونکہ ان سے خیانت کا صدور نہیں ہوا تھا بلکہ انہوں نے اِخْتِیَانٌ کا ارتکاب کیا تھا جس کے معنی قصدِ خیانت کے لئے جذبات کے حرکت میں آنے کے ہیں اسی معنی کی طرف اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

(خ و ی)

اَلْخَوَاءُ کے معنی خالی ہونے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے :۔ خَوٰی (ض) خَوًی۔ بَطْنُہٗ مِنَ الطَّعَامِ یعنی اس کا پیٹ طعام سے خالی ہو گیا۔ اور تشبیہ کے طور پر خَوَی الْجَوْزُ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی خالی ہونے کے ہیں۔ خَوَتْ خَوَاءً۔ اَلدَّارُ گھر ویران ہو کر گر پڑا اور جب ستارے کے گرنے پر بارش نہ ہو تو تشبیہ کے طور پر کہا جاتا ہے خَوَی النَّجْمُ وَاَخْوٰی

لہ وفی التنزیل وہی خاویۃ علی عروشہا وایضاً (۲: ۲۵۹) (۶۹-۷) ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

یہاں خوبی کی نسبت اَخْوٰی کے لفظ میں زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے جیساکہ سقّی اور اَسْقٰی ہیں۔
اَلتَّخْوِیَۃُ دو چیزوں کے درمیان جگہ خالی چھوڑنا۔

(خ ی ب)

اَلْخَیْبَۃُ (ض) کے معنی ناکام ہونے اور مقصد فوت ہوجانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَخَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ (۱۴-۱۵) تو ہر سرکش ضدی نامراد ہوگیا۔
وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰی (۲۰-۶۱) اور جس نے افترا کیا وہ نامراد رہا۔
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا (۹۱-۱۰) اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا۔

(خ ی ر)

اَلْخَیْرُ وہ ہے جو سب کو مرغوب ہو مثلاً عقل عدل وفضل اور تمام مفید چیزیں۔ یہ اَلشَّرُّ کی ضد ہے۔ اور خیر دو قسم پر ہے (۱) خیر مطلق جو ہر حال میں اور ہر ایک کے نزدیک پسندیدہ ہو جیساکہ آنحضرت نے جنت کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا (۱۱۹)
لَاخَیْرَ بِخَیْرٍ بَعْدَہُ النَّارُ وَلَاشَرَّ بِشَرٍّ بَعْدَہُ الْجَنَّۃُ کہ وہ خیر کچھ بھی خیر نہیں ہے جس کے بعد آگ ہو اور وہ شر کچھ بھی شر نہیں ہے جس کے بعد جنت حاصل ہوجائے۔ (۲) دوسری قسم خیر وشر مقید کی ہے یعنی وہ چیز جو ایک کے حق میں خیر اور دوسرے کے لئے شر ہو مثلاً دولت کہ بسا اوقات یہ زید کے حق میں خیر اور عمرو کے حق میں شر بن جاتی ہے۔ اس بنا پر قرآن نے اسے خیر وشر دونوں سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
اِنْ تَرَکَ خَیْرًا (۲-۱۸۰) اگر وہ کچھ مال چھوڑ جاتے۔
اور دوسرے مقام پر فرمایا:۔
اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّھُمْ بِہٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِیْنَ نُسَارِعُ لَھُمْ فِی الْخَیْرَاتِ (۲۳-۵۵-۵۶)
کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو دنیا میں ان کو مال اور بیٹوں سے مدد دیتے ہیں (تو اس سے ان کی بھلائی میں جلدی کر رہے ہیں۔
بعض علماء نے کہا ہے کہ مال پر خیر کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جب وہ مال کثیر ہو اور حلال طریق سے جمع کیا گیا ہو جیساکہ مروی ہے (۱۲۱) کہ حضرت علیؓ اپنے ایک غلام کے پاس گئے تو اس نے دریافت کیا کہ اے امیرالمؤمنین! میں کچھ وصیت نہ کر جاؤں تو حضرت علیؓ نے فرمایا "نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وصیت کیلئے "اِنْ تَرَکَ خَیْرًا" فرمایا ہے۔ اور خیر مال کثیر کو کہا جاتا ہے" چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَاِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ (۱۰۰-۸) وہ تو مال کی سخت محبت کرنے والا ہے۔ میں بھی خیر کے معنی مال کثیر کے ہیں۔
بعض علماء نے کہا ہے کہ آیت کریمہ اِنْ تَرَکَ خَیْرًا میں مال کو خیر کہنے میں ایک باریک نکتہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ وصیت صرف

ا؎ وایضاً (۳-۱۲۶) ۲؎ ؎۳
قال الحافظ فی تخریجہ رواہ عبدالرزاق عن معمر عن ہشام عن ابیہ وایضاً ابن ابی شیبۃ عن ابی خالد الاحمر عنہ ومثلہ عن عائشۃ ان رجلا اراد ان یوصی فسألتہ کم مالک (عبدالرزاق عن عبداللہ بن عبید بن عمیر وابن ابی شیبۃ عن ابن ابی ملیکۃ عن عائشۃ انظر تخریج الحافظ ۴ رقم ۱۰۴-۱۰۶)
؎۳ الحدیث ذکرہ فی الکشاف

اس مال میں بہتر ہے جو محمود طریق سے جمع کیا گیا ہو اس معنی میں فرمایا :-

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ (۲-۱۱۵)
کہدو (جو چاہو خرچ کرو لیکن) جو مال خرچ کرنا چاہو وہ (درجہ بدرجہ اہل استحقاق ہیں) ماں باپ کو۔

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ (۲-۱۹۷)
اور جو نیک کام کرو گے وہ خدا کو معلوم ہو جائیگا۔

اور آیت کریمہ :-
فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا (۲۴-۳۳)
اگر تم ان میں (صلاحیت اور) نیکی پاؤ تو ان سے مکاتبت کر لو۔

میں بعض نے خَيْرًا سے مال مراد لیا ہے یعنی اگر تمہیں معلوم ہو کہ ان کے پاس مال ہے اور بعض نے خیر بمعنی ثواب لیا ہے کہ اگر تمہیں یقین ہو کہ انکی آزادی تمہارے اور ان کے حق میں فائدہ مند یعنی باعث ثواب ہو گی۔ خیر و شر کا استعمال دو طرح پر ہوتا ہے کبھی بطور اسم کے جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اور آیت کریمہ :-

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ (۳-۱۰۴)
اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے۔

میں بھی خیر بطور اسم کے استعمال ہوا ہے اور کبھی یہ دونوں بطور وصف کے آتے ہیں۔ اور اَفْعَلُ مِنْ کی تقدیر میں ہوتے ہیں جیسے هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ ذَاكَ وَاَفْضَلُ ۔ یعنی یہ اس سے بہتر اور افضل ہے قرآن میں ہے :-

نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ (۲-۱۰۶) تو اس سے بہتر بھیج دیتے ہیں

اور آیت کریمہ :-
وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ..... (۲-۱۸۴) تو روزہ رکھنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔

میں خیر اسم بھی ہو سکتا ہے اور بمعنی اَفْعَلُ مِنْ بھی۔ اور آیت کریمہ :-

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (۲-۱۹۷)
اور زاد راہ (یعنی رستے کا خرچ) ساتھ لے جاؤ کیونکہ بہتر (فائدہ) زاد راہ (کا) پرہیزگاری ہے۔
میں خیر بمعنی اَفْعَلُ مِنْ کے ہے۔

پھر کبھی تو خیر کا لفظ شر کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے اور کبھی ضُرٌّ کے مقابلہ میں جیسے فرمایا :-

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۶-۱۷) اور اگر خدا تم کو کوئی سختی پہنچائے تو اسی کے سوا اس کو کوئی دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر نعمت (و راحت) عطا کرے (تو کوئی اس کو روکنے والا) نہیں وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور آیت کریمہ :-
فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ (۵۵-۷۰) ان میں نیک سیرت (اور) خوبصورت۔

میں بعض نے کہا ہے کہ خَيْرَاتٌ اصل میں خَيِّرَاتٌ ہے تخفیف کے لئے ایک یاء کو حذف کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے۔ رَجُلٌ خَيْرٌ وَامْرَءَةٌ خَيْرَةٌ وَهٰذَا خَيْرُ الرِّجَالِ وَهٰذِهٖ خَيْرَةُ النِّسَاءِ اور خَيْرَاتٌ سے مراد یہ ہے کہ ان میں نیک سیرت عورتیں ہوں گی جن میں کسی قسم کی رذالت نہیں پائی جائے گی۔ اَلْخَيَّرُ. بہتر جو خیر کے ساتھ مختص ہو نَاقَةٌ خِيَارٌ وَجَمَلٌ خِيَارٌ (مذکر و مونث) بہتر اونٹنی یا اونٹ۔

اَلْاِسْتِخَارَةُ کے معنی طلب خیر کے ہیں اس کا مطاوع خَارَ آتا ہے۔ کہا جاتا ہے :-

اِسْتَخَارَ اللّٰہُ الْعَبْدُ فَخَارَ لَہٗ۔ بندے نے اللہ تعالیٰ سے طلب خیر کی تو اللہ تعالیٰ نے جو بہتر تھا وہ بتا دیا۔ خَایَرْتُ فُلَانًا کَذَا فَخِرْتُہٗ میں نے فلاں سے (علم میں) مسابقت کی تو میں غالب رہا۔

اَلْخِیْرَۃُ سے مراد وہ حالت ہے جو طالب خیر یا مختار کو حاصل ہوتی ہے جیسا کہ قِعْدَۃٌ وَ جِلْسَۃٌ کا لفظ قَاعِدٌ او جَالِسٌ کی ہیئت اور حالت پر بولا جاتا ہے۔

اَلْاِخْتِیَارُ (افتعال) بہتر چیز کو طلب کر کے اسے کر گزرنا۔

اور کبھی اختیار کا لفظ کسی چیز کو بہتر سمجھنے پر بھی بولا جاتا ہے گو نفس الامر میں وہ چیز بہتر نہ ہو اور آیت کریمہ:۔

وَلَقَدِ اخْتَرْنٰھُمْ عَلٰی عِلْمٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔ (۴۴-۳۲) اور ہم نے بنی اسرائیل کو اہل عالم سے دانستہ منتخب کیا تھا۔

میں ان کے بلحاظ خلقت کے بہتر ہونے کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہیں دوسروں پر فوقیت بخشنا مراد ہو۔

متکلمین کی اصطلاح میں مُخْتَار کا لفظ ہر اس فعل کے متعلق بولا جاتا ہے جس کے کرنے میں انسان پر کسی قسم کا جبر و اکراہ نہ ہو لہٰذا ھُوَ مُخْتَارٌ فِیْ کَذَا کا محاورہ فُلَانٌ لَہٗ اِخْتِیَارٌ کے ہم معنی نہیں ہے کیونکہ اِخْتِیَارٌ کے معنی اس کام کے کرنے کے ہوتے ہیں جسے انسان بہتر خیال کرتا ہو۔ مگر مُخْتَارٌ[1] کا لفظ فاعل اور مفعول دونوں پر بولا جاتا ہے۔

(خ ی ط)

اَلْخَیْطُ۔ تاگا۔ والجمع اَلْخُیُوْطُ۔

خَاطَ (ض) خِیَاطَۃً وَخَیَّطَ الثَّوْبَ کے معنی کپڑا سینے کے ہیں اور کپڑا سینے کی سوئی کو الخِیَاط کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ (۷-۴۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں سے نکل جائے۔

اور آیت کریمہ:۔

حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ (۲-۱۸۷) یہاں تک کہ صبح کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے الگ نظر آنے لگے۔

میں خَیْطِ اَبْیَض اور اَسْوَد سے صبح کی سفیدی اور رات کی تاریکی مراد ہے۔ اور شاعر کے قول (طویل)

(۱۴۸) تَدَلّٰی عَلَیْھَا بَیْنَ سِبٍّ وَخَیْطَۃٍ[2]

وہ رسی اور میخ کے مابین اس پر اٹک گیا۔

میں خَیْطَۃٌ کا لفظ بطور استعارہ رسی یا میخ کے معنی میں استعمال ہوا ہے ایک روایت میں ہے (۱۲۲)[3] کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی رضی اللہ عنہ بن حاتم نے سیاہ اور سفید دو عقال (ڈورے) رکھ لئے ان کی طرف دیکھتے جاتے اور کھاتے جاتے یہاں تک کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے ممتاز نظر آنے لگے پھر اس نے آنحضرت کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا:۔

---

[1] قال ابو ذویب یصف مشتار العسل وتمامہ: ..... یجر دا مثل الوکف یکبو غرابہا وفی التہذیب القالی (۲: ۲۵۸) شطرہ الثانی شدید الوصاۃ نابل ابن وابن نابل والبیت من شواہد الکشاف ۳۴ الکن فیہ تمامہ ندلی دلوا المایخ المتشمر واللہ اعلم والبیت فی تہذیب الاصلاح تا اللسان (سب، خیط۔

[2] حدیث عدی بن حاتم متفق علیہ فی ابی داؤد من حدیث الشعبی عنہ والصحیح انہ صلی اللہ علیہ وسلم قال مزاحًا لم یعیرہ بالحمق وان کانت اللفظۃ تاتی بمعنی الحمق، انظا ۱۲ ش

اِنَّكَ لَعَرِيْضُ الْقَفَا وَاِنَّمَا ذَالِكَ بَيَاضُ النَّهَارِ وَسَوَادُ اللَّيْلِ۔ کہ تم تو نرے ہی عریض القفاء (احمق) ہو۔ اس سے مراد تورات کی سیاہی اور فجر کی سفیدی ہے۔

خَيَّطَ الشَّيْبُ فِيْ رَأْسِهٖ۔ اس کے سر میں تاگے کی طرح بڑھاپا ظاہر ہوگیا۔ اَلْخَيْطُ (ایضاً) شتر مرغ اس کی جمع اَلْخِيْطَانُ ہے۔ نَعَامَةٌ خَيْطَاءُ۔ تاگے کی طرح لمبی گردن والا شتر مرغ۔

(خ ی ل)

اَلْخَيَالُ۔ اس کے اصل معنی صورت مجردہ کے ہیں جیسے وہ صورت جو خواب یا آئینے میں نظر آتی ہے یا کسی کی عدم موجوگی میں دل کے اندر اس کا تصور آتا ہے۔ پھر (مجازاً) ہر اس امر پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کا تصور کیا جائے اور ہر اس پتلے دبلے شخص کو خیال کہا جاتا ہے جو بمنزلہ خیال اور تصور کے ہو۔

اَلتَّخْيِيْلُ (تفعیل) کے معنی کسی کے نفس میں کسی چیز کا خیال یعنی تصور قائم کرنے کے ہیں اور اَلتَّخَيُّلُ کے معنی از خود اس قسم کا تصور قائم کر لینے کے ہیں۔ اور خِلْتُ بمعنی ظَنَنْتُ آتا ہے۔ اس اعتبار سے کہ مظنون چیز بھی بمنزلہ خیال کے ہوتی ہے۔

خَيَّلَتِ السَّمَآءُ آسمان میں بارش کا سماں نظر آنے لگا۔ فُلَانٌ مُخِيْلٌ بِكَذَا۔ فلاں اس کا سزاوار ہے اصل میں اس کے معنی یہ ہیں کہ فلاں اس خیال کو ظاہر کرنے والا ہے۔ اَلْخُيَلَاءُ۔ تکبر جو کسی ایسی فضیلت کے تخیل پر مبنی ہو جو انسان اپنے اندر خیال کرتا ہو۔ اسی سے لفظ خَيْل لیا گیا ہے کیونکہ جو شخص گھوڑے پر سوار ہو وہ اپنے اندر نخوت و غرور پاتا ہے۔ دراصل خَيْل کا لفظ گھوڑے اور سوار دونوں کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (۸-۶۰) اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے اور کبھی ہر ایک پر انفراداً بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے[1] (۱۲۲) يَا خَيْلَ اللّٰهِ ارْكَبِيْ۔ (اے اللہ کے سوار گھوڑے پر سوار ہو جا) تو یہاں خیل بمعنی فارس کے ہے اور ایک حدیث میں ہے[2] (۱۲۳) عَفَوْتُ لَكُمْ عَنْ صَدَقَةِ الْخَيْلِ کہ میں نے تمہیں گھوڑوں کا صدقہ معاف کیا اَلْاَخْيَلُ۔ شقراق (ایک پرندہ) کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ رنگ بدلتا رہتا ہے۔ اور ہر لحظہ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ دوسرے رنگ کا ہے۔ اسی بنا پر شاعر نے کہا ہے[3] (مجزوالکامل)

(۱۴۹) كَاَبِيْ بَرَاقِشَ كُلَّ لَوْ — نٍ لَوْنُهٗ يَتَخَيَّلُ

ابو براقش کی طرح جو ہر آن نیا رنگ بدلتا ہے۔

---

[1] رواه الشیخ فی الناسخ والمنسوخ وعزاه السهیلی فی الروض لمسلم والحدیث باختلاف الفاظه فی ابی داؤد والمستدرک للحاکم وفی الردة للواقدی قاله خالد بن الولید لاصحابه یوم الیمامة راجع الکافی رقم ۴ ۲۹ والحیوان ۱/ ۳۴۵ من کلمات النبی صلی اللہ علیه وسلم لم یتقدمه فیهن احد وفی اضداد ابی الطیب یقولون یا خیل اللہ ارکبی علی القلب هذه من المجاز [2] رواه ابو داؤد والترمذی من حدیث علی مرفوعاً قال الدارقطنی الصواب وقفه علی علیؓ وفی المسند لاختلاف راجع لاختلاف الفاظه النیل ۴/ ۱۴۴ و کنز العمال ۴ رقم ۱۲۵۸ [3] قاله الاسدی فی ذم قوم مشهورین بالتقابح وفی المطبوع کانت بدل کابی مصحف راجع اللسان (برقش) والاقتضاب ۳۵۲ والعیون (۲: ۲۹) والحیوان (۳: ۷۴) وانظر للبیت والروایات عما مثل فیه دیوان المعانی (۱: ۲۸۲) وخزانة الادب (۳: ۶۶۰) والصناعتین ۱۰۳ وذیل الامالی ۸۳ والمحاضرات للمؤلف (۱: ۱۵) ۞ ۞ ۞

کتاب الدال

(د ء ب)

اَلدَّأْبُ کے معنی مسلسل چلنے کے ہیں۔

کہا جاتا ہے:۔

دَأَبَ فِی السَّیْرِ دَأْبًا۔ وہ مسلسل چلا۔ قرآن میں ہے:۔

وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ (۱۴-۳۳) اور سورج اور چاند کو تمہارے لئے کام میں لگا دیا کہ دونوں (دن رات) ایک دستور پر چل رہے ہیں۔

نیز دَأْبٌ کا لفظ عادۃ مستمرہ پر بھی بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:۔

کَدَأْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ (۳-۱۱) ان کا حال بھی فرعونیوں کا سا ہے۔

یعنی انکی سی عادت جس پر وہ ہمیشہ چلتے رہے ہیں۔

(د ب ب)

اَلدَّبُّ وَالدَّبِیْبُ (ض) کے معنی آہستہ آہستہ چلنے اور رینگنے کے ہیں۔ یہ لفظ حیوانات اور زیادہ تر حشرات الارض کے متعلق استعمال ہوتا ہے اور شراب اور بھنگی وغیرہ کے جسم اور گھڑے وغیرہ ہیں) سرایت کر جانے کے لئے بھی بولا جاتا ہے جن کی حرکات کا علم حاسہ بصر سے اور ایک نہ ہو سکتا ہو۔ یہ لفظ گو عرف میں خاص کر گھوڑے پر بولا جاتا ہے مگر (لغۃ) ہر حیوان یعنی ذی حیات چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاللّٰہُ خَلَقَ کُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ (۲۴-۴۵) اور خدا ہی نے ہر چلتے پھرتے جانور کو پانی سے پیدا کیا۔

وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ کُلِّ دَآبَّةٍ (۲-۱۶۴) اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلائے ہیں۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱-۶) اور زمین پر چلنے پھرنے والا نہیں مگر اس کا رزق خدا کے ذمے ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ یَّطِیْرُ بِجَنَاحَیْهِ۔۔۔۔ (۶-۳۸) اور زمین پر چلنے پھرنے والا (حیوان) یا دو پروں سے اڑنے والا پرند نہیں ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَلَوْ یُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا کَسَبُوْا مَا تَرَکَ عَلٰی ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ (۳۵-۴۵) اور اگر خدا لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب پکڑنے لگتا تو روئے زمین پر کسی ایک چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا۔

کی تفسیر میں ابو عبیدہؓ نے کہا ہے کہ یہاں دَآبَّةٌ

سے خاص کر انسان مراد ہیں۔ مگر اولیٰ یہ ہے کہ اسے
عموم پر رکھا جائے اور اس سے ہر ذی حیات چیز
مراد لی جائے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ
دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ (۲۷-۸۲)
اور جب ان کے بارے میں (عذاب کا) وعدہ
پورا ہوگا تو ہم ان کے لئے زمین میں سے ایک
جانور نکالیں گے جو ان سے کلام کرے گا۔
کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہ ایک غیر معروف
قسم کا جانور ہوگا جو قیامت کے قریب خروج
کریگا۔ اور بعض نے اس سے وہ شریر لوگ
مراد لئے ہیں جو جہالت میں جانوروں کی طرح
ہوں گے۔ اس صورت میں لفظ دَابَّۃ جمع ہوگا
(جیسا کہ خَائن کی جمع خَائِنَۃ آجاتی ہے) اور
ہر چلنے پھرنے والی چیز کو شامل ہوگا۔ اور آیت کریمہ
إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ (۸-۲۲) کچھ
شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تمام جانوروں میں
سب سے بدتر۔
میں دَوَابّ کا لفظ جملہ حیوانات کو شامل ہے۔
محاورہ ہے:۔
نَاقَةٌ دَبُوبٌ ضعف اور سستی کی وجہ سے
آہستہ چلنے والی اونٹنی۔
مَا بِالدَّارِ دُبِّيٌّ[1]۔ گھر میں کوئی نہیں۔
أَرْضٌ مَدْبُوبَةٌ۔ وہ زمین جس میں چھوٹے
چھوٹے رینگنے والے جانور کثرت سے ہوں۔

(د ب ر)

دُبُرٌ۔ پشت، مقعد یہ قبل کی ضد ہے اور
یہ دونوں لفظ بطور کنایہ جائے مخصوص کے معنی میں
استعمال ہوتے ہیں اور اس میں دُبْرٌ اور دُبُرٌ
دو لغات ہیں اس کی جمع أَدْبَارٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ (۸-۱۶) اور
جو شخص جنگ کے روز ان سے پیٹھ پھیرے گا۔
يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ (۸-۵۰)
ان کے مونہوں اور پیٹھوں پر (کوڑے و ہتھوڑے
وغیرہ) مارتے ہیں۔
فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ (۸-۱۵) تو ان
سے پیٹھ نہ پھیرنا۔
یعنی ہزیمت خوردہ ہو کر مت بھاگو۔ اور آیت کریمہ:۔
وَأَدْبَارَ السُّجُودِ (۵۰-۴۰) (اور نماز کے بعد بھی)
میں ادبار کے معنی نمازوں کے آخری حصے (یا
نمازوں کے بعد) کے ہیں۔ اور أَدْبَارَ النُّجُومِ
(۵۲-۴۹) میں ایک قراءت إِدْبَارَ النُّجُومِ
بھی ہے۔ اس صورت میں یہ مصدر بمعنی ظرف
ہوگا یعنی ستاروں کے ڈوبنے کا وقت جیسا
کہ مَقْدَمَ الْحَاجِّ اور خُفُوقَ النَّجْمِ میں
ہے۔ اور أَدْبَار (بِفَتْحِ الْهَمْزَةِ) ہونے کی
صورت میں جمع ہوگی۔ اور الدبر سے مشتقات
(جیسے دَبَرَ وَأَدْبَرَ وَدَابِرٌ) کبھی باعتبار
فاعل (یعنی فعل لازم) کے استعمال ہوتے ہیں۔
جیسے:۔ دَبَرَ فُلَانٌ (فلاں نے پیٹھ پھیری)
أَمْسِ الدَّابِرُ (کل گذشتہ) قرآن میں ہے۔
وَاللَّيْلِ إِذْ أَدْبَرَ (۷۴-۳۳) اور رات کی
جب پیٹھ پھیرنے لگے
اور کبھی باعتبار مفعول (یعنی فعل متعدی) کے جیسے
دَبَرَ السَّهْمُ الْهَدَفَ (تیر نشانہ سے دور گر پڑا)

---

[1] ھو نصہ وجاز دابۃ ھاھنا انسان راجع مجازہ (۲: ۱۵۶) وقارن الطبری ۲، ۲۰ ودبی قال الجوہری ولا یتکلم بہا الا فی الجحد ای النفی :

دَبَرَ فُلَانٌ الْقَوْمَ (یعنی وہ قوم سے پیچھے رہ گیا
قرآن میں ہے :-
فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (۶-۴۵)
غرض ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی۔
اِنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِیْنَ (۱۵-۶۶)
کہ ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہی کاٹ دی جائیگی۔
اور دَابِرٌ کے معنی متاخر یا تابع کے آتے ہیں خواہ وہ تاخر باعتبار مکان یا زمان کے ہو اور خواہ باعتبار مرتبہ کے۔
اَدْبَرَ۔ اعراض کرنا پشت پھیرنا۔ قرآن میں ہے:۔
ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ۔ اور پھر پشت پھیر کر چلا اور (قبول حق سے) غرور کیا (۷۴-۲۳)
تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى (۷۰-۱۷) ان لوگوں کو بلائے گی جنہوں نے (دین حق سے) اعراض کیا۔
حدیث میں ہے[1] :- (۱۲۵)
لَا تَقَاطَعُوْا وَلَا تَدَابَرُوْا وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا۔ کہ نہ ایک دوسرے سے قطع تعلق کرو اور نہ آپس میں روٹھو اور اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو۔
بعض نے لَا تَدَابَرُوْا کے معنی یہ کئے ہیں کہ پس پشت ایک دوسرے کی برائی بیان نہ کرو۔
اَلْاِسْتِدْبَارُ (استفعال) پشت پھیرنا۔ کسی چیز کے پیچھے ہونے کو طلب کرنا۔

تَدَابَرَ الْقَوْمُ باہم اختلاف کرکے قطع تعلق کرنا۔
اَلدِّبَارُ۔ یہ دَابَرَہٗ کا مصدر ہے جس کے معنی پس پشت دشمنی کرنے کے ہیں۔
اَلتَّدْبِیْرُ (تفعیل) کسی معاملہ کے انجام پر نظر رکھتے ہوئے اس میں غور و فکر کرنا قرآن میں ہے:۔
فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا (۷۹-۵) پھر (دنیا کے) کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔
یعنی وہ فرشتے جو امور دنیوی کے انتظام کیلئے مقرر ہیں۔
اَلتَّدْبِیْرُ (ایضًا) آزاد کردن بندہ پس از مرگ۔
اَلدَّبَارُ (بفتح الدال) ہلاکت جو قوم کی جڑ کو کاٹ ڈالے۔
نیز ایام جاہلیت میں بدھ کے دن کو دبار کہا جاتا تھا۔ کیونکہ عرب لوگ اس سے بدشگونی لیتے تھے۔
اَلدَّبِیْرُ۔ ریسماں کہ برگشتند بوقت رشتن سپس اوو روضد آں قبیل است)
رَجُلٌ مُّقَابَلٌ وَّمُدَابَرٌ۔ نجیب الطرفین۔
شَاةٌ مُّقَابَلَةٌ مُّدَابَرَةٌ۔ بکری جس کا اگلی اور پچھلی جانب سے کان کٹا ہوا ہو۔
دَابِرَةُ الطَّائِرِ پرند کے پاؤں کا رخارہ پرند کی پانچویں انگلی جو دوسری انگلیوں کے اوپر نکلتی ہے۔
دَابِرَةُ الْحَافِرِ۔ ناخن کہ بر بازوئے ستور بر آید۔
اَلدَّبُوْرُ پچھوائی ہوا۔ اَلدَّبْرَةُ قابل کاشت زمین کا ٹکڑا اسکی جمع دِبَارٌ ہے شاعر نے کہا ہے[2] ع (طویل)
(۱۵۰) جَرْبَةٍ تَعْلُوْا الدِّبَارَ غُرُوْبُهَا

---

[1] متفق علیہ من حدیث ابی ہریرۃ ورواہ البخاری عن انس بمعناہ والطبرانی عن ابی ایوب راجع کنز العمال ۹: ۲۲۹ و ۹۲۸ وتخریج الاحیاء ۲/ ۱۷۸،۱۸۰ [2] قالہ بشر بن ابی خازم وتکملتہ: تحدر ماء البئر عن جرشیۃ علی ... وفی المطبوع جربہ ربالیا) مصحف والصواب بالموحدۃ والضاد ومعناہ المزرعۃ والدبار جمع دبرۃ ودبارۃ وہی القطعۃ من المزرعۃ والجرشیۃ ناقۃ منسوبۃ الی جرش وہی ارض بالیمن واہلہا یستقون علی الابل فالشاعر شبہ تحدر دموعہ بتحدر ماء علی جربۃ من غروب یستقی علیہا کذا قال الجوہری (جرش۔ دبر) والبیت ایضًا فی اللسان (جرب دبر جرش) و المفضلیات (۲: ۳۰) وفیہ الغرب مکان البئر راجع ایضًا البلدان (رسم جرش) وفیہ ان جرش فتحت فی حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سنۃ عشر من الہجرۃ صلحًا علی الفئ وجُرَش بالضم والفتح ۱۲

جیسے کہ منی اونٹنی کے پانی سے بھرے ہوئے ڈول زمین پر گرتے ہیں۔
اَلدَّبْرُ۔ شہد کی مکھیوں، بھڑوں یا اس قسم کی دوسری چیزوں کا غول جن کا ڈنک ان کے مقعد پر ہوتا ہے۔ اس کا واحد دَبْرَۃٌ ہے۔
اَلدِّبْرُ۔ مال کثیر جو میت چھوڑ مرے۔ اس کا تثنیہ اور جمع نہیں آتا۔
دَبِرَ الْبَعِیْرُ۔ زخمی بیٹھ والا ہونا۔ ایسے اونٹ کو اَدْبَرُ وَ دَبِرٌ کہتے ہیں۔ اَلدَّبْرَۃُ (بفتح الباء و سکونہا) شکست در کارزار۔[1]

(د ث ر)

اَلْمُدَّثِّرُ۔ (از تفعل) اصل میں مُتَدَثِّرٌ تھا۔ تار کو دال سے بدل کر دال کو دال میں ادغام کر دیا۔ اس کے معنی کپڑا اوڑھنے والے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے دَثَّرْتُہٗ فَتَدَثَّرَ (میں نے اسے کپڑے میں لپیٹا چنانچہ وہ لپٹ گیا) قرآن میں ہے:۔
یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ (۷۴-۱) اے (محمدؐ) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو۔
اَلدِّثَارُ۔ وہ کپڑا جس میں آدمی لپٹ جائے جیسے چادر کمبل وغیرہ
تَدَثَّرَ الْفَحْلُ النَّاقَۃَ۔ سانڈھ اونٹنی پر چڑھ گیا
تَدَثَّرَ الرَّجُلُ الْفَرَسَ۔ آدمی گھوڑے پر کود کر سوار ہو گیا۔ رَجُلٌ دَثُوْرٌ۔ گمنام آدمی۔
سَیْفٌ دَاثِرٌ۔ زنگ آلو تلوار جسے پالش کئے بہت عرصہ گزر گیا ہو۔ اسی سے جس منزل کے نشانات مٹ گئے ہوں اُسے دَاثِرٌ کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ دِثْرُ مَالٍ وہ مال کی اچھی طرح خبر گیری کرنے والا ہے۔[2]

(د ح ر)

اَلدَّحْرُ وَالدُّحُوْرُ۔ (ن) کے معنی دھتکار دینے اور دور کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اُخْرُجْ مِنْھَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۷-۱۸) نکل جا یہاں سے ذلیل دھتکارا ہوا۔
فَتُلْقٰی فِیْ جَھَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۱۷-۳۹) ملامت زدہ اور درگاہ خدا سے راندہ بنا کر جہنم میں ڈال دیئے جاؤ گے۔
وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ دُحُوْرًا (۳۷-۹) اور ہر طرف سے (ان پر انگارے) پھینکے جاتے ہیں۔ (یعنی وہاں سے نکال دینے کو۔

(د ح ض)

دَاحِضَۃٌ۔ (اسم فاعل) باطل اور زائل ہونے والی (دلیل) قرآن میں ہے:۔
حُجَّتُھُمْ دَاحِضَۃٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ (۴۲-۱۶) ان کے پروردگار کے نزدیک ان کی دلیل باطل ہو رہی ہے۔
کہا جاتا ہے اَدْحَضْتُ فُلَانًا فِیْ حُجَّتِہٖ فَدَحَضَ وَ اَدْحَضْتُ حُجَّتَہٗ فَدَحَضَتْ (میں نے اس کی دلیل کو باطل کیا تو وہ باطل ہو گئی)[3]
قرآن میں ہے:۔
وَیُجَادِلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِہِ الْحَقَّ (۱۸-۵۶) اور جو کافر ہیں وہ باطل (سے استدلال کر کے) جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس سے حق کو اس کے مقام سے پھسلا دیں۔
اصل میں یہ دَحْضُ الرِّجْلِ سے مشتق ہے

---

[1] کذا فی الصحاح [2] ومنہ المثل شر الرأی الدبری ای الذی یسنح اخیرا عند فوت الحاجۃ [3] وفی التنزیل: فساہم فکان من المدحضین (۳۷-۱۴۱)

جس کے معنی پاؤں کے پھسلنے اور ٹھوکر کھانے کے ہیں۔ اس بنا پر مناظرہ کے بارے میں کسی نے کہا ہے؎ ع (الکامل)

(۱۵) نَظْرًا یُزِیْلُ مَوَاقِعَ الْاَقْدَامِ
ایسی نظر جو قدموں کو ان کی جگہ سے پھسلا دے۔ اور بطور استعارہ دَحَضَتِ الشَّمْسُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی سورج ڈھلنے کے ہیں

(د ح و)

اَلدَّحْوُ۔ کے معنی کسی چیز کو اس کی جگہ سے زائل کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا۔ (۷۹-۳۰)
اور اس کے بعد زمین کو اس کے مقر سے دور کیا۔ یعنی اسے اس کی قرار گاہ سے زائل کر دیا جیسا کہ آیت کریمہ:۔ یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ (۷۳-۱۴) میں ہے۔ یہ دَحَا الْمَطَرُ الْحَصٰی عَنْ وَجْهِ الْاَرْضِ (کہ بارش زمین سے کنکر بہا کر لے گئی) کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ نیز کہا جاتا ہے:۔ مَرَّ الْفَرَسُ یَدْحُوْ دَحْوًا۔ گھوڑا اپنے سم زمین پر لگاتا خاک اڑاتا چلا گیا۔ اور اسی سے اُدْحِیُّ النَّعَامِ ہے جس کے معنی ریت میں شترمرغ کے انڈے دینے کی جگہ کے ہیں۔ یہ دَحْوٌ سے اُفْعُوْلٌ کے وزن پر ہے۔ دِحْیَةُ ایک مرد کا نام تھا (جو دحیہ کلبی کے نام سے مشہور تھا)

(د خ ر)

اَلدَّخَرُ وَالدُّخُوْرُ (ف، س) کے معنی ذلیل ہونے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ اَدْخَرْتُهُ فَدَخَرَ میں نے اسے ذلیل کیا تو وہ ذلیل ہو گیا۔ قرآن میں ہے وَهُمْ دَاخِرُوْنَ (۱۶-۴۸) اور وہ ذلیل ہو کر۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ (۴۰-۶۰) جو لوگ میری عبادت سے از راہ تکبر کنیاتے ہیں عنقریب جہنم میں ذلیل ہو کر داخل ہوں گے۔
اور یَدَّخِرُ اصل میں یَدْتَخِرُ تھا پہلے تاء کو دال سے تبدیل کیا پھر ذال کو دال بنا کر دال کو دال میں ادغام کر کے یَدَّخِرُ بنا لیا) اور یہ اس باب (دخر) سے نہیں ہے۔

(د خ ل)

اَلدُّخُوْلُ (ن) یہ خروج کی ضد ہے۔ اور مکان وزمان اور اعمال سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے دَخَلَ مَكَانَ كَذَا (فلاں جگہ میں داخل ہوا۔ قرآن میں ہے:۔
اُدْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ (۲-۵۸) کہ اس گاؤں میں داخل ہو جاؤ۔
اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶-۳۲) جو تم عمل کیا کرتے تھے ان کے بدلے بہشت میں داخل ہو جاؤ۔

۱؎ والبیت من شواہد الکشاف ۳/۱۲۳ واولہ: یتقارضون اذا التقوا فی مجلس۔ والبیت فی محاضرات المؤلف ۱:۲۷ والصناعتین ۲۸۱، ۷ ۳۵ وفیہ مواطئ بلا مواقع واللسان (نظر، قرض، زال) وفی روایتہ فی موطن بدل فی مجلس والشطر فی المقاییس ۲:۳۴۱ والبیت فی المشکل للقتیبی ۱۳۰ ومجازات القرآن للرضی ۳۴۳ والشوکانی فی ۲۶۹ والقرطبی ۲۵۶ والفخر (۳۰: ۱۰۰) والبحر ۸/۳۱ والطبری (۲۹: ۳۰) والغریب للقتیبی ۴۸۲ والبیان للجاحظ (۱:۱۱) وفی روایتہ فی موقف بدل فی مجلس ۱۲

اُدْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا (۱۶-۲۹) کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ اس میں رہو گے۔

وَیُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۵۸-۲۲) اور وہ ان کو بہشتوں میں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں داخل کرے گا۔

وَیُدْخِلُ مَنْ یَّشَآءُ فِیْ رَحْمَتِهٖ (۷۶-۳۱) جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کر لیتا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ (۱۷-۸۰) اور کہو کہ اے پروردگار مجھے (مدینے میں) اچھی طرح داخل کیجیو۔

میں مَدْخَلٌ (بفتح المیم) دَخَلَ یَدْخُلُ سے ہوگا اور مُدْخَلٌ (بضمۂ میم) ہو تو اَدْخَلَ یُدْخِلُ سے جیسے فرمایا:۔

لَیُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا یَّرْضَوْنَهٗ (۲۲-۵۹) وہ ان کو ایسے مقام میں داخل کریگا جسے وہ پسند کریں گے۔ اور آیت کریمہ:۔

مُّدْخَلًا کَرِیْمًا (۴-۳۱)

میں ہر دو قراءت منقول ہیں یعنی (میم کا ضمہ اور فتحہ) ابو علی الفسوی[1] لکھتے ہیں کہ مَدْخَلًا (بفتح المیم) میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جنت میں قصد اور ارادہ سے داخل ہوں گے۔ اور ان کی حالت اہل دوزخ کی سی نہیں ہوگی جن کے بارے میں قرآن نے کہا ہے:۔

اَلَّذِیْنَ یُحْشَرُوْنَ عَلٰی وُجُوْهِهِمْ اِلٰی جَهَنَّمَ (۲۵-۳۴) جو لوگ اپنے چہروں کے بل دوزخ کی طرف جمع کئے جائیں گے۔

اِذِ الْاَغْلٰلُ فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ یُسْحَبُوْنَ (۴۰-۷۱) جب کہ ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی (اور) گھسیٹے جائیں گے۔

اور مُدْخَلًا پڑھا جائے تو یہ لَیُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا یَّرْضَوْنَهٗ کی طرح ہوگا۔

اِدَّخَلَ۔ کسی جگہ میں بہ صد مشقت داخل ہونا گھس جانا۔ قرآن میں ہے:۔

لَوْ یَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا (۹-۵۷) اگر ان کو کوئی بچاؤ کی جگہ (جیسے قلعہ) یا غار و مغاک یا زمین کے اندر گھسنے کی جگہ مل جائے۔

اَلدَّخَلُ۔ یہ دَغَلٌ کی طرح اندرونی عداوت، فساد یا کسی نسب کا دعویٰ کرنے سے کنایہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے:۔

دُخِلَ فُلَانٌ فِیْ عَقْلِهٖ اَوْ جِسْمِهٖ فَهُوَ مَدْخُوْلٌ وَدَخِلَ (س) دَخَلًا (کنایہ) یعنی اس کے عقل و جسم یا اصل میں خرابی پائی جاتی ہے۔ اسی سے اندر سے کھوکھلے درخت کو شَجَرَةٌ مَّدْخُوْلَةٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَكُمْ دَخَلًا بَیْنَكُمْ (۱۶-۹۲) تم اپنی قسموں کو باہمی فساد کا ذریعہ بنانے لگو۔

اَلدِّخَالُ (از الابل) وہ اونٹ جو ایک مرتبہ پانی پی چکا ہو اور اسے دوبارہ پیاسے اونٹوں کے درمیان حوض پر داخل کیا جائے تاکہ مزید پانی پی لے۔

اَلدُّخَّلُ۔ ایک چھوٹا سا و مضندے رنگ کا پرند اور اسے دُخَّلٌ اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ گنجان درختوں میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے اور نظر نہیں آتا۔

اَلدَّوْخَلَةُ کھجور کے پتوں کا زنبیل۔

---

[1] الفارسی صاحب الایضاح والتکملۃ والمتولد ۲۸۸ھ المتوفی ۳۷۷ھ راجع لاحوالہ (من بحث آمین)

دَخَلَ بِامْرَءَتِہٖ (کنایہ) اس نے اپنی عورت سے مباشرت کی۔ قرآن میں ہے:۔
مِنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِىْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ (۴-۲۳) جن عورتوں سے تم مباشرت کر چکے ہو.... ہاں اگر ان کے ساتھ تم نے مباشرت نہ کی ہو تو ان کی لڑکیوں کے ساتھ نکاح کر لینے میں، تم پر کچھ گناہ نہیں۔

(د خ ن)

اَلدُّخَانُ۔ یہ اَلْعُثَانُ کے ہم معنی ہے یعنی اس دھوئیں کو کہتے ہیں جو آگ کے شعلہ کے ساتھ نکلتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ (۴۱-۱۱)
پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا۔ کے معنی یہ ہیں کہ وہ دھوئیں کی مثل تھا یعنی اس میں تماسک نہیں تھا۔
دَخَنَتِ النَّارُ تَدْخُنُ۔ آگ کا کثرت سے دھواں دینا اسی سے دُخْنَةٌ ہے لیکن عرف میں اس خوشبو کو دُخْنَةٌ کہا جاتا ہے جس سے دھونی دی جاتی ہے۔
دَخِنَ الطَّبِیْخُ۔ پکی ہوئی چیز کا دھوئیں سے خراب ہو جانا۔ اور دُخَان سے لون (رنگ) کے معنی لے کر کہا جاتا ہے۔ شَاةٌ دَخْنَاءُ وَذَاتُ دُخْنَةٍ دھوئیں جیسی سیاہ بکری۔
لَیْلَةٌ دَخْنَانَةٌ تاریک رات۔
اور اس سے ایذا رسانی کے معنی لیکر هُوَ دَخِنُ الْخُلُقِ کا محاورہ استعمال کرتے ہیں یعنی وہ بدخلق ہے۔ ایک روایت میں ہے[1]: (۱۲۵) هُدْنَةٌ عَلٰى دَخَنٍ۔ یعنی صلح ہو جائے گی لیکن دلوں میں کینہ ہوگا۔

(د ر ر)

اَلْمِدْرَارُ (صیغہ مبالغہ) بہت برسنے والا قرآن میں ہے:۔
وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا (۶-۶)
اور ان پر آسمان سے لگاتار مینہ برسایا۔
يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا (۷۱-۱۱)
وہ تم پر آسمان سے لگاتار مینہ برسائے گا۔
اصل میں مِدْرَار، دَرٌّ اور دِرَّةٌ سے ہے جس کے معنی دودھ کے ہیں۔ پھر بطور استعارہ بارش کے لئے استعمال ہونے لگا ہے جیسا کہ اونٹ کے دیگر اسماء و اوصاف بطور استعارہ استعمال ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔
لِلّٰهِ دَرُّهٗ (اس کی خوبی اللہ کے لئے ہے (تعجب) دَرَّ دَرُّكَ تمہاری خیر زیادہ ہو۔
پھر بطور استعارہ بازار کے پُر رونق ہونے پر لِلسُّوْقِ دِرَّةٌ (بازار پر رونق ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔
مثل مشہور ہے (مثل) سَبَقَتْ دِرَّتُهٗ غِرَارَهٗ اس کی تلوار پر خون سبقت کر جاتا ہے) جیسا کہ ضرب المثل کے طور پر (مثل) سَبَقَ سَيْلُهٗ مَطَرَهٗ (اس کی بارش سے قبل ہی سیلاب آجاتا ہے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اسی سے کہا جاتا ہے۔ اِسْتَدَرَّتِ الْمِعْزٰى۔ یعنی بکری نے نر سے جفتی کی خواہش کی کیونکہ بکری حاملہ ہوگی تو بچہ جنے گی اور بچہ جنے گی تو دودھ دے گی لہذا

[1] من حدیث حذیفۃ بن الیمان وبعدہ دجماعۃ علی اقذاء مثل تکدہ رنیا ثم دفقد نصا نیہم الفائق ۲/۲۲۲ والبداکرہ ۳:۱۲۱: ۵۸۳

اِسْتِدْرَار کا لفظ بول کر زر کی خواہش سے کنایہ کیا جاتا ہے۔

(د ر ء)

اَلدَّرْءُ (ف)، کے معنی دنیزہ وغیرہ کے ایک جانب مائل ہو جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔
قَوَّمْتُ دَرْءَہٗ میں نے اس کی کجی کو درست کر دیا۔
دَرَءْتُ عَنْہُ۔ میں نے اس سے دفع کیا قرآن میں ہے:
وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ (۱۳-۲۲) اور نیکی کے ذریعہ برائیوں کا مقابلہ کرتے ہیں
وَیَدْرَؤُا عَنْہَا الْعَذَابَ (۲۴-۸) اور عورت سے سزا کو یہ بات ٹال سکتی ہے۔
حدیث میں ہے (۱۲۶) اِدْرَءُو الْحُدُوْدَ بِالشُّبُہَاتِ شرعی حدود کو شبہات سے دفع کرو اس میں تنبیہ کیا ہے کہ حدود کو دفع کرنے کے لئے حیلہ کرنا چاہیے
قرآن میں ہے:
فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِکُمُ الْمَوْتَ ....(۳-۱۶۸)
تو اپنے اوپر سے موت کو ٹال دینا۔
اور آیت کریمہ:
فَادّٰرَءْتُمْ فِیْہَا (۲-۷۲) تو اس میں تم باہم جھگڑنے لگے۔
میں اِدَّارَءْتُمْ اصل میں تَدَارَءْتُمْ ہے تخفیف کے لئے تاء کو دال سے بدل کر ادغام کر دیا گیا ہے اور شروع میں ابتدائے سکون کی وجہ سے ہمزہ وصلی لایا گیا ہے لہٰذا یہ اِفَّاعَلْتُمْ کے وزن پر ہے۔ بعض ادبا نے کہا ہے اِدَّارَءْتُمْ بروزن اِفْتَعَلْتُمْ ہے مگر یہ چند وجوہ کی بنا پر صحیح نہیں ہے۔ اوّل یہ کہ اِدَّارَءْتُمْ کے آٹھ حروف ہیں اور اِفْتَعَلْتُمْ کے صرف سات حرف ہیں۔ دوم یہ کہ اس میں ہمزہ وصلی کے بعد حرف تاء ہے جسے دال سے تبدیل کیا گیا ہے اور اِفْتَعَلْتُمْ میں ایسے نہیں ہے۔ سوم یہ کہ اگر اِفْتَعَلْتُمْ کے وزن پر ہوتا تو دوسرے حرف کے بعد دال کو تاء سے تبدیل کرنا چاہیے تھا۔ چہارم یہ کہ جس فعل کا عین کلمہ حرف صحیح ہو اس میں تاء افتعال کا مابعد ہمیشہ متحرک رہتا ہے۔ مگر یہاں اسے ساکن بنا لیا گیا ہے۔ پنجم یہ کہ یہاں تاء اور دال کے درمیان حرف زائد لایا گیا ہے۔ حالانکہ باب افتعال میں یہ نہیں ہوتا۔ ششم یہ کہ اسے باب افتعال سے ملنے کی صورت میں الف کو عین کلمہ ماننا پڑے گا۔ حالانکہ وہ موضع عین میں نہیں ہے۔ ہفتم یہ کہ دو حروف اِفْتَعَلَ کی تاء سے قبل ہیں اور اس کے بعد بھی دو ہی ہیں۔ مگر اِدَّارَءْتُمْ میں تاء کے بعد تین حروف ہیں۔

(د ر ج)

اَلدَّرَجَۃُ۔ کا لفظ منزلۃ کے ہم معنی ہے مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ مَنْزِلَۃٌ اترنے کی جگہ کو اور درجۃ اس وقت کہتے ہیں جب اس سے صعود یعنی اوپر چڑھنے کا اعتبار کیا جائے ورنہ بسیط جگہ پر امتداد کے اعتبار سے اسے درجۃ نہیں کہتے جیسا کہ چھت اور سیڑھی کے درجات ہوتے ہیں مگر کبھی اس کا اطلاق منزلہ رفیعہ یعنی

---

[۱] روی عن علی مرفوعاً لکنہ منکر و عن ابن مسعود موقوفاً وفی مسند ابی حنیفۃ الحارثی عن ابن عباس مرفوعاً وکذا عن عقبۃ بن عامر و معاذ و عمرو غیرہ احد من الصحابۃ لکن جملۃ الآثار لا تخلو عن ضعف او نکارۃ واصح ما فیہ قول ابن مسعود راجع النیل (۷-۱۱۰-۱۱۱) و بمعناہ فی ابن ماجۃ و عن عائشۃ فی الترمذی موقوفاً [۲] تاریخ الطبری ۱/۲۵۶-۲۵۷

بلند مرتبہ پر بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔
وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲-۲۲۸) البتہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔
میں تنبیہ کی ہے کہ عقل، سیاست وغیرہ کے اعتبار سے مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے جس کی طرف آیت:۔
اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (۴-۳۴) مرد عورتوں کے قوام اور منتظم ہیں۔ میں اشارہ پایا جاتا ہے۔
اور اہل جنت کے متعلق فرمایا:۔
لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (۸-۴) اور ان کے لئے پروردگار کے ہاں (بڑے بڑے) درجے ..... ہیں۔
هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ (۳-۱۶۳) یعنی وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں اصحاب درجات ہوں گے اور تشبیہ کے طور پر ستاروں کے منازل کو دَرَجَاتُ النُّجُوْمِ کہا جاتا ہے۔
مَدْرَجَةٌ۔ راستے کا وسط اور وسیع حصہ۔
فُلَانٌ يَتَدَرَّجُ فِي كَذَا فلاں اس پر درجہ بدرجہ چڑھ رہا ہے۔
دَرَجَ الشَّيْخُ وَالصَّبِيُّ دَرَجَانًا۔ بوڑھے اور بچے کا اس طرح آہستہ آہستہ چلنا جیسا کہ سیڑھی پر چڑھنے والا چلتا ہے۔
اَلدَّرْجُ۔ کتاب یا کپڑے کی تہ اور لپیٹے ہوئے مراسلہ یا کپڑے کو بھی دَرْج کہا جاتا ہے اور بطور استعارہ دَرْج بمعنی موت بھی آجاتا ہے۔ جیساکہ طَوَتْهُ الْمَنِيَّةُ میں طَيٌّ کا لفظ موت کے لئے مستعار ہے۔ اور محاورہ ہے:۔
مَنْ دَبَّ وَدَرَجَ یعنی جو زندہ اور چل پھر رہا ہے اور جو مر چکا ہے اور اس نے اپنے دفتر زندگی کو لپیٹ لیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ (۷-۱۸۲) ہم ان کو بتدریج اس طریق سے پکڑیں گے کہ ان کو معلوم نہ ہوگا۔
کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ ہم انہیں کتاب کی طرح لپیٹ لیں گے۔ یہ ان کی بے خبری اور غفلت سے کنایہ ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا (۱۸-۲۸) اور جس شخص کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے ..... اس کا کہنا نہ ماننا۔
بعض نے سَنَسْتَدْرِجُهُمْ کے معنی یہ کئے ہیں کہ ہم انہیں بتدریج پکڑیں گے بایں طور کہ انہیں آہستہ آہستہ کسی چیز (جہنم) کے قریب لارہے ہیں جیسا کہ سیڑھیوں اور منزلوں پر چڑھا یا ان سے نیچے اترا جاتا ہے۔
دُرْجٌ۔ چھوٹا سا تھیلا جس میں عورتیں خوشبو اور سنگار کا دیگر سامان رکھتی ہیں۔ اَلدُّرْجَةُ۔ وہ لتہ جسے لپیٹ کر ناقہ کی کس میں رکھ دیا جاتا ہے
اَلدُّرَّاجُ تیتر کیونکہ وہ بھی آہستہ آہستہ چلتا ہے۔

(د ر س)

دَرَسَ الدَّارُ۔ گھر کے نشان باقی رہ گئے اور نشان کا باقی رہنا چونکہ شے کے فی ذاتہ مٹنے کو چاہتا ہے اس لئے دُرُوْسٌ کے معنی اِنْمِحَاءٌ یعنی مٹ جانا کر لئے جاتے ہیں اسی طرح دَرَسْتُ الْكِتَابَ وَالْعِلْمَ کے اصل معنی کتاب یا علم کو حفظ کر کے اس کا اثر لے لینے کے ہیں اور اثر کا حاصل ہونا مسلسل قراءت کے بغیر ممکن نہیں اس لئے دَرَسْتُ الْكِتَابَ کے معنی

سلسل پڑھنا کے آتے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔
وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ (۷-۱۶۹) اور جو کچھ اس (کتاب) میں ہے اس کو انہوں نے پڑھ بھی لیا ہے۔
بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳-۷۹) کیونکہ تم کتاب (خدا کی) تعلیم دینے اور اسے پڑھتے پڑھاتے رہتے ہو۔
وَمَا اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ كُتُبٍ يَّدْرُسُوْنَهَا (۳۴-۴۴) اور ہم نے نہ تو ان کو کتابیں دیں جن کو یہ پڑھتے ہیں۔
اور آیت کریمہ :۔
وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ (۶-۱۰۵) میں ایک قراءت دَارَسْتَ بھی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ کافر یہ نہ کہیں کہ تم نے کتاب کو دوسروں سے پڑھ لیا۔
بعض نے کہا ہے وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ (۷-۱۶۹) کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اس پر عمل ترک کر دیا اور یہ دَرَسَ الْقَوْمُ الْمَكَانَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے۔ یعنی انہوں نے مکان کے نشانات مٹا دیئے۔
دَرَسَتِ الْمَرْءَةُ (کنایہ) عورت کا حائضہ ہونا۔
دَرَسَ الْبَعِيْرُ۔ اونٹ کے جسم پر خارش کے اثرات ظاہر ہونا۔

(د ر ك)

اَلدَّرْكُ اور دَرَجٌ کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن اَلدَّرَجُ کا لفظ اوپر چڑھنے کے اعتبار سے بولا جاتا ہے اور اَلدَّرْكُ کا لفظ نیچے اترنے کے لحاظ سے اس لئے دَرَجَاتُ الْجَنَّةِ اور دَرَكَاتُ النَّارِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جیسا کہ پستی کے اعتبار سے دوزخ کو ھَاوِيَةٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۴-۱۴۵) کچھ شک نہیں کہ منافق لوگ دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ہوں گے۔
اور سمندر کی گہرائی کی تہہ اور اس رسی کو جس کے ساتھ پانی تک پہنچنے کے لئے دوسری رسی ملائی جاتی ہے، بھی دَرَكٌ کہا جاتا ہے۔ اور دَرَكٌ بمعنی تاوان بھی آتا ہے مثلاً خرید و فروخت میں بیعانہ کو دَرَكٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔
لَا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى (۲۰-۷۷) پھر تم کو نہ تو (فرعون کے) آپکڑنے کا خوف ہوگا اور نہ (غرق ہونے کا) ڈر۔
اَدْرَكَ۔ کسی چیز کی غایت کو پہنچنا، یا لینا جیسے اَدْرَكَ الصَّبِيُّ لڑکا بچپن کی آخری حد کو پہنچ گیا یعنی بالغ ہوگیا۔ قرآن میں ہے :۔
حَتّٰۤى اِذَاۤ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ (۱۰-۹۰) یہاں تک کہ اس کو غرق (کے عذاب) نے آپکڑا۔
اور آیت کریمہ :۔
لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (۶-۱۰۳) (وہ ایسا ہے کہ) نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ کو بعض نے ادراک بصری کی نفی پر حمل کیا ہے اور بعض نے ادراک کی نفی بلحاظ بصیرت مراد لی ہے اور کہا ہے کہ اس آیت سے اس معنی پر تنبیہ کی ہے جو کہ حضرت ابوبکرؓ کے قول "يَا مَنْ غَايَةُ مَعْرِفَتِهِ الْقُصُوْرُ عَنْ مَعْرِفَتِهِ" (اے وہ ذات جس کی غایت معرفت بھی اس کی معرفت سے کوتاہی کا نام ہے) میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کی غایت یہ ہے کہ انسان کو تمام اشیاء کا کما حقہٗ علم حاصل ہونے کے بعد یہ یقین ہو جائے کہ ذات باری تعالیٰ نہ کسی کی جنس ہے اور نہ ہی کسی چیز کی مثل ہے بلکہ وہ ان تمام چیزوں کی موجد ہے

لِتَتَدَارُكُ ۔ (پالینا) یہ زیادہ تر نعمت اور فریاد رسی کے لیئے استعمال ہوتا ہے ۔ قرآن میں ہے :-

لَوْلَا اَنْ تَدَارَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (۶۸-۴۹)

اگر تمہارے پروردگار کی مہربانی ان کی یاوری نہ کرتی ۔

اور آیت کریمہ :-

حَتّٰی اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا (۷-۳۸)

یہاں تک کہ جب سب اس میں داخل ہو جائیں گے ۔

کے معنی یہ ہیں کہ جب سب کے سب اس میں ایک دوسرے کو آملیں گے ۔ پس اِدَّارَكُوْا اصل میں تَدَارَكُوْا ہے ۔ اسی طرح آیت کریمہ :-

بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ (۲۷-۶۶)

بلکہ آخرت (کے بارے) میں انکا علم منتہی ہو چکا ہے ۔

میں اِدَّارَكَ اصل میں تَدَارَكَ ہے تاء کو دال میں ادغام کرنے کے بعد ابتدائے سکون کی وجہ سے ہمزہ وصل لایا گیا ہے جس طرح کہ آیات :-

اِثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ (۹-۳۸) اور اِطَّيَّرْنَا بِكَ (۲۷-۴۷) میں ہے ایک قراءت میں بَلْ اَدْرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ہے حسنؒ نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ امور آخرت سے سراسر غافل ہیں، مگر اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ آخرت کو پالینے سے انکا علم منتہی ہو چکا ہے اس بنا پر وہ اس سے جاہل اور بے خبر ہیں ۔ بعض نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ انہیں آخرت میں ان چیزوں کی حقیقت معلوم ہو جائیگی کیونکہ دنیا میں جو چیزیں محض ظنون نظر آتی ہیں آخرت میں ان کے متعلق یقین حاصل ہو جائے گا ۔

(د ر ھ م)

اَلدِّرْهَمُ ۔ چاندی کے ایک سکہ کا نام ہے اسکی جمع دَرَاهِمُ ہے ۔ قرآن میں ہے :-

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ (۱۲-۲۰)

اور اسکو تھوڑی سی قیمت (یعنی) معدودے چند درہموں پر بیچ ڈالا ۔

(د ر ی)

اَلدِّرَايَةُ اس معرفت کو کہتے ہیں جو کسی قسم کے حیلہ یا تدبیر سے حاصل کی جائے اور بہ دَرَيْتُهٗ وَدَرَيْتُ بِهٖ دِرْيَةً دونوں طرح استعمال ہوتا ہے (یعنی اس کا تعدیہ باء کے ساتھ بھی ہوتا ہے ۔ اور باء کے بغیر بھی) جیسا کہ فَطِنْتُ وَشَعَرْتُ ہے اور اَدْرَيْتُ بمعنی دَرَيْتُ آتا ہے ۔ شاعر نے کہا ہے[1] ع (الوافر)

(۱۵۲) وَمَاذَا يَدَّرِي الشُّعَرَاءُ مِنِّي
وَقَدْ جَاوَزْتُ رَاْسَ الْاَرْبَعِيْنَ

اور شعراء مجھے کیسے دھوکہ دے سکتے ہیں جب کہ میں چالیس سے تجاوز کر چکا ہوں ۔ قرآن میں ہے ۔

لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا (۶۵-۱) تجھے کیا معلوم شاید خدا اس کے بعد کوئی رجعت کی سبیل پیدا کردے ۔

وَاِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ (۲۱-۱۱۱) اور میں نہیں جانتا شاید وہ تمہارے لئے آزمائش ہو ۔

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ (۴۲-۵۲) تم نہ تو کتاب کو جانتے تھے ۔

اور قرآن پاک میں جہاں کہیں وَمَا اَدْرٰكَ آیا ہے

---

[1] قالہ سحیم بن وثیل الریاحی وفی اللسان والمحکم وطبع ، اخر بدل رأس والبیت فی البحتری ۲۵ والکامل ۵۰۴ وفی ترجمتہ فی الاصابۃ (۲: ۱۱۰) والسمط (۵۰۸) والسیوطی ۱۷۵ والعینی (۱: ۱۹۱) والخزانۃ (۱: ۱۲۶) والاصمعیات ۷۳ واصلاح یعقوب ۵۶ ونقد الشعر، وفیہ ینتغی بدل یدری ومجالس ثعلب ۱۷۶ والاشباہ (۴: ۱۵۲) والبیت کانہ نقیدۃ القافیۃ فیہ اقواء ولیعدہ : - اخو خمسین مجتمع اشدی ونجذنی مداورۃ الشئون ۱۲ ؛

وہاں بعد میں اس کا بیان بھی لایا گیا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَمَا اَدْرٰكَ مَا هِيَهْ۔ نَارٌ حَامِيَةٌ (۱۰۱-۱۰-۱۱)
اور تم کیا سمجھے کہ ہاویہ کیا ہے؟ (وہ) دھکتی ہوئی آگ ہے۔
وَمَا اَدْرٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ لَيْلَةُ الْقَدْرِ (۹۷-۲-۳) اور تمہیں کیا معلوم کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر۔
وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْحَاقَّةُ (۶۹-۳) اور تم کو کیا معلوم ہے کہ سچ مچ ہونے والی کیا چیز ہے؟
ثُمَّ مَا اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ (۸۲-۱۷)
اور تمہیں کیا معلوم کہ جزا کا دن کیسا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ۔ (۱۰-۱۶) (یہ بھی) کہہ دو کہ اگر خدا چاہتا تو (نہ تو) میں ہی یہ کتاب تم کو پڑھ کر سناتا اور نہ ہی تمہیں اس سے واقف کرتا۔
میں اَدْرٰىكُمْ دَرَيْتُ سے ہے کیونکہ اگر دَرَأْتُ سے ہوتا تو وَلَا اَدْرَأْتُكُمُوْهُ کہا جاتا[1]۔ اور جہاں کہیں قرآن میں وَمَا يُدْرِيْكَ آیا ہے اس کے بعد اس کا بیان مذکور نہیں ہے[2] (جیسے فرمایا) وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى (۸۰-۳)۔ اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا۔
وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ (۴۲-۱۷)
اور تم کو کیا معلوم شاید قیامت قریب ہی آ پہنچی ہو۔
یہی وجہ ہے کہ دِرَايَةٌ کا لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال نہیں ہوتا اور شاعر کا قول[3] (ع) (

(۱۵۳) لَاهُمَّ لَآ اَدْرِيْ وَاَنْتَ الدَّارِيْ
اے اللہ میں نہیں جانتا اور تو خوب جانتا ہے۔
میں جو اَنْتَ الدَّارِيْ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال ہوا ہے تو یہ بے سمجھ اور اجڈ بدو کا قول ہے (للہذا حجت نہیں ہو سکتا)
اَلْمِدْرَيَةُ (۱) ایک قسم کا حلقہ جس پر نشانہ بازی کی مشق کی جاتی ہے۔
(۲) وہ اونٹنی جسے شکار کو مانوس کرنے کے لئے کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اور شکاری اس کی اوٹ میں بیٹھ جاتا ہے تاکہ شکار کر سکے۔
اَلْمِدْرٰى (۱) بکری کا سینگ کیونکہ وہ اس کے ذریعہ مدافعت کرتی ہے۔ اسی سے استعارۃً کنگھی یا باریک سینگ کو مدری کہا جاتا ہے[4]۔ جس سے عورتیں اپنے بال درست کرتی ہیں۔

(د س ر)

اَلدُّسُرُ: میخیں اس کا واحد دِسَارٌ ہے قرآن میں ہے:۔
وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ (۵۴-۱۳)
اور ہم نے نوحؑ کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میخوں سے تیار کی گئی تھی سوار کر لیا۔
اصل میں دَسْرٌ کے معنی کسی چیز کو زور سے مار کر ہٹا دینے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔ دَسَرَهٗ بِالرُّمْحِ۔ اسے نیزہ مار کر پیچھے ہٹا دیا اور رَجُلٌ (

---

[1] وفی الصحاح: وقرئ ولا أدرأتکم بہ، والوجہ فیہ ترک الھمزۃ (راھ) وفی اعراب ثلاثین ھمزۃ الحسن البصری فی بعض الآیات وکذب النحویین وکذا الاختلاف فی الدریۃ۔ قال ابوزید ہو جمہور ولکن الجمہور علی ترک الھمزۃ [2] منقول عن الفراء راجع اعراب ثلاثین لابن خالویہ ۵۰
[3] البیت فی الصحاح واللسان (دری) لھم، وتمامہ... کل مریٔ منک علی مقدار ۱۲ [4] وفی الحدیث ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان فی یدہ مدری یحک بہ راسہ (الفائق ۱/۱۹۶)

مِطْعَنٌ کی طرح مِدَسٌّ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی بہت بڑے نیزہ بان کے ہیں۔ ایک روایت میں ہے[1] (۱۲۷)

لَيْسَ فِي الْعَنْبَرِ زَكٰوةٌ اِنَّمَا هُوَ شَيْءٌ دَسَرَهُ الْبَحْرُ کہ عنبر میں زکوٰۃ نہیں ہے وہ ایک چیز ہے جسے سمندر کنارے پر پھینک دیتا ہے۔

(د س س)

اَلدَّسُّ (ن) کے معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں زبردستی داخل کر دینے کے ہیں کہا جاتا ہے۔ دَسَسْتُهٗ فَدَسَّ۔ میں نے اسے ٹھونسا تو وہ ٹھنس گیا[2]

دُسَّ الْبَعِيْرُ بِالْهِنَاءِ۔ اونٹ پر زبردستی قطران ملی گئی۔

بعض کہتے ہیں کہ قطران کے متعلق دَسٌّ کا لفظ استعمال نہیں ہوتا۔ قرآن میں ہے:۔

اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ (۱۶-۵۹) یا زمین میں گاڑ دی۔

(د س ی)

دَسّٰی (تفعیل) کے معنی کسی چیز کو مٹی میں چھپا دینے اور گم کر دینے کے ہیں۔ یہ اصل میں دَسَّسَ تھا تخفیف کے لئے ایک سین کو یاء سے تبدیل کر دیا گیا ہے جیسا کہ تَظَنَّنْتُ سے تَظَنَّيْتُ بنا لیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (۹۱-۱۰) اور جس نے اسے دبا دیا وہ نامراد اور ناکام رہا۔

(د ع ع)

اَلدَّعُّ کے معنی سختی کے ساتھ دھکا دینے کے ہیں۔ اصل میں یہ کلمہ زجر ہے جس طرح پھسلنے والے کو دبطور دعا لَعًا کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دَعْدَعْ بھی کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا (۵۲-۱۳) جس دن وہ آتش جہنم کی طرف نہایت سختی سے دھکیلے جائیں گے۔

فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ (۱۰۷-۲) یہ وہی (بدبخت) ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

شاعر نے کہا ہے[3] (   )

(۱۴۵) دَعَّ الْوَصِيِّ عَلٰى قَفَاءِ يَتِيْمِهٖ

جیسا کہ وصی یتیم کی گدی پر گھونسا مارتا اور اسے دھکے دیتا ہے۔

(د ع و)

اَلدُّعَاءُ (ن) کے معنی ندا کے ہیں مگر ندا کا لفظ کبھی صرف یَا، اَیَا وغیرہما حروف ندا پر بولا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کے بعد منادٰی مذکور نہ ہو لیکن دُعاء کا لفظ صرف اس وقت بولا جاتا ہے جب حرف ندا کے ساتھ اسم (منادٰی) بھی مذکور ہو جیسے:۔ یَا فُلَانُ۔ کبھی یہ دونوں یعنی دعاء اور نداء ایک دوسرے کی جگہ پر بولے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاءً وَّنِدَاءً (۲-۱۷۱) ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سن سکے۔

اور کبھی دُعاء بمعنی تسمیہ (نام رکھنا) آجاتا ہے

---

[1] الحدیث موقوف علی ابن عباس راجع الفائق ار ۱۹۷ وبحث عنہ صاحب الامالی وعنہ ایضا لیس العنبر برکاز راجع البخاری مع الفتح ۳ر ۱۰۵ [2] وفی الحدیث العرق دساس من روایۃ ابن عمر دالفائق ار ۲۲۲ [3] لم اجدہ وبیحکی [4] قارن الفتح للحافظ ۱۲ر ۳۳۸

جیسے دَعْوَتُ ابْنِیْ زَیْدًا [1] میں نے اپنے لڑکے کا نام زید رکھا۔ اور آنحضرتؐ کی تعظیم پر رغبت دلاتے ہوئے فرمایا [2]:۔

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَآءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا۔ (۲۴-۶۳) مومنو! پیغمبر کے بلانے کو ایسا خیال نہ کرنا جیسا تم آپس میں ایک دوسرے کو بلاتے ہو۔

کیونکہ بعض لوگ آنحضرتؐ سے مخاطبت کے وقت آپ کو "یا محمدؐ" کہہ کر پکارتے تھے۔

اور دَعْوَتُہٗ کے معنی سوال یا مدد طلب کرنا بھی آتے ہیں [3]۔ قرآن میں ہے :۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ۔ انہوں نے کہا (اب کے) اپنے پروردگار سے پھر درخواست کیجیے۔

اور آیت کریمہ :۔

قُلْ اَرَاَیْتَکُمْ اِنْ اَتٰکُمْ عَذَابُ اللّٰہِ اَوْ اَتَتْکُمُ السَّاعَۃُ اَغَیْرَ اللّٰہِ تَدْعُوْنَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔ بَلْ اِیَّاہُ تَدْعُوْنَ۔

(۶-۴۰-۴۱) کہو (کافرو) بھلا دیکھو تو اگر تم پر خدا کا عذاب آ جائے یا قیامت آموجود ہو تو کیا تم (ایسی حالت میں) خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے؟ اگر سچے ہو (تو بتاؤ) (نہیں) بلکہ (مصیبت کے وقت تم) اسی کو پکارتے ہو۔

میں تنبیہ کی ہے کہ جب تمہیں کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا اور عاجزی کرتے ہو۔

وَادْعُوْا رَبَّکُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا۔ (۷-۵۶) اور خدا سے خوف کرتے ہوئے اور امید رکھ کر دعائیں مانگتے رہنا۔

وَادْعُوْا شُھَدَآءَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۲-۲۳) اور خدا کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں ان کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّہٗ مُنِیْبًا اِلَیْہِ۔ (۳۹-۸) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے پروردگار کو پکارتا (اور) اس کی طرف دل سے رجوع کرتا ہے۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِہٖ (۱۰-۱۲) اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹا ہمیں پکارتا ہے۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنْفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ۔ (۱۰-۱۰۶) اور خدا کو چھوڑ کر ایسی چیز کو نہ پکارنا جو نہ تمہارا بھلا کر سکے اور نہ کچھ بگاڑ سکے۔

اور آیت کریمہ :۔

لَا تَدْعُوا الْیَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا کَثِیْرًا۔ (۲۵-۱۴) آج ایک ہی موت کو نہ پکارو بہت سی موتوں کو پکارو۔

دعائے ثبور سے یَا لَھْفَاہ یا حَسْرَتَاہ وغیرہ کلمات تاسف کہنا اور واویلا کرنا مراد ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ آج تم پر ایک مصیبت نہیں ہے بلکہ بہت سے غموم و مصائب کا سامنا ہوگا۔

اَلدُّعَآءُ (اِلَی الشَّیْءِ) کے معنی کسی چیز کا قصد کرنے پر رغبت دلانے اور اکسانے کے ہیں۔

---

[1] کذا ذکرالحافظ فی الفتح ۱۳ / ۳۴۸ [2] وجملۃ القول ان لفظ الدعاء جاء فی القرآن لستۃ معان العبادۃ ولم یذکرہ المؤلف والآیۃ ادعونی استجب لکم بمعنی العبادۃ بدل مابعدہا والاستغاثۃ والسوال والقول والنداء والثناء راجع شرح الاسماء الحسنٰی لابی القاسم القشیری [3] وایضًا دعا بمعنی جعل کما فی قولہ تعالیٰ : اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا (۱۹-۹۱)

قرآن میں ہے :-

رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ (۱۲ - ۳۳) کہ پروردگار جس کام کی طرف یہ مجھے بلاتی ہیں اس کی نسبت مجھے قید پسند ہے۔

وَاللّٰهُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ (۱۰ - ۲۵) اور خدا سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

وَیٰقَوْمِ مَالِیْٓ اَدْعُوْکُمْ اِلَی النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَی النَّارِ تَدْعُوْنَنِیْ لِاَکْفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشْرِکَ بِهٖ. (۴۰ - ۴۱، ۴۲) اور اے قوم میرا حال ہے کہ میں تو تم کو نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی) آگ کی طرف بلاتے ہو، تم مجھے اس لئے بلاتے ہو کہ خدا کے ساتھ کفر کروں اور ....

.... اس کا شریک مقرر کروں۔

اور آیت کریمہ :-

لَا جَرَمَ اَنَّ مَا تَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ۔ (۴۰ - ۴۳) سچ تو یہ ہے کہ جس چیز کی طرف تم مجھے بلاتے ہو اس کو دنیا اور آخرت میں بلانے (یعنی دعا قبول کرنے) کا مقدور نہیں ہے۔

میں دَعْوَةٌ کے معنی رفعت اور عظمت کے ہیں[1]

اَلدِّعْوَةُ - کے معنی خاص کر نسب کا دعوی کرنے کے آتے ہیں۔ اصل میں یہ قِعْدَةٌ وَجِلْسَةٌ کی طرح فِعْلَةٌ کے وزن پر ہے جو حالت کے لئے آتا ہے۔ مثل مشہور ہے :-

دَعْ دَاعِیَ اللَّبَنِ (مثل) یعنی دودھ اتارنے کے لئے تھوڑا سا دودھ تھنوں میں چھوڑ دیجئے۔

اَلْاِدِّعَاءُ کے معنی کسی چیز کے متعلق دعوی کرنے کے ہیں (کہ یہ میری ہے) اور جنگ میں اِدِّعَاءٌ کے معنی اپنے کو کسی طرف منسوب کرنا ہوتے ہیں[2] (کہ میں فلاں قوم سے ہوں یا فلاں کا بیٹا ہوں وغیرہ)

اور آیت کریمہ :-

وَلَکُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ٭ نُزُلًا (۴۱ - ۳۱) اور جو چیز طلب کرو گے تمہارے لئے (موجود ہوگی یہ) مہمانی ہے۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم جنت میں جو چیز طلب کرو گے حاضر کر دی جائے گی۔

اور دَعْوٰی کبھی بمعنی اِدِّعَاءٌ بھی آجاتا ہے۔

جیسے فرمایا :-

فَمَا کَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ (۷ - ۵) تو جس وقت ان پر عذاب آتا تھا ان کے منہ سے یہی نکلتا تھا۔

اور کبھی بمعنی دعا کے[3] جیسے فرمایا :-

وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (۱۰ - ۱۰) اور ان کا آخری قول یہ (ہوگا) کہ خدائے رب العلمین کی حمد (اور اس کا شکر) ہے۔

(د ف ء)

اَلدِّفْءُ - گرمی، حرارت یہ بَرْدٌ (سردی) کی ضد ہے۔ اور آیت کریمہ :-

لَکُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ (۱۶ - ۵) ان میں تمہارے لئے جڑاول اور بہت سے فائدے ہیں۔

میں دِفْءٌ سے جاڑے کا سامان مراد ہے۔

رَجُلٌ دِفْاٰنِ (مؤنث دِفْاٰئی) گرمی حاصل کرنیوالا۔

---

[1] کذا نقل عن السلف الحافظ فی الفتح (۱۳ - ۳۳۸) [2] امر صلی اللہ علیہ وسلم ضرار بن ازور ان یحلب ناقة فقال له دار الفائق ۱/۴۱۹ والنہایہ (دعا) وغریب ابی عبید [3] کما قال صلی اللہ علیہ وسلم یوم الاحد انا ابن عبد المطلب ومن الدعوة الدعیٰ وجمعه ادعیاء (۳۳ - ۴) [4] والدعوی ہہنا بمعنی القول راجع الفتح للحافظ ۱۳/ ۳۳۸

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

بَيْتٌ دَفِيْئٌ گرم مکان۔

(د ف ع)

اَلدَّفْعُ (دفع کرنا، ہٹا دینا) جب اس کا تعدیہ بذریعہ اِلیٰ ہو تو اس کے معنی دے دینے اور حوالے کر دینا ہوتے ہیں جیسے فرمایا:۔

فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (۴-۶) تو ان کا مال ان کے حوالے کر دو۔

اور جب بذریعہ عَنْ متعدی ہو تو اس کے معنی مدافعت اور حمایت کرنا ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (۲۲-۳۸) خدا تو مومنوں سے ان کے دشمنوں کو ہٹاتا رہتا ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ (۲-۲۵۱) اور خدا لوگوں کو ایک دوسرے (پر چڑھائی اور حملہ کرنے) سے ہٹاتا نہ رہتا۔

اور آیت کریمہ:۔

لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ (۷۰:۲-۳) کوئی اس کو ٹال نہ سکے گا۔ (اور وہ) خدائے صاحب درجات کی طرف سے (نازل ہوگا)

میں دَافِعٌ کے معنی حامی اور محافظ کے ہیں۔

اَلْمُدَفَّعُ ہر جگہ سے دھتکارا ہوا۔ ذلیل اور رسوا۔

اَلدُّفْعَةُ۔ بارش کی بوچھاڑ۔ اَلدُّفَّاعُ سیلاب کا زور۔

(د ف ق)

اَلدَّفْقُ (مصدر ن) کے معنی سرعت کے ساتھ بہنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ۔ (اچھل کر تیزی سے گرنے والے پانی سے۔ (۸۶-۶)

اسی سے بطور استعارہ جَآءُوْا دُفْعَةً۔ (وہ یکبارگی آ گئے) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور تیز رفتار اونٹ کو بَعِيْرٌ اَدْفَقُ کہتے ہیں۔

مَشْيُ الدِّفِقَّى اس طرح تیز رفتاری سے چلنا جیسے زور سے بہنے والا پانی اچھل کر گرتا ہے اور بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔

مَشَوْا دِفَقًا۔ وہ تیز چلے۔

(د ك ك)

اَلدَّكُّ (اسم) کے معنی نرم اور ہموار زمین کے ہیں۔ اور دَكَّهٗ (ن) دَكًّا کے معنی کوٹ کر ہموار کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً (۶۹-۱۴) اور زمین اور پہاڑ دونوں اٹھا لئے جائیں گے پھر ایک بارگی توڑ کر برابر کر دیئے جائیں گے۔

وَدُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا (۸۹-۲۱)[1] یعنی زمین کوٹ کوٹ کر ہموار کر دی جائیگی۔

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا (۷-۱۴۳) جب ان کا پروردگار پہاڑ پر نمودار ہوا تو (تجلی انوار ربانی نے) اس کو ریزہ ریزہ کر دیا۔

اور اسی سے دُكَّان ہے جس کے معنی ہموار چبوترہ کے ہیں۔

اَلدَّكْدَاكُ۔ نرم ریت۔ اَرْضٌ دَكَّاءُ ہموار زمین۔ ج دُكٌّ۔ اور ہموار زمین کے ساتھ تشبیہ دے کر نَاقَةٌ دَكَّاءُ اس اونٹنی کو کہہ دیتے ہیں جس کی کوہان نہ ہو۔[2]

---

[1] وفی المطبوع الجبال مکان الارض خطأ مطبعی ۱۲ [2] قارن المجاز لابی عبیدہ (۱/۳۱۵)

(د ل ل)

اَلدَّلَالَةُ۔ جس کے ذریعہ کسی چیز کی معرفت حاصل ہو جیسے الفاظ کا معانی پر دلالت کرنا اور اشارات ورموز اور کتابت کا اپنے مفہوم پر دلالت کرنا اور حساب میں عقود کا عدد مخصوص پر دلالت کرنا وغیرہ اور پھر دلالت عام ہے کہ جاعل یعنی واضع کی وضع سے ہو یا بغیر وضع اور قصد کے ہو مثلاً ایک شخص کسی انسان میں حرکت دیکھ کر جھٹ جان لیتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ (۳۴-۱۴)
تو کسی چیز سے ان کا مرنا معلوم نہ ہوا مگر گھن کے کیڑے سے۔
اصل میں دَلَالَةٌ کا لفظ کِتَابَةٌ وَاِمَارَةٌ کی طرح مصدر ہے۔ اور اسی سے دَالٌّ صیغہ صفت فاعل ہے یعنی وہ جس سے دلالت حاصل ہو اور دَلِیْلٌ صیغۂ مبالغہ ہے جیسے عَالِمٌ وَعَلِیْمٌ وَقَدِیْرٌ[1] ہے۔ کبھی دَالٌّ وَدَلِیْلٌ بمعنی دَلَالَةٌ (مصدر) آجاتے ہیں اور یہ تَسْمِیَةُ الشَّیْءِ بِمَصْدَرِہٖ کے قبیل سے ہے۔

(د ل ك)

دُلُوْكُ (الشَّمْسِ) کے معنی ہیں آفتاب کا (زوال) مائل بہ غروب ہونا۔ قرآن میں ہے:۔
اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ[2] (۱۷-۷۸) (اے محمدؐ) سورج کے ڈھلنے سے.... نماز.... پڑھا کرو۔

یہ اصل میں دلکتُ الشمس کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں کوئی چیز دیکھنے کے لئے آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھ کر دھوپ کو دفع کرنا۔ اور اسی سے دَلَکْتُ الشَّیْءَ فِی الرَّاحَةِ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی چیز کو ہتھیلی میں لے کر ملنے کے ہیں۔ دَلَکْتُ الرَّجُلَ لیت لعل کرنا۔
اَلدَّلُوْكُ۔ ایک قسم کی خوشبو جسے بدن پر ملا جاتا ہے۔
اَلدَّلِیْكُ۔ ایک قسم کا کھانا جو مسکہ اور کھجور سے تیار ہوتا ہے۔

(د ل و)

دَلَوْتُ الدَّلْوَ۔ کے معنی کنویں میں ڈول ڈالنے کے ہیں اور اَدْلَیْتُهَا کے معنی ڈول بھر کر نکالنے کے ابومنصور نے لکھا ہے کہ۔ اَدْلٰی کے معنی ڈول کنویں میں ڈالنے کے آجاتے ہیں۔ قرآن میں ہے[1]:۔
فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ (۱۲-۱۹) اس نے کنویں میں ڈول لٹکایا۔
اسی سے بطور استعارہ اَدْلٰی کے معنی کسی چیز تک پہنچنے کے لئے ذریعہ بنانا بھی آجاتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[3] ع (

(۱۵۵) وَلَيْسَ الرِّزْقُ عَنْ طَلَبٍ حَثِيْثٍ
وَلٰكِنْ اَلْقِ دَلْوَكَ فِی الدِّلَاءِ۔

رزق جدوجہد سے حاصل نہیں ہوتا ہاں تمہیں اس کے لئے وسائل تلاش کرنا چاہیئے۔ اسی بنا پر وسیلہ کو مَاتِحٌ[4] کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے ع (الطویل)

---

[1] وفی التنزیل ثم جعلنا الشمس علیہ دلیلا (۲۵-۴۵)، [2] راجع تاج المصادر للامام جعفر البیہقی [3] البیت فی محاضرات المؤلف (۲: ۲۹۴) وفی روایۃ: دما طلب المعیشۃ بالتمنی ..... ومجموعۃ المعانی ۳۰ والمیدانی رقم ۴۳۲۲ مع آخر ولم ارفی المراجع من نسبہ [4] قالہ العجیبا السلولی ومعنی بالمائح لسانہ وفی اللسان (میح) المائح یملی الناس ویعلی بادل معلی والدلاۃ بدل الطوی والبیت فی المحکم (میح) ومجالس ثعلب (۲: ۴۲۲) فی نسعۃ والازمنۃ والامکنۃ (۲: ۱۵۹) وہی قصیدۃ فی الاغانی انشدہا الشاعر بین یدی عبدالملک بن مروان والعجیر ہو عمیر بن عبداللہ بن عبیدۃ شاعر مقل وکان خبیثا راجع الاغانی (۱۱: ۱۴۶-۱۵۳) والخزانۃ (۲: ۳۹۹) وابن السلام (۱۹۹-۲۰۰)

(۱۵۶) وَلِي مَآرِبُ لَمْ يُؤَدِّ النَّاسُ قَبْلَهُ
مُعَلًّى وَأَشْطَانُ الطَّوِيِّ كَثِيرٌ
میرے پاس اظہار مطلب کے لئے ایسا بلند قدر
وسیلہ ہے جو اچھوتے مضامین بیان کرتا ہے
اور گفتگو کے اسباب بہت ہیں اور قرآن میں ہے :۔
وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ (۲-۱۸۸)۔ اور نہ ان
اموال کے ذریعہ رشوت دیکر حکام تک رسائی حاصل کرو۔
اَلتَّدَلِّي (تفعل) قریب ہونا اور اترآنا۔ قرآن میں ہے:۔
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى (۵۳-۸) پھر قریب ہوئے اور
آگے بڑھے۔

(د م د م)

اَلدَّمْدَمَةُ (فعللۃ) ہلاک کرنا۔ اور آیت:۔
فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ (۹۱-۱۴)۔ کے معنی یہ
ہیں کہ خدا نے انہیں ہلاک کر ڈالا اور پریشان و بے
چین کر دیا۔
بعض نے کہا ہے کہ دَمْدَمَةٌ (اسم صوت ہے
اور) بلی کی آواز کی حکایت کو کہتے ہیں۔ اسی سے
دَمْدَمَ فُلَانٌ فِي كَلَامِهِ کا محاورہ ہے یعنی اس
نے پریشان کن سی گفتگو کی۔ دَمَمْتُ الثَّوْبَ کپڑے
کو رنگ سے طلا کرنا۔
اَلدِّمَامُ۔ ہر وہ چیز جس سے طلا کی جائے۔
بَعِيرٌ مَدْمُومٌ بِالشَّحْمِ۔ بہت موٹا اور چربی
والا اونٹ گویا چربی اس پر طلا کی گئی ہے۔
اَلدَّامَّاءُ وَالدُّمَمَةُ۔ جنگلی چوہے کا بل۔
اَلدَّامَاءُ (تخفیف میم) وَالدَّهُومَةُ صحرا۔ ریگستان۔

(د م ر)

اَلتَّدْمِيرُ (تفعیل) کے معنی ہیں کسی چیز پر
ہلاکت لا ڈالنا۔ قرآن میں ہے:۔
فَدَمَّرْنَاهُمْ تَدْمِيرًا (۲۵-۳۶) اور ہم نے
انہیں ہلاک کر ڈالا۔
ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ (۲۶-۱۷۲) پھر ہم نے
اوروں کو ہلاک کر دیا۔
وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ
وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ (۷-۱۳۷) اور فرعون
اور قوم فرعون جو محل بناتے اور انگور کے
باغ (جو چھتریوں پر چڑھاتے تھے سب کو
ہم نے تباہ و برباد کر دیا۔
اور آیت کریمہ:۔
دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (۴۷-۱۰) خدا نے
ان پر تباہی ڈال دی۔
میں دَمَّرَ کا مفعول محذوف ہے۔
محاورہ ہے:۔ مَا بِالدَّارِ تَدْمُرِيٌّ۔ یعنی
گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔

(د م ع)

دَمَعَتْ (ف) الْعَيْنُ دَمْعًا وَدَمَعَانًا
آنسو جاری ہونا۔ قرآن میں ہے:۔
تَوَلَّوْا وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ
حَزَنًا (۹-۹۲) تو وہ لوٹ گئے۔ اور اس غم
سے ۔ ۔ ۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔
معلوم ہوا کہ الدمع اسم بھی آتا ہے جس کے معنی
ہیں آنسو اور (باب مذکور کا) مصدر بھی۔

(د م غ)

اَلدَّمْغُ (ف) کے اصل معنی دماغ پھوڑ
دینے کے ہیں (اس سے نیست و نابود کرنے

کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، قرآن میں ہے:۔
بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ (۲۱-۱۸) (نہیں) بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا مغز توڑ دیتا ہے۔
حُجَّةٌ دَامِغَةٌ۔ حجت قاطع۔ سر پھوڑ دلیل۔
نیز دَامِغَةٌ۔ ایک قسم کے شگوفہ کو کہتے ہیں جو کھجور کے تنا سے پھوٹ نکلتا ہے۔ اگر اسے کاٹا نہ جائے تو کھجور کے درخت کو خشک اور خراب کر دیتا ہے نیز دَامِغَةٌ اس لوہے کو بھی کہتے ہیں جو پالان کی لکڑی کے پیچھے لگا دیا جاتا ہے۔
یہ تمام الفاظ دَمْغٌ سے بطور استعارہ استعمال ہوتے ہیں۔ جس کے معنی دماغ کو توڑنا کے ہیں۔

(د م ی)

اَلدَّمُ۔ خون۔ یہ اصل میں دَمْيٌ تھا یاء کو برائے تخفیف حذف کر دیا ہے، قرآن میں ہے:۔
حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ (۵-۳)۔ تم پر مردار جانور اور (بہتا) لہو ..... یہ سب حرام ہیں۔
دَمٌ کی جمع دِمَاءٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ (۲-۸۴) کہ آپس میں کشت و خون نہ کرنا۔
دَمِيَتِ (س) الْجِرَاحَةُ۔ زخم سے خون بہنا۔
فَرَسٌ مَدْمِيٌّ۔ خون کی طرح نہایت سرخ رنگ کا گھوڑا۔
اَلدُّمْيَةُ۔ گڑیا (جو خون کی مانند سرخ اور منقوش ہو)
شَجَّةٌ دَامِيَةٌ۔ سر کا زخم جس سے خون بہہ رہا ہو۔

(د ن ر)

اَلدِّيْنَارُ۔ (اشرفی) اصل میں دِنَّارٌ تھا ایک نون کو یاء سے تبدیل کیا گیا ہے (والجمع دنانیر) بعض نے کہا ہے کہ یہ فارسی لفظ دین آر سے معرب ہے یعنی وہ جسے شریعت لے آئی ہو[1]۔ قرآن میں ہے:۔
مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ (۳-۷۵) کہ اگر اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھو۔

(د ن و)

اَلدُّنُوُّ (ن) کے معنی قریب ہونے کے ہیں اور یہ قرب ذاتی، حکمی، مکانی، زمانی اور قرب بلحاظ مرتبہ سب کو شامل ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ (۶-۹۹) اور کھجور کے گابھے میں سے قریب جھکے ہوئے خوشے کو۔
اور آیت کریمہ:۔
ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى (۵۳-۸) پھر قریب ہوئے اور آگے بڑھے۔
میں قرب حکمی مراد ہے۔ اور لفظ اَدْنٰی کبھی بمعنی اَصْغَرُ آتا ہے۔ اس صورت میں اَکْبَرُ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا[2]:۔
وَلَا أَدْنَى مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ (۵۸-۷) اور نہ اس سے کم نہ زیادہ۔
اور کبھی اَدْنٰی بمعنی اَرْذَلُ استعمال ہوتا ہے اس وقت یہ خیر کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ (۲-۶۱) بھلا عمدہ چیزیں چھوڑ کر ان کے عوض ناقص چیزیں کیوں چاہتے ہو۔
اور[3] کبھی بمعنی اول (نشاۃ اولیٰ) استعمال ہوتا ہے اور الآخر (نشاۃ ثانیہ) کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

---

[1] المعرب للجوالیقی وراجع الاتقان (۱/۱۳۹) [2] والصواب فی التمثیل ولنذیقنھم من العذاب الادنیٰ دون العذاب الاکبر (۳۲-۲۱)

خَسِرَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃَ ط (۲۲-۱۱) اس نے دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی۔

اور آیت کریمہ:۔

وَاٰتَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً ط وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ (۱۶-۱۲۲) اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی اور آخرت میں بھی نیک لوگوں میں ہوں گے۔

اور[1] کبھی اَدْنٰی بمعنی اقرب آتا ہے اور اقصٰی کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ بِالْعُدْوَۃِ الْقُصْوٰی ط (۸-۴۲) جس وقت تم (مدینے کے) قریب کے ناکے پر تھے اور کافر بعید کے ناکے پر۔

اَلدُّنْیَا کی جمع اَلدُّنٰی آتی ہے جیسے اَلْکُبْرٰی کی جمع اَلْکُبَرُ وَالصُّغْرٰی کی جمع اَلصُّغَرُ۔

اور آیت کریمہ:۔

وَذٰلِکَ اَدْنٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِالشَّھَادَۃِ عَلٰی وَجْھِھَا ؕ (۵-۱۰۸) اس طریق سے بہت قریب ہے کہ یہ لوگ صحیح صحیح شہادت ادا کریں۔

میں اَدْنٰی بمعنی اقرب ہے یعنی یہ اقرب ہے۔ کہ شہادت ادا کرنے میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھیں۔ اور آیت کریمہ:

ذٰلِکَ اَدْنٰی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُھُنَّ (۳۳-۵۱) یہ (اجازت) اس لئے ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہیں۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ ط (۲-۲۱۹-۲۲۰) تاکہ تم سوچو یعنی (دنیا اور آخرت (کی باتوں) میں (غور کرو)

دنیا اور آخرت کے تمام احوال کو شامل ہے کہا جاتا ہے۔

اَدْنَیْتُ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ وَاَدْنَیْتُ اَحَدَھُمَا مِنَ الْاٰخَرِ۔ یعنی دو چیزوں کو باہم قریب کرنا یا ایک چیز کو دوسری کے قریب کرنا۔ قرآن میں ہے:۔

یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ ط (۳۳-۵۹) کہ باہر نکلا کریں تو اپنی چادریں اپنے اوپر ڈال لیا کریں۔

اَدْنَتِ الْفَرَسُ۔ گھوڑی کے وضع حمل کا وقت قریب آپہنچا۔

اَلدَّنِیُّ۔ خاص کر حقیر اور رذیل آدمی کو کہا جاتا ہے اور یہ سَیِّئٌ کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے:۔

ھُوَ دَنِیٌّ۔ یعنی نہایت رذیل ہے۔ اور جو مروی ہے (۱۲۸) اِذَا اَکَلْتُمْ فَدَنُّوْا تو یہ دُوْنَ سے ہے یعنی جب کھانا کھاؤ تو اپنے سامنے سے کھاؤ۔

(د ھ ر)

اَلدَّھْرُ (زمانہ) اصل میں مدت عالم کو کہتے ہیں یعنی ابتداء آفرینش سے لے کر اس کے اختتام تک کا عرصہ۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔

ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ (۷۶-۱) بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے۔

میں اَلدَّھْرُ سے یہی معنی مراد ہیں پھر (مجازاً) اس سے ہر طویل مدت مراد لی جاتی ہے بخلاف لفظ "زمان" کے کہ یہ مدت قلیلہ اور کثیرہ دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اور دَھْرُ فُلَانٍ کے معنی اس کی مدت حیاۃ کے ہیں اور جو عادت زندگی بھر باقی رہے اس پر بھی استعارۃً دَھْرٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے: مَا دَھْرِیْ بِکَذَا۔

---

[1] وفی النہایہ دونا تحوالث ود تو اوہنیتوا اتال وہوفنعلوا امن وتایدنو وعناہ کلوا مما یلیکم وما بین یدیکم

ہیں اس کا عادی نہیں ہوں۔ اور خلیلؒ نے حکایت
کی ہے:۔ دَهَرَ فُلَانًا نَائِبَةٌ دَهْرًا۔ (یعنی
فلاں پر مصیبت نازل ہوگئی) تو یہاں دَھْر کا
لفظ مصدر ہے اور بعض نے دَھْدَرَۃٌ دَھْدَرَۃٌ
بھی کہا ہے دَهْرٌ دَاهِرٌ وَدَهِيْرٌ زمانہ بے انتہا
وقت۔ ایک حدیث میں ہے[1] (۱۲۹)
لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ۔ کہ
زمانہ کو برا مت کہو کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی زمانہ ہے)
بعض نے اللہ تعالیٰ کے دَھْر ہونے کے یہ معنی
بیان کئے ہیں کہ جو خیر وشر اور خوشی وناخوشی زمانہ
کی طرف منسوب ہوتی ہے اس کا فاعل حقیقی چونکہ
اللہ تعالیٰ ہی ہے لہذا جب تم زمانہ کو برا بھلا
کہو گے جو تمہارے اعتقاد کے مطابق فاعل
ہے۔ تو گویا اللہ تبارک وتعالیٰ کو
گالیاں دے رہے ہو۔ اور بعض نے
کہا ہے کہ حدیث میں دَھْر ثانی دَھْر اول کا غیر
ہے اور یہ مصدر بمعنی فاعل ہے یعنی فَاِنَّ اللّٰهَ
هُوَ الدَّاهِرُ اور معنی یہ ہیں کہ ہر قسم کا تصرف
وتدبیر اور جو کچھ رونما ہوتا ہے اس کا فیضان اللہ
تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے مگر معنی اول اظہر و
انسب ہے۔ اور قرآن پاک نے مشرکین عرب
کے قول کی حکایت کرتے ہوئے فرمایا:۔
مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا
يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (۴۵-۲۴) کہ ہماری
زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے کہ (یہیں) مرتے
اور جیتے ہیں اور یہ صرف زمانہ ہی ہے جو ہمیں
ہلاک کر دیتا ہے۔
اس کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں دَھْرٌ
سے مراد زمانہ ہی ہے۔

(د ھ ق)

اَلدَّهْقُ (ف) کے معنی لبالب بھرنے اور
چھلکنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَكَاْسًا دِهَاقًا (۷۸-۳۴) اور لبالب اور چھلکتا
ہوا پیالہ۔
محاورہ ہے:۔
اَدْهَقْتُ الْكَاْسَ فَدَهَقَ (میں نے پیالہ بھرا
تو وہ بھر گیا) دَهَقَ لِيْ مِنَ الْمَالِ دَهْقَةً (اس
نے مجھے بہت مال دیا) جیسا کہ قَبَضَ لِيْ قَبْضَةً
کا محاورہ ہے۔

(د ھ م)

اَلدُّهْمَةُ۔ کے اصل معنی تو رات کی سیاہی
کے ہیں اور یہ لفظ گھوڑے کی سیاہی پر بولا جاتا
ہے کبھی اس سے نہایت گہرا سبز رنگ مراد
ہوتا ہے جیسا کہ ہلکے سیاہ رنگ کو خُضْرَۃٌ سے
تعبیر کر لیتے ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں قسم کی رنگت
قریبًا ملتی جلتی سی ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
مُدْهَامَّتَانِ (۵۵-۶۴) دونوں خوب گہرے سبز۔
یہ اِدْهَامَّ اِدْهِيْمَامًا سے مُفْعَالٌّ کے وزن
پر ہے۔ کسی شاعر نے رات کا وصف بیان کرتے
ہوئے کہا ہے[2] (البسیط)

---

[1] اخرجہ البخاری واللسان (دہر) والفائق ۱ / ۳۱۵ وانظر تاویل الحدیث امالی المرتضی (۱ / ۴۵ - ۴۶) وابن کثیر ۴ : ۱۵۱)
والطبری ۲۵ / ۱۵۲ بسیاق غریب جداً والحدیث باختلاف الفاظہ فی (م، حم، ق) وابن عساکر فی معجمہ وابن النجار کلہم عن ابی ہریرۃ) راجع
کنز العمال (۳ : ۵۴۳)؛ [2] قالہ ذوالرمۃ والبیت فی اللسان (عسف، ہوم) (فقدمر تخریجہ فی (خضر) ؎ ؎ ؎ ؎

(۱۳۶) فی ظلّ اخضر یدعو ھامہ البوم

یعنی تاریک رات جس میں کہ بوم اپنے ھام کو بلا رہا ہوتا ہے۔

(د ھ ن)

اَلدُّھْنُ۔ تیل۔ چکناہٹ ج اَدْھَانٌ

قرآن میں ہے:۔

تَنْبُتُ بِالدُّھْنِ (۲۳-۲۰)۔ جو روغن ... لئے ہوئے اگتا ہے۔

اور آیت کریمہ:۔ فَکَانَتْ وَرْدَۃً کَالدِّھَانِ (۵۵-۳۷) پھر ... تیل کی تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائیگا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ دِھَان کے معنی تلچھٹ کے ہیں۔

اَلْمُدْھُنُ۔ ہر وہ برتن جس میں تیل ڈالا جائے۔ یہ اسم آلہ کے منجملہ ان اوزان کے ہے جو بطور شواذ مُفْعُلٌ کے وزن پر آتے ہیں اور بطور تشبیہ (پہاڑ میں) اس مقام (چھوٹے سے گڑھے) کو بھی مُدْھُنٌ کہا جاتا ہے جہاں تھوڑا سا پانی ٹھہر جاتا ہو اور دُھْنٌ سے بطور استعارہ کم دودھ والی اونٹنی کو دَھِیْنٌ کہا جاتا ہے اور یہ فعیل بمعنی فاعل کے وزن پر ہے یعنی وہ بقدر دہن کے دودھ دیتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ فَعِیل بمعنی مفعول ہے۔

گویا اسے دودھ کا دھن لگایا گیا ہے۔ یہ بھی دودھ کے کم ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ یہ دوسرا قول اقرب الی الصحت معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے آخر میں تا تانیث نہیں آتی۔ (جو فعیل بمعنی مفعول ہونیکی دلیل ہے)

دَھَنَ الْمَطَرُ الْاَرْضَ۔ بارش نے زمین کو ہلکا سا نم کر دیا جیسا کہ سر پر تیل ملا جاتا ہے۔

دَھَنَہٗ بِالْعَصَا (کنایۃً) لاٹھی سے اس کی تواضع کی۔ یہ بطور تہکم کے بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ مَسَحْتُہٗ بِالسَّیْفِ وَحَیَّیْتُہٗ بِالرُّمْحِ کا محاورہ ہے۔

اَلْاِدْھَانُ۔ یہ اصل میں تَدَھِیْن کی طرح ہے۔ لیکن یہ تصنع، نرمی برتنے اور حقیقت کا دامن ترک کر دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ تَقْرِیْدٌ کا لفظ جس کے اصل معنی اونٹ سے چیچڑ دور کرنا کے ہیں پھر تصنع اور نرمی برتنا کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اَفَبِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَنْتُمْ مُّدْھِنُوْنَ (۵۶-۸۱) کیا تم اسی کتاب سے انکار کرتے ہو؟

شاعر نے کہا ہے[1]:۔ (السریع)

(۱۵۷) اَلْحَزْمُ وَالْقُوَّۃُ خَیْرٌ

مِنَ الدِّھَانِ وَالْفَلَّۃِ وَالْھَاعِ

کہ حزم واحتیاط اور قوت چاپلوسی اور جزع فزع

---

[1] قالہ ابو قیس بن الاسلت الانصاری (وفی روایۃ الاکثر): الکیس والقوۃ خیر من ال: اِشفاق والفہۃ وَالْھَاع۔ والبیت من کلمۃ مفضلیۃ ۲۳۵ فی ۲۴ بیتًا وفی روایتہ الفکۃ بدل الفلۃ وفی روایۃ احمد بن عبید الفہۃ کما فی اللسان (فک) ومعناہ الضعف والھاع سوء الحرص مع الضعف والبیت فی الحیوان (۳: ۴۴) والبیان (۱: ۲۰۴) والامالی (۲: ۲۱۲) والسمط ۲۷ والبحر (۸: ۲۰۸) وابدال ابی الطیب (۲: ۳۷۵) وفی العمدۃ (۲: ۸۰) اتنا والامثلۃ مما عیب فی المقابلۃ وابو قیس اختلف فی اسمہ وذکرہ الحافظ فی الاصابہ والراجح صیفی بن الاسلت وکان الذی اسند امرہ الیہ فی الحرب الاخیرۃ بین الاوس والخزرج فکفی ونسانہ حتی شحب وتغیر ولبث اشھرًا لایقرب من امرأتہ ثم انہ جاء لیلۃ فدق علی امرأتہ ففتحت لہ فاھوی الیہا بیدہ فدفعتہ وانکرتہ فقال انا ابو قیس فقالت والشاعر فتنک حتی تکلمت فقال فی ذالک القصیدۃ مطلعہا: قالت ولم تقصد لقیل الخنا مہلًا فقد ابلغت اسماعی۔ وفیہا الشاہد واختلف فی اسلامہ راجع الاصابۃ (۸: ۱۵۸/ ۵: ۲۵۷/ ۴: ۲۵۲) والاغانی (۱۵: ۱۴۵) واسد الغابۃ (۱: ۱۸۴) والخزانۃ (۳: ۳۷۵-۳۷۸)

سے بہتر ہیں۔
داھنت فلانا مداھنۃ میں نے فلاں کے سامنے چاپلوسی کی۔ قرآن میں ہے :۔
وَدُّوْا لَوْ تُدْھِنُ فَیُدْھِنُوْنَ (۶۸-۹) کہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم مداہنت سے کام لو یہ بھی نرم ہو جائیں۔

(د و د)

دَاوٗد (داؤد علیہ السلام) یہ عجمی نام ہے (اور عجمہ و علمیت کی بنا پر غیر منصرف ہے)

(د و ر)

اَلدَّارُ۔ منزل۔ مکان کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ چار دیواری سے گھرا ہوتا ہے۔ بعض نے دَارَۃٌ بھی کہا ہے۔ اس کی جمع دِیَارٌ ہے۔ پھر دار کا لفظ شہر، علاقہ بلکہ سارے جہان پر بولا جاتا ہے اور اَلدَّارُ الدُّنْیَا اور اَلدَّارُ الْاٰخِرَۃُ سے نشاۃ اولیٰ و نشاۃ ثانیہ میں دو قرارگاہوں کی طرف اشارہ ہے۔ بعض نے دَارُ الدُّنْیَا وَدَارُ الْاٰخِرَۃِ (باضافت) بھی کہا ہے۔ قرآن میں ہے :۔
لَھُمْ دَارُ السَّلَامِ عِنْدَ رَبِّھِمْ (۶-۱۲۷) ان کے لئے ان کے اعمال کے صلے میں پروردگار کے ہاں سلامتی کا گھر ہے۔
یہاں دارالسلام سے جنت مراد ہے اور دَارُ الْبَوَارِ (۱۴-۲۸) ہلاکت کا گھر (اس سے جہنم۔ نیز فرمایا)۔
قُلْ اِنْ کَانَتْ لَکُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ (۲-۹۴) کہہ دو کہ اگر آخرت کا گھر ۔۔۔۔ تمہارے لئے ہی مخصوص ہے۔
اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ (۲-۲۴۳)۔ بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ۔۔۔۔۔۔ اپنے گھروں سے نکل بھاگے تھے۔
وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا (۲-۲۴۶) جب کہ ہم وطن ۔۔۔۔۔ سے خارج کر دیئے گئے ہیں۔
سَاُورِیْکُمْ دَارَ الْفٰسِقِیْنَ (۷-۱۴۵) میں عنقریب تم کو نافرمان لوگوں کا گھر دکھاؤں گا۔
کہا جاتا ہے مَا بِھَا دَیَّارٌ۔ یعنی یہاں کوئی نہیں رہتا۔ یہ دَارٌ سے فَیْعَالٌ کے وزن پر ہے۔ کیونکہ اگر فَعَّالٌ کے وزن پر ہوتا تو دَیَّارٌ کی بجائے دَوَّارٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ (قول سے) قَوَّالٌ اور (جور سے) جَوَّارٌ ہے۔
اَلدَّائِرَۃُ۔ خط محیط (سرکل) کو کہتے ہیں یہ دَارَ یَدُوْرُ دَوَرَانًا سے ہے جس کے معنی چکر لگانا کے ہیں پھر مصیبت گردش زمانہ کو بھی دائرہ (یا دائرۃ) کہہ دیا جاتا ہے اسی مناسبت سے زمانہ کو ۔۔۔ الدَّوَارِیُّ کہتے ہیں کیونکہ اس کی گردشیں بھی انسان پر گھومتی رہتی ہیں چنانچہ شاعر نے کہا ہے[1] (الرجز)
(۱۵۸) وَالدَّھْرُ بِالْاِنْسَانِ دَوَّارِیٌّ
کہ زمانہ انسان کو گھما رہا ہے۔
اور الدودۃ والدائرۃ کا لفظ مکروہ چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بالمقابل جو محبوب چیز گھوم کر آئے اسے دَوْلَۃٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔

---

[1] بیت من مشطورۃ الرجز للعجاج فی وصف الدہر وبعدہ: "افنی القرون وہو قعسری" وقبلہ: "اطربا وانت قنسری" (الرجز فی اللسان قعسر دور) والصحاح (دور) وتفسیر الطبری (۹: ۱۴) واراجیز العرب للسید توفیق البکری ۷۴، ا مجموع اشعار العرب (۲: ۶۶) والخزانۃ (۳: ۱۱ ۵) وابن ہشام (۱: ۱۲) رقم ۱۲ وثلاثین ۱۹ والسیوطی ۱۸ والمرزوقی ۴: ۸۱۸ والحکام (قعسر) ۱۲

نَخْشٰی اَنْ تُصِیْبَنَا دَائِرَۃٌ۔ (۵-۵۲) ہمیں خوف ہے کہ کہیں ہم پر زمانے کی گردش نہ آجائے (دائرۃ کی جمع دَوَائِرُ آتی ہے۔ قرآن میں ہے :۔

وَیَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَائِرَ عَلَیْھِمْ دَائِرَۃُ السَّوْءِ۔ (۹-۹۸) کہ وہ تمہارے حق میں مصیبتوں کے منتظر ہیں انہی پر بری مصیبت واقع ہو یعنی تباہی اور بربادی انہیں ہر طرف سے اس طرح گھیرلے جیسا کہ کوئی شخص دائرہ کے اندر ہوتا ہے۔ اور ان کے لئے اس بربادی سے نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے

اَلدَّوَّارُ۔ ایک بت کا نام ہے جس کے گرد اگرد لوگ طواف کیا کرتے تھے۔

اَلدَّارِیُّ۔ یہ الدار کی طرف منسوب ہے[1] مگر عطار (عطر فروش) کے ساتھ مخصوص ہوچکا ہے جیساکہ اَلْھَالِکِیُّ کا لفظ قَیْنٌ یعنی لوہار پر خاص کر بولا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے[2] (۱۲۹)

مَثَلُ الْجَلِیْسِ الصَّالِحِ کَمَثَلِ الدَّارِیِّ کہ نیک صحبتی کی مثال عطار کی سی ہے۔

اور جو شخص گھر کے اندر ہی جم کر بیٹھا رہے اور باہر نہ نکلے اسے بھی دَارِیٌّ کہا جاتا ہے۔

اور آیت کریمہ :۔

اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً حَاضِرَۃً تُدِیْرُوْنَھَا بَیْنَکُمْ۔ (۲-۲۸۲) ہاں اگر سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں لیتے دیتے ہو۔ یعنی نقد اور ہاتھوں ہاتھ لین دین ہو اور اس میں کسی قسم کی تاخیر نہ ہو۔

(د و ل)

اَلدَّوْلَۃُ وَالدُّوْلَۃُ۔ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی گردش کرنا۔ بعض نے کہا ہے کہ دَوْلَۃٌ کا لفظ مال وزر کے گھومنے پر بولا جاتا ہے اور دُوْلَۃٌ لڑائی اور عزت وجاہ کے ادلنے بدلنے پر۔ بعض نے ان دونوں میں یہ فرق کیا ہے کہ دَوْلَۃٌ اسم ہے اور اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعہ لین دین کیا جائے اور دُوْلَۃٌ (بضم الدال) مصدر ہے یعنی لین دین کرنا۔ قرآن میں ہے :۔

کَیْلَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ۔ تاکہ جو لوگ تم میں دولت مند ہیں انہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے۔

تَدَاوَلَ الْقَوْمُ کَذَا کسی چیز کو دولت [illegible] باری باری لینا۔

دَاوَلَ اللہُ کَذَا بَیْنَھُمْ۔ اللہ تعالےٰ نے لوگوں کے درمیان اسے گھمایا۔

قرآن میں ہے :۔

وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ۔ (۳-۱۴۰)

---

[1] ذکر علماء اللغۃ والغریب قولین فی ہذہ النسبۃ الاول نسبۃ الی الدار وہی محکم لموضع بین البصرۃ والبحرین کما فی الیاقوت (رسم: الدار) وذکرہ ابن دریلق الملاحم وقال :۔ الدار موضع بالبحرین معروف والیہ ینسب الداری العطار والثانی انہ نسبۃ الی فرضۃ البحرین یقال لہا دارین : قال الیاقوت : والنسبۃ الیہا دَارِیٌّ والیہ ذہب ابن الاثیر فی النہایۃ (دار) والجوہری فی الصحاح (دار) وفی البلدان ہی بلدۃ فتحت فی ایام ابی بکر رضی اللہ عنہ سنۃ ۱۲ وکان علی الغزاۃ العلاء بن الحضرمی وفیہ یقول الفرزدق کَاَنَّ تریکۃ من ماء مزن ۔ ودَارِیُّ الذکی من المدام راجع البلدان (رسم : دارین) ۱۲ [2] وتتمۃ الحدیث ذکرہ المؤلف فی الاخوانیات من محاضراتہ (۳ : ۲) والزمخشری فی الفائق (۱ : ۲۰۲) والنہایۃ (دار) راجع الحدیث (د، ک، عن انس) و (ع والراہمرزی ، ق حب فی روضۃ العقلاء عن شبل من انس) وابن حبان والراہمرزی ایضا عن ابی موسیٰ ولفظ الاکثر مثل العطار الا ان اصحاب الغریب ذکروا لفظ الداری بدل العطار راجع للمراجع کنز العمال (۹، ۵، ۵) والفتح للنبہانی ۳ / ۱۲۸ ومجمع البحار (۱ / ۵۲) ۱۲

اور یہ دن ہیں کہ ہم ان کو لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔
اَلدَّوْلُ۔ بڑی مصیبت ج اَلدَّأْلِیْلُ دَالدُّوْلَاءُ۔

(د و م)

اَلدَّوَامُ۔ اصل میں دوام کے معنی سکون کے ہیں کہا جاتا ہے۔ دَامَ الْمَاءُ (پانی ٹھہر گیا) اور حدیث میں[1] (۱۳۰) اَلْمَاءُ الدَّائِمُ (یعنی کھڑے پانی میں پیشاب کرنے سے منع کیا گیا ہے۔
اَدَمْتُ الْقِدْرَ وَدَوَّمْتُهَا تھوڑا سا پانی ڈالکر ہانڈی کو ٹھنڈا کر دیا۔ اسی سے دَامَ الشَّیْءُ کا محاورہ ہے یعنی وہ چیز جو عرصہ دراز تک رہے قرآن میں ہے:۔
وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ (۵-۱۱۷)۔ اور جب تک میں ان میں رہا ان (کے حالات) کی خبر رکھتا رہا۔
اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا۔ (۳-۷۵) جب تک اس کے سر پر ہر وقت کھڑے نہ رہو۔
لَنْ نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا (۵-۲۴) جب تک وہ لوگ وہاں ہیں ہم کبھی وہاں نہیں جا سکتے۔
اور یہ باب دِمْتَ تَدَامُ سے آتا ہے اور بعض نے دُمْتَ تَدُوْمُ کہا ہے جیسے مُتَّ تَمُوْتُ۔
دَوَّمَتِ الشَّمْسُ فِيْ كَبِدِ السَّمَاءِ۔ وسط آسمان میں سورج ٹھہر گیا۔ شاعر نے کہا ہے[2]۔ ع
(۱۵۹) وَالشَّمْسُ حَيْرَى لَهَا فِي الْجَوِّ تَدْوِيْمُ
سورج حیران پریشان ہو کر فضا میں ٹھہرا ہوا ہے۔
دَوَّمَ الطَّيْرُ فِي الْهَوَاءِ۔ پرند فضا میں منڈلایا۔
اِسْتَدَمْتُ الْاَمْرَ میں نے اس پر دیر تک غور و فکر کیا۔
اَلظِّلُّ الدَّوْمُ (دَائِمٌ) ہمیشہ رہنے والا سایہ۔
اَلدِّيْمَةُ۔ بارش جو لگاتار کئی روز تک برستی رہے

(د و ن)

اَلدُّوْنُ۔ جو کسی چیز سے قاصر اور کوتاہ ہو وہ "دُوْن" کہلاتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ دُنُوٌّ کا مقلوب ہے۔ اور اَلْاَدْوَنُ بمعنی دَنِیٌّ آتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ (۳-۱۱۸) کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کو راز دار مت بناؤ جو دیانت میں تمہارے ہم مرتبہ (یعنی مسلمان) نہیں ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جو قرابت میں تم سے نیچے ہیں یعنی تمہارا ان سے تعلق نہیں ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ (۴-۴۸) اور اسکے سوا اور گناہ ...... معاف کر دے۔
میں مَادُوْنَ سے وہ گناہ مراد ہیں جو شرک سے کم درجہ ہیں یا وہ جو شرک کے علاوہ ہیں۔ اور یہ دونوں معنی ایک دوسرے کو لازم ملزوم ہیں اور آیت کریمہ:۔
ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ

---

[1] و لفظۃ الحدیث ولا یبولن احدکم فی الماء الدائم راجع تخریجہ فی کنز العمال ۹ : ۲ ، ۷ - ۱۷ - ۸۶ - ۱۷ و فی کتب الغریب النہایۃ (دوم) و الفائق (۱ : ۲۰۵) [2] قالہ ذوالرمۃ فی میمیتہ یصف جندبا الذی یصیح فی حر الشمس و اولہ: معرو یا یعض الرمضاء یرکضہ۔ والبیت فی اللسان (دوم) و الاقتضاب ۴۵۹ و البحر (۲ : ۲۹۸) و المحاضرات للمؤلف ۵۰۹ و المعانی الکبیر ۱۱۰۴ ودیوانہ ۵۷۸ و ابو الطیب فی اضداد ۲۶۷

مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ (۵-۱۱۶) کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری والدہ کو معبود مقرر کرو۔ میں مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ کے معنی غَیْرُ اللّٰہِ کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ہم دونوں کو معبود بنا لو۔ بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ دو معبود جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ تک پہنچا جائے۔ اور آیت کریمہ:۔
لَیْسَ لَھُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ (۶-۵۱) اس کے سوا نہ تو ان کا کوئی دوست ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا۔ اور نیز آیت:۔
وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (۲-۱۰۷) اور خدا کے سوا تمہارا کوئی دوست اور مددگار نہیں۔
کے معنی یہ ہیں کہ حکم الٰہی کے بغیر کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ان کی مدد کر سکے اور یہی معنی آیت کریمہ:۔
قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنْفَعُنَا وَلَا یَضُرُّنَا (۶-۷۰) کہو کیا ہم خدا کے سوا ایسی چیز کو پکاریں جو نہ ہمارا بھلا کر سکے نہ برا۔ میں مراد ہیں اور دُوْنَ میں ایک لغت دَوْنَ (بفتح الدال) بھی ہے کہا جاتا ہے۔ دَوْنَكَ کَذَا یعنی یہ پکڑ لو۔ قتیبی نے کہا ہے کہ دَانَ یَدُوْنُ دُوْنًا کے معنی کمزور ہونے کے ہیں[1]۔

(د ی ن)

دِنْتُ الرَّجُلَ کے معنی قرض لینے اور اَدَنْتُهٗ کے معنی ہیں میں نے اسے دائن بنا دیا یعنی قرض دیا۔ ابو عبیدہ نے کہا ہے کہ دِنْتُهٗ کے معنی اَقْرَضْتُهٗ یعنی قرض دینا کے ہیں اور مقروض کو مَدِیْنٌ وَمَدْیُوْنٌ کہا جاتا ہے دِنْتُهٗ کے معنی قرض لینا بھی آتے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[2] (
(۱۶۰) نَدِیْنُ وَیَقْضِی اللّٰہُ عَنَّا وَقَدْ نَرٰی
مَصَارِعَ قَوْمٍ لَا یَدِیْنُوْنَ ضُیَّعًا
ہم قرض لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہم سے اس قرض کو ادا کر دیتا ہے اور جو لوگ قرض نہیں لیتے ان کی قبریں ضائع ہونے والی دیکھتے ہیں اور اَدَنْتُ دِنْتُ کی طرح ہے یعنی اس کے معنی قرض لینا کے ہیں اور اَدَنْتُ کے معنی قرض دینا بھی ہیں۔
اَلتَّدَایُنُ وَالْمُدَایَنَةُ۔ قرض کا معاملہ کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی (۲-۲۸۲) جب تم آپس میں کسی میعاد معین کے لئے قرض کا معاملہ کرنے لگو۔
مِنْ بَعْدِ وَصِیَّةٍ یُّوْصٰی بِھَآ اَوْ دَیْنٍ (۴-۱۲) (یہ حصے بھی) بعد ادائے وصیت و قرض۔
اَلدِّیْنُ کے معنی طاعت اور جزا کے آتے ہیں اور بطور استعارہ دین بمعنی شریعت بھی آتا ہے۔ اور دین ملت کی طرح ہے لیکن شریعت کی طاعت اور فرمانبرداری کے لحاظ سے اسے دین کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (۳-۱۹) دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے۔
وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْھَهٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ (۴-۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین

---

[1] قال فی الصحاح ولا یشتق منہ فعل، وبعضہم یقول منہ، دَانَ یَدُوْنُ دَوْنًا راجع ایضًا اللسان (دون) [2] فی اللسان ضُیَّع بالخفض علی الصفة للقوم والبیت للعجیر السلولی وقبلہ: فَعُدْ صاحب اللحام سیفا تبیعہ۔ وزد ورہما فوق المغالین واخنع ۔ البیت فی الصحاح (دین) وفی روایة الفیا ضُیَّعًا وقال ابن بری: صوابہ ضُیَّعٍ بالخفض علی الصفة للقوم) ؂

اچھا ہوسکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے۔
وَاَخْلَصُوْا دِیْنَهُمْ لِلّٰهِ (۴-۱۴۶) اور خالص خدا کے فرمانبردار ہوگئے۔ اور آیت کریمہ:۔
یَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ۔ (۵-۷۷) اے اہل کتاب اپنے دین (کی بات) میں ناحق مبالغہ نہ کرو۔
میں آنحضرت کے دین یعنی اسلام کی اتباع پر ترغیب پائی جاتی ہے جو تمام ادیان سے معتدل دین ہے اور افراط وتفریط سے پاک ہے جیسے فرمایا:۔
وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (۲-۱۴۳) اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا۔
اور آیت کریمہ:۔
لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (۲-۲۵۶)۔ دین (اسلام) میں زبردستی نہیں ہے۔
میں بعض نے دین کے معنی طاعت کئے ہیں کیونکہ طاعت حقیقت میں وہی ہے جو مبنی براخلاص ہو اور اخلاص کی صورت میں اکراہ وجبر کیسے ہوسکتا ہے بعض نے کہا ہے کہ عدم جبر کا حکم ان اہل کتاب کے ساتھ مختص ہے جو جزیہ ادا کریں۔ اور آیت کریمہ:۔
اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰهِ یَبْغُوْنَ (۳-۸۳) کیا یہ (کافر) خدا کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں؟۔
میں دِیْنُ اللّٰهِ سے دین اسلام مراد ہے۔ کیونکہ دوسری آیت میں (قرآن نے) تصریح فرمادی ہے:۔
وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ۔ (۳-۸۵) اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔
اور مندرجہ ذیل آیات میں بھی یہی معنی مراد ہے:۔
هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ۔ (۹-۳۳) وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا۔
وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ (۹-۲۹) اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں۔
وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (۴-۱۲۵) اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہوسکتا ہے جس نے حکم خدا کو قبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ (۵۶-۸۶)۔
میں غَیْرَ مَدِیْنِیْنَ کے معنی غَیْرَ مَجْزِیِّیْنَ کے ہیں۔ یعنی اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہیں تمہارے اعمال کی جزا نہیں دی جائے گی۔
اَلْمَدِیْنُ وَالْمَدِیْنَةُ (ایضًا) کے معنی غلام اور لونڈی کے بھی آتے ہیں۔ ابوزید[1] نے کہا ہے کہ یہ دِیْنَ فُلَانٌ یُدَانُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی کسی ناپسند کام پر مجبور کئے جانے کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ دِنْتُهٗ سے ماخوذ ہے جس کے معنی طاعت کی جزا دینے کے ہیں بعض نے لفظ مَدِیْنَة (شہر) بھی اسی معنی سے لیا ہے۔

---

[1] ابوزید سعید بن اوس بن ثابت الانصاری وحدہ من الصحابۃ یاشدید العنایۃ بجمع اللغات واللہجات توفی سنہ ۲۱۴ھ وقد قارب المائۃ کان من تلامذۃ عمرو بن العلاء وزلیزیدی کان رفیقہ فی الدرس راجع لاحوالہ (بشد) ۱۲

کتابُ الذّال

(ذ ء ب)

اَلذِّئْبُ۔ کے معنی بھیڑیا کے ہیں اصل میں یہ ذِئْبٌ یعنی مہموز ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَاَکَلَهُ الذِّئْبُ۔ (۱۲-۱۷) تو اسے بھیڑیا کھا گیا۔
اَرْضٌ مَذْءَبَةٌ۔ بہت بھیڑیوں والی سرزمین۔
ذُئِبَ فُلَانٌ۔ در گوسپنداں وے گرگ افتاد۔
تَذَاءَبَتِ الرِّیْحُ۔ ہوا ہر طرف سے چلی۔ یہ بھیڑیے کی آمد کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔
تَذَاءَبْتُ لِلنَّاقَةِ۔ اونٹنی کو بچے پر مہربان کرنے کیلئے بھیڑیے کا روپ دھار لینا اور ہیئت کذائی میں مشابہت کے پیش نظر پالان کے پہلوؤں کے درمیان کی کشادگی کو ذِئْبَةٌ کہا جاتا ہے۔

(ذ ء م)

ذَاَمَهُ یَذْءَمُهُ ذَاْمًا اور ذَمَّهُ (ن) ذَمًّا اور ذَامَهُ۔ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی کو حقیر اور مذموم گرداننا۔ قرآن میں ہے:۔
اُخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا (۷-۱۸) نکل جا یہاں سے ذلیل راندے ہوئے۔

(ذ ب ب)

اَلذُّبَابُ۔ کے معنی مکھی کے ہیں اور یہ لفظ شہد کی مکھی اور بھڑ وغیرہ پر بولا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)

(۱۶۱) فَهَذَا اَوَانُ الْعِرْضِ حَیٌّ ذُبَابُهُ
زَنَابِیْرُهُ وَالْاَزْرَقُ الْمُتَلَمِّسُ

یہ وادی کے پررونق ہونے کا موسم ہے اس کے زنابیر اور سبز مکھیاں خوب بھن بھنا رہی ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا۔ (۲۲-۷۳) اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے۔ میں ذباب کے معنی مکھی کے ہیں۔
ذُبَابُ الْعَیْنِ۔ آنکھ کی پتلی۔ اسے ذباب یا تو ہیئت میں تشبیہ کے لحاظ سے کہا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ آنکھ کی پتلی سے بھی مکھی کی طرح شعاعیں نکلتی ہیں۔ اور ایذارسانی میں مکھی کے ساتھ تشبیہ دے کر تلوار کی دھار کو ذُبَابُ السَّیْفِ کہا جاتا

---

[1] قال المتلمس ولقب بہ بہذا البیت والبیت فی الحماسۃ (۲: ۱۰۲) والخزانۃ (۳: ۲۷۰) والاغانی (۲۱: ۱۲۰) والسمط ۲۰۰ والاقتضاب ودیوانہ رقم ۵ والسیوطی ۱۷، ۱۰۴ والمختارات ۳۳ والمحکم (عرض) والحیوان (۳: ۳۹۱) والمعانی الکبیر للقتبی وفی روایتہ وذاک بدل فہذا والمرزوقی ۲۶۲ وفی روایتہ حی ذبابہ بدل حی ذبابہ والمتلمس شاعر جاہلی اسمہ جریر بن عبد المسیح الضبعی راجع لترجمتہ السیوطی ۱۰۲-۱۰۴ والاغانی (۲۱: ۱۲۷-۱۳۵) والخزانۃ (۱: ۴۷۶) والشعراء (۱۳۱-۱۳۶)

ہے۔ اسی طرح موذی شخص کو بھی ذُبَابٌ کہہ دیا جاتا ہے۔

ذَبَّبَ عَنْ فُلَانٍ کسی سے مکھی کو دور ہٹانا۔

اَلْمِذَبَّۃُ۔ موچھل۔ مکھیاں اڑانے کا آلہ۔

استعارہ کے طور پر ذَبٌّ کا لفظ ہر چیز کے دفع کرنے پر بولا جاتا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے:۔

ذَبَبْتُ عَنْ فُلَانٍ۔ میں نے فلاں سے دور ہٹایا۔

ذُبَّ الْبَعِیْرُ اونٹ کی ناک میں مکھی داخل ہو گئی۔ یہ بھی بیماری کے دوسرے صیغوں کی طرح (جیسے زُکِمَ وغیرہ) فعل مجہول استعمال ہوتا ہے۔

بَعِیْرٌ مَذْبُوْبٌ وَذُبَّ جِسْمُہٗ۔ اونٹ دبلا ہو کر مکھی یا تلوار کی دھار کی طرح ہو گیا۔

اَلذَّبْذَبَۃُ اصل میں معلق چیز کے ہلنے کی آواز کو کہتے ہیں۔ پھر بطور استعارہ ہر قسم کی حرکت اور اضطراب کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ (۴-۱۴۳) بیچ میں پڑے لٹک رہے ہیں۔

یعنی وہ ہمیشہ مضطرب سے رہتے ہیں کبھی مسلمانوں کی طرف جھک جاتے ہیں اور کبھی کفار کی طرف۔ شاعر نے کہا ہے۔[1] (طویل)

(۱۶۲) تَرٰی کُلَّ مَلِکٍ دُوْنَھَا یَتَذَبْذَبٗ

کہ اس کی سلطنت کے ورے ہر ایک سلطنت مضطرب نظر آتی ہے۔

ذَبَّبْنَا اِبِلَنَا۔ ہم نے اونٹوں کو سخت ہنکایا۔ شاعر نے کہا ہے[2] (متقارب)

(۱۶۳) یُذَبِّبُ وَرْدٌ عَلٰی اِثْرِہٖ

کہ وَرْد اس کے پیچھے سخت دوڑ رہا تھا۔

(ذ ب ح)

اَلذَّبْحُ (ف) اصل میں اس کے معنی حیوانات کے حلق کو قطع کرنے کے ہیں اور ذِبْحٌ بمعنی مَذْبُوْحٌ آتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ۔ (۳۷-۱۰۷) اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو ان کا فدیہ دیا۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً (۲-۶۷) کہ خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ ایک بیل ذبح کرو۔

ذَبَحْتُ الْفَارَۃَ۔ میں نے نافہ مشک کو چیرا۔ یہ حیوان کے ذبح کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ اسی طرح ذَبَحَ الدِّنَّ کا محاورہ ہے جس کے معنی مٹکے میں شگاف کرنے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ۔ (۲-۴۹) تمہارے بیٹوں کو تو قتل کر ڈالتے تھے۔

میں صیغہ تفعیل برائے تکثیر ہے یعنی وہ کثرت کے ساتھ یکے بعد دیگرے تمہارے لڑکوں کو ذبح کر رہے تھے۔

سَعْدُ الذَّابِحِ (برج جدی کے ایک) ستارے کا نام ہے۔ اور سیلاب کے گڑھوں کو مَذَابِحُ کہا جاتا ہے۔

---

[1] قالہ النابغۃ فی قصیدۃ یمدح فیہا النعمان بن المنذر واولہ: اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ اَعْطَاکَ سورۃ وسیاتی فی (سور) [2] وتمامہ: و

ادرکہ وقع مردی خشب- والبیت لعنترۃ بن شداد العبسی ابو المغلس راجع المرزوقی ۴۴۴ وفی رعایۃ المختار الجاہلی (ا:۰ ۲۱)

والعقد الثمین ۳۵ تذاءب بمل یذیب ومرد بدل مردی والبیت فی اللسان (خشب)، والمعانی ۱۸۲۰ ❊ ❊ ❊

(ذ خ ر)

اَلْاِدِّخَارُ (افتعال) اصل میں اِذْتِخَارٌ تھا۔ کہا جاتا ہے۔

ذَخَرْتُهٗ وَادَّخَرْتُهٗ (مستقبل کے لئے ذخیرہ جمع کرنا) ایک روایت میں ہے[1]۔

اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ لَا یَدَّخِرُ لِغَدٍ۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل کے لئے کوئی چیز جمع نہ کرتے تھے۔

اَلْمَذَاخِرُ۔ پیٹ اور انتڑیاں جن میں طعام کا ذخیرہ جمع رہتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[2] (الطویل)

(۱۶۴) فَلَمَّا سَقَیْنَاهَا الْعَكِیْسَ تَمَلَّأَتْ
مَذَاخِرُهَا وَامْتَدَّ رَشْحًا وَرِیْدُهَا

جب ہم نے اسے عکیس یعنی شوربے میں ملا ہوا دودھ پلایا تو اس کا پیٹ بھر گیا اور رگیں پھول کر پسینہ بہنے لگا۔

اَلْاِذْخِرُ۔ ایک قسم کی خوشبودار گھاس۔

(ذ ر ر)

اَلذُّرِّیَّةُ۔ نسل۔ اولاد۔ قرآن میں ہے:۔

وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ (۲-۱۲۴) اور میری اولاد میں سے بھی۔

وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ (۲-۱۲۸) اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک گروہ کو اپنا مطیع بنائے رہیو۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (۴-۴۰) خدا کسی کی ذرا بھی حق تلفی نہیں کرتا۔

اور کہا گیا ہے کہ ذُرِّیَّةٌ اصل میں ہمزۃ اللام ہے اور (ذ ر ء) میں اس پر بحث آ رہی ہے۔

(ذ ر ء)

اَلذَّرْءُ کے معنی ہیں اللہ نے جس چیز کا ارادہ کیا اسے ظاہر کر دیا۔ کہا جاتا ہے۔

ذَرَءَ اللّٰهُ الْخَلْقَ۔ یعنی ان کے اشخاص کو موجود کیا قرآن میں ہے:۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (۷-۱۷۹) اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لئے پیدا کئے ہیں۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا (۶-۱۳۶)۔ اور (یہ لوگ) خدا ہی کی پیدا کی ہوئی چیزوں (یعنی) کھیتی اور چوپایوں میں خدا کا بھی ایک حصہ مقرر کرتے ہیں۔

وَمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا یَذْرَؤُكُمْ فِیْهِ (۴۲-۱۱) اور چارپایوں کے بھی جوڑے (بنائے اور) اسی

---

[1] رواہ الترمذی عن انس مسندا وعن ثابت مرسلا وتاویل الحدیث ای لنفسہ فلا ینافی انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یحبس لاہلہ قوت سنتہم والحدیث رواہ ابن حبان فی زوائدہ رقم ۲۵۵۰، ۹ ۱۳۹/۲ قال المناوی فی شرح الجامع الصغیر اسنادہ جید وفی الترمذی غریب دراجع التحفۃ ج ۳ ص ۲۷۲)

[2] وفی اللسان (مدح) قالہ الراعی ابو منصور الاسدی یصف فرسا والصواب انہ للراعی النمیری یصف امرءۃ وہی ام خنزر بن ارقم وکان بینہ وبین خنزر ہجاء فہجاہ بکون امہ تطرقہ وتطلب منہ القری ویدل علیہ ماقبلہ؛ فلما عرفنا انہا ام خنزر وجنا لہ والیہا وغاب مغیدہا الی آخر ما قال ثلاثۃ ابیات اللسان (مدح)، والصحاح (مدح، ذخر) وتہذیب الالفاظ ۴۰۶ مع آخر والحماسۃ لابی تمام بالتبریزی (۴: ۳۹) والمعانی للقتبی ۳۸۴ والحکم (عکس، مدح) ومشابہ الانصاف ۱۳۷ وفی روایۃ البیت اختلاف ففی روایۃ تمدحت بدل تملأت کما فی الصحاح واللسان وخواصرہا بدل مذاخرہا وازداد بدل امتد ۱۲

طریق پر تم کو پھیلا تا رہتا ہے۔
اور تَذْرُوْهُ الرِّيحُ (۱۸-۴۵) میں ایک قراءت تَذْرِيْهِ الرِّيَاحُ بھی ہے[1]۔
اَلذُّرْأَةُ۔ بڑھاپے یا نمک کی سفیدی۔
کہا جاتا ہے مِلْحٌ ذَرْآنِيٌّ نہایت سفید نمک[2] اور جس کے بال سفید ہو جائیں اسے رَجُلٌ اَذْرَءُ کہا جاتا ہے اس کی مؤنث ذَرْآءُ ہے۔
ذَرِئَ شَعْرُهٗ (و ذَرَءَ کفرح ومنع) اس کے بال سفید ہو گئے۔

(ذ ر ع)

اَلذِّرَاعُ۔ ہاتھ (کہنی سے لے کر درمیانی انگلی کے آخر تک) کبھی ذِرَاع کا لفظ بول کر مَذْرُوْع یعنی وہ چیز بھی مراد لی جاتی ہے جس کی پیمائش کی گئی ہو۔ قرآن میں ہے:۔
فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ۔ (۶۹-۳۲) پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے جکڑ دو۔
اور ذِرَاعٌ مِّنَ الثَّوْبِ وَ ذِرَاعٌ مِّنَ الْاَرْضِ وغیرہ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور حیوان کے بازو کے ساتھ تشبیہ دے کر ایک ستارے کو بھی ذِرَاعُ الْاَسَدِ کہا جاتا ہے۔
ذِرَاعُ الْعَامِلِ۔ نیزے کا اگلا حصہ۔ محاورہ ہے۔
هٰذَا عَلٰى حَبْلِ ذِرَاعِكَ۔ یہ تیرے اختیار میں ہے جیسا کہ "هُوَ فِيْ كَفِّكَ" کا محاورہ ہے۔
ضَاقَ بِكَذَا ذِرَاعِيْ۔ یعنی میں اس سے عاجز ہوں[3] جیسا کہ ضَاقَتْ بِهٖ يَدِيْ محاورہ ہے۔
ذَرَعْتُهٗ۔ (۱) بازو پر مارنا۔ اور ذَرَعْتُ کے معنی (۲) بازو پھیلانا بھی آتے ہیں اور اسی سے ذَرَعَ الْبَعِيْرُ فِيْ سَيْرِهٖ کا محاورہ ہے جس کے معنی اونٹ کے بازو پھیلا کر چلنے کے ہیں (تیز چلنا)
فَرَسٌ ذَرِيْعٌ وَ ذَرُوْعٌ کشادہ قدم گھوڑا (تیز رو)
مُذَرَّعٌ (سفید بازو والا گھوڑا یا بیل) اور زِقٌّ ذِرَاعٌ کے معنی بعض کے نزدیک بڑی مشک کے ہیں اور بعض کے نزدیک چھوٹی مشک کو کہتے ہیں۔ پہلی صورت میں بازوؤں والی مشک مراد ہو گی۔ اور دوسری صورت میں بغیر بازو مشک کے یعنی جس کے بازو کاٹ دیئے گئے ہوں۔
محاورہ ہے ذَرَعَهُ الْقَيْءُ اس پر قے غالب آ گئی
ذَرْعُ الْفَرَسِ۔ گھوڑے کا کشادہ قدم چلنا۔
تَذَرَّعَتِ الْمَرْاَةُ الْخُوْصَ۔ عورت کا ٹوکری وغیرہ بنانے کے لئے کھجور کی شاخوں کو کاٹنا۔ اسی سے تشبیہ کے طور پر تَذَرَّعَ فِيْ كَلَامِهٖ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کلام میں تیزی کرنے کے ہیں جیسا کہ سَفْسَفَ فِيْ كَلَامِهٖ (لغو گوئی کرنا) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ جو اصل میں سَفِيْفُ الْخُوْصِ (کھجور کے پتوں کی ٹوکری) سے ماخوذ ہے۔

(ذ ر و)

ذِرْوَةُ السَّنَامِ وَ ذُرَاهُ۔ کوہان کا بلند حصہ۔ اسی سے محاورہ ہے اَنَا فِيْ ذُرَاكَ میں تیری جناب میں باعزت ہوں[4] (یعنی تیری پناہ میں ہوں) اَلْمِذْرَوَانِ سرین کے دونوں کنارے (وَلَا وَاحِدَ لَهٗ)

---

[1] قراءۃ شاذۃ و فی حرف ابن مسعود تذریہ الریاح وایضاً تُذرِیہ فہذہ ثلاث ذکرہا اصحاب التفاسیر (راجع الطبری والشوکانی)
[2] و فی المعاجم بفتح الراء و سکونہا۔ [3] و فی التنزیل: وضاق بھم ذرعًا (۱۱-۷۷)؛ [4] والمعروف بفتح الذال ای فی ظلک و کنفک [5] راجع الامالی ج ۱ ص ۱۹۹

ذَرَتْهُ الرِّيْحُ تَذْرُوْهُ وَتَذْرِيْهِ۔ ہوا کا کسی چیز کو بکھیر دینا۔ قرآن میں ہے:

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا (۵۱-۱) بکھیرنے والیوں کی قسم جو اڑا کر بکھیر دیتی ہیں۔

تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ۔ (۱۸-۴۵)۔ کہ ہوائیں اسے اڑاتی پھرتی ہیں۔

اَلذُّرِّيَّةُ کے اصل معنی چھوٹی اولاد کے ہیں مگر عرف میں مطلق اولاد پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ جمع ہے مگر واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے[1]۔ قرآن میں ہے:۔

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ۔ (۳-۳۴) ان میں سے بعض بعض کی اولاد تھے۔

ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ۔ (۱۷-۳) اے ان لوگوں کی اولاد جن کو ہم نے نوحؑ کے ساتھ (کشتی میں) سوار کیا تھا۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ۔ (۳۶-۴۱) اور ایک نشانی ان کے لئے یہ ہے کہ ہم نے ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا۔

اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ۔ (۲-۱۲۴) میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا انہوں نے کہا کہ (پروردگار) میری اولاد سے بھی۔

ذُرِّيَّةٌ کے اصل میں تین اقوال ہیں۔

(۱) بعض کے نزدیک یہ ذَرَءَ اللّٰهُ الْخَلْقَ سے ہے یعنی اصل میں مہموز اللام ہے مگر کثرت استعمال کے سبب دُرِّيَّةٌ وَبَرِيَّةٌ کی طرح ہمزہ کو ترک کر دیا گیا ہے۔

(۲) بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں ذُرُّوِيَّةٌ بروزن فُعْلِيَّةٌ تھا اور ذَرٌّ سے مشتق ہے۔ جیسے قُمْرِيَّةٌ قُمْرٌ سے (۳) ابوالقاسم البلخی[2] کہتے ہیں کہ آیت کریمہ:۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ (۷-۱۷۹) اور ہم نے .... جہنم کے لئے پیدا کئے۔

میں ذَرَاْنَا ذَرَيْتُ الْحِنْطَةَ سے مشتق ہے جس کے معنی گندم کو اساوِن کرنے کے ہیں گویا وہ اسے بھی مہموز نہیں سمجھتے[3]۔

(ذ ع ن)

اَلْاِذْعَانُ (افعال) کے معنی کسی کا مطیع اور منقاد ہو جانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ (۲۴-۴۹) تو ان کی طرف مطیع ہو کر چلے آتے۔

نَاقَةٌ مِذْعَانٌ سواری کی مطیع اور فرمانبردار اونٹنی۔

(ذ ق ن)

ذَقَنٌ (ٹھوڑی) اس کی جمع اَذْقَانٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ۔ (۱۷-۱۰۹) اور

---

[1] وفی اشتقاقہ اختلاف ذکرہ اصحاب المعاجم فی (ذ ر ر) وفی (ذ ر ء) وفی (ذ ر و)

[2] ابو القاسم البلخی عبداللہ بن احمد الحنفی المعروف بالکعبی احد شیوخ المعتزلہ ورأس طائفۃ منہم یقال لہم الکعبیہ و فی النحل للشہرستانی ۱/۳۷ وکان تلمیذاً لابی الحسین الخیاط المعتزلی و مذہبہ وفی کشف الظنون ۱/۴۴۳ و ابن الندیم ۷۵ انہ الف تفسیراً کبیراً فی اثنی عشر جلداً توفی رحمہ اللہ فی سنۃ ۳۱۹، و ۳۱۷ راجع لتراجمہ لسان المیزان ۳/۲۵۵ و ابن خلکان ۱/۲۵۲ [3] لان المہموز معناہ یخالف الاعتزال فتجنبہم تملوی راجع الکشاف ۱۲

ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں (اور) روتے جاتے ہیں۔
ذَقَنْتُہٗ: میں نے اس کی ٹھوڑی پر مارا۔
نَاقَۃٌ ذَقُوْنٌ: وہ اونٹنی جو ٹھوڑی کے سہارے پر چلتی ہو[1]۔ پھر تشبیہ کے طور بڑے ڈول کو جو ایک جانب مائل ہو اسے بھی دَلْوٌ ذَقُوْقٌ کہہ دیتے ہیں[2]۔

(ذ ک ر)

اَلذِّکْرُ: یہ کبھی تو اس ہیئت نفسانیہ پر بولا جاتا ہے جس کے ذریعہ سے انسان اپنے علم کو محفوظ رکھتا ہے۔ یہ قریبًا حفظ کے ہم معنیٰ ہے مگر حفظ کا لفظ احراز کے لحاظ سے بولا جاتا ہے اور ذِکْرٌ کا لفظ استحضار کے لحاظ سے۔ اور کبھی ذِکْرٌ کا لفظ دل یا زبان پر کسی چیز کے حاضر ہونے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ اس بنا پر بعض نے کہا ہے کہ ذِکْرٌ دو قسم پر ہے۔ ذکر قلبی اور ذکر لسانی۔ پھر ان میں سے ہر ایک دو قسم پر ہے نسیان کے بعد کسی چیز کو یاد کرنا یا بغیر نسیان کے کسی کو ہمیشہ یاد رکھنا اور ہر قول کو ذکر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ ذکر لسانی کے بارے میں فرمایا:۔
لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ۔ (۲۱-۱۰) ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے۔
وَھٰذَا ذِکْرٌ مُّبٰرَکٌ اَنْزَلْنٰہُ۔ (۲۱-۵۰) اور یہ مبارک نصیحت ہے جسے ہم نے نازل فرمایا ہے۔
وَھٰذَا ذِکْرُ مَنْ مَّعِیَ وَذِکْرُ مَنْ قَبْلِیْ (۲۱-۲۴) یہ میری اور میرے ساتھ والوں کی کتاب ہے اور جو مجھ سے پہلے (پیغمبر) ہوئے ہیں۔
اور آیت کریمہ:۔
ءَاُنْزِلَ عَلَیْہِ الذِّکْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا۔ (۳۸-۸) کیا ہم سب میں سے اسی پر نصیحت (کی کتاب) اتری ہے۔
میں ذکر سے مراد قرآن پاک ہے۔ نیز فرمایا:۔
صٓ۔ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ۔ (۳۸-۱) ص۔ قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت دینے والا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَاِنَّہٗ لَذِکْرٌ لَّکَ وَلِقَوْمِکَ ج۔ (۴۳-۴۴) اور یہ (قرآن) تمہارے لئے اور تمہاری قوم کے لئے نصیحت ہے۔
میں ذکر بمعنی شرف ہے یعنی یہ قرآن تیرے اور تیری قوم کیلئے باعث شرف ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ (۱۶-۴۳) تو اہل کتاب سے پوچھ لو۔
میں اہل ذکر سے اہل کتاب مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا۔ رَّسُوْلًا (۶۵-۱۰-۱۱) خدا نے تمہارے پاس نصیحت (کی کتاب) اور اپنے پیغمبر (بھی بھیجے) ہیں۔
میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَلذِّکْرُ آنحضرتؐ کی وصف ہے۔ جیسا کہ عیسیٰؑ کی وصف میں کَلِمَۃٌ

---

[1] وفی الصحاح ترخی ذقنہا فی السیر و فی الاساس تمد خطا ہا و تحرک راسہا قوۃ و نشاطا فی العیر ۱۲

[2] وفی الصحاح والمحیط اذا خرز تہا فجاءت شفتہا مائلۃ (التاج) ۱۲

کا لفظ وارد ہوا ہے اور آنحضرت کو اَلذِّکْر
اس لحاظ سے کہا گیا ہے۔ کہ کتب سابقہ میں آپؐ
کے متعلق خوش خبری پائی جاتی تھی۔ اس قول کی بنا
پر رَسُوْلًا ذِکْرًا سے بدل واقع ہوگا۔ بعض
کے نزدیک رَسُوْلًا پر نصب ذِکْرًا کی وجہ
سے ہے گویا آیت یوں ہے۔ قَدْ اَنْزَلْنَا
اِلَیْکُمْ کِتَابًا یا ذِکْرًا رَسُوْلًا یَتْلُوْ[1] جیسا کہ
آیت کریمہ:۔ اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ
مَسْغَبَةٍ یَّتِیْمًا (۹۰-۱۴) میں یَتِیْمًا اِطْعَامٌ
کی وجہ سے منصوب ہے اور نسیان کے بعد
ذکر کے متعلق فرمایا:۔
فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَمَاۤ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ
اَنْ اَذْکُرَهٗ (۱۸-۶۳)۔ تو میں مچھلی (وہیں) بھول
گیا اور مجھے (آپ سے) اس کا ذکر کرنا شیطان
نے بھلا دیا۔
اور ذکر قلبی اور لسانی دونوں کے متعلق فرمایا:۔
فَاذْکُرُوا اللّٰهَ کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ اَوْ اَشَدَّ
ذِکْرًا (۲-۲۰۰)۔ تو (منیٰ میں) خدا کو یاد کرو جسطرح
اپنے باپ دادا کو یاد کیا کرتے تھے بلکہ اس سے
بھی زیادہ۔
فَاذْکُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ وَ
اذْکُرُوْهُ کَمَا هَدٰىکُمْ (۲-۱۹۸) تو مشعر
حرام (یعنی مزدلفہ) میں خدا کا ذکر کرو اور اسطرح
ذکر کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا۔ اور آیت کریمہ:۔
وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ (۲۱-۱۰۵) کے
اور ہم نے نصیحت (کی کتاب یعنی تورات) کے
بعد زبور میں لکھ دیا تھا۔

میں اَلذِّکْر سے کتب سابقہ مراد ہیں۔ اور
آیت کریمہ:۔
هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ
لَمْ یَکُنْ شَیْئًا مَّذْکُوْرًا (۷۶-۱) انسان
پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ
کوئی چیز قابل ذکر نہ تھی۔
میں شَیْئًا مَّذْکُوْرًا کے معنی یہ ہیں کہ بذات
خود اس کا وجود نہ تھا اگرچہ علم الٰہی میں اس وقت
بھی موجود تھا۔ اور آیت کریمہ:۔
اَوَلَا یَذْکُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ
قَبْلُ (۱۹-۶۷) کیا (ایسا) انسان یاد نہیں کرتا
کہ ہم نے اس کو پہلے بھی تو پیدا کیا تھا۔
کے معنی یہ ہیں کہ کیا حشر و نشر کے منکر کو اپنی پہلی
پیدائش یاد نہیں ہے جس سے وہ دوبارہ جی
اٹھنے پر استدلال کر سکتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔
قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ۔
(۳۶-۷۹)
وَهُوَ الَّذِیْ یَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ یُعِیْدُهٗ (۳۰-۲۷)
اور آیت کریمہ:۔
وَلَذِکْرُ اللّٰهِ اَکْبَرُ۔ (۲۹-۳۸) اور خدا کا
ذکر بڑا (اچھا کام) ہے۔
کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے کو
یاد کرنا بندے کے اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے سے
بڑھ کر ہے۔ گویا اس میں کثرت سے ذکر الٰہی کی
ترغیب پائی جاتی ہے۔
اَلذِّکْرٰی۔ کثرت سے ذکر الٰہی کرنا اس میں
"اَلذِّکْر" سے زیادہ مبالغہ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] علی سبیل المبالغۃ او علی حذف مضاف من الاول تقدیرہ: انزل ذا ذکر رسولا (فتح القدیر ۵/۲۴۶-۲۴۷) کے
قالہ ابو علی الفارسی لان المصدر المنون یعمل (السابق) فالمراد بالذکر القرآن راجع الطبری ۱۲

رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ (۳۸-۴۳)
(یہ) ہماری طرف سے رحمت اور عقل والوں کے لیے نصیحت ہے۔
وَذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۱-۵۵) اور نصیحت کرتے رہو کہ نصیحت مومنوں کو نفع دیتی ہے۔
اسی طرح بہت سی آیات میں ذِکْرٰی کا لفظ آیا ہے۔
اَلتَّذْكِرَةُ: جس کے ذریعہ کسی چیز کو یاد دلایا جائے اور یہ دلالت اور امارت سے اعم ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ (۷۴-۴۹)
ان کو کیا ہوا کہ نصیحت سے روگرداں ہو رہے ہیں۔
كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ (۸۰-۱۱) دیکھو یہ (قرآن) نصیحت ہے۔ مراد قرآن پاک ہے۔
ذَكَّرْتُهٗ كَذَا: کسی کو کچھ یاد دلانا۔ قرآن میں ہے:۔
وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ (۱۴-۵) اور ان کو خدا کے دن یاد دلاؤ۔
اور آیت کریمہ:۔
فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى (۲-۲۸۲) تو دوسری اسے یاد دلا دے گی۔
کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ اسے دوبارہ یاد دلا دے۔ اور بعض نے یہ معنی کئے ہیں وہ حکم لگانے میں دوسری کو ذِکْر بنا دے گی۔ بعض علماء نے آیت کریمہ:۔
فَاذْكُرُوْنِىْٓ اَذْكُرْكُمْ (۲-۱۵۲) سو تم مجھے یاد کیا کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔
اور اُذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ (۲-۴۰) میرے وہ احسان یاد کرو۔
میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ اُذْكُرُوْنِىْ کے مخاطب آنحضرتؐ کے اصحاب ہیں جنہیں معرفت الٰہی میں فوقیت حاصل تھی اس لئے انہیں براہ راست اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور دوسری آیت کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو اس کے انعامات کے ذریعہ سے پہچانتے تھے۔ اس بنا پر انہیں حکم ہوا کہ انعامات الٰہی میں غور و فکر کرتے رہو حتیٰ کہ اس ذریعہ سے تم کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے۔
اَلذَّكَرُ: نر۔ یہ اُنْثٰی (مادہ) کی ضد ہے قرآن میں ہے:۔
وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى (۳-۳۶) اور (نذر کے لئے لڑکا (موزون تھا کہ وہ) لڑکی کی طرح (ناتواں) نہیں ہوتا۔
ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ (۶-۱۴۴) کہ خدا نے دونوں (کے) نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں (کی) مادینوں کو۔
ذَكَرٌ کی جمع ذُكُوْرٌ وَذُكْرَانٌ آتی ہے چنانچہ فرمایا:۔
ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا (۴۲-۵۰)... بیٹے اور بیٹیاں۔
اور ذَكَرٌ کا لفظ بطور کنایہ عضو تناسل پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور جو عورت نرینہ بچہ جنے اسے مُذْكِرٌ کہا جاتا ہے مگر اَلْمِذْكَارُ وہ ہے جس کی عادت نرینہ اولاد کو جنم دینا ہو۔
نَاقَةٌ مُذَكَّرَةٌ: وہ اونٹنی جو عظمت جثہ میں اونٹ کے مشابہ ہو۔
سَيْفٌ ذُوْ ذُكْرٍ وَمُذَكَّرٌ: آبدار اور تیز تلوار۔
صارم ذُكُوْرُ الْبَقْلِ: وہ ترکاریاں جو لمبی اور سخت ڈلدار ہوں۔

(ذ ك و)

ذَكَتِ (ن) النَّارُ کے معنی آگ جلنے اور روشن ہونے کے ہیں اور ذَكَّيْتُهَا (تفعیل) کے معنی جلانے اور روشن کرنے کے۔ ذُكَاءٌ: سورج

اور فجر کو سورج کا بیٹا تصور کر کے اسے اِبْنُ ذُكَاءَ کہا جاتا ہے اور اس کا حاجب اور دربان تصور کر کے اسے حَاجِبُ الشَّمْسِ کہہ دیتے ہیں۔
اور بطور کنایہ ذُكَاءٌ کے معنی ذہانت اور زود فہمی کے بھی آتے ہیں۔ جیسا کہ فُلَانٌ هُوَ شُعْلَةُ نَارٍ کا محاورہ ہے کہ فلاں آتش کا پرکالا ہے۔ ذَكَّيْتُ الشَّاةَ۔ بھیڑ ذبح کرنا۔
اصل میں تَذْكِيَةٌ (تفعیل) کے معنی حرارت غریزی خارج کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں مخصوص طریقہ سے حیاۃ زائل کرنے کو تَذْكِيَة کہتے ہیں[1]۔
اس اشتقاق کی اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ میت کو خَامِدٌ اور هَامِدٌ کہا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف بجھی ہوئی آگ کو مَيِّتَةٌ کہا جاتا ہے۔
ذَكَّى الرَّجُلُ۔ جب کوئی شخص سن رسیدہ ہو کر کثرت تجارب کی بنا پر ذکاوت اور فہم سے بہرہ مند ہو جائے تو اس کے متعلق یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اس اشتقاق کے اعتبار سے صرف اسی عمر رسیدہ کو مُذَكًّى کہا جائے گا جو کار آزمودہ اور ریاضت چشیدہ ہو اور پھر تجارب اور ریاضت عام طور پر چونکہ عمر رسیدہ آدمیوں میں پائے جاتے ہیں اس لئے ان کے بارے میں ذکاوت کا لفظ استعمال ہوا تو اس مناسبت سے عمدہ اور عمر رسیدہ گھوڑوں کے کے متعلق بھی ذُكَاءٌ کا لفظ بولا جانے لگا چنانچہ محاورہ ہے: جَرْيُ الْمُذَكِّيَاتِ غِلَابٌ۔ کہ بوڑھے گھوڑے دوڑ میں غالب رہتے ہیں[2]۔

(ذ ل ل)

اَلذُّلُّ (ن) یہ ذَلَّ يَذِلُّ کا مصدر ہے اور ذُلٌّ (بضمہ ذال) زور و قہر کی وجہ سے جھکنے کو کہتے ہیں مگر جب طبیعت کی تیزی اور سختی از خود مغلوب ہو جائے تو اسے ذِلٌّ (بکسرہ ذال) کہا جاتا ہے۔ لہٰذا آیت کریمہ:
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (۱۷-۲۴) کے معنی یہ ہیں کہ ان کے سامنے مقہور و مجبور بن کر رہو۔ اور ایک قراءت میں جَنَاحَ الذِّلِّ (بکسرہ ذال) ہے[3] یعنی ان کے سامنے نرم خو اور طاعت کیش بن کر رہا کرو۔ بغیر تاء کے ذُلٌّ اور تاء کے ساتھ ذِلَّةٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ قُلٌّ اور قِلَّةٌ ہے۔ قرآن میں ہے:
وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ (۱۰-۲۷) اور ان کے مونہوں پر ذلت چھا جائے گی۔
وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (۲-۶۱) اور (آخرکار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (اور بے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی۔
سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَذِلَّةٌ (۷-۱۵۲) ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا اور ذلت (نصیب ہوگی)

---

[1] ای فی قتری الا ما ذکیتم ای الا ان تذبحوا [2] المثل لقیس بن زہیر العبسی یفخر بھا یوصف بالتبریز علی اقرانہ فی حلبۃ الفضل راجع للمثل (اللسان ذکی) والمیدانی رقم ۸۲۱ وجمہرۃ الامثال ۸۰ والمشکل للقتبی ۵۶۵ وسمط اللآلی ۸۳ ۵ قال الیمنی فی طرتہ ... دی غلاءٌ والمثل فی الکامل ۲۱۹ والمستقصی والثمارہ ۲۸۵ والعسکری ۷۷، ۱/۳۰۳ والتبریزی ۲/۲۳ [3] وہی قراءۃ ابن عباس وعروۃ بن جبیر وغیرہما وبالضم قراءۃ الجمہور (ابوحیان ۶/۲۸ وابن الانباری ۳/۷۴)

ذَلَّتِ الدَّابَّةُ ذُلًّا۔ منہ زوری کے بعد سواری کا مطیع ہوجانا اور اس قسم کی مطیع اور منقاد سواری کو ذَلُولٌ (صفت فاعلی) کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔
لَا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ (۲-۷۱) کہ وہ بیل کام میں لگا ہوا نہ ہو۔ نہ تو زمین جوتتا ہو۔
پھر اگر انسان کی ذلت خود اس کے اپنے اختیار وارادہ سے ہو تو وہ محمود سمجھی جاتی ہے جیسا کہ قرآن نے مومنین کی مدح کرتے ہوئے فرمایا۔
أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ (۵-۵۴) جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں۔
وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ۔ (۳-۱۲۳) اور خدا نے جنگ بدر میں بھی تمہاری مدد کی تھی اور اس وقت بھی تو تم بے سروسامان تھے۔
فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا۔ (۱۶-۶۹) یعنی بغیر کسی قسم کی سرکشی کے نہایت مطیع اور منقاد ہو کر اپنے پروردگار کے صاف راستوں پر چلی جا اور آیت کریمہ:۔
وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا۔ (۷۶-۱۴) کے معنی یہ ہیں کہ وہ گچھے اس طرح جھکے ہوئے ہوں گے کہ ان کو نہایت آسانی سے توڑ سکیں گے۔
محاورہ ہے۔ (مثل)
اَلْأُمُورُ تَجْرِي عَلَى أَذْلَالِهَا۔ کہ تمام امور اپنے راستوں پر اور حسب مواقع جاری ہیں۔

(ذ م م)

ذَمَّهُ (ن) ذَمًّا کے معنی مذمت کرنے کے ہیں۔ اس سے صیغہ صفت مفعولی مَذْمُومٌ وَذَمِيمٌ آتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
مَذْمُومًا مَدْحُورًا۔ (۱۷-۱۸) نفرین سنکر اور درگاہ خدا سے راندہ ہو کر۔
اور بعض ذَمَمْتُهُ۔ صیغہ واحد متکلم میں دوسری میم کو تاء سے بدل کر ذَمَتُّهُ[1] بھی کہہ دیتے ہیں۔
اَلذِّمَامُ۔ وہ عہد وغیرہ جس کا ضائع کرنا باعث مذمت ہو۔ یہی معنی ذِمَّةٌ وَمَذَمَّةٌ کے ہیں۔ کہا گیا ہے لِيْ مَذَمَّةٌ فَلَا تَهْتِكْهَا کہ میرے عہد یا حرمت کا پاس کیجئے توڑیئے نہیں۔
أَذْهِبْ مَذَمَّتَهُمْ بِشَيْءٍ یعنی ان کے حق احترام کا بدلہ اتا رئیے۔
أَذَمَّ بِكَذَا۔ اس کی حرمت کو ضائع کر دیا۔ تہاون سے کام لیا۔
رَجُلٌ مَذَمٌّ[2] جس میں حرکت بہت کم ہو۔ ذَمَّةٌ کم پانی والا کنواں۔ چیونٹی کے انڈوں کی طرح سفید سا مادہ جو ناک پر ظاہر ہو جاتا ہے اسے اَلذَّمِيمُ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[3]۔ (ر)
(۱۶۵) وَتَرَى الذَّمِيمَ عَلَى مَرَاسِنِهِمْ
يَوْمَ الْهِيَاجِ كَمَازِنِ النَّمْلِ

---

[1] ایضاً ذَمِمْتُ وَذَمَمْتُ (الصحاح) [2] ھو جھاذِمامٌ [3] قالہ الحادرۃ الذبیانی وفی روایۃ اللسان: کمازن الجثل وفی الجمہرۃ لابن درید عنب العجارع او عنب الہیاج (۱۹) بدل یوم الہیاج وفی روایۃ الابدال لابی الطیب (ا: ۱۹۶) وتری الذنیق قال فی الصحاح الذمیم المخاط والبول الذی یذم ویذن من قضیب التیس الذمیم البصا شیئ یخرج من مسام المارن کبیض النمل وذہب ابن درید الی ان الذمیم بہنا ہو الندی۔ راجع للبیت اللسان والتاج (جثل، ذمم، مزن) والصحاح (ذمم) و المخصص (۲: ۵۶، ۸/۱۵۰) والاساس (رسن) ومبادی اللغۃ للاسکافی ۷۶

لڑائی کے دن انکی ناک پر چیونٹی کے انڈوں کی طرح سفید سی پھنسیاں نظر آتی ہیں۔

(ذ ن ب)

ذَنَبُ الدَّآبَّةِ وَغَیْرِھَا۔ چوپایہ وغیرہ کی دم کو کہتے ہیں۔ پھر اس کا اطلاق کم مرتبہ اور رذیل آدمی پر ہونے لگا ہے چنانچہ محاورہ ہے :۔ ھُمْ اَذْنَابُ الْقَوْمِ۔ یعنی وہ رذیل ہیں اور اسی سے بطور استعارہ ٹیلوں میں پانی کے راستوں کو مَذَانِبُ التِّلَاعِ کہا جاتا ہے۔ اَلْمِذْنَبُ (رایضًا) وہ کھجور جو پچھلی جانب سے پکنا شروع ہو۔

اَلذَّنُوْبُ۔ لبی دم والا گھوڑا۔ دم دار ڈول مَعْجُلُ کی طرح بطور استعارہ ذَنُوْب کے معنی بھی نصیبہ اور حصہ آجاتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔ فَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحَابِھِمْ۔ (۵۱-۵۹) کہ ان ظالموں کے لئے بھی (عذاب کی) نوبت مقرر ہے جس طرح ان کے ساتھیوں کی نوبت مقرر تھی۔

اَلذَّنْبُ (ض) کے اصل معنی کسی چیز کی دم پکڑنا کے ہیں کہا جاتا ہے ذَنَبْتُہٗ میں نے اس کی دم پر مارا دم کے اعتبار سے ہر اس فعل کو جس کا انجام برا ہو اسے ذَنْبٌ کہہ دیتے ہیں اسی بنا پر انجام کے اعتبار سے گناہ کو تَبِعَۃٌ بھی کہا جاتا ہے۔ ذَنْبٌ کی جمع ذُنُوْبٌ ہے۔ قرآن میں ہے :۔ فَاَخَذَھُمُ اللّٰہُ بِذُنُوْبِھِمْ (۳-۱۱) تو خدا نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب (عذاب میں) پکڑ لیا تھا۔

فَکُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْبِہٖ (۲۹-۴۰) تو ہم نے سب کو ان کے گناہوں کے سبب پکڑ لیا۔ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ (۳-۱۳۵) اور خدا کے سوا گناہ بخش بھی کون سکتا ہے۔ وَغَیْرُ ذٰلِکَ مِنَ الْاٰیَاتِ ؁

(ذ ھ ب)

اَلذَّھَبُ۔ سونا۔ اسے ذَھَبَۃٌ بھی کہا جاتا ہے۔ رَجُلٌ ذَھِبٌ۔ جو کان کے اندر زیادہ سونا دیکھ کر ششدرہ جائے۔ شَیْءٌ مُّذَھَّبٌ (او مُذْھَبٌ) زراندودہ طلاء کی ہوئی چیز۔ کُمَیْتٌ مُّذَھَّبٌ (او مُذْھَبٌ) کمیت گھوڑا جس کی سرخی پر زردی غالب ہو۔ گویا وہ سنہری رنگ کا ہے۔

اَلذَّھَابُ (والذُّھُوْبُ) کے معنی چلاجانے کے ہیں۔ ذَھَبَ (ف) بِالشَّیْءِ وَاَذْھَبَہٗ۔ لے جانا۔ یہ اعیان و معانی دونوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔ اِنِّیْ ذَاھِبٌ اِلٰی رَبِّیْ (۳۷-۹۹) کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جانے والا ہوں۔ فَلَمَّا ذَھَبَ عَنْ اِبْرَاھِیْمَ الرَّوْعُ (۱۱-۷۴) جب ابراہیمؑ سے خوف جاتا رہا۔ اور آیت کریمہ: فَلَا تَذْھَبْ نَفْسُکَ عَلَیْھِمْ حَسَرَاتٍ (۳۵-۸) تو ان لوگوں پر افسوس کرکے تمہارا دم نہ نکل جائے۔

میں ذَھَابِ نَفْسٍ موت سے کنایہ ہے اور فرمایا :۔ اِنْ یَّشَاْ یُذْھِبْکُمْ وَیَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِیْدٍ (۱۴-۱۹) اگر وہ چاہے تو تمہیں نابود کردے اور (تمہاری جگہ) نئی مخلوق پیدا کردے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (۳۵-۳۴) وہ کہیں گے خدا کا شکر ہے جس نے ہم سے غم دور کیا۔

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ (۳۳-۳۳) خدا چاہتا ہے تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دور کر دے۔

اور آیت:۔ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ (۴-۱۹) کے معنی یہ ہیں کہ تم ان کو اپنے گھروں میں اس لئے نہ روک رکھو کہ اس طرح مہر وغیرہ کچھ تم ان سے واپس لو۔ اور فرمایا۔

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ (۸-۴۶) اور آپس میں جھگڑا نہ کرنا (ایسا کرو گے تو) تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہارا اقبال جاتا رہے گا۔

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ (۲-۱۷) تو خدا نے ان لوگوں کی روشنی زائل کر دی۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ (۲-۲۰) اور اگر خدا چاہتا تو ان کے کانوں (کی شنوائی) ..... کو زائل کر دیتا۔

لَیَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیْ (۱۱-۱۰) تو (خوش ہو کر) کہتا ہے کہ (آہا) سب سختیاں مجھ سے دور ہو گئیں۔

(ذ ھ ل)

اَلذُّهُوْلُ (ف) ایسی مشغولیت جو غم و نسیان کی موجب ہو۔ کہا جاتا ہے:۔ ذَهَلَ عَنْ كَذَا۔ وہ اس سے غافل ہو گیا۔

اَذْهَلَهٗ كَذَا۔ فلاں چیز نے غافل کر دیا۔ قرآن میں ہے۔

یَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ (۲۲-۲) (اے مخاطب) جس دن تو اس کو دیکھے گا (اس دن یہ حال ہو گا کہ) تمام دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو بھول جائیں گی۔

(ذ و)

ذُوْ (والا - صاحب) یہ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے (۱) اول یہ کہ اسماء (اجناس و انواع) کے ساتھ توصیف کے لئے اسے ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ اسم ضمیر کی طرف مضاف نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ اسم ظاہر کی طرف مضاف ہوتا ہے اور اس کا تثنیہ جمع بھی آتا ہے۔ اور مونث کے لئے ذَاتُ کا صیغہ استعمال ہوتا ہے اس کا تثنیہ ذَوَاتَا اور جمع ذَوَاتُ آتی ہے۔ اور یہ تمام الفاظ مضاف ہو کر استعمال ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (۲-۲۵۱) لیکن خدا اہل عالم پر بڑا مہربان ہے۔

ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰی (۵۳-۶) (یعنی جبرئیل) طاقتور نے پھر وہ پورے نظر آئے۔

وَذِی الْقُرْبٰی (۲-۸۳) اور رشتہ داروں۔

وَیُؤْتِ كُلَّ ذِیْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ (۱۱-۳) اور ہر صاحب فضل کو اسکی بزرگی (کی داد) دیگا۔

ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی (۲-۱۷۷) رشتہ داروں اور یتیموں۔

اِنَّهٗ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۱۱-۵) وہ تو دلوں تک کی باتوں سے آگاہ ہے۔

وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ (۱۸-۱۸) اور ہم ان کو دائیں اور بائیں کروٹ بدلاتے ہیں۔

وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ

(۸-۷) اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے شان وشوکت (یعنی بے ہتھیار) ہے وہ تمہارے ہاتھ آجائے۔

ذَوَاتَا اَفْنَانٍ۔ (۵۵-۴۸) ان دونوں میں بہت سی شاخیں (یعنی قسم قسم کے میووں کے درخت ہیں۔ علمائے معانی (منطق وفلسفہ) ذات کے لفظ کو بطور استعارہ عینِ شے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہ جوہر اور عرض دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اور پھر کبھی یہ مفرد (یعنی بدونِ اضافت کے استعمال ہوتا ہے۔ اور کبھی اسم ضمیر کی طرف مضاف ہو کر اور کبھی معرف باللام ہو کر۔ اور یہ لفظ بمنزلہ نفس اور خاصہ کے بولا جاتا ہے۔ اور نَفْسُهٗ وَخَاصَّتُهٗ کی طرح ذَاتُهٗ بھی کہا جاتا ہے۔ مگر یہ عربی زبان کے محاورات سے نہیں ہے (۲) ذو بنی طی ذُو بمعنی اَلَّذِیْ استعمال کرتے ہیں اور یہ رفعی، نصبی، جری، جمع اور تانیث کی صورت میں ایک ہی حالت پر رہتا ہے جیساکہ شاعر نے کہا ہے ع (الوافر)

(۱۶۴) وَبِئْرِیْ ذُوْحَفَرْتُ وذُوْطَوَیْتُ
یعنی کنواں جسے میں نے کھودا اور صاف کیا ہے۔

(ذ ا)

ہاں "ھٰذَا" میں "ذَا" کا لفظ اسم اشارہ ہے جو محسوس اور معقول چیز کی طرف اشارہ کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ ھٰذِہٖ وَھٰذِیْ وھَاتَا۔ ان میں سے صرف ھَاتَا کا تثنیہ ھَاتَانِ آتا ہے۔ ھٰذِہٖ اور ھٰذِیْ کا تثنیہ استعمال نہیں ہوتا۔ قرآن میں ہے:۔

اَرَاَیْتَكَ هٰذَا الَّذِیْ كَرَّمْتَ عَلَیَّ۔ (۱۷-۶۲) کہ دیکھ تو یہی وہ ہے جسے تونے مجھ پر فضیلت دی ہے۔

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ (۳۸-۵۳) یہ وہ چیزیں ہیں جن کا ...... تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ۔ (۵۱-۱۴) یہ وہی ہے جس کے لئے تم جلدی مچایا کرتے تھے۔

اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ (۲۰-۶۳) کہ یہ دونوں جادوگر ہیں۔

هٰذِهِ النَّارُ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۔ (۵۲-۱۴) یہی وہ جہنم ہے جس کو تم جھوٹ سمجھتے تھے۔

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِیْ یُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ۔ (۵۵-۴۳) یہی وہ جہنم ہے جسے گنہگار لوگ جھٹلاتے تھے۔

"ھٰذَا" کے بالمقابل جو چیز اپنی ذات کے اعتبار سے دور ہو یا باعتبار مرتبہ بلند ہو۔ اس کے لئے ذَاكَ اور ذٰلِكَ استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ (۲-۱،۲) الٓمّٓ یہ کتاب

ذٰلِكَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰهِ (۱۸-۱۷) یہ خدا کی نشانیوں میں سے ہے۔

ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ یَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى۔ (۶-۱۳۱) یہ اس لئے کہ تمہارا پروردگار ایسا نہیں ہے کہ بستیوں کو ...... ہلاک کردے۔

---

(۱) قالہ سنان بن فحل الطائی حین اختصم الی عبدالرحمٰن بن الضحاک والی المدینۃ (۱۰۳-۱۰۴) ایام یزید بن عبدالملک والبیت من خمسۃ اورد ھا ابوتمام فی الحماسۃ رقم ۱۹۲ المرزوقی وقد عیب بہ علی المؤلف ایرادہ فی باب الحماسۃ راجع شرح الحماسۃ ابن الدین الطبرسی) وفی اللسان (ذوو) غیر منسوب (امالی الشجریۃ (۲: ۳۰۷) والخزانۃ (۲: ۱۱ ۵) ۱۲

(ماذا)

اور "مَاذَا" بھی دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ اول یہ کہ "مَا" "ذَا" کے ساتھ مل کر بمنزلہ ایک اسم کے ہو۔ دوم یہ کہ ذَا بمنزلہ اَلَّذِیْ کے ہو اور مَا بمعنی اَیُّ شَیْءٍ کے ہو۔ پہلی قسم کی مثال جیسے:۔

عَمَّاذَا تَسْأَلُ۔ (کہ کس چیز کے بارے میں سوال کرتے ہو) اس صورت میں چونکہ "مَا" اکیلا استفہام کے لئے نہیں ہے بلکہ "ذَا" کے ساتھ مل کر ایک اسم بنتا ہے۔ اس لئے "مَا" کے الف کو حذف نہیں کیا گیا۔ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے[1] (الوافر)

(۱۶۷) دَعِیْ مَاذَا عَلِمْتِ سَأَتَّقِیْهِ

یعنی جو چیز تجھے معلوم ہے اسے چھوڑ دے میں اس سے بچنے کی کوشش کرونگا۔ اور آیت کریمہ:۔

یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ؕ (۲-۲۱۹)

اور یہ بھی تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کونسا مال خرچ کریں۔

میں جو لوگ قُلِ الْعَفْوَ میں اَلْعَفْوَ کو منصوب پڑھتے ہیں۔ وہ "مَاذَا" کو بمنزلہ ایک اسم کے مانتے ہیں یعنی کونسی چیز صرف کریں مگر جن کے نزدیک "اَلْعَفْوُ" مرفوع ہے ان کے نزدیک ذَا بمعنی اَلَّذِیْ ہے اور مَا استفہامیہ ہے اَیْ مَا الَّذِیْ یُنْفِقُوْنَ یعنی وہ کونسی چیز ہے جسے خرچ کریں۔ اس بنا پر آیت کریمہ:۔

مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۱۶-۲۴) کہ تمہارے پروردگار نے کیا اتارا ہے تو کہتے ہیں کہ (وہ تو) پہلے لوگوں کی حکایتیں ہیں۔ میں اَسَاطِیْرُ پر رفع اور نصب دونوں جائز ہیں[2]۔

(ذ و د)

ذَادَهٗ۔ (ن) عَنْ كَذَا کے معنی کسی چیز سے دفع کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَیْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ (۲۸-۲۳) اور دیکھا ان کے ایک طرف دو عورتیں (اپنے مال کو) روکے کھڑی ہیں۔ یعنی اپنے ذَوْدٌ کو روکے کھڑی ہیں۔ اور ذَوْدٌ دس اونٹوں کی جماعت کو کہا جاتا ہے۔

(ذ و ق)

اَلذَّوْقُ (ن) کے معنی چکھنے کے ہیں۔ اصل میں ذَوْقٌ کے معنی تھوڑی چیز کھانے کے ہیں۔ کیونکہ کسی چیز کو زیادہ مقدار میں کھانے پر اَكْلٌ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قرآن نے عذاب کے متعلق ذوق کا لفظ اختیار کیا ہے اس لئے کہ عرف میں اگرچہ یہ قلیل چیز کھانے کے لئے استعمال ہوتا ہے مگر لغوی معنی کے اعتبار سے اس میں معنی کثرت کی صلاحیت موجود ہے۔ لہٰذا معنی عموم کے پیش نظر عذاب کے لئے یہ لفظ اختیار کیا ہے۔ تاکہ قلیل وکثیر ہر قسم کے عذاب کو شامل ہوجائے قرآن میں بالعموم یہ لفظ عذاب کے

---

[1] تالہ المثقب العبدی عائذ بن محصن وتمامہ، لٰکن بالمغیب نبئینی۔ والبیت فی الخزانۃ (۲: ۵۵۴) وابن ہشام (۱: ۳۳۳) والعینی (۱: ۴۸۸) والسیوطی ۶۹ قال السیوطی اورد المؤلف فی "ماذا" علی انہا موصول اوجنس بمعنی ای شیئ وعلمت ضبطہ المناص بکسر التاء والاخفش عن ابی اسحاق بعضہا والسان (ذو) ونسبہ الی ابی حیۃ النمیری والبحر ۱۱۹/۱ وانا الکتاب ا ... والزمخشری بغیر عزو ۱۲ [2] قارن المشکل للقتیبی (۱۲۴-۱۲۵) ۱۲

ساتھ آیا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ (۴-۵۹) تاکہ (ہمیشہ عذاب) کا مزہ چکھتے رہیں۔
وَقِيلَ لَهُمْ ذُوقُوا عَذَابَ النَّارِ (۳۲-۲۰) اور ان سے کہا جائیگا کہ دوزخ کے مزے چکھو۔
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنتُمْ تَكْفُرُونَ (۳-۱۰۶) اب کفر کے بدلے (جو دنیا میں کرتے تھے) عذاب (کے مزے) چکھو۔
ذُقْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ (۴۴-۴۹) (اب) مزہ چکھو تو بڑی عزت والا (اور) سردار ہے۔
إِنَّكُمْ لَذَائِقُوا الْعَذَابِ الْأَلِيمِ (۳۷-۳۸) بے شک تم تکلیف دینے والے عذاب کا مزہ چکھنے والے ہو۔
ذَٰلِكُمْ فَذُوقُوهُ (۸-۱۴) یہ مزہ تو یہاں چکھو۔
وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ (۳۲-۲۱) اور ہم ان کو (قیامت کے) بڑے عذاب کے سوا عذاب دنیا کا بھی مزہ چکھائیں گے۔
اور بعض مقامات پر رحمت کے ساتھ بھی آیا ہے جیسے فرمایا:۔
وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً (۱۱-۹) اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے نعمت بخشیں۔
وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ (۱۱-۱۰) اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد آسائش کا مزہ چکھائیں۔
اور کبھی (بطور استعارہ) ابتلاء و اختبار کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے اَذَقْتُهُ كَذَا فَذَاقَ میں نے اسے مزہ چکھایا چنانچہ اس نے چکھ کر لیا۔ فُلَانٌ ذَاقَ كَذَا وَأَنَا أَكَلْتُهُ (مثل) فلاں نے تو اسے چکھا ہے اور میں کھا چکا ہوں یعنی میں اس سے زیادہ باخبر ہوں۔ اور آیت کریمہ:۔
فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ (۱۶-۱۱۲) تو خدا نے ان کے اعمال کے سبب ان کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا کر (ناشکری کا) مزہ چکھایا۔
میں لباس کے ساتھ ذوق لفظ استعمال ہوا ہے کیونکہ اس سے اختبار و ابتلاء مراد ہے یعنی بھوک اور خوف سے اس طرح دوچار کیا کہ وہ ان کا تجربہ کرنے لگے بعض نے کہا ہے کہ یہاں در اصل دو جملے ہیں اور تقدیر کلام یہ ہے اَذَاقَهَا طَعْمَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ وَأَلْبَسَهَا لِبَاسَهُمَا۔ یعنی انہیں بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا اور ان دونوں کا لباس اوڑھا دیا۔ اور آیت کریمہ:۔
وَإِذَا أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً (۴۲-۴۸) اور جب ہم انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں۔
میں رَحْمَة کے ساتھ اَذَاقَ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور رحمة کے بالمقابل سَيِّئَة (یعنی سختی اور مصیبت) کے لئے اَصَابَ کا لفظ آتا ہے تو لفظ اَذَاقَ لاکر تنبیہ کی ہے کہ انسان ادنیٰ سی نعمت پاکر اترا جاتا ہے اور گھمنڈ کرنے لگ جاتا ہے اس سے آیت کریمہ:۔
كَلَّا إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ۔ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ (۹۶-۶،۷) مگر انسان سرکش ہو جاتا ہے جبکہ اپنے تئیں غنی دیکھتا ہے۔
کے مفہوم کی طرف اشارہ ہے۔

کِتَابُ الرَّاۗءِ

(ر ب ب)

اَلرَّبُّ (ن) کے اصل معنی تربیت کرنا یعنی کسی چیز کو تدریجاً نشوونما دے کر حد کمال تک پہنچانا کے ہیں اور رَبَّہٗ، وَرَبَّاہُ وَرَبَّبَہٗ تینوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں کسی نے کہا ہے۔ لَاَنْ یَّرُبَّنِیْ رَجُلٌ مِّنْ قُرَیْشٍ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ یَّرُبَّنِیْ رَجُلٌ مِّنْ هَوَازِنَ۔ کہ کسی قریشی کا سردار ہونا مجھے اس سے زیادہ عزیز ہے کہ بنی ہوازن کا کوئی آدمی مجھ پر حکمرانی کرے۔ رَبٌّ کا لفظ اصل میں مصدر ہے اور استعارۃً بمعنی فاعل استعمال ہوتا ہے اور مطلق (یعنی اضافت اور لام تعریف سے خالی) ہونے کی صورت میں سوائے اللہ تعالیٰ کے، جو جملہ موجودات کے مصالح کا کفیل ہے، اور کسی پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا چنانچہ ارشاد ہے۔ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَرَبٌّ غَفُوْرٌ (۳۴-۱۵) عمدہ شہر اور (آخرت میں) گناہ بخشنے والا پروردگار۔ نیز فرمایا:۔

وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اور وہ تم سے (کبھی بھی) یہ نہیں کہے گا کہ فرشتوں اور انبیاء کرام کو خدا مانو (یعنی انہیں معبود بناؤ اور مسبب الاسباب اور مصالح عباد کو کفیل سمجھو (۳-۸۰)

اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور دوسروں پر بھی۔ چنانچہ فرمایا:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱-۱) ہر طرح کی حمد خدا ہی کو (سزاوار) ہے (جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

اَللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ۔ (۳۷-۱۲۶) (یعنی اللہ کو جو تمہارا (بھی) پروردگار (ہے) اور تمہارے پہلے آباؤاجداد کا (بھی)

رَبُّ الدَّارِ گھر کا مالک۔ رَبُّ الْفَرَسِ گھوڑے کا مالک اسی معنی کے اعتبار سے فرمایا:۔

اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ (۱۲-۴۲) اپنے آقا سے میرا بھی تذکرہ

لہ قالہ صفوان بن امیۃ، کما فی الکشاف ۱/۸ والمغازی لابن اسحاق ومن طریقہ اخرجہ ابن حبان فی صحیحہ والبیہقی فی الدلائل و ذکر الدارقطنی فی الغرائب عن الزہری مرسلاً کما ذکرہ والصواب ان صفوان قالہ لکلدۃ بن حنبل اخیہ من امہ وحدیثہ انہ لما انہزم الناس عن الرسول (صلی اللہ علیہ وسلم) یوم حنین وتکلم الناس فقال سفیان بن حرب لا تنتھی ہزیمتہم دون البحر وصرح کلدۃ بن حنبل الا بطل السحر الیوم فقال لہ صفوان اسکت فض اللہ فاک انظر للکلمۃ سیرۃ ابن ہشام ۴/۸۷ واللسان (ریب) والفائق ۲/ ۴۸ انما ضداد ابن السکیت ۴/۲۰ والاضداد ابن الطیب ۴/۳۱ وفی اللسان (رب) وکذا قال ابن عباس فی حوار لابن الزبیر لان یربنی بنو عمی احب الی من ان یربنی غیرہم یعنی ان بنی امیۃ خیر منک ۱۲

کرنا۔ سو شیطان نے اس کو اپنے آقا سے تذکرہ کرنا بھلا دیا۔

اِرْجِعْ اِلٰی رَبِّكَ۔ (۱۲-۵۰) اپنے سرکار کے پاس لوٹ جاؤ۔ اور آیت:۔

مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ۔ (۱۲-۲۳) (یوسف نے کہا) معاذ اللہ وہ (تمہارا شوہر) میرا آقا ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ رَبِّيْ سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور بعض نے عزیز مصر مراد لیا ہے۔ لیکن پہلا قول انسب معلوم ہوتا ہے[1]۔

رَبَّانِيٌّ بقول بعض یہ رَبَّانَ (صیغہ صفت) کی طرف منسوب ہے۔ لیکن عام طور پر فَعْلَان (صفت) فَعِلَ سے آتا ہے۔ جیسے عَطْشَانُ سَكْرَانُ اور فَعَلَ (بفتحہ عین) سے بہت کم آتا ہے جیسے۔ نَعْسَانَ (مِنْ نَعَسَ)

بعض نے کہا ہے کہ یہ رَبٌّ (مصدر) کی طرف منسوب ہے اور رَبَّانِيٌّ وہ ہے جو علم کی پرورش کرے جیسے حکیم (یعنی جو حکمت کو فروغ دے۔) اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ رَبٌّ مصدر کی طرف ہی منسوب ہے اور رَبَّانِيٌّ وہ ہے۔ جو علم سے اپنی پرورش کرے درحقیقت یہ دونوں معنی باہم متلازم ہیں کیونکہ جس نے علم کی پرورش کی تو اس نے علم کے ذریعہ اپنی ذات کی بھی تربیت کی اور جو شخص اس کے ذریعہ اپنی ذات کی تربیت کریگا وہ علم کو بھی فروغ بخشے گا۔

۲ بعض نے کہا ہے کہ یہ رَبٌّ بمعنی اللہ کی طرف منسوب ہے اور رَبَّانِيٌّ بمعنی اِلٰهِيٌّ ہے (یعنی اللہ والا) اور اس میں الف نون زائدتان ہیں جیسا کہ جِسْمٌ ولِحْيَةٌ کی نسبت میں جِسْمَانِيٌّ ولِحْيَانِيٌّ کہا جاتا ہے[2]۔ حضرت علیؓ کا قول ہے (۱۶۸)

اَنَا رَبَّانِيُّ هٰذِهِ الْاُمَّةِ میں اس امت کا عالم ربانی ہوں اس کی جمع رَبَّانِيُّوْنَ ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے:۔

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ (۵-۶۳) انہیں ان کے رَبِّيْ (یعنی مشائخ) کیوں منع نہیں کرتے۔

كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ (۳-۷۸) (بلکہ دوسروں سے کہیگا) کہ تم خدا پرست ہو کر رہو۔

اور ۳ بعض نے کہا ہے کہ رَبَّانِيٌّ اصل میں سریانی لفظ ہے اور یہی قول انسب معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ عربی زبان میں یہ لفظ بہت کم پایا جاتا ہے[3] اور آیت:۔ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ (۳-۱۴۵) بہت سے اللہ والوں نے۔ میں رِبِّيٌّ بمعنی رَبَّانِيٌّ ہے[4]۔

اَلرُّبُوْبِيَّةُ وَالرَّبَابِيَّةُ یہ دونوں مصدر ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے رُبُوْبِيَّةٌ اور دوسروں کے لئے رَبَابِيَّةٌ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

اَلرَّبُّ (صیغہ صفت) جمع ارباب۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] وهذا هو قول الزجاج راجع فتح القدير للشوكاني ۳/۲۷ ادا لفيوضات الالٰهية ۲/۵۴۴ [2] والزائدتان للمبالغة في النسبة كما في رقباني ولحياني راجع الكتاب لسيبويه واضداد ابي الطيب ۳۰۵ [3] قال ابو عبيدة في مجازه (۱: ۹۷) لم يعرفوا ربانيين وفي العرب للجواليقي (۱۶۱) قال ابو عبيد احسن الكلمة ليس بعربية انما هي عبرانية او سريانية وذالك لان ابا عبيدة زعم ان العرب لا تعرف الربانيين۔ زاد ابو عبيد وانما عرفها الفقهاء واهل العلم راجع ايضا اللسان (ربب) وانظره في القرطبي ۴: ۱۲۲ و غريب ابي عبيد [4] في مجاز ابي عبيدة: الربيون الجماعة الكثيرة والواحد منها رِبِّيٌّ ايضا فارن الفتح ۸/۱۵۵

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَہَّارُ (۱۲-۳۹) بھلا دیکھو تو سہی کہ جدا جدا معبود اچھے یا خدائے یگانہ اور زبردست۔

اصل تو یہ تھا کہ رَبٌّ کی جمع نہ آتی۔ کیونکہ قرآن پاک میں یہ لفظ خاص کر ذات باری تعالیٰ کیلئے استعمال ہوا ہے لیکن عقیدۂ کفار کے مطابق بصیغہ جمع استعمال ہوا ہے اور سوا اَرْبَابٌ کے علاوہ اس کی جمع اَرِبَّۃٌ وَرُبُوْبٌ بھی آتی ہے۔ چنانچہ شاعر نے کہا ہے[1] (بسیط)

(۱۶۸) کَانَتْ اَرِبَّتُھُمْ بَھْزٌ وَغَرَّھُمْ
عَقْدُ الْجِوَارِ وَکَانُوْا مَعْشَرًا غُدُرًا

ان کے ہم عہد بنی بہز تھے جنہیں عقد جوار نے مغرور کر دیا اور درحقیقت وہ غدار لوگ ہیں۔

دوسرے شاعر نے کہا ہے[2] (طویل)

(۱۶۹) وَکُنْتَ امْرَءًا اَفْضَتْ اِلَیْکَ رِبَابَتِیْ
وَقَبْلَکَ رَبَّتْنِیْ فَضِعْتُ رُبُوْبُ

تم وہ آدمی ہو جس تک میری سرپرستی پہنچی ہے تم سے پہلے بہت سے میرے سرپرست بن چکے ہیں مگر میں ضائع ہوگیا ہوں۔ رَبَابَۃٌ عہد و پیمان یا اس چیز کو کہتے ہیں جس میں قمار بازی کے تیر لپیٹ کر رکھے جاتے ہیں۔

رَابَّۃٌ وہ بیوی جو پہلے شوہر سے اپنی اولاد کی تربیت کر رہی ہو۔ اس کا مذکر رَابٌّ ہے۔ لیکن وہ اولاد جو پہلے شوہر سے ہو اور دوسرے شوہر کی زیر تربیت ہو یا پہلی بیوی سے ہو اور دوسری بیوی کی آغوش میں پرورش پا رہی ہو۔ اسے رَبِیْبٌ یا رَبِیْبَۃٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع رَبَائِبُ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

وَرَبَائِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ (۴-۲۳) اور تمہاری بیویوں کی (پچھلی) اولاد جو تمہاری گودوں میں (پرورش پاتی) ہے۔

رَبَّیْتُ الْاَدِیْمَ بِالسَّمْنِ میں نے چمڑے کو گھی لگا کر نرم کیا۔

رَبَّیْتُ الدَّوَاءَ بِالْعَسَلِ میں نے شہد سے دوا کی اصلاح کی سِقَاءٌ مَرْبُوْبٌ پانی مشک جسے تیل لگا کر نرم کیا گیا ہو۔ شاعر نے کہا ہے[3] (طویل)

(۱۷۰) فَکُوْنِیْ لَہٗ کَالسَّمْنِ رُبَّتْ لَہُ الْاَدَمُ

تم اس کے لئے ایسی ہو جاؤ جیسے رُبَّتْ لگا ہوا چمڑا گھی کے لئے ہوتا ہے۔

اَلرَّبَابُ بادل کو کہتے ہیں کیونکہ وہ نباتات کی پرورش کرتا اور اسے بڑھاتا ہے اسی معنی کے اعتبار سے مَطَرٌ کو دَرٌّ (دودھ) اور

---

[1] قالہ ابو ذؤیب الہذلی و بہز بطن من سلیم والبیت فی اللسان (رب) والمعانی الکبیر ۴۸ [2] قالہ علقمۃ بن عبدہ فی قصیدۃ (مفضلیۃ (۲: ۴۹) وفی روایۃ اما نتی بدل ربابتی وربتنی (بتاء التانیث والبیت فی منتہی الطلب (۱: ۲۹) والطبری (۱: ۴۴۸، ۳۱: ۲۲۷) واللسان (رب) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۴۲۲) والعقد الثمین ۱۰۷ وایام العرب ۵۷ وفی الہامش قال بعض مصححی اللسان قال الصاغانی والروایۃ "انت امرؤ" والمخاطب حارث بن نضلۃ [3] قالہ عمرو بن شاس الاسدی یخاطب امرأتہ ام حسان ابنۃ الحارث وکانت تکرہ ابنہ عرارًا فطلقہا ثم ندم ولام نفسہ وصدرہ فان کنت منی او ترید بن صحبتی۔ وقولہ ربت لہ الادم ای جعل فیہا الرب لئلا تفسد والادم واحدہ ادیم یرید الاسقیۃ التی یجعل فیہا الرب تصلح للسمن وفی روایۃ اسد الغابۃ بہ بدل لہ والبیت فی الحماسۃ مع المرزوقی ۲۸۰ والشعراء ۳۸۹ والکامل ۱۵۴ والطبقات لجمحی ۷۶ وانظر الخبر والابیات ایضًا فی الاغانی (۱۰: ۶۰) والامالی (۲: ۱۸۴-۱۸۵) وفی روایۃ رُبّت لہ الادم والتبریزی والسمط ۸۰۳

بادل کو تشبیہاً نَقُوحٌ (یعنی دودھیلی اونٹنی) کہا جاتا ہے کہ وہ ہے۔

اَرَبَّتِ السَّحَابَۃُ بدلی متواتر برستی رہی اور اسکے اصل معنی ہیں بدلی صاحب تربیت ہوگئی اس کے بعد اس سے ٹھہرنے کا معنی لے کر یہ لفظ کسی جگہ پر مقیم ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے اَرَبَّ فُلَانٌ بِمَکَانِ کَذَا اس نے فلاں جگہ پر اقامت اختیار کی۔

رُبَّ تقلیل کے لئے آتا ہے اور کبھی تکثیر کے معنی بھی دیتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْ کَانُوْا مُسْلِمِیْنَ (۱۵-۲) کافر بہتیرے ہی ارمان کریں گے (کہ) اے کاش (وہ بھی) مسلمان ہوئے ہوتے۔

(ر ب ح)

اَلرِّبْحُ وہ فائدہ جو خرید و فروخت سے حاصل ہو مجازاً ثمرۂ اعمال کو بھی رِبْحٌ کہا جاتا ہے۔ اس کی نسبت کبھی سامان تجارت کی طرف ہوتی ہے۔ اور کبھی صاحب سامان کی طرف۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔

فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُھُمْ (۲-۱۶) سو نہ تو ان کی تجارت سودمند ہوئی۔

کسی شاعر نے کہا ہے۔ (ر

(۱۷۱) قَرَوْا اَضْیَافَھُمْ رُبْحًا بِبُحٍّ

بعض نے کہا ہے کہ رُبَحٌ ایک پرندے کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ رُبَحٌ بمعنی چربی ہے لیکن ہمارے خیال میں رُبَحٌ سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جو رِبْحٌ سے حاصل ہوتی ہو جیسا کہ نقص سے جو اثر ظاہر ہوتا ہے اسے نقص کہا جاتا ہے اور بُحٌّ قرعہ اندازی یا قماربازی کے تیر کو کہتے ہیں۔ تو شعر کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اپنے مہمانوں کی مہمانداری سے تعریف کا بہت بڑا فائدہ حاصل کیا۔ جیسا کہ دوسرے شاعر نے کہا ہے[۲] (طویل)

(۱۷۲) فَاَوْسَعَنِیْ حَمْدًا وَاَوْسَعْتُہٗ قِرًی
وَاَرْخِصْ بِحَمْدٍ کَانَ کَاسِبُہُ الْاَکْلُ

اس نے میری تعریف میں فروگذاشت نہ کی اور میں نے بھی اس کی خوب مہمان نوازی کی۔ وہ تعریف کتنی سستی ہے جو چند لقموں سے حاصل ہو جائے۔

(ر ب ص)

اَلتَّرَبُّصُ کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ خواہ وہ انتظار سامان تجارت کی گرانی یا ارزانی کا ہو یا کسی امر کے واقع ہونے یا زائل ہونے کا انتظار ہو۔ تَرَبَّصْتُ لِکَذَا وَلِیْ رُبْصَۃٌ بِکَذَا وَتَرَبُّصٌ کسی چیز کا انتظار کرنا۔ قرآن میں ہے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ یَتَرَبَّصْنَ (۲-۲۲۸) مطلقہ عورتوں کو چاہئے کہ انتظار کریں۔

قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّیْ مَعَکُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ (۵۲-۳۱) ان سے کہو کہ (بہت اچھا تم بھی) انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔

قُلْ ھَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَا اِلَّا اِحْدَی الْحُسْنَیَیْنِ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِکُمْ (۹-۵۲) (اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہو کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں

---

[۱] قالہ خفاف بن ندبہ وتمامہ یعیش بفضلہ ان الحی سمر والبیت فی اللسان والحکم والتاج (ربح، بح)، وقبلہ: اذا الحسناء لم ترحض بدیھا ولم یقصر لھا بصر لیستر [۲] البیت فی الفاضل للمبرد ۸۲ والحماسۃ رقم: ۷۳۰ والمرزوقی ۱۵۰۹ فی ثلاثۃ بغیر عزو ۱۲

ہیں سے (خواہ نخواہ) ایک نہ ایک کا انتظار کرتے ہو اور ہم تمہارے حق میں انتظار کرتے ہیں۔

(ر ب ط)

رَبْطُ الْفَرَسِ کے معنی گھوڑے کو کسی جگہ پر حفاظت کے لئے باندھ دینے کے ہیں اور اسی سے رِبَاطُ الْجَیْشِ ہے یعنی فوج کا کسی جگہ پر متعین کرنا اور وہ مقام جہاں حفاظتی دستے متعین رہتے ہوں اسے رِبَاط کہا جاتا ہے۔ اور رَبَطْتُ وَرَابَطْتُ کا مصدر بھی رِبَاط آتا ہے اور مُرَابَطَۃٌ کے معنی حفاظت کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَمِنْ رِبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (۸-۶۰) اور گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھے رکھنے سے جس سے تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو مرعوب کرو۔
یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ (۳-۱۹۹) (ان تکلیفوں کو جو راہ خدا میں تم کو پیش آئیں) برداشت کرو اور ایک دوسرے کو صبر کی ترغیب دو اور دشمن کے مقابلے کے لئے تیار رہو۔
پس معلوم ہوا کہ مُرَابِطَۃٌ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اسلامی سرحدوں پر دفاع کے لئے پہرہ دینا اور دوسرے نفس کو ناجائز خواہشات سے روکنا اور اس میں کوتاہی نہ کرنا جیسے مجاہدۂ نفس کی صورت میں ہوتا ہے اور اس مجاہدۂ نفس کا ثواب بھی جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے[1] (—) مِنَ الرِّبَاطِ اِنْتِظَارُ الصَّلٰوۃِ بَعْدَ الصَّلٰوۃِ کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا بھی رباط ہے۔
فُلَانٌ رَابِطُ الْجَاْشِ۔ فلاں مضبوط دل ہے۔
چنانچہ قرآن میں ہے:۔
لَوْلَاۤ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰی قَلْبِهَا۔ (۲۸-۱۰) اگر ہم اس کے دل کو مضبوط نہ کئے رہتے (تو عجب نہ تھا کہ وہ ہمارا معاملہ ظاہر کر دیتیں۔
وَلِیَرْبِطَ عَلٰی قُلُوْبِكُمْ (۸-۱۱) تاکہ تمہارے دلوں کی ڈھارس بندھ جائے۔
اور اسی معنی کی طرف دوسرے مقام پر اشارہ فرمایا ہے۔
هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (۵۸-۲۲) وہ خدا ہی تو تھا جس نے مسلمانوں کے دلوں میں تحمل ڈالا اور اپنے فیضان غیبی سے ان کی تائید کی۔
کیونکہ ان کے دل ایسے نہیں تھے جیسے فرمایا:۔
وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ۔ (۱۴-۴۳) اور ان کے دل (ہیں کہ) ہوا ہوئے چلے جا رہے ہیں۔
اور اسی سے فُلَانٌ رَابِطُ الْجَاْشِ کا محاورہ ماخوذ ہے جس کے معنی مضبوط دل شخص کے ہیں۔

(ر ب ع)

اَرْبَعٌ وَاَرْبَعُوْنَ وَرُبْعٌ وَرِبَاعٌ ان سب کی ایک ہی اصل ہے۔ قرآن میں ہے:۔
ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ (۱۸-۲۲) (اصحاب کہف) تین تھے اور چوتھا ان کے ساتھ ان کا کتا تھا۔
اَرْبَعِیْنَ سَنَةً یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ۔ چالیس برس تک

---

[1] اخرجہ ابن حبان فی زوائدہ من حدیث جابر انظر رقم ۱۶۱ وفی روایۃ افضل الرباط انتظار الصلوٰۃ بعد الصلوٰۃ (عب وابن جریر عن ابی ہریرۃ) راجع کنز العمال ۱۲

وہ سرزمین ان کے نصیب نہ ہوگی اور) اس بیابان میں سرگرداں رہیں گے (۵ - ۲۶)

اَرْبَعِیْنَ لَیْلَۃً (۷ - ۱۴۲) (ربوں) چالیس رات (کا وعدہ پورا ہو گیا)

وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ (۴ - ۱۲) اور تم کچھ (ترکہ) چھوڑ مرو تو بیبیوں کا حصہ چوتھائی ہے۔

مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ (۴ - ۳) دو دو اور تین تین اور چار چار (عورتوں سے نکاح کر لو)۔

رَبَعْتُ الْقَوْمَ (۱) میں نے قوم سے چوتھائی حصہ وصول کیا (۲) میں نے انہیں چار بنا دیا۔

رَبَعْتُ الْحَبْلَ رسی کو چار ریشوں سے بٹنا

رِبْعٌ (۱) چار دن کے پیاسے اونٹ (۲) چوتھیا بخار

اَرْبَعَ اِبِلَهٗ اونٹوں کو چوتھے روز پانی پلانا۔

رَجُلٌ مَرْبُوْعٌ وَمُرْبِعٌ جسے چوتھیا بخار ہو۔

اَلْاَرْبِعَاءُ چہارشنبہ۔ کیونکہ عربی میں ہفتہ کا پہلا دن اتوار ہے۔ جسے یوم الاحد کہا جاتا ہے۔

رَبِیْعٌ موسم بہار (کیونکہ یہ سال کا چوتھا موسم ہے)، اسی سے محاورہ ہے:۔

رَبَعَ فُلَانٌ وَارْتَبَعَ اس نے فلاں جگہ پر موسم بہار گذارا مجازاً کسی جگہ پر اقامت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ اقامت موسم بہار میں ہو یا کسی اور موسم میں ہو، حتی کہ ہر منزل کو رَبْعٌ کہا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے اصل معنی موسم ربیع کی اقامت گاہ کے ہیں۔

اَلرُّبَعُ وَالرِّبْعِیُّ جانور کا وہ بچہ جو موسم ربیع میں پیدا ہوا اور موسم بہار جانوروں کی ولادت کے لئے چونکہ سال میں پہلا اور بہتر موسم ہے اس لئے استعارہ کے طور پر وہ بچہ جو کسی کے ہاں عالم شباب میں پیدا ہو اسے رِبْعِیٌّ کہا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے[1]۔

اَفْلَحَ مَنْ كَانَ لَهٗ رِبْعِیُّوْنَ۔ سعادت مند ہے وہ شخص جس کے ہاں عالم شباب میں اولاد ہو جائے۔

اَلْمِرْبَاعُ موسم بہار میں بچہ دینے والی اونٹنی۔

غَیْثٌ مُرْبِعٌ موسم بہار کی بارش۔

رَبَعَ الْحَجَرَ وَالْحِمْلَ پتھر یا بوجھ کو چاروں طرف سے پکڑ کر اٹھانا۔

اَلْمِرْبَعُ لکڑی جس کے ذریعہ چوپایہ پر بوجھ لادا جاتا ہے رَبِیْعَۃٌ وہ پتھر جو ورزش کے طور پر اٹھایا جاتا ہے۔

اِرْبَعْ عَلٰى ظَلْعِكَ۔ یعنی طاقت سے زیادہ کام نہ کرو یہ یا تو رَبَعَ بمعنی اِقَامَۃ سے ہے اور یا رَبَعَ الْحَجَرَ سے اَلْمِرْبَاعُ اموال غنیمت کا چوتھا حصہ جو رئیس قبیلہ وصول کیا کرتا تھا یہ رَبَعْتُ الْقَوْمَ سے ماخوذ ہے جس کے معنی رُبْع وصول کرنے کے ہیں اور اسی سے استعارہ کے طور پر رِبَاعَۃ بمعنی سیادت آتا ہے۔ مشہور محاورہ ہے:۔

لَا یُقِیْمُ رِبَاعَۃَ الْقَوْمِ اِلَّا فُلَانٌ کہ قوم کی سیاست کی باگ ڈور فلاں شخص ہی سنبھا سکتا ہے۔

رَبِیْعَۃٌ (ایضاً) اصل میں ڈبیہ کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ

---

[1] وقیلہ: ان بنی صبیۃ صیفیون والشطر قد اصبح مثلاً یضرب فی التندم علی مافات وقد تمثل بہا سلیمان بن عبد الملک وہو بجود بنفسہ الفائق (۲: ۲۵۱) والاخبار الطوال ۳۳۰ والمثل فی المیدانی (۱: ۴۱) والرجز ایضاً فی الاصلاح ۲۶۲، ۴۰۷ والحیوان (۱: ۱۰۹) والاشتقاق ۲۴۳، ۲۰۱ والعقد (۲: ۱۰۳) والمقاییس (۲: ۲۷۶) والالفاظ ۲۹۶ والفائق (۲: ۷۴) والمخصص (۱: ۳۰) والمحکم والتاج (ربع) جمہرۃ الامثال (۱: ۴) والسان (ربع، صیف) والشطر الثانی فی شرح الحماسۃ للمرزوقی ۱۳۹۵ والاول فی المعانی للقتبی ۳۱۱ واختلف فی اول قائلہ فقیل ہو رابی زید ۸۶ ہو اکثم بن صیفی وفی المیدانی سعد بن مالک بن ضبیعۃ وقیل بن معاویہ بن قشیر وفی محاضرات المؤلف (۲: ۲۰۱) قالہ دہقان لملک من ملوک العجم وفیہا الخبر وفی اللسان او اکثم بن صیفی ۱۲

اس کے چار طبقے یا چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔
اَلرُّبَاعِیَّتَانِ دو دانتوں کا نام۔ بعض نے کہا ہے کہ ان دونوں کے درمیان چونکہ چار دانتوں کا فاصلہ ہوتا ہے اس لئے انہیں رباعیتان کہا جاتا ہے۔
اَلْیَرْبُوْعُ جنگلی چوہا کیونکہ یہ چوکھا بل بناتا ہے۔
اَرْضٌ مَرْبَعَۃٌ بہت چوہوں والی زمین جیسا کہ زیادہ سوسمار والی زمین کو مَضَبَّۃٌ کہا جاتا ہے۔

(ر ب و)

رَبْوَۃٌ (مثلثۃ الراء) وَرَبَاوَۃٌ (بفتح الراء و کسرھا) بلند جگہ یا ٹیلے کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اِلٰی رَبْوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ (۲۳-۵۰)
ایک اونچی جگہ پر جو ٹھہرنے کے قابل اور شاداب بھی تھی)
ابو الحسن نے کہا ہے کہ رَبْوَۃٌ کا لفظ زیادہ جید ہے۔ کیونکہ اس کی جمع رُبًی آتی ہے۔ اور رَبَا فُلَانٌ فلاں اونچی جگہ پر چلا گیا۔ اور رَبْوَۃٌ کو رَابِیَۃٌ بھی کہا جاتا ہے گویا وہ خود بلندی پر ہے اور اسی سے رَبَا ہے جس کے معنی بڑھنے اور بلند ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَاِذَا اَنْزَلْنَا عَلَیْھَا الْمَاءَ اھْتَزَّتْ وَرَبَتْ۔ (۲۲-۵) پھر جب ہم اس پر پانی برسا دیتے ہیں تو وہ لہلانے اور ابھرنے لگتی ہے۔
فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا (۱۳-۱۷) پھر نالے پر پھولا ہوا جھاگ آگیا۔
فَاَخَذَھُمْ اَخْذَۃً رَّابِیَۃً (۶۹-۱۰) تو خدا نے بھی انہیں بڑا سخت پکڑا۔
اَرْبَی عَلَیْہِ کسی پر بلند ہونا یا کسی کی نگرانی کرنا۔
رَبَّیْتُ الْوَلَدَ فَرَبَا میں نے بچے کی تربیت کی چنانچہ وہ بڑھ گیا۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں رَبَّبْتُ ہے۔ تخفیف کے لئے ایک باء حذف کر دی گئی ہے۔ جیسا کہ تَظَنَّیْتُ کہ اصل میں تَظَنَّنْتُ ہے تخفیفًا ایک نون کو یاء سے تبدیل کر دیا ہے۔
اَلرِّبَا (سود) راس المال یعنی اصل سرمایہ پر جو بڑھوتی لی جائے وہ ربٰو کہلاتی ہے۔ لیکن شریعت میں خاص قسم کی بڑھوتی پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ زیادہ ہونے کے اعتبار سے فرمایا:۔
وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَ فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰہِ۔ (۳۰-۳۹) اور تم جو چیز (عطیہ) زیادہ لینے کے لئے دو تاکہ لوگوں کے اموال میں بڑھوتی ہو وہ اللہ کے یہاں نہیں بڑھے گی۔
اور آیت:۔
یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقٰتِ (۲-۲۷۶) اللہ سود کو بے برکت کرتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔ میں مَحْق کا لفظ لاکر اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ رِبا یعنی سود میں برکت نہیں ہوتی اس کے مقابلہ میں زکوٰۃ کے متعلق فرمایا:۔
وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ۔ (۳۰-۳۹) اور جو تم (محض) خدا کی رضا جوئی کے ارادے سے زکوٰۃ دیتے ہو تو جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہی اپنے دیئے ہوئے کو خدا کے ہاں بڑھا رہے ہیں۔
اَلْاَرْبِیَّانِ۔ سرینوں کے چڑھے۔
اَلرَّبْوُ سانس پھولنا۔ سانس پھول کر چونکہ اوپر کو چڑھتا ہے اس لئے اسے رَبْوٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ سانس پھولے ہوئے آدمی کے متعلق ھُوَ یَتَنَفَّسُ الصُّعَدَاءَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اور اَلرَّبِیْئَۃُ جس کے معنی جاسوس ہیں (ر ب ء) سے ہے اور اس

مادہ (ر ب د) سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

(ر ت ع)

رَتَعَ (ف) رَتْعًا وَرُتُوْعًا. وَرِتَاعًا کے اصل معنی جانوروں کے چرنے کے ہیں۔ پھر استعارہ کے طور پر انسانوں کے جی بھر کر کھانے پینے پر یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔

يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ (۱۲-۱۲) کہ (جنگل کی پھل پھلاری) کھائے پئے اور کھیلے (کودے)

اور تشبیہ کے طور پر (بدگوئی کے معنی میں بھی آتا ہے جیساکہ) شاعر نے کہا ہے[1] (رمل)

(۱۷۴) وَإِذَا خَلَوْا لَهُ لَحْمِي رَتَعْ

جب تنہائی میں اس کے پاس ہوتے ہیں تو میرا گوشت کھانے لگ جاتا ہے یعنی غیبت کرتا ہے۔

مویشی کے لئے (راتع کی جمع) رِتَاعٌ آتی ہے اور انسان کے لئے رَاتِعُوْنَ۔

(ر ت ق)

اَلرَّتْقُ۔ اس کے اصل معنی جوڑنا اور ملانا کے ہیں خواہ خلقی طور پر ہو یا صناعی طریقہ سے۔ قرآن میں ہے :۔

كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا (۲۱-۳۰) (کہ آسمان زمین) دونوں ایک ہیولیٰ تھے تو ہم نے (اس کو توڑ کر) زمین و آسمان کو الگ الگ کیا۔

رَتْقَاءُ وہ عورت جس کی شرمگاہ کے دونوں کنارے باہم چپیدہ ہوں اور اس سے ہم بستری نہ ہوسکے مشہور محاورہ ہے۔

فُلَانٌ رَاتِقٌ وَفَاتِقٌ فِيْ كَذَا (مثل) فلاں اس معاملہ میں کرتا دھرتا ہے۔

(ر ت ل)

اَلرَّتَلُ کسی چیز کا حسن تناسب کے ساتھ منتظم اور مرتب ہونا رَجُلٌ رَتَلُ الْاَسْنَانِ آدمی جس کے دانت آبدار اور حسن ترتیب کے ساتھ ہوں اور تَرْتِيْل کے معنی سہولت اور حسن تناسب کے ساتھ کسی کلمہ کو ادا کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا (۷۳-۴) اور قرآن کو خوب حسن ترتیب سے پڑھا کرو۔

وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيْلًا (۲۵-۳۲) اور ہم نے اسے نہایت عمدہ ترتیب اور تناسب کے ساتھ اتارا۔

(ر ج ج)

اَلرَّجُّ (ن) اس کے معنی کسی چیز کو ہلانے اور جنبش دینے کے ہیں اور اِرْتِجَاجٌ (افتعال) اس کا مطاوع ہے جس کے معنی ہلنے اور مضطرب ہونے کے ہیں۔ جیسے :۔ رَجَّهُ فَارْتَجَّ. اسے ہلایا چنانچہ وہ ہلنے لگا۔ قرآن میں ہے :

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا (۵۶-۴) (اور قیامت اس وقت واقع ہوگی) جب کہ زمین بڑے زور سے ہلنے لگے گی۔

اسی کو دوسرے مقام پر :۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ۔ الآیۃ (جب زمین بڑے زور سے ہلا دی جائے گی (۹۹-۱) سے تعبیر کیا ہے۔

اَلرَّجْرَجَۃُ اضطراب۔ كَتِيْبَةٌ رَجْرَاجَةٌ لشکر جرار

---

[1] منفید القافیۃ قالہ سوید بن کاہل الیشکری فی کلمۃ مفضلیۃ ۸۸ بیتًا بعضہا فی الامالی (۱:۱۰۱ / ۲:۱۹ / ۳:۱۹) وصدرہ : ویحیینی اذا لاقیتہ والبیت فی اللسان (رتع) والشعراء ۲۵ والخزانۃ (۱: ۵/۴۷) وفیہ ایضا الکشاف ۲۷ وفی روایۃ اذ یخلو بسل خلوا وجیب لی بلسل ویحیین ۱۲ ۞

جَارِیَۃٌ رَجْرَاجَۃٌ تھرتھرا کر چلنے والی چھوکری
اِذْ تَجَّ کَلَامُہٗ کلام کرتے وقت آواز میں گونج اور لہر پیدا ہونا۔
رِجْرِجَۃٌ تھوڑا سا پانی جو ہلانے سے گدلا ہو جائے

(ر ج ز)

اَلرِّجْزُ اس کے اصل معنی اضطراب کے ہیں اور اسی سے رَجَزَ الْبَعِیْرُ ہے جس کے معنی ضعف کے سبب چلتے وقت اونٹ کی ٹانگوں کے کپکپانے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھانے کے ہیں ایسے اونٹ کو اَرْجَزُ اور ناقہ کو رَجْزَاءُ کہا جاتا ہے اور شعر کے ایک بحر کا نام بھی رَجَزٌ ہے جس میں شعر پڑھنے سے زبان میں اضطراب سا معلوم ہوتا ہے اور جو قصیدہ اس بحر میں کہا جائے اسے اُرْجُوْزَۃٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع اَرَاجِیْزُ آتی ہے اور رَجَزَ فُلَانٌ وَ اُرْتَجَزَ کے معنی بحر رجز پر شعر بنانے یا اُرْجُوْزَہ پڑھنے کے ہیں اور رجز گو شاعر کو راجِزٌ، رَجَّازٌ اور رَجَّازَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت:۔
عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ۔ (۳۴-۵) (ان کیلئے) عذاب دردناک کی سزا ہے۔ میں لفظ رِجْز زلزلہ کی طرح عذاب سے کنایہ ہے۔ اور فرمایا:۔
اِنَّا مُنْزِلُوْنَ عَلٰٓی اَھْلِ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ (۲۹-۳۴) ہم ان پر ایک آسمانی آفت نازل کرنے والے ہیں۔
اور آیت کریمہ:۔
وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ۔ (۷۴-۵) اور نجاست سے الگ رہو۔
میں بعض نے کہا ہے کہ رُجْزٌ سے بت مراد ہیں۔ بعض نے اس سے ہر وہ عمل مراد لیا ہے جس کا نتیجہ عذاب ہو اور گناہ کو بھی مآل کے لحاظ سے عذاب کہا جا سکتا ہے۔ جیسے ندی بمعنی شبنم آجاتا ہے اور آیت:۔
وَیُنَزِّلُ عَلَیْکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَھِّرَکُمْ بِہٖ وَیُذْھِبَ عَنْکُمْ رِجْزَ الشَّیْطٰنِ۔ (۸-۱۱) اور آسمان سے تم پر پانی برسا رہا تھا تاکہ اس کے ذریعہ سے تم کو پاک کرے اور شیطانی گندگی کو تم سے دور کرے۔
میں رِجْزَ الشَّیْطٰنِ سے مراد خواہشات نفسانی ہیں جیسا کہ اس کے محل میں بیان کیا گیا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے کفر بہتان طرازی فساد انگیزی وغیرہا گناہ مراد ہیں جن کی کہ شیطان ترغیب دیتا ہے۔
رِجَازَۃٌ وہ کمبل جس میں پتھر وغیرہ باندھ کر اونٹ کے ہودہ ۔۔۔۔ کا توازن قائم رکھنے کیلئے ایک طرف باندھ دیتے ہیں اس میں بھی حرکت و اضطراب کے معنی ملحوظ ہیں۔

(ر ج س)

اَلرِّجْسُ پلید، ناپاک، جمع اَرْجَاسٌ کہا جاتا ہے۔ رَجُلٌ رِجْسٌ ناپاک آدمی وَرِجَالٌ اَرْجَاسٌ۔ قرآن میں ہے:۔
رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ (۵-۹۰) (توبس) ناپاک اور شیطانی کام ہیں۔
جاننا چاہیئے کہ رِجْسٌ چار قسم پر ہے (۱) صرف طبیعت کے لحاظ سے (۲) صرف عقل کی جہت سے (۳) صرف شریعت کی رو سے (۴) ہر سہ کی رو سے جیسے میتہ (مردار) سے انسان کو طبعی نفرت بھی ہے اور عقل و شریعت کی رو سے بھی ناپاک ہے رجس شرعی جیسے جوا اور شراب ہے کہ شریعت

نے انہیں رجس قرار دیا ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ چیزیں عقل کی رو سے بھی رجس ہیں چنانچہ آیت کریمہ۔ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (۲-۲۱۹) مگر فائدہ سے ان کا گناہ (اور نقصان) بڑھ کر ہے۔ میں اسی معنی پر تنبیہ کی ہے کیونکہ جس چیز کا نقصان اس کے نفع پر غالب ہو ضروری ہے کہ عقل سلیم اس سے مجتنب رہنے کا حکم دے اسی طرح کفار کو رجس قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہ شرک کرتے ہیں اور شرک عند العقل قبیح ترین چیز ہے جیسے فرمایا:۔ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ (۹-۱۲۵) اور جن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تو اس (سورت) نے ان کی (پہلی) خباثت پر ایک اور خباثت بڑھادی۔ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ۔ (۱۰-۱۰۰) اور خدا (شرک وکفر کی) نجاست انہیں لوگوں پر ڈالتا ہے جو دلائل وحدانیت میں عقل کو کام میں نہیں لاتے۔

بعض نے رِجْسٌ سے نتن (بدبو دار) اور بعض نے عذاب مراد لیا ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت:۔ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ (۹-۲۸) مشرک تو (نرے) گندے ہیں۔

میں مشرکین کو اور آیت کریمہ:۔ اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ (۶-۱۴۵) (یا سور کا گوشت کہ یہ چیزیں بیشک ناپاک ہیں میں خنزیر کے گوشت کو رجس کہا گیا ہے یعنی شرعاً ناپاک ہو اموری۔ رِجْسٌ وَرَجْزٌ سخت آواز رعد۔ بَعِيْرٌ رَجَّاسٌ مست اونٹ۔ غَمَامٌ رَاجِسٌ وَرَجَّاسٌ بہت گرجنے والا بادل۔

(ر ج ع)

اَلرُّجُوْعُ اس کے اصل معنی کسی چیز کے اپنے مبدا حقیقی یا تقدیری کی طرف لوٹنے کے ہیں خواہ وہ کوئی مکان ہو یا فعل ہو یا قول اور خواہ وہ رجوع بذاتہ ہو یا باعتبار جزء کے اور یا باعتبار فعل کے ہو، الغرض رجوع کے معنی عود کرنے اور لوٹنے کے ہیں اور رَجْعٌ کے معنی لوٹانے کے اور رَجْعَةٌ کا لفظ طلاق کے بعد رجوع کرنے یا موت کے بعد دنیا کی طرف لوٹنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ محاورہ ہے[1]:۔ فُلَانٌ يُؤْمِنُ بِالرَّجْعَةِ فلاں رجعت پر ایمان رکھتا ہے اور رِجَاعٌ کا لفظ خاص کر پرند کے اپنی جماعت سے علیحدہ ہونے کے بعد واپس اس طرف لوٹ آنے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ رجوع کے معنی میں فرمایا:۔

لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَى الْمَدِيْنَةِ (۶۳-۸) (اور منافق کہتے ہیں کہ اگر ہم مدینے لوٹ کر گئے۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ (۱۲-۶۳) تو جب (یہ لوگ) اپنے والد کے پاس لوٹ کر گئے۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ (۷-۱۵۰) اور جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف لوٹے۔

وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا (۲۴-۲۸) اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ آؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ۔ رَجَعْتُ عَنْ كَذَا میں نے فلاں بات سے رجوع کر لیا۔ رَجَعْتُ الْجَوَابَ (متعدی) جواب دینا۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

فَاِنْ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ (۹-۸۳) اگر خدا تم کو (جہاد) سے ان منافقوں کے (کسی گروہ

---

[1] قال فی اللسان ومن جملتهم طائفة من الرافضة يقولون ان علیا بن ابی طالب مستتر فی السحاب فلا يخرج مع من خرج من ولده حتی ينادی مناد من السماء: اخرج مع فلان

کی طرف (صحیح وسلامت) لوٹا کرلے جائے۔
اِلَى اللهِ مَرْجِعُكُمْ۔ (۵-۱۱-۴۸) تم (سب) کو اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔
اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى۔ (۹۶-۸) بے شک (ان سب کو) تمہارے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔
اور آیت کریمہ:۔
اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ۔ (۱۰-۴) اسی کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے۔
مَرْجِعٌ رُجُوْعٌ سے بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ آیت:۔
ثُمَّ اِلَيْهِ تَرْجِعُوْنَ (۲-۲۸) پھر اس کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔
میں ہے اور رَجْعٌ (متعدی) سے بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں ایک قراءت ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۲-۲۸) پھر اس کی طرف لوٹائے جاؤگے۔
بھی ہے اور آیت کریمہ:۔
وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللهِ۔ (۲-۲۸۱) اور (دیکھو) اس دن (کی پرسش) سے ڈرو جب کہ تم اللہ کے حضور میں لوٹائے جاؤگے۔
میں ایک قراءت تَرْجِعُوْنَ (بصیغہ معروف) بھی ہے۔ اور آیت:۔
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۴۳-۲۸) کہ (اب بھی) یہ لوگ باز آجائیں۔
میں رُجُوْعٌ عَنِ الذَّنْبِ یعنی گناہ سے باز آجانا مراد ہے۔ اسی طرح آیت:۔
وَحَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ (۲۱-۹۵) کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں کے لئے ممکن نہیں ہے کہ توبہ کرکے شرک وکفر یا گناہوں سے

باز آجائیں کیونکہ مرنے کے بعد توبہ نہیں ہے اسی بنا پر منافقین کو استہزا کے طور پر کہا جائیگا:۔
اِرْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا۔ (۵۷-۱۳) (الآیۃ) تو (ان سے کہا جائیگا) کہ (نہیں) اپنے پیچھے (یعنی دنیا) کی طرف لوٹ جاؤ اور (وہاں) کوئی اور روشنی تلاش کرو۔
(یعنی توبہ کرکے ایمان لاؤ جو اس روشنی کا سبب ہے۔ اور آیت:۔
بِمَ يَرْجِعُ الْمُرْسَلُوْنَ (۲۷-۳۵) کہ ایلچی کیا لے کر آتے ہیں۔
میں يَرْجِعُ رجوع سے بھی ہوسکتا ہے اور رَجْعُ الْجَوَابِ سے بھی جیسا کہ فرمایا:۔
يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضِ نِ الْقَوْلَ۔ (۳۴-۳۱) اور ایک کی بات ایک رد کررہا ہوگا۔
اور آیت کریمہ:۔
ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ مَاذَا يَرْجِعُوْنَ (۲۷-۲۸) پھر ان سے (الگ) ہٹ جا۔ اور دیکھتا رہ کہ لوگ کیا جواب دیتے ہیں۔
میں يَرْجِعُوْنَ رَجْعُ الْجَوَابِ سے ہے نہ کہ رجوع سے اور آیت:۔
وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (۸۶-۱۱) (اور پانی برسانے والے آسمان کی قسم۔
میں رَجْعٌ کے معنی بارش کے ہیں اور بارش کو رَجْعٌ اس لئے کہا گیا ہے کہ اولاً سمندروں سے بخارات بن کر پانی اوپر چلا جاتا ہے اور پھر ہوا، بارش کی صورت میں انہیں زمین پر واپس لے آتی ہے اور تالاب کو بھی رَجْعٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ اس میں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے اور یا اس لئے کہ اس کی لہروں میں تلاطم ہوتا رہتا ہے محاورہ ہے:۔

لَيْسَ لِكَلَامِهِ مَرْجُوْعٌ اس کی بات کا جواب نہیں۔
دَابَّةٌ لَهَا مَرْجُوْعٌ۔ وہ جانور جسے استعمال کے بعد بیچنا ممکن ہو۔
نَاقَةٌ رَاجِعٌ اونٹنی جو جفتی سے حاملہ نہ ہو گویا وہ نر کے نطفہ کو واپس لوٹا دیتی ہے۔
اَرْجَعَ يَدَهٗ اِلٰی سَيْفِهٖ۔ اس نے تلوار سونتنے کے لئے ہاتھ کو واپس لوٹایا۔
اَلْاِرْتِجَاعُ (افتعال) واپس لے لینا۔ اِرْتَجَعَ اِبِلًا۔ نر شتر بیچ کر ان کے عوض مادہ شتر خریدنا۔ اس میں اگرچہ بعینہ پہلی چیز کو لوٹانے کے معنی نہیں پائے جاتے لیکن تقدیرًا واپس لوٹانیکے معنی ملحوظ ہیں۔
اِسْتَرْجَعَ فُلَانٌ۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہا۔
اَلتَّرْجِيْعُ (۱) غنا یا قرأت کے وقت آواز کو حلق میں لوٹانا۔
(۲) کوئی بات دوبارہ کہنا، اسی سے ترجیع فی الاذان ہے جس کے معنی اذان میں شہادتین کو ایک مرتبہ پست آواز سے کہنے کے بعد دوبارہ بلند آواز سے کہنے کے ہیں۔
اَلرَّجِيْعُ (۱) انسان یا چوپایہ کا فضلہ اسے اگر رجوع سے مانا جائے تو فعیل بمعنی فاعل ہوگا۔ اور اگر رَجْعٌ (متعدی) سے مانا جائے تو فعیل بمعنی مفعول ہوگا۔
جُبَّةٌ رَجِيْعٌ۔ وہ جبہ جسے ادھیڑ کر دوبارہ سلا گیا ہو۔
(۲) نیز رجیع اس سواری کو کہتے ہیں جو ایک سفر سے واپس آنے کے بعد متصل ہی دوسرے سفر پر چل جائے اس کی مؤنث رَجِيْعَةٌ ہے اور کنایۃً کثرت اسفار کی وجہ سے لاغر اور دبلی سواری کو بھی دَابَّةٌ رَجِيْعٌ وَرَجْعُ سَفَرٍ کہہ دیتے ہیں۔
(۳) نیز مکرر کلام کو بھی رَجِيْعٌ کہا جاتا ہے اور (۴) وہ کلام جو بوجہ کراہت متکلم کی طرف لوٹا دی جائے اسے بھی رَجِيْعٌ ہی کہا جاتا ہے۔

(ر ج ف)

اَلرَّجْفُ (ن) اضطراب شدید کو کہتے ہیں اور رَجَفَتِ الْاَرْضُ اَوِ الْبَحْرُ کے معنی زمین یا سمندر میں زلزلہ آنا کے ہیں۔ بَحْرٌ رَجَّافٌ متلاطم سمندر۔ قرآن میں ہے:- يَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ (۷۳-۱۴) جب کہ زمین اور پہاڑ ہلنے لگیں گے۔ يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ۔ (۷۹-۶) جب کہ زمین لرز جائے گی۔ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ۔ (۷-۷۸) پس ان کو زلزلے نے پالیا۔
اَلْاِرْجَافُ (افعال) کوئی جھوٹی افواہ پھیلا کر یا کسی کام کے ذریعہ اضطراب پھیلانا کے ہیں قرآن میں ہے:- وَالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِيْنَةِ (۳۳-۶۰) اور جو لوگ مدینے میں جھوٹی افواہیں پھیلاتے ہیں۔ مثل مشہور ہے[1]۔ اَلْاَرَاجِيْفُ مَلَاقِيْحُ الْفِتَنِ کہ جھوٹی افواہیں فتنوں کی جڑ ہیں۔

(ر ج ل)

اَلرَّجُلُ کے معنی مرد کے ہیں اس بنا پر قرآن میں ہے:- وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلًا (۶-۹) اگر ہم (رسول کا مددگار) کوئی فرشتہ بناتے تو اس کو بھی آدمی ہی بناتے۔
رَجُلَةٌ۔ عورت جو مردسی وضع اختیار کر لے۔ شاعر نے کہا ہے[2]۔ (۱۷۵)
"لَمْ يُبَالُوْا حُرْمَةَ الرَّجُلَةْ"

---

[1] راجع للمثل المعاجم وفی المیدانی ۱۲ ۲ـــہ لم اجدہ قائلہ واولہ۔ تحرّقوا حبیب فناتہم۔ والبیت فی اللسان (رجل)، والکامل ۲۴۱ بتفسیر الطبری (۸ : ۲۴۴) والبحر (۲ : ۱۷۴) وفی المطبوع لم ینالوا مصحفۃ وقبلہ، کل جار ظل مختبطا۔ غیر جیران بنی جبلۃ۔ والبیت ایضاً فی امالی ابن الشجری (۲ : ۲۸۷) واعراب ثلاثین لابن خالویہ ۴۴ وفی روایۃ صولۃ بدل حرمۃ والاعجاز للباقلانی

اس مرد نما عورت کی حرمت کی پرواہ نہ کی۔
اور رَجُلٌ کے معنی مردِ کامل بھی آتے ہیں جس میں مردانگی کے جوہر نمایاں ہو۔ قرآن میں ہے:۔
وَجَاءَ مِنْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى۔ (۳۶-۲۰) اور شہر کے پرلے سرے سے ایک مرد دوڑتا ہوا آیا۔
رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ۔ فرعون کے لوگوں میں سے ایک مردِ مومن یعنی جو قوی اور بہادر تھا یہ ماجرا سن کر بولا) اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ۔ کہ کیا تم (صرف اتنی بات پر) ایک شخص کے قتل کے درپے ہو کہ وہ خدا ہی کو اپنا پروردگار بتاتا ہے۔
محاورہ ہے:۔ هُوَ اَرْجَلُ الرَّجُلَيْنِ کہ وہ دونوں میں زیادہ جوانمرد ہے۔
اَلرِّجْلُ۔ پاؤں۔ اس کی جمع اَرْجُلٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ (۵-۶) اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو اور اپنے پاؤں بھی ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔
رَاجِلٌ و رَجِلٌ۔ پا پیادہ چلنے والا۔ یہ بھی الرجل بمعنی پاؤں سے مشتق ہے اور راجل کی جمع رِجَالَۃ اور رَجْلٌ آتی ہے جیسے رَكْبٌ جو کہ رَاكِبٌ کی جمع ہے اور رَاجِلٌ کی جمع رِجَالٌ بھی آجاتی ہے جیسے رَاكِبٌ وَرِكَابٌ۔
اور رَجُلٌ رَاجِلٌ اسے کہتے ہیں جو چلنے پر قدرت رکھتا ہو اس کی جمع رِجَالٌ آجاتی ہے قرآن میں ہے:۔
فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا۔ (۲-۲۳۹) تو پاؤں پیدل یا سوار۔
اسی طرح رَجِيْلٌ وَذُوْ رُجْلَةٍ کے معنی بھی بہت زیادہ پا پیادہ چلنے والے شخص کے ہیں۔

حَرَّةٌ رَجْلَاءُ۔ جس میں صعوبت سے چلا جائے
اَلْاَرْجَلُ۔ سفید پاؤں والا گھوڑا۔ بڑے پاؤں والا۔ رَجَلْتُ الشَّاةَ میں نے بکری کو پاؤں سے باندھ کر لٹکا دیا۔ اور بطور استعارہ رِجْلٌ کے معنی (۱) ٹڈی دل اور پانی بہنے کا راستہ بھی آجاتے ہیں اس کا واحد رِجْلَةٌ ہے اور سَيْلُ الْمَاءِ کو رِجْلٌ کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ اسے مذانب کہہ دیتے ہیں۔
رِجْلَةٌ۔ بقلة الحمقاء کیونکہ وہ بھی عموماً راستہ میں اگتا ہے۔
اور کسی شخص کے عہد حکومت کو بھی رِجْل کہہ دیتے ہیں مثلاً کہا جاتا ہے۔ كَانَ ذَالِكَ عَلٰى رِجْلِ فُلَانٍ (کہ فلاں کے عہد حکومت میں تھا) جیسا کہ عَلٰى رَأْسِ فُلَانٍ کا محاورہ ہے۔
اِرْتَجَلَ الْكَلَامَ۔ فی البدیہہ کہنا۔ اِرْتَجَلَ الْفَرَسُ فِي عَدْوِهٖ گھوڑے کا درمیانی دوڑ دوڑنا۔
تَرَجَّلَ الرَّجُلُ۔ سواری سے اتر کر پیدل چلنا۔
تَرَجَّلَ فِي الْبِئْرِ۔ بغیر رسی کے کوئیں میں اترنا۔
تَرَجَّلَ النَّهَارُ سائے کا دیواروں سے نیچے اترنا گویا وہ پیدل چل رہا ہے۔
رَجَّلَ شَعْرَهٗ۔ کے معنی بالوں کو کنگھی کرنا کے ہیں کیونکہ کنگھی کرنے سے بال نیچے پاؤں کی طرف اتر آتے ہیں۔
اَلْمِرْجَلُ۔ نصب کی ہوئی دیگ۔ اَرْجَلْتُ الْفَصِيْلَ۔ اونٹنی کے بچہ کو اسکی ماں کیساتھ آزاد چھوڑ دیا۔

(ر ج م)

اَلرِّجَامُ۔ پتھر۔ اسی سے الرجم ہے جس کے معنی سنگسار کرنا کے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ رَجَمَهٗ۔ اسے سنگسار کیا اور جسے سنگسار کیا گیا

ہو اسے مَرْجُوْمٌ کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ۔ (۲۶-۱۱۶) کہ تم ضرور سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔
اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ۔ (۱۸-۲۰) کیونکہ تمہاری قوم کے لوگ تمہاری خبر پائیں گے تو تمہیں سنگسار کر دیں گے۔
پھر استعارہ کے طور پر رَجْمٌ کا لفظ جھوٹے گمان توہم، سب وشتم اور کسی کو دھتکار دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
رَجْمًا بِالْغَيْبِ (۱۸-۲۲) یہ سب غیب کی باتوں میں انکل کے تکے چلاتے ہیں۔
شاعر نے کہا ہے[1] (طویل)
(۱۷۶) "وَمَا هُوَ عَنْهَا بِالْحَدِيْثِ الْمُرَجَّمِ"
اور لڑائی کے متعلق یہ بات محض اندازے سے نہیں ہے۔
اور شیطان کو رجیم اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ خیرات اور ملأ اعلیٰ کے مراتب سے راندہ ہوا ہے قرآن میں ہے:۔
فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ (۱۶-۹۸) تو شیطان مردود کے وسواس سے خدا کی پناہ مانگ لیا کرو۔
فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ۔ (۳۸-۷۷) تو بہشت سے نکل جا کہ راندہ درگاہ ہے۔
اور شُهُبٌ ستاروں کو رُجُوْمٌ کہا گیا ہے قرآن میں ہے:۔
رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (۶۷-۵) ان کو شیاطین کے لئے ایک طرح کا زد بنایا ہے۔
رَجْمَةٌ و رُجْمَةٌ۔ قبر کا پتھر جو بطور نشان اس پر نصب کیا جاتا ہے۔ مجازاً اس سے قبر مراد لیتے ہیں۔ اس کی جمع رِجَامٌ و رُجَمٌ آتی ہے۔ اور رَجَمْتُ الْقَبْرَ کے معنی قبر پر پتھر نصب کرنا کے ہیں۔ حدیث میں ہے[2]۔ (۱۵۰)
لَا تَرْجُمُوْا قَبْرِيْ کہ میری قبر پر پتھر نہ لگانا۔
اَلْمُرَاجَمَةُ۔ باہم ایک دوسرے کو مغلظات سنانا۔ مُقَاذَفَةٌ کی طرح یہ لفظ بھی اس معنی میں بطور استعارہ استعمال ہوتا ہے۔ اور رَجْمٌ سے تَرْجُمَانٌ بروزن تَفْعُلَانٌ آجاتا ہے۔

(ر ج و)

رَجَا الْبِئْرِ۔ کنویں کا کنارہ۔ رَجَا السَّمَآءِ۔ آسمان کا کنارہ۔ اس کی جمع اَرْجَآءٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا۔ (۶۹-۱۷) اس کے کناروں پر فرشتے ہوں گے۔
اور رَجَاءٌ ایسے ظن کو کہتے ہیں جس میں مسرت حاصل ہونے کا امکان ہو۔ اور آیت کریمہ:۔
مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا۔ (۷۱-۱۳) تو تمہیں کیا بلا مار گئی کہ تم نے خدا کا وقار دل سے اٹھا دیا۔
میں بعض مفسرین نے اس کے معنی لَا تَخَافُوْنَ کئے ہیں یعنی کیوں نہیں ڈرتے

---

[1] قالہ زہیر فی معلقتہ من السبعۃ واولہ: ۔ وما الحرب الا ما علمتم و ذقتم۔ والبیت فی مجاز ابی عبیدۃ ۸ ۳۹ رقم ۴ ۴۶ وعنہ فی القرطبی ۲: ۴۲ والعقد الثمین ۹۵ وایام العرب ۴ ۷۲ والاساس (رجم) والمحاضرات للمؤلف (۲: ۱۴۶) والجمہرۃ ۱۰۷ ودیوانہ ۱۷ وشرح العشر للتبریزی ۲ (۱۱۲) والبحر ۶: ۱۱۴) والقرطبی (۱۰: ۳۸۲) والخزانۃ (۳: ۲۵۴) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۲۴۵) وشرح السبع لابن الانباری ۲۷۶ ÷
[2] وصیۃ اوصیٰ بہا عبداللہ بن مغفل وقت الموت ای لا تجعلوا علیہا الرجم ومعناہ النہی عن التسنیم والرفع انظر الفائق ۱ر۲۳۳ والنہایۃ (۲: ۲۰۵) قال الجوہری المحدثون یروونہ بتخفیف الجیم والصحیح تشدیدہا ۱۲ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

ہو جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1]۔ (الطویل)

(۱۷۷) اِذَا لَسَعَتْهُ النَّحْلُ لَمْ يَرْجُ لَسْعَهَا
وَخَالَفَهَا فِي بَيْتِ نُوبٍ عَوَاسِلِ

جب اسے مکھی ڈنگ مارتی ہے تو وہ اس کے ڈسنے سے نہیں ڈرتا۔ اور اس نے شہد کی مکھیوں سے معاہدہ کر رکھا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ خوف و رجا باہم متلازم ہیں تو جب کسی محبوب چیز کے حصول کی توقع ہوگی۔ ساتھ ہی اس کے تضیع کا اندیشہ بھی دامن گیر رہے گا۔ اور ایسے ہی اس کے برعکس صورت میں کہ اندیشہ کے ساتھ ہمیشہ امید پائی جاتی ہے) قرآن میں ہے:۔

وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَالَا يَرْجُوْنَ۔ (۴-۱۰۴)

اور تم کو خدا سے وہ وہ امیدیں ہیں جو ان کو نہیں۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ۔ (۹-۱۰۶) اور کچھ اور لوگ ہیں کہ حکم خدا کے انتظار میں ان کا معاملہ ملتوی ہے۔

اَرْجَتِ النَّاقَةُ اونٹنی کی ولادت کا وقت قریب آگیا۔ اس کے اصل معنی یہ ہیں کہ اونٹنی نے اپنے مالک کو قرب ولادت کی امید دلائی۔

اَلْاُرْجُوَانُ ایک قسم کا سرخ رنگ جو رجاء کی طرح فرحت بخش ہوتا ہے۔

(ر ح ب)

اَلرَّحْبُ (اسم) جگہ کی وسعت کو کہتے ہیں۔ اسی سے رَحَبَةُ الْمَسْجِدِ ہے جس کے معنی مسجد کے کھلے صحن کے ہیں اور رَحُبَتِ الدَّارُ کے معنی گھر کے وسیع ہونے کے پھر یہ رَحْبٌ کا لفظ استعارۃً پیٹ یا سینہ کی وسعت کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے رَحِبُ الْبَطْنِ (لمبا زور) رَحِبُ الصَّدْرِ (فراخ سینہ) عالی ظرف کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے برعکس ضیق الصدر کا لفظ مجازاً تنگ سینہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

قرآن میں ہے:۔

وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ۔ (۹-۲۵) اور زمین باوجود وسعت کے تم پر تنگ ہوگئی۔

اور بطور استعارہ جس کے نوکر چاکر بہت زیادہ ہوں اسے رَحِيْبُ الْفِنَاءِ کہا جاتا ہے۔

مَرْحَبًا وَّاَهْلًا تو نے کشادہ جگہ پائی اور اپنے اہل میں آیا (یہ لفظ خوش آمدید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) قرآن میں ہے:۔

لَا مَرْحَبًا بِهِمْ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ۔ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ۔ (۳۸: ۵۹-۶۰)

---

[1] قالہ ابو ذویب الہذلی فی وصف مشتار والبیت من شواہد الکشاف ۴/۴۱ والطبری ۱/۲۱۳ والطبرسی ودیوان الہذلیین (۱: ۱۴۳) والاساس (۲: ۹۷۴) واللسان (نوب) ومجاز القرآن رقم ۳۰۹ والخزانۃ (۲: ۲۹۴) ورسالۃ المبرد ما اتفق لفظہ واختلف معناہ) والاضداد لابن الانباری) ۹ وابن السکیت ۹۷ والمقاییس (نوب) و ابن ولاد ۳۴ والمعانی الکبیر ۶۲۷ والجمہرۃ (اشعار) ۹۲ والقرطبی (۸: ۲۱۱) والدرۃ للحریری ۷ او تہذیب اصلاح المنطق (۲۴/۱: ۲۰۴) ومعانی القرآن للفراء الی النوادر (۱: ۲۸۷) وفیہ عوامل بدل عواسل والمشکل للقتیبی ۷۴ او غریبہ ۱۰۱ وفی روایۃ ابی الطیب (ابدال ۲: ۴۳۸) ورسالۃ الغفران (۲: ۲۴۳) والمخصص (۸: ۱۲۸/۱۷: ۱۱) والصحاح (نوب) واللسان والتاج (خلف، رجا، دبر) واضداد ابی الطیب ۲۹۹ خالفہا (بالخاء المعجمۃ) ورواۃ الاضداد او للثلاثۃ حالفہا (بالحاء المہملۃ) ۱۲

ان پر خدا کی مار بے شک یہ بھی دوزخ ہی میں آ رہے ہیں (یہ سن کر وہ کہیں گے) بلکہ تم پر خدا کی مار۔

(ر ح ق)

رَحِیْقٌ (خالص عمدہ شراب جس میں کسی قسم کی ملاوٹ نہ ہو) قرآن میں ہے :۔
یُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِیْقٍ مَّخْتُوْمٍ۔ (۸۳-۲۵) ان کو شراب خالص سر بند پلائی جائے گی۔

(ر ح ل)

اَلرَّحْلُ ہر وہ چیز جسے اونٹ پر اس لئے باندھا جائے کہ اس پر سوار ہوا جائے پھر یہ لفظ مجازاً خود اونٹ پر بولا جانے لگا ہے اور کبھی رَحْلٌ کا لفظ اس چیز پر بھی بولا جاتا ہے جس پر گھر میں بیٹھا جاتا ہے۔ اس کی جمع رِحَالٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے :۔
وَقَالَ لِفِتْیَانِہِ اجْعَلُوْا بِضَاعَتَھُمْ فِیْ رِحَالِھِمْ (۱۲-۶۲) تو اس نے اپنے نوکروں سے کہا کہ ان کا سرمایہ ان کے کجاووں میں رکھ دو۔
اَلرِّحْلَۃُ (مصدر) اس کے اصل معنی سفر یا کوچ کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔
رِحْلَۃَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ (۱۰۶-۲) جاڑے اور گرمی کے سفروں کو (اکٹھا رکھنے والے)
اَرْحَلْتُ الْبَعِیْرَ میں نے اونٹ پر پالان کسا
اَرْحَلَ الْبَعِیْرُ اونٹ کا اس قدر موٹا ہو جانا گویا موٹاپے کی وجہ سے اس کی پیٹھ پر پالان رکھا ہوا ہے۔
رَحَّلْتُہٗ میں نے اسے اس جگہ سے دور ہٹایا۔
اَلرَّاحِلَۃُ اونٹ جو سواری کے قابل ہو جائے وَاَحْلَہٗ سفر کرنے میں اس کی مدد کی۔ مُرَحَّلٌ وہ کپڑا جس پر کجاوے کی تصویریں بنی ہوئی ہوں۔

(ر ح م)

اَلرَّحِمُ۔ عورت کا رحم۔ اور رُحُوْمٌ اس عورت کو کہتے ہیں جسے خرابی رحم کی بیماری ہو اور استعارہ کے طور پر رحم کا لفظ قرابت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ تمام اقربا ایک ہی رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس میں رَحِمٌ و رُحْمٌ دو لغت ہیں۔ قرآن میں ہے :۔
وَاَقْرَبَ رُحْمًا (۱۸-۸۱) اور قرابت میں (اس سے) بہتر ہو)
اَلرَّحْمَۃُ وہ رقت قلب جو مرحوم (یعنی جس پر رحم کیا جائے) پر احسان کی مقتضی ہو۔ پھر کبھی اس کا استعمال صرف رقت قلب کے معنی میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنی میں خواہ رقت کی وجہ سے نہ ہو۔ جیسے :۔ رَحِمَ اللّٰہُ فُلَانًا اللہ تعالٰی اس پر رحم فرمائے جب اس کے ساتھ ذات باری تعالٰی متصف ہو تو اس سے صرف احسان مراد ہوگا جیسا کہ مروی ہے۔ (۱۵۱)
ان الرَّحْمَۃَ مِنَ اللّٰہِ انعام و افضال و من الادمیین رقۃ و تعطف کہ اللہ کی طرف سے رحمت اس کے انعام و فضل سے عبادت ہوتی ہے اور لوگوں کی طرف سے رقت اور شفقت کے معنی میں آتی ہے۔ اسی معنی میں آنحضرت نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا ہے (۱۵۲)
انہ لما خلق اللّٰہ الرحم قال لہ انا الرَّحْمٰن

لہ ملاحظہ ہو فقہ اللغۃ للثعالبی ۱۲ مترجم ۔ کہ اخرجہ ابوداؤد وغیرہ

وَانت الرحم شققت اسمك من اسمی فمن وصلك وصلتهٗ ومن قطعك قطعتهٗ. کہ جب اللہ تعالیٰ نے رحم پیدا کیا تو اس سے فرمایا:۔ "میں رحمان ہوں اور تو رحم ہے۔ میں نے تیرے نام کو اپنے نام سے اخذ کیا ہے۔ پس جو تجھے ملائے گا۔ (یعنی صلہ رحمی کرے گا) میں بھی اسے ملاؤں گا اور جو تجھے قطع کریگا میں اسے پارہ پارہ کر دوں گا"

اس حدیث میں بھی معنی سابق کی طرف اشارہ ہے کہ رحمت میں رقت اور احسان دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔ پس رقت تو اللہ تعالیٰ نے طبائع مخلوق میں ودیعت کر دی ہے اور احسان کو اپنے لئے خاص کر لیا ہے۔ تو جس طرح لفظ رحم رحمت سے مشتق ہے اسی طرح اس کا وہ معنی جو لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ بھی اس معنی سے ماخوذ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ میں پایا جاتا ہے اور ان دونوں کے معنی میں بھی وہی تناسب پایا جاتا ہے جو ان کے لفظوں میں ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ وَالرَّحِیْمُ یہ دونوں فَعْلَانٌ وَفَعِیْلٌ کے وزن پر مبالغہ کے صیغے ہیں[1] جیسے نَدْمَانٌ وَ نَدِیْمٌ پھر رحمٰن کا اطلاق اس ذات پر ہوتا ہے جس نے اپنی رحمت کی وسعت میں ہر چیز کو سما لیا ہو، اس لئے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس لفظ کا اطلاق جائز نہیں ہے اور رحیم بھی اسماء حسنیٰ سے ہے اور اس کے معنی بہت زیادہ رحمت کرنے والے کے ہیں اور اس کا اطلاق دوسروں پر بھی جائز ہے۔

چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (۲-۱۷۳) بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اور آنحضرت کے متعلق فرمایا:۔

لَقَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْكُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۹-۱۲۸) لوگو! تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے (اور) ان کو تمہاری بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانوں پر نہایت درجے شفیق (اور) مہربان ہیں۔

بعض نے رحمٰن اور رحیم میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ رحمٰن کا لفظ دنیوی رحمت کے اعتبار سے بولا جاتا ہے۔ جو مومن اور کافر دونوں کو شامل ہے اور رحیم اخروی رحمت کے اعتبار سے جو خاص کر مومنین پر ہوگی۔ جیسا کہ آیت:۔

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ۔ (۷-۱۵۶) اور ہماری جو رحمت ہے وہ (اہل و نااہل) سب چیزوں کو شامل ہے۔ پھر اس کو خاص کر ان لوگوں کے نام لکھ لیں گے۔ جو پرہیزگاری اختیار کریں گے۔

میں اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ دنیا میں رحمت الٰہی عام ہے اور مومن و کافر دونوں کو شامل ہے لیکن آخرت میں مومنین کے ساتھ مختص ہوگی (اور کفار اس سے کلیۃً محروم ہوں گے)

(ر خ و)

اَلرُّخَاءُ۔ لینت یعنی نرمی کو کہتے ہیں اور یہ شَیْءٌ رِخْوٌ سے ماخوذ ہے جس کے معنی نرم چیز کے ہیں اور باب رَخِیَ یَرْخٰی بروزن عَلِمَ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

[1] راجع غریب القرآن للقتیبی ومجاز القرآن لابی عبیدۃ ۲۱ والطبری را: ۵۸، ۵۹ ورد علی ابی عبیدۃ رداعنیفاً فالقول: ان الرحمان مجازہ ذوالرحمۃ والرحیم مجازہ الراحم۔

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَاءً حَيْثُ اَصَابَ. (۳۸-۳۶) تو ہم نے ہوا کو ان کا تابع کر دیا کہ جہاں پہنچنا چاہتے ان کے حکم کے مطابق اسی طرف وہ نرمی سے چلتی۔

اور اسی سے اَرْخَيْتُ السِّتْرَ کا محاورہ لیا گیا ہے۔ جس کے معنی پردہ لٹکانے کے ہیں پھر اِرْخَاءُ السِّتْرِ سے بطور استعارہ اِرْخَاءُ سَرْحَانَ بولا جاتا ہے جس کے معنی بھیڑیے کی تیز روی کے ہیں۔ ابو ذؤیب نے کہا ہے[1] (الکامل)

(۱۷۸) "فَهِيَ رِخْوٌ تَمْزَعُ"

اور وہ ہوا کی طرح تیز اور نرم رفتار ہے۔

فَرَسٌ مِرْخَاءٌ۔ تیز رو گھوڑی۔ خَیل مِرَاخٌ۔ تیز رو گھوڑے۔

اَرْخَيْتُهٗ میں نے اس کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی کہ تیز رفتاری سے چلے۔

(ر د د)

اَلرَّدُّ (ن) اس کے معنی کسی چیز کو لوٹا دینے کے ہیں خواہ ذات شے کو لوٹایا جائے یا اس کی حالتوں میں سے کسی حالت کو محاورہ ہے۔ رَدَدْتُهٗ فَارْتَدَّ میں نے اسے لوٹایا پس وہ لوٹ آیا۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ. (۶-۱۴۸) (مگر نا بکے) لوگوں سے اس کا عذاب تو ہمیشہ کے لئے ٹلنے والا ہی نہیں۔

اور ذات شے کو واپس لوٹانے کے متعلق فرمایا۔

لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ. (۶-۲۸) اور اگر (دنیا میں) واپس بھیج دیئے گئے تو جس چیز سے ان کو منع کیا گیا ہے اس کو پھر دوبارہ کریں۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ. (۱۷-۶) پھر ہم نے (تم کو) دشمنوں پر (غلبہ دے کر) (دوبارہ) تمہارے دن پھر دیئے۔

رُدُّوْهَا عَلَيَّ. (۳۸-۳۳) (تو) ان گھوڑوں کو میرے پاس لوٹا لاؤ۔

فَرَدَدْنٰهُ اِلٰٓى اُمِّهٖ (۲۸-۱۳) غرض ہم نے پھر موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ماں کے پاس لوٹا دیا۔

يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ (۶-۲۷) اے کاش ہم پھر دنیا میں واپس بھیج دیے جائیں اور پروردگار کی آیتوں کو) نہ جھٹلاتے۔

اور کسی کو اس کی پہلی حالت کی طرف رد کرنے کے متعلق ہے۔ فرمایا:۔

يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ. (۳-۱۴۹) تم کو الٹے پاؤں (کفر کی طرف) لوٹا کر لے جائیں گے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ (۱۰-۱۰۷) اگر (اللہ تعالیٰ) تجھ کو کسی قسم کا فائدہ پہنچانا چاہے تو کوئی اس کے فضل کا روکنے والا نہیں۔ میں رَآدَّ کے معنی روکنے والا اور دفع کرنے والا کے ہیں اور یہی معنی آیت:۔

عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ (۱۱-۷۶) (اور ان لوگوں پر ایسا) عذاب آنے والا ہے جو ٹل نہیں سکتا۔ میں مراد ہے اور اسی سے اَلرَّدُّ اِلَى اللّٰهِ ہے جیسے فرمایا:۔

وَلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا. (۱۸-۳۶) (تو جب) میں اپنے پروردگار

---

[1] قطعۃ من عجز البیت لابی ذؤیب وتکملتہ: فعدو بہ خوصا یفصم جریہا حلق الرحالۃ ... والبیت من کلمۃ مفضلیۃ جمہریۃ طویلۃ فی ۶۵ بیتا (۲۲۱-۲۲۹) والبیت فی السمط ۴۸۴، ۱۲۷ والسیوطی ۹۲ والجمہرۃ ۲۶۴ والاقتضاب ۳۱۴ والحکم (رحل) ودیوان الہذلیین (۱: ۱۶) واللسان (رخو)۔

کی طرف لوٹایا جاؤنگا تو جہاں لوٹ کر جاؤں گا (بہر حال) اس (دنیا) سے (تو) اس جگہ کو بہتر ہی پاؤں گا۔

ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عَالِمِ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ (۹-۹۴) پھر آخر کار تم اس (ذات) مطلق کی طرف لوٹائے جاؤگے جو حاضر و غائب دونوں کو جانتا ہے۔

ثُمَّ رُدُّوْا اِلَی اللّٰہِ مَوْلٰھُمُ الْحَقِّ (۶-۶۲) پھر قیامت کے دن تمام لوگ اپنے مالک برحق خدائے تعالیٰ کے پاس واپس بلائے جائیں گے۔

تو یہاں رَدٌّ کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت ثُمَّ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ میں رَجْعٌ کا لفظ ہے۔ بعض نے کہا ہے اَلرَّدُّ اِلَی اللّٰہِ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ (۱) ایک معنی وہ ہے جس کا ذکر آیت مِنْھَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْھَا نُعِیْدُکُمْ (۲۰-۵۵) میں ہے (یعنی فوت کر کے) زمین کی طرف لوٹا دینا اور دوسرے معنی وہ ہیں جس کی طرف کہ

وَمِنْھَا نُخْرِجُکُمْ تَارَۃً اُخْرٰی (۲۰-۵۵) میں ارشاد فرمایا ہے یعنی فوت کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا لیکن یہ دو معنی دو حالتوں کے اعتبار سے ہیں اور رَدٌّ کا لفظ اپنے عموم کے اعتبار سے دونوں معنی کو شامل ہے اور آیت فَرَدُّوْا اَیْدِیَھُمْ فِیْٓ اَفْوَاھِھِمْ (۱۴-۹) کی تفسیر میں مختلف اقوال منقول ہیں ایک یہ کہ غصہ سے پشت دست کاٹنے لگے دوم یہ کہ منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ تیسرے یہ کہ اَفْوَاھِھِمْ میں ھِمْ کی ضمیر کا مرجع انبیاء کو قرار دیا جائے یعنی انہوں نے انبیاء کے منہ پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے اور انہیں خاموش کر دیا اور رَدٌّ کا لفظ لا کر اس بات پر تنبیہ کی ہو کہ انہوں نے بار بار ایسا کیا۔[1]

اور آیت: لَوْ یَرُدُّوْنَکُمْ مِّنْ بَعْدِ اِیْمَانِکُمْ کُفَّارًا (۲-۱۰۹) کہ ایمان لا چکنے کے بعد تم کو کافر بنا دیں۔

میں یَرُدُّ کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمہیں دوبارہ حالت کفر کی طرف لوٹانا چاہتے ہیں جسے تم چھوڑ کر مسلمان ہوئے ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ یَرُدُّوْکُمْ بَعْدَ اِیْمَانِکُمْ کٰفِرِیْنَ (۳-۹۹) لوگو! تم اہل کتاب کے کسی فریق کا بھی کہا مانوگے تو وہ تمہارے ایمان لائے پیچھے تم کو پھر کافر بنا دیں گے۔

اَلْاِرْتِدَادُ وَالرِّدَّۃُ اس راستہ پر پلٹنے کو کہتے ہیں جس سے کوئی آیا ہو۔ لیکن رِدَّۃٌ کا لفظ کفر کی طرف لوٹنے کے ساتھ مختص ہو چکا ہے اور ارتداد عام ہے جو حالت کفر اور غیر دونوں کی طرف لوٹنے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِھِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَھُمُ الْھُدٰی (۴۷-۲۵) بیشک جو لوگ اپنی پشتوں پر لوٹ گئے (اس کے) بعد کہ ان کے سامنے ہدایت واضح ہو گئی۔ اور آیت کریمہ: یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ (۵-۵۴)۔

میں اسلام سے کفر کی طرف لوٹنا مراد ہے اور یہی معنی آیت: وَمَنْ یَّرْتَدِدْ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَیَمُتْ وَھُوَ کَافِرٌ (۲-۲۱۷)

میں مراد ہیں وَنُرَدُّ عَلٰٓی اَعْقَابِنَا (۶-۷۱) تو کیا اس کے بعد بھی الٹے پیروں (کفر کی طرف) لوٹ جائیں گے۔

[1] والبسط ما رایت البحث فی الآیۃ فی امالی المرتضیٰ راجع (۱-۳۶۵-۳۶۷)

اور غیر کفر کی طرف لوٹنے کے متعلق فرمایا :۔
وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰی اَدْبَارِکُمْ (۵-۲۱) اور اپنی پشتوں پر مت پھرو یعنی کسی کام کی تحقیق کر لینے اور اس کی اچھائی کو جان لینے کے بعد اسے مت چھوڑو۔
فَارْتَدَّا عَلٰی اٰثَارِهِمَا قَصَصًا (۱۸-۶۴) پھر وہ دونوں اپنے دبیروں کے، نشانوں کے کھوج لگاتے الٹے پاؤں پھرے۔
فَلَمَّاۤ اَنْ جَآءَ الْبَشِیْرُ اَلْقٰهُ عَلٰی وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِیْرًا (۱۲-۹۶) پھر جب (یوسف علیہ السلام کے زندہ وسلامت ہونے کی) خوشخبری دینے والا (یعقوب علیہ السلام کے پاس) آپہنچا تو اس نے لا آنے کے ساتھ ہی یوسفؑ کا کرتہ (یعقوب (علیہ السلام) کے چہرہ پر ڈال دیا تو وہ فوراً بینا ہو گئے۔ یعنی ان کی بینائی ان کی طرف لوٹ آئی اور رَدَدْتُ الْحُکْمَ اِلٰی فُلَانٍ کے معنی کسی کے فیصلہ سپرد کر دینے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے :۔
وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰۤی اُولِی الْاَمْرِ مِنْهُمْ (۴-۸۳) اور اگر اس خبر کو رسول اور ان لوگوں کے سپرد کر دیتے جو ان میں سے برسر حکومت ہیں۔
فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (۴-۵۹) پھر اگر کسی امر میں تم (اور حاکم وقت) آپس میں جھگڑ پڑو تو اس امر میں اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔
عام محاورہ ہے :۔ رَادَّهُ فِیْ کَلَامِهٖ کسی سے بحث کرنا حدیث میں ہے[1] :۔ (۱۵۳)
اَلْبَیِّعَانِ یَتَرَادَّانِ یعنی بائع اور مشتری بیع کو رد کر دیں۔

رَدَّةُ الْاِبِلِ اونٹوں کا دوبارہ پانی پینے کو جانا۔
اَرَدَّتِ النَّاقَةُ (۱) اونٹنی کا ولادت سے قبل پستان نکالنا (۲) نمناک زمین پر بیٹھنے کی وجہ سے اونٹنی کے پستان اور مخصوص جگہ پر ورم ہو جانا۔
اِسْتَرَدَّ الْمَتَاعَ سامان واپس لے لینا۔

(ر د ء)

اَلرِّدْءُ۔ جو دوسرے کا مددگار بن کر اس کے تابع ہو۔ قرآن میں ہے :۔
فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْءًا یُّصَدِّقُنِیْٓ (۲۸-۳۴) ان کو مددگار بنا کر میرے ساتھ بھیج دو کہ میری تصدیق کریں۔
اور اَرْدَءَهُ کے معنی کسی کی مدد کرنا کے ہیں اور رَدِیْءٌ (ردی) بھی اصل میں رِدْءٌ کے ہم معنی ہے مگر عرف میں متاخر مذموم پر بولا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے :۔ رَدُءَ الشَّیْءُ رَدَاءَةً فَهُوَ رَدِیْءٌ۔ کسی شے کا ردی ہونا۔

(ر د ف)

اَلرِّدْفُ تابع یعنی ہر وہ چیز جو دوسرے کے پیچھے ہو اور رِدْفُ الْمَرْءَةِ کے معنی عورت کے سرین کے ہیں۔
اَلتَّرَادُفُ یکے بعد دیگرے آنا ایک دوسرے کی پیروی کرنا۔
اَلتَّرَادُفُ۔ متاخر یعنی پچھلا۔
اَلْمُرْدِفُ اگلا جس نے اپنے پیچھے کسی کو سوار کیا ہو۔ قرآن میں ہے :۔

---

[1] رواہ النسائی عن سمرۃ وابو داؤد وابن ماجۃ عن ابی بردۃ والمستدرک عن ابن عمرو والبخاری عن ابن عمر ومتفق علیہ عن حکیم بن حزام وراجع الفتح للنبہانی ۲/۲۰۔

فَاسْتَجَابَ لَكُمْ اَنِّیْ مُمِدُّكُمْ بِاَلْفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُرْدِفِیْنَ (۸-۹) سو اس نے تمہاری سن لی (اور فرمایا) کہ ہم لگاتار ایک ہزار فرشتوں کے ساتھ تمہاری مدد کریں گے۔

ابو عبیدہ کے نزدیک رَدِفَ وَاَرْدَفَ یعنی مجرد اور مزید فیہ ایک ہی معنی میں آتے ہیں[1] اس لئے انہوں نے مُرْدِفِیْنَ کا معنی "بعد میں آنے والے" کیا ہے۔ اور یہ شاہد پیش کیا ہے[2] (   )

(۱۷۹) "اِذَا الْجَوْزَاءُ اَرْدَفَتِ الثُّرَیَّا" جب ثریا کے پیچھے جوزاء ستارا نکل آیا۔

مگر ابو عبیدہ کے علاوہ دوسرے علماء نے مُرْدِفِیْنَ کے معنی یہ کئے ہیں کہ "دوسرے فرشتوں کو پیچھے لانے والے" تو اس لحاظ سے گویا دو ہزار فرشتوں کے ساتھ مسلمانوں کی مدد کی گئی تھی۔

بعض نے کہا ہے کہ مُرْدِفِیْنَ سے مراد وہ فرشتے ہیں۔ جو اسلامی لشکر کے آگے آگے چلتے تھے تاکہ کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ڈال دیں۔

اور ایک قرأت میں مُرْدَفِیْنَ فتح دال کے ساتھ ہے[3] یعنی ہر ایک مسلمان فوجی کے پیچھے اس کی مدد کے لئے ایک فرشتہ متعین تھا۔

ایک اور قرأت میں مُرَدِّفِیْنَ بتشدید دال ہے جو دراصل مُرْتَدِفِیْنَ باب افتعال سے ہے۔ صرفی قاعدہ کے مطابق تا کو دال میں ادغام کر کے اس کی حرکت را کو دے دی گئی ہے۔ سورۂ آل عمران میں ہے۔

اَلَنْ یَّكْفِیَكُمْ اَنْ یُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِیْنَ ۔ بَلٰۤی اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَیَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ ۔ هٰذَا یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِیْنَ ۔(۳-۲۳-۲۴) کیا تم کو اتنا کافی نہیں کہ تمہارا رب (آسمان سے) تین ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد فرمائے (ضرور کافی ہے) بلکہ اگر تم ثابت قدم رہو (اور خدا اور رسول کی نافرمانی سے) بچو اور دشمن (ابھی) اسی دم تم پر چڑھ آئیں تو تمہارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا جو بڑی سج دھج سے آموجود ہوں گے۔

اَرْدَفْتُهٗ میں نے اسے اپنے پیچھے سوار کیا۔

اَلرِّدَافُ سواری پر ردیف کے بیٹھنے کی جگہ۔

دَابَّةٌ لَا تُرَادِفُ اَوْلَا تُرْدِفُ ۔ سواری جو ردیف کو سوار نہ ہونے دے۔

جَاءَ وَاحِدٌ فَاَرْدَفَهٗ اٰخَرُ ۔ ایک کے بعد دوسرا آیا۔

اَرْدَافُ الْمُلُوْكِ بادشاہوں کے جانشین۔ نائب۔

---

[1] وكذا قال ابن الاعرابي راجع شرح الدرة ۲۰۱ ومجاز ابی عبیدة (۱: ۲۴۱) والحجة لابی علی الفارسی (۱: ۱۹۳) والقرطبی ۷/ ۲۷۱ ونقل عن ابی عبیدة الحافظ فی الفتح (۸: ۲۲۴) [2] راجع اللسان (ردف افرط) قالہ خزیمة بن نهد وكان یعشق فاطمة بنت یشكر وفیها یقول و تمام: ظَنَنْتُ بِاٰل فاطمة الظنونا ۔ ولعده یقول: حالت دون ذالك من ہموم ۔ ہموم تورث الدار الدفینا والبیت فی الطبری (۹: ۱۹۱) وشرح الدرة ۲۰۱ والبحر ۷: ۲۱۶) غیر منسوب وفی السمط (۱: ۹۹) انہ لخزیمة (مثل ربیبة) بن نہد قال الاستاذ المیمنی ہذا ہو الصحیح وہو مصحف فی جل الكتب بخزیمة او جذیمہ الا فی المعجم البكری ۱۴ والمشتبہ فانہ ضبطہ بالصواب والبیت فی التاج (ردف) وشرح المعلقات لابن الانباری ۸۷ والتبریزی ۲۷۳ وخزیمة ترجمة فی المعجم البكری ۱۴ ورجع ایضاً المبدا فی ۲۸۸، ۲۷۴، ۳۹۰ وكتاب البسوس ۷ وانظر لمعناه الانواء للقتبی والخبر بطولہ فی الاغانی (۱۱: ۱۵۴) ۱۲ [3] قرا اہل المدینة ویعقوب مُرْدَفِیْنَ بفتح الدال والباقون بالكسر وقرئی فی الشواذ مردفین (راجع الطبری ۹/ ۱۱۱)

(ر د م)

اَلرَّدْمُ۔ پتھروں سے کسی شگاف کو بند کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا (۱۸-۹۵) میں تم (لوگوں) میں اور ان (لوگوں) میں ایک روک بنا دوں۔
رَدْمٌ بمعنی مَرْدُوْمٌ یا مُرْدَمٌ ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] ع (الکامل)
(۱۸۰) هَلْ غَادَرَ الشُّعَرَاءُ مِنْ مُتَرَدَّمٍ
کیا شعراء قدیم نے کوئی قابل اصلاح مقام چھوڑا ہے (جس پر طبع آزمائی کی جائے)
اَرْدَمَتْ عَلَيْهِ الْحُمّٰى کسی کو دائمی بخار رہنا۔
سَحَابٌ مُرْدِمٌ ساکن اور ایک جگہ پر ٹھہرنے والا بادل۔

(ر د ی)

اَلتَّرَدِّيْ۔ (س) اس کے معنی ہلاکت کے ہیں اور اَلتَّرَدِّيْ (تفعل) کے معنی ہیں اپنے آپ کو ہلاکت کے سامنے پیش کرنا۔ قرآن میں ہے:۔
وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗ اِذَا تَرَدّٰى۔ (۹۲-۱۱) اور جب وہ جہنم میں گرے گا تو اس کا مال اس کے کچھ بھی کام نہ آئے گا۔
وَاتَّبَعَ هَوَاهُ فَتَرْدٰى۔ (۲۰-۱۶) اور وہ اپنی نفسانی خواہش کے پیچھے پڑا (اگر ایسا کرو گے) تو تم تباہ ہو جاؤ گے۔
(الاِرْدَاءُ (افعال) ہلاک کرنا قرآن میں ہے:۔
تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ۔ (۳۷-۵۶) خدا کی قسم تو تو مجھے تباہ کرنے کو تھا۔
اَلْمِرْدَاةُ وہ پتھر جس سے دوسرے پتھر توڑے جاتے ہیں۔

(ر ذ ل)

اَلرَّذْلُ وَالرُّذَالُ وہ چیز جس سے اس کے ردی ہونے کی وجہ سے بے رغبتی کی جائے۔ قرآن میں ہے:۔
وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ (۱۶-۷۰) اور تم میں سے ایسے بھی ہیں جو بدترین حالت کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔
اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ۔ (۱۱-۲۷) مگر جو ہم میں رذیلے ہیں (اور پیرو ہو بھی گئے ہیں تو) بے سوچے سمجھے (سرسری نظر سے)۔
اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ۔ (۲۶-۱۱۱) کیا ہم تمہاری بات تسلیم کریں۔ حالانکہ ادنیٰ درجے کے لوگ تمہارے متبع ہیں۔
یہ اَرْذَل کی جمع ہے جس کے معنی حقیر اور رذیل شخص کے ہیں۔

(ر ز ق)

اَلرِّزْقُ وہ عطیہ جو جاری ہو خواہ دنیوی ہو یا اخروی اور رزق بمعنی نصیبہ بھی آجاتا ہے۔ اور کبھی[2] اس چیز کو بھی رزق کہا جاتا ہے جو پیٹ

---

[1] قالہ عنترۃ العبسی وتمامہ: ام ہل عرفت الدار بعد توہم والبیت من معلقتہ تسمی المذہبۃ راجع السیوطی ۴۹۱ والامالی (۲: ۲۴۱) اللآلی السمط (۶۹) البیت لابوجانی شرحی التبریزی والزوزنی وبوجدنی دیوان الستۃ ۴۴ (العقد الثمین) رقم ۲۱ مطلع قصیدۃ وانظر ایضا ابن الانباری ۲۹۴ والتبریزی ۱۷۲ رواہ ابوعمرو عن ابی حرام العکلی فقط والبیت من قصیدۃ الطبری (۱۶: ۲۳) والشعر الجاہلی (۱: ۲۷۹) واللسان ورد ۲ بیشی من مترجم وفی روایۃ ابی عبیدۃ مترنم راجع ابدال ابی الطیب (۲: ۵۰) والجمہرۃ ۱۶۱ والشطر فی المثل السائر (۱: ۴۷۲)

میں پہنچ کر غذا بنتی ہے۔ کہا جاتا ہے۔
اَعْطَی السُّلْطَانُ رِزْقَ الْجُنُوْدِ۔ بادشاہ نے فوج کو راشن دیا۔
رُزِقْتُ عِلْمًا۔ مجھے علم عطا ہوا۔ قرآن میں ہے۔
وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ (۶۳-۱۰) یعنی جو کچھ مال وجاہ اور علم ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے صرف کرو

اسی طرح آیت:۔
وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔ (۲-۳) اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے (راہ خدا میں) صرف کرتے ہیں۔ میں بھی رزق عام ہے جو ان تینوں کو شامل ہے۔
كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ (۲-۸۱) اور ہم نے جو تم کو عمدہ اور پاکیزہ روزیاں دی ہیں (شوق سے) کھاؤ۔
اور آیت کریمہ:۔ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ۔ (۵۶-۸۲)
میں رزق کے معنی حصہ اور نصیبہ کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ نعمت الٰہی کی تکذیب کو تم نے اپنا حصہ بنالیا ہے۔ اور آیت:۔
وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ (۵۱-۲۲) اور تمہارا رزق آسمان میں ہے۔
میں بعض نے کہا ہے کہ رزق سے مراد بارش ہے جو ہر ذی حیات کے لئے باعث حیات ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔
وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً اور ہم نے آسمان سے بارش کی اور بعض نے کہا ہے کہ رزق سے مراد نصیبہ ہے اور آیت میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ حظوظ یعنی نصیبے مقادیر کے ساتھ ہیں۔ اور آیت:

فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ۔ (۱۸-۱۹) تو اس میں سے (بقدر ضرورت) کھانا تمہارے پاس لے آئے۔ میں رزق سے مراد طعام ہی ہے جو انسانی غذا بنتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ۔ رِزْقًا لِّلْعِبَادِ۔ (۵۰-۱۰،۱۱) اور لمبی لمبی کھجوریں جن کی گیلیں خوب گتھی ہوئی ہیں بندوں کو روزی دینے کے لئے۔
میں رزق سے غذائی اشیاء مراد ہیں اور بعض کے نزدیک کھانے پہننے اور ہر قسم کے استعمال کی چیزیں مراد ہیں۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں قدرت الٰہی کے ساتھ بارش کے ذریعہ ہی زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور آیت:۔
وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ۔ (۳-۱۶۹) اور (اے پیغمبر) جو لوگ اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں ان کو مرا ہوا خیال نہ کرنا (وہ مرے نہیں) بلکہ زندہ ہیں ان کو ان کے پروردگار کے ہاں روزی ملتی ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے ان پر اخروی نعمتوں کا برابر فیضان ہو رہا ہے۔
اسی طرح آیت:۔
وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا (۱۹-۶۲) اور وہاں ان کا کھانا صبح وشام (جس وقت وہ چاہیں گے ان کو) ملا کرے گا۔
میں انعامات اخروی ہی مراد ہیں۔ اور آیت:۔
اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۱-۵۸) اللہ تعالےٰ خود بڑا روزی دینے والا، قوت والا اور زبردست ہے۔

میں رزق کا لفظ عموم پر محمول ہوگا اور ذات باری تعالیٰ کے سوا اور کسی پر اس کا اطلاق جائز نہیں ہے لیکن "رَازِقٌ" کا لفظ خالق رزق اور اس کے دینے والے اور مسبب تینوں پر بولا جاتا ہے اس لئے اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر بھی ہوتا ہے اور اس انسان پر بھی جو دوسروں تک رزق پہنچانے کا سبب بنتا ہے۔ لہٰذا آیت:۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَسْتُمْ لَهُ بِرَازِقِينَ۔ (۱۵-۲۰) ..... اور ہم ہی نے زمین میں تمہارے لئے سامان معیشت پیدا کیا اور ان کے لئے بھی جن کو تم روز نہیں دیتے۔

یعنی جن کی روزی کا نہ تم سبب بنتے ہو اور نہ ہی تمہیں ان کی روزی میں کسی قسم کا دخل ہے۔

اسی طرح آیت:۔

وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا وَلَا يَسْتَطِيعُونَ۔ (۱۶-۷۳) اور خدا کے سوا ان (معبودوں) کی پرستش کرتے ہیں جو آسمانوں و زمین میں ان کو رزق دینے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے اور نہ ہی (ایسے اختیار پر) دسترس پا سکتے ہیں۔

میں لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا سے مراد یہ ہے کہ انہیں رزق دینے میں کسی قسم کا بھی دخل نہیں ہے (اور تمام اسباب رزق خدا تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں۔

عام محاورہ ہے۔ اِرْتَزَقَ الْجُنْدُ یعنی لشکر نے اپنا مقررہ راشن حاصل کیا اور وہ راشن جو ایک دفعہ دیا جائے اسے رَزْقَةٌ کہا جاتا ہے۔

(ر س س)

وَاَصْحٰبُ الرَّسِّ (۵۰-۱۲) اور رس کے رہنے والوں نے۔

بعض نے کہا ہے کہ رَسٌّ ایک وادی کا نام ہے[1] جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2]۔ (الطویل)

(۱۸۱) وَهُنَّ لِوَادِي الرَّسِّ كَالْيَدِ لِلْفَمِ

اور وہ وادی رس کے لئے جیسے ہاتھ منہ کی طرف اصل میں رَسٌّ کسی چیز کے تھوڑے سے نشان کو کہا جاتا ہے۔ عام محاورہ ہے:۔

سَمِعْتُ رَسًّا مِنْ خَبَرٍ میں نے کچھ یوں ہی سی خبر سنی

رَسَّ الْحَدِيثُ فِي نَفْسِي میرے دل میں تمہاری بات کا تھوڑا سا اثر ہوا۔

وَجَدَ رَسًّا مِنْ حُمّٰى۔ اس نے بخار کا تھوڑا سا اثر محسوس کیا۔

رُسَّ الْمَيِّتُ۔ میت دفن ہوگئی اور اس کی شخصیت کے بعد اس کے آثار باقی رہے۔

(ر س خ)

رُسُوخُ الشَّيْءِ۔ کسی چیز کا محکم اور جاگزیں ہونا

رَسَخَ الْغَدِيرُ جوہڑ کا پانی خشک ہو کر زمین میں جذب ہوگیا۔

اَلرَّاسِخُ فِي الْعِلْمِ وہ محقق جسے کوئی اشکال اور شبہ پیش نہ آسکے۔ گویا یہ راسخ فی العلم لوگ وہی ہیں جو آیت:۔ اَلَّذِينَ اٰمَنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا۔ (۴۹-۱۵) الیس سچے

---

[1] ابن کثیر ۳ / ۳۱۹ عن ابن عباس قریۃ من قری ثمود وفی روایۃ ابن ابی حاتم عن ابن عباس انہا اسم بئر فی آذربائیجان قیل ان قوما دفنوا فیہا نبیہم وفی تفسیر الطبری ان اصحاب الرس ہم اصحاب الاخدود وفی البخاری الرس معدن جمعہ رساس وقیل قوم شعیب راجع البخاری مع الفتح ۸/۴ ۔

[2] قالہ زہیر فی معلقتہ دیکھئے صفحہ ۲۹۴ حاشیہ [1] ❊ ❊

مسلمان تو وہ ہیں) جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک و شبہ نہیں کیا ہیں مذکورہ صفات کیساتھ متصف ہیں۔ اور اسیطرح سورۂ نساء میں فرمایا:۔

لٰكِنِ الرَّاسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ (۴-۱۶۲) لیکن (اے پیغمبر) ان میں سے جو علم میں بڑی پلے گاہ رکھتے ہیں۔

(ر س ل)

اَلرِّسْلُ: اصل میں اس کے معنی آہستہ اور نرمی کے ساتھ چل پڑنے کے ہیں اور نَاقَةٌ رِسْلَةٌ نرم رفتار اونٹنی کو کہتے ہیں اور یکی کے ساتھ اٹھنے والے اونٹوں کو اِبِلٌ مَرَاسِيْلُ کہا جاتا ہے۔ اسی سے رسول ہے جس کے معنی ہیں روانہ ہونے والا پھر کبھی رفق اور نرمی کے لحاظ سے عَلٰی رِسْلِكَ کہہ دیتے ہیں یعنی اپنے حال پر سکون سے ٹھہرے رہیے اور کبھی صرف روانہ ہونے کا معنی لے لیتے ہیں چنانچہ اسی اعتبار سے اس سے رسول مشتق ہے مگر کبھی رسول کا لفظ صرف پیغام پر بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے۔[1] (   )

(۱۸۲) اَلَا اَبْلِغْ اَبَا حَفْصٍ رَسُوْلًا

ابو حفص (عمرؓ) کو میرا پیغام پہنچا دو۔

اور کبھی اس شخص پر جسے پیغام دے کر بھیجا گیا ہو اور واحد جمع دونوں کے لئے آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (۹-۱۲۸) لوگو تمہارے پاس تمہیں میں سے ایک رسول آئے ہیں۔ اور فرمایا:۔

اَنَا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶-۱۶) ہم تمام جہان کے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔

اور شاعر نے کہا ہے۔[2] (   )

(۱۸۳) اَلِكْنِيْ اِلَيْهَا وَخَيْرُ الرَّسُوْ
لِ اَعْلَمُهُمْ بِنَوَاحِي الْخَبَرِ

اسے میرا پیغام پہنچا دو اور بہتر پیغام بر تو وہ ہوتا ہے جو خبر کو اچھی طرح جانتا بھی ہو۔

اور رسول کی جمع رُسُل آتی ہے اور قرآن پاک میں رسول اور رُسُلُ اللہ سے مراد کبھی فرشتے ہوتے ہیں جیسے فرمایا:۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۸۱-۱۹) کہ یہ (قرآن) بے شک معزز فرشتے (یعنی جبریل) کا (پہنچایا ہوا) پیام ہے۔

اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْا اِلَيْكَ (۱۱-۸۱) ہم تمہارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں یہ لوگ تم تک نہیں پہنچ پائیں گے۔

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ (۱۱-۷۷) اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس آئے تو وہ غمزدہ ہوئے۔

---

[1] قالہ زہیر بن ابی سلمیٰ واولہ: بکرن بکورا واستحرن بسحرۃ - والبیت فی الکامل ۸۱/۴ ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۵۲) والبحر (۲: ۳۹۸) والعقد ۵/۳ وایام العرب ۲۷۷ والتبریزی فی العشر ۱۰۵ وابن الانباری ۵۰ وفی روایۃ فہن ووادی الرس ۱۲

[2] قالہ جعدۃ بن عبداللہ السلمی وتمامہ: فدتی لکم من اخی ثقۃ اذ اری - والبیت فی اللسان (ازر) فی ستۃ ابیات قال احد مصحح اللسان ولعل الاولیٰ ان یقول قول نضیلۃ الاکبر الاشجعی بدل جعدۃ والبیت فی الوحشیات ۱۰۸ مع الخمسۃ قال فی ذیلہ لبقیلۃ الاکبر او لرجل من الانصار من سلمٰی راجع الآمدی ۶۳ وکنایات الثعالبی ۳ واللسان (قلص ، انس) والعمدۃ (۲۱/۱) والفصول والغایات ۱۰۶ قال احمد شاکر وہی ایضا طبقات ابن سعد (۳: ۲۰۵) والفائق (۲: ۱۳۱) والصناعتین ۳۵۴ [3] قالہ ابو ذؤیب الہذلی والبیت من شواہد الطبری (۶: ۱۵۸) والطبرسی والسان (رسل ، الک) والمحکم (غنی) ۱۲

وَلَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُنَا اِبْرَاهِیْمَ بِالْبُشْرٰی (۱۱-۶۹) اور جب ہمارے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوش خبری لے کر آئے۔

وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا (۷۷-۱) قسم ہے ان فرشتوں کی جو پیام الٰہی دے کر بھیجے جاتے ہیں۔

بَلٰی وَرُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَكْتُبُوْنَ (۴۳-۸۰) کیوں نہیں (ضرور سنتے ہیں) اور (سننے کے علاوہ) ہمارے فرشتے ان کے پاس (تعینات ہیں کہ وہ ان کی سب باتیں) لکھے جاتے ہیں۔

اور کبھی اس سے مراد انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں جیسے فرمایا وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ (۳-۱۴۴) اور محمد اس سے بڑھ کر اور کیا کہ ایک رسول ہیں اور بس یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ (۵-۶۷) اے پیغمبر جو احکام تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئے ہیں (بلا کم وکاست) ان کو لوگوں تک پہنچادو۔

اور آیت:۔ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ (۶-۴۸) اور پیغمبروں کو ہم صرف اس غرض سے بھیجا کرتے ہیں کہ (نیکوں کو خوشنودی خدا کی) خوشخبری سنائیں اور (بدوں کو عذاب سے) ڈرائیں۔

میں ملائکہ اور انسان دونوں مراد ہو سکتے ہیں اور آیت:۔ یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (۲۳-۵۱) (ہم نے اپنے پیغمبروں سے یہی ارشاد کرتے رہے ہیں کہ) اے گروہ پیغمبران ستھری چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔

میں آنحضرتؐ اور آپؐ کے تمام برگزیدہ اصحاب مراد ہیں اور صحابہ کرام پر آنحضرتؐ کے ساتھ تبعًا رُسُل کا لفظ بولا گیا ہے جیسا کہ مُهَلَّبُ اور اس کی اولاد کو مَهَالِبَه کہا جاتا ہے۔

اَلْاِرْسَالُ (افعال) کے معنی بھیجنے کے ہیں اور اس کا اطلاق انسان پر بھی ہوتا ہے اور دوسری محبوب یا مکروہ چیزوں کے لئے بھی آتا ہے۔ کبھی (۱) یہ تسخیر کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسے ہوا، بارش وغیرہ کا بھیجنا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَاَرْسَلْنَا السَّمَاۤءَ عَلَیْهِمْ مِّدْرَارًا (۶-۶) اور (اوپر سے) ان پر موسلادھار مینہ برسایا۔

اور کبھی (۲) کسی بااختیار وارادہ شخص کے بھیجنے پر بولا جاتا ہے جیسے پیغمبر بھیجنا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَیُرْسِلُ عَلَیْكُمْ حَفَظَةً (۶-۶۱) اور تم لوگوں پر نگہبان (فرشتے) تعینات رکھتا ہے۔

فَاَرْسَلَ فِی الْمَدَاۗىِٕنِ حٰشِرِیْنَ (۲۶-۵۳) اس پر فرعون نے (لوگوں کی بھیڑ) جمع کرنے کے لئے شہروں میں ہرکارے دوڑائے۔

اور کبھی (۳) یہ لفظ کسی چیز کو اس کی اپنی حالت پر چھوڑ دینے اور اس سے کسی قسم کا تعرض نہ کرنے پر بولا جاتا ہے جیسے فرمایا:۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا (۱۹-۸۳) (اے پیغمبر) کیا تم نے (اس بات پر) غور نہیں کیا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے کہ وہ انہیں انگیخت کر کے اکساتے رہتے ہیں۔

اور کبھی (۴) یہ لفظ امساک (روکنا) کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔ مَا یَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا یُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ (۳۵-۲) تو اللہ جو اپنی رحمت (کے لنگر) لوگوں کے لئے (کھول دے تو کوئی اس کا بند کرنے والا نہیں

اور بند کرے تو اس کے (بند کئے) پیچھے کوئی اس کا جاری کرنے والا نہیں۔
اور رَسْلٌ اس اونٹنی یا بکری کو کہتے ہیں جو پیہم اور نرم رفتاری سے چلے اور اگر لوگ یکے بعد دیگرے متواتر آئیں تو کہا جاتا ہے۔ جَاؤُا اَرْسَالًا یعنی وہ یکے بعد دیگرے آئے۔ اور اسی سے رِسْلٌ اس زیادہ دودھ کو کہتے ہیں جو مسلسل آرہا ہو۔

(ر س و)

رَسَا الشَّيْءُ۔ (ن) کے معنی کسی چیز کے کسی جگہ پر ٹھہرنے اور استوار ہونے کے ہیں اور اَرْسٰی کے معنی ٹھہرانے اور استوار کر دینے کے۔ قرآن میں ہے:۔ وَقُدُوْرٍ رَّاسِيٰتٍ (۳۴-۱۳) اور بڑی بھاری بھاری دیگیں جو ایک جگہ پر جمی رہیں۔
رَوَاسِيَ شَامِخَاتٍ (۷۷-۲۷) اور اونچے اونچے پہاڑ یہاں پہاڑوں کو بوجہ ان کے ثبات اور استواری کے رَوَاسِيَ کہا گیا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا (۷۹-۳۲) اور پہاڑوں کو (اس میں گاڑ کر) پلا دیا۔
اسی طرح معنیٰ ثبات کے اعتبار سے پہاڑوں کو اوتاد فرمایا ہے۔ جیسے:۔ وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا (۷۸-۵) اور پہاڑوں کو (زمین کی) میخیں نہیں بنایا۔
کسی شاعر نے کہا ہے[1]۔ (البسیط)

(۱۸۴) وَلَا عِمَادَ اِذَا لَمْ تُرْسِ اَوْتَادُ

اور میخوں کے بغیر ستون نہیں ٹھہر سکتے۔ عام محاورہ ہے:۔ اَلْقَتِ السَّحَابَةُ مَرَاسِيَهَا کہ بادل نے اپنے لنگر ڈال دیئے یعنی جم کر برسنے لگا جیسا کہ اسی معنی میں اَلْقَتْ طُنُبَهَا کہا جاتا ہے اور قرآن میں ہے:۔ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰهَا۔ (۱۱-۴۱) اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور لنگر انداز ہونا ہے۔
تو یہ اَجْرَيْتُ وَاَرْسَيْتُ (باب افعال) سے ماخوذ ہے۔ اور مُرْسٰى کا لفظ مصدر میمی بھی آتا ہے اور صیغہ ظرف زمان و مکان اور اسم مفعول بھی استعمال ہوتا ہے اور آیت مذکورۃ الصدر میں ایک قرأت مَجْرٰهَا وَمَرْسٰهَا بھی ہے[2]۔ اور آیت:۔
يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا (۷-۱۸۷) (اے پیغمبر لوگ) تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ کہیں اس کا وقوع کب ہوگا! (یعنی کب واقع ہوگی)
میں مُرْسٰهَا سے اس کے بپا ہونے کا زمانہ مراد ہے۔ عام محاورہ ہے: رَسَوْتُ بَيْنَ الْقَوْمِ میں نے قوم کے درمیان صلح کو پختہ کر دیا۔

(ر ش د)

اَلرَّشَدُ وَالرُّشْدُ یہ غَيٌّ[3] کی ضد ہے اور ہدایت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور یہ باب نَصَرَ وَعَلِمَ دونوں سے آتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ (۲-۱۸۶) تاکہ وہ سیدھے رستے پر لگ جائیں۔
قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ (۲-۲۵۶) گمراہی سے ہدایت الگ ہو چکی۔
فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا۔ (۴-۶) اور اگر تم

---

[1] قاله الافوه الاودی (واسمه صلاءة بن عمرو وکنی ابا ربیعه) وصدره: والبیت لاینبنی الا باعمدة . . . وفی الثانی الا له عمد۔ وفی المطبوع "ولاجبال" اخشی ان یکون تصحیفا والبیت من باب التمثیل ای لاینال الامر الابتوفر اسبابه۔ فی الطرائف من شعر الافوه الاودی والبیت فی روضة العقلاء ۲۴۸ والبحر ۵۰ (۱۹۲) وانظر التخریج علیه الشادر۔ [2] کذا فی الصحاح [3] تفسیر ابن کثیر الی ابی رجاء العطاردی (۲/۴۴۴)

ان میں صلاحیت دیکھو۔
وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ (۲۱-۵۱)
اور ابراہیم علیہ السلام کو ہم نے شروع ہی سے فہم سلیم عطا کی تھی۔
ان آیات میں ابراہیم اور یتیم دونوں کے متعلق رُشد کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن دونوں میں بون بعید پایا جاتا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ رَشَدٌ (بفتح الراء والشین) رُشد (بضم الراء) سے اخص ہے کیونکہ رُشد کا لفظ امور دنیوی اور اخروی دونوں میں استعمال ہوتا ہے اور رَشَدٌ صرف امور اخروی کے ساتھ مختص ہے۔ اور
رَاشِدٌ اور رَشِيدٌ (صیغہ صفت) دونوں طرح پر یکساں طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔
أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ (۴۹-۷) یہی لوگ نیک چلن ہیں۔
وَمَا أَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيدٍ (۱۱-۹۷) اور فرعون کی بات کچھ راہ کی بات تو تھی نہیں۔

(ر ص ص)

رَصٌّ (ن) کے معنی دو چیزوں کو باہم ملا کر جوڑ دینے کے ہیں اور رَصَاصٌ سیسہ کو کہتے ہیں اور اسی سے فرمایا:۔
كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ (۶۱-۴) گویا ایک مضبوط دیوار ہیں جس میں سیسہ پلا دیا گیا ہے۔
اور رَصَصْتُهُ (ن) وَرَصَّصْتُهُ (تفعیل) کے ایک ہی معنی ہیں یعنی کسی چیز کو سیسہ پلا کر مضبوط کرنا اور جوڑنا اور تَرَاصُّوا فِي الصَّلٰوةِ کے معنی ہیں نماز کی صف میں باہم پیوستہ ہو کر کھڑے ہونا اور تَرْصِيصُ الْمَرْأَةِ کے معنی ہیں عورت کا نقاب کو
مضبوطی سے باندھنا اور اس میں تَرَصُّص سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے۔

(ر ص د)

اَلتَّرَصُّدُ گھات لگا کر بیٹھنا۔ اور رَصَدَ لَهُ وَتَرَصَّدَ کے معنی ہیں کسی کے لئے گھات لگانا اور أَرْصَدْتُهُ کسی کو گھات لگانے کے لئے مقرر کرنا اور أَرْصَدَ لَهُ کے معنی پناہ دینا بھی آتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَإِرْصَادًا لِمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ مِنْ قَبْلُ (۹-۱۰۷) اور ان لوگوں کو پناہ دیں جو اللہ اور رسول کے ساتھ پہلے لڑ چکے ہیں۔
إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ (۸۹-۱۴) (بیشک تیرا پروردگار نافرمانوں کی تاک میں لگا رہتا ہے)۔
رَصَدٌ (صیغہ صفت) یہ معنی فاعل اور مفعول دونوں کے لئے آتا ہے اور واحد اور جمع دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
يَسْلُكُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ رَصَدًا (۷۲-۲۷) تو ان کے آگے اور ان کے پیچھے (فرشتوں سے) پہرہ دینے والے ان کے ساتھ چلتے ہیں۔
تو یہاں رَصَدًا سے واحد اور جمع دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔
اَلْمَرْصَدُ گھات لگانے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ (۹-۵) اور ہر گھات کی جگہ پر ان کی تاک میں بیٹھو۔
اور مِرْصَادٌ بمعنی مَرْصَدٌ آتا ہے لیکن مرصاد اس جگہ کو کہتے ہیں جو گھات کے لئے مخصوص ہو۔ قرآن میں ہے:۔
إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا (۷۸-۲۱) بیشک

دوزخ گھات میں ہے۔
توآیت میں اس بات پر بھی تنبیہ ہے کہ جہنم کے اوپر سے لوگوں کا گزر ہوگا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔
وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا۔(۱۹۔۷۱) اور تم میں سے کوئی (ایسا بشر) نہیں جو جہنم پر سے ہو کر نہ گزرے۔

(ر ض ع)

رَضَعَ الْمَوْلُوْدُ (ض س) رِضَاعًا وَرَضَاعَةً بچے کا دودھ پینا۔ اسی سے استعارہ کے طور پر انتہائی کمینے کو لَئِیْمٌ رَاضِعٌ کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس کنجوس شخص پر بولا جاتا ہے جو انتہائی بخل کی وجہ سے رات کے وقت اپنی بکریوں کے پستانوں سے دودھ چوس لے تاکہ کوئی ضرورت مند دودھ دوہنے کی آواز سنکر سوال نہ کرے۔ پھر اس سے رَضُعَ فُلَانٌ بمعنی لَئُمَ استعمال ہونے لگا ہے۔ رَاضِعَتَانِ بچے کے اگلے دو دانت جن کے ذریعہ وہ ماں کی چھاتی سے دودھ چوستا ہے۔ (اور) اِرْضَاعٌ (افعال) کے معنی دودھ پلانا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ (۲۔۲۳۳) اور جو شخص پوری مدت تک دودھ پلانا چاہے تو اس کی خاطر مائیں اپنی اولاد کو پورے دو برس دودھ پلائیں۔ نیز فرمایا:۔
فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ۔ (۶۵۔۶) اگر وہ (بچے کو) تمہارے لئے دودھ پلانا چاہیں تو انہیں ان کی دودھ پلائی دو۔

عام محاورہ ہے:۔
فُلَانٌ اَخُوْهُ مِنَ الرَّضَاعَةِ (بضم الراء) فلاں کا رضاعی بھائی ہے۔ حدیث میں ہے[1] (۱۵۵)
يَحْرُمُ مِنَ الرِّضَاعِ مَا يَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ۔ جو رشتے نسب سے حرام ہونے ہیں وہ بوجہ رضاعت کے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔
اَلْاِسْتِرْضَاعُ کسی سے دودھ پلوانا۔ قرآن میں ہے:۔
وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَكُمْ (۲۔۲۳۳) اگر تم اپنی اولاد کو (کسی دایہ سے) دودھ پلوانا چاہو۔ یعنی انہیں مزدوری دے کر دودھ پلوانے کا ارادہ ہو۔

(ر ض و)

رَضِيَ (س) رِضًا فَهُوَ مَرْضِيٌّ وَمَرْضُوٌّ۔ راضی ہونا۔ واضح رہے کہ بندے کا اللہ تعالیٰ سے راضی ہونا یہ ہے کہ جو کچھ قضائے الہیٰ سے اس پر وارد ہو وہ اسے خوشی سے برداشت کرے اور اللہ تعالیٰ کے بندے پر راضی ہونے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اسے اپنے اوامر کا بجا لانے والا اور منہیات سے رکنے والا پائے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (۵۔۱۱۹) اللہ تعالیٰ ان سے خوش اور وہ اللہ تعالیٰ سے خوش۔
لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (۴۸۔۱۸) تو اللہ تعالیٰ ضرور ان مسلمانوں سے خوش ہوتا ہے۔
وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵۔۳) اور ہم نے تمہارے لئے دین اسلام کو پسند فرمایا:۔
اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۹۔۳۸) کیا آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پر قناعت کر بیٹھے ہو۔

[1] الحدیث فی (حم، ق، د، ن، ہ عن عائشۃ، حم، م، ن، ہ۔ عن ابن عباس وفی روایۃ من الولادۃ بدل النسب وابن جریر عن عائشۃ بمعناہ (ت حسن صحیح) دالطبرانی عن ابن عباس ۲ قال فی الصحاح نجاعدوا بہ علی الاصل والقیاس ۱۲

يُرْضُوْنَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ وَتَأْبٰى قُلُوْبُهُمْ۔ (۹-۸)
اپنی زبانی باتوں سے تو تم کو رضامند کر دیتے ہیں اور ان کے دل ہیں کہ ان باتوں سے انکار کرتے ہیں۔
وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَا آتَيْتَهُنَّ۔ (۳۳-۵۱)
اور آزردہ خاطر نہ ہوں گی اور جو کچھ (بھی) تم ان کو دو گے وہ (لے کر سب کی سب) راضی ہو جائیں گی۔
اَلرِّضْوَانُ رضائے کثیر یعنی نہایت خوشنودی کو کہتے ہیں۔ چونکہ سب سے بڑی رضا اللہ تعالیٰ کی رضامندی ہے اس لئے قرآن پاک میں خاص کر رضائے الٰہی کے لئے رِضْوَانٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:۔
وَرَهْبَانِيَّةَنِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ۔ (۵۷-۲۷) اور (لذت) دنیا کا چھوڑ بیٹھنا جس کو انہوں نے از خود ایجاد کیا تھا ہم نے وہ طریق ان پر فرض نہیں کیا تھا۔ . . . .
. . . مگر (ہاں) انہوں نے اس کو خدا (ہی) کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے ایجاد کیا تھا۔
يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا۔ (۴۸-۲۹)
اور خدا کے فضل اور خوشنودی کی طلب گاری میں لگے رہتے ہیں۔
يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ۔ (۹-۲۱) ان کا پروردگار ان کو اپنی مہربانی اور رضامندی کی خوشخبری دیتا ہے۔
اور آیت کریمہ۔ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ (۲-۲۳۲) جب جائز طور پر آپس میں راضی ہو جائیں۔
میں تَرَاضَوْا باب تفاعل سے ہے جس کے معنی باہم اظہار رضامندی کے ہیں۔

(ر ط ب)

اَلرَّطْبُ (تر) یہ یَابِسٌ (خشک) کی ضد ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۔ . . . . . (۶-۵۹)۔ اور (دنیا کی) تر اور خشک چیزیں (سب ہی تو) کتاب واضح (یعنی لوح محفوظ میں) لکھی ہوئی موجود ہیں۔
اور رُطَبٌ کا لفظ (پختہ اور) تازہ کھجور کے ساتھ مخصوص ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَهُزِّيْ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا (۱۹-۲۵) اور کھجور کی شاخ کو اپنی طرف ہلا۔ تجھ پر تازہ پکی کھجوریں جھڑ پڑیں گی۔
اَرْطَبَ النَّخْلُ کے معنی ہیں درخت خرما کی کھجوروں والا ہو گیا۔ اس میں صاحب ماخذ ہونے کا خاصہ پایا جاتا ہے (جیسے اَتْمَرَ وَاَجْنٰی میں ہے عام محاورہ ہے):۔
اَرْطَبْتُ الْفَرَسَ وَرَطَّبْتُهٗ میں نے گھوڑے کو تازہ گھاس کھلائی اور رَطِبَ الْفَرَسُ (باب عَلِمَ سے لازمی ہے اور اس) کے معنی گھوڑے نے تازہ گھاس کھانا کے ہیں۔
رَطِبَ الرَّجُلُ۔ تروخشک ہر قسم کی باتیں کرنا خوش گپیاں اڑانا یہ محاورہ رَطِبَ الْفَرَسُ کے ساتھ بطور تشبیہ استعمال ہوتا ہے:۔
اَلتَّرْطِيْبُ نرم و ملائم کو کہتے ہیں۔

(ر ع ب)

اَلرُّعْبُ۔ اس کے اصل معنی خوف سے بھر کر کٹ جانے کے ہیں۔ کہا جاتا ہے:۔

رَعَبْتُهٗ فَرَعَبَ رُعْبًا۔ میں نے اسے خوف زدہ کیا تو وہ خوف زدہ ہوگیا۔ اور خوف زدہ شخص کو رَعِبٌ کہا جاتا ہے۔ اَلتِّرْعَابَةُ (صیغہ صفت) بہت زیادہ ڈرپوک۔ قرآن میں ہے:۔
وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ۔ (۳-۱۵۱) ہم عنقریب تمہاری ہیبت کافروں کے دلوں میں بٹھا دیں گے۔
وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا۔ (۱۸-۱۸) اور ان کی (صورت حال سے تجھ میں ایک دہشت سما جائے۔
پھر کبھی یہ صرف بھرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے رَعَبْتُ الْحَوْضَ میں نے حوض کو پانی سے پر کر دیا۔
سَیْلٌ رَاعِبٌ سیلاب جو وادی کو پر کر دے۔ اور جَارِیَةٌ رُعْبُوْبَةٌ کے معنی جوانی سے بھرپور اور نازک اندام دوشیزہ کے ہیں اس کی جمع رَعَابِیْبُ آتی ہے۔

(ر ع د)

اَلرَّعْدُ (اسم) بادل کی گرج مروی ہے (۱) اَنَّهٗ مَلَكٌ يَسُوْقُ السَّحَابَ کہ رَعْدٌ اس فرشتے کا نام ہے جو بادلوں کو چلاتا ہے۔ کہا جاتا ہے۔
رَعَدَتِ السَّمَاءُ وَبَرَقَتْ بادل گرجا اور چمکا۔ اور یہی معنی اَرْعَدَتْ وَاَبْرَقَتْ کے ہیں اور کنایہ کے طور پر یہ دونوں لفظ تہدید یعنی ڈرانے اور دھمکانے کے معنی میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اور صَلَفٌ تَحْتَ رَاعِدَةٍ (مثل) ضرب المثل ہے جو اس شخص کے حق میں بولی جاتی ہے جو بڑا باتونی ہو لیکن کر کے نہ دکھاتا ہو (۲)
اَلرِّعْدِیْدُ بزدلی کی وجہ سے کانپنے والا نیز محاورہ ہے۔ اُرْعِدَتْ فَرَائِصُهٗ خَوْفًا یعنی مارے خوف کے اس کے پٹھے کانپنے لگے۔

(ر ع ن)

قرآن میں ہے:۔
لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا (۲-۱۰۴) یعنی راعنا کہہ کر خطاب نہ کیا کرو۔
رَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِی الدِّیْنِ (۴-۴۶) اور اپنی زبانوں کو مروڑ کر اور دین اسلام میں طعنے کی راہ سے کہہ کر تم سے خطاب کرتے ہیں۔
اس کلمہ کے ساتھ آنحضرت کو بطور تہکم خطاب کرتے تھے اور آپ پر رعونت کا الزام دھرتے اور ظاہر یہ کرتے کہ ہم رَاعِنَا کا کلمہ کہتے ہیں جس کے معنی ہیں ہمارا خیال کیجیے اور رَاعِنَا۔ رعن سے مشتق ہے اور رَعُنَ الرَّجُلُ (ک) کے معنی کسی آدمی کے سست اور بے وقوف ہونے کے ہیں اس سے صیغہ صفت اَرْعَنُ اور رَعْنٌ آتا ہے جس کے معنی کم فہم آدمی کے ہیں یہ دراصل رَعْنٌ کی بسالہ تشبیہ کے طور پر بولا جاتا ہے جس کے معنی بینی کوہ کے ہیں یعنی پہاڑ کا وہ حصہ جو باہر نکلا ہوا ہو اور اَرْعَنُ کی مؤنث رَعْنَاءُ آتی ہے کسی شاعر نے کہا ہے (۳)

(۱۸۵) لَوْلَا ابْنُ عُتْبَةَ عَمْرٌو وَالرَّجَاءُ لَهٗ
مَا كَانَتِ الْبَصْرَةُ الرَّعْنَاءُ لِیْ وَطَنًا

اگر عمرو بن عتبہ اور اس کے عطایا کی امید نہ ہوتی تو میں

---

(۱) ہکذا ورد فی حدیث مرفوع عن ابن عباس والحدیث فی الترمذی والنسائی واحمد والطبرانی فی الاوسط من روایۃ جابر وابی عمران الکوفی۔ عن ابن جریج راجع التفاسیر تحت الآیۃ (۱۳-۱۳) وتخریج الکشاف رقم ۲۲۵ وقد ذکر معنیہ ابوعبیدۃ فی مجازہ ۱/۳۲۵۔ (۲) مثل فی جل المعاجم فی الصحاح: لمن یکثر الکلام ولا خیر فیہ (۳) قالہ الفرزدق فی عمرو بن عتبۃ وفی اللسان (رعن) صدرہ: لولا ابو مالک المرجو نائلہ وفی روایۃ النقائض بدل الرعناء والبیت فی الاقتضاب ۱۵۴ ودیوانہ والبلدان (رسم: بصرۃ) وفیہ وجہ تلقیبہا بالرعناء ۱۲

بَصۡرَۃ رَعۡنَا کو بھی اپنا وطن نہ بناتا۔
بصرۃ کو رَعۡنَاءُ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ بادیہ کی بنسبت نشیبی ہونے کے سبب گویا رَعۡنَاء (سست عورت) کے مشابہ ہے اور یا اس لئے کہ اس کی ہوا میں تغیر اور تکسر پایا جاتا ہے۔

(ر ع ی)

اَلرَّعۡیُ۔ اصل میں حیوان یعنی جاندار چیز کی حفاظت کو کہتے ہیں۔ خواہ غذا کے ذریعہ ہو جو اس کی زندگی کی حافظ ہے یا اس سے دشمن کو دفع کرنے کے ذریعہ ہو اور رَعَیۡتُہٗ کے معنی کسی کی نگرانی کرنے کے ہیں اور اَرۡعَیۡتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اسکے سامنے چارا ڈالا اور رِعۡیٌ چارہ یا گھاس کو کہتے ہیں مَرۡعیٰ (ظرف) چراگاہ۔ قرآن میں ہے:۔
کُلُوۡا وَارۡعَوۡا اَنۡعَامَکُمۡ (۲۰-۵۴) تم بھی کھاؤ اور اپنے چارپاؤں کو بھی چراؤ۔
اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا وَمَرۡعٰهَا (۷۹-۳۱) اس میں سے اس کا پانی اور چارہ نکالا۔
وَالَّذِیۡۤ اَخۡرَجَ الۡمَرۡعٰی (۸۷-۴) اور جس نے (خوش نما) چارہ (زمین سے) نکالا۔
رَعۡیٌ اور رِعَاءٌ کا لفظ عام طور پر حفاظت اور حسن انتظام کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَمَا رَعَوۡهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا (۵۷-۲۷) لیکن جیسے اس کی نگہداشت کرنا چاہئے تھی انہوں نے نہ کی۔
اور ہر وہ آدمی جو دوسروں کا محافظ اور منتظم ہو اسے رَاعِیٌ کہا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے[1] (۱۵۷)
کُلُّکُمۡ رَاعٍ وَکُلُّکُمۡ مَسۡئُوۡلٌ عَنۡ رَعِیَّتِهٖ
تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق سوال ہوگا شاعر نے کہا ہے[2] (السریع)
(۱۸۶) ۔۔۔۔۔۔۔۔ وَلَا رَاءُ
مَرۡعِیٌّ فِی الۡاَقۡوَامِ کَالرَّاعِیۡ
اور محکوم قومیں حاکم قوموں کے برابر نہیں ہو سکتیں۔
اور رَاعِیٌ کی جمع رِعَاءٌ وَرُعَاۃٌ آتی ہے۔ اَلۡمُرَاعَاۃُ کسی کام کے انجام پر غور کرنا اور دیکھنا کہ اس سے کیا صادر ہوتا ہے کہا جاتا ہے۔
رَاعَیۡتُ النُّجُوۡمَ میں نے ستاروں کے غروب ہونے پر نگاہ رکھی۔ قرآن میں ہے:۔
لَا تَقُوۡلُوۡا رَاعِنَا وَقُوۡلُوا انۡظُرۡنَا (۲-۱۰۴)
(مسلمانو پیغمبر سے) رَاعِنَا کہہ کر مت خطاب کیا کرو بلکہ اُنۡظُرۡنَا کہا کرو۔
کہا جاتا ہے:۔
اَرۡعَیۡتُہٗ سَمۡعِیۡ۔ میں نے اس کی بات پر کان لگایا یعنی غور سے اس کی بات کو سنا۔ اسی طرح محاورہ ہے:۔
اَرۡعِنِیۡ سَمۡعَكَ میری بات سنیئے۔
اور اَرۡعٰی عَلیٰ کَذَا۔ کے معنی کسی پر رحم کھانے اور اس کی حفاظت کرنے کے ہیں۔

(ر غ ب)

اَلرَّغۡبَۃُ اس کے اصل معنی کسی چیز میں وسعت کے ہیں۔ کہا جاتا ہے: رَغُبَ الشَّیۡءُ

---

[1] اصل الحدیث متفق علیہ وایضا فی الترمذی وابی داود والبیہقی من انس وابن عباس والطبرانی من حدیث ابن عباس راجع لتخریجہ احیاء العلوم للغزالی بتخریج العراقی ۲ / ۲۱ وکنز العمال ۶ رقم ۱۳۱۰۹۱ والفتح الکبیر ۲ / ۳۰۴-۳۱-۳۳۱ [2] قالہ ابو قیس بن الاسلت وتکملتہ، لیس قطا مثل قُطَیّ ۔۔۔ والبیت من کلمۃ مفضلیۃ (۲-۸۵) جمہرۃ فی ۱۹ بیتا راجع السمط ۸۲۷ والمیدانی (۲: ۱۰۹) واللسان (قطا، رعی) وایام العرب ۸۳ وخاص الخاص للثعالبی ۷۴ والمثل ایضا فی المیدانی (۲: ۸۶، ۱۱۴) والعسکری ۱۷۵، ۱۴۷)

کسی چیز کا وسیع ہونا اور حَوْضٌ رَغِیْبٌ کشادہ حوض کو کہتے ہیں۔ عام محاورہ ہے۔

فُلَانٌ رَغِیْبُ الْجَوْفِ فلاں پیٹو ہے۔

فَرَسٌ رَغِیْبُ الْعَدْوِ تیز رفتار اور کشادہ قدم گھوڑا

اَلرَّغْبَۃُ وَالرَّغَبُ وَالرُّغْبیٰ ارادہ اور خواہش کی وسعت کو کہتے ہیں قرآن میں ہے:۔

وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا (۲۱-۹۰) اور وہ ہم کو ہمارے فضل کی توقع اور ہمارے عذاب کے خوف سے پکارتے ہیں۔

اور رَغِبَ فِیْهِ وَاِلَیْهِ کے معنی کسی چیز پر رغبت اور حرص کرنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اِنَّا اِلَی اللّٰہِ رَاغِبُوْنَ (۹-۵۹) ہم تو اللہ سے لو لگائے بیٹھے ہیں۔

لیکن رَغِبَ عَنْ کے معنی کسی چیز سے بے رغبتی کے ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَمَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّۃِ اِبْرٰهِیْمَ (۲-۱۳۰) اور کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے انحراف کرے۔

اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ (۱۹-۴۶) اے ابراہیم، کیا تو میرے معبودوں سے پھرا ہوا ہے۔

اور رَغِیْبَۃٌ کے معنی بہت بڑے عطیہ کے ہیں (ج رَغَائِبُ) یہ رغبت سے مشتق ہے یا تو اس لئے کہ وہ مرغوب فیہ ہوتی ہے اور یا اصل معنی یعنی وسعت کے لحاظ سے عطیہ کو رغیبہ کہا جاتا ہے شاعر نے کہا ہے (الکامل)

(۱۸۷) "یعطی الرغائب من یشاء و یمنع"

وہ جسے چاہتا ہے بڑے بڑے عطایا بخشتا اور جس سے چاہتا ہے روک لیتا ہے۔

(ر غ د)

رَغَدًا اور رَغِیْدًا۔ آسودہ زندگی۔ قرآن میں ہے:۔

وَکُلَا مِنْهَا رَغَدًا (۲-۳۵) اور اس میں سے تم دونوں بافراغت کھاؤ۔

یَاْتِیْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ کُلِّ مَکَانٍ (۱۶-۱۱۲) ہر طرف سے ان کا رزق بافراغت ان کے پاس چلا آتا تھا۔

اَرْغَدَ الْقَوْمُ آرام و راحت میں بسر کرنا۔

اَرْغَدَ مَاشِیَتَہٗ اس نے اپنے مویشی چراگاہ میں آزاد چھوڑ دیئے۔

ان میں اول یعنی اَرْغَدَ الْقَوْمُ جَدَبَ وَاَجْدَبَ کی طرح لازم ہے اور دوسرا یعنی اَرْغَدَ مَاشِیَتَہٗ اَدْخَلَ کی طرح متعدی ہے۔

اَلْمُرْغَادُّ ایک قسم کا کھانا جو دودھ میں خرما وغیرہ ڈال کر بنایا جاتا ہے اور وافر ہونے کی وجہ سے زندگی کی آسودگی پر دلالت کرتا تھا۔

(ر غ م)

اَلرُّغَامُ اصل میں خاک کو کہتے ہیں اور رَغِمَ اَنْفُ فُلَانٍ کے معنی ہیں اس کی ناک خاک آلودہ ہو یعنی وہ ذلیل ہو اور اَرْغَمَہٗ کسی کو ذلت کے ساتھ خاک میں ملا دیا مجازًا رَغِمَ اَنْفُ فُلَانٍ کے معنی ناراض ہونا بھی آتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2] (   )

---

[1] لعبدۃ بن الطیب من قصیدۃ یعظ فیها بنیه وصدرہ:۔ اوصیکم بتقی الالٰہ فانه ... راجع للبیت شرح شواهد التلخیص (۱: ۳۶)

[2] قد مر فی (الف) رقم ۱۲ وفیہ غضبت بدل ارغمت

(۱۸۸) اِذَا رَغِمَتْ تِلْكَ الْاُنُوْفُ لَمْ اُرْضِهَا
وَلَمْ اَطْلُبِ الْعُتْبٰی وَلٰکِنْ اَزِيْدُهَا

اگر وہ ناراض ہوں گے تو میں ان کو راضی کرنے کی کوشش نہیں کروں گا بلکہ اس کی ناراضگی کو اور بڑھاؤں گا۔ یہاں پر رغم کو اِرْضَاء کے بالمقابل لانا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے معنی سخط یعنی غصے اور ناراض ہونے کے ہیں۔ اسی سے یہ کہا جاتا ہے:۔
اَرْغَمَ اللّٰهُ اَنْفَ فُلَانٍ اَوْ اَرْغَمَهٗ یعنی اللہ اسے ذلیل کرے اور رَاغَمَهٗ (باب مفاعلہ کے معنی باہم ناراض ہونے اور ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کی کوشش کے ہیں بعد ازاں مراغمہ کا لفظ منازعت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ اور آیت:۔
يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً۔ (۴-۱۰۰) تو وہ زمین میں اس کو رہنے سہنے کی وافر جگہ اور ہر طرح کی کشائش ملے گی۔
میں مُرَاغَمًا سے مراد پناہ گاہ ہے یعنی برائی کو دیکھ کر اسے روکنے کی کوشش کرے اگر اس سلسلہ میں اسے وطن بھی ترک کرنا پڑے تو ہراساں نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ اسے کوئی اچھی پناہ گاہ دے گا۔ جہاں اسے وسعت اور فراخی نصیب ہوگی اور یہ رَغِمْتُ اِلَيْهِ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کسی کے پاس چلا جانا۔ جیسے غَضِبْتُ اِلٰی فُلَانٍ مِنْ کَذَا یعنی ناراض ہو کر فلاں کے پاس چلا گیا۔

(ر ف ف)

رَفِيْفُ الشَّجَرِ درخت کی شاخوں کا ہوا سے لہلہانا اور منتشر ہونا کہا جاتا ہے۔
رَفَّ الطَّائِرُ جَنَاحَيْهِ پرندکا اپنے بچے کی حفاظت کے لئے دونوں بازو پھیلانا۔ یہ باب رَفَّ يَرُفُّ (ن) سے ہے اور استعارہ کے طور پر رَفٌّ کا لفظ کسی چیز کی دیکھ بھال کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے عام محاورہ میں کہا جاتا ہے۔
مَا لِفُلَانٍ حَافٌّ وَلَا رَافٌّ یعنی اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ اس پر کوئی شفقت کرنے والا نہیں رہا۔ مثل مشہور ہے[1] (مثل)
مَنْ حَفَّنَا اَوْ رَفَّنَا فَلْيَقْتَصِدْ جو ہم پر شفقت کرے اسے چاہیئے کہ اعتدال سے کام لے۔
اَلرَّفْرَفُ کے معنی درخت کے منتشر پتوں کے ہیں۔ اور قرآن کی آیت:۔
عَلٰی رَفْرَفٍ خُضْرٍ (۵۵-۷۶) وہ سبز قالینوں پر تکیہ لگائے)
رَفْرَفٌ سے خاص قسم کے کپڑے مراد ہیں۔ جو مرغزار کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اور بعض کا قول ہے کہ رَفْرَفٌ سے خیمے کا کنارہ مراد ہے۔ جو زمین پر پڑا رہتا ہے اور حسن (بصری) سے مروی ہے کہ اس سے گل تکیے مراد ہیں۔

(ر ف ت)

اَلرَّفْتُ یہ باب نصر کا مصدر ہے اور رَفَتَ الشَّيْءَ کے معنی کسی چیز کو چورا چورا کر دینے کے ہیں اور جو بھوسہ وغیرہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے اسے رفات کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَقَالُوْا اَئِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا۔ (۱۷-۴۹)

---

[1] انظر للمثل النہایۃ لابن الاثیر (۲-۸۸۹) واللسان والصحاح (رنف) ومجالس ثعلب ۲/ ۱۱۴ وفی اتباع ابی الطیب ۸۴ فلیترک بدل فلیقتصد وکلھم جعل الکلمۃ من قبیل المثل الا ابا الطیب فانہ قال جاء فی الحدیث - ۱۲

اور کہا کرتے کہ جب ہم گل سڑ کر ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔
اور استعارہ کے طور پر رُفات اس رسی کو بھی کہتے ہیں۔ جو بوسیدہ ہو کر ٹکڑے ہو گئی ہو۔

(ر ف ث)

اَلرَّفَثُ (ن) وہ فحش باتیں جن کا ذکر اچھا نہیں سمجھا جاتا یعنی جماع اور اس کے دواعی کا تذکرہ اور آیت کریمہ :۔
اُحِلَّ لَکُمْ لَیْلَۃَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِکُمْ (۲-۱۸۷) مسلمانوں (ماہ رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لئے جائز کر دیا گیا ہے۔
میں کنایۃً جماع مراد ہے اور اس سے متنبہ کیا گیا ہے کہ ماہ رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کو جماع کے لئے بلانا اور ان سے اس کے متعلق گفتگو کرنا جائز ہے اور اسے بواسطہ الی متعدی کرکے معنی افضار کی طرف اشارہ کیا ہے اور آیت :۔
فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ .... (۲-۱۹۷) (اور حج میں) نہ شہوت کی کوئی بات کرے اور نہ گناہ کی۔
میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جماع کی ممانعت کی گئی ہو اور یہ بھی کہ اس کے متعلق گفتگو سے منع کیا گیا ہو۔ کیونکہ یہ گفتگو جماع کے مقدمات میں شامل ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ صحیح ہے کیونکہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ دورانِ طواف میں یہ شعر پڑھا۔ (رجز)

(۱۸۹) وَهُنَّ یَمْشِیْنَ بِنَا هَمِیْسًا
اِنْ تَصْدُقِ الطَّیْرُ نَنِكْ لَمِیْسًا

اور اونٹ ہمیں لے کر آہستہ آہستہ نرم رفتاری سے چلتے ہیں اگر پرندہ سچ بولتا ہے تو ہم لمیس سے جماع کریں گے۔
اور رَفَثَ وَاَرْفَثَ دونوں ایک دوسرے کی جگہ میں استعمال ہوتے ہیں اس لئے کہ رَفَثَ کے معنی مباشرت کرنے کے ہیں اور اَرْفَثَ کے معنی رَفَثَ (ماخذ) کے ساتھ متصف ہونا کے اور یہ دونوں باتیں لازم ملزوم ہیں۔

(ر ف د)

اَلرِّفْدُ (ن) اس کے معنی عطا اور مدد کے ہیں اور رَفْدٌ مصدر (ض) ہے جس کے معنی مدد دینے اور عطا کرنے کے ہیں اور مِرْفَدٌ اس چیز کو کہتے ہیں۔ جس میں عطیہ ڈال کر دیا جائے عام طور پیالوں میں خیرات ڈال کر دی جاتی ہے اس لئے مِرْفَدٌ بمعنی پیالہ آتا ہے اور رَفَدْتُهٗ کے معنی عطیہ دینے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔
بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ۔ (۱۱-۹۹) بہت ہی برا عطیہ ہے جو انہیں دیا جائے گا۔
اور اَرْفَدْتُهٗ کے معنی کسی کے لئے عطا مقرر کرنے کے ہیں کہ وہ مقررہ مقدار میں اس سے لیتا رہے رَفَدَهٗ وَاَرْفَدَهٗ دونوں سَقَاهُ وَاَسْقَاهُ کی طرح متعدی بن کر استعمال ہوتے ہیں۔
اور رُفِدَ فُلَانٌ فَهُوَ مُرْفَدٌ سے بطور استعارہ

ـلہ راجع للقصۃ والبیت الکشاف والمستدرک للحاکم والطبری (۲: ۲۶۵) وفی روایۃ نخرجن یسرین مکان یمشین والرجز ایضا فی البحر (۲/۱۶،۲۷) والعمدۃ (۱: ۳۰) والمحاضرات للمؤلف (۱: ۵۹) وابن کثیر (۱/۲۳۷) والحیوان للجاحظ (۳: ۴۰) والعیون (۱: ۳۲۱/۳: ۲۲)

وہ شخص بھی مراد ہوتا ہے جسے ریاست (سرداری) دی گئی ہو۔

اَلرَّفُوْدُ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو ایک بار دودھ دوہنے سے پیالہ بھر دے لہٰذا یہ (فعول) بمعنی فاعل ہے اور بعض نے کہا ہے کہ مَرَافِیْدُ ان اونٹنیوں اور بکریوں کو کہا جاتا ہے جو موسم گرما اور سرما میں برابر دودھ دیتی ہوں اور ان کا دودھ کبھی خشک نہ ہوتا ہو شاعر نے کہا ہے[1] (الوافر)

(۱۹۰) أأطعمت العراق ورافدیه
فزاریا احذ ید القمیص

یعنی تو نے عراق اور دجلہ و فرات پر ایک فزاری کو عامل بنا کر بھیجا ہے جو خیانت میں نہایت ماہر ہے۔ یہاں رافدیه سے دجلہ اور فرات مراد ہیں کیونکہ ان کا پانی مسلسل جاری رہتا ہے۔

تَرَافَدُوْا کے معنی ایک دوسرے سے تعاون کرنا کے ہیں اسی سے رفادہ ہے یعنی وہ فنڈ جو قریش نادار حجاج کی مدد کے لئے جمع رکھتے تھے۔

(ر ف ع)

اَلرَّفْعُ (ف) کے معنی اٹھانے اور بلند کرنے کے ہیں یہ کبھی تو مادی چیز جو اپنی جگہ پر پڑی ہوئی ہو اسے اس کی جگہ سے اٹھا کر بلند کرنے پر بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ (۲-۶۳) اور ہم نے طور پہاڑ کو تمہارے اوپر لاکر کھڑا کیا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا۔ (۱۳-۲) اللہ وہ قادر مطلق ہے جس نے آسمان کو بدون کسی سہارے کے اونچا بنا کھڑا کیا۔

اور کبھی عمارت کو کھڑا کرنے اور اوپر لے جانے کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ۔ (۲-۱۲۷) اور جب ابراہیم (علیہ السلام) خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔

اور کبھی ناموری اور شہرت کا ذکر بلند کرنے کے لئے جیسے فرمایا:۔

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۹۴-۴) اور ہم نے تمہارے ذکر خیر کا آوازہ بلند کیا۔

اور کبھی مرتبہ کی بلندی بیان کرنے کیلئے۔ جیسے فرمایا:۔ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ (۶-۱۶۶) اور ان میں سے بعض کو بعض پر بلحاظ درجات کے فوقیت دی۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ (۱۲-۷۶) اور ہم

[1] قاله الفرزدق یہجو عمر بن هبیرة الفزاری ویخاطب یزید بن عبدالملک لما ولاه العراق (۱۰۲ھ) وقبله: تفیهق بالعراق ابوالمثنی۔ وعلّم قومه اکل الخبیص والبیت فی السمط ۸۶۲ واللسان والمحکم والصحاح (خذو) ودیوانه (۲: ۴۸۸) رقم ۴۰۲ والحصری (۱: ۵۷) والجرجانی ۴۷ والکامل ۸۰۸- والرافدان: الدجلة والفرات والبیت ایضا فی الحیوان (۵: ۱۹۷/۶: ۱۰۵) فی اربعة ابیات والجزنی الفاضل ۱۱۱ وادب الکاتب للصولی ۱۱۳ والبیت ایضا فی مجازات القرآن ۲۹۱ والمعارف للقتیبی ۱۷۹ والمعانی للقتیبی ۵۹۷ والروایة فی معظم المصادر "أأطعمت" وفی الاغانی (۱۹: ۱۷) والامالی (۲۳۳ت) والصحاح أوَلیت وفی الحیوان والاساس واللسان (رفد) "بعثت الی" فاظن ان الغار فی المطبوع مصحف قال القتیبی فی المعانی الاحذ معناه سریع الید داراد خفة یدہ فی السرقة والخیانة (کذا فی الصحاح) وذکر القمیص للتسدید القافیه وذکر الاخباریون: فعزله یزید سنة ۱۰۵ھ ثم لیسمع لہ ذکرہ

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

جس کو چاہتے ہیں (حسن تدبیر ہیں) اس کے درجے بلند کر دیتے ہیں۔

رَفِیْعُ الدَّرَجَاتِ ذُوالْعَرْشِ (۴۰-۱۵) خدا بڑا عالی مرتبہ (اور) عرش (بریں) کا مالک ہے۔

اور آیت:۔ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَیْهِ (۴-۱۵۸) بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا۔[1]

میں رفع کے معنی آسمان کی طرف اٹھالے جانا بھی ہوسکتے ہیں اور رفع بلحاظ شرف بخشی بھی اور (قیامت کے متعلق) آیت:۔

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (۵۶-۳) بعض کو نیچا دکھائے گی اور بعض کو (بلحاظ درجہ) بلند کرے گی۔

(میں بھی) رافِعَۃٌ کا لفظ خافِضَۃ کے مقابلہ میں آیا ہے جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ رفع بلحاظ درجات مراد ہے۔ اور آیت:۔

وَاِلَی السَّمَآءِ كَیْفَ رُفِعَتْ (۸۸-۱۸) اور آسمان کی طرف (نہیں دیکھتے) کہ کیسا اونچا بنایا۔

میں دونوں قسم کی بلندی کی طرف اشارہ ہے یعنی بلندی بلحاظ محل اور بلندی بلحاظ شرف و منزلت اور آیت۔

وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ (۵۶-۳۴) اور اونچے اونچے فرش۔

میں فرش کی بلندی سے ان کے عمدہ اور نفیس ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ اسی طرح آیت:۔

فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ (۸۰-۱۳،۱۴) ان اوراق میں (لکھا ہوا ہے) جن کی تعظیم کی جاتی ہے اور وہ پاکیزہ اور اونچی جگہ پر رکھے ہوئے ہیں۔

میں بھی بلندی بلحاظ شرف و منزلت ہی مراد ہے۔ اور آیت:۔

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ ...... (۲۴-۳۶) ایسے گھروں میں جن کی نسبت خدا نے حکم دیا ہے کہ ان کی عزت کی جائے۔

میں بھی رَفَعَ بلحاظ عز و شرف مراد ہے یعنی ان کی تعظیم کی جائے اور ان کے اندر کوئی نازیبا حرکت نہ کی جائے جو ان کے ادب و احترام کے خلاف ہو اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت:۔

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ (۳۳-۳۳) (اے پیغمبر کے گھر والو) خدا کو تو یہی منظور ہے کہ تم سے (ہر طرح کی) گندگی کو دور کرے۔

میں رجس کے (دور کرنے سے عز و شرف بخشنا مراد ہے اور رفع کے معنی تیز رفتاری بھی آتے ہیں چنانچہ) کہا جاتا ہے۔ رَفَعَ الْبَعِیْرُ فِیْ سَیْرِہٖ اونٹ تیز رفتاری سے چلا اَرْفَعْتُهٗ اَنَا میں نے اسے تیز چلایا بَعِیْرٌ مَرْفُوْعُ السَّیْرِ تیز رفتار اونٹ۔ اور (رَفَعَ کے معنی کسی کے راز کو فاش کرنا بھی آتے ہیں جیسے) رَفَعَ فُلَانٌ عَلٰی فُلَانٍ میں نے اس سے پردہ اٹھا دیا یعنی اس کے راز کو فاش کر دیا اور رِفَاعَةٌ اس چھوٹی سی گدی کو کہتے ہیں جسے عورتیں اپنے سرین پر باندھ لیتی ہیں تاکہ وہ بڑے معلوم ہوں۔

(ر ق ق)

اَلرِّقَّةُ (باریکی) اور دِقَّةٌ کے ایک ہی معنی ہیں لیکن دِقَّة بلحاظ کناروں کی باریکی کے استعمال ہوتا ہے اور رِقَّةٌ بلحاظ عمق کے بولا جاتا ہے۔ پھر اگر رقت کا لفظ اجسام کے متعلق استعمال ہو تو اس کی ضد صفاقت آتی ہے جیسے ثَوْبٌ رَقِیْقٌ (باریک کپڑا) اور ثوب صفیق (موٹا کپڑا) اور دل کے متعلق استعمال ہو تو اس کی ضد قساوت اور جفاء آتی ہے مثلاً نرم دل کے متعلق کہا جاتا ہے۔

[1] لکن الرفع الی السماء متعین فی الآیۃ لان الاحادیث تدل بالتواتر علی انہا الحق (راجع ر ی ق ن)

فلاں کرقیق القلب اور اس کے بالمقابل سخت
دل آدمی کو قاسی القلب کہتے ہیں۔
اَلرَّقُّ: کاغذ کی طرح کی کوئی چیز جس پر لکھا جائے
چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۵۲-۳) (اور چوڑے چکلے
کاغذ پر لکھی ہوئی (کتاب کی قسم ہے)
اور نیز کچھوے کو بھی رَقٌّ کہا جاتا ہے۔
اَلرِّقُّ کے معنی غلاموں کا مالک ہونے کے ہیں۔
اسی سے مملوک غلام کو رقیق کہا جاتا ہے اس
کی جمع اَرِقَّاءُ آتی ہے اور اِسْتَرَقَّ فُلَانٌ فُلَانًا
کے معنی کسی کو غلام بنانے کے ہیں
اَلرَّقْرَاقُ شراب کی چمک دمک کو کہتے ہیں اور
رَقْرَاقَۃٌ کے معنی شفاف شراب کے ہیں نیز ہر
وہ قطعہ زمین جو پانی سے متصل ہو اسے رِقَّۃٌ کہا
جاتا ہے کیونکہ مرطوب ہونے کی وجہ سے وہ نرم ہوتی
ہے مثال مشہور ہے (ا)
اَعَنْ صَبُوْحٍ تُرَقْرِقُ کیا تمہارا اشارہ صبح کی شراب
سے ہے۔ یہ حسن طلب کے موقع پر بولا جاتا ہے۔

ر ق ب

اَلرَّقَبَۃُ اصل میں گردن کو کہتے ہیں پھر رقبۃ
کا لفظ بول کر مجازاً انسان مراد لیا جاتا ہے اور
عرف عام میں اَلرَّقَبَۃُ غلام کے معنوں میں استعمال
ہونے لگا ہے جیسا کہ لفظ رَأْسٌ اور ظَھْرٌ بول
کر مجازاً سواری مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔
فُلَانٌ یَرْبِطُ کَذَا ظَھْرًا اَوْ کَذَا رَأْسًا۔۔۔۔۔
یعنی فلاں کے پاس اتنی سواریاں ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِیْرُ رَقَبَۃٍ مُّؤْمِنَۃٍ
(۴-۹۲) کہ جو مسلمان کو غلطی سے (بھی) مار ڈالے تو
ایک مسلمان بردہ آزاد کرائے۔
اور رَقَبَۃٌ کی جمع رِقَابٌ آتی ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَفِی الرِّقَابِ (۲-۱۷۷) اور غلام کو آزاد کرنے میں۔
مراد مکاتب غلام ہیں۔ کیونکہ مال زکوٰۃ کے وہی مستحق
ہوتے ہیں اور رَقَبْتُہٗ (ن) کے معنی گردن پر مارنے
یا کسی کی حفاظت کرنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔
لَا یَرْقُبُوْنَ فِیْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّۃً۔۔۔۔۔
(۹-۱۰) کسی مسلمان کے بارے میں نہ تو قرابت کا
پاس ملحوظ رکھتے ہیں اور نہ ہی عہد و پیمان کا۔
اسی سے نگران کو رَقِیْبٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے
کہ وہ اس شخص کی گردن پر نظر رکھتا ہے جس کی نگرانی
منظور ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ وہ نگرانی کے لئے
بار بار اپنی گردن اٹھا کر دیکھتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَارْتَقِبُوْا اِنِّیْ مَعَکُمْ رَقِیْبٌ (۱۱-۹۳) تم بھی
منتظر رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔
اِلَّا لَدَیْہِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ (۵۰-۱۸) مگر ایک
چوکیدار (اس کے لکھنے کو) تیار رہتا ہے۔
اَلْمَرْقَبُ: بلند جگہ جہاں رقیب (نگران) بیٹھ
کر چوکسی کرتا ہے اور قمار بازوں کے محافظ کو
بھی رَقِیْبٌ کہا جاتا ہے۔ جو قمار بازی کے بعد
شراب نوشی کرتے ہیں۔ اسی طرح قمار بازی
کے تیسرے درجہ کے تیر کو بھی رقیب کہتے ہیں۔
تَرَقُّبٌ (تفعل) کے معنی ہیں انتظار کرتے ہوئے
کسی چیز سے بچنا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَخَرَجَ مِنْھَا خَائِفًا یَّتَرَقَّبُ (۲۸-۲۱) چنانچہ
موسیٰ علیہ السلام شہر سے نکل بھاگے اور دوڑتے
جاتے تھے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

لہ راجع للمثل المعاجم۔

رَقُوبٌ اس عورت کو کہتے ہیں جو کثرت اولاد کی وجہ سے اپنے بچوں کی موت کی منتظر ہو نیز وہ اونٹنی جو پانی پینے کے لئے باری کے انتظار میں ہو اسے بھی رَقُوبٌ کہا جاتا ہے اَرْقَبَ (افعال) کے معنی رُقْبیٰ کرنے کے ہیں یعنی کسی کو اس کی زندگی بھر کے لئے مکان وغیرہ ہبہ کر دینا اور اس کی موت کے بعد اس عطا کو واپس لے لینا۔ اور اسے رُقْبیٰ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ہبہ کے بعد گویا وہ اس کی موت کا انتظار کرتا ہے۔ اور ایسے ہبہ کو عُمریٰ بھی کہا جاتا ہے[1]۔

(ر ق د)

اَلرُّقَادُ خوشگوار اور ہلکی سی نیند کو کہتے ہیں کہا جاتا ہے رَقَدَ (ن) رُقُودًا فَھُوَ رَاقِدٌ اور رَاقِدٌ کی جمع رُقُودٌ آتی ہے جیسے فرمایا:۔ وَهُمْ رُقُودٌ (۱۸-۱۸) حالانکہ وہ (اصحاب کہف) سوئے ہوئے ہیں۔

اصحاب کہف کی گہری اور لمبی نیند کے باوجود ان پر رقود کا لفظ بول کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نیند خواہ کتنی ہی گہری اور لمبی کیوں نہ ہو موت کے مقابلہ میں وہ نوم خفیف کی حیثیت رکھتی ہے۔ لوگوں کو یقین ہو چکا تھا کہ اصحاب کہف مر چکے ہیں قرآن نے وَهُمْ رُقُودٌ کہہ کر ان سے موت کی نفی کی ہے۔

اور مَرْقَدٌ (ظرف) خواب گاہ کو کہتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔

يَا وَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَرْقَدِنَا۔ (۳۶-۵۱) ہم پر افسوس ہے کس نے ہمیں ہماری خواب گاہوں سے جگا اٹھایا۔

اور اَرْقَدَ الظَّلِيمُ کے معنی شتر مرغ کے تیز دوڑنے کے ہیں گویا اس نے تیز روی سے اپنی نیند کو دور کر دیا۔

(ر ق م)

اَلرَّقْمُ کے معنی گاڑھے خط کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ رَقْمٌ کے معنی کتاب پر اعراب اور نقطے لگانے کے ہیں اور آیت:۔

كِتَابٌ مَرْقُومٌ (۸۳-۹) وہ ایک کتاب ہے (وقتاً فوقتاً) اس کی خانہ پری ہوتی رہتی ہے۔ میں مَرْقُومٌ کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں یعنی گاڑھے اور جلی خط میں لکھی ہوئی یا نقطے لگائی ہوئی۔

اور جو شخص کسی کام کا ماہر اور حاذق ہو اس کے متعلق ضرب المثل کے طور پر کہا جاتا ہے۔ فُلَانٌ يَرْقُمُ فِي الْمَاءِ یعنی وہ ماہر ہے۔

اور آیت کریمہ:۔ اِنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ (۱۸-۹) کہ غار اور لوح والے۔ کی تفسیر میں بعض نے کہا ہے کہ رَقِیْم ایک مقام کا نام ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اس پتھر کی طرف نسبت ہے جس میں ان کے نام کندہ تھے اور گدھے کے دونوں بازوؤں پر جو نشان ہوتے ہیں انہیں رَقْمَتَا الْحِمَارِ کہا جاتا ہے اور اَرْضٌ مَرْقُومَةٌ تھوڑی گھاس والی زمین کو کہتے ہیں گویا وہ کتابت کے نشانات کی طرح ہے۔

اَلرُّقْمِيَّاتُ تیروں کو کہتے ہیں جو مدینہ کے ایک مقام کی طرف منسوب ہیں۔

(ر ق ی)

رَقِيَ (س) رُقِيًّا۔ فِي السُّلَّمِ کے معنی سیڑھی

[1] لکن اصحاب غریب الحدیث فرقوا بین العمری والرقبیٰ ۱۲

پر چڑھنے کے ہیں اور ارتقاء (انتعال) بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَلْيَرْتَقُوْا فِي الْاَسْبَابِ (۳۸-۱۰) تو ان کو چاہیے کہ سیڑھیاں لگا کر آسمان پر چڑھیں۔

مثل مشہور ہے[1]:۔ اِرْقَ عَلٰی ظَلْعِكَ یعنی اپنی طاقت کے مطابق چلو اور طاقت سے زیادہ اپنے آپ پر بوجھ نہ ڈالو۔

اور رُقْيَةٌ بمعنی رقیہ یعنی افسوں کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ ہے۔

كَيْفَ رُقْيُكَ اَوْ رُقْيَتُكَ کہ تمہارا افسوں کیسا ہے۔

اس میں رُقْیٌ مصدر ہے اور رُقْيَةٌ اسم اور آیت کریمہ:۔

وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ (۱۷-۹۳) یعنی ہم تیرے افسوں پر یقین کرنے والے نہیں ہیں۔

میں رُقِیّ بمعنی رُقْيَةٌ کے ہے۔ اور آیت:۔

وَقِيْلَ مَنْ رَاقٍ (۷۵-۲۷) اور کون افسوں کرے۔

میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اس وقت جھاڑ پھونک سے کوئی اس کی جان نہیں بچا سکے گا۔ چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے[2] (الکامل)

(۱۹۰) وَاِذَا الْمَنِيَّةُ اَنْشَبَتْ اَظْفَارَهَا
اَلْفَيْتَ كُلَّ تَمِيْمَةٍ لَا تَنْفَعُ

کہ جب موت اپنا پنجہ گاڑ دیتی ہے۔ تو کوئی افسوں کارگر نہیں ہوتا۔

ابن عباس نے مَنْ رَاقٍ کے معنی کئے ہیں کہ کون سے فرشتے اس کی روح لے کر اوپر جائیں یعنی ملائکہ رحمت یا ملائکہ عذاب۔

اَلتَّرْقُوَةُ ہنسلی کی ہڈی کو کہتے ہیں اس لحاظ سے کہ سانس پھول کر وہیں تک چڑھتی ہے اس کی جمع تَرَاقِيْ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ (۷۵-۲۶) سنو جی! جب جان بدن سے نکل کر گلے تک پہنچ جائیگی۔

(ر ک ب)

اَلرُّكُوْبُ کے اصل معنی حیوان کی پیٹھ پر سوار ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً (۱۶-۸) تاکہ ان سے سواری کا کام لو اور (سواری کے علاوہ یہ چیزیں) موجب زینت (بھی) ہیں۔

مگر کبھی کشتی وغیرہ پر سوار ہونے کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ (۲۹-۶۵) پھر جب لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں۔

مگر عرف میں رَاكِبٌ کا لفظ شتر سوار کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔ اس کی جمع رَكْبٌ وَرُكْبَانٌ اور رُكُوْبٌ تینوں آتی ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ (۸-۴۲) اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف کو (ہٹا ہوا) تھا۔

فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا (۲-۲۳۹) تو پیادہ یا سوار (ہو کر)

اور "رکاب" خاص کر مرکوب یعنی سواری پر بولا جاتا ہے۔

اَرْكَبَ الْمُهْرُ۔ بچھیرا سواری کے قابل ہو گیا۔

---

[1] المثل فی جل المعاجم [2] قالہ ابو ذؤیب الہذلی یرثی بنیہ والبیت من کلمۃ مفضلیۃ (۲: ۲۲۰) جمہرۃ (۱۴۳) فی ۲۰ بیتا مذکورہ بعضہا فی اللسان (نسب) والخزانۃ (۱: ۲۰۲) والسیوطی ۹۲، ۳ر۹۳ و دیوان الہذلیین (۱: ۳) والعقد (۲: ۱۵) والاصابۃ ۲۵۰۷ والاسد (۵: ۱۹۰) والسمط ۴۴۹، ۸۸۸ والحماسۃ للبحتری ۹۹ والکامل ۵۱۸ و شواہد الکشاف ونقد الشعر ۴ ومحاضرات المؤلف (۴: ۸۹۴) وخاص الخاص ۸۲ والفاضل للمبرد ۱۵ وفی تاریخ الطبری ان معاویۃ تمثل بہ عند موتہ ۱۲

مُرْکَبٌ۔ خاص کر اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسرے کے گھوڑے پر سوار ہو یا جو شخص سواری نہ کر سکے یا سوار ہونا نہ جانتا ہو۔

اَلْمُتَرَاکِبُ وہ چیز جو تہ بتہ ہو۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا (۶-۱۰۰) پھر ہم سبز کونپلیں نکالتے ہیں کہ ان سے گتھے ہوئے دانے نکالتے ہیں۔

رُکْبَۃٌ[1] کے معنی زانو کے ہیں اور رَکَبْتُہٗ کے معنی ہیں "میں نے اس کے زانو پر مارا" جیسے کَاَدْتُہٗ (میں نے اس کے دل پر مارا) وَاَمْتَنْتُہٗ (میں نے اس کے سر پر مارا) اور نیز رَکَبْتُہٗ کے معنی گھٹنے سے مارنا بھی آتے ہیں۔ جیسے یَدَیْتُہٗ (میں نے اسے ہاتھ سے مارا) عِنْتُہٗ (میں نے اسے نظر لگادی) وغیرہ۔ پھر کنایۃ کے طور پر عورت کے ستر کو بھی رَکَبٌ کہہ دیتے ہیں[2] جیسا کہ مجازاً عورت کو مطیۃ (سواری) یا قَعِیْدَۃٌ (بمعنی مُقْعَدَۃٌ) کہا جاتا ہے۔

(ر ک د)

رَکَدَ (ن) رُکُوْدًا کے معنی پانی یا ہوا وغیرہ کے ٹھہر جانے کے ہیں۔ اسی طرح کشتی کے ٹھہر جانے پر بھی رُکُوْد کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ (۴۲-۳۲-۳۳) اور اس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے (یاد دہانی) جہاز ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح (اونچے اونچے) دکھائی دیتے ہیں اگر خدا چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے تو جہاز سمندر کی سطح پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔

جَفْنَۃٌ رَکُوْدٌ لبالب بھرا ہوا پیالہ۔

(ر ک ز)

اَلرِّکْزُ (دھیمی آواز (یا آہٹ) کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا (۱۹-۹۸) اب تم ان میں سے کسی کو (بھی) دیکھتے ہو یا ان کی بھنک بھی سنتے ہو۔

اور رَکَزْتُ کَذَا۔ کے معنی ہیں میں نے اسے مخفی طور پر دفن کر دیا اسی سے اَلرِّکَازُ ہے جس کے معنی دفینہ ہیں۔ خواہ اسے کسی انسان نے دفن کیا ہو جیسے خزانہ وغیرہ یا قدرتی طور پر زمین کے اندر پایا جائے جیسے معدنیات اور اَلرِّکَازُ کا لفظ ان دونوں کو شامل ہے۔ اور حدیث[3] (۱۵۹) وَفِي الرِّكَازِ الْخُمُسُ (رکاز میں خمس ہے) میں رکاز کے دونوں معنی بیان کئے گئے ہیں۔ عام محاورہ ہے: رَکَزَ رُمْحَہٗ اس نے اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا اور فوج کی فرودگاہ کو مَرْکَزٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ جہاں ڈیرہ ڈالتے ہیں۔ وہاں زمین میں اپنے نیزے (جھنڈے) گاڑ دیتے ہیں۔

(ر ک س)

اَلرِّکْسُ کے معنی کسی چیز کو اس کے سر پر الٹا

---

[1] وفی الصحاح: الرکب (بالتحریک) منبت العانۃ وقال الخلیل یختص بالمرأۃ وقیل یعم [2] الاول عند اہل الحجاز والثانی عند اہل العراق والقولان تحتملہا اللغۃ (النہایۃ) [3] الحدیث رواہ الجماعۃ عن ابی ہریرۃ ولہ الفاظ وطرق (جامع النیل ۴/۱۵۷) و مالک فی مؤطاہ عن الزہری والشافعی فی الام ۲/۳۷ والرسالۃ رقم ۵۲۳ تحقیق احمد شاکر ومسند احمد ۱/۴۳۵ رقم ۴۱۴۴ وایضا عن ابن عباس (طب) عن ثعلبۃ (طس) عن جابر و ابن مسعود۔

کر دینا یا اس کے اول سرے کو موخر کر کے پچھلے سرے کے
ساتھ ملا دینا کے ہیں محاورہ ہے:۔
اَرْکَسْتُہٗ میں نے اسے الٹا کر دیا اور رُکِسَ اس کا
مطاوع آتا ہے۔ اور اِرْتَکَسَ فِیْ اَمْرِہٖ کے معنی کسی
معاملہ میں الجھ جانے کے ہیں (یعنی کسی مصیبت سے
رہائی کے بعد دوبارہ اس میں پھنس جانا) قرآن میں ہے:۔
وَاللّٰہُ اَرْکَسَھُمْ بِمَا کَسَبُوْا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے
انہیں پھر کفر میں پلٹا دیا ہے (۴-۸۸)

(ر ک ض)

اَلرَّکْضُ اس کے اصل معنی ٹانگ کو حرکت
دینے کے ہیں اگر سوار کے متعلق بولا جائے جیسے:۔
رَکَضْتُ الْفَرَسَ تو اس کے معنی گھوڑے کو تیز
دوڑانے کے لئے ایڑھ لگانا کے ہوتے ہیں اور پیادہ
آدمی کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنی پاؤں کے
ساتھ زمین کو روندنا کے ہوتے ہیں جیسے فرمایا:۔
اُرْکُضْ بِرِجْلِكَ (۳۸-۴۲) یعنی اپنی ٹانگ زمین پر مارو۔
اور آیت کریمہ:۔
لَا تَرْکُضُوْا وَارْجِعُوْا اِلٰی مَا اُتْرِفْتُمْ فِیْہِ۔
(۲۱-۱۳) مت بھاگو اور ساز وسامان (دنیا) کی طرف
لوٹ جاؤ جس میں تم چین کرتے تھے۔
میں انہیں شکست خوردہ ہو کر بھاگنے سے منع
کیا گیا ہے۔ اور یہ نہی تہدید اور تعجیز کے لئے ہے)

(ر ک ع)

اَلرُّکُوْعُ اس کے اصل معنی انحناء یعنی جھک
جانے کے ہیں اور نماز میں خاص شکل میں جھکنے پر
بولا جاتا ہے اور کبھی محض عاجزی اور انکساری کے
معنی میں آتا ہے خواہ بطور عبادت ہو یا بطور عبادت
نہ ہو۔ قرآن میں ہے:۔
یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا (۲۲-۷۷)
مسلمانو! (خدا کے حضور) سجدے اور رکوع کرو۔
وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ (۲-۴۳) جو (ہمارے
حضور بوقت نماز) جھکتے ہیں تم بھی ان کے ساتھ جھکا کرو۔
وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ (۲-۱۲۵) (مجاوروں
اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں (کے لئے)
اَلرّٰکِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ (۹-۱۱۲) رکوع کرنے
والے اور سجدہ کرنے والے۔
شاعر نے کہا ہے [1] (الطویل)

(۱۹۱) اُخَبِّرُ اَخْبَارَ الْقُرُوْنِ الَّتِیْ مَضَتْ
اَدِبُّ کَاَنِّیْ کُلَّمَا قُمْتُ رَاکِعُ

میں گذشتہ لوگوں کی خبر دیتا ہوں (میں سن رسیدہ ہونے
کی وجہ سے) رینگ کر چلتا ہوں اور خمیدہ پشت
کھڑا ہوتا ہوں۔

(ر ک م)

رَکَمٌ (ن) کے معنی ہیں کسی چیز کو اوپر تلے رکھنا
قرآن میں ہے:۔ سَحَابٌ مَّرْکُوْمٌ (۵۲-۴۴)
تہ بہ تہ بادل۔
اَلرُّکَامُ اوپر تلے رکھی ہوئی چیزیں جیسے فرمایا:۔
ثُمَّ یَجْعَلُهٗ رُکَامًا (۲۴-۴۳) پھر اسے تو بر تو
کر دیتا ہے۔

---

[1] قالہ لبید فی قصیدۃ فی الحکم راجع (۱: ۳۶) والمعمرین ۶۱ والشعراء ۲۵۱ والاغانی (۱۴: ۹۶، ۱۳۴) مجاز القرآن (۱: ۴۵) واضداد ابی الطیب ۸۶۵ والمعانی للقتیبی ۱۲۱۶ واللسان والتاج (رکع) ومجموعۃ المعانی ۲۳ الی ثلاثۃ ابیات والبحر (۱: ۱۷۳) والعنقد (۲: ۷۸)

اسی سے ریت کے ٹیلے اور لشکر کو بھی رُکام کہا جاتا ہے اور مُرْتَکَمُ الطَّرِیقِ شاہراہ کو کہتے ہیں۔ جس میں آمد و رفت کے نشانات بکثرت ہوں۔

(ر ک ن)

رُکْنٌ۔ کسی چیز کی وہ جانب جس کے سہارے پر وہ قائم ہوتی ہے استعارہ کے طور پر زور اور قوت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ (۱۱-۸۰) اے کاش (آج) مجھ کو تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا میں کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ جاتا۔
اور رَکَنْتُ اِلٰی فُلَانٍ اَرْکَنُ کے معنی کسی کی طرف مائل ہونے کے ہیں یہ فتح کاف کے ساتھ ہے مگر صحیح رَکَنَ یَرْکُنُ (ن) یا رَکِنَ یَرْکَنُ (س) ہے۔
قرآن میں ہے :۔
وَلَا تَرْکَنُوْۤا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا (۱۱-۱۱۳) اور جن لوگوں نے ہماری نافرمانی کی اُنکی طرف نہ جھکنا۔
نَاقَۃٌ مُرْکَنَۃُ الضَّرْعِ بڑے تھنوں والی اونٹنی۔
لَہٗ اَرْکَانٌ تُعَظِّمُہٗ (اس کی قوم اسے عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔
اَلْمُرْکَنُ۔ لگن۔ ٹب اور اَرْکَانُ الْعِبَادَاتِ سے عبادات کے وہ جوانب مراد ہوتے ہیں جو ان کا مبنیٰ بنتے ہیں اور ان کے ترک سے وہ باطل ہو جاتی ہیں۔

(ر م م)

اَلرَّمُّ (ن) کے معنی پوشیدہ چیز کی اصلاح اور مرمت کرنے کے ہیں اور رِمَّۃٌ خاص کر بوسیدہ ہڈی کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔
مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَھِیَ رَمِیْمٌ (۳۶-۷۸) ہڈیاں جب بوسیدہ ہو جائیں گی تو انہیں کون زندہ کر سکتا ہے۔
مَا تَذَرُ مِنْ شَیْءٍ اَتَتْ عَلَیْہِ اِلَّا جَعَلَتْہُ کَالرَّمِیْمِ (۵۱-۴۲) جس چیز پر سے ہو کر وہ گزرتی ہے اسے پرانی ہڈی کی طرح (چورا) کئے بغیر نہ چھوڑتی۔
اَلرُّمَّۃُ خاص طور پر بوسیدہ رسی کو کہا جاتا ہے اور اَلرِّمُّ لکڑی بھوسہ وغیرہ کے چورہ کو کہتے ہیں۔
رَمَمْتُ الْمَنْزِلَ عمارت کی مرمت کرنا جیسے تَفَقَّدْتُ (کسی چیز کی دیکھ بھال کرنا) مشہور محاورہ ہے[1] (مثل) اِدْفَعْہُ اِلَیْہِ بِرُمَّتِہٖ اسے کلیتًہ اس کے سپرد کر دیجئے۔
اَلْاِرْمَامُ اس کے معنی خاموش ہونے کے ہیں اور اَرَمَّتْ عِظَامُہٗ کے معنی ہیں ہڈیوں کا اس قدر بوسیدہ ہو کر باریک ہو جانا کہ پھونکنے سے اڑ جائیں اور آواز نہ آئے تَرَمْرَمَ الْقَوْمُ کے معنی مہمل بڑبڑانے یا گفتگو کے لئے ہونٹ ہلا کر رہ جانے کے ہیں۔
اَلرُّمَّانُ (فُعْلَان) انار کو کہتے ہیں۔

(ر م ح)

اَلرُّمْحُ اس کے معنی نیزہ کے ہیں اس کی جمع رِمَاحٌ آتی ہے، چنانچہ قرآن میں ہے :۔
تَنَالُہٗۤ اَیْدِیْکُمْ وَرِمَاحُکُمْ (۵-۹۴) جہاں تک تمہارے ہاتھ اور نیزے پہنچ سکیں۔
اور رَمَحَہٗ کے معنی کسی کو نیزہ سے مارنے کے ہیں اور رَمَحَتْہُ الدَّابَّۃُ کے معنی جانور کے دولتی جھاڑنے کے ہیں۔ اَلسِّمَاکُ الرَّامِحُ ایک ستارے کا نام ہے کیونکہ اس کے پیش پیش ایک دمدار ستارہ ہوتا ہے جو دیکھنے میں نیزے جیسا معلوم ہوتا ہے مثل مشہور ہے[1]۔

---

[1] انظر للکلمۃ ادب الکاتب لابن قتیبہ ۲۸ والمیدانی ا ر ۲۳۳ وفیہ رد یا المستقصی المیدانی (۱: ۴۲) ۞ ۞ ۞ ۞ ۞

اَخَذَتِ الْاِبِلُ رِمَاحَهَا اونٹوں نے اپنے نیزے سنبھال لئے یعنی خبردار یا موٹا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو ذبح سے بچالیا۔
اَخَذَتِ الْبُهْمٰى رُمْحَهَا بُهمٰی گھاس خاردار ہوگئی کیونکہ وہ بھی خاردار ہونے کی وجہ سے چرواہوں سے محفوظ ہوجاتی ہے۔

(ر م د)

رَمَادٌ وَرِمْدَدٌ وَاَرْمِدَاءُ وَاَرْمِدَةٌ خاکستر راکھ کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:
كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ (۱۴-۱۸) گویا راکھ کا ڈھیر ہے جسے آندھی کے دن ہوا اڑا لے جائے۔
رَمَدَتِ النَّارُ کے معنی آگ کے بجھ کر راکھ بن جانے کے ہیں پھر استعارہ کے طور پر ہلاکت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ هُمُودٌ کا لفظ مجازاً بمعنی ہلاکت آجاتا ہے۔ اور رَمِدَ الْمَاءُ کے معنی پانی کے گدلا ہوجانے کے ہیں۔ گویا اس میں راکھ ڈال دی گئی ہے اور رَمَادٌ خاکستری رنگ کی چیز کو کہتے ہیں اور مچھر کو رَمْدٌ کہا جاتا ہے (جو اَرْمَدُ کی جمع ہے) اور رَمَادَةٌ کے معنی قحط سالی کے ہیں۔

(ر م ز)

اَلرَّمْزُ (ن) ہونٹ کے ساتھ اشارہ کرنے یا ہلکی سی آواز کے ہیں۔ اور ابرو کے ساتھ اشارہ کرنے کو غمز کہا جاتا ہے۔ پھر استعمال میں ہر وہ کلام جو اشارہ کی طرح ہو رَمْزٌ کہلاتی ہے جیسا کہ شکایت کو غَمْزٌ کہہ دیتے ہیں۔ قرآن میں ہے:
اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا (۳-۴۰) نشانی (یہ) ہے کہ تم تین روز تک لوگوں سے بات نہ کرو۔ مگر اشارہ سے۔
اور مَا اَرْمَازَ کے معنی ہیں اس نے اشارہ سے بھی بات نہ کی اور كَتِيبَةٌ رَمَّازَةٌ بڑے لشکر کو کہتے ہیں۔ کیونکہ بوجہ کثرت ازدحام کے اس میں آواز سنائی نہیں دیتی اور صرف اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔

(ر م ض)

شَهْرُ رَمَضَانَ (۲-۱۸۵) روزوں کا مہینہ یہ رَمَضٌ سے مشتق ہے جس کے معنی سورج کی سخت تپش کے ہیں اَرْمَضَتْهُ سخت تپش نے اسے جھلس دیا۔ فَرَمِضَ چنانچہ وہ جھلسا گیا۔
اَرْضٌ رَمِضَةٌ سخت گرم سرزمین۔ رَمِضَتِ الْغَنَمُ سخت گرمی میں باہر چرنے کی وجہ سے بکریوں کے جگر زخمی ہوگئے۔
فُلَانٌ يَتَرَمَّضُ الظِّبَاءَ فلاں سخت گرم جگہ میں ہرن شکار کرتا ہے۔

(ر م ی)

اَلرَّمْیُ (ض) کے معنی پھینکنے کے ہیں یہ اجسام (مادی چیزوں) جیسے تیر وغیرہ کے متعلق استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:
وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸-۱۷) اے پیغمبر جب تو نے تیر چلائے تو تم نے تیر نہیں چلائے بلکہ اللہ تعالٰی نے تیر چلائے۔
اور اقوال کے متعلق استعمال ہو تو "قذف" کی طرح اس کے معنی سب وشتم اور تہمت طرازی کے ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:
وَالَّذِينَ يَرْمُونَ اَزْوَاجَهُمْ (۲۴-۹) جو لوگ اپنی بیبیوں پر (زنا کا) عیب لگائیں۔

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ (۲۴-۴) جو لوگ پاکدامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں۔
محاورہ ہے۔ اَرْمٰی فُلَانٌ عَلٰی مِائَۃٍ وہ سو سے زائد ہیں۔ خَرَجَ یَتَرَمّٰی وہ نکل کر نشانہ بازی کرنے لگا۔

(ر ھ ب)

اَلرَّھْبُ وَالرَّھْبَۃُ ایسے خوف کو کہتے ہیں جس میں احتیاط اور اضطراب بھی شامل ہو۔ قرآن میں ہے:۔
لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَھْبَۃً (۵۹-۱۳) تمہاری ہیبت تو ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے بڑھکر ہے جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھْبِ (۲۸-۳۲) (اور دفع) خوف کے لئے اپنے بازو سکیڑ لو)۔
اس میں ایک قرأت رُھْب بضم الراء بھی ہے۔ جس کے معنی فَزَعٌ یعنی گھبراہٹ کے ہیں۔
مقاتل کہتے ہیں کہ میں رَھْبٌ کی تفسیر معلوم کرنے کی غرض سے نکلا۔ دریں اثنا کہ میں کھانا کھا رہا تھا ایک اعرابی عورت آئی۔ اور اس نے کہا "اے اللہ کے بندے مجھے کچھ خیرات دیجئے۔ جب میں لپ بھر کر اسے دینے لگا تو کہنے لگی ھٰھُنَا فِیْ رَھْبِیْ یعنی یہاں میری آستین میں ڈال دیجئے (تو میں سمجھ گیا کہ آیت میں بھی رھب بمعنی آستین ہے) لیکن پہلے معنی یعنی گھبراہٹ کے زیادہ صحیح ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
رَغَبًا وَّ رَھَبًا (۲۱-۹۰) (ہمارے فضل کی توقع اور) ہمارے عذاب کے خوف سے (ہمیں پکارتے رہتے ہیں)۔
تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ (۸-۶۰) اس سے تم اللہ کے دشمنوں پر (اور اپنے دشمنوں پر) دھاک بٹھائے رکھو گے۔
اور آیت:۔
وَاسْتَرْھَبُوْھُمْ (۷-۱۱۶) اور ان کو دہشت میں ڈال دیا۔ میں اِسْتِرْھَاب کے معنی دہشت زدہ کرنے کے ہیں۔
وَاِیَّایَ فَارْھَبُوْنَ (۲-۴۰) اور مجھ سے ہی ڈرو۔
اور تَرَھُّبٌ (تفعل) کے معنی تعبد یعنی راہب بننے اور عبادت میں خوف سے کام لینے کے ہیں اور فرط خوف سے عبادت گذاری میں غلو کرنے کو رَھْبَانِیَّۃٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَرَھْبَانِیَّۃَ نِ ابْتَدَعُوْھَا (۵۷-۲۷) اور رہبانیت (لذت دنیا کا چھوڑ بیٹھنا) جو انہوں نے از خود ایجاد کی تھی۔
اور رُھْبَان (صومعہ نشیں لوگ) واحد بھی ہوسکتا ہے اور جمع بھی، جو اس کو واحد قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک اس کی جمع رَھَابِیْنُ آتی ہے لیکن اس کی جمع رَھَابِنَۃٌ بنانا زیادہ مناسب ہے۔
اَلْاِرْھَابُ (افعال) کے اصل معنی اونٹوں کو خوف زدہ کرنے کے ہیں۔ یہ اَرْھَبْتُ (افعال) کا مصدر ہے۔ اور اسی سے "رَھْبٌ" ہے جس کے معنی لاغر اونٹنی (یا شتر نر قوی ہیکل لاں جثہ) کے ہیں۔ مشہور محاورہ ہے[1]:۔
رَھَبُوْتٌ خَیْرٌ مِنْ رَحَمُوْتٍ کہ رحم سے خوف بہتر ہے۔

(ر ھ ط)

اَلرَّھْطُ دس آدمیوں سے کم جماعت کو رھط کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کا اطلاق چالیس آدمیوں تک کی جماعت پر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] ای لان یفرق منک خیر من ان تحب یاجع المیدانی ۳ ر ۲۷، رقم ۲۷۵۸ والتشار (رھب) وغریب القرآن للقتبی ۱۹ وفی الکامل ۲، ا رہبوتی خیر لک من رحموتی۔

تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ (۲۷-۴۸) نو آدمی تھے جو ملک میں فساد کرتے۔
وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ (۱۱-۹۱) اگر تیری برادری کے لوگ نہ ہوتے تو ہم تجھے سنگسار کر دیتے۔
يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ (۱۱-۹۲) میری قوم! کیا میری برادری کے لوگ تمہیں (اللہ تعالیٰ سے) زیادہ عزیز ہیں۔
الرُّهَطَاءُ جنگلی چوہے کا بل۔ اور اس کو رُهْطَةٌ بھی کہا جاتا ہے۔ اور شاعر کے شعر[1] (المتقارب)

(۱۹۲) اَجْعَلُكَ رَهْطًا عَلٰى حُيَّضٍ

(میں تجھے حیض والی عورتوں کا لتہ بنا دوں گا یعنی نہایت ذلیل کر دوں گا)
میں بعض نے رَهْط کے معنی اس چمڑے کے لیے ہیں۔ جو حائض عورتیں ایام ماہواری میں پہنا کرتی تھیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ شعر مذکور میں رھط سے مراد وہ چیتھڑا ہے۔ جو حائض عورت جائے مخصوص میں رکھتی ہے۔ اور اسی سے مشہور محاورہ ہے۔ هُوَ اَذَلُّ مِنَ الرَّهْطِ۔ وہ حیض کے چیتھڑے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں۔

(ر ه ق)

رَهِقَهٗ (س) رَهَقًا۔ الامر کسی معاملہ نے اسے بزور وجبر دبا لیا۔ اور رَهِقَهٗ وَاَرْهَقَهٗ (مجرد ومزید فیہ) دونوں کے ایک ہی معنی ہیں جیسے رَدِفَهٗ وَاَرْدَفَهٗ وَبَعَثَهٗ وَابْتَعَثَهٗ۔ قرآن میں ہے۔
وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ (۱۰-۲۷) اور ان پر ذلت چھا رہی ہوگی۔
سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا (۷۴-۱۷) ہم عنقریب اس کو عذاب سخت میں مبتلا کر دیں گے۔
اور اسی سے اَرْهَقْتُ الصَّلٰوةَ ہے جس کے معنی نماز کو آخر وقت تک موخر کرنے کے ہیں۔ حتیٰ کہ دوسری نماز کا وقت آجائے۔

(ر ه ن)

اَلرَّهْنُ (گروی رکھی ہوئی چیز) اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جو قرض میں بطور ضمانت رکھی جائے۔ اور یہی معنی رِهَانٌ کے ہیں۔ لیکن رھان خاص کر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی مقابلہ میں شرط کے طور پر رکھ لی جائے اصل میں یہ دونوں لفظ مصدر ہیں جیسے: رَهَنْتُ الرَّهْنَ وَرَاهَنْتُهٗ رِهَانًا اور رَهِيْنٌ وَمَرْهُوْنٌ صیغہ صفت ہیں اور رَهْنٌ کی جمع رِهَانٌ، رُهُنٌ اور رُهُوْنٌ آتی ہے اور آیت: فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ (۲-۲۸۳) تو کچھ رہن قبضہ میں رکھ لو۔
میں ایک قراءت رُهُنٌ بھی ہے۔ اور آیت كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ۔ (۷۴-۳۸) ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ رَهِيْنَةٌ فعیل بمعنی فاعل ہے اور اس کے معنی ثابت اور قائم رہنے والی کے ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ فعیل بمعنی مفعول

---

[1] قالہ ابو المثلم الہذلی وصدرہ: متی ما تشا غیر زمو الملوک ...... والبیت فی اللسان (رہط، زہو) والمقاییس (۲: ۴۵۱/۳: ۲۹) بغیر عزو والمعانی الکبیر (۱: ۴۸۴، ۵۹۳) والمشکل للقتیبی ۹۱ وفی اربعۃ وتہذیب الالفاظ ۷۲ وباب الشباب وبدیوان الہذلیین (۲: ۲۲۳-۴۲ الشاکری) بنی خزاعۃ بن سعد بن ہذیل وترجمتہ فی المؤتلف ۲۷۰-۲۷۸ قال القتیبی فی المعانی الرہط جلد یشق اسفلہ ویترک اعلاہ فیلبسہ الصبیان قتادہ وکانوا فی الجاہلیۃ یطوفون عراۃ والنساء فی الرہط وہو شقوقۃ قدر ما بین الرکبۃ الی السرۃ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷ ÷

سے ہے اور اس کے معنی ہیں کہ ہر شخص اپنے گزشتہ اعمال کی پاداش میں رکا رہے گا۔

پھر رَھْن میں چونکہ حبس در وکنے، کے معنی پائے جاتے ہیں اس لئے کبھی مجازاً رھن بمعنی حبس یعنی مطلق کسی چیز کو روکنے کے آجاتا ہے۔ جیسا کہ آیت مذکورہ میں ہے اور رَهَنْتُ فُلَانًا وَ رَهَنْتُ عِنْدَهٗ کے معنی کسی کے پاس گروی رکھنے کے ہیں اور اِرْتَهَنْتُ (افتعال) کے معنی گروی لینے کے۔

اور اَرْهَنْتُ (افعال) فِی السِّلْعَةِ کے معنی بعض نے سامان تجارت کو گراں فروخت کرنا کئے ہیں۔ اصل میں اس کے معنی بیعانہ کے طور پر کچھ سامان دے دینے کے ہیں۔ جو قیمت ادا کرنے تک بطور ضمانت بائع کے پاس رہتا ہے۔

(ر ھ و)

(الرَّهْوُ ساکن چنانچہ، آیت کریمہ:۔ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا (۴۴-۲۴) اور دریا کو ساکن چھوڑ دے۔

میں رَهْوًا کے معنی ساکن کے ہیں بعض نے کہا ہے کہ اس سے راستہ کی کشادگی مراد ہے اور یہی معنی صحیح ہیں[1]۔ اور اسی سے رَهَاءٌ ہے جس کے معنی ہموار جنگل کے ہیں اور ہر وہ ہموار قطعہ زمین جہاں پانی جمع ہوتا ہو اسے رَهْو کہا جاتا ہے اسی سے ایک حدیث ہے[2] (۱۶۰) لَا شُفْعَةَ فِی رَهْوٍ... کہ پانی کی گذرگاہ کے مشترک ہونے سے حق شفع ثابت نہیں ہوتا۔

ایک اعرابی نے ٹانگیں پھیلا کر کھڑے ہوئے اونٹ دیکھ کر کہا:۔ رَهْوٌ بَیْنَ سَنَامَیْنِ۔ کہ یہ دونوں بلندیوں کے درمیان رَهْوٌ یعنی کشادگی ہے۔

(ر و ح ی)

اَلرَّوْحُ وَالرُّوْحُ۔ دراصل ایک ہی ہیں رُوح کا اطلاق سانس پر ہوتا ہے شاعر نے آگ کے متعلق کہا ہے[3] (طویل)

(۱۹۵) فَقُلْتُ لَهُ ارْفَعْهَا اِلَیْكَ وَاَحْیِهَا
بِرُوحِكَ وَاجْعَلْ لَهَا قِیتَةً قَدْرًا

تو میں نے کہا کہ اسے اٹھاؤ اور قدرے نرم پھونک مار کر اسے سلگاؤ اور اس میں تھوڑا سا ایندھن ڈال دو۔ اور سانس بھی چونکہ روح کا ایک جزء ہے.... اس لئے مجازاً اسے روح کہہ دیا ہے جیسا کہ نوع کو اسم جنس سے تعبیر کر دیتے ہیں مثلاً تَسْمِیَةُ الْاِنْسَانِ بِالْحَیَوَانِ اور کبھی روح کا اطلاق اس چیز پر ہوتا ہے جس کے ذریعہ زندگی حرکت، منافع کا حصول و مضرت سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (۱۷-۸۵) اور تجھ سے روح کی حقیقت دریافت کرتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ یہ میرے پروردگار کا ایک حکم ہے۔ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (۱۵-۲۹) اور میں نے

---

[1] قال الطبری (۲۵: ۱۲۱-۱۲۲) واولی الاقوال فی ذالک بالصواب ای الساکن ۔ [2] الحدیث فی الفائق ۳/۲۲۲ وغریب ابی عبید ۳/۱۲ وفی الصحاح (رہو) والتاج واللسان (رہو) [3] قالہ ذوالرمۃ وفی لسان العرب وحاییا واقتت لہا قیتۃ قدرا بمل واجعل لہا الخ یقال واقتت لنارک قیتۃ ای اطعمہا والبیت من شواہد الطبری (۲۷: ۶۔۳) واللسان (قتت، نفخ، حی) ودیوانہ ۴۲ من قصیدۃ لہ والمشکل للقتبی ۲۷ فی ثلاثۃ ابیات والبحر (۳: ۴۰۱)

اس میں اپنی طرف سے، روح پھونک دی۔
میں روح کے یہی معنی مراد ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اسے اپنی ذات کی طرف منسوب کرنا اضافت ملک کے طور پر ہے جس سے اس کی شرافت کا اظہار مقصود ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ:۔
وَطَهِّرْ بَيْتِيَ (۲-۲۶۲) میں بیت کی اضافت اپنی ذات کی طرف کی ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ۔
يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا (۳۹-۵۳) اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر زیادتی کی۔
میں عباد کی نسبت بھی یا متکلم (ذات باری تعالیٰ) کی طرف اضافت تشریفی ہے۔
اور قرآن نے ذو شرف ملائکہ کو بھی اَرْوَاح سے موسوم کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا (۷۸-۳۸) جس روز کہ روح (فرشتہ) اور دیگر ملائکہ صفیں باندھ کھڑے ہوں گے۔
تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ (۷۰-۴) فرشتے اور جبریل اس کی طرف چڑھتے ہیں۔
اور آیت:۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ (۲۶-۱۹۳) اسے روح امین لے کر اترا۔
میں روح امین سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ اور دوسری آیت میں جبریل علیہ السلام کو روح القدس بھی کہا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ (۲-۲۷) اس قرآن کو روح القدس لے کر آتے ہیں۔
قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
وَرُوحٌ مِّنْهُ (۴-۱۷۱) اور وہ ایک روح تھی جو خدا کی طرف سے آئی۔
اور عیسیٰؑ کو روح اس لئے کہا ہے کہ وہ مردوں کو زندہ کرتے تھے۔
اور قرآن کو بھی روح کہا گیا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا (۴۲-۵۲) اس طرح ہم نے اپنے حکم سے (دین کی) جان (یعنی یہ کتاب) تمہاری طرف وحی کے ذریعہ بھیجی۔ اس لئے قرآن سے حیات اخروی حاصل ہوتی ہے جس کے متعلق فرمایا:۔
وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (۲۹-۶۴) اور دار آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔
اور رَوْح (بفتح الراء) کے معنی سانس کے ہیں اور اَرَاحَ الْإِنْسَانُ کے معنی تنفس یعنی سانس لینے کے اور آیت:۔
فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ (۵۶-۸۹) تو راحت اور رزق ہے۔
میں رَیحان سے خوشبودار چیزیں مراد ہیں اور بعض نے رزق مراد لیا ہے۔ اور کھانے کے اناج کو بھی ریحان کہا گیا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ (۵۵-۱۲) اور ہر طرح کے اناج جو بھوسی کے خول کے اندر ہوتے ہیں اور کھانے کا اناج۔
ایک اعرابی سے پوچھا گیا کہ کہاں جا رہے ہو۔ تو اس نے جواب دیا "أَطْلُبُ مِنْ رَيْحَانِ اللهِ" کہ میں اللہ کے رزق کی تلاش میں ہوں لیکن اصل معنی وہی ہیں۔ جو ہم پہلے بیان کر آئے ہیں (یعنی خوشبودار چیز) ایک حدیث میں ہے۔[1] (۱۶۲) اَلْوَلَدُ مِنْ رَيْحَانِ اللهِ کہ اولاد بھی اللہ کے ریحان سے ہے اور یہ ایسے ہی ہے۔ جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے[2]

---

[1] کلمۃ من حدیث طویل راجع الفائق ۱/۴۸۶ (جبن) اکمم لمن ریحان اللہ و فی الحکیم عن خولۃ بنت حکیم الولد من ریحان الجنۃ و فی العیون (۳/۹۴) والعقد ۲/۸۲۴) الولد من ریحان اللہ راجع العراقی ۲/۲۸ و الطبرانی فی الصغیر ۱۶۹ و الفتح الربانی ۱/۲۴۲

[2] لاعرابیۃ کانت ترقص ولدہا راجع ادب الدنیا والدین بشرح لخان زادہ والعیون (۳: ۹۴)

(۱۹۷) یَا حَبَّذَا رِیحُ الْوَلَدِ
رِیحُ الْخُزَامَی فِی الْبَلَدِ

اولاد کی خوشبو کیسی پیاری ہے۔ یہ خزامی گھاس کی خوشبو ہے جو شہر میں مہکتی ہے اور اولاد کو ریحان اس لئے کہا ہے کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق ہے

اَلرِّیحُ کے معنی معروف ہیں۔ یعنی ہوا متحرک کو کہتے ہیں عام طور پر جن مواضع میں ارسال الریح صیغہ مفرد کے ساتھ مذکور ہے وہاں عذاب مراد ہے اور جہاں کہیں لفظ جمع کے ساتھ مذکور ہے وہاں رحمت مراد ہے[1]۔ چنانچہ ریح کے متعلق فرمایا:۔

اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیحًا صَرْصَرًا (۵۴-۱۹) ہم نے ان پر ایک زناٹے کی آندھی چلائی۔

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیحًا (۳۳-۹) تو ہم نے ان پر آندھی چلائی۔

کَمَثَلِ رِیحٍ فِیهَا صِرٌّ (۳-۱۱۷) مثال اس ہوا کی ہے جس میں بڑی ٹھر بھی ہو۔

اِشْتَدَّتْ بِهِ الرِّیحُ (۱۴-۱۸) اس کو سخت ہوا لے اڑی۔

اور رِیَاح (جمع کا لفظ) کے متعلق فرمایا:۔

وَاَرْسَلْنَا الرِّیَاحَ لَوَاقِحَ (۱۵-۲۲) اور ہم ہی ہوا کو چلاتے ہیں جو بادلوں کو پانی بار دار کرتی ہے۔

اَنْ یُّرْسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرَاتٍ (۳۰-۴۶) کہ وہ ہواؤں کو اس غرض سے بھیجتا ہے کہ لوگوں کو بارش کی خوشخبری پہنچائیں۔

یُرْسِلُ الرِّیَاحَ بُشْرًا (۷-۵۷) باران رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے تاکہ لوگوں کو مینہ کی آمد کی خوشخبری پہنچادیں۔

اور آیت:۔ یُرْسِلُ الرِّیَاحَ فَتُثِیرُ سَحَابًا (۳۰-۴۸) اور وہ قادر مطلق ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ ہوائیں بادلوں کو ان کی جگہ سے ابھارتی ہے۔

میں بھی چونکہ معنی رحمت اغلب ہے اس لئے یہاں لفظ جمع کی قرائت زیادہ صحیح ہے۔

کبھی مجازاً ریح بمعنی غلبہ بھی آجاتا ہے چنانچہ فرمایا:۔ وَتَذْهَبَ رِیحُکُمْ (۸-۴۶) اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

محاورہ ہے:۔

اَرْوَحَ الْمَاءُ پانی متغیر ہوگیا خاص کر بدبودار ہونے کے وقت بولتے ہیں۔

رِیحَ الْغَدِیرُ یُرَاحُ جوہڑ پر ہوا کا چلنا۔ اور اَرَاحُوْا کے معنی رَوَاحٌ یعنی شام کے وقت میں داخل ہونے کے ہیں اور خوشبودار تیل کو دُهْنٌ مُرَوَّحٌ کہا جاتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے[2] (۱۶۳) لَمْ یَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ کہ وہ جنت کی خوشبو تک نہیں پائے گا۔

اَلْمَرْوَحَةُ ہوا چلنے کی سمت اَلْمِرْوَحَةُ (آلہ) پنکھا۔ اَلرَّائِحَةُ مہکنے والی خوشبو۔

محاورہ ہے:۔

رَاحَ فُلَانٌ اِلٰی اَهْلِهٖ (۱) فلاں اپنے اہل کیطرف ہوا کی طرح تیزی کے ساتھ گیا۔ (۲) اس نے اپنے اہل وعیال میں پہنچ کر راحت حاصل کی۔

---

[1] نسبہ فی الاتقان الی ابی بن کعب و بحیدہ [illegible] و ورد فی الادعیۃ الماثورۃ اللھم اجعلہا ریاحا ولا تجعلہا ریحا (الخالق ۱/۲۵۴) وقد ردہ الخفاجی فی شرح الدرۃ ۱۲۳-۱۲۴۔ وورد فی القرآن خلافہ ولسلیمان الریح عاصفۃ (۲۱-۱۸) وجرین بہم بریح طیبۃ (۱۰-۲۲) وفی الحدیث نصرت بالصبا وہی ریح الانبیاء [illegible]

[2] حدیث لم یرح رائحۃ الجنۃ ورد فی قتل المعاہد (حم، خ، ن، ہ) عن ابن عمرو الفائق ۱/۵۴ و الغریب لابی عبید ۱/۷۵ راجع کنز العمال ج ۴ رقم ۱۸۲۱ / ۱۸۲۴-۱۸۲۵ و زد علیہ ابن حبان رقم ۳۰/۱۳۱-۱۲۲۳ عن ابی بکرۃ ۱۲

اَلرَّاحَۃُ آرام۔ یہ بھی رَوْحٌ سے ماخوذ ہے۔ مشہور محاورہ ہے:۔ اِفْعَلْ ذَالِکَ فِیْ مَرَاحٍ وَرَوَاحٍ کہ آرام سے یہ کام کرو۔

اَلْمُرَاوَحَۃُ کے معنی ہیں دو کاموں کو باری باری کرنا۔ اور استعارہ کے طور پر رَوَاحٌ سے دوپہر کو آرام کا وقت مراد لیا جاتا ہے اور اسی سے کہا جاتا ہے۔ اَرَحْنَا اِبِلَنَا کہ ہم نے اونٹوں کو آرام دیا (یعنی باڑہ میں لے آئے) اور پھر اَرَحْتُ اِلَیْہِ سے بطور استعارہ کہا جاتا ہے۔

اَرَحْتُ اِلَیْہِ حَقَّہٗ کہ میں نے اس کا حق واپس لوٹا دیا اور مُرَاحٌ باڑے کو کہا جاتا ہے اور تَرَوَّحَ الشَّجَرُ وَرَاحَ یَرَاحُ کے معنی درخت کے شگوفہ دار ہونے اور نئے پتے نکالنے کے ہیں اور کبھی رَوْحٌ سے وسعت اور فراخی کے معنی بھی مراد لئے جاتے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے۔ قَصْعَۃٌ رَوْحَاءُ فراخ پیالہ اور آیت کریمہ:۔ وَلَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ ۔۔۔۔ (۱۲-۸۷) اور خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ میں بھی وسعت رحمت مراد ہے جو لفظ رَوْحٌ سے مفہوم ہوتی ہے۔

(ر و د)

اَلرَّوْدُ اسکے اصل معنی نرمی کے ساتھ کسی چیز کی طلب میں بار بار آمدورفت کے ہیں اور اس معنی میں فعل رَادَ وَارْتَادَ آتا ہے اسی سے رَائِدٌ ہے جس کے معنی ہیں وہ شخص جسے پانی اور چارہ کی تلاش کیلئے قافلہ سے آگے بھیج دیا گیا ہو اور رَادَ الْاِبِلَ کے معنی گھاس کی تلاش میں اونٹوں کو ادھر ادھر لئے پھرنا کے ہیں پھر نق کے اعتبار سے کہا جاتا ہے رَادَتِ الْاِبِلُ فِیْ مَشْیِھَا۔ تَرُوْدُ رَوَدَانًا اونٹ نرم رفتار چلے۔ اور اسی سے مِرْوَدٌ ہے جس کے معنی سرمہ لگانے کی سلائی یا حلقہ لگام کے لوہا کے ہیں اور اَرْوَدَ یُرْوِدُ (افعال) کے معنی ہیں نرمی کرنا اور اس سے رُوَیْدًا (اسم فعل) ہے جیسے رُوَیْدَکَ الشِّعْرَ یَغِبُّ کل تک شعر کو مہلت دو یعنی اس پر غور کر لو۔

اَلْاِرَادَۃُ یہ رَادَ یَرُوْدُ سے ہے جس کے معنی کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنے کے ہیں اور ارادۃ اصل میں اس قوۃ کا نام ہے، جس میں خواہش ضرورت اور آرزو کے جذبات ملے جلے ہوں پھر اس سے مراد دل کا کسی چیز کی طرف کھنچنا اس فیصلہ کے ساتھ کہ اسے کرنا چاہئے یا نہیں اور اس لئے یہ کبھی دل کے کسی طرف کھنچنے کے لئے بولا جاتا ہے جو کہ ارادہ کا مبدا ہے اور کبھی صرف منتہی کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ یعنی محض فیصلے کے لئے۔ جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے متعلق استعمال ہو تو منتہیٰ کے معنی مراد ہوتے ہیں۔ یعنی کسی کام کا فیصلہ نزوع نفس کا معنی مراد نہیں ہوتا کیونکہ ذات باری تعالیٰ خواہشات نفسانی سے مبرا ہے لہٰذا اَرَادَ اللّٰہُ کَذَا کے معنی ہوں گے۔ اللہ نے فلاں کام کا فیصلہ کیا چنانچہ فرمایا:۔

اِنْ اَرَادَ بِکُمْ سُوْٓءًا اَوْاَرَادَ بِکُمْ رَحْمَۃً (۳۳-۱۷) یعنی اگر خدا تمہاری برائی کا فیصلہ کرے یا تم پر اپنا فضل و کرم کرنا چاہے۔

اور کبھی ارادہ بمعنی امر کے آتا ہے مثلاً اُرِیْدُ مِنْکَ کَذَا کے معنی یہ ہیں کہ تجھے فلاں کام کرنے کا حکم دیتا ہوں۔ جیسے قرآن میں ہے۔

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ ۔۔۔۔ (۲-۱۸۵) اللہ تمہارے ساتھ آسانی

کرنا چاہتا ہے۔ اور تمہارے ساتھ سختی نہیں کرنا چاہتا۔
(یعنی آسان کاموں کا حکم دیتا ہے اور ایسے امور کا حکم نہیں دیتا جس سے تم سختی میں مبتلا ہو جاؤ)
اور کبھی ارادہ بمعنی قصداً آتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ (۲۸-۸۳)
وہ دنیا میں کسی طرح کی شیخی نہیں کرنا چاہتے۔
یعنی نہ اس کا قصد کرتے ہیں اور نہ ہی اسے اپنا مطلوب بناتے ہیں پھر جس طرح یہ لفظ قوت اختیاریہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح قوت تسخیری یعنی اضطراری اور غیر اختیاری امور میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لئے ارادہ کا لفظ حیوانات اور جمادات دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں دیوار کے متعلق فرمایا:۔
يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ (۱۸-۷۷) کہ وہ گرا چاہتی تھی۔
یعنی گرنے کے قریب تھی۔ اور محاورہ ہے:۔
فَرَسِي تُرِيدُ التِّبْنَ کہ میری گھوڑی بھوسہ کھانا چاہتی ہے۔
اَلْمُرَاوَدَةُ (مفاعلہ) یہ بھی رَادَ يَرُوْدُ سے ہے اور اس کے معنی ارادوں میں باہم اختلاف اور کشیدگی کے ہیں۔ یعنی ایک کا ارادہ کچھ ہو اور دوسرے کا کچھ اور رَاوَدْتُ فُلَانًا عَنْ كَذَا کے معنی کسی کو اس کے ارادہ سے پھسلانے کی کوشش کرنا کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَفْسِي (۱۲-۲۶) اس نے مجھے میرے ارادہ سے پھیرنا چاہا۔
تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ (۱۲-۳۰) وہ اپنے غلام سے (ناجائز) مطلب حاصل کرنے کے درپے ہے۔
یعنی اسے اس کے ارادہ سے پھسلانا چاہتی ہے۔
سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ (۱۲-۶۱) ہم اس کے باپ کو اس سے پھیرنے کی کوشش کریں گے۔
(یعنی اسے آمادہ کریں گے کہ وہ برادر یوسف علیہ السلام کو ہمارے ساتھ بھیج دے)
وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ نَفْسِهِ (۱۲-۳۲) بے شک میں نے اس سے (ناجائز) مطلب حاصل کرنا چاہا۔

(ر ء س)

اَلرَّأْسُ سر کو کہتے ہیں اور اس کی جمع رُءُوْسٌ آتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا (۱۹-۴) اور سر (بڑھاپے کی آگ) سے بھڑک اٹھا ہے۔
وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ (۲-۱۹۶) اپنے سر نہ منڈاؤ۔
اور کبھی رَأْسٌ بمعنی رئیس بھی آتا ہے اور أَرْأَسُ (اسم تفضیل) کے معنی بڑے سر والے کے ہیں اور سیاہ سر والی بکری کو شَاةٌ رَأْسَاءُ کہتے ہیں اور رِيَاسُ السَّيْفِ کے معنی دستہ شمشیر کے ہیں۔

(ر و ض)

اَلرَّوْضُ اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی جمع ہو اور سرسبز بھی ہو۔ قرآن میں ہے:۔
فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ (۳۰-۱۵) باغ بہشت میں ان کی خاطر داریاں ہو رہی ہوں گی۔
اور پانی کے جمع ہونے کے اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ أَرَاضَ الْوَادِي وَاسْتَرَاضَ وادی میں پانی وافر ہو گیا اور أَرَاضَهُمْ کے معنی ہیں اس نے لوگوں کو سیراب کر دیا۔
اَلرِّيَاضَةُ کسی سے بکثرت کوئی کام لینا تاکہ اسے

اس میں سدھاؤ اور مہارت پیدا ہو جائے۔ اسی سے رُضْتُ الدَّابَّۃَ ہے یعنی سواری کو سدھانا اور مطیع کرنا۔ اور اِفْعَلْ کَذَا مَا دَامَتِ النَّفْسُ مُسْتَرَاضَۃً کے معنی ہیں کہ اس وقت تک یہ کام کرو جب تک نفس محنت کے قابل رہے یا اس میں وسعت رہے اور یہ اِرَاضَۃٌ یا رَوْضٌ سے مشتق ہوگا اور آیت کریمہ:

فِیْ رَوْضَۃٍ یُّحْبَرُوْنَ (۳۰-۱۵) میں رَوْضَۃ سے جنت کے سبزہ زار یعنی اس کے محاسن اور لذات مراد ہیں اور آیت فِیْ رَوْضَاتِ الْجَنَّاتِ میں (صیغہ جمع سے) ان ظاہری نعمتوں کی طرف اشارہ ہے جو آخرت میں اصحاب جنت کے لئے تیار کی گئیں ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ ان علوم و اخلاق کی طرف اشارہ ہے جن میں تخصص حاصل کر لینے سے انسان کا دل پاکیزہ ہو جاتا ہے۔

(ر و ع)

اَلرُّوْعُ کے معنی خَلَدٌ یعنی دل کے ہیں جیسے حدیث میں ہے[۱] (۱۴۶)

اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِیْ رُوْعِیْ ۔۔۔۔ کہ روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی۔ اور رَوْعٌ (بفتح الراء) خوف کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرَاهِیْمَ الرَّوْعُ (۱۱-۷۴) پھر جب ابراہیم (کے دل سے) خوف دور ہوا۔

محاورہ ہے:۔ رُعْتُهٗ وَرَوَّعْتُهٗ خوف زدہ کرنا، گھبرا دینا۔ نَاقَۃٌ رَوْعَاءُ ڈرپوک اونٹنی۔

اَلْاَرْوَعُ۔ وہ چیز جو اپنے حسن و جمال سے دیکھنے والے کو حیرت میں ڈال دے گویا خوف زدہ کر رہی ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[۲]

(۱۹۸) یَهُوْلُكَ اِنْ تَلْقَاهُ فِی الصَّدْرِ مَحْفَلًا

کہ محفل میں اس سے ملاقات کرے تو دل میں ہول پیدا کر دے۔

(ر و غ)

اَلرَّوْغُ کے معنی کسی حیلہ اور تدبیر کی خاطر ایک جانب مائل ہونے کے ہیں اسی سے رَاغَ الثَّعْلَبُ (ن) رَوْغَانًا ہے یعنی لومڑ کا فریب دہی کے طور پر ادھر ادھر جانا اور کج راستہ کو رَائِغٌ کہا جاتا ہے گویا وہ اپنے پیچ و خم سے فریب دے رہا ہے۔ رَاوَغَ فُلَانٌ فُلَانًا کسی سے فریب کھیلنا اور رَاغَ فُلَانٌ اِلٰی فُلَانٍ کے معنی ہیں یہ فلاں کی طرف اس طرح لوٹا کہ اپنا مقصد حیلے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ قرآن میں ہے۔

فَرَاغَ اِلٰی اَهْلِهٖ (۵۱-۲۶) پھر وہ جلدی سے اپنے گھر پہنچا۔

فَرَاغَ عَلَیْهِمْ ضَرْبًا بِالْیَمِیْنِ (۳۷-۹۳) تو پڑی قوت سے ان کے مارنے کیلئے مائل ہوئے۔

اور اصل میں اس کے معنی ہیں داؤ لگا کر کسی چیز کو حاصل کرنا اور (عَلٰی) صلہ کے لفظ سے معنی استیلاء کا اظہار مقصود ہے۔

(ر و م)

رُوْمٌ ایک مشہور قوم ہے کبھی یہ لفظ رُوْمِیٌّ کی جمع کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے جیسے عَجَمٌ وَعَجَمِیٌّ۔ قرآن میں ہے:۔

الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ (۳۰-۱،۲) رومی مغلوب ہو گئے

---

[۱] فی الصحاح: تریبع السرب (ریاح) [۲] راجع للحدیث اللآلی ۸۰۰/۲ و اللسان: شرح السنۃ من روایۃ عبداللہ بن مسعود العسکری فی الامثال و الغزالی فی الاحیا

وفی روایۃ روح الامین تاج العروس [illegible]

(ر و ی)

مَاءٌ رَوَاءٌ وَرِوًی بہت زیادہ سیر کرنے والے پانی کو کہتے ہیں اور رِوًی بروزن عِدًی اور سِوًی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (رجز)

(۱۲۲) مَنْ شَکَّ فِیْ فَلْجٍ فَھٰذَا فَلْجٗ
مَاءٌ رَوَاءٌ وَطَرِیْقٌ نَھْجٌ

جسے مقام فلج میں شبہ ہو وہ دیکھ لے کہ یہی فلج ہے (یعنی سیراب کرنے والا پانی اور کھلا راستہ۔

اور آیت:۔

ھُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِئْیًا۔ (۱۹-۷۴) جن کے سازوسامان اور جن کی (ظاہری) رواداری ان سے کہیں عمدہ تھی۔

جو لوگ اسے مہموز نہیں بناتے ان کے نزدیک رَیٌّ سے مشتق ہے۔ اور خوبصورت کو رِیٌّ اس لئے کہا جاتا ہے کہ گویا وہ حسن سے پُر ہے۔ لیکن اگر اسے مہموز پڑھا جائے تو رِئْیًا سے مراد وہ چیز ہوگی جس کی خوبصورتی کی وجہ سے اس کی طرف نظریں اٹھتی ہوں۔ بعض کے نزدیک بغیر ہمزہ کے بھی رُؤْیَۃ سے مشتق ہے اور رِیٌّ کے معنی منظر (ظاہری حالت) کے ہیں اسی سے رِوَاءٌ (خوش نمائی) ہے۔ لیکن بعض نے کہا ہے کہ رُوَاءٌ میں قلب ہوا ہے اور یہ رَأَبْتُ سے مشتق ہے۔

اَبو علی الفسوی کہتے ہیں کہ لفظ مَرْوْءَۃٌ بھی حُسْنٌ فِیْ مِرْءَۃِ الْعَیْنِ کَذَا (ظاہر دیکھنے میں خوبصورت ہے) سے ماخوذ ہے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ مِرْاٰۃ میں میم زائدہ ہے اور مَرُوْءَۃٌ بروزن فَعُوْلَۃ ہے۔ اور اس میں میم اصلی ہے اور اَنْتَ بِمَرْءًی وَّمَسْمَعٍ کے معنی ہیں کہ تم اس قدر میرے قریب ہو کہ میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں اور تمہاری بات سن سکتا ہوں۔

بعض باء کو حذف کرکے اَنْتَ مِنِّیْ مَرْاٰیً وَّمَسْمَعٌ بولتے ہیں اور مَرْءًی بروزن مَفْعَلٌ ہے اور رَأَیْتُ سے ماخوذ ہے۔

(ر ی ب)

رَابَنِیْ کَذَا اور اَرَابَنِیْ کے معنی ہیں فلاں معاملہ نے مجھے رَیْب میں ڈال دیا اور رَیْب کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق کسی طرح کا وہم ہوگا لیکن بعد میں اس توہم کا ازالہ ہو جائے۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ۔ (۲۲-۵) اگر تم کو (قیامت کے دن) پھر جی اٹھنے میں کسی طرح کا شک ہو۔ اور آیت:۔

فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا اَنْزَلْنَا۔ (۲-۲۳) (اگر تمہیں) مَا اَنْزَلْنَا میں کسی قسم کا شک و شبہ ہے۔

اور آیت:۔

رَیْبَ الْمَنُوْنِ۔ (۵۲-۳۰) گردش زمانہ (کا انتظار کرتے ہیں)۔

گردش زمانہ کو رَیْب کہنے سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان کے وقوع میں شک و شبہ ہے بلکہ اس لحاظ سے انہیں ریب کہا ہے کہ ان کے تعین اوقات میں انسان متردد رہتا ہے کہ خدا جانے کب گردش کا وقت آجائے لہٰذا انسان نفس گردش کے وقوع کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس کے تعین اوقات کے لحاظ سے ہمیشہ رَیْبَ الْمَنُوْن میں مبتلا رہتا ہے۔ اسی بناء پر شاعر نے کہا ہے[2] :

---

[1] البیت لراجز من بنی العنبر من تمیم بالفلج مارلھم قالہ فی البلدان وابو عبید البکری فی معجمہ (رسم فلج) ومجاز القرآن لابی عبیدہ: ۱۰۸ والبیت فی السجاد ندی ۱: ۴۴۱ بغیر عزو ۱۲

[2] قالہ ابو ذویب الخ راجع المحاضرات للمؤلف (رقم ۲: ۵۱۴)

(۱۹۳) اَلنَّاسُ قَدْ عَلِمُوْا اَنْ لَا بَقَاءَ لَھُمْ
لَوْ اَنَّھُمْ عَلِمُوْا مِقْدَارَ مَا عَلِمُوْا
کہ لوگوں کو اس بات کا تو یقین ہو چکا ہے کہ ان کیلئے بقا نہیں ہے۔ کاش انہیں اس کا وقت بھی معلوم ہوتا۔
اور دوسرے شاعر نے کہا ہے[ٹ] (الکامل)

(۱۹۴) اَمِنَ الْمَنُوْنِ وَرَیْبِھَا تَتَوَجَّعُ
کہ کیا تو زمانہ اور اس کی گردشوں پر جزع فزع کرتا ہے
قرآن میں ہے:۔
لَفِیْ شَکٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ (۱۱-۱۰) قرآن کی طرف سے ایسے شک میں پڑے ہوئے ہیں جس نے انہیں حیران کر رکھا ہے۔
مُعْتَدٍ مُّرِیْبٍ (۵۰-۲۵) حد (عبودیت) سے بڑھے ہوئے اور شک و شبہ پیدا کرنے والے (کی اطاعت مت کر)
اور اِرْتِیَابٌ (افتعال) اَرَابَ کے ہم معنی ہے جس کے معنی شک و شبہ میں پڑنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اَمِ ارْتَابُوْا اَمْ یَخَافُوْنَ (۲۴-۵۰) یا شک میں پڑے ہوئے ہیں اور اس بات سے ڈرتے ہیں۔
وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ (۵۷-۱۴) اور اس بات کے منتظر رہے (کہ مسلمانوں پر کوئی آفت نازل ہو) اور (اسلام کی طرف سے) شک میں پڑے رہے۔

اور مومنین سے اِرْتِیَاب کی نفی کرتے ہوئے فرمایا
وَلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (۷۴-۳۱) اور اہل کتاب اور مسلمان (ان باتوں میں کسی طرح کا) شک و شبہ نہ لائیں۔
ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا (۴۹-۱۵) پھر کسی طرح کا شک و شبہ نہیں کیا۔
ایک حدیث میں ہے[ٹ]۔ (۱۹۵) دَعْ مَا یُرِیْبُكَ اِلٰی مَالَا یُرِیْبُكَ کہ شک و شبہ چھوڑ کر وہ کام کرو جس میں شک و شبہ نہ ہو۔
اور گردش زمانہ کو رَیْبُ الدَّھْرِ اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان میں فریب کاری کا وہم ہوتا ہے (کما مرّ) اور رِیْبَةٌ رَیْبٌ سے اسم ہے جس کے معنی شک و شبہ کے ہیں (جمع رِیَبٌ) قرآن میں ہے:۔
بَنَوْا رِیْبَةً فِیْ قُلُوْبِھِمْ (۹-۱۱۰) کہ وہ عمارت ان کے دلوں میں رِیْبَة بنی رہے گی۔ یعنی ہمیشہ ان کے دلی کھوٹ اور خلجان پر دلالت کرتی رہے گی۔

(ر ی ش)

رِیْشُ الطَّائِرِ پرندہ کے پروں کو کہتے ہیں اور کبھی یہ لفظ خصوصیت کے ساتھ بازوؤں کے پروں پر بولا جاتا ہے اور چونکہ پرندکے پر اس کے

ٹ قالہ ابو ذویب الھذلی فی مطلع رثا بنیہ راجع الانصاف ۷۶ وخاص الخاص للثعالبی ۱۸ والغریب للقتبی ۴۲۵ والقرطبی (۱۲: ۱۷۰، ۱۷: ۷۲) واللسان (ریب) والسمط ۴۵۴ والقصیدة مفضلیة فی ۶۵ بیتا وتمام البیت: والدھر لیس بمعتب من یجزع والبیت فی الاستیعاب ۶۶۷ والاغانی (۶: ۵۹) والخزانة (۱: ۲۰۲) والسیوطی ۹۲ والبیقی (۳: ۹۳۴) والعقد (۲: ۱۵) والاصابة ۴۵۴ واسد الغابة (۵: ۱۹۰) رقم ۷۰ ۲۵ ومجازات القرآن الرضی ۲۸۳ وتہذیب الالفاظ ۴۵ ونظام الغریب ۲۳۰ وشواہد المغنی (۲: ۲۰۴) واضداد ابی الطیب ۲۲۳ وشرح السبع لابن الانباری ۴۱۴ والبحر (۵: ۹۳۴)

ٹ الحدیث بطولہ رواہ الترمذی فی آخر الطب والحاکم فی الاحکام والبیوع والطبرانی والبزار من حدیث الحسن بن علی وانس عن عمر والنسائی عن الحسن بن علی وابن حبان فی زوائدہ رقم ۵۱۲ عن الحسن والحدیث بطرقہ واختلاف الفاظہ فی کنز العمال (۲: ۲۲۵-۲۲۶) والکاف الشاف لابن حجر رقسم ۱۱ والفتح الباری (۴: ۲۳۴)

لئے بمنزلہ لباس کے ہوتے ہیں۔ اس لئے استعارہ کے طور پر یہ لفظ لباس کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَرِیْشًا وَّلِبَاسُ التَّقْوٰی (۷-۲۶) اور موجب زینت اور پرہیزگاری کا لباس۔
عام محاورہ ہے:۔
اَعْطَاہُ اِبِلًا بِرِیْشِھَا اسے سامان سمیت اونٹ دے دیئے یعنی مال و متاع سمیت جو ان کے اوپر تھا۔
اور رِشْتُ السَّھْمَ اَرِیْشُہٗ رِیْشًا کے معنی تیر کو پر لگانے کے ہیں اور تیر پر نہادہ کو مَرِیْشٌ (کمبیع) کہتے ہیں۔ پھر استعارہ کے طور پر اصلاح امر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لہذا رِشْتُ فُلَانًا فائز کاش کے معنی ہیں۔ میں نے اس کی اصلاح کی تو اس کی حالت سدھر گئی۔ شاعر نے کہا ہے[۵]: (...)

(۱۹۷) فَرِشْنِیْ بِحَالٍ طَالَمَا قَدْ بَرَیْتَنِیْ
خَیْرُ الْمَوَالِیْ مَنْ یَرِیْشُ وَلَا یَبْرِیْ

مجھے عرصہ دراز تک تم نے تراشا ہے کبھی تو میری اصلاح کیجئے۔ بہتر موالی وہ ہیں جو بگاڑتے نہیں بلکہ سنوارتے رہتے ہیں۔
اور نیزہ کے پر سے کمزوری کے معنی کے تصور کی بنا پر کمزور نیزہ کو رُمْحٌ رَاشٌ کہہ دیتے ہیں۔

(ر ی ع)

اَلرِّیْعُ بلند جگہ کو کہتے ہیں۔ جو دور سے ظاہر ہو اس کا واحد رِیْعَۃٌ ہے قرآن میں ہے:۔
اَتَبْنُوْنَ بِکُلِّ رِیْعٍ اٰیَۃً تَعْبَثُوْنَ (۲۶-۲۸) کیا تم ہر اونچی جگہ پر بے ضرورت یادگاریں بناتے ہو۔
اور معنی ارتفاع کے لحاظ سے کنویں کی منڈیر کو رَیْعٌ کہا جاتا ہے۔ پھر ہر چیز کے اوائل کو رَیْعَان کہا جاتا ہے۔ اور استعارہ کے طور پر رَیْع ہر چیز کے زائد حصہ اور بلندی کے لئے آتا ہے اور اسی سے تَرَیَّعَ السَّحَابُ ہے جس کے معنی بادل کے نمایاں اور ظاہر ہونے کے ہیں

(ر ی ن)

اَلرَّیْنُ۔ اس زنگ کو کہتے ہیں جو کسی صاف چیز پر لگ جاتے۔ قرآن میں ہے:۔
کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ (۸۳-۱۴) نہیں بلکہ (بات یہ ہے کہ) ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔ یعنی ان کے مجلیٰ قلوب پر زنگ بیٹھ گیا ہے جس کی وجہ سے وہ خیر و شر میں تمیز نہیں کر سکتے۔ شاعر نے کہا ہے[۶] (البسیط)

(۱۹۹) اِذَا رَانَ النُّعَاسُ بِھِمْ
جب نیند نے ان پر غلبہ پا لیا۔

محاورہ ہے:۔
رِیْنَ عَلٰی قَلْبِہٖ۔ اس کے دل پر زنگ بیٹھ گیا

(ر ء ف)

اَلرَّاْفَۃُ یہ رَءُفَ رَکَ سے ہے اور اس کے معنی شفقت اور رحمت کے ہیں صفت کا صیغہ رَءُوْفٌ اور رَئِفٌ مثل حَذِرٌ وَیَقِظٌ آتا ہے قرآن میں ہے:۔

---

[۵] قالہ سوید بن الصامت الانصاری کما فی تو مراجع الیقر (۲: ۷۷) والاساس (۱: ۳۸۸) والاصابۃ (...) والعیون (۲: ۸۱) فی ابیات وفی اللسان (شرح) ریخی فی ستۃ ونسبہ لعمیر بن حباب قال احمد صیحۃ عبارۃ شارح القاموس قال سوید الانصاری ہو الصواب ۱۲

[۶] ھذا من البیت قالہ عبدۃ بن الطبیب من کلمۃ مفضلیۃ (۱: ۱۳۹) وتکملتہ:۔ امرتہ القوم ..... نقلت اذا نھکوا من حبۃ قیلوا والبیت فی الامالی (۱: ۲۷۰) والسمط ۶۰۵ والمفضلیات وفی المطبوع (...) قد صحف والتصویب من المرجع

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِيْنِ اللّٰهِ (۲۴-۲) اور اللہ کے حکم (کی تعمیل) میں تم کو ان (کے حال) پر (کسی طرح کا) ترس دامن گیر نہ ہو۔

(ر ء ی)

رائی یہ مہموز العین اور ناقص یائی ہے کیونکہ اس سے اسم مشتق رُؤْيَةٌ آتا ہے چنانچہ اسی سے شاعر نے تقلب کرکے کہا ہے [1] (الطویل)

(۲۰۰) وَكُلُّ خَلِيْلٍ رَاءَنِيْ فَهُوَ قَائِلٌ
مِنْ اَجْلِكَ هٰذَا الْهَامَةُ الْيَوْمَ اَوْ غَدٍ

جو دوست مجھے دیکھتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ یہ بدحالی تمہاری وجہ سے ہے اور یہ آج یا کل مر جائے گا۔

اور مضارع میں ہمزہ کو حذف کرکے تَرٰی، یَرٰی اور نَرٰی کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا (۱۹-۲۶) اگر کوئی آدمی نظر پڑے۔

اور آیت کریمہ:۔

اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (۴۱-۲۹) شیطان اور آدمی جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا ایک نظر ان کو ہمیں بھی تو دکھاؤ۔

میں ایک قرأت اَرْنَا بھی ہے۔

اَلرُّؤْيَةُ کے معنی کسی مرئی چیز کا ادراک کر لینا کے ہیں اور قوائے نفس (قوائے مدرکہ) کے اعتبار سے رُؤْيَةٌ کی چند قسمیں ہیں۔

(۱) حاسۂ بصر یا کسی ایسی چیز سے ادراک کرنا جو حاسۂ بصر کے ہم معنی ہے جیسے قرآن میں ہے:۔

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ (۱۰۲-۶) تم ضرور دوزخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لوگے پھر (اگر دیکھو گے بھی تو غیر مشتبہ) یقینی دیکھنا دیکھو گے۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ (۳۹-۶۰) اور تم قیامت کے روز دیکھو گے کہ جن لوگوں نے خدا پر جھوٹ بولا۔

اور آیت:۔

فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ (۹-۱۰۵) اللہ تعالیٰ ابھی تمہارے کردار کو دیکھے گا۔

میں اللہ تعالیٰ کے علم کو آنکھوں کے ساتھ دیکھنے کی طرح قرار دے کر یَرٰی کا لفظ لایا گیا ہے ورنہ آنکھ سے دیکھنا اللہ تعالیٰ کے حق میں صحیح نہیں ہے۔

اِنَّهُ يَرٰكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهُ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ۔ کہ وہ شیطان اور اس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھ لیتا ہے کہ تم ان کو نہیں دیکھ سکتے۔

(۲) وہم و خیال سے کسی چیز کا ادراک کرنا جیسے۔ اَرٰى اَنَّ زَيْدًا مُنْطَلِقٌ۔ میرا خیال ہے کہ زید جا رہا ہوگا۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَوْ تَرٰى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۸-۵۰) اور کاش تم اس وقت کی کیفیت خیال میں لاؤ جب ۔۔۔۔ کافروں کی جانیں نکالتے ہیں۔

(۳) کسی چیز کے متعلق تفکر اور اندیشہ محسوس کرنا جیسے فرمایا:۔

اِنِّيْ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ (۸-۴۸) میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔

(۴) عقل و بصیرت سے کسی چیز کا ادراک کرنا جیسے فرمایا:۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (۵۳-۱۱) پیغمبر نے جو دیکھا تھا اس کے دل نے اس میں کوئی

---

[1] قالہ کثیر عزۃ یخاطب جیبۃ والبیت فی اللسان (ر ء ی) ہوم) وامالی ابن الشجری (۲: ۱) والکامل ۲۲۶، ۱۳۳، ۱۴۱ والبحر ۷: ۲۱۱) واستشہد بہ القلب فی الکتاب ... ۱۳۰) ...

جھوٹ نہیں ملایا۔
اسی طرح دوسری جگہ فرمایا:۔
وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى (۵۳-۱۳) ایک دفعہ اور بھی (اصل صورت پر) دیکھا۔
اور رای کے جب دو مفعول آئیں تو اس میں علم کے معنی ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔
وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (۳۴-۶) اور (اے پیغمبر) جن لوگوں کو صحف آسمانی کا علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں۔
اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ (۱۸-۳۹) اگر مال اور اولاد کے اعتبار سے تو مجھ کو اپنے سے کمتر سمجھتا ہے۔
اور اَرَاَيْتَ (ہمزہ استفہام) اَخْبِرْنِیْ کے قائم مقام ہوتا ہے اور اگر اس پر کاف (ضمیر خطاب) داخل ہو، تو حالت تثنیہ جمع اور تانیث میں تاء کو اس کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا ہے اور ان حالتوں میں تاء کی بجائے کاف میں حسب مقام تبدیلی ہوتی رہتی ہے جیسے فرمایا:۔
اَرَاَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ (۱۷-۶۲) بھلا بتائیے یہی وہ ہے۔
قُلْ اَرَاَيْتَكُمْ (۶-۴۰) (اے پیغمبر) ان سے پوچھو کہ بھلا دیکھو تو سہی۔
قُلْ اَرَاَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ (۴۶-۴) (اے پیغمبر) ان لوگوں سے کہو کہ بھلا دیکھو تو سہی کہ جن کو تم اللہ کے سوا) پکارتے ہو۔
اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى (۹۶-۹) (اے پیغمبر) تم نے اس شخص کے حال پر (بھی) نظر کی جو منع کرتا ہے۔
قُلْ اَرَاَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ ..... (۲۸-۹) (اے پیغمبر) ان سے کہو کہ بھلا دیکھو تو سہی کہ اگر اللہ تعالیٰ لے آئے۔
قُلْ اَرَاَيْتُمْ اِنْ كَانَ (۴۶-۱۰) (اے پیغمبر) ان لوگوں سے) کہو بھلا دیکھو تو سہی کہ اگر یہ ہو۔
اَرَاَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ (۱۸-۶۳) آپ نے یہ بھی دیکھا کہ جب ہم (دریا کے کنارے) اس پتھر کے پاس ٹھہرے۔
ان تمام آیات میں تنبیہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔
رَاْىٌ۔ غلبہ ظن کی بنا پر کسی معاملہ کے دو متناقض پہلوؤں میں سے کسی ایک کی صحت کا یقین کر لینا رائے کہلاتا ہے اور آیت:۔
يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ (۳-۱۱۳) جن کو آنکھوں دیکھنے مسلمانوں کا گروہ اپنے سے دو چند دکھائی دے رہا ہے۔
میں "يَرَوْنَ" "رَأْی" سے مشتق ہے جس کے معنی گمان کرنے کے ہیں اور معنی یہ ہیں کہ عینی مشاہد کی رو سے وہ انہیں اپنے سے دو چند خیال کرتے تھے جیسے کہا جاتا ہے:۔
فَعَلَ ذٰلِكَ رَاْيَ عَيْنِيْ اَوْ رَاْءَةَ عَيْنِيْ کہ اس نے یہ کام میرے سامنے کیا ہے۔
اَلتَّرْوِيَةُ وَالتَّرْوِيَةُ کے معنی کسی چیز پر غور و فکر کرنے اور ایک رائے اختیار کرنے کیلئے یکسوئی سے اس کی طرف توجہ دینے کے ہیں اور اَلْمُتَرَوِّیْ وَالْمُرْتَوِیْ بمعنی متفکر ہے اور رَاَيْتُ متعدی بہ الی ہو تو اس کے معنی کسی چیز کی طرف اس طرح نظر ڈالنے کے ہیں کہ اس کے بعد انسان کو عبرت حاصل ہو جیسے فرمایا:۔
اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ .... (۲۵-۴۵) (اے پیغمبر) کیا تو نے اپنے پروردگار کی (قدرت کی) طرف نظر نہیں کی۔
اور آیت:۔ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (۴-۱۰۵) میں اَرٰى (افعال) بمعنی تعلیم کے ہے یعنی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں سکھایا ہے۔

اَلتَّرَائِيَۃُ اس علامت کو کہتے ہیں جو دیکھنے کے لئے نصب کی گئی ہو اور محاورہ ہے :۔

مَعَ فُلَانٍ رَئِيٌّ مِّنَ الْجِنِّ یعنی وہ آسیب زدہ ہے۔

اور اَرْأَتِ النَّاقَۃُ فَھِیَ مُرْءٍ اونٹنی کا حاملہ ہونا ظاہر ہو جانا۔

اَلرُّؤْيَا بمعنی خواب کے ہیں اور یہ ہمزہ کے ساتھ بروزن فُعْلٰی ہے اور کبھی ہمزہ کو حذف کر کے واؤ کے ساتھ اَلرُّوْيَا کہہ دیتے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے (۱۶۵) لَمْ يَبْقَ مِنْ مُبَشِّرَاتِ النُّبُوَّۃِ اِلَّا الرُّؤْيَا۔ کہ مبشرات نبوت سے صرف خواب رہ گئے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ (۴۸۔۲۷) بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو واقعی سچا خواب دکھایا تھا۔

وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِیْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَۃً لِّلنَّاسِ۔ (۱۷۔۶۰) اور خواب جو ہم نے تم کو دکھایا تھا تو بس اس کو لوگوں (کے ایمان) کی آزمائش (کا ذریعہ) ٹھہرایا۔

فَلَمَّا تَرَاءَ ى الْجَمْعٰنِ (۲۶۔۶۱) پھر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں۔

یعنی جب وہ باہم اس طرح آمنے سامنے ہوئے کہ ایک دوسرے کو دیکھ سکیں اور اسی سے وہ حدیث ہے جس میں فرمایا[۲] (۱۶۶)

لَا تَتَرَاءٰى نَارَاھُمَا کہ ایک دوسرے کی آگ نظر نہ آئے محاورہ ہے۔

مَنَازِلُھُمْ رِئَاءٌ کہ ان کے مکانات باہم متقابل ہیں۔

فَعَلَ ذٰلِكَ رِئَاءَ النَّاسِ اس نے نمود اور دکھاوے کے لئے یہ کام کیا۔

اَلْمِرْآۃُ آئینہ جس میں اشیاء کا عکس نظر آئے۔ یہ رَأَيْتُ سے مِفْعَلَۃٌ کے وزن پر ہے جیسے صَحَّفْتُ سے مِصْحَفَۃٌ اور اس کی جمع مَرَائِیْ آتی ہے۔

اَلرِّئَۃُ پھیپھڑا۔ اس کی جمع مِنْ لَفْظِہٖ رِؤُوْنَ آتی ہے۔ اس پر ابوزید نے اس شعر سے استشہاد کیا ہے۔[۳] (

(۱۲۱) حَفِظْنَاھُمْ حَتّٰٓی اَتَی الْغَيْظُ مِنْھُمْ
قُلُوْبًا وَاَكْبَادًا لَّھُمْ وَرِئِيْنَا

ہم نے انہیں غصہ دلایا حتّٰی کہ غیظ و غضب ان کے دل و جگر اور پھیپھڑوں میں سرایت کر گیا۔

اور اسی سے رِئْتُہٗ ہے جس کے معنی پھیپھڑے پر مارنے کے ہیں

---

[۲] رواہ ابوداؤد دباب علی ما یقاتل المشرکون من حدیث جریر بن عبداللہ والنسائی فی باب القود بغیر حدیدۃ مرسلاً والحدیث فی اللآلی ۷، ۵ وانظر تحریج الکاف الشاف لابن حجر ۵۵ و تخریج العراقی علی الاحیاء (۲ : ۷۹) والفائق (۱ : ۲۱۹) وغریب ابی عبید ۱۲ [۳] البیت فی اللسان (دسای) بغیر عزو ولیغنظنا ہم بدل حفظناہم

[۱] رواہ ابوداؤد فی باب الدعاء فی الرکوع والسجود من حدیث ابن عباس وفیہ الرؤیا الصالحۃ راجع العون (۱ : ۳۲۷) والحدیث ایضاً رواہ مسلم (۱ : ۱۹۱) طبع ھند والنسائی وابن ماجۃ ۱۲

کتاب الزاء

(ز ب د)

اَلزَّبَدُ جھاگ کو کہتے ہیں اور اَزْبَدَ الْمَاءُ کے معنی ہیں پانی کے اوپر جھاگ آگیا۔ قرآن میں ہے:۔ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً (۱۳-۱۷) سو جھاگ تو رائیگاں جاتا ہے۔

پھر محض رنگ میں مشابہت کی وجہ سے مسکہ کو بھی زُبْدٌ کہا جاتا ہے اور زَبَدْتُهٗ زَبْدًا کے معنی ہیں "میں نے اسے جھاگ کی طرح بکثرت مال دیا" یا "میں نے اسے مسکہ کھلایا"۔

اَلزُّبَّادُ پھول یا کلی جو جھاگ کی طرح سفید ہوتی ہے۔

(ز ب ر)

اَلزُّبْرَةُ لوہے کی بڑی سل کو کہتے ہیں اور اس کی جمع زُبَرٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ (۱۸-۹۶) (اچھا) لوہے کی سلیں ہم کو لادو۔

اور کبھی زُبْرَۃٌ کا لفظ بالوں کے گچھا پر بولا جاتا ہے اس کی جمع "زُبَرٌ" آتی ہے اور استعارہ کے طور پارہ پارہ کی ہوئی چیز کو زُبَرٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا (۲۳-۵۳) پھر لوگوں نے آپس میں پھوٹ کرکے اپنا (اپنا) دین جدا جدا کرلیا۔

زَبَرْتُ الْكِتَابَ میں نے کتاب کو موٹے خط میں لکھا اور ہر وہ کتاب جو جلی اور گاڑھے خط میں لکھی ہوئی ہو اُسے زَبُوْرٌ کہا جاتا ہے لیکن عرف میں زبور کا لفظ اس آسمانی کتاب کے لئے مخصوص ہوچکا ہے۔ جو حضرت داؤد علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا۔ (۴-۱۶۳) اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو زبور عطا کی۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ (۲۱-۱۰۵) اور ہم نے نصیحت (کی کتاب یعنی توراۃ) کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا۔

اس میں ایک قرأت زُبُوْرٌ (بضمہ زا) بھی ہے۔ جو یا تو زَبُوْرٌ بفتحہ زا کی جمع ہے جیسے ظَرِيْفٌ کی جمع ظُرُوْفٌ آجاتی ہے اور یا زِبْرٌ (بکسرۂ زا) کی جمع ہے۔ اور زِبْرٌ گو اصل میں مصدر ہے لیکن بطور استعارہ اس کا اطلاق کتاب پر ہوتا ہے جیسا کہ خود کتاب کا لفظ ہے کہ اصل میں مصدر ہے لیکن بطور اسم کے استعمال ہوتا ہے پھر جس طرح کتاب

لہ هو مستعار من زبرت الفضة وقال قتادہ ومجاہد الزبر بمعنی الکتب جمع زبور راجع

تفسیر الکشاف صلے ج ۲ معالم ج ۳ صفحہ ۵۲ :

کی جمع کتب آتی ہے اس طرح زَبْرٌ کی جمع زُبُرٌ آجاتی ہے بعض کا قول ہے کہ زبور کتب الہیہ میں سے ہر اس کتاب کو کہتے ہیں جس پر واقفیت دشوار ہو۔ قرآن میں ہے:۔
وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ (۲۶-۱۹۶) اس میں شک نہیں کہ یہ (یعنی اس کی پیشین گوئی) اگلے پیغمبروں کی کتابوں میں موجود ہے۔
وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ (۳-۸۴) اور صحیفے اور روشن کتاب لائے تھے۔
اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ (۵۴-۴۳) یا تمہارے لئے صحیفوں میں معافی (لکھی ہوئی) ہے۔
اور بعض کا قول ہے کہ زبور اس کتاب کا نام ہے جو صرف حِکَم عقلیہ پر مشتمل ہو اور اس میں احکام شرعیہ نہ ہوں۔ اور الکتاب ہر اس کتاب کو کہا جاتا ہے جو احکام و حِکَم دونوں پر مشتمل ہو۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور میں کوئی حکم شرعی نہیں ہے۔
زِئْبِرُ الثَّوْبِ کپڑے کا رواں۔ اسی سے کہا جاتا ہے هَاجَ زِئْبِرُهٗ وہ غصہ سے بھڑک اٹھا۔
اور بڑے کندھوں والے شخص کو زُبْرٌ کہا جاتا ہے۔

(ز ج ج)

اَلزُّجَاجُ ایک قسم کا شفاف پتھر (شیشہ) اس کا مفرد زُجَاجَةٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فِيْ زُجَاجَةٍ ۔ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ (۲۴-۳۵) ایک شیشہ میں ہے (اور) شیشہ گویا چمکتا ہوا تارا ہے۔
اَلزُّجُّ نیزہ کی پچھلی طرف لگا ہوا لوہا۔ جمع زِجَاجٌ اور زَجَجْتُ الرَّجُلَ کے معنی ہیں میں نے اسے نیزہ کی نوک سے مارا۔ اَزْجَجْتُ الرُّمْحَ میں نے نیزہ میں زج لگائی یا اس سے زج کو نکال لیا۔
اَلزَّجَجُ ابرو کی درازی اور باریکی۔ جو نیزہ کی انی کے مشابہ ہو۔
ظَلِیْمٌ اَزَجُّ وَنَعَامَةٌ زَجَّاءُ دراز گام شتر مرغ۔

(ز ج ر)

اَلزَّجْرُ اصل میں آواز کے ساتھ دھتکارنے کو کہتے ہیں زَجَرْتُهٗ میں نے اسے جھڑکا، روکا۔ اِنْزَجَرَ (جھڑکنے پر) کسی کام سے رک جانا۔ یہ زَجَرَ کا مطاوع بن کر استعمال ہوتا ہے قرآن میں ہے:۔
فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ (۷۹-۱۳) اور قیامت تو ایک ڈانٹ ہے۔
پھر کبھی یہ صرف دھتکار دینا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی آواز کیلئے اور آیت کریمہ:۔
فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا (۳۷-۲) میں زاجرات سے مراد وہ فرشتے ہیں جو بادلوں کو ڈانٹ کر چلاتے ہیں اور آیت:۔
مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ (۵۴-۴) جس میں (کافی) تنبیہ ہے۔ میں مُزْدَجَرٌ سے ایسی باتیں مراد ہیں جو ارتکاب معاصی سے روکتی اور سختی سے منع کرتی ہیں اور آیت:۔
وَازْدُجِرَ (۵۴-۹) اور اسے جھڑکیاں دی گئیں۔ کے معنی ہیں ڈانٹ کر نکال دیا گیا یہاں زجر کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ مار بھگانے کے وقت تہدید آمیز کلمات استعمال کئے جاتے ہیں۔ جیسے جا چلا جا دور ہو جا وغیرہ۔

(ز ج و)

اَلتَّزْجِيَةُ کے معنی کسی چیز کو دفع کرنے کے ہیں تاکہ چل پڑے مثلاً پچھلے سوار کا اونٹ کو چلانا یا ہوا

کا بادلوں کو چلانا۔ قرآن میں ہے :۔
یُزْجِیْ سَحَابًا (۲۴-۴۳) (اللہ ہی) بادلوں کو ہنکاتا ہے
یُزْجِیْ لَکُمُ الْفُلْکَ (۱۷-۶۶) جو تمہارے لئے (سمندروں میں) جہازوں کو چلاتا ہے۔
اور اسی سے کہا جاتا ہے۔ رَجُلٌ مُزْجیً ہنکایا ہوا آدمی یعنی کمزور اور ذلیل آدمی۔
اَزْجَیْتُ رَدِیَّ التَّمْرِ میں نے ردی کھجوروں کو دور پھینک دیا اور زَجَا (لازم) اَزْجیٰ کا مطاوع بن کر استعمال ہوتا ہے اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔
زَجَا الْخَرَاجُ (ن) خراج کا سہولت سے جمع ہو جانا۔ اور "خَرَاجٌ زَاجٍ" اس خراج کو کہتے ہیں جو معمولی ہونے کی وجہ سے سہولت سے جمع ہو جائے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

(۲۰۳) وَحَاجَةٍ غَيْرِ مُزْجَاةٍ عَنِ الْحَاجِ
اور حاجت مندوں کی بعض حاجتیں معمولی نہیں ہوتیں کہ انہیں پورا کیا جا سکے۔

(ز ح ز ح)

اَلزَّحْزَحَةُ کے معنی ہیں دور ہٹانا اور پرے طرف کرنا۔ قرآن میں ہے :۔
فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ (۳-۱۸۴) پس جو شخص آگ سے دور رکھا گیا۔

(ز ح ف)

اَلزَّحْفُ اصل میں اس کے معنی پاؤں کو گھسیٹ گھسیٹ کر چلنا کے ہیں جیسا کہ بچہ چلنے کے قابل ہونے سے پہلے اور اونٹ تھکن کی وجہ سے اپنے پاؤں گھسیٹ کر چلتا ہے۔ یا فوج کثرت انبوہ کی وجہ سے آہستہ آہستہ گھسٹ گھسٹ کر آگے بڑھتی ہے۔ قرآن میں ہے :۔
اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا (۸-۱۵) جب کفار سے تمہاری مٹھ بھیڑ ہو جائے۔
اور زَاحِفٌ اس تیر کو کہتے ہیں جو نشانہ سے ورے گر جائے۔

(ز خ ر ف)

اَلزُّخْرُفُ اصل میں اس زینت کو کہتے ہیں جو ملمع سے حاصل ہو اسی سے سونے کو بھی زُخْرُفٌ کہا جاتا ہے کیونکہ یہ زیبائش کے کام آتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔
اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا یہاں تک کہ زمین سبزے سے خوشنما اور آراستہ ہو گئی (۱۰-۲۴)
بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ (۱۷-۹۳) طلائی گھر۔
وَزُخْرُفًا (۴۳-۳۵) اور سونے کے (دروازے)
اور زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا (۶-۱۱۲) کے معنی ہیں "ملمع کی ہوئی باتیں"

(ز ر ب)

اَلزَّرَابِیُّ یہ زِرْبٌ کی جمع ہے جو ایک عمدہ قسم کا کپڑا ہے اور ایک مقام کی طرف منسوب ہے پھر تشبیہ و استعارہ کے طور پر زَرَابِیُّ بمعنی فرش کے بھی آجاتا ہے۔ جیسے فرمایا :۔
وَزَرَابِیُّ مَبْثُوْثَةٌ (۸۸-۱۶) اور بچھائے ہوئے فرش۔
اور زَرْبٌ وَ زَرِيْبَةٌ بکریوں کے باڑہ اور تیر انداز کے چھپنے کی جگہ کو بھی کہتے ہیں۔

(ز ر ع)

اَلزَّرْعُ اس کے اصل معنی اِنْبَات یعنی

اگانے کے ہیں اور یہ کھیتی اگانا در اصل قدرت کا کام
ہے اور انسان کے کسب و ہنر کو اس میں دخل
نہیں ہے اسی بنا پر آیت کریمہ :۔
أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۔ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ
أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ (۵۶-۶۴) بھلا بتاؤ کہ جو تم
بوتے ہو کیا اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔
میں حَرْث (بونا) کی نسبت تو انسان کی طرف کی
ہے مگر زَرْعٌ (اگانے) کی انسان سے نفی کر کے اسے
اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے اور کھیتی اگانے
کے اسباب مثلاً زمین کو تیار کر کے اس میں تخم ریزی
کرنا اور مناسب احتیاطیں برتنا۔ چونکہ انسان سر
انجام دیتا ہے اس لئے مجازاً انسان کی طرف بھی
زَرْع کی نسبت کر دیتے ہیں جیسا کہ أَنْبَتُّ كَذَا
کا محاورہ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ انسان منجملہ اگاتے
کے اسباب سے ہے۔

زَرْعٌ اصل میں مصدر ہے اور اس سے مَزْرُوعٌ
(اسم مفعول) یعنی کھیتی مراد ہوتی ہے جیسے فرمایا :۔
فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا (۳۲-۲۷) پھر ہم اس (پانی)
کے ذریعہ کھیتی نکالتے ہیں۔
وَزُرُوعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيمٍ (۴۴-۲۶) اور کتنی
ہی کھیتیاں اور کتنے ہی عمدہ عمدہ مکانات۔
اور تشبیہ کے طور پر جس طرح انسان کے متعلق أَنْبَتَهُ
اللَّهُ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اسی طرح محاورہ میں
زَرَعَ اللَّهُ وَلَدَكَ (اللہ تمہاری اولاد کو نمو بخشے)
بھی کہہ دیتے ہیں اور مُزْدَرِع بمعنی زَرَّاع یعنی کسان
کے ہے۔ اور اِزْدَرَعَ النَّبَاتُ کے معنی ہیں نباتات بڑھ گئی۔

(ز ر ق)

الزُّرْقَةُ (نیلاہٹ) ایک رنگ جو سپیدی
اور سیاہی کے بین بین ہوتا ہے۔ محاورہ ہے۔
زَرِقَتْ عَيْنُهُ زُرْقَةً وَزَرَقَانًا اس کی آنکھ نیلی
ہوگئی اور آیت کریمہ :۔
زُرْقًا يَتَخَافَتُونَ بَيْنَهُمْ (۲۰-۱۰۲، ۱۰۳)
نیلی آنکھوں والے جو آپس میں آہستہ آہستہ
باتیں کریں گے۔
میں زُرْقًا کے معنی اندھے جن کی آنکھوں میں نور نہ ہو۔
الزُّرَّقُ ایک پرند کا نام ہے (سفید شاہین) محاورہ
ہے۔ زَرَقَ الطَّائِرُ پرند کا بیٹ کرنا اور زَرَقَهُ
بِالْمِزْرَاقِ کے معنی ہیں "اسے چھوٹے نیزہ سے مارا"

(ز ر ی)

زَرَيْتُ عَلَيْهِ کے معنی کسی پر عیب لگانے کے
ہیں اور أَزْرَيْتُ بِهِ یا اِزْدَرَيْتُ (افتعال) کے
معنی ہیں کسی کو حقیر اور بے وقعت گردانتا۔ قرآن
میں ہے :۔
تَزْدَرِي أَعْيُنُكُمْ (۱۱-۳۱) (جنہیں) تمہاری
نظریں حقیر دیکھتی ہیں۔
یہ اصل میں تَزْدَرِيهِمْ أَعْيُنُكُمْ ہے یعنی
اس کا مفعول محذوف ہے اور معنی یہ ہے کہ
تم انہیں نظر حقارت سے دیکھتے ہو۔

(ز ع ق)

الزُّعَاقُ سخت کھاری اور کڑوے پانی
کو کہتے ہیں اور جس کھانے میں حد سے زیادہ نمک
ہو اسے طعام مزعوق کہا جاتا ہے۔
زَعَقَ (ف) بِهِ کے معنی کسی پر چلا کر اسے گھبرا
دینے کے ہیں اور اِنْزَعَقَ (لازم) گھبرا جانا۔
اَلزَّعِقُ بہت چلانے والا

اَلزَّمَّاقُ بہت بلند آواز نکالنے والا۔

(ز ع م)

اَلزَّعْمُ اصل میں ایسی بات نقل کرنے کو کہتے ہیں جس میں جھوٹ کا احتمال ہو اس لئے قرآن پاک میں یہ لفظ ہمیشہ اس موقع پر آیا ہے جہاں کہنے والے کی مذمت مقصود ہے چنانچہ فرمایا:۔
زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا (۶۴-۷) کفار یہ زعم کرتے ہیں۔
بَلْ زَعَمْتُمْ (۱۸-۴۸) مگر تم یہ خیال کرتے ہو۔
كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ (۶-۲۲) (جن کو تم شریک خدائی) سمجھتے تھے۔
زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ (۱۷-۵۶) (جنہیں تم نے اللہ کے سوا (معبود) خیال کیا۔
اور زَعَامَةٌ کے معنی ذمہ داری اٹھانے اور ریاست (سرداری) کے ہیں اور کفیل (ضامن) اور رئیس کو زعیم کہا جاتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں کی بات میں جھوٹ کا احتمال ہو سکتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَاَنَا بِهٖ زَعِيْمٌ (۱۲-۷۲) اور میں اس کا ذمہ دار ہوں۔
اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ (۶۸-۴۰) ان میں سے کون اس کا ذمہ دار ہے۔ یہاں زَعِيْمٌ یا تو زعامہ بمعنی کفالۃ سے ہے اور یا زعم بالقول سے ہے۔

(ز ف ف)

زَفَّ الْاِبِلُ يَزِفُّ زَفًّا وَزَفِيْفًا کے معنی ہیں اونٹ کا تیز چلنا اور اَزَفَّهَا (افعال) کے معنی تیز چلانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ۔ (۳۷-۹۴) وہ اسکی طرف دوڑتے آئے۔
اور ایک قرأت میں يُزِفُّوْنَ (بضم یاء) ہے یعنی وہ اپنے ساتھیوں کو تیز روی پر برانگیختہ کرتے ہیں۔

اصل میں زَفِيْفٌ کے معنی ہوا کے تیز چلنے یا شتر مرغ کے اس قدر تیز چلنے کے ہیں جس میں نیم پرواز پائی جائے۔ کہا جاتا ہے زَفَّ النَّعَامُ شتر مرغ تیز چلا پھر اسی سے استعارہ کے طور زَفَّ الْعَرُوْسَ کہا جاتا ہے۔ یعنی دلہن کو شوہر کے پیش کیا۔ اس میں بھی معنی سرعت ملحوظ ہے مگر اس کا تعلق چلنے سے نہیں ہے بلکہ پیش کرنے والوں کے وفور شوق سے ہے۔

(ز ف ر)

اَلزَّفِيْرُ اس کے اصل معنی سانس کی اس قدر تیزی سے آمد و شد کے ہیں کہ اس سے سینہ پھول جائے۔ قرآن میں ہے:۔
لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ (۱۱-۱۰۶) ان کے لئے اس میں چیخنا ہے۔
اِزْدَفَرَ (افتعال) فُلَانٌ كَذَا کسی چیز کو مشقت سے اٹھانا جس سے سانس پھول جائے۔ اس لئے پانی لانے والی لونڈیوں کو زَوَافِرُ کہا جاتا ہے۔

(ز ق م)

اَلزَّقُّوْمُ تھوہر کا درخت۔ اور آیت کریمہ:۔
اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ (۴۴-۴۳) بیشک سینڈھ کا درخت۔
میں زَقُّوْم سے دوزخ کے کریہ کھانے مراد ہیں۔
اور اس سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔
زَقَمَ فُلَانٌ وَتَزَقَّمَ اس نے کوئی کریہ چیز نگل لی۔

(ز ك و)

اَلزَّكَاةُ اس کے اصل معنی اس نمو (افزونی) کے ہیں جو برکت الٰہیہ سے حاصل ہو اس کا تعلق

دنیاوی چیزوں سے بھی ہے اور اخروی امور کے ساتھ بھی چنانچہ کہا جاتا ہے۔
زکا الزرع یزکو۔ کھیتی کا بڑھنا اور پھلنا پھولنا
اور آیت:۔
أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا (۱۸-۱۹) کس کا کھانا زیادہ صاف ستھرا ہے۔
میں ازکیٰ سے ایسا کھانا مراد ہے جو حلال اور خوش انجام ہو اور اسی سے زکوٰۃ کا لفظ مشتق ہے یعنی وہ حصہ جو مال سے حق الٰہی کے طور پر نکال کر فقراء کو دیا جاتا ہے اور اسے زکوٰۃ یا تو اسلئے کہا جاتا ہے کہ اس میں برکت کی امید ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ اس سے نفس پاکیزہ ہوتا ہے یعنی خیرات و برکات کے ذریعہ اس میں نمو ہوتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے تسمیہ میں ان ہر دو امور کا لحاظ کیا گیا ہو۔ کیونکہ یہ دونوں خوبیاں زکوٰۃ میں موجود ہیں۔
قرآن میں اللہ تعالیٰ نے نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کا بھی حکم دیا ہے چنانچہ فرمایا:۔
وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ (۲-۴۳) نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔
اور تزکیہ نفس سے ہی انسان دنیا میں اوصاف حمیدہ کا مستحق ہوتا ہے اور آخرت میں اجر و ثواب بھی اسی کی بدولت حاصل ہوگا اور تزکیہ نفس کا طریق یہ ہے کہ انسان ان باتوں کی کوشش میں لگ جائے جن سے طہارت نفس حاصل ہوتی ہے اور فعل تزکیہ کی نسبت کبھی تو انسان کی طرف کی جاتی ہے کیونکہ وہ اس کا اکتساب کرتا ہے جیسے فرمایا:۔
قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا (۹۱-۹) کہ جس نے اپنی روح کو پاک کیا (وہ ضرور اپنی) مراد کو پہنچا۔
اور کبھی یہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتا ہے کیونکہ فی الحقیقت وہی اس کا فاعل ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ (۴-۴۹) بلکہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے۔
اور کبھی اس کی نسبت نبی کی طرف ہوتی ہے کیونکہ وہ لوگوں کو ان باتوں کی تعلیم دیتا ہے جن سے تزکیہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا (۹-۱۰۳) کہ اس سے تم ان کو (ظاہر میں بھی) پاک اور (باطن میں بھی) پاکیزہ کرتے رہو۔
يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيهِمْ (۲-۱۵۱) وہ پیغمبر انہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور انہیں بذریعہ تعلیم (اخلاق رذیلہ) سے پاک کرتا ہے:۔
اور کبھی اس کی نسبت عبادت کی طرف ہوتی ہے کیونکہ عبادت تزکیہ کے حاصل کرنے میں بمنزلہ آلہ کے ہے چنانچہ یحیٰی علیہ السلام کے متعلق فرمایا:۔
وَحَنَانًا مِنْ لَدُنَّا وَزَكَاةً (۱۹-۱۳) اور اپنی جناب سے رحمدلی اور پاکیزگی دی تھی۔
لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا (۱۹-۱۹) تاکہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا بخشوں۔
یعنی وہ فطرتاً پاکیزہ ہوگا اور فطرتی پاکیزگی جیسا کہ بیان کر چکے ہیں۔ بطریق اجتباء حاصل ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو عالم اور پاکیزہ اخلاق بنا دیتا ہے اور یہ پاکیزگی تعلیم و ممارست سے نہیں بلکہ محض توفیق الٰہی سے حاصل ہوتی ہے جیسا کہ اکثر انبیاء اور رسل کے ساتھ ہوا ہے۔
اور آیت کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ لڑکا آئندہ چل کر پاکیزہ اخلاق ہوگا لہذا زکیا کا تعلق زمانہ حال کے ساتھ نہیں بلکہ استقبال کے ساتھ ہے۔
قرآن میں ہے:۔

وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِلزَّکٰوةِ فٰعِلُوۡنَ (۲۳-۴) اور وہ جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں۔
یعنی وہ عبادت اس غرض سے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں پاک کر دے یا وہ اپنے نفوس کو پاک کرنے کی غرض سے عبادت کرتے ہیں وَالۡمَآلُ وَاحِدٌ لہٰذا لِلزَّکٰوةِ میں لام تعلیل کے لئے ہے جسے لام علت و قصد کہتے ہیں اور لام تعدیہ نہیں ہے حتی کہ یہ فٰعِلُوۡنَ کا مفعول ہو۔
انسان کے تزکیہ نفس کی دو صورتیں ہیں ایک تزکیہ بالفعل یعنی اچھے اعمال کے ذریعہ اپنے نفس کی اصلاح کرنا یہ طریق محمود ہے چنانچہ آیت کریمہ:۔
قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَکّٰهَا (۹۱-۹) اور آیت:۔
قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی۔ (۸۷-۱۴) میں تزکیہ سے یہی مراد ہیں۔ دوسرے تزکیہ بالقول ہے جیسا کہ ایک ثقہ شخص دوسرے کے اچھے ہونیکی شہادت دیتا ہے۔ اگر انسان خود اپنے اچھا ہونے کا دعوےٰ کرے اور خودستائی سے کام لے تو یہ مذموم ہے اور اللہ تعالےٰ نے اس قسم کے تزکیہ سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔
لَا تُزَکُّوۡۤا اَنۡفُسَکُمۡ (۵۳-۳۲) اپنے آپ کو پاک نہ ٹھہراؤ۔
اور یہ نہی تادیبی ہے کیونکہ انسان کا اپنے منہ آپ میاں مٹھو بننا نہ تو عقلاً ہی درست ہے اور نہ ہی شرعاً یہی وجہ ہے کہ جب ایک دانش مند سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی بات ہے جو باوجود حق ہونے کے زیب نہیں دیتی تو اس نے جواب دیا۔ مَدۡحُ الۡاِنۡسَانِ نَفۡسَهٗ کہ خودستائی کرنا۔

(ز ل ل)

اَلزَّلَّةُ کے اصل معنی بلا قصد کے قدم پھسل جانے کے ہیں کہا جاتا ہے:۔ زَلَّتۡ (ض) رِجۡلُهٗ تَزِلُّ اور پھسلنے کی جگہ کو زَلَّةٌ کہا جاتا ہے نیز جو گناہ بلا قصد سرزد ہو جائے اسے بھی بطور تشبیہ زَلَّةٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَاِنۡ زَلَلۡتُمۡ (۲-۲۰۹) اگر تم لغزش کھا جاؤ۔
فَاَزَلَّهُمَا الشَّیۡطٰنُ۔ (۲-۳۶) انہیں شیطان نے پھسلا دیا۔
اِسۡتَزَلَّهٗ (استفعال) کسی کو پھسلانے کا قصد و ارادہ کرنا اور آیت کریمہ:۔
اِنَّمَا اسۡتَزَلَّهُمُ الشَّیۡطٰنُ۔ (۳-۱۵۴) شیطان نے انہیں پھسلا دیا۔
کے معنی یہ ہیں کہ شیطان انہیں آہستہ آہستہ پھسلانے کی کوشش کرتا رہا حتی کہ وہ پھسل گئے کیونکہ جب انسان صغائر میں بے پرواہی سے کام لیتا ہے تو وہ شیطان کے تسلط کے لئے راستہ ہموار کرتا ہے۔ حدیث میں ہے۔[1] (۱۶۶)
مَنۡ اُزِلَّتۡ اِلَیۡهِ نِعۡمَةٌ فَلۡیَشۡکُرۡهَا کہ جسے بلا طلب نعمت مل جائے اسے منعم کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔
جس سے مفہوم ہوتا ہے کہ جب بلا قصد نعمت حاصل ہونے پر شکر گزاری لازم ہے تو جو احسان کسی کے قصد اور ارادہ سے ہو اس کا شکریہ بالاولیٰ ضروری ہے۔
اَلتَّزَلۡزُلُ اس کے معنی اضطراب کے ہیں اور

---

[1] فی الفائق مرفوعا (۱: ۳۶۸) وفی غریب ابی عبید (۱: ۵۱) مب۔ عن یحیی بن عبد اللہ بن صیفی مرسلا بلفظ من اولیت الیہ ومن انزلت قال ابو عبید لیس ذا لمحفوظ وفی ابن عساکر عنہ مرسلا من ازلفت الیہ ید یا ارجع کنز العمال ۶: رقم ۱۹۸۸، ۱۹۹۲ ☆ ☆ ☆

اس میں تکرار حروف تکرار معنی پر دال ہے قرآن میں ہے:۔
اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (۹۹-۱) جب زمین بڑے زور سے ہلائی جائے گی۔
اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی (سخت) مصیبت ہوگی۔
وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا (۳۳-۱۱) اور وہ (دشمنوں کے رعب سے) خوب ہی جھڑ جھڑائے گئے۔

(ز ل ف)

اَلزُّلْفَةُ اس کے معنی قرب اور مرتبہ کے ہیں چنانچہ آیت:۔
فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً (۶۷-۲۷) سو جب وہ قریب دیکھیں گے۔
کے بعض نے یہ معنی کئے ہیں کہ جب وہ مومنین کے مراتب قرب کو دیکھیں گے اور وہ خود ان سے محروم ہوں گے اور بعض نے کہا ہے کہ یہاں زُلْفَةً سے عذاب کا قرب مراد ہے اور عذاب کو زُلْفَةً کہنا حالانکہ یہ مراتب محمودہ میں استعمال ہوتا ہے، بطور تہکم ہے جیسا کہ عذاب کے متعلق بشارت یا اس قسم کے دوسرے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔
اور منازل لیل یعنی رات کے حصوں کو بھی زُلَفٌ کہا گیا ہے جیسے فرمایا:۔
وَزُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ (۱۱-۱۱۴) اور رات کے کچھ حصوں میں۔
شاعر نے کہا ہے[1] (رجز)

(۲۰۴) طَیَّ اللَّیَالِیْ زُلَفًا فَزُلَفًا
اور راتوں کا تھوڑا تھوڑا کرکے گزرنا۔
اَلزُّلْفٰی۔ قرب و مرتبہ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی (۳۹-۳) کہ خدا کے ہم کو قریب کردیں۔
وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِیْنَ (۲۶-۹۰)[a] اور بہشت پرہیزگاروں کے قریب لائی جائے گی۔
اور لَیْلَةُ الْمُزْدَلِفَةِ کو اس نام سے اس لئے پکارتے ہیں کہ حجاج عرفات سے لوٹنے کے بعد اس رات منیٰ کے قریب پہنچ جاتے ہیں اور حدیث میں ہے[2] (۱۶۷) اِزْدَلِفُوْا اِلَی اللّٰهِ بِرَكْعَتَیْنِ کہ دو رکعت نماز سے اللہ کا قرب حاصل کرو۔

(ز ل ق)

زَلَقٌ اور زَلَلٌ تقریباً ہم معنی ہیں۔
قرآن میں ہے:۔
صَعِیْدًا زَلَقًا (۱۸-۴۰) صاف میدان۔
یعنی چکنی زمین جس میں کوئی سبزہ نہ ہو جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا۔
(۲-۲۶۴) اسے سپاٹ کرکے بہا گیا۔
اَلْمَزْلَقُ پھسلنے کی جگہ۔ اور آیت کریمہ:۔
لَیُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ (۶۸-۵۱) اپنے نظروں سے (گھور کر) تجھے تیرے مکان سے پھسلا دیں۔

---

[1] وقبلہ: ناج طواہ الاین ہمًّا وجفا وشاتہ، سماوۃ الہلال حتی احقوقفا۔ والشطر من ارجوزۃ للعجاج راجع اراجیز العرب للسید البکری
[2] ۲ھ وفی مجاز القرآن لابی عبیدۃ (۱: ۳۰۰) والطبری (۱۹: ۸۱) والکامل ۱۲۹/۲، ۸۲۴ فی ثلاثۃ اشطار وادب الکتاب للصولی ۱۲۲ والصحاح والتاج واللسان (زلف) والزمخشری (۱: ۸۰) ودیوانہ ۸۴ والکتاب (۱: ۱۵۰) والبحر (۱: ۸۳) وابن خالویہ ۹۸ والعینی (۱: ۲۹) [2] وفی النہایہ (زلف) فی حدیث مصعب بن عمیر ذا زالت الشمس فازدلف الی اللہ برکعتین واخطب فیہا ای تقرب ۱۲

میں ابصار کے متعلق زَلَقَ کا لفظ مجازاً استعمال ہوا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1]۔ (الکامل)

(۲-۵) نَظَرٌ يُزِيلُ مَوَاضِعَ الْاَقْدَامِ

ایسی نظر جو قدموں کو ان کی جگہ سے پھسلا دے۔

کہا جاتا ہے زَلَقَهُ وَاَزْلَقَهُ اسے پھسلایا فَزَلِقَ۔ چنانچہ پھسل گیا۔

یونس لغوی کا قول ہے کہ زَلَقَ اور اَزْلَقَ کا یہ محاورہ صرف قرآن میں استعمال ہوا ہے اور ابی بن کعب نے اَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ میں ازلقنا (قاف کے ساتھ) پڑھا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے وہاں دوسرے لوگوں کو لاکر ہلاک کر ڈالا۔

(ز م ر)

زُمْرَةٌ کے معنی چھوٹی سی جماعت کے ہیں

اس کی جمع زُمَرٌ ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا (۳۹-۷۳) اور جنہوں نے اپنے رب کا تقویٰ اختیار کیا وہ بہشت کی طرف گروہ گروہ کرکے چلے جائیں گے۔

اور اسی سے شَاةٌ زَمِرَةٌ ہے جس کے معنی کم اُون والی بھیڑ کے ہیں اور بے مروت آدمی کو زَمِرٌ کہا جاتا ہے اور زَمَرَتِ النَّعَامَةُ تَزْمِرُ زِمَارًا کے معنی ہیں شتر مرغ نے سیٹی بجائی اور اسی سے کنایہ کے طور پر فاجرہ عورت کو زَمَّارَةٌ وزَمَّارَةٌ کہا جاتا ہے[2]۔

(ز م ل)

يٰۤاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ (۷۳-۱) اے اوڑھنے والے۔

تو مُزَّمِّلٌ اصل میں مُتَزَمِّلٌ ہے جس کے معنی کپڑے میں لپٹنے کے ہیں اور استعارہ کے طور پر سستی اور کوتاہی کرنے والے کو بھی تعریضاً مُزَّمِّلٌ کہا جاتا ہے اسی سے زُمَّيْلٌ ہے جس کے معنی کمزور اور ناتواں کے ہیں تأبط شرا کے متعلق اس کی والدہ نے کہا ہے[3]۔

لَيْسَ بِزُمَّيْلٍ شَرُوْبٍ لِلْقَيْلِ

کہ وہ کمزور اور ناتواں نہیں ہے کہ دوپہر کے وقت دودھ پینے کی ضرورت ہو۔

(ز ن م)

اَلزَّنِيْمُ یا مُزَنَّمٌ اسے کہتے ہیں جو کسی قوم سے نسبی تعلق تو نہ رکھتا ہو لیکن اس کے ساتھ یونہی ملحق ہو جیسے زَنَمَتَا الشَّاةِ یعنی گوشت کے وہ زائد ٹکڑے جو بکری کے گلے یا کان سے نیچے لٹک رہے ہوتے ہیں قرآن میں ہے:

عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ (۶۸-۱۳) سخت جھگڑالو اس کے علاوہ بدذات بھی۔

اور زَنِيْمٌ اس غلام کو بھی کہتے ہیں جو کسی قوم کی طرف منسوب ہو یعنی زَلَمَةٌ یا زَنَمَةٌ کی طرح

---

[1] وفی اللسان انشد ابواسحاق راجع (زلق. قرض) وقد مر تخریجاتی (دحض) والبیت فی المعانی للقتیبی ۵۸۵، ۱۱۲۹ و المشاحبین ۱۸۲ والطبری (۲۸: ۳۷)، ۱۲ [2] وفی الحدیث نہی النبی صلی اللہ علیہ وسلم عن کسب الزمارۃ وہی التی تزمر او الزانیۃ وراجع غریب ابی عبید (۱: ۱۴۴) والفائق (۱: ۵۳۹) [3] ترثیہ انظر المعانی فی الکبیر ۱۲۳ وفیہ وفی اللسان رثاھا وابناہ، وابن اللیل۔ لیس بزمیل شروب للقیل، کمقرب الخیل۔ ترید بابن اللیل انہ صاحب غارات والقیل اللبن الذی یشرب وقت القیلولۃ ای نوم الظہیرۃ والفعل منہ قال واقتال ای لیس ہو شروب للقیل مہیانا وقیق الخصر یحتاج الی الشرب نصف النہار وفی المطبوع الفیل مکان القیل والتصحیح من اللسان (زمل) ۱۲

لٹک رہا ہو (حقیقت ان سے نہ ہو) شاعر نے کہا ہے [1] (الطویل)

(۲۰۷) فَاَنْتَ زَنِیْمٌ نِیْطَ فِیْ اٰلِ ھَاشِمٍ
کَمَا نِیْطَ خَلْفَ الرَّاکِبِ الْقَدَحُ الْفَرْدُ

اور تو حرام زادہ ہے جو آل ہاشم کے ساتھ اس طرح معلق ہے جیسے لکڑی کا خالی پیالہ سوار کے پیچھے لٹک رہا ہوتا ہے۔

(ز ن ی)

اَلزِّنَا عقد شرعی کے بغیر کسی عورت سے ہم بستری کرنے کا نام زنا ہے۔ یہ اسم مقصور ہے اگر اسے ممدود پڑھا جائے تو باب مفاعلۃ کا مصدر بھی ہو سکتا ہے اور اس کی طرف نسبت کی صورت زَنَوِیٌّ کہا جائے گا اور فلاں لِزِنْیَۃٍ (بکسرہ زا و فتح آں) کے معنی ہیں فلاں حرام زادہ ہے۔

قرآن میں ہے:

اَلزَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَا یَنْکِحُھَا اِلَّا زَانٍ (۲۴-۳) زانی مرد سوائے زانیہ یا مشرکہ عورت کے کسی سے نکاح نہیں کرتا اور فاجرہ عورت سوائے فاجرہ کے کسی دوسرے سے نکاح نہیں کرتی۔

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ (۲۴-۲) زانیہ عورت اور زانی مرد۔

اور اگر مہموز اللام سے ہو جیسے زَنَاَ فِی الْجَبَلِ زَنْاً وَّزُنُوْءً۔ تو اس کے معنی پہاڑ پر چڑھنے کے ہوتے ہیں۔

اَلزَّنَاءُ۔ حاقن یعنی پیشاب روکنے والے کو کہتے ہیں۔ حدیث میں ہے [2] (۱۶۸) لَا یُصَلِّیْ الرَّجُلُ وَھُوَ زَنَاءٌ۔ کہ آدمی کو چاہیئے کہ حاقن ہونے کی صورت میں نماز نہ پڑھے۔

(ز ھ د)

اَلزَّھِیْدُ کے معنی حقیر چیز کے ہیں اور کسی چیز سے بے رغبتی کرنے والے یا حقیر سی چیز پر راضی ہو جانے والے کو زَاھِدٌ فِی الشَّیْءِ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:

وَکَانُوْا فِیْہِ مِنَ الزَّاھِدِیْنَ (۱۲-۲۰) اور اس کے بارہ میں وہ بے رغبت تھے۔

(ز ھ ق)

زَھَقَتْ نَفْسُہٗ کے معنی ہیں کسی چیز پر رنج و غم سے اس کی جان نکل گئی۔ قرآن میں ہے:

وَتَزْھَقَ اَنْفُسُھُمْ (۹-۵۵) اور ان کی جانیں (اس حال میں) نکلیں۔

(ز ی ت)

زَیْتٌ وَزَیْتُوْنَۃٌ مثل شَجَرٍ وشَجَرَۃٍ ایک مشہور درخت کا نام ہے۔ قرآن میں ہے:

زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ (۲۴-۳۵) زیتون کے درخت سے روشن ہو رہا ہے۔ جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی۔

اَلزَّیْتُ زیتون کے تیل کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:

یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ (۲۴-۳۵) قریب ہے کہ اس کا تیل روشنی کرے۔

---

[1] قالہ حسان بن ثابت یہجو ابا سفیان بن الحارث بن عبد المطلب من شواہد الکشاف ۳۸ و دیوانہ ۵۹ والبحر ۵: ۳۰۵) والحصری (۱: ۹۳) واللسان (زنم)، وذیوانت والمرزوقی ۴۵۰ [2] الحدیث فی اللسان (زنا)، الفائق ۱: ۲۷ و راجع لسان و ذیلہ المرتضی (۲: ۲۸۵-۲۸۶) و غریب ابی عبید (۱: ۱۴۹)

اور زَاتَ طَعَامَہٗ کے معنی ہیں اس نے طعام میں زیتون کا تیل ڈالا جیسے مَتَنَہٗ اور دَھَنَہٗ بِہٖ کیطرح زَاتَ رَاْسَہٗ کا محاورہ بھی استعمال ہوتا جس کے معنی ہیں (اس نے سر میں تیل لگایا اور (اِزْدَاتَ بمعنی اِدَّھَنَ کے ہیں۔

(ز و ج)

اَلزَّوْجُ جن حیوانات میں نر اور مادہ پایا جاتا ہے ان میں سے ہر ایک دوسرے کا زوج کہلاتا ہے یعنی نر اور مادہ دونوں میں سے ہر ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ حیوانات کے علاوہ دوسری اشیائیں سے جفت کو زَوْجٌ کہا جاتا ہے جیسے موزے اور جوتے وغیرہ پھر ہر اس چیز کو جو دوسری کی مماثل یا مقابل ہونے کی حیثیت سے اس سے مقترن ہو وہ اس کا زوج کہلاتی ہے۔ قرآن میں ہے: وَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى (۷۵-۳۹) اور (آخر کار) اس کی دو قسمیں کیں (یعنی) مرد اور عورت۔
وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ (۲-۳۵) (تو) اور تیری بی بی جنت میں رہو۔
اور بیوی کو زَوْجَةٌ (تا) کے ساتھ کہنا عامی لغت ہے اس کی جمع زوجات آتی ہے شاعر نے کہا ہے[1]

(۲۰۸) فَبَكَا بَنَاتِي شَجْوَهُنَّ وَزَوْجَتِي

تو میری بیوی اور بیٹیاں غم سے رونے لگیں۔
اور زَوْجٌ کی جمع اَزْوَاجٌ آتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے: هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ (۳۶-۵۶) وہ اور انکے جوڑے۔
اور آیت:

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ (۳۷-۲۲) جو لوگ (دنیا میں) نافرمانیاں کرتے رہے ہیں ان کو اور ان کے ساتھیوں کو (ایک جگہ) اکٹھا کر دو۔
میں ازواج سے ان کے وہ ساتھی مراد ہیں جو فعل میں ان کی اقتداء کیا کرتے تھے اور آیت کریمہ:
اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا (۲۰-۱۳۱) اس کی طرف جو مختلف قسم کے لوگوں کو ہم نے (دنیاوی سامان) دے رکھے ہیں۔
اشباہ و اقران یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ مراد ہیں اور آیت:
سُبْحَانَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ (۳۶-۳۶) پاک ہے وہ ذات جس نے (ہر قسم کی) چیزیں پیدا کیں۔ نیز:
وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (۵۱-۴۹) اور تمام چیزیں ہم نے دو قسم کی بنائیں۔
میں اس بات پر تنبیہ کی ہے۔ کہ تمام چیزیں جوہر ہوں یا عرض مادہ و صورت سے مرکب ہیں اور ہر چیز اپنی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے بتا رہی ہے کہ اسے کسی نے بنایا ہے اور اس کے لئے صانع (بنانے والا) کا ہونا ضروری ہے نیز تنبیہ کی ہے کہ ذات باری تعالیٰ ہی فرد مطلق ہے اور اس (خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ) لفظ سے واضح ہوتا ہے کہ روئے عالم کی تمام چیزیں زوج ہیں اس حیثیت سے کہ ان میں سے ہر ایک چیز کی ہم مثل یا مقابل پائی جاتی ہے یا یہ کہ اس میں ترکیب پائی جاتی ہے۔ بلکہ نفس ترکیب سے تو کوئی چیز بھی منفک نہیں ہے۔ پھر ہر چیز کو زوجین کہنے سے اس بات پر

---

[1] قاله عبدة بن الطبيب التيمي والبيت من كلمة مفضلية رقم ۲۷ في ۲۰ بيتا. صح فيها بنيه حين كبر و نماه: ۔ والاقربون الي ثم تصدعوا۔ والبيت في اضداد ابن الانباري ج ۳ والمخصص (۱۷: ۳۴) واضداد ابي الطيب ۔ ۳۴

تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اگر کسی چیز کی ضد یا مثل نہیں ہے تو وہ کم از کم جوہر اور عرض سے ضرور مرکب ہے لہٰذا ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر زوجین ہے۔ اور آیت:۔ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی (۲۰-۵۳) طرح طرح کی مختلف روئیدگیاں۔

میں ازواج سے مختلف انواع مراد ہیں جو ایک دوسری سے ملتی جلتی ہوں اور یہی معنی آیت:۔

مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ (۳۱-۱۰) ہر قسم کی عمدہ چیزیں (اگائیں)

اور آیت کریمہ:۔ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (۶-۱۴۴) (نر اور مادہ) آٹھ قسم کے پیدا کئے ہیں۔ میں مراد ہیں اور آیت کریمہ:۔

كُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً (۵۶-۷) میں اَزْوَاجٌ کے معنی ہیں قُرَنَاءُ یعنی امثال و نظائر یعنی تم تین گروہ ہو جو ایک دوسرے کے قرین ہو چنانچہ اس کے بعد اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ سے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (۸۱-۷) اور جب لوگ باہم ملا دیئے جائیں گے۔

میں بعض نے زُوِّجَتْ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ہر پیروکار کو اس کے پیشوا کے ساتھ جنت یا دوزخ میں اکٹھا کر دیا جائیگا۔ جیسا کہ آیت:۔ اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ (۳۷-۲۲) میں مذکور ہو چکا ہے اور بعض نے آیت کے معنی یہ کئے ہیں کہ اس روز روحوں کو ان کے جسموں کے ساتھ ملا دیا جائیگا جیسا کہ آیت:۔ يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً (۸۹-۲۷،۲۸)

اے اطمینان پانے والی جان اپنے رب کی طرف لوٹ آ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔

میں بعض نے رَبِّكِ کے معنی صَاحِبِكِ یعنی بدن ہی کئے ہیں اور بعض کے نزدیک زُوِّجَتْ سے مراد یہ ہے کہ نفوس کو ان کے اعمال کے ساتھ جمع کر دیا جائیگا جیسا کہ آیت کریمہ:۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ..... (۳-۳۰) جب کہ ہر شخص اپنے اچھے اور برے عملوں کو اپنے سامنے حاضر اور موجود پائیگا۔

میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔ زَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (۵۲-۲۰) اور ہم انہیں حورعین کا ساتھی بنا دیں گے۔

میں زَوَّجْنٰهُمْ کے معنی باہم ساتھی اور رفیق بنا دینا ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں بھی حور کے ساتھ اس فعل (زَوَّجْنَا) کا ذکر کیا ہے وہاں اس کے بعد باء لائی گئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ حوروں کے ساتھ محض رفاقت ہوگی جنسی میل جول اور ازدواجی تعلقات نہیں ہوں گے کیونکہ اگر یہ مفہوم مراد ہوتا تو قرآن بِحُوْرٍ کی بجائے زَوَّجْنٰهُمْ حُوْرًا کہتا جیسا کہ زَوَّجْتُهٗ امْرَاَةً کا محاورہ ہے یعنی میں نے اس عورت سے اس کا نکاح کر دیا۔[1]

(ز و د)

اَلزَّادُ موجودہ ضرورت سے زائد اندوختہ کو کہتے ہیں اور اَلتَّزَوُّدُ (تفعل) کے معنی توشہ لینا ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] ہذا مذہب البریونس وابوعبیدۃ من علماء العربیۃ قال الواحدی والتنزیل یدل علی ما قال یونس (راجع الغرر ۲-۲۵۴) وفی البخاری: زوجنا بحور ای انکحناہم قال فی الفتح (۷-۲۵۵) وتعقب بان زوّج لا یتعدی بالباء۔ وفیہ نظر لان صاحب المحکم حکاہ لکن قال انہ قلیل واللہ اعلم۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى (۲-۱۹۷)

اور زاد راہ ساتھ لے جاؤ بے شک بہترین توشہ سوال سے بچنا ہے۔

اور اَلْمِزْوَدُ اس توشہ دان کو کہتے ہیں جس میں کھانا رکھا جاتا ہے اور اَلْمَزَادَۃُ مشکیزہ جس میں پانی بطور زاد راہ رکھا جاتا ہے۔

(ز و ر)

اَلزَّوْرُ سینہ کا بالائی حصہ اور زُرْتُ فُلَانًا کے معنی ہیں میں نے اپنا سینہ اس کے سامنے کیا یا اس کے سینہ کا قصد کیا (اس کی ملاقات کی) جیسا کہ وَجَهْتُهٗ کا محاورہ ہے یعنی اس کے سامنے اپنا چہرہ کیا یا اس کے چہرہ کا قصد کیا۔ رَجُلٌ زَائِرٌ ملاقاتی زَائِرٌ کی جمع زَوْرٌ آتی ہے جیسا کہ سَافِرٌ کی جمع سَفْرٌ مگر کبھی رَجُلٌ زَوْرٌ بھی آجاتا ہے اس صورت میں یہ مقصد ہوتا ہے جیسا کہ ضَعْفٌ کا لفظ ہے نیز اَلزَّوْرُ کے معنی سینہ کے ایک طرف جھکا ہونا کے ہیں اور جس کے سینہ میں ٹیڑھا پن ہو اسے اَلْاَزْوَرُ کہتے ہیں اور آیت کریمہ:- تَزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ (۱۸-۱۷) کے معنی یہ ہیں کہ سورج ان کے غار سے ایک طرف کو ہٹ کر نکل جاتا ہے یہاں تَزَاوَرُ میں حرف زاء پر تشدید بھی پڑھی جاتی ہے اور بغیر تشدید کے بھی[1] اور بعض نے تَزْوَرُّ وزن افعلال پڑھا ہے[2] مگر الحسن فرماتے ہیں یہ قراءت یہاں موزوں نہیں ہے کیونکہ اِزْوِرَارٌ کے معنی ہیں منقبض ہونا کہا جاتا ہے تَزَاوَرَ عَنْهُ وَ ازْوَرَّ عَنْهُ اس نے اس سے پہلو تہی کی۔ اس سے ایک جانب ہٹ گیا اور جس کنویں کی کھدائی میں ٹیڑھا پن ہو اسے بِئْرٌ زَوْرَاءُ کہا جاتا ہے۔ اسی سے جھوٹ کو اَلزُّوْرُ کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی جہت راست سے ہٹا ہوا ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:-

ظُلْمًا وَّزُوْرًا (۲۵-۴) ظلم اور جھوٹ سے۔

قَوْلَ الزُّوْرِ (۲۲-۳۰) جھوٹی بات سے۔

مِنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا (۵۸-۲) اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔

لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (۲۵-۷۲) وہ جھوٹی شہادت نہیں دیتے۔

اور شاعر کے قول۔

(۲۰۹) وَجَاءُوْا بِزُوْرٍ رَيِّهِمْ مَجْنُنَا بِالْاَمْ[3]

وہ اپنے دو جھوٹے خدا لے کر آگئے اور ہم اپنے بہادر سردار کو؛

میں زَوْرٌ کے معنی بت کے ہیں[4] کیونکہ بت پرستی بھی جھوٹ اور حق سے ہٹ جانے کا نام ہے۔

---

[1] بالتشدید قراءۃ الحرمین وابی عمرو بالتخفیف قراءۃ الکوفیین والاعمش وطلحۃ وابن ابی لیلیٰ وا ما تزوّر فھی قراءۃ قتادۃ وابن ابی اسحاق وابن عامر و فیہ قراءۃ اخریٰ ای تزاوار علی خشال حمار تروی قراءۃ ابی رجاء وایوب السختیانی وابن ابی عبلۃ وجابر وقراءۃ ابن مسعود راجع ابی حیان (۶: ۱۰۷-۱۰۸) [2] الرجز للاغلب العجلی قالہ فی الزوبین حرب کانت بین بکر و بین بنی تمیم والاصم لقب عمرو بن قیس بن عامر الشیبانی رئیس بکر بن وائل یومئذ یعنی بزوریھم بکر بن مجالین قد قیدوھا دعالوا الیہا ان زورا تا ای الاعتماد لعدہ: شیخ لنا قد کان من عہدارم۔ وفی المطبوع نسہ بینھم مصحف والرجز فی الامالی (۲: ۱۸۰) والسمط ۸۰۱ والعقد (۳: ۳۴۴) (۵: ۲۰۰) وایام العرب ۳۴۱ والحماسۃ وابن الشجری ۱۳۸ واللسان والتاج (زور، اصم) وفیہ عن ابی عبیدۃ وارجوزۃ لیحیی بن منصور راجع ابدال ابی الطیب (۲: ۹۹) وابدال یعقوب ۴۵ وشرح السبع لابن الانباری ۲۹۴ وفی روایۃ لبنیھم وزرا والغالث؛ قد کرم الشیخ تفاہ وکرم والاغلب العجلی (م ۲۱ھ) راجز جاہلی اسلامی احد المعمرین واستشہد فی وقعۃ نہاوند انظر المؤتلف ۲۳ والخزانۃ البغدادیۃ (۱: ۳۳۳) والاعلام للزرکلی (۱: ۳۳۹) ۱۲

زول

زَالَ الشَّیْءُ یَزُوْلُ زَوَالاً کسی چیز کا اپنا صحیح رخ چھوڑ کر ایک جانب مائل ہو جانا، اپنی جگہ سے ہٹ جانا اور اَزَلْتُہٗ وَ زَوَّلْتُہٗ کے معنی ہیں ایک جانب مائل کر دینا کسی چیز کو اس کی جگہ سے ہٹا دینا۔ قرآن میں ہے:۔

اَنْ تَزُوْلَا (۳۵-۴۱) کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں
وَلَئِنْ زَالَتَا (۳۵-۴۱) اگر وہ ٹل جائیں۔
لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ (۱۴-۴۶) کہ اس سے پہاڑ ہی اپنی جگہ سے ٹل جائیں۔

ز ی د

اَلزِّیَادَۃُ اس اضافہ کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے پورا ہونے کے بعد بڑھایا جائے چنانچہ کہا جاتا ہے۔ زِدْتُہٗ میں نے اسے بڑھایا فَازْدَادَ چنانچہ وہ بڑھ گیا اور آیت:۔

وَنَزْدَادُ کَیْلَ بَعِیْرٍ (۱۲-۶۵) اور (اس کے حصہ کا) ایک بار شتر غلہ اور لیں گے۔

میں نَزْدَادُ فعل متعدی نہیں ہے حتیٰ کہ کَیْلَ بَعِیْرٍ کو اس کا مفعول کہا جائیگا بلکہ یہ اِزْدَدْتُّ فَضْلًا کی طرح ہے جس کے معنی فضل میں زیادہ ہونے کے ہیں اور یہ باب سَفِہَ نَفْسَہٗ کے قبیل سے ہے۔

اور زیادہ (زیادتی) کبھی مذموم ہوتی ہے۔ یعنی کسی چیز کا ضرورت سے زیادہ ہونا مثلاً انگلیوں اور جانور کی ٹانگ میں زیادتی اور اسی طرح جگر میں جو گوشت کا زائد ٹکڑا پایا جاتا ہے، وہ چونکہ کسا یا نہیں جاتا اس لئے اسے زائد اور بے فائدہ سمجھا جاتا ہے۔ اور کبھی زیادتی محمود ہوتی ہے جیسے فرمایا:۔

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ (۱۰-۲۶) جو نیکی کرتے ہیں ان کیلئے نیک بدلہ ہے اور بڑھ کر

کئی طرق سے مروی ہے (۱۶۹) کہ یہاں زیادہ سے نظر الی وجہ اللہ مراد ہے اور اس سے ان انعامات اور احوال کی طرف اشارہ ہے جن کا اس زندگی میں ہم تصور بھی نہیں کر سکتے[1]۔ اور آیت

وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲-۲۴۷) اور علم وجسم میں اسے زیادہ کشائش بخشی۔

میں زیادہ سے مراد یہ ہے کہ وہ علم و جسم میں اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتے ہیں۔ نیز فرمایا:۔

وَیَزِیْدُ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اھْتَدَوْا ھُدًی (۱۹-۷۶) اور اللہ ان کو روز بروز زیادہ ہدایت دیتا چلا جاتا ہے۔

اور مذموم زیادتی کے متعلق فرمایا:۔

مَا زَادَھُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (۳۵-۴۲) ان کی نفرت میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔

زِدْنٰھُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ (۱۶-۸۸) اور ہم ان کے حق میں عذاب پر عذاب بڑھاتے جائیں گے۔

فَمَا تَزِیْدُوْنَنِیْ غَیْرَ تَخْسِیْرٍ (۱۱-۶۳) تو تم میرا اور نقصان ہی کر رہے ہو۔

اور آیت کریمہ:۔

فَزَادَھُمُ اللّٰہُ مَرَضًا (۲-۱۰) سو اللہ نے ان کے مرض میں اور اضافہ کر دیا۔

میں مرض کے بڑھنے سے مراد یہ ہے کہ انسان کی سرشت کچھ ایسی ہے کہ جب وہ کوئی برا یا اچھا فعل سرانجام دیتا ہے تو جوں جوں اس فعل کو

---

[1] قال ابن کثیر (۲:۴۱۴) فی تفسیرہ وھذا ھو المروی عن السلف والخلف وقد وردت فیہ احادیث کثیرۃ عن السلف۔

سرانجام دیتا رہتا ہے توں توں اس فعل کا ملکہ اس میں قوی ہوتا رہتا ہے۔ اور آیت:۔
هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ (۵۰-۳۰) کیا کچھ اور ہے؟۔ میں طلب زیادہ بھی مراد ہو سکتی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں دوزخ کے بھر جانے پر تنبیہ ہو اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جو دوزخ سے وعدہ کیا ہے کہ۔
لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ۔ (۱۱-۱۱۹) کہ ہم (کیا) جنات اور (کیا) بنی آدم سب سے دوزخ بھر دیں گے
وہ پورا ہو کر رہے گا اور زِدْتُہٗ فعل متعدی ہے اور زَادَ بمعنی اِزْدَادَ (لازم) بھی آیا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَازْدَادُوْا تِسْعًا (۱۸-۲۵) اور نو دو برس اس کے اوپر) اور رہیں۔
ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا (۳-۹۰) پھر وہ کفر میں (اور) بڑھ گئے
وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ (۱۳-۸) اور نیز (ہر ماہ کے) پیٹ کا گھٹنا اور بڑھنا) اور شَتَّى زَائِدٌ وَزَيْدٌ دونوں طرح کہا جاتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۲۱۰) وَاَنْتُمُوْا مَعْشَرٌ زَيْدٌ عَلٰى مِائَةٍ
فَاَجْمِعُوْا اَمْرَكُمْ كَيْدًا فَكِيْدُوْنِيْ

اور تم سو سے زیادہ آدمی ہو تو تم میرے خلاف جو تدبیر کر سکتے ہو کر و۔

(ز ی غ)

اَلزَّيْغُ کے معنی حالت استقامت سے ایک جانب مائل ہو جانا کے ہیں اور اَلتَّزَايُغُ کے معنی تَمَايُلٌ یعنی بہت زیادہ مائل ہو جانا یا ایک دوسرے سے مائل ہونا رَجُلٌ زَائِغٌ مائل ہونے والا۔ اس کی جمع زَاغَةٌ وَزَائِغُوْنَ آتی ہے۔ زَاغَتِ الشَّمْسُ سورج مائل بزوال ہو گیا زَاغَ الْبَصَرُ نگاہ نے غلطی کی ایک طرف ہٹ گئی۔ اور آیت کریمہ:۔
وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ (۳۳-۱۰) کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ خوف وہراس کی وجہ سے انہیں کچھ نظر نہیں آئے گا اور یہ بھی کہ آیت:۔
يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ (۳-۱۳) کے ہم معنی ہو یعنی نگاہیں صحیح طور پر کسی چیز کا ادراک نہیں کر سکیں گی۔ نیز فرمایا:۔
مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى (۵۳-۱۷) نظر نہ تو حقیقت سے ایک طرف ہٹی اور نہ ہی اس نے حد سے تجاوز کیا۔
مِنْ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ (۹-۱۱۷) اس کے بعد کہ ..... پھر جانے کو تھے۔
اور آیت کریمہ:۔ فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (۶۱-۵) کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ از خود صحیح راہ سے ہٹ گئے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دلوں کو اسی طرف جھکا دیا۔

---

[1] قالہ ذو الاصبع العدوانی واسمہ حرثان بن محرث وفی الصحاح (زید) طرأ بدل کیدا وفی المفضلیات (۱: ۱۷۱) لحا ابوطی ... الامالی (۱: ۲۵۳) فلا الحی ... بدلہ۔ والبیت فی اللسان (زید) والحکم دعشرا ھو من قصید تہ مفضلیۃ ۳۶ والبیت ۲۹ القصیدۃ یتھاجہا فی الامالی (۱: ۲۵۲-۲۵۴) والکامل ۵۰ وفیہ کیدکم بدل امرکم وانظر القصیدۃ فنتھی الطلب (۱: ۱۹۶-۱۸۷) والاغانی (۳: ۸-۱۰) والشعراء ۶۳۶-۶۳۸ و البیت فی الکتاب والحماسۃ لابن الشجری ۱۷ والخزانۃ (۳: ۲۲۶) والعینی (۳: ۲۸۷) والمرتضی ۲ ۲۵ ولترجمۃ الشاعر راجع الاشتقاق ۱۶۳ والمعمرین ۹۰ والشعراء (۸-۲۹۰) والخزانۃ (۲: ۲۰۶-۲۰۹)

ز ی ل

زَالَهُ يَزِيلُهُ زَيْلًا کے معنی کسی چیز کو اس کی جگہ سے زائل کرنا کے ہیں شاعر نے کہا ہے (الکامل)

(۲۱۱) " زَالَ زَوَالُهَا "

کہ اللہ تعالیٰ محبوبہ کے خیال کو میرے دل سے زائل کر دے۔ اور زَوَالُ کے معنی التصرف یعنی پھرنا بھی آتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اَسْكَتَ اللّٰهُ نَامَتَهُ کی طرح محاورہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی آواز کو ختم کر دیا۔ اور یہی معنی زَيَّلَ ذَوِيلَهُ کے ہیں شاعر نے کہا ہے (الطویل)

(۲۱۲) " اِذَا مَا رَأَتْنَا زَالَ مِنْهَا زَوِيلُهَا "

جب وہ ہمیں دیکھتی ہے تو بدک کر بھاگ جاتی ہے اور جن کے نزدیک زال متعدی نہیں ہے وہ شعر اول میں زَوَالَهَا کو منسوب علی المصدر مانتے ہیں یعنی مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

تَزَيَّلُوْا وہ متفرق ہو گئے۔ قرآن میں ہے: لَوْ تَزَيَّلُوْا (۴۸-۲۵) اگر وہ الگ الگ ہو جاتے۔

اور آیت: فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ (۱۰-۲۸) پھر ہم ان میں جدائی ڈال دیں گے۔

میں اگر زِلْتُهُ کو متعدی کہا جائے تو باب تفعیل تکثیر کے لئے ہوگا یعنی بالکل الگ الگ کر دینا جیسے مَزَّتُهُ وَمَيَّزْتُهُ اور مَا زَالَ اور لَا يَزَالُ ہمیشہ حرف نفی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور یہ كَانَ فعل ناقص کی طرح اپنے اسم کو رفع اور خبر کو نصب دیتے ہیں اور اصل میں یہ اجوف یائی ہیں کیونکہ عربی زبان میں زَيَّلْتُ (تفعیل) یا کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور مَا زَالَ کے معنی ہیں مَا بَرِحَ یعنی وہ ہمیشہ ایسا کرتا رہا چنانچہ قرآن میں ہے: وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ (۱۱-۱۱۸) وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمْ (۹-۱۱۰) وہ عمارت ہمیشہ (ان کے دلوں میں باعث اضطراب بنی) رہیگی۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۲۲-۵۵) کافر لوگ ہمیشہ ...... رہیں گے۔

مَا زِلْتُمْ فِيْ شَكٍّ (۴۰-۳۴) تم برابر شبہ میں رہے۔

اور محاورہ میں مَا زَالَ زَيْدٌ اِلَّا مُنْطَلِقًا کہنا صحیح نہیں ہے جیسا کہ مَا كَانَ زَيْدٌ اِلَّا مُنْطَلِقًا کہا جاتا ہے کیونکہ زَالَ میں ثَبَتَ کی ضد ہونے کی وجہ سے نفی کے معنی پائے جاتے ہیں اور "مَا" و "لَا" بھی حروف نفی سے ہیں اور نفی کی نفی اثبات ہوتا ہے لہٰذا مَا زَالَ ثبت ہونے میں كَانَ کی طرح ہے تو جس طرح كَانَ زَيْدٌ اِلَّا مُنْطَلِقًا کی ترکیب صحیح نہیں ہے اس طرح مَا زَالَ زَيْدٌ اِلَّا مُنْطَلِقًا

---

[1] قطعة من عجز البيت قاله الاعشى وتكملته: هذا النهار بدا لها من همها - ما بالها بالليل زال زوالها. والبيت من قصيدة يمدح فيها قيس بن معديكرب مطلعها: رحلت سمية غدوة اجمالها. غضبى عليك فما تقول بدا لها: ديوانه: ۱۵ - ۴ م ۱۵ اللسان (زول) مثل للعرب قديم واختلف في اى زوالها منصوب اللام او مرفوعها ومن رواه برفع اللام زوالها) قال فيه اقواء راجع اللسان (قوى) وفي ذيل الامالي ۵۷ يقال: زال زوالا وزيل زويله (دعاء) اى ذهب ثبات.

[2] قاله ذوالرمة يصف بيضة وصدره: وبيضاء لا تنحاش منا وامها ... وفي رواية الشنافر (زول، حوش، زيل) زيل منها بدل زال منها ومعناه ذعرت منا ولفرت والبيت في ديوانه ۵۴۵ والخصائص لابن الانباري ۲۷۷ ولغا لسنى (۱: ۲۰۷) والاضداد لابى الطيب ۱/۳۲۲ والحيوان (۵: ۲۵۷) والمعاني القتبي ۲۵۵ والتاج (۱: ۸۲ / ۱۵۷) وفي كل المراجع زيل منها بدل زال منها ولكلا الروايتين محمل وان كان الاول اكثر ولم يرد الثاني سوى المؤلف

بھی صحیح نہیں ہوگا۔

(ز ی ن)

اَلزِّیْنَۃُ زینت حقیقی وہ ہوتی ہے جو انسان کے لئے کسی حالت میں بھی معیوب نہ ہو یعنی نہ دنیا میں اور نہ ہی عقبٰی میں اور وہ چیز جو ایک حیثیت سے موجب زینت ہو لیکن دوسری حیثیت سے موجب زینت نہ ہو وہ زینت حقیقی نہیں ہوتی بلکہ اسے صرف ایک پہلو کے اعتبار سے زینت کہہ سکتے ہیں اور اجمالاً زینت کے تین اقسام ہیں۔

(۱) زینت نفسی جیسے علم اور اعتقادات حسنہ جو نفس انسانی کے لئے باعث آرائش بنتے ہیں۔

(۲) زینت بدنی۔ جیسے قوت اور طول قامت وغیرہ چیزیں جو جسم کے لئے خوبصورتی کا سبب بنتی ہیں۔

(۳) زینت خارجیہ جیسے مال وجاہ وغیرہ جو انسان کیلئے باعث زینت بنتے ہیں لہٰذا آیت کریمہ:۔

حَبَّبَ اِلَیْکُمُ الْاِیْمَانَ وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (۴۹-۷) خدا نے تمہیں ایمان کی محبت دے دی اور اس کو تمہارے دلوں میں عمدہ کر دکھایا۔

میں زینت سے نفسانی زینت مراد ہے اور آیت کریمہ:۔

مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ (۷-۳۲) (ان سے پوچھو کہ) اللہ نے جو زینت (کے ساز وسامان پیدا کئے ہیں) ان کو کس نے حرام کیا ہے۔

کو بعض نے زینت خارجی پر محمول کیا ہے جیسا کہ مروی ہے کہ کچھ لوگ برہنہ ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے تو اس آیت کے ذریعہ انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا گیا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ آیت مذکورہ میں زِیْنَۃَ اللّٰہِ سے وہ کرم مراد ہے جس کا ذکر کہ آیت:۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ (۴۹-۱۳) اور تم میں بڑا شریف تو وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔ میں پایا جاتا ہے چنانچہ اسی معنی میں شاعر نے کہا ہے:

(۲۱۳) وَزِیْنَۃُ الْمَرْءِ حُسْنُ الْاَدَبِ

کہ حسن ادب ہی انسان کے لئے باعث زینت بن سکتا ہے اور آیت:۔

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِہٖ فِیْ زِیْنَتِہٖ (۲۸-۷۹) الغرض (ایک دن قارون) اپنے ترک سے اپنی قوم کے سامنے نکلا۔

میں مال وجاہ اور ساز وسامان وغیرہ دنیوی زینت مراد ہے زَانَہٗ کَذَا اور زَیَّنَہٗ کے معنی کسی چیز کے حسن کو ظاہر کرنے کے ہیں۔ بالفعل آراستہ کر کے یا بذریعہ قول کے (جیسے کسی چیز کو لوگوں کی نظر میں بھلا کر کے دکھانا) اور اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعدد مقامات پہ تزیین کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے مگر بعض آیات میں اسے شیطان کی منسوب کیا گیا ہے اور بعض مواقع میں بغیر نسبت کے فعل مجہول کی صورت میں لایا گیا ہے چنانچہ اپنی ذات کی طرف منسوب کرتے ہوئے ایمان کے متعلق فرمایا:۔

وَزَیَّنَہٗ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (۴۹-۷) اور اس (ایمان) کو تمہارے دلوں میں عمدہ کر دکھایا۔

اور کفار کے متعلق فرمایا:۔

زَیَّنَّا لَہُمْ اَعْمَالَہُمْ (۲۷-۴) ہم نے ان کے اعمال کو ان کے لئے عمدہ کر دکھایا۔

زَیَّنَّا لِکُلِّ اُمَّۃٍ عَمَلَہُمْ (۶-۱۰۸) اور ہم نے ہر امت کے لئے ان کا عمل اچھا کر دکھایا۔

اور شیطان کی طرف نسبت کرتے ہوئے فرمایا:۔

وَاِذْ زَیَّنَ لَہُمُ الشَّیْطٰنُ اَعْمَالَہُمْ (۲۳-۱۶

اور شیطان نے ان لوگوں کے اعمال بد ان کو اچھے کر دکھائے۔

لَاُزَیِّنَنَّ لَہُمْ فِی الْاَرْضِ (۱۵-۳۹) میں ان...

---

[1] راجع ابن کثیر [2] مراعدہ

و ساز و سامان۔ زندگی کو) انہیں عمدہ کر دکھاؤں گا۔
اور بغیر نسبت کے فعل مجہول کی صورت میں فرمایا:۔
زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ (۳-۱۳) (طبعی طور پر) لوگوں کو (دنیا کی) مرغوب چیزوں کے ساتھ وابستگی بھلی معلوم ہوتی ہے۔
زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ (۹-۳۷) ان کی بدکرداریاں ان کو بھلی کر کے دکھائی گئیں۔
زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا (۲-۲۱۳)
جو لوگ دین حق کے منکر ہیں دنیا کی زندگی انہیں عمدہ کر دکھائی گئی۔

اور آیت کریمہ:۔
زُيِّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ (۶-۳۷) اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے شریکوں نے ان کے بچوں کو جان سے مار ڈالنا اچھا کر دکھایا ہے۔

میں زُيِّنَ اصل میں زَيَّنَهٗ شُرَكَاؤُهُمْ ہے
اور آیات زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ (۶۷-۵)
ہم نے آسمان دنیا کو ستاروں سے زینت دی۔
إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ (۳۷-۶)
اور ہم ہی نے آسمان دنیا کو (ایک) زینت یعنی ستاروں سے آراستہ کیا۔
وَزَيَّنَّاهَا لِلنَّاظِرِينَ (۱۵-۱۶) اور ہم نے دیکھنے والوں کے لئے اسے خوبصورت بنایا۔
میں اس زینت کیطرف اشارہ ہے جسکا تعلق حاسۂ بصر سے ہے اور جسے عوام و خواص محسوس کرتے ہیں۔ نیز اس میں زینت معنوی یعنی ستاروں کی رفتار انکے احکام کیطرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے جسکی معرفت خواص کو حاصل ہو سکتی ہے پھر اللہ تعالیٰ کا اشیاء کو زینت بخشنا تکوین و ابداع سے ہوتا ہے یعنی انکو آراستہ حالت میں پیدا کرنا اور لوگوں کا کسی چیز کو زینت بخشنا یا تو ملمع سازی سے ہوتا ہے اور یا بذریعہ قول کے یعنی کسی چیز کی تعریف کرنا اور اسے خوشنما صورت میں پیش کرنا۔

کِتَابُ السِّیْن

(س ء ل)

اَلسُّؤْلُ. دراصل اس حاجت کو کہتے ہیں جس پر نفس حریص ہو قرآن میں ہے:۔
قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَكَ یٰمُوْسٰی (۲۰-۳۶) موسیٰ تمہاری دعا قبول کرلی گئی۔ اور یہ سُؤْل وہی ہے جس کا تذکرہ آیت:۔
رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ (الآیۃ) میں ہے۔
اَلسُّؤْلُ اور اَلْاُمْنِیَّۃُ کے قریب قریب ایک ہی معنی ہیں لیکن امنیۃ کا لفظ اس خواہش پر بولا جاتا ہے جو تا حال انسان کے دل میں ہو اور اس کا اظہار نہ کیا ہو لیکن سُؤْل اس حاجت کو کہتے ہیں جو طلب بھی کی جاچکی ہو تو گویا سُؤْل کا درجہ امنیۃ کے بعد کا ہے۔

(س ب ب)

اَلسَّبَبُ اصل میں اس رسی کو کہتے ہیں جس سے درخت خرما وغیرہ پر چڑھا (اور اس سے اترا) جاتا ہے اس کی جمع اسباب ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَلْیَرْتَقُوْا فِی الْاَسْبَابِ (۳۸-۱۰) تو ان کو چاہیئے کہ سیڑھیاں لگا کر (آسمان پر) چڑھیں۔ اور یہ معنوی لحاظ سے آیت:۔
اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ یَّسْتَمِعُوْنَ فِیْهِ (۵۲-۳۸) یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے کہ اس پر چڑھ کر (آسمان سے باتیں) سن آتے ہیں۔ کے مضمون کی طرف اشارہ ہے۔ پھر اسی مناسبت سے ہر اس شے کو سَبَبٌ کہا جاتا ہے۔ جو دوسری شے تک رسائی کا ذریعہ بنتی ہو۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَاٰتَیْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا فَاَتْبَعَ سَبَبًا (۱۸=۸۴-۸۵) اور اسے ہر قسم کے ذرائع بخشے سو وہ ایک راہ پر چلا۔
مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہر چیز کی معرفت اور سامان و ذرائع عطا کئے تھے جس کے ذریعہ وہ اپنے مقصود تک پہنچ سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک ذریعہ اختیار کیا اور آیت کریمہ:۔
لَعَلِّیْ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ۔ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ (۴۰:۳۶-۳۷) تاکہ جو آسمان تک پہنچنے کے ذرائع ہیں ہم ان تک جا پہنچیں۔
میں بھی اسباب سے مراد ذرائع ہی ہیں یعنی تاکہ ہم ان اسباب و ذرائع کا پتہ لگائیں جو آسمان میں پائے جاتے ہیں اور ان سے موسیٰ (علیہ السلام) کے مزعومہ خدا کے متعلق معلومات حاصل کریں اور عمامہ، دوپٹہ اور ہر لمبے کپڑے کو طول میں رسی کے ساتھ تشبیہ دے کر بھی سَبَبٌ کہا جاتا ہے اسی

جہت سے شاہراہ کو بھی سَبَبٌ کہہ دیا جاتا ہے جیسا کہ شاہراہ کو بھی خَیْطٌ (تاگا) اور کبھی محدود کپڑے کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

اَلتَّسَبُّبُ (مصدر ن) کے معنی مغلظات اور فحش گالی دینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (۶-۱۰۹) تو جو لوگ خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو حاجت روائی کے لئے بلایا یعنی ان کی پرستش کیا کرتے ہیں ان کو برا نہ کہو کہ یہ لوگ بھی ازراہ نادانی ناحق خدا کو برا کہہ بیٹھیں گے۔

ان کے اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ صریح الفاظ میں اللہ تعالیٰ کو گالیاں دیں گے۔ کیونکہ اس طرح تو کوئی مشرک بھی نہیں کرتا بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ جوش میں آکر شان الٰہی میں گستاخی کریں گے اور ایسے الفاظ استعمال کریں گے جو اس کی ذات کے شایان شان نہیں جیسا کہ عام طور پر مجادلہ کے وقت ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے[۱]۔

فَمَا كَانَ ذَنْبُ بَنِيْ مَالِكٍ
بِاَنْ سُبَّ مِنْهُمْ غُلَامٌ فَسَبَّ

بِاَبْيَضَ ذِيْ شَطَبٍ قَاطِعٍ
يَقُدُّ الْعِظَامَ وَيَبْرِي الْقَصَبْ

بنی مالک کا صرف اتنا گناہ ہے کہ ان میں سے ایک لڑکے کو بخل پر عار دلائی گئی اور اس نے عار کے جواب میں سفید دھاری دار قاطع تلوار سے اپنی موٹی اونٹنیوں کو ذبح کر ڈالا جو ہڈیوں کو کاٹ ڈالتی ہو اور اور قصب یعنی بانس کو تراش دیتی ہو ان اشعار میں اس مضمون کی طرف اشارہ ہے جس کو دوسرے شاعر نے یوں ادا کیا ہے کہ[۲]

نَشْتِمُ بِالْاَفْعَالِ لَا بِالتَّكَلُّمِ

کہ ہم زبان کی بجائے افعال سے گالی دیتے ہیں۔

اور سِبٌّ (فِعْلٌ) بمعنی دشنام دہندہ کیلئے آتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[۳]۔

لَا تَسُبَّنَّنِيْ فَلَسْتَ بِسِبِّيْ
اِنَّ سِبِّيْ مِنَ الرِّجَالِ الْكَرِيْمُ

مجھے گالی نہ دو۔ تم مجھے گالی دینے کے لائق نہیں ہو کیونکہ نہایت شریف درجہ کا آدمی ہی مجھے گالی دے سکتا ہے۔

اَلسُّبَّةُ ہر وہ چیز جو عار و ننگ کی موجب ہو اور کنایہ کے طور پر دبر کو بھی سُبَّةٌ کہا جاتا ہے۔

---

[۱] قالہ ذوالخرق الطہوری واسمہ قرط یتعصب لغالب بن صعصعۃ ابی الفرزدق وکان بینہ وبین سحیم بن وثیل الریاحی معاقرۃ یوم صوءر (موضع قریب من الکوفۃ) واختلفت الروایات فی القصیدۃ راجع الخبر والاختلاف فی ذیل الامالی ۵۲-۴۵ والسمط ۴۷-۴۷۶ والابیات مقیدۃ القافیۃ فی اللسان (سب) والنقائض ۷۰-۱۰ والامالی (۲: ۱۱۴) والمؤتلف للآمدی ۱۲۷ وایام العرب ۱۴۰-۴۰۴ وفی روایۃ بنی عامر بدل بنی مالک وہو وہم نبہ علیہ ابن درید والازہری ورد البکری فی التنبیہ راجع ایضا المعانی للقتبی ۱۰۸۷ والمحکم (عقر) والثانی من الابیات: عراقیب کوم طوال الذری۔ تخر بوا رکھا للرکب ۱۲ [۲] قالہ معبد بن علقمۃ یخاطب زہیرا واولہ: وتجہل ایدینا ویحلم رأینا۔ والبیت من کلمۃ فی الحماسۃ رواہ التبریزی (۲: ۹۱) وفی السمط (۱: ۴۳۴) فی ثلاثۃ والتنبیہ للبکری ۴۵ وفی العیون (۱: ۲۸۴) والشطر منسوب لایاس بن قتادۃ وعجزہ فیہ: تعاقب ایدینا ویحلم رأینا والبیت فی المصنون (۸۳) والصناعتین ۴۰ [۳] البیت فی اصلاح یعقوب ۶۴ (دار المعارف ۱۳۷۵ھ) ولم ینسبہ التبریزی فی تہذیبہ ۲۱ وہو لعبدالرحمان بن حسان یہجو مسکینا الدارمی قالی والسب الذی یسابک ۱۲

جیساکہ اسے سَوْءَۃٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
اَلسَّبَّابَۃُ انگشت شہادت یعنی انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی کیونکہ گالی دیتے وقت اس کے ساتھ اشارہ کیا جاتا ہے جیساکہ اس انگلی کو مُسَبِّحَۃٌ (انگشت شہادت) کہا جاتا ہے۔ چونکہ تسبیح کے وقت اشارہ کے لئے اسے اوپر اٹھایا جاتا ہے۔

(س ب ت)

اَلسَّبْتُ کے اصل معنی قطع کرنے کے ہیں اور اسی سے کہا جاتا ہے سَبَتَ السَّیْرَ اس نے تسمہ کو قطع کیا۔ سَبَتَ شَعْرَہٗ اس نے اپنے بال مونڈے سَبَتَ اَنْفَہٗ اس کی ناک کاٹ ڈالی۔
بعض نے کہا ہے کہ ہفتہ کے دن کو یَوْمَ السَّبْتِ اس لئے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی تخلیق اتوار کے دن شروع کی تھی اور چھ دن میں تخلیق عالم فرما کر سنیچر کے دن اسے ختم کر دیا تھا اسی سے سَبَتَ فُلَانٌ ہے جس کے معنی ہیں وہ ہفتہ کے دن میں داخل ہوا۔ اور آیت کریمہ :۔
یَوْمَ سَبْتِہِمْ شُرَّعًا (۷-۱۶۳) سنیچر کے دن (مچھلیاں) سینہ سپر ہو کر ان کے سامنے آجاتیں۔ میں بعض نے یَوْمَ سَبْتِہِمْ سے ان کے کاروبار کو چھوڑنے کا دن مراد لیا ہے اس اعتبار سے یَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ کے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز وہ کاروبار نہ چھوڑتے اور بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ جس روز سنیچر نہ ہوتا ان ہر دو معنی کا مآل ایک ہی ہے اور آیت :۔
اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ (۱۶-۱۲۴) میں سبت سے مراد سنیچر کے دن ترک عمل کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ سنیچر کے دن کام کاج چھوڑنے کا حکم صرف اس لئے دیا گیا تھا..... اور آیت :۔
وَجَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا (۷۸-۹) اور نیند کو (موجب) راحت بنایا۔ میں سبات کے معنی ہیں حرکت وعمل کو چھوڑ کر آرام کرنا اور یہ رات کی اس صفت کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت :۔
لِتَسْکُنُوْا فِیْہِ (۱۰-۶۷) تاکہ تم رات میں راحت کرو۔ میں مذکور ہے یعنی رات کو راحت وسکون کے لئے بنایا ہے۔

(س ب ح)

اَلسَّبْحُ اس کے اصل معنی پانی یا ہوا میں تیز رفتاری سے گزر جانے کے ہیں سَبَحَ (ف) سَبْحًا وَسِبَاحَۃً وہ تیز رفتاری سے چلا پھر استعارۃً یہ لفظ فلک میں نجوم کی گردش اور تیز رفتاری کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے فرمایا :۔
کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَسْبَحُوْنَ۔ (۲۱-۳۳) (سب اپنے اپنے) فلک یعنی دائرے میں تیزی کے ساتھ چل رہے ہیں۔
اور گھوڑے کی تیز رفتاری پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے فرمایا :۔
وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا (۷۹-۳) اور فرشتوں کی قسم جو آسمان وزمین کے درمیان تیرتے پھرتے ہیں۔
اور کسی کام کو سرعت کے ساتھ کر گزرنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے فرمایا :۔
اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا (۷۳-۷) اور دن کے وقت تو تم بہت مشغول کار رہتے ہو۔
اَلتَّسْبِیْحُ کے معنی تنزیہ الٰہی بیان کرنے کے ہیں اصل میں اس کے معنی عبادت الٰہی میں تیزی کرنا کے ہیں..... پھر اس کا استعمال ہر فعل خیر پہ

ہونے لگا ہے جیسا کہ اِبْعَاد کا لفظ شر پر بولا جاتا
ہے کہا جاتا ہے اَبْعَدَكَ اللّٰہُ خدا اسے ہلاک کرے۔
پس تسبیح کا لفظ قولی فعلی اور قلبی ہر قسم کی عبادت پر
بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
فَلَوْلَا اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِيْنَ (۳۷-۱۴۳)
تو اگر یونس علیہ السلام اس وقت (خدا کی) تسبیح (و
تقدیس) کرنے والوں میں نہ ہوتے۔
یہاں بعض نے مُسَبِّحِیْنَ کے معنی مُصَلِّیْنَ کئے
ہیں لیکن انسب یہ ہے کہ اسے تینوں قسم کی
عبادت پر محمول کیا جائے۔
وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (۲-۳۰) اور ہم تیری
حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔
وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ (۳-۴۱) اور صبح و
شام (اسی کی) تسبیح و تقدیس کرتے رہنا۔
فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (۵۰-۴۰) (اور رات
میں بھی) اس کی تسبیح و تقدیس) کرو اور نمازوں
کے بعد بھی۔
لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ (۶۸-۲۸) یعنی اس کی عبادت
اور شکر گزاری کیوں نہیں کرتے ہو۔
بعض نے اسے استثنا کے معنی پر حمل کیا ہے یعنی
تم انشاء اللہ کیوں نہیں کہتے اور اس کی دلیل آیت
اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ
(۶۸-۱۷) ہے یعنی انہوں نے قسمیں کھائیں کہ صبح
ہوتے ہی پھل کاٹ لیں گے اور استثنا نہ کیا۔
اور آیت کریمہ:۔
تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَ
مَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ
وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (۱۷-۴۴)
ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ (فرشتے اور آدمی) آسمان
و زمین میں ہیں (سب) اس کی تسبیح (و تقدیس) کرتے
ہیں اور (جتنی چیزیں ہیں سب) اس کی حمد (و ثنا) کے
ساتھ اس کی تسبیح (و تقدیس) کر رہی ہیں مگر تم
لوگ ان کی تسبیح (و تقدیس) کو نہیں سمجھتے۔
میں تسبیح کے وہی معنی مراد ہیں جو کہ آیت کریمہ:۔
وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
طَوْعًا وَّكَرْهًا (۱۳-۱۵) اور جس قدر مخلوق
آسمان و زمین میں ہے (سب) چار و نا چار اللہ
ہی کے آگے سربسجود ہے۔
اور آیت:۔
وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ
مِنْ دَآبَّةٍ (۱۶-۴۹) اور جتنی چیزیں آسمانوں
اور جتنی جاندار چیزیں زمین میں ہیں (سب) اللہ ہی
کے آگے سربسجود ہیں۔
میں سجدہ کے ہیں یعنی تسبیح کے حقیقی معنی مراد ہیں،
جیسا کہ سجدہ کے ہیں مگر ان کا ادراک
ہماری سمجھ سے بالاتر ہے جیسا کہ آیت:۔
وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ کے استدراک
اور آسمان و زمین کے ذکر کے بعد وَمَنْ فِيْهِنَّ
کے عطف سے معلوم ہوتا ہے اور بعض نے
اس کی تقدیر یہ بیان کی ہے۔
يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَيَسْجُدُ لَهٗ
مَنْ فِي الْاَرْضِ مگر یہ صحیح نہیں ہے اولاً تو
اس لئے کہ مَنْ (یعنی ذوالعقول) کی تسبیح کو ہم
سمجھتے ہیں اور قرآن نے وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ
کہا ہے اور ثانیاً اس لئے کہ بعد میں وَمَنْ فِيْهِنَّ
عطف کے ساتھ مذکور ہے پھر اگر شروع آیت
میں بھی مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ کی تقدیر کو مان لیا جائے
(جیسا کہ بعض نے کہا ہے) تو اس عطف کا کوئی معنی)

ہونا لازم آتا ہے (لہٰذا صحیح یہ ہے کہ سب اشیاء (بشمول آسمان وزمین) کی تسبیح اور سجود کو حقیقی معنی پر محمول کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ یہ سب چیزیں حق تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہیں اور اس کے سامنے سربسجود رہتی ہیں لیکن بعض تسخیری طور پر اور بعض اپنے اختیار اور ارادہ سے[1] اور یہ بات تو بلا اختلاف سبھی مانتے ہیں کہ آسمان وزمین اور دواب جانوروں کی تسبیح تسخیری ہے یعنی انکے احوال اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ پر دال ہیں۔ البتہ اختلاف اس میں ہے کہ آیا آسمان وزمین تسبیح بالاختیار کرتے ہیں؟ تو آیت اسی معنی کی مقتضی ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔

سُبْحَانٌ یہ اصل میں غُفْرَانٌ کی طرح مصدر ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَسُبْحَانَ اللّٰہِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ (۳۰-۱۷) سو جس وقت تم لوگوں کو شام ہو اللہ کی تسبیح بیان کرو۔
سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا تو پاک (ذات) ہے ہم کو کچھ معلوم نہیں۔ شاعر نے کہا ہے[1]۔ (سریع)

(۲۱۸) سُبْحَانَ مِنْ عَلْقَمَةَ الْفَاخِرِ

سبحان اللہ! علقمہ بھی فخر کرتا ہے۔
بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں سُبْحَانَ عَلْقَمَةَ ہے اس میں مِنْ معنی اضافت کو ظاہر کرنے کے لئے زائد ہے اور علقمۃ کی طرف سبحان کی اضافت بطور تہکم ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ اصل میں "سُبْحَانَ اللّٰہِ مِنْ اَجْلِ عَلْقَمَةَ" ہے اس صورت میں اس کا مضاف الیہ محذوف ہوگا۔
السُّبُّوْحُ الْقُدُّوْسُ یہ اسماء حسنیٰ سے ہے اور عربی زبان میں فُعُّوْلٌ کے وزن پر صرف یہ دو کلمے ہی آتے ہیں اور ان کو فاء کلمہ کی فتح کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے جیسے کَلُّوْبٌ وَسَمُّوْدٌ
السُّبْحَةُ بمعنی تسبیح ہے اور اُن منکوں کو بھی سُبْحَةٌ کہا جاتا ہے جن پر تسبیح پڑھی جاتی ہے۔

(س ب خ)

اَلسَّبْخُ کے معنی وسعت کے ہیں اور آیت:۔
اِنَّ لَكَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا (۷۳-۷) کہ تیرے لئے دن میں بڑا مشغلہ ہے۔ میں ایک قرأت سَبْخًا بھی ہے۔
سَبَخَ اللّٰہُ عَنْہُ الْحُمّٰی اللہ نے اس کا بخار ہلکا کر دیا۔
اَلسَّبِیْخُ پرندکے پر اور دھنکی ہوئی روئی وغیرہ کو کہا جاتا ہے جن میں اکتنانا ور ثقل نہیں ہوتا۔

(س ب ط)

اَلسَّبْطُ اس کا اصل معنی سہولت کے ساتھ کسی چیز کا منبسط ہونا ہیں اور سَبِطَ (س) سُبُوْطًا وَسَبَاطَةً وَسَبَاطًا کے معنی بالوں کے سیدھا اور دراز ہونے کے ہیں اور سیدھے بالوں کو جن میں گھنگٹ نہ ہو سَبِطٌ یا سَبْطٌ کہا جاتا ہے۔
اسی طرح خوش قامت عورت کو بھی سَبِطَةٌ

---

[1] قالہ الاعشیٰ فی ہجو علقمۃ وصدرہ: اقول لما جاءنی فخرہ۔ انظر الخبر وترجمۃ الشاعر فی الاغانی (۵۱ و ۵) والخزانۃ (۲: ۲۴۴-۴۴) والبیت فی دیوانہ ۰۷ والجمہرۃ (۱: ۲۲۹) والنشمری (۱: ۱۴۳) ومجاز القرآن قم ۳۲ واللسان والتاج والاساس والحکم (سبح)، والسمط (۱: ۵۵) والقرطبی (۱: ۲۷۹) والطبری (۱: ۲۱۱) والصحاح (سبح)، وغریب القرآن للقتبی ۸ وعلقمۃ ہو علقمۃ بن علاثۃ صحابی قدم علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہو شیخ فاسلم و بایع وروی حدیثا واحدا واستعملہ عمر بن الخطاب علی حوران فمات بہا والبیت فی مجالس ثعلب (۱: ۲۱۶) وامالی الشجری (۲: ۲۵۰) وابن خالویہ ۴۵۔

کہا جاتا ہے اور دراز کف دست آدمی کو مَبْسُوطُ الْکَفَّیْنِ کہتے ہیں اور یہ سخاوت سے کنایہ ہوتا ہے۔

اَلسِّبْطُ اس کے معنی اولاد کی اولاد یعنی پوتے اور نواسے کے ہیں گویا اس میں فروع کے امتداد کے معنی پائے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ (۲-۱۴۰) اور حضرت یعقوب اور ان کی اولاد۔

یہاں اسباط سے مراد قبائل ہیں۔ ہر قبیلہ ایک شخص کی اولاد سے تھا۔ جیسے فرمایا:۔

اَسْبَاطًا اُمَمًا (۷-۱۶۰) (الگ الگ) بارہ قبیلے بنا دیئے

اَلسَّابَاطُ وہ مسقف راستہ جو دو مکانوں کے درمیان ہو۔ اور اَخَذَتْ فُلَانًا سُبَاطٌ کے معنی ہیں فلاں کو بخار چڑھ گیا۔ مثل مشہور ہے[1] (مثل)

اَلسُّبَاطَةُ خَیْرٌ مِنْ قُمَامَةٍ کہ خاک روبہ کوڑے سے بہتر ہے۔

سَبَطَتِ النَّاقَةُ وَلَدَهَا اونٹنی نے ناتمام بچہ گرادیا۔

(س ب ع)

اَلسَّبْعُ اصل میں "سَبْعٌ" سات کے عدد کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (۲-۲۹) سات آسمان۔ سَبْعًا شِدَادًا (۷۸-۱۲) سات مضبوط (آسمان) بنائے۔ سَبْعَ سُنْبُلَاتٍ (۱۲-۴۶) سات بالیں۔ سَبْعَ لَیَالٍ (۶۹-۷) سات راتیں۔ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ کَلْبُهُمْ (۱۸-۲۲) (وہ) سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے۔ سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا (۶۹-۳۲) ستر گز

سَبْعِیْنَ مَرَّةً (۹-۸۰) ستر مرتبہ۔ اور آیت:۔

سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ (۱۵-۸۷) (الحمد کی) سات آیتیں (عطا فرمائیں) جو نماز کی ہر رکعت میں کرر پڑھی جاتی ہیں۔ میں بعض نے کہا ہے کہ سورۃ الحمد مراد ہے کیونکہ اس کی سات آیتیں ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اَلسَّبْعُ الطِّوَال یعنی سورۃ بقرہ سے لے کر اعراف تک سات لمبی سورتیں مراد ہیں۔ اور قرآن پاک کی تمام سورتوں کو بھی مثانی کہا گیا ہے۔ کیونکہ ان میں واقعات تکرار کے ساتھ مذکور ہیں اور منجملہ ان کے یہ سات سورتیں ہیں

اَلسَّبِیْعُ وَالسُّبُعُ اونٹوں کو ساتویں روز پانی پر وارد کرنا۔

اَلْاُسْبُوْعُ۔ ایک ہفتہ یعنی سات دن جمع اَسَابِیْعُ طُفْتُ بِالْبَیْتِ اُسْبُوْعًا میں نے خانہ کعبہ کے گرد سات چکر لگائے سَبَعْتُ الْقَوْمَ میں ان کا ساتواں بن گیا۔ اَخَذْتُ سُبْعَ اَمْوَالِهِمْ میں نے ان کے اموال سے ساتواں حصہ وصول کیا۔

اَلسَّبُعُ۔ درندہ کو کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کی قوت پوری ہوتی ہے جیسا کہ سات کا عدد "عدد تام" ہوتا ہے۔

ھُذَلِیْ نے کہا ہے[2] (الکامل)

(۲۱۹) .... کانہ

عَبْدٌ لِّاٰلِ اَبِیْ رَبِیْعَةَ مُسْبِعٌ

گویا وہ آل ابی ربیعہ کا غلام ہے جس کی بکریوں کو پھاڑ کھانے کے لئے درندے آگئے ہوں۔

بعض نے مُسْبِعٌ کا معنی مُهْمَلٌ مَعَ السِّبَاعِ کئے ہیں یعنی وہ جو درندوں کی طرح آوارہ پھرتا ہے اور بعض نے مُسْبَعٌ (بفتح با) پڑھا ہے۔

---

[1] المثل فی مجمع الامثال للمیدانی..... [illegible]

[2] المثل فی جل المعاجم ۱۲ ۵ قالہ ابو ذؤیب الہذلی یصف حمارا الوحشی واولہ: صخب الشوارب لایزال ... والبیت من کلمۃ مفضلیۃ فی ۵ ۷ بیتا وفی الجمھرۃ ۲-۲ ۴ ۲/۱ وہ منہا المؤلف ۶ ۳۶ ۳، ۵۷ ۴، ۳۷۲، ۷ ۴ ۳) راجع نظام الغریب للربعی (۱۳) واصلاح یعقوب ۴۷ ۲ والحکم (ربع ابع) واللسان (شرب، سبع) والاغانی ۱: ۹ ۲ والمزہر ۱: ۳۵) والصاحبی ۶۹ قال یعقوب فی اصلاحہ اسبعت عبدی اذا اہملتہ فہو مسبع وفی الصاحبی لفظۃ مسبع ما فسرحتی الآن تفسیرا شافیا۔

اور یہ دَعِیٌّ سے کنایہ ہے یعنی وہ شخص جس کا نسب معلوم نہ ہو۔ سَبَعَ فُلَانًا کسی کی غیبت کرنا اور درندہ کی طرح اس کا گوشت کھانا۔ اَلْمَسْبَعَۃُ۔ درندوں کی سرزمین۔

(س ب غ)

دِرْعٌ سَابِغٌ پوری اور وسیع زرہ کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔ اَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ (۳۴-۱۱) کہ کشادہ (اور پوری) پوری زرہیں بناؤ۔
اسی سے استعارہ کے طور پر اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ (پورا وضو کرنا) اور اِسْبَاغُ النِّعَمِ (پورا پورا انعام کرنا) کا محاورہ استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ (۳۱-۲۰) اور تم پر اپنی نعمتوں کو پورا کیا۔

(س ب ق)

اَلسَّبْقُ اس کے اصل معنی چلنے میں آگے بڑھ جانا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فَالسَّابِقَاتِ سَبْقًا (۷۹-۴) پھر وہ (حکم الہٰی کو سننے کے لئے) لپکتے ہیں۔
اَلْاِسْتِبَاقُ کے معنی تسابق یعنی ایک دوسرے سے سبقت کرنا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ (۱۲-۱۷) ہم ایک دوسرے سے دوڑ میں مقابلہ کرنے لگ گئے۔
وَاسْتَبَقَا الْبَابَ (۱۲-۲۵) اور دونوں دوڑتے ہوئے دروازے پر پہنچے۔
مجازاً ہر شے میں آگے بڑھ جانے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
مَا سَبَقُوْنَا اِلَیْهِ (۴۶-۱۱) تو یہ ہم سے اس کی طرف سبقت نہ کر جاتے۔

وَلَوْلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ (۲۰-۱۲۹) اگر تمہارے پروردگار نے پہلے سے ایک بات نہ فرمائی ہوتی۔
پھر استعارہ کے طور پر احراز فضیلت کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
اَلسَّابِقُوْنَ السَّابِقُوْنَ (۵۶-۱۰) اور آگے نکل جانے والے ہی اعلیٰ درجہ کے لوگ ہیں۔
تو سَابِقُوْنَ سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو اعمال صالحہ کے ذریعہ ثواب الہٰی اور جنت کی طرف پیش پیش جانے والے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ان کے متعلق فرمایا:۔
یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرَاتِ وَهُمْ لَهَا سَابِقُوْنَ (۲۳-۶۱) یہی لوگ نیک کاموں میں جلدی کرتے ہیں اور یہی ان کے لئے لپکتے ہیں۔
اور آیت کریمہ:۔
وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ (۵۶-۶۰) اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں۔
کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ ہماری گرفت اور قبضہ سے باہر نہیں نکل سکتے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:۔
وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَبَقُوْا (۸-۵۹) کافر یہ نہ سمجھیں کہ ہمارے قابو سے نکل گئے ہیں۔
وَمَا کَانُوْا سَابِقِیْنَ (۲۹-۳۹) اور نہ وہ ہم سے کہیں بھاگ کر جا سکے۔

(س ب ل)

اَلسَّبِیْلُ۔ اصل میں اس رستہ کو کہتے ہیں جس میں سہولت سے چلا جا سکے، اس کی جمع سُبُلٌ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَاَنْهَارًا وَّسُبُلًا (۱۶-۱۵) دریا اور راستے۔
وَجَعَلَ لَکُمْ فِیْهَا سُبُلًا (۷۱-۳۰) اور تمہارے

لئے اس میں راستے بنا دیئے۔
اور آیت:۔
وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّونَهُمْ عَنِ السَّبِيلِ (۴۳-۳۷)
اور وہ صحیح راہ سے روکتے ہیں۔
میں اَلسَّبِیْل سے مراد طریق حق ہے کیونکہ اسم جنس جب مطلق استعمال ہو تو حق (یعنی فرد کامل) ہی مراد ہوتا ہے۔ اور اسی معنی میں فرمایا:۔
ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ (۸۰-۲۰) پھر اس پر راہ آسان کر دی۔
اور راہگیر کو سَابِلٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع سَابِلَةٌ ہے اور جس راہ پر بہت زیادہ آمد و رفت ہو اسے سَبِيلٌ سَابِلٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ شِعْرٌ شَاعِرٌ کا محاورہ ہے[1]۔
اِبْنُ السَّبِيلِ اس مسافر کو کہتے ہیں جو اپنے منزل مقصود سے دور ہو اور سبیل کی طرف اس کی نسبت بوجہ ممارست کے ہے۔ پھر سبیل کا لفظ ہر اس چیز پر بولا جاتا ہے۔ جو کسی دوسری چیز تک رسائی کا ذریعہ ہو عام اس سے کہ وہ چیز خیر ہو یا شر۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
اُدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ (۱۶-۱۲۵) (لوگوں کو) خدا کے راستہ کی طرف دعوت دو۔
قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي (۱۲-۱۰۹) (اے پیغمبر ان سے) کہو کہ یہ میرا راستہ ہے۔
ان دونوں آیتوں میں سبیل سے مراد راہ حق ہی ہے لیکن پہلی آیت میں مبلغ (پہنچانے والے) کی طرف نسبت ہے اور دوسری آیت میں ان کے لئے کر چلنے والے یعنی پیغمبر کی طرف۔
قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ (۴۷-۴) جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو گئے۔

إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ (۴۰-۲۹) (اور وہی) راہ دکھاتا ہوں، جو سیدھی ہے۔
وَلِتَسْتَبِينَ سَبِيلُ الْمُجْرِمِينَ (۶-۵۵) تاکہ مجرموں کا راستہ واضح ہو جائے۔
فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ (۱۶-۶۹) (مزے سے) اپنے پروردگار کے (تعلیم کئے ہوئے آسان) راستوں پر چل۔
اور سبیل کے معنی شاہراہ بھی آتے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔
قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي (۱۲-۱۰۸) (اے پیغمبر) کہدو یہی میرا راستہ ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
سُبُلَ السَّلَامِ (۵-۱۶) سلامتی کے رستوں کی طرف۔ میں سبل السلام سے جنت کے راستے مراد ہیں۔
مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ (۹-۹۱) نیکوکاروں پر کوئی الزام نہیں۔
فَأُولَٰئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِنْ سَبِيلٍ۔ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ (۴۲-۴۱، ۴۲) تو یہ لوگ (معذور ہیں) ان پر کوئی الزام نہیں۔ الزام (تو) ان ہی پر ہے۔
إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا (۱۷-۴۲) مالک عرش (یعنی خدا) تک پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ نکالا ہوتا۔
عام محاورہ ہے:۔
أَسْبَلَ السِّتْرَ وَالذَّيْلَ اس نے پردہ یا دامن لٹکا دیا۔
فَرَسٌ مُسْبَلُ الذَّنَبِ دراز دم گھوڑا سَبَلَ الْمَطَرُ وَأَسْبَلَ۔ بارش برسنا اور وہ بارش جو آسمان سے بہہ کر زمین کی طرف آ رہی ہو اور ہنوز زمین پر نہ گری ہو اسے سَبَلٌ کہا جاتا ہے اور سَبَلَةٌ خاص کر مونچھوں کے بالوں کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ

[1] وليس ہذا الكلام يقال له مجاز في الاسناد ۱۲

(اس کی) بڑھ کر، نیچے کو لٹک پڑتے ہیں۔
اَلسُّنْبُلَةُ بال اس کی جمع سَنَابِل آتی ہے۔
قرآن میں ہے:۔
سَبْعَ سَنَابِلَ فِی کُلِّ سُنْبُلَةٍ (۲-۲۶۱) سات بالیں ہر بال میں۔
سَبْعَ سُنْبُلَاتٍ خُضْرٍ (۱۲-۴۶) سات سبز بالیں۔
اَسْبَلَ الزَّرْعُ کھیتی میں بالیں پڑ گئیں (ماخذ کے ساتھ متصف ہونا کے معنی پائے جاتے ہیں) جیسے
اَحْصَدَ الزَّرْعُ واجنی النخل کا محاورہ ہے:۔
اَلْمُسْبِلُ جوئے کے تیروں میں سے پانچواں تیر۔

(س ب ء)

سَبَأٌ ایک شہر کا نام ہے جو پرانے زمانے میں (سیل العرم سے) تباہ ہو گیا تھا۔ قرآن میں ہے:۔
وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ (۲۷-۲۲) اور میں سبا سے تیرے پاس ایک یقینی خبر لیکر آیا ہوں۔
اور اسی سے ایک ضرب المثل ہے۔ (مثل)
ذَهَبُوْا اَیَادِیْ سَبَاءَ یعنی وہ تتر بتر ہو گئے۔ اور (اہل سبا کی طرح ان کا نام و نشان مٹ گیا۔
سَبَأْتُ الْخَمْرَ میں نے پینے کے لئے شراب خریدی۔
اَلسَّابِیَاءُ (مشیمہ) یعنی وہ جھلی جس میں بچہ ہوتا ہے!

(س ت ت)

سِتَّةٌ چھ کے عدد کو کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ (۷-۵۴) چھ روز میں۔
سِتِّیْنَ مِسْکِیْنًا (۵۸-۴) ساٹھ مساکین کو۔
اور سِتٌّ اصل میں سِدْسٌ ہے جسے اس کی بحث میں ذکر کیا جائے گی۔ (انشاء اللہ)

(س ت ر)

اَلسَّتْرُ (مصدر ن) اس کے اصل معنی کسی چیز کو چھپا دینے کے ہیں اور سِتْرٌ وسُتْرَةٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کوئی چیز چھپائی جائے۔
قرآن میں ہے:۔
لَمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا (۱۸-۹۰) جن کے لئے ہم نے اس (سورج) سے بچنے کیلئے کوئی اوٹ نہیں بنائی۔
حِجَابًا مَّسْتُوْرًا (۱۷-۴۵) ایک گاڑھا پردہ (حائل کر دیتے ہیں)
اَلْاِسْتِتَارُ اس کے معنی چھپ جانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَمَا کُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ (۴۱-۲۲) اور (اس لئے) نہ چھپتے تھے۔

(س ج د)

اَلسُّجُوْدُ (ن) اسکے اصل معنی فروتنی اور عاجزی کرنے کے ہیں اور اللہ کے سامنے عاجزی اور اس کی عبادت کرنے کو "سُجُوْد" کہا جاتا ہے اور یہ انسان حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے (کیونکہ) سجود کی دو قسمیں ہیں۔ سجود اختیاری جو انسان کے ساتھ خاص ہے اور اسی سے وہ ثواب الٰہی کا مستحق ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (۵۳-۶۲) سو اللہ کے لئے سجدہ کرو اور (اسی کی) عبادت کرو۔
اور سجود تسخیری جو انسان، حیوانات اور جمادات سب کے حق میں عام ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا

وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۔ (۱۳-۱۵) (فرشتے) جو آسمانوں میں ہیں اور جو انسان زمین میں ہیں۔ چار و ناچار اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں اور صبح و شام ان کے سایے (بھی اسی کو سجدہ کرتے ہیں)

اور نیز فرمایا۔

يَتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ (۱۶-۴۸) اس کے سائے (کبھی) دائیں طرف کو اور (کبھی) بائیں طرف کو جھکے رہتے ہیں گویا اللہ کے آگے سربسجود ہیں۔

تو اس سے مراد سجود تسخیری ہے یعنی وہ زبان حال سے گویا ہیں کہ ان کو کسی صانع حکیم نے بنایا ہے اور وہ اس کی مخلوق ہیں۔ اور آیت :۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۔ (۱۶-۴۹) اور جتنی چیزیں آسمانوں اور جتنی جاندار چیزیں زمین میں ہیں۔ اور فرشتے (سب) اللہ ہی کے آگے سربسجود ہیں اور ذرا بھی تکبر نہیں کرتے۔

دونوں قسم کے سجود یعنی تسخیری اور اختیاری پر مشتمل ہے اور آیت :۔

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ (۵۵-۶) اور نجم و شجر اس کے سامنے سربسجود ہیں۔ میں سجود تسخیری مراد ہے۔ اور آیت :۔

اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (۲-۳۴) آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے اس کو قبلہ بنانا مراد ہے اور بعض نے کہا ہے کہ آدم علیہ السلام کے سامنے انکساری اور ان کی اولاد کے مصالح کا بندوبست کرنے کا انہیں حکم دیا گیا تھا سو بجز ابلیس کے تمام فرشتے یہ حکم بجا لائے تھے اور آیت :۔

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا (۲-۵۸) اور دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا۔

کے معنی یہ ہیں کہ انکسار و انقیاد کے ساتھ وہاں جانا۔ اصطلاح شریعت میں سجود کو نماز کا خاص رکن قرار دیا گیا ہے اور اس کا اطلاق سجود قرآن اور سجود شکر پر بھی ہوتا ہے جو سجدہ نماز کے حکم میں ہے اور کبھی اس سے مراد نفس نماز ہوتی ہے۔ جیسے فرمایا :۔

وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ (۵۰-۴۰) اور نماز کے پیچھے بھی۔ یعنی نماز سے فارغ ہونے کے بعد اور چاشت کی نماز کو سُبْحَةُ الضُّحٰى اور سُجُوْدُ الضُّحٰى کہتے ہیں اور آیت :۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ (۱۵-۹۸) اپنے پروردگار کی حمد (و ثنا) کے ساتھ (اس کی تسبیح (و تقدیس بیان کیا کرو۔ میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں تسبیح سے نماز مراد ہے۔ اَلْمَسْجِدُ (ظرف) کے معنی جائے نماز کے ہیں اور آیت

وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ (۷۲-۱۸) اور مسجدیں تو خدا ہی (کی عبادت کے لئے) ہیں میں بعض نے کہا ہے کہ مساجد سے روئے زمین مراد ہے کیونکہ آنحضرت کے لئے تمام زمین کو مَسْجِدٌ اور طَهُوْرٌ بنایا گیا ہے جیسا کہ ایک حدیث میں مروی ہے[1] (۱۷۰)

اور بعض نے کہا ہے کہ مساجد سے اعضاء سجود یعنی پیشانی، ناک دونوں ہاتھ دونوں زانوں اور دونوں پاؤں مراد ہیں[2]۔ اور آیت :۔

---

[1] ولفظہ : جعلت لی الارض مسجدًا وطہورًا اخرجہ الجماعۃ [2] ابن عطاء کما فی البحر ۸ : ۳۵۲ واللسان ۴/۱-۲ و ۴/۱۸۸ و الکشاف ۴/۱۰۴ وقد اشار الیہ ابن قتیبۃ فی غریبہ ۱۲

أَلَّا يَسْجُدُوا لِلّٰهِ (۲۷-۲۵) (اور نہیں سمجھتے) کہ اللہ کو ... سجدہ کیوں نہ کریں۔

میں لا زائد ہے اور معنی یہ ہیں کہ میری قوم اللہ ہی کو سجدہ کرو۔ اور آیت:۔

وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا (۱۲-۱۰۰) اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

میں اظہار عاجزی مراد ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مراد سجدہ خدمت ہے جو اس وقت جائز تھا اور شعر[1] (الکامل)

(۲۲۰) وَافَىٰ بِهَا كَدَرَاهِمِ الْأَسْجَادِ

میں شاعر نے وہ دَرَاهِم مراد لئے ہیں جن پر بادشاہ کی تصویر ہوتی تھی اور لوگ ان کے سامنے سجدہ کرتے تھے۔

(س ج ر)

السَّجْرُ اس کے اصل معنی زور سے آگ بھڑکانے کے ہیں۔ اور سَجَرْتُ التَّنُّوْرَ کے معنی ہیں میں نے تنور جلا دیا اسے ایندھن سے بھر دیا اسی سے فرمایا:۔

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ (۵۲-۶) اور (نیز) جوش مارنے والے سمندر کی۔

شاعر نے کہا ہے[2] (المتقارب)

(۲۲۱) إِذَا شَاءَ طَالَعَ مَسْجُورَةً ... تَرَىٰ حَوْلَهَا النَّبْعَ وَالسَّمْسَمَا

جب وہ چاہتا ہے تو پانی سے پرگڑھا اسے نظر آجاتا ہے جس کے گرداگرد نبع اور سمسم کے درخت اگے ہوئے ہیں۔

اور آیت:۔

وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ (۸۱-۶) اور جس وقت دریا پاٹ دیئے جائیں۔

کے معنی حسن (البصری) نے یہ کئے ہیں کہ جب دریا آگ سے بھڑکا دیئے جائیں اور بعض نے یہ معنی کیا ہے کہ جب ان کے پانی خشک کر دیئے جائیں اور یہ ان میں آگ بھڑکانے کی غرض سے ہوگا۔

ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ (۴۰-۷۲) پھر آگ میں جھونکے جائیں گے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔

وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (۲-۲۴) جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔

اور استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔

سَجَرَتِ النَّاقَةُ اونٹنی دوڑ میں بھڑک اٹھی یعنی سخت دوڑی جیسے اِشْتَعَلَتِ النَّاقَةُ کا محاورہ ہے اور اَلسَّجِيْرُ کے معنی مخلص دوست کے ہیں گویا وہ محبت کی آگ میں جلتا رہتا ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے۔

فُلَانٌ مُحْرَقٌ فِي مَوَدَّةٍ کہ فلاں سوختہ محبت ہے۔

کسی شاعر نے کہا ہے[3]

(۲۲۲) سُجَرَاءُ نَفْسِي غَيْرُ جَمْعِ أُشَابَةٍ

---

[1] قالہ اسود بن یعفر النہشلی وصدرہ: من خمر ذی نطف اغن منطق ... والبیت فی اللسان (سجد) والمفضلیات (۲: ۱۸) وفیہ لدراہم بدل کدراہم والاسجاد بکسر الہمزۃ السجود قال الاصمعی: دراہم الاسجاد، دراہم الاکاسرۃ ای النصاری وہی دراہم الجزیۃ التی ادلتہم ۱۲ [2] البیت لنمر بن تولب العکل والشاعر لیصف وعلاً وفی روایۃ السماسما بدل السمسما وہو شجر لشبہ الآبنوس ادلفسہ والبیت من شواہد الطبری (۲۷/۱) والطبرسی (۹۶/۵۴) والخزانۃ (۴: ۳۸۴) ومجاز القرآن لابی عبیدۃ وتہذیب الالفاظ ۶۰۵ وکتاب الابدال لابی الطیب (۱: ۱۳۵/۲۷۴) واللسان والتاج (ملاسم) والمختارات الشجریہ ۲۷ (مسورۃ بدل مسجورۃ) والاضداد للاصمعی ۲۶۸ والقرطبی (۲: ۴۱) والجمہرۃ ۲۱ وابن درید (۲: ۷۶) والسیوطی ۲۹۰ وشرح السبع لابن الانباری ۵۵۶ واضداد ابن الانباری ۵۴ وابن السکیت ۱۴۸ والسجستانی ۲۶) واضداد لابی الطیب ۳۶۲ وغریب القرآن للقتیبی ۲۲۴ [3] قالہ ابوکبیر الہذلی (عامر بن الحلیس) وتمامہ، حشدا ولا ہلک المفارش عزل والبیت فی تہذیب الاصلاح ۲۷۶ مع آخر دیوان الہذلیین (۲: ۹۰) والمعانی الکبیر ۵۲۱ والمرزوقی ۲۳۳ والمحکم عزل حشدا وفیہ قال ابن جنی: روی حشد مغلث الدال

(س ج ل)

اَلسَّجْلُ بڑے ڈول کو کہتے ہیں اور سَجَلْتُ الْمَاءَ فَانْسَجَلَ کے معنی ہیں میں نے پانی بہایا تو وہ بہہ گیا اور اَسْجَلْتُہٗ کے معنی ہیں میں نے اسے پانی سے بھرا ہوا ڈول دیا اور استعارہ کے طور پر عطائے کثیر کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

اَلْمُسَاجَلَۃُ کے اصل معنی ڈول کے ساتھ کھیتی سیراب کرنے کے ہیں اور پھر مبارات اور مناضلت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے شاعر نے کہا ہے[1] (الرجز)

(۲۲۳) مَنْ یُّسَاجِلْنِیْ یُسَاجِلْ مَاجِدًا

جو میرے ساتھ مقابلہ کرے گا تو وہ ایک شریف آدمی سے مقابلہ کریگا یعنی میں ماجد اور شریف ہوں۔

اَلسِّجِّیْلُ سنگ گل کو کہتے ہیں اور اصل میں جیسا کہ کہا گیا ہے۔ یہ لفظ فارسی سے معرب ہے بعض نے کہا ہے کہ اَلسِّجِلُّ کے اصل معنی اس پتھر کے ہیں جس پر لکھا جاتا تھا بعدہ ہر اس چیز کو جس پر لکھا جائے سِجِلٌّ کہنے لگے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ (۲۱-۱۰۴) جیسے خطوں کا مکتوب لپیٹ لیا جاتا ہے۔ یعنی لکھی ہوئی چیزوں کی حفاظت کے لئے اسے لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں۔

(س ج ن)

اَلسَّجْنُ (مصدر ن) قید خانہ میں بند کر دینا اور آیت۔ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ (۱۲-۳۳) اے میرے پروردگار قید خانہ میں رہنا مجھے زیادہ پسند ہے۔ میں ایک قراءت اَلسَّجْنُ (بفتحہ سین) بھی ہے۔

لَيَسْجُنُنَّهٗ حَتّٰی حِيْنٍ (۱۲-۳۵) (ان کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ) ایک وقت خاص تک اس کو قید رکھیں۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ (۱۲-۳۶) اور (اتفاق سے) یوسفؑ کے ساتھ دو نوجوان (ادبھی) جیل خانہ میں داخل ہوئے۔

اَلسِّجِّيْنُ یہ عِلِّيِّيْنَ کے مقابلہ میں جہنم کا نام ہے اور اس میں الفاظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دال ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ زمین کے ساتویں طبقہ کا نام ہے۔ قرآن میں ہے:۔

لَفِیْ سِجِّیْنٍ وَمَا اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ (۸۳-۷،۸) (بدکار لوگوں کے نامۂ اعمال) سجین میں ہوں گے اور تم کیا جانو کہ سجین کیا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ عام طور پر جس چیز کو قرآن نے مَا اَدْرٰكَ کے ساتھ بیان فرمایا ہے اسے بعد میں بیان کر دیا گیا ہے اور جسے مَا یُدْرِیْكَ کے ساتھ بیان کیا ہے اسے مبہم چھوڑ دیا ہے لیکن یہاں باوجود اس کے کہ سِجِّيْنٌ اور عِلِّيِّيْنَ کو مَا اَدْرٰكَ کے بعد بیان فرمایا ہے پھر بھی انہیں مبہم رکھا گیا ہے اور کتاب کی تفسیر بیان فرما دی ہے تو اس میں

---

[1] قالہ الاخضر اللبھی (فضل بن عباس) وتمامہ: یملأ الدلوالی عقد الکرب۔ والبیت فی اللسان (سجل) وتفسیر الطبری (۲: ۹۴) والامالی (۲: ۹۴) والسمط ۰۰ ے والکامل ۵ ۷ اوالاغانی (۱۴: ۱۷۱/۱۵: ۲) وکنایات الجرجانی ۱۵ والمعانی للقتبی ۵۹۵ والاضداد لابن الانباری ۳۳۵ ولیعلم: انا الاخضر من یعرفنی۔ اخضر الجلدۃ فی بیت العرب وانما قال انا الاخضر لانہ کان شدید الادمۃ والخضرۃ انما اتتہ من قبل جدتہ وامہ ام الفضل بنت العباس بن عبد المطلب، وکانت حبشیۃ وفی مصارع العشاق ۲۷۹ تمامہ: اخضر الجلدۃ فی بیت العرب قال وتغنی بہ عبداللہ بن جعفر فی مجلس معاویۃ بالابطح وفی الحصری (۳: ۱۷۱) اختلاط

ایک باریک نکتہ ہے جسے اس کتاب کے بعد دوسری جگہ پر بیان کیا جائے گا۔

(س ج و)

سَجَا اللَّیْلُ۔ رات پرسکون ہوگئی قرآن میں ہے:۔
وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی (۹۳-۲) اور رات کی قسم جب ساکن ہو جائے۔
اور یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ رات کے پرسکون ہونے کے لئے کہا جاتا ہے۔
ھَدَأَتِ الْاَرْجُلُ یعنی پاؤں کی چاپ رک گئی۔
اور عَیْنٌ سَاجِیَۃٌ کے معنی خاموش آنکھ کے ہیں اور سَجَی الْبَحْرُ سَجْوًا کے معنی ہیں سمندر پرسکون ہوگیا اسی سے استعارہ کے طور پر میت کو کفن میں چھپانے کیلئے تَسْجِیَۃُ الْمَیِّتِ کہا جاتا ہے۔

(س ح ب)

اَلسَّحْبُ اس کے اصل معنی کھینچنے کے ہیں۔
چنانچہ دامن زمین پر گھسیٹ کر چلنے یا کسی انسان کو منہ کے بل کھینچنے پر سَحْبٌ کا لفظ بولا جاتا ہے اسی سے بادل کو سَحَابٌ کہا جاتا ہے یا تو اس لئے کہ ہوا اسے کھینچ کر لے چلتی ہے اور یا اس لئے کہ وہ خود پانی کو کھینچ کر لاتا ہے اور یا اس بنا پر کہ وہ چلنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گھسٹتا ہوا چل رہا ہے قرآن میں ہے:۔
یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی وُجُوْھِھِمْ (۵۴-۴۸) جس دن ان کو ان کے منہ کے بل دوزخ کی آگ میں گھسیٹا جائے گا۔
اور فرمایا۔ یُسْحَبُوْنَ o فِی الْحَمِیْمِ (۴۰-۷۱-۷۲) انہیں دوزخ میں کھینچا جائے گا۔
محاورہ ہے:۔
فُلَانٌ یَتَسَحَّبُ عَلٰی فُلَانٍ کہ فلاں اس پر جرأت کرتا ہے۔ جیسا کہ یَتَجَرَّءُ عَلَیْہِ کہا جاتا ہے۔
اَلسَّحَابُ۔ ابر کو کہتے ہیں خواہ وہ پانی سے بھرا ہو یا خالی اس لئے خالی بادل کو سَحَابٌ جَھَامٌ کہا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللہَ یُزْجِیْ سَحَابًا (۲۴-۴۳) کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ بادل کو چلاتا ہے۔
حَتّٰی اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا (۷-۵۷) حتیٰ کہ جب وہ بھاری بادل کو اٹھا لاتی ہیں۔
وَیُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ (۱۳-۱۲) اور وہ بھاری بادل اٹھاتا ہے۔
اور کبھی لفظ سحاب بول کر بطور تشبیہ کے اس سے سایہ اور تاریکی مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:
اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰہُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ سَحَابٌ ۚ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُھَا فَوْقَ بَعْضٍ (۲۴-۴۰) یا ان کے اعمال کی مثال ایسی ہے جیسے گہرے دریا کے اندرونی اندھیروں کی سی رہے) کہ دریا کو لہر نے ڈھانپ رکھا ہے اور (لہر بھی ایک نہیں بلکہ) لہر کے اوپر لہر ان کے اوپر بادل (کی تاریکی غرض) اندھیرے ہیں ایک کے اوپر ایک۔

(س ح ت)

اَلسُّحْتُ۔ اصل میں اس چھلکے کو کہتے ہیں جو پوری طرح اتار لیا جائے (اور اس سے ہلاک کر دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے) چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَیُسْحِتَکُمْ بِعَذَابٍ (۲۰-۶۱) ورنہ وہ تم پر کوئی عذاب (نازل کر کے اس) سے تم کو ملیامیٹ کر دے گا۔
اس میں ایک قرأت فَیَسْحَتَکُمْ (فتح یاء کے ساتھ) بھی

ہے اور سَحَتَہٗ (ض)، وَاَسْحَتَہٗ (افعال) کے ایک ہی معنی آتے ہیں یعنی بیخ کنی اور استیصال کرنا پھر اسی سے سُحْتٌ کا لفظ ہر اس ممنوع چیز پر بولا جانے لگا ہے جو باعث عار ہو کیونکہ وہ انسان کے دین اور مروت کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاَکّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (۵-۴۲) اور مال حرام ڈکوسے چلے جاتے ہیں۔

یعنی وہ چیز جوان کے دین کا ناس کرنے والی ہے۔ ایک حدیث میں ہے[1] (۱۷۱) کُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ فَالنَّارُ اَوْلٰی بِہٖ .... جو گوشت مال حرام کے کھانے سے پیدا ہو وہ آگ کے لائق ہے اور اسی سے "رشوت" کو سُحْت کہا گیا ہے[2] (۱۷۲) ایک روایت میں ہے[3] (۱۷۳) کہ حجام (پچھنا لگانے والے) کی کمائی "سحت" ہے۔ تو یہاں سُحْت بمعنی حرام نہیں ہے جو دین کو برباد کرنے والا ہو بلکہ سُحْت بمعنی مکروہ ہے یعنی ایسی کمائی مروت کے خلاف ہے کیونکہ آنحضرت نے ایسی کمائی سے اونٹنی کو چارہ ڈالنے اور غلاموں کو کھلانے کا حکم دیا ہے۔

(س ح ر)

اَلسَّحَرُ کے معنی حلق کے کنارہ اور پھیپھڑے کے ہیں اور اسی سے محاورہ ہے۔ اِنْتَفَخَ سَحْرُہٗ اس کا پھیپھڑا پھول گیا (یعنی وہ بزدل ہے) اور بڑے حلق والے اونٹ کو بَعِیْرٌ سَحِرٌ کہا جاتا ہے اور جو چیز ذبح کے وقت نرخرے سے اتار کر پھینک دی جاتی ہے اسے "سُحَارَۃٌ" کہا جاتا ہے اور یہ نُقَایَۃٌ وَسُقَاطَۃٌ کے وزن پر ہے (اور فُعَالَۃٌ کا وزن ردی اشیاء کے معنی میں استعمال ہوتا ہے) بعض کا قول ہے کہ اسی سے سِحْرٌ مشتق ہے جس کے معنی گلہ یا پھیپھڑے پر مارنے کے ہیں۔ اور سِحْرٌ کا لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے اول دھوکا اور بے حقیقت تخیلات پر بولا جاتا ہے جیسا کہ شعبدہ باز اپنے ہاتھ کی صفائی سے نظروں کو حقیقت سے پھیر دیتا ہے یا نمّام ملمع سازی کی باتیں کرکے کانوں کو صحیح بات سننے سے روک دیتا ہے چنانچہ آیات:۔

سَحَرُوْا اَعْیُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْھَبُوْھُمْ (۷-۱۱۶) تو انہوں نے جادو کے زور سے لوگوں کی نظر بندی کر دی اور ان سب کو دہشت میں ڈال دیا۔

یُخَیَّلُ اِلَیْہِ مِنْ سِحْرِھِمْ (۲۰-۶۶) (تو موسیٰ کو ان کے جادو کی وجہ سے ایسا معلوم ہوا۔

میں سِحْرٌ کا لفظ اسی معنی پر محمول ہے اور بنا بریں انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو سَاحِرٌ کہہ کر پکارا تھا چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فَقَالُوْا یٰاَیُّھَا السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّکَ (۴۳-۴۹)

---

[1] الحدیث بہذا اللفظ فی شعب الایمان من حدیث کعب بن عجرۃ وباختلاف الفاظہ فی الدارمی ۲: ۳۲۸ والمستدرک للحاکم والترمذی ولفظہا لایربو لحم نبت من سحت فالنار اولی بہ (ب) حل من ابی بکر وابن جریر۔ عن ابن عمر کنز العمال ۴ رقم ۴ وبمعناہ ۰۰،۷۵،۷۹،۷ / ۱۲: ۵۲۷ راجع تخریج العراقی علی الاحیاء ج ۱ ص ۲ وتخریج الکشاف رقم ۴۵۷ [2] راجع للحدیث الفائق ۱: ۲۸۰ (ابن جریر۔ عن ابن عمر و دوابن مردویہ عن ابی ہریرۃ ست خصال من السحت (لحسوۃ الامام الحدیث [3] الطبرانی عن رافع بن خدیج والخطیب عن ابی ہریرۃ وابن النجار۔ عن السائب بن یزید طیلسانی عن ابی ہریرۃ وضعفہ۔ [4] انظر ضمن حدیث رافع بن خدیج المذکور (الآن والترمذی وابو داؤد وحسنہ وابن ماجۃ من حدیث محیصۃ تخریج احیاء العلوم (۲ / ۴ / ۱۱)

تو ان لوگوں نے کہا اے جادوگر ہمارے لیے اپنے پروردگار سے دعا کر"۔

دوم[2] شیطان سے کسی طرح کا تقرب حاصل کر کے اس سے مدد چاہنا جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ (۲۶-۲۲۲) (کہ) کیا میں تمہیں بتاؤں کس پر شیطان اترا کرتے ہیں (ہاں) تو وہ اترا کرتے ہیں ہر جھوٹے بدکردار پر۔

اور اسی معنی میں فرمایا:۔

وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ (۲-۱۰۲) بلکہ کفر (کیا تھا تو) شیاطین نے کیا تھا کہ وہ لوگوں کو جادو سکھلایا کرتے تھے۔

اور اس کے تیسرے معنی وہ ہیں جو عوام مراد لیتے ہیں یعنی سحر وہ علم ہے جس کی قوت سے صور اور طبائع کو بدلا جا سکتا ہے (مثلاً) انسان کو گدھا بنا دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت شناس علماء کے نزدیک ایسے علم کی کچھ حقیقت نہیں ہے[1]

پھر کسی چیز کو سحر کہنے سے کبھی اس شے کی تعریف مقصود ہوتی ہے جیسے کہا گیا ہے[2] (۱۴۲) إِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا کہ بعض بیان جادو اثر ہوتا ہے اور کبھی اس کے عمل کی لطافت مراد ہوتی ہے چنانچہ اطباء طبیعت کو "سَاحِرَةٌ" کہتے ہیں اور غذا کو سِحْرٌ سے موسوم کرتے ہیں کیونکہ اس کی تاثیر نہایت ہی لطیف اور باریک ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَسْحُورُونَ (۱۵-۱۵) (یا) یہ تو نہیں کہ ہم پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔

یعنی سحر کے ذریعہ ہمیں اس کی معرفت سے پھیر دیا گیا ہے۔ اور اسی معنی میں فرمایا:۔

إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ (۲۶-۱۵۳) تم پر تو بس کسی نے جادو کر دیا ہے۔

بعض نے کہا ہے مُسَحَّرٌ وہ ہے جس کے سَحَرٌ یعنی پھیپھڑا وغیرہ ہو اور مطلب یہ تھا کہ تم غذا کے محتاج ہو پھر پیغمبر کیسے ہو سکتے ہو۔ جیسا کہ دوسری جگہ (ان کے اعتراض کو نقل کرتے ہوئے قرآن نے) فرمایا:۔

مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ (۲۵-۷) یعنی یہ تو ہماری طرح کا کھانے پینے والا انسان ہے جیسے فرمایا:۔

مَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا (۲۶-۱۵۴) کہ تم بھی ہم ہی جیسے آدمی ہو۔

اور بعض نے کہا ہے کہ مُسَحَّرٌ کے معنی ہیں وہ شخص جسے جادو کا علم دیا گیا ہو اور وہ اپنے دعویٰ کو لطف دوقت سے ثابت کر سکتا ہو۔ اور آیت:۔

إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُورًا (۱۷-۴۷) کہ تم مسحور

---

[1] وقد نقد علیہم ابن قتیبہ فی مشکلہ وتلطف علی عقول من انکرہ وقال فی ختام البحث: "فمن آمن بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم وبان ما جاء بہ الحق بجمیع ہذا وفرح صدرہ بہ من انکرہ ۔ لانہ لا نؤمن الا بما اوجبہ النظر والقیاس علی ما شاہد ورأی فی الموات والحیوان ۔ تما ذا ابقی علی المسلمین؟ وای شیئ ترک للملحدین انظر لمشکلہ من ۸۳ ـــ ۹۲ وغرائب القرآن للنیسابوری والطبری والفخر وبجانبہ ماکتب صاحب الکشاف والجاحظ فی الحیوان تجد ما بین الفریقین من خلاف ۱۲ [2] قال صلی اللہ علیہ وسلم حین وفد علیہ عمرو بن الاہتم والزبرقان بن بدر وقیس بن عاصم والمثل یضرب فی استحسان المنطق وایراد الحجۃ البالغۃ راجع للمثل المیدانی (۱: ۷)، والحدیث فی (مالک، حم، خ، د، ت) عن ابن عمر وبدون اللام فی (حم، د) عن ابن عباس وفی (د) عن بریدۃ

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

آدمی کے پیچھے پڑے ہو۔
میں مَسْحُوْرًا کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔ اور فرمایا۔
فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ يَامُوْسٰى مَسْحُوْرًا (۱۷-۱۰۱) تو فرعون نے ان سے کہا کہ موسیٰ! میں تیری نسبت ایسا خیال کرتا ہوں کہ کسی نے تجھ پر جادو کر (کے تجھے دیوانہ بنا) دیا ہے۔
لیکن آیت:۔
اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۵-۱۱۰) کہ یہ تو صریح جادو ہے۔
دوسرے معنی پر دلالت کرتی ہے۔ اور فرمایا۔
وَجَاءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ (۷-۱۱۶) اور (بہت ہی بڑا (بھاری) جادو (بنا کر) لائے۔
أَسِحْرٌ هٰذَا وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُوْنَ (۱۰-۷۷) کیا یہ جادو ہے۔ اور جادوگروں (کا) تو یہ حال ہے کہ ان (کو کبھی) کامیابی نہیں ہوتی۔
فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (۲۶-۳۸) غرض (دن مقرر ہوا) اور (اس معین دن کے وعدے پر جادوگر جمع کئے گئے۔
فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سَاجِدِيْنَ (۲۶-۴۶) یہ دیکھ کر جادوگر (ایسے متاثر ہوئے کہ) سجدے میں گر پڑے۔
اَلسَّحَرُ وَ السُّحْرَةُ اصل میں تو اس کے معنی آخر شب کی تاریکی کے ہیں جو دن کی ابتدائی روشنی میں مخلوط ہو۔ پھر اس وقت کا نام ہی سَحَرٌ رکھ دیا گیا ہے۔
محاورہ ہے۔ لَقِيْتُهُ بِاَعْلَى السَّحَرَيْنِ یعنی میں اسے صبح کاذب کے وقت ملا۔ اور مُسْحِرٌ اس آدمی کو کہتے ہیں جو سحری کے وقت گھر سے نکلا ہو اور اَلسَّحُوْرُ اس طعام کو کہتے ہیں جو بوقت سحر تناول کیا جائے اور تَسَحَّرَ کے معنی سحور تناول کرنے کے ہیں۔

(س ح ق)

اَلسَّحْقُ (ض ک) اس کے اصل معنی کسی چیز کو ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں۔ زیادہ تر دوا کے پیسنے پر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:۔
سَحَقْتُهُ فَانْسَحَقَ میں نے دوا کو پیسا چنانچہ وہ پس گئی اَسْحَقَ الثَّوْبُ کے معنی کپڑے کا پرانا ہو جانا کے ہیں اور پرانے کپڑے کو سَحْقٌ کہا جاتا ہے اسی سے اَسْحَقَ الضَّرْعُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ہیں دودھ خشک ہو جانے کی وجہ سے تھن مرجھا گئے۔
...... اور ہو سکتا ہے کہ "اسحٰق" (علم) بھی اسی سے مشتق ہو اس صورت میں یہ اسم منصرف ہو گا۔ اور کپڑے کے بوسیدہ کر دینے پر سَحَقَهُ (مجرد) بھی استعمال ہوتا ہے اور محاورہ میں اَسْحَقَهُ اللّٰهُ کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرے اسی سے فرمایا:۔
فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۶۷-۱۱) کہ دوزخیوں کے لئے دوری ہے۔ اور فرمایا:۔
اَوْ تَهْوِیْ بِهِ الرِّيْحُ فِیْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (۲۲-۳۱) یا اس کو ہوا کسی دور جگہ لے کر ڈال دے گی۔
اور استعارہ کے طور پر جاری خون کو مُنْسَحِقٌ وَ سَحُوْقٌ کہا جاتا ہے جیسے مرْدُوْدٌ

(س ح ل)

قرآن میں ہے:۔
فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ (۲۰-۳۹) تو دریا اسے ساحل پر ڈال دے گا۔
یہ اصل میں سَحَلَ الْحَدِيْدَ سے ہے جس کے معنی ریتی سے لوہے کا برادہ بنانے اور چھیلنے کے ہیں۔

بعض کا خیال ہے دریا کے کنارے کو ساحل کی بجائے مَسْحُوْلٌ کہنا چاہیے تھا مگر اسم مفعول کی بجائے اسم فاعل استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ھَمٌّ نَاصِبٌ کہا جاتا ہے حالانکہ ھَمٌّ مَنْصُوْبٌ ہوتا ہے بعض کے نزدیک سَاحِلٌ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ پانی کو متفرق اور محدود کر دیتا ہے اس صورت میں ساحل بمعنی فاعل ہوگا۔

اَلسُّحَالَۃُ. برادہ کو کہتے ہیں اور گدھے کی ہنہناہٹ کو سَحِیْلٌ یا سُحَالٌ کہا جاتا ہے گویا کرخت ہونے کے لحاظ سے اس کی آواز لوہے کو رگڑنے کی آواز کے مشابہ ہے۔

اور بلند آواز آدمی کو مِسْحَلٌ کہا جاتا ہے گویا وہ سَحِیْلُ الْحِمَارِ کے مشابہ ہے یعنی رفع صوت کے لحاظ سے نہ کہ آواز کے کرخت ہونے کے لحاظ سے جیسا کہ قرآن نے گدھے کی آواز کے متعلق کہا ہے۔

اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ (۳۱-۱۹) اور دہانہ لگام کے دونوں طرف کے حلقوں کو مِسْحَلَتَانِ کہا جاتا ہے۔

(س خ ر)

اَلتَّسْخِیْرُ (تفعیل) کے معنی کسی کو کسی خاص مقصد کی طرف زبردستی لیجانا کے ہیں قرآن میں ہے۔

وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۴۵-۱۳) اور جو کچھ آسمان میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اس نے (اپنے کرم سے) ان سب کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے۔

وَسَخَّرَ لَکُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَسَخَّرَ لَکُمُ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ ...... (۱۴-۳۳) اور (اسی طرح ایک اعتبار سے) سورج اور چاند کو تمہارے اختیار میں کر دیا کہ دونوں بڑے چکر لگا رہے ہیں اور (ایسے ہی ایک طرح سے) رات اور دن کو تمہارے اختیار میں کر دیا۔

وَسَخَّرَ لَکُمُ الْفُلْکَ (۱۴-۳۲) اور کشتیوں کو تمہارے اختیار میں کر دیا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔ کَذٰلِکَ سَخَّرْنٰھَا لَکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ (۲۲-۳۶) ہم نے یوں ان (جانوروں) کو تمہارے بس میں کر دیا ہے تاکہ تم (ہمارا) شکر کرو۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا (۴۳-۱۳) پاک ہے وہ ذات جس نے ان چیزوں کو ہمارے بس میں کر دیا ہے۔

تو مُسَخَّرٌ وہ ہے جسے کسی کام پر مجبور کر کے لگایا گیا ہو اور مِسْخَرٌ وہ جسے اولاً تو کسی کام پر مجبور کیا جائے پھر وہ اپنے ارادہ سے مسخر ہو جائے۔ چنانچہ قرآن میں ہے

لِیَتَّخِذَ بَعْضُھُمْ بَعْضًا سُخْرِیًّا (۴۳-۳۲) تاکہ وہ ایک دوسرے کو تابع بنائے رہیں۔

اور سَخِرْتُ مِنْہُ وَاسْتَسْخَرْتُہٗ کے معنی کسی سے مذاق کرنے اور اس کی ہنسی اڑانا ہیں قرآن میں ہے۔

قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْکُمْ کَمَا تَسْخَرُوْنَ۔ وہ (حضرت نوح علیہ السلام ان کے تمسخر کا یہ) جواب دیتے کہ اگر (آج) تم ہم پر ہنستے ہو تو جس طرح تم (ہم پر ہنستے ہو اسی طرح) ہم (ایک دن) تم پر ہنسیں گے۔ (۱۱-۳۸)

بَلْ عَجِبْتَ وَیَسْخَرُوْنَ (۳۷-۱۲) (اے پیغمبر) بات یہ ہے کہ تم تو ان کے انکار قیامت سے تعجب کرتے ہو اور یہ (تمہاری باتوں پر) ہنستے ہیں۔

رَجُلٌ سُخَرَۃٌ ہنسی اڑانے والا۔ اور سُخْرَۃٌ وہ ہے جس کی لوگ ہنسی اڑائیں اور ہنسی اڑانے والے

کے اس فعل کو سُخْرِیَۃٌ وَسِخْرِیَۃٌ کہا جاتا ہے
اور آیت کریمہ:۔
فَاتَّخَذْتُمُوهُمْ سِخْرِيًّا (۲۳-۱۱۰) تو تم نے ان کی ہنسی بنائی۔ میں سُخْرِيًّا تسخیر سے بھی ہو سکتا ہے اور سُخْرِیَۃٌ یعنی ہنسی اڑانے کے معنی میں بھی
اور اسی طرح آیت:۔
وَقَالُوا مَا لَنَا لَا نَرَى رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِنَ الْأَشْرَارِ أَتَّخَذْنَاهُمْ سِخْرِيًّا (۳۸-۶۲-۶۳) اور دوزخی آپس میں یہ بھی کہیں گے کہ جن لوگوں کو ہم برے لوگوں میں شمار کرتے تھے کیا بات ہے کہ ہم ان کو یہاں دوزخ میں نہیں دیکھتے کیا ہم نے ان کی (ناحق) ہنسی بنائی۔ میں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں لیکن اس کے بعد وَكُنْتُمْ مِنْهُمْ تَضْحَكُونَ (۲۳-۱۱۰) سے دوسرے معنی کی تائید ہوتی ہے

(س خ ط)

اَلسَّخَطُ وَالسُّخْطُ اس سخت غصہ کو کہتے ہیں جو سزا کا مقتضی ہو۔ قرآن میں ہے:۔
إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ (۲۳-۱۱۱) تو وہ فوراً غصہ سے بھر جاتے۔
اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس سے مراد انزال عقوبت ہوتی ہے جیسے فرمایا:۔
ذٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللّٰهَ (۴۷-۲۸) (اور) ان کی (یہ نوبت اس لئے ہوگی کہ جو چیز خدا کو بری لگتی ہے یہ اسی کے رستے پر چلے۔
أَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (۵-۸۰) (نتیجہ یہ ہوا) کہ دنیا میں بھی خدا ان سے ناراض ہوا۔
كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللّٰهِ (۳-۱۶۱) اس شخص جیسا (فعل سرزد) ہو سکتا ہے جو خدا کے غضب میں آگیا ہو۔

(س د د)

اَلسَّدُّ (دیوار، آڑ)

بعض نے کہا ہے سَدٌّ اور سُدٌّ کے ایک ہی معنی ہیں اور بعض دونوں میں فرق کرتے ہیں کہ سُدٌّ (بضمہ سین) اس آڑ کو کہا جاتا ہے جو قدرتی ہو اور سَدٌّ (بفتحہ سین) مصنوعی اور بنائی ہوئی روک کو کہتے ہیں۔ اصل میں یہ سَدَدْتُہٗ (ن) کا مصدر ہے جس کے معنی رخنہ کو بند کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا (۱۸-۹۴) کہ (آپ) ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار کھینچ دیں۔
اور تشبیہ کے طور پر ہر قسم کے موانع کو سَدٌّ کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:۔
وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا (۳۶-۹) اور ہم نے ان کے آگے بھی دیوار بنا دی اور ان کے پیچھے بھی۔
ایک قراءت میں سُدًّا بھی ہے۔
اَلسُّدَّۃُ برآمدہ جو دروازے کے سامنے بنایا جائے تاکہ بارش سے بچاؤ ہو جائے کبھی دروازے کو بھی سُدَّۃٌ کہہ دیتے ہیں جیسا کہ مشہور ہے[1]:۔
اَلْفَقِیْرُ الَّذِیْ لَا یُفْتَحُ لَہٗ سُدَدُ السُّلْطَانِ یعنی وہ فقیر جن کے لئے بادشاہ کے دروازے نہ کھولے جائیں اَلسَّدَادُ وَالسَّدَدُ کے معنی استقامت کے ہیں اور اَلسِّدَادُ اسے کہتے ہیں جس سے رخنہ اور شگاف کو بھرا جائے۔ اور استعارہ کے طور پر ہر اس چیز کو سِدَادٌ کہا جاتا ہے جس سے فقر کو روکا جائے۔

---

[1] وفی وارد الحوض: ہم الذین لا تفتح لہم السدد (النہایہ ۲ سد)

(س د ر)

اَلسِّدْرُ (بیری کا) درخت جس کا پھل بہت کم غذائیت کا کام دیتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:۔
وَاَثْلٍ وَّشَیْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِیْلٍ (۳۴-۱۶) اور جن میں کچھ تو جھاؤ تھا اور تھوڑی سی بیریاں۔
اور کبھی (کانٹا جھاڑ دے کر) اسے بے کانٹا کرکے اس سے سایہ حاصل کیا جاتا ہے اس لئے اسے جنت کے آرام اور اس کی نعمتوں کے لئے بطور مثال کے ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (۵۶-۲۸) بے خار کی بیریوں میں (مزے کر رہے) ہوں گے۔
کیونکہ ایسا درخت بہت زیادہ سایہ دار ہوتا ہے
اور آیت:۔
اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی (۵۳-۱۶) جب کہ اس بیری پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا۔
میں السدرۃ سے اس مقام کی طرف اشارہ ہے جہاں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فیوضات الٰہیہ اور بھاری انعامات سے خاص طور پر نوازا گیا تھا
بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد وہ درخت ہے جس کے نیچے آنحضرت نے بیعت رضوان لی تھی اور وہاں اللہ تعالیٰ نے مومنین پر سکینت الٰہیہ نازل فرمائی تھی۔
اَلسَّدَرُ کے معنی خیرہ چشم ہونے کے ہیں اور خیرہ چشم کو سَادِرٌ کہا جاتا ہے اور سَدَرَ شَعْرَہٗ کے معنی بال لٹکانے کے ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ (دسر) سے مقلوب ہے۔

(س د س)

اَلسُّدُسُ (اسم عدد چھٹا حصہ کو کہتے ہیں)
قرآن میں ہے:۔
فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ (۴-۱۱) تو ماں کا چھٹا حصہ ہے۔
اَلسِّدْسُ پیاسے (اونٹوں کو چھٹے روز پانی پلانے کی باری اور سِتَّۃٌ بھی اصل میں سِدْسٌ ہی ہے۔
سَدَسْتُ الْقَوْمَ کے معنی قوم میں چھٹا آدمی ہونے یا ان کے اموال سے چھٹا حصہ وصول کرنے کے ہیں اور جَاءَ سَادِسًا وَسَاتًّا وَسَادِيًا کے ایک ہی معنی ہیں یعنی وہ چھٹے درجہ پر آیا۔
قرآن میں ہے:۔
وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ (۵۸-۷) اور نہ کہیں پانچ کا (مجمع ہوتا ہے) مگر وہ ان میں چھٹا ہوتا ہے۔
وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ (۱۸-۲۲) اور (بعض کہیں گے کہ وہ پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا۔
محاورہ مشہور ہے:۔ لَا اَفْعَلُ كَذَا سَدِيْسَ عُجَيْسَ میں کبھی بھی یہ کام نہیں کرونگا۔
اَلسُّدُوْسُ طیلسان کو کہتے ہیں اَلسُّنْدُسُ باریک (دیبا) اس کے مقابل اِسْتَبْرَق موٹے ریشم کو کہتے ہیں۔

(س ر ر)

اَلْاِسْرَارُ کسی بات کو چھپانا یہ اعلان کی ضد ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
سِرًّا وَّعَلَانِيَةً (۲-۲۷۴) اور پوشیدہ اور ظاہر اور فرمایا:۔
يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (۲-۷۷) (کہ) جو کچھ

یہ چھپاتے اور جو کچھ یہ ظاہر کرتے ہیں خدا کو (سب) معلوم ہے۔

وَاَسِرُّوْا قَوْلَکُمْ اَوِاجْهَرُوْا بِهٖ (۶۷-۱۳) اور تم (لوگ) بات پوشیدہ کہو یا ظاہر۔

اور اس کا استعمال اعیان ومعانی دونوں میں ہوتا ہے

اَلسِّرُّ۔ اس بات کو کہتے ہیں جو دل میں پوشیدہ ہو۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

یَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی (۲۰-۷) وہ چھپے بھید اور نہایت پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔

نیز فرمایا:۔ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُمْ (۹-۷۸) کہ خدا ان کے بھیدوں اور مشوروں تک سے واقف ہے۔

مُسَارَّۃٌ (مفاعلۃ) کے معنی ہیں کسی بات کو چھپانے کی وصیت کرنا اور تَسَارَّ الْقَوْمُ کے معنی لوگوں کا باہم ایک دوسرے کو بات چھپانے کی وصیت کرنے یا باہم سرگوشی کرنے کے ہیں اور آیت:۔

وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ (۱۰-۵۴) (پچھتائیں گے) اور ندامت کو چھپائیں گے۔

تو یہاں اَسَرُّوْا کے معنی چھپانے کے ہیں۔ اور بعض نے اس کے معنی ظاہر کرنا بھی کئے ہیں کیونکہ دوسری آیت میں ہے:۔

فَقَالُوْا یٰلَیْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُکَذِّبَ بِاٰیٰتِ رَبِّنَا۔ (۶-۲۷) اور کہیں گے کہ اے کاش ہم پھر (دنیا میں) لوٹا دیئے جائیں تاکہ اپنے پروردگار کی آیتوں کی تکذیب نہ کریں۔

لیکن یہ معنی صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ آیت مذکور میں جس ندامت کے چھپانے کا ذکر ہے اس سے وہ ندامت مراد نہیں ہے جس کے اظہار کی طرف آیت یٰلَیْتَنَا میں اشارہ پایا جاتا ہے۔

اَسْرَرْتُ اِلٰی فُلَانٍ حَدِیْثًا کسی سے پوشیدہ طور پر راز کی بات کہنا۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِیْثًا (۶۶-۳) اور (یاد کرو) جب پیغمبر نے اپنی ایک بی بی سے ایک بھید کی بات کہی۔

اور آیت:۔

تُسِرُّوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ (۶۰-۱) اور تم ان کی طرف پوشیدہ دوستی کے پیغام بھیجتے ہو۔

کے معنی یہ ہیں کہ تم انہیں اپنی پوشیدہ دوستی سے آگاہ کرتے ہو۔ اس بنا پر بعض نے یہاں تُسِرُّوْنَ کے معنی تُظْهِرُوْنَ کئے ہیں اور یہی معنی صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اِسْرَارٌ اِلَی الْغَیْرِ (کسی سے بھید کی بات کہنا) جس طرح دوسروں سے اخفا کو مقتضی ہے اسی طرح اس شخص کے سامنے اظہار کو مستلزم ہے جس سے وہ بھید کہا جاتا ہے لہٰذا اَسْرَرْتُ اِلٰی فُلَانٍ (یعنی دوسرے سے راز کی بات کہنا) میں من وجہ اخفا اور من وجہ اظہار کے معنی پائے جاتے ہیں۔ اور آیت:۔

وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا (۷۱-۹) (ظاہر اور پوشیدہ ہر طرح سمجھاتا رہا۔ بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

اور کنایہ کے طور پر اَلسِّرُّ کے معنی نکاح (جماع) کے بھی آتے ہیں کیونکہ وہ بھی چھپ کر کیا جاتا ہے اور سِرٌّ خالص چیز کو کہتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے۔ هُوَ مِنْ سِرِّ قَوْمِهٖ وہ اپنی قوم میں سب سے بہتر ہے اور اسی سے سِرُّ الْوَادِیْ وَسَرَارَتُهٗ ہے جس کے معنی وادی کے بہتر حصہ کے ہیں۔

سُرَّةُ الْبَطْنِ ناف کا وہ حصہ جو قطع کرنے کے

بعد باقی رہ جاتا ہے اور یہ چونکہ عکن بطن میں مخفی رہتا ہے اس لئے اسے سُرَّۃُ الْبَطْنِ کہتے ہیں اور وہ چیز جو ناف سے قطع کی جاتی ہے اسے سُرٌّ و سُرُرٌ کہا جاتا ہے ہتھیلی کی لکیروں کو اَسِرَّۃُ الرَّاحَۃِ کہتے ہیں اسی طرح پیشانی کے خطوط کو اَسَارِیْرُ الْجَبْھَۃِ کہا جاتا ہے اسطرح مہینہ کی آخری تاریخ جس میں چاند ظاہر نہیں ہوتا اسے سَرَارٌ کہا جاتا ہے۔

اَلسُّرُوْرُ قلبی فرحت کو کہتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَلَقّٰھُمْ نَضْرَۃً وَّسُرُوْرًا (۷۶-۱۱) اور خدا ان کو تازگی اور خوش دلی عنایت فرمائے گا۔

تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ (۲-۶۹) دیکھنے والے کے دل کو خوش کر دیتا ہو۔

اسی طرح اہل جنت کے متعلق فرمایا:۔

وَیَنْقَلِبُ اِلٰٓی اَھْلِہٖ مَسْرُوْرًا (۸۴-۹) اور وہ اپنے گھر والوں میں خوش خوش آئے۔

اور اہل نار کے متعلق فرمایا:۔

اِنَّہٗ کَانَ فِیْٓ اَھْلِہٖ مَسْرُوْرًا (۸۴-۱۳) یہ اپنے اہل و عیال میں مست رہتا تھا۔

تو اس میں تنبیہ ہے کہ آخرت کی خوشی دنیا کی خوشی کے برعکس ہوگی۔

اَلسَّرِیْرُ (تخت) وہ جس پر کہ ٹھاٹھ سے بیٹھا جاتا ہے یہ سُرُوْرٌ سے مشتق ہے کیونکہ خوشحال لوگ ہی اس پر بیٹھتے ہیں اس کی جمع اَسِرَّۃٌ اور سُرُرٌ آتی ہے۔ قرآن نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:۔

مُتَّکِئِیْنَ عَلٰی سُرُرٍ مَّصْفُوْفَۃٍ (۵۲-۲۰) تختوں پر جو برابر بچھے ہوئے ہیں تکیہ لگائے ہوئے۔

فِیْھَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَۃٌ (۸۸-۱۳) وہاں تخت ہوں گے اونچے بچھے ہوئے۔

وَلِبُیُوْتِھِمْ اَبْوَابًا وَّسُرُرًا عَلَیْھَا یَتَّکِـُٔوْنَ (۴۳-۳۴) اور ان کے گھروں کے دروازے بھی (چاندی کے بنا دیئے) اور تخت بھی جن پر تکیہ لگاتے۔

اور میت کے جنازہ کو اگر سَرِیْرُ الْمَیِّتِ کہا جاتا ہے تو یہ سریر (تخت) کے ساتھ صوری مشابہت کی وجہ سے ہے۔ یا نیک شگون کے طور پر کہ مرنے والا دنیا کے قید خانہ سے رہائی پا کر جوار الٰہی میں خوش و خرم ہے جس کی طرف کہ آنحضرت نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا[1] (۱۷۵) اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ کہ مومن کو دنیا قید خانہ معلوم ہوتی ہے۔

(س ر ب)

اَلسَّرَبُ (مصدر ن) اس کے اصل معنی نشیب کی طرف جانے کے ہیں اور (اسم کے طور پر) نشیبی جگہ کو بھی سَرَبٌ کہہ دیتے ہیں قرآن میں ہے:۔

فَاتَّخَذَ سَبِیْلَہٗ فِی الْبَحْرِ سَرَبًا (۱۸-۶۱) تو اس نے دریا میں سرنگ کی طرح اپنا رستہ بنا لیا۔

سَرَبَ (ن) سَرَبًا، سُرُوْبًا جیسے مَرَّ مَرًّا و مُرُوْرًا اور اِنْسَرَبَ (انفعال) کے ایک ہی معنی آتے ہیں لیکن سَرَبَ بالذات فاعل سے فعل صادر ہونے پر بولا جاتا ہے اور اِنْسَرَبَ بھی انفعالی معنی کے لحاظ سے بولا جاتا ہے یعنی وہ فعل جو دوسرے سے متاثر ہو کر کیا جائے۔

سَرِبَ الدَّمْعُ (س) آنسو رواں ہونا۔

---

[1] دیکھئے الکافر الحدیث راجع رحم ام ات، وعن ابی ہریرۃ وابن حبان فی زوائدہ رقم ۸۸۴ (طب. ک) عن سلمان، البزار عن ابن عمر وفی روایۃ سجن المؤمن وسنتہ راجع تخریج عراقی علی الاحیاء (۳ : ۲۰۲)

اَلْمَسْرَبِ الْحَيَّةُ اِلٰى جُحْرِهَا سانپ کا اپنے بل میں اتر جانا اسی طرح سَرِبَ (س) الْمَاءُ مِنَ السِّقَاءِ کے معنی مشکیزے سے پانی ٹپکنا کے ہیں اور وہ پانی جو مشکیزے سے ٹپک رہا ہو اسے مَاءٌ سَرَبٌ وَسَرِبٌ کہتے ہیں۔

اَلسَّارِبُ کسی راستہ پر اپنی مرضی سے چلا جانے والا۔
وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ (۱۳-۱۰) یا رات کو کہیں چھپ جائے یا دن (کی روشنی) میں کھلم کھلا چلے پھرے۔

سَارِبٌ کی جمع سُرُبٌ آتی ہے۔ جیسے رَكْبٌ وَرَاكِبٌ اور عرف میں اونٹوں کے گلہ کو سُرْبٌ کہا جاتا ہے۔ مثلاً محاورہ ہے: ذُعِرَتْ سِرْبُهُ اس کے اونٹ ڈر کر متفرق ہو گئے (یعنی بدحال ہو گیا) اور هُوَ اٰمِنٌ فِي سِرْبِهِ (وہ خوش حال ہے) بعض سِرْبٌ کے معنی نفس کے ہیں اور بعض نے کنایتاً اہل و عیال مراد لیا ہے۔ اسی سے کنایہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔
اِذْهَبِيْ فَلَا اَنْدَهُ سِرْبَكِ جاؤ تجھے طلاق ہے اور اصل معنی یہ ہے کہ تمہارے اونٹ جدھر جانا چاہیں آزادی سے چلے جائیں میں انہیں نہیں روکوں گا۔

اَلسُّرْبَةُ دس سے لے کر بیس تک گھوڑوں کی جماعت کو سُرْبَةٌ کہا جاتا ہے۔

اَلْمَسْرُبَةُ (بضم را) سینہ کے درمیان کے بال جو نیچے پیٹ تک ایک خط کی صورت میں چلے جاتے ہیں۔ اَلسَّرَابُ (شدت گرما میں دوپہر کے وقت) بیابان میں جو پانی کی طرح چمکتی ہوئی ریت نظر آتی ہے اسے سَرَابٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بظاہر دیکھنے میں ایسے معلوم ہوتی ہے جیسے پانی بہہ رہا ہے پھر اس سے ہر بے حقیقت چیز کو تشبیہ کے طور پر سَرَابٌ کہا جاتا ہے اور اس کے بالمقابل جو چیز حقیقت رکھتی ہو اسے شَرَابٌ کہا جاتا ہے۔
قرآن میں ہے:
كَسَرَابٍ بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاءً (۲۴-۳۹) جیسے میدان میں سراب کہ پیاسا اسے پانی سمجھے۔
وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (۷۸-۲۰) اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ سراب ہو کر رہ جائیں گے۔

(س ر ب ل)

اَلسِّرْبَالُ۔ کرتہ۔ قمیص خواہ کسی چیز سے بنی ہوئی ہو جیسے فرمایا:
سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ (۱۴-۵۰) ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے۔
سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ (۱۶-۸۱) اور تمہارے (آرام کے) واسطے کرتے بنائے جو تم کو گرمی سے بچائیں اور کرتے (یعنی زرہیں) جو تم کو (اسلحہ) جنگ (کے ضرر) سے محفوظ رکھیں۔
تو بَاْسَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ تمہیں ایک دوسرے کے ضرر سے محفوظ رکھتے ہیں۔

(س ر ج)

اَلسِّرَاجُ چراغ (وہ چیز جو بتی اور تیل سے روشن ہوتی ہے۔ مجازاً ہر روشن چیز کو سِرَاجٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:
وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (۷۱-۱۶) اور سورج کو چراغ ٹھہرایا ہے۔
وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا (۷۸-۱۳) اور روشن چراغ بنایا۔

تو یہاں "روشن چراغ" سے مراد سورج ہے۔
اَسْرَجْتُ السِّرَاجَ کے معنی چراغ روشن کرنے کے ہیں اور سَرَّجْتُ کَذَا کے معنی چراغ کی مثل کسی چیز کو خوبصورت بنانے کے۔ شاعر نے کہا ہے (رجز)

(۲۲۴) وَ فَاحِمًا وَ مِرْسَنًا مُسَرَّجًا

کوئلہ کی مثل سیاہ بال اور سراج کی مثل خوبصورت ناک
اَلسَّرْجُ کے معنی زین کے ہیں اور زین ساز کو سَرَّاجٌ کہا جاتا ہے۔

(س ر ح)

اَلسَّرْحُ ایک قسم کا پھلدار درخت ہے اس کا واحد سَرْحَۃٌ ہے اور سَرَّحْتُ الْاِبِلَ کے اصل معنی تو اونٹ کو "سرح" درخت چرانے کے ہیں بعدہ چراگاہ میں چرنے کے لئے کھلا چھوڑ دینے پر اس کا استعمال ہونے لگا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَلَکُمْ فِیْهَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَحِیْنَ تَسْرَحُوْنَ (۱۶-۶) اور جب شام کو انہیں (جنگل سے) لاتے ہو اور جب صبح کو (جنگل) چرانے لے جاتے ہو تو ان سے تمہاری عزت و شان ہے۔
اور چرواہے کو سَارِحٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع سَرْحٌ ہے جیسے شَارِبٌ کی جمع شَرْبٌ (اور رَاکِبٌ کی جمع رَکْبٌ) آتی ہے اور تَسْرِیْحٌ کا لفظ طلاق دینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:۔
اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ (۲-۲۲۹) یا بھلائی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے۔ اور اسی طرح آیت:۔
وَسَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا (۳۳-۴۹) اور ان کو کچھ فائدہ (یعنی خرچ) دے کر اچھی طرح سے رخصت کر دو۔
میں بھی سَرِّحُوْهُنَّ کے معنی طلاق دینے کے ہیں اور یہ تَسْرِیْحٌ سے مستعار ہے جس کے معنی جانوروں کو چرنے کے لئے چھوڑ دینا کے ہیں۔ جیسا کہ خود طلاق کا لفظ اِطْلَاقُ الْاِبِلِ (اونٹ کا پائے بند کھولنا) کے محاورہ سے مستعار ہے۔ اور کبھی مَسْرَحٌ میں تیزروی کے معنی کا اعتبار کر کے تیزرو اور سہل رفتار اونٹنی کو نَاقَۃٌ سَرْحٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے بطور استعارہ شعر کے ایک بحر کا نام مُنْسَرِحٌ رکھا گیا ہے۔

(س ر د)

اَلسَّرْدُ اصل میں اس کے معنی کسی سخت چیز کو سینے کے ہیں۔ جیسے زرہ بنانا اور چمڑے کو سینا پھر بطور استعارہ لوہے کی کڑیوں کو مسلسل جوڑنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَ قَدِّرْ فِی السَّرْدِ (۳۴-۱۱) اور کڑیوں کو اندازہ سے جوڑو۔
اور صِرَاطٌ و سِرَاطٌ و زِرَاطٌ کی طرح سَرْدٌ کو زَرْدٌ اور سَرَّادٌ کو زَرَّادٌ کہا جاتا ہے۔
اَلْمِسْرَدُ (اسم آلہ) سوراخ کرنے کا اوزار۔

سلہ قالہ العجاج یصف امرءۃ وقبلہ: ازمان ابدت واضحا مفلجا۔ اغر براقا وطرفا ابرجا ومقلۃ وحاجبا مزججا۔۔۔۔۔۔ وانظر فی دیوانہ ۸ وارجیز العرب ۲۷ والمعاہد ۲۰۷ والالفاظ ۷ والامالی وتہذیب الالفاظ والعینی (۱: ۲۹) وفی المتداولات ان لفظۃ المسرج فی الشطر غریب ولیت شعری الغرابۃ فیہ الا ان یقال ان ماخذہ دقیق ولا یابا ہ الذوق۔

(س ر د ق)

اَلسُّرَادِقُ فارسی سے معرب ہے[1] کلام عرب میں کوئی ایسا اسم مفرد نہیں ہے جس کا تیسرا حرف الف ہو اور اس کے بعد دو حرف ہوں۔ قرآن میں ہے۔ وَاَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا (۱۸-۲۹) جس کے شامیانے ان کو گھیر رہے ہوں گے۔

اور بَيْتٌ مُسَرْدَقٌ اس مکان کو کہتے ہیں جو شامیانہ کی طرز پر بنایا ہو۔

(س ر ط)

اَلسِّرَاطُ کے معنی "آسان راستہ" کے آتے ہیں اور اصل میں سَرَطْتُ الطَّعَامَ وَزَرَدْتُهُ سے مشتق ہے جس کے معنی طعام کو نگل جانے کے ہیں۔ اور راستہ کو صراط اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ راہرو کو گویا نگل لیتا ہے یا رہرو اس کو نگلتا ہوا چلا جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے۔ قَتَلَ اَرْضًا عَالِمُهَا وَقَتَلَتْ اَرْضٌ جَاهِلَهَا کہ واقف کار رہرو تو زمین کو مار ڈالتا ہے لیکن ناواقف کو زمین ہلاک کر دیتی ہے۔ ابو تمام نے کہا ہے[3]

رَعَتْهُ الْفَيَافِيْ بَعْدَ مَا كَانَ حِقْبَةً
رَعَاهَا اِذَا مَا الْمُزْنُ يَنْهَلُّ سَاكِبُهُ

اس کے بعد کہ اس نے ایک زمانہ دراز تک سرسبز جنگلوں میں گھاس کھائی اب اس کو جنگلات نے کھا لیا یعنی دبلا کر دیا۔

اسی طرح راستہ کو لَقَمٌ اور مُلْتَقَمٌ بھی کہا جاتا ہے اس لحاظ سے کہ گویا راہرو اس کو لقمہ بنا لیتا ہے۔

(س ر ع)

اَلسُّرْعَةُ اس کے معنی جلدی کرنے کے ہیں اور یہ "بُطْأٌ" (درنگ کردن) کی ضد ہے۔ اجسام اور افعال دونوں کے متعلق اس کا استعمال ہوتا ہے کہا جاتا ہے سَرُعَ (ک)، فَهُوَ سَرِيْعٌ وَاَسْرَعَ (افعال)، فَهُوَ مُسْرِعٌ اس نے جلدی کی اور اَسْرَعُوْا کے معنی صَارَتْ اِبِلُهُمْ سِرَاعًا (ان کے اونٹ تیز رفتاری سے چلنے لگے) آتے ہیں۔ جیسا کہ اس کے بالمقابل اَبْلَدُوْا کے معنی سست ہونا آتے ہیں۔

سَارَعُوْا وَتَسَارَعُوْا ایک دوسرے سے سبقت کرنا چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ (۳-۱۳۳) اور اپنے پروردگار کی بخشش (اور بہشت) کی (طرف لپکو۔

وَيُسَارِعُوْنَ فِى الْخَيْرَاتِ (۳-۱۱۴) اور نیکیوں پر لپکتے ہیں۔

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا (۵۰-۴۴) اس روز زمین ان پر سے پھٹ جائے گی اور جھٹ پٹ نکل کھڑے ہوں گے۔

يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا (۷۰-۴۳) اس دن یہ قبروں سے نکل کر (اس طرح) دوڑیں گے۔

اور کسی کام میں قوم سے آگے نکل جانے والوں کو

---

[1] من سرایردہ او من سرادر ۱۲ [2] الاحزفان وہما علا ابطہ وحلاحلہ ۱۲ [3] قال ابو تمام من قصیدتہ التی یمدح فیہا عبداللہ بن طاہر والبیت فی دیوانہ ۴۴ والخفاجی ۲۳ والامالی (۱: ۵۸۵)، وفی المطبوع رعتہ مصحف وفی روایۃ الدیوان ماء الروض بدل ماء المزن وبعدہ، نکم جزرع واوجب ذروۃ غارب۔ ومن قبل کانت آمکتہ ذرائبہ (الاتماک الاسمان والمذانب مجاری الماء) ۱۲

سَرْعَانُ الْقَوْمِ کہا جاتا ہے۔
مثل مشہور ہے[1] (مثل) سَرْعَانَ ذَا اِهَالَةً یہ اس شخص کے متعلق کہا جاتا ہے جو قبل از وقت کسی واقعہ کی پیش گوئی کرے۔ تو یہ سَرُعَ سے مبنی بر فتحہ ہے۔ جیسا کہ وَشُكَ سے وَشْكَانَ اور عَجِلَ سے عَجْلَانَ آجاتا ہے اور آیت:۔
اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۳-۱۹۹) (اور) خدا جلد از جلد حساب لینے والا ہے۔
اور اسی طرح آیت:۔
اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ (۷-۱۶۷) بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب دینے والا ہے۔
میں سَرِيْعٌ کے لفظ سے اس معنی پر تنبیہ کرنا مقصود ہے جو کہ آیت:۔
اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۳۶-۸۲) اس کی شان یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔
سے مفہوم ہوتے ہیں۔

(س ر ف)

اَلسَّرَفُ کے معنی انسان کے کسی کام میں حد اعتدال سے تجاوز کر جانے کے ہیں مگر عام طور پر اس کا استعمال انفاق یعنی خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کر جانے پر ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا (۲۵-۶۷) اور وہ کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اڑاتے ہیں اور نہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں۔
وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا (۴-۶) اور اس خوف سے کہ وہ بڑے ہو جائیں گے (یعنی بڑے ہو کر تم سے اپنا مال واپس لے لیں گے) اسے فضول خرچی اور جلدی میں نہ اڑا دینا۔
اور یہ یعنی بے جا سرف کرنا مقدار اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے بولا جاتا ہے چنانچہ حضرت سفیان (ثوری) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی میں ایک حبہ بھی صرف کیا جائے تو وہ اسراف میں داخل ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (۶-۱۴۲) اور بے جا نہ اڑانا کہ خدا بے جا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔
وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ (۴۰-۴۳) اور حد سے نکل جانے والے دوزخی ہیں۔
یعنی جو اپنے امور میں حد اعتدال سے تجاوز کرتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ (۴۰-۲۸) بے شک خدا اس شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے نکل جانے والا (اور) جھوٹا ہے۔
اور قوم لوط علیہ السلام کو بھی مُسْرِفِيْنَ (حد سے تجاوز کرنے والے) کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ بھی خلاف فطرت فعل کا ارتکاب کرکے جائز حدود سے تجاوز کرتے تھے اور عورت جسے آیت:۔
وَنِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ (۲-۲۲۳) تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔
میں حَرْثٌ قرار دیا گیا ہے ـــ میں بیج بونے کی بجائے اسے بے محل ضائع کرتے تھے اور آیت:۔
يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ (۳۹-۵۲) (اے پیغمبر میری طرف سے لوگوں کو کہہ دو کہ) اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی۔
میں اَسْرَفُوْا کا لفظ مال وغیرہ ہر قسم کے اسراف کو شامل ہے اور قصاص کے متعلق آیت:۔

[1] اہالۃ منصوب علی الحال والتقدیر سرع اہالۃ بذہ (منتہی الارب)

فَلَا یُسْرِفْ فِی الْقَتْلِ (۱۷-۳۳) تو اس کو چاہیئے کہ قتل (کے قصاص) میں زیادتی نہ کرے۔

میں اِسْرَافَ فِی الْقَتْلِ یہ ہے کہ غیر قاتل کو قتل کرے اس کی دو صورتیں ہیں۔ مقتول سے بڑھ کر باشرف آدمی کو قتل کرنے کی کوشش کرے۔ یا قاتل کے علاوہ دوسروں کو بھی قتل کرے جیسا کہ جاہلیت میں رواج تھا۔

عام محاورہ ہے۔ مَرَرْتُ بِکُمْ فَسَرِفْتُکُمْ کہ تمہارے پاس سے بے خبری میں گزر گیا۔ تو یہاں سَرِفْتُ بمعنی جَھِلْتُ کے ہے یعنی اس نے بے خبری میں اس حد سے تجاوز کیا جس سے اسے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے تھا اور یہی معنی جہالت کے ہیں۔

اَلسُّرْفَۃُ ایک چھوٹا سا کیڑا جو درخت کے پتے کھا جاتا ہے۔ اس میں اسراف کا تصور کر کے اسے سُرْفَۃٌ کہا جاتا ہے پھر اس سے اشتقاق کر کے کہا جاتا ہے۔

سُرِفَتِ الشَّجَرَۃُ درخت کرم خوردہ ہو گیا۔ اور ایسے درخت کو مَسْرُوْفَۃ (کرم خوردہ) کہا جاتا ہے۔

(س ر ق)

اَلسَّرِقَۃُ (مصدر ض) اس کے اصل معنی خفیہ طور پر اس چیز کے لے لینے کے ہیں جس کو لینے کا حق نہ ہو اور اصطلاح شریعت میں کسی چیز کو محفوظ جگہ سے مخصوص مقدار میں لے لینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ (۵-۳۸) اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت۔

قَالُوْا اِنْ یَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ۔ (۱۲-۷۷) (برادران یوسفؑ نے) کہا اگر اس نے چوری کی ہو تو کچھ عجب نہیں کہ اس کے ایک بھائی نے بھی پہلے چوری کی تھی۔

اَیَّتُھَا الْعِیْرُ اِنَّکُمْ لَسَارِقُوْنَ (۱۲-۷۰) کہ قافلہ والو! تم تو چور ہو۔

اِنَّ ابْنَکَ سَرَقَ (۱۲-۸۱) کہ آپ کے صاحبزادے نے (وہاں جا کر) چوری کی۔

اور اِسْتَرَقَ السَّمْعَ کے معنی چوری چھپے سننے کی کوشش کرنا ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ (۱۵-۱۸) ہاں اگر کوئی چوری سے سننا چاہے۔

اَلسَّرَقُ وَالسَّرَقَۃُ سفید ریشم۔

(س ر م د)

اَلسَّرْمَدُ کے معنی دائم (ہمیشہ) کے ہیں[1]۔ قرآن میں ہے:۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللہُ عَلَیْکُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا (۲۸-۷۱) کہو بھلا دیکھو تو اگر خدا تم پر ہمیشہ قیامت کے دن تک رات (کی تاریکی) کئے رہے۔

اسی طرح اس کے بعد کی آیت میں اَلنَّھَارَ سَرْمَدًا فرمایا ہے۔

(س ر ی و)

اَلسُّرٰی کے معنی رات کو سفر کرنے کے ہیں اور اس معنی میں سَرٰی (ض) وَاَسْرٰی (افعال) دونوں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] فی الکشاف انہ مشتق من السرد علی وزن فَعْمَلٌ فالمیم فیہ زائدۃ وان کان رباعیا فوزنہ فَعْلَلٌ (الکشاف والروح)

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ (۱۱-۸۱) تو کچھ رات رہے سے اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا (۱۷-۱) (وہ ذات پاک) ہے جو ایک رات اپنے بندے کو ...... لے گیا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اَسْرٰی (باب افعال) سَرَیٰ یَسْرِیْ سے نہیں ہے۔ جس کے معنی رات کو سفر کرنے کے ہیں، بلکہ یہ سَرَاۃ سے مشتق ہے جس کے معنی کشادہ زمین کے ہیں۔ (اور اصل میں) اس کے لام کلمہ میں واو ہے اور اسی سے شاعر نے کہا ہے[1]۔ (البسیط)

(۲۱۷) بِسَرْوِ حِمْيَرَ اَبْوَالُ الْبِغَالِ بِهٖ

حمیر کی کشادہ زمین میں جہاں خچروں کا پیشاب یعنی کہ سراب نظر آتے ہیں۔

پس اَسْرٰی کے معنی کشادہ زمین میں چلے جانا ہیں جیسے اَجْبَلَ کے معنی ہیں وہ پہاڑ پر چلا گیا اور اَتْهَمَ کے معنی، وہ تہامہ میں چلا گیا۔

لہٰذا آیت:۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو وسیع اور کشادہ سرزمین میں لے گیا۔ نیز سَرَاۃ ہر چیز کے افضل اور اعلیٰ حصہ کو بھی کہتے ہیں۔ اسی سے سَرَاۃُ النَّهَارِ ہے جس کے معنی دن کی بلندی کے ہیں۔ اور آیت:۔

قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا (۱۹-۲۴) تمہارے پروردگار نے تمہارے نیچے ایک چشمہ پیدا کر دیا ہے۔

میں سَرِیٌّ سے نہر جاری مراد ہے بعض نے کہا ہے کہ یہ سَرْوٌ سے مشتق ہے جس کے معنی رفعت کے ہیں اور بلند قدر آدمی کو رَجُلٌ سَرْوٌ کہا جاتا ہے تو لفظ سری سے عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے اس شرف کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں خاص طور پر نوازا تھا۔

محاورہ ہے:۔

سَرَوْتُ الثَّوْبَ عَنِّیْ میں نے اپنے اوپر سے کپڑا اتار دیا۔

وَسَرَوْتُ الْجُلَّ عَنِ الْفَرَسِ میں نے گھوڑے سے جھول اتار دیا۔

بعض نے کہا ہے کہ اسی سے رَجُلٌ سَرِیٌّ ہے کیونکہ بلند قدر آدمی ہوشیار رہتا ہے گویا وہ کپڑے اتارے ہوئے ہے اسکے برعکس کاہل سست اور ناتوان آدمی کو مُتَدَثِّرٌ مُتَزَمِّلٌ اور زُمَّيْلٌ وغیرہ کہا جاتا ہے گویا وہ اپنے کپڑوں میں لپٹا پڑا ہے اور اَلسَّارِيَةُ اس جماعت کو کہتے ہیں جو رات کو سفر کرتی ہو اور اس کے معنی رات کے بادل اور ستون بھی آتے ہیں۔

---

[1] من کلمۃ جمہرۃ ۲۰۴ ... ۱۳۱ فی ۵ بیتًا مطلعہا: طاف الخیال رکب لیلما بینا ۔ ودون لیلی عواد لو تعدینا قالہ تمیم بن مقبل العامری فی مشوبۃ و منتہیات العرب سبع قصائد منوتماتہ انی لسعیت وہنًا فالک الینا ’’وسرو حمیر من منازلہم بالیمن وابوال البغال یراد بہا السراب تشبیہًا فلان بول البغال کاذب لا ینفع وکذا السراب والیمن : الارض الواسعۃ قدر مد البصر کما فی المعاجم راجع المقاییس واللسان (یمن، سری) و اصلاح المنطق ۱۳۱ وتہذیب الالفاظ ... والبیت ایضًا فی امالی المرتضی ۱: ۹۲ وتہذیب المنطق (...) وفیہ سرو حمیر بدل الیاء وسرو حمیر مکان یوصف بالجمعتی حدیث قریش عشت الی قابل لاسترین بین الناس حتی یاتی الراعی حقہ بسرو حمیر لم یعرق جبینہ ۔ راجع للبیت السبع لابن الانباری والاشتقاق و البلدان وراجع ایضًا غریب ابی عبید ۳/ ۲۷۷-۲۷۸

(س ط ح)

اَلسَّطْحُ مکان کے اوپر کے حصے یعنی چھت کو کہتے ہیں اور سَطَحْتُ الْبَیْتَ کے معنی چھت ڈالنے کے ہیں لیکن سَطَحْتُ الْمَکَانَ کے معنی کسی جگہ کو چھت کی طرح ہموار کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ (۸۸-۲۰) اور زمین کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح بچھائی گئی۔

اِنْسَطَحَ الرَّجُلُ کے معنی چت لیٹنے کے ہیں اور ربی ذئب کے ایک کاہن کا نام سَطِیْحٌ مشہور ہوگیا تھا۔ کیونکہ وہ زمانت کی مرض میں مبتلا ہونے کے باعث زمین پر پڑا رہتا تھا۔

اَلْمِسْطَحُ خیمہ کا ستون جس پر خیمہ نصب کیا جاتا ہے

سَطَحْتُ الثَّرِیْدَۃَ فِی الْقَصْعَۃِ میں نے پیالہ میں ثرید کو پھیلایا۔

(س ط ر)

اَلسَّطْرُ وَالسَّطَرُ قطار کو کہتے ہیں خواہ کسی کتاب کی ہو یا درختوں اور آدمیوں کی۔ اور سَطَرَ فُلَانٌ کَذَا کے معنی ایک ایک سطر کرکے لکھنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ (۶۸-۱) ن قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں اس کی قسم۔

وَکِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ (۵۲-۲) اور کتاب جو لکھی ہوئی ہے۔

کَانَ ذٰلِکَ فِی الْکِتٰبِ مَسْطُوْرًا (۳۳-۶) یہ حکم کتاب یعنی قرآن میں لکھ دیا گیا ہے یعنی مندرج اور ثابت ہے۔

اور سَطْرٌ کی جمع اَسْطُرٌ وَسُطُوْرٌ وَاَسْطَارٌ ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (رجز):

(۲۲۷) اِنِّیْ وَاَسْطَارٍ سُطِرْنَ سَطْرًا

یعنی قسم ہے قرآن کی سطروں کی کہ میں ۔۔۔۔۔

اور آیت کریمہ:۔

اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۶-۲۵) پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں میں مبرد نے کہا ہے کہ یہ اُسْطُوْرَۃٌ کی جمع ہے جیسے اُرْجُوْحَۃٌ کی جمع اَرَاجِیْحُ اور اُثْفِیَّۃٌ کی جمع اَثَافِیُّ اور اُحْدُوْثَۃٌ کی اَحَادِیْثُ آتی ہے۔

اور آیت:۔

وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّکُمْ قَالُوْٓا اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (۱۶-۲۴) اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے کیا اتارا ہے۔ تو کہتے ہیں کہ (وہ تو) پہلے لوگوں کی حکایتیں ہیں۔ یعنی انہوں نے بزعم خود یہ کہا کہ یہ جھوٹ موٹ کی لکھی ہوئی کہانیاں ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ان کے قول کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا:۔

اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ اکْتَتَبَهَا فَهِیَ تُمْلٰی عَلَیْهِ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا (۲۵-۵) اور کہتے ہیں کہ یہ (پہلے

---

[1] قائلہ رؤبۃ بن العجاج وتمامہ: القائل یا نصر نصرًا نصرا۔ والشطر فی الخزانۃ (۱: ۱۹۰) وفی الشطر الثانی بحث قررہ علی ثلاثۃ اوجہ وفی العباب للصاغانی بالصاد المہملۃ مصحف والصواب المعجمۃ وھو اسم الحاجب وتبعہ صاحب القاموس لکنہ خطأ والبیت من شواہد الکشاف (۲: ۸۱) والطبری (۲۹: ۱۸) ومجاز القرآن لابی عبیدۃ (۲: ۲۳۰-۲۴۴) رقم ۲۶۲ وفی روایۃ آیات بسطرن سطرا وشنتمری (۱: ۳۰۴) وابن یعیش (۲: ۳) ودیوانہ ۱۷۴ وطبرسی والسان والصحاح (سطر) والرجز مما استشہد بہ النحویون فی توابع المنادی انظر السیوطی وابن یعیش وشرح المفصل لابن یعیش فی شرح ابیات الایضاح وحاشیۃ الامیر علی المغنی (۲: ۱۵) والدسوقی (۲: ۴۴) والشذور ۳۲۷ وابن ہشام رقم ۲۲۷

لوگوں کی کہانیاں ہیں جن کو اس نے جمع کر رکھا ہے وہ صبح و شام ان کو پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

اور آیت :۔

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (۸۸-۲۱،۲۲) تو تم نصیحت کرتے رہو کہ تم نصیحت کرنے والے ہی ہو تم ان پر داروغہ نہیں ہو۔

ہیں لفظ مُصَيْطِرٍ اور اسی طرح آیت :۔

أَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُونَ (۵۲-۳۷) یا یہ کہیں کے داروغہ ہیں۔

میں مُصَيْطِرُونَ، تَسَيْطَرَ فُلَانٌ عَلَى كَذَا وَسَيْطَرَ عَلَيْهِ سے مشتق ہے جس کے معنی کسی چیز کی حفاظت کے لئے۔ اس پر سطر کی طرح سیدھا کھڑا ہونے کے ہیں پس آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم ان پر نگہداشت کے لئے مقرر نہیں ہو۔ اور یہاں مُصَيْطِرٍ کا استعمال ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت :۔

أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَىٰ كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ (۱۳-۳۳) تو کیا جو (خدا) ہر متنفس کے اعمال کا نگران (و نگہبان) ہے۔

ہیں قَائِمٌ کا۔ اور آیت :۔

وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِحَفِيظٍ۔ میں حفیظ کا لفظ ہے۔ بلکہ بعض نے تو آیت لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ کے معنی ہی لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِحَفِيظٍ کئے ہیں لہذا مُصَيْطِرٍ کا لفظ ایسے ہی ہے جیسا کہ آیت :۔

وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ (۴۳-۸۰) اور ہمارے فرشتے ان کے پاس (ان کی) سب باتیں لکھ لیتے ہیں۔

میں کتابت کا لفظ ہے اور یہ کتابت وہی ہے جو کہ آیت أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ ذَٰلِكَ فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ ..... (۲۲-۷۰) کیا تم نہیں جانتے کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ خدا اس کو جانتا ہے یہ سب کچھ کتاب میں (لکھا ہوا) ہے بے شک یہ سب کچھ خدا کو آسان ہے۔ میں مذکور ہے۔

(س ط و)

اَلسَّطْوَةُ (تعدیہ بواسطہ باء) کے معنی کسی کو سختی سے پکڑنے کے ہیں جیسے سَطَا بِهِ (ن) اس کو سخت پکڑا یا اس پر حملہ کیا۔ قرآن میں ہے :۔

يَكَادُونَ يَسْطُونَ بِالَّذِينَ يَتْلُونَ عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا (۲۲-۷۲) قریب ہوتے ہیں کہ جو لوگ ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہیں ان پر حملہ کر دیں۔ یہ اصل میں سَطَا الْفَرَسُ (ن) عَلَى الرَّمَكَةِ سے مشتق ہے جس کے معنی نر گھوڑے کے اپنی اگلی دونوں ٹانگیں اٹھا کر اپنی مادہ پر چڑھ جانے کے ہیں خواہ بوجہ نشاط کے ہو یا جفتی کی غرض سے۔ اسی طرح سَطَا الرَّاعِيُّ عَلَى النَّاقَةِ کے معنی چرواہے کے اونٹنی کے فرج میں ہاتھ ڈال کر اس کے پیٹ سے مردہ بچہ نکالنے کے ہیں[1]۔ پھر استعارہ کے طور پر طَغْوٌ کی طرح سَطْوَةٌ کا لفظ بھی پانی کی زیادتی پر بولا جاتا ہے اور طَغَى الْمَاءُ، وَسَطَا کے معنی پانی کے طغیانی میں آجانے کے ہیں۔

(س ع د)

اَلسَّعْدُ وَالسَّعَادَةُ (خوش نصیبی) کے معنی ہیں حصول خیر میں امور الٰہیہ کا انسان کے لئے

[1] وفی الحدیث لا بأس ان یسطو الرجل علی المرأۃ اذا خیف علیھا ولم توجد امرأۃ تعالجھا (النھایہ)

ممد اور معاون ہونا۔ اس کی ضد شَقَاوَۃٌ (بدبختی) ہے سَعِدَ (لازم) کے معنی نیک بخت ہونے اور اَسْعَدَہُ اللہُ کے معنی نیک بخت کرنے کے ہیں۔ سَعِیْدٌ (نیک بخت) جمع سُعَدَاءُ اور سب سے بڑی سعادت مندی جنت میں جانا ہے اسی لئے قرآن پاک میں فرمایا ہے:۔

وَاَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّۃِ (۱۱-۱۰۸) اور جو نیک بخت ہوں گے وہ بہشت میں داخل کئے جائیں گے۔

اور فرمایا:۔

فَمِنْهُمْ شَقِیٌّ وَّسَعِیْدٌ (۱۱-۱۰۵) پھر ان میں سے کچھ بدبخت ہوں گے اور کچھ نیک بخت۔

اَلْمُسَاعَدَۃُ (کار خیر میں مدد کرنا) کے معنی ایسے کام میں معاونت کے ہیں جس میں سعادت کا گمان ہو۔ اور لَبَّیْکَ وَسَعْدَیْکَ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بہت زیادہ سعادت بخشے اور تمہاری مساعدت فرمائے۔ لیکن پہلے معنی زیادہ بہتر ہیں۔

اَلْاِسْعَادُ خاص کر نوحہ خوانی میں کسی کی مدد کرنا۔ جیسے محاورہ ہے:۔

اِسْتَسْعَدْتُہٗ فَاَسْعَدَنِیْ میں نے اس سے مدد مانگی تو اس نے میری مدد کی۔

اَلسَّاعِدُ کلائی یا بازو کو کہتے ہیں کیونکہ انسان دفاع اسی کے زور سے کرتا ہے تو گویا اس میں مُسَاعَدَۃٌ کے معنی پائے جاتے ہیں اسی بنا پر پرند کے بازوں کو سَاعِدَیْن کہا جاتا ہے۔ جیساکہ (معنی قوت کے لحاظ سے) انہیں یَمَانِیَیْن سے موسوم کیا جاتا ہے۔

اَلسَّعْدَانُ ایک خاردار گھاس جس کے کھانے سے اونٹنی کا دودھ بڑھ جاتا ہے۔ اسی لئے مثال مشہور ہے[1]۔ (مثل)

مَرْعًی وَلَا کَالسَّعْدَانِ کہ گھاس تو ہے لیکن سعدان کی سی نہیں۔ اَلسَّعْدَانَۃُ کے معنی کبوتر، تسمہ کی گرہ۔ اور اونٹ کے سینہ کے بھی آتے ہیں اور سَعُوْدُ الْکَوَاکِبِ مشہور دس ستارے ہیں جن میں سے ہر ایک کو سَعْدٌ کہا جاتا ہے۔

(س ع ر)

اَلسَّعْرُ کے معنی آگ بھڑکنے کے ہیں۔ اور سَعَرْتُ النَّارَ وَسَعَّرْتُهَا کے معنی آگ بھڑکانے کے۔ مجازاً لڑائی وغیرہ بھڑکانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:۔ اِسْتَعَرَ الْحَرْبُ لڑائی بھڑک اٹھی اِسْتَعَرَ اللُّصُوْصُ ڈاکو بھڑک اٹھے۔ یہ اِشْتَعَلَ کے ہم معنی ہے اور نَاقَۃٌ مَسْعُوْرَۃٌ کے معنی دیوانی اونٹنی کے ہیں جیسے:۔ مُوْقَدَۃٌ وَمُهَیَّجَۃٌ کا لفظ اس معنی میں بولا جاتا ہے۔ اَلْمِسْعَرُ آگ بھڑکانے کی لکڑی (کھرنی لڑائی بھڑکانے والا۔

اَلسُّعَارُ آگ کی تپش کو کہتے ہیں اور سُعِرَ الرَّجُلُ کے معنی آگ یا گرم ہوا سے جھلس جانے کے ہیں۔

---

[1] انظر الامثل الکامل ۹-۱۰۰ کالسعدان بدون الہاء قال الشاعر: ماءٌ ولا کصدّاءٍ ومرعیً ولا کالسعدان یشرب التبیع الذی فیہ فضل وغیرہ افضل اول من قال ذالک خنساء بنت عمرو بن الشرید وحکی انہا امرأۃ من طیئ تزوجہا امرؤ القیس ابن حجر الکندی انظر المثل والقصۃ المیدانی رقم ۳۸۳۷ و۳۸ ۴۱۳ و السمط ۴۳۶ والفاخر رقم ۱۲۱ العسکری ۲/۱۸۷، ۲۰۲ والضبی ۵۴، ۶۹ والالفاظ ۵۵ والنویری ۳/۵۱ والمستقصی ۱۲

✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣ ✣

قرآن میں ہے :-

وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا (۴-۱۰) اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

وَإِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ (۸۱-۱۲) اور جب دوزخ (کی آگ) بھڑکائی جائے گی۔

عَذَابَ السَّعِيْرِ (۶۷-۵) دہکتی آگ کا عذاب (تیار کر رکھا ہے۔)

تو یہاں سَعِيْرٌ بمعنی مَسْعُوْرٌ ہے۔

نیز قرآن میں ہے :-

إِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلَالٍ وَّسُعُرٍ (۵۴-۴۷) بے شک گنہگار لوگ گمراہی اور دیوانگی میں (مبتلا) ہیں۔

اَلسُّعُرُ کے معنی مروجہ نرخ کے ہیں اور یہ استعار النار (آگ کا بھڑکنا) کے ساتھ تشبیہ کے طور پر بولا گیا ہے۔

(س ع ی)

اَلسَّعْيُ۔ تیز چلنے کو کہتے ہیں اور یہ عَدْوٌ (سرپٹ دوڑ) سے کم درجہ (کی رفتار) ہے (مجازاً) کسی اچھے یا برے کام کے لئے کوشش کرنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے :-

وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا (۲-۱۱۴) اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو۔

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ (۶۶-۸) (بلکہ) ان کا نور (ایمان) ان کے آگے .... چل رہا ہوگا۔

وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا (۵-۳۳) اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں۔

وَإِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ (۲-۲۰۵) اور جب پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے تو زمین میں (فتنہ انگیزی کرنے کے لئے) دوڑتا پھرتا ہے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى (۵۳-۳۹، ۴۰) اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش دیکھی جائے گی۔

وَاِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى (۹۲-۴) تم لوگوں کی کوشش طرح طرح کی ہے۔

وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (۱۷-۱۹) اور اس میں اتنی کوشش کرے جتنی اسے لائق ہے اور وہ مومن بھی ہو تو ایسے ہی لوگوں کی کوشش ٹھکانے لگتی ہے۔

فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ (۲۱-۹۴) تو اس کی کوشش رائگاں نہ جائے گی۔

لیکن اکثر طور پر سَعْيٌ کا لفظ افعال محمودہ میں استعمال ہوتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے۔[1] (الکامل)

(۲۲۸) إِنْ أَجْزِ عَلْقَمَةَ بْنَ سَيْفٍ سَعْيَهٗ
لَا أَجْزِهٖ بِبَلَاءِ يَوْمٍ وَّاحِدٍ

اگر میں علقمۃ بن سیف کو اس کی مساعی کا بدلہ دوں تو ایک دن کے حسن کردار کا بدلہ نہیں دے سکتا اور قرآن میں ہے :-

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ (۳۷-۱۰۲) جب وہ ان کے

---

[1] قاله الغنوي في مدح علقمة بن سيف العتابي والشعر قصة انظر التبريزي والبيت في الحماسة (۲: ۲۶۷) والمرزوقي رقم ۶۰۶ واللسان (ظلم) والبيان ۳/۲۳۱ والمعجم للمرزباني والبيت معزو للمرناق الطائي وفي المطبوع ابن سعد والتصحيح من البيان وشرح الحماسة والبيت ايضا في الحيوان (۳: ۴۶۷) في ثلاثة ۱۲

سا تھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا۔
یعنی اس عمر کو پہنچ گیا کہ کام کاج میں باپ کا ہاتھ بٹا سکے اور مناسکِ حج میں سَعْیٌ کا لفظ صفا اور مروہ کے درمیان چلنے کے لئے مخصوص ہو چکا ہے اور سعی بِهٖ کے معنی خاص کر چغلی کھانے اور صدقہ وصول کرنے کے آتے ہیں اور مکاتب غلام کے اپنے آپ کو آزاد کروانے کے لئے مال کمانے پر بھی سِعَایَۃٌ کا لفظ بولا جاتا ہے مُسَاعَاۃٌ کا لفظ فسق و فجور اور مَسْعَاۃٌ کا لفظ اچھے کاموں کے لئے کوشش کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ (۲۲-۵۱) اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں میں اپنے زعم باطل میں ہمیں عاجز کرنے کے لئے سعی کی۔ میں معجز کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے ہماری نازل کردہ آیات میں ہمارے عجز کو ظاہر کرنے کے لئے پوری طاقت صرف کر ڈالی۔

(س غ ب)

اَلْمَسْغَبَۃُ (س ن) بھوک چنانچہ آیت کریمہ:
اَوْ اِطْعٰمٌ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ (۹۰-۱۴) یا بھوک کے دن کھانا کھلانا۔
میں مَسْغَبَۃٌ سَغَبٌ سے مشتق ہے جس کے معنی بھوک سے درماندہ ہو جانے کے ہیں اور پیاس سے نڈھال ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے کہا جاتا ہے سَغِبَ (س) سَغَبًا وَسُغُوْبًا وَهُوَ سَاغِبٌ اور صفت کا صیغہ سَغْبَانٌ مثل عَطْشَانٌ بھی آتا ہے۔

(س ف ر)

اَلسَّفْرُ اصل میں اس کے معنی کشفِ غطاء یعنی پردہ اٹھانے کے ہیں اور یہ اعیان کے ساتھ مخصوص ہے جیسے سَفَرَ الْعِمَامَةَ عَنِ الرَّأْسِ اس نے سر سے عمامہ اتار دیا۔ سَفَرَ عَنْ وَجْهِهٖ چہرہ کھولا اور سَفَرَ الْبَيْتَ کے معنی گھر میں جھاڑو دینے اور کوڑا کرکٹ صاف کرنے کے ہیں اور جھاڑو کو مِسْفَرٌ اور اس گرد و غبار کو سَفِيْرٌ کہا جاتا ہے جو جھاڑو دے کر دور کی جاتی ہے۔
اَلْاِسْفَارُ (افعال) یہ الوان کے ساتھ مختص ہے یعنی کسی رنگ کے ظاہر ہونے پر بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:
وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ (۷۴-۳۴) اور قسم ہے صبح کی جب روشن ہو۔ اور فرمایا:
وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ (۸۰-۳۸) کتنے منہ اس روز چمک رہے ہوں گے۔
اور حدیث[۱] (۱۶۷)
اَسْفِرُوْا بِالصُّبْحِ تُوْجَرُوْا صبح خوب روشن ہونے کے بعد نماز پڑھا کرو تو زیادہ ثواب ملے گا۔ میں اَسْفِرُوْا اَسْفَرْتُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی روشنی میں داخل ہونے کے ہیں جیسے اَصْبَحْتُ (میں صبح میں داخل ہوا) سَفَرَ الرَّجُلُ اس نے سفر کیا اور سَافِرٌ (مسافر) کی جمع سَفْرٌ آتی ہے۔ جیسے رَاكِبٌ کی جمع رَكْبٌ (وعلی ہٰذا القیاس)۔

---

۱ کذا رواہ الشافعی فی اختلاف الحدیث (۲۰۷) والمعروف من الفاظ الحدیث اسفروا بالفجر فانہ اعظم للاجر من حدیث رافع بن خدیج رواہ الترمذی والشافعی فی الرسالۃ رقم ۳۴ وابن حبان فی زوائدہ رقم ۲۶۳، ۲۶۵ وفی ۲۶۲ اصبحوا بالصبح

اور سَافَرَ کے معنی ہیں اس نے سفر کیا یہ خاص کر باب مفاعلہ سے آتا ہے گویا اس میں جانبین یعنی وطن اور آدمی کے ایک دوسرے سے دور ہونے کے معنی کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اور سَفْرٌ سے ہی سُفْرَۃٌ کا لفظ مشتق ہے جس کے معنی طعام سفر یا توشہ دان ہیں جس میں سفری کھانا رکھا جاتا ہے قرآن میں ہے:۔
وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ (۴-۴۳)۔ اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو۔
اَلسِّفْرُ اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں حقائق کا بیان ہو گویا وہ حقائق کو بے نقاب کرتی ہے اس کی جمع اَسْفَارٌ آتی ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا (۶۲-۵) ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوئی ہوں۔
یہاں مُمَثَّلٌ بِہٖ میں خصوصیت کے ساتھ اَسْفار کا لفظ ذکر کرنے سے اس بات پر متنبہ کرنا مقصود ہے کہ تورات اگرچہ اپنے مضامین کو محقق طور پر بیان کرتی ہے لیکن جاہل یہود، پھر بھی اس کو نہیں سمجھ پاتے۔ لہٰذا ان کی مثال بعینہٖ اس گدھے کی سی ہے جو علم و حکمت کے پشتارے اٹھائے ہوئے ہو اور آیت بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ (۸۰-۱۵-۱۶) (ایسے) لکھنے والوں کے ہاتھوں میں جو سردار نیکوکار ہیں۔ میں سَفَرَۃ سے مراد وہ فرشتے ہیں جنہیں دوسری جگہ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ (۸۲-۱۱) (عالی قدر لکھنے والے۔ کہا ہے) اور یہ سَافِرٌ کی جمع ہے جیسے كَاتِبٌ کی جمع كَتَبَةٌ۔
اَلسَّفِیْرُ۔ اس فرستادہ کو کہا جاتا ہے جو مُرْسِلٌ کی غرض کو مُرْسَلٌ اِلَیْہِ پر کھولتا اور فریقین سے منافرت کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ فَعِیْلٌ بمعنی فاعل سے ہے اور سِفَارَۃٌ بمعنی رسالت آتا ہے پیغمبر، فرشتے اور (سماوی) کتابیں لوگوں پر حقائق کی کشادگی کرنے میں باہم شریک ہیں (اس لئے ان سب کو سَفِیْرٌ کہہ سکتے ہیں۔ اور سَفِیْرٌ (فعیل) بمعنی مفعول ہو تو اس کے معنی کوڑا کرکٹ کے ہوتے ہیں جو جھاڑو دے کر صاف کر دیا جاتا ہے۔ اور شاعر کے قول[1]۔

(۲۲۹) وَمَا السِّفَارُ قَبَّحَ السِّفَارِ

میں بعض نے سِفَار کے معنی اس لوہے کے کئے ہیں جو اونٹ کی ناک میں ڈالا جاتا ہے اور اس معنی پر اگر اس شعر کے علاوہ اور کوئی دلیل نہ ہو تو یہ مُسَافَرَۃٌ (مفاعلہ) کا مصدر بھی ہو سکتا ہے[2]۔

(س ف ع)

اَلسَّفْعُ کے معنی گھوڑے کو سواء ناصیہ یعنی پیشانی کے بال پکڑ کر کھینچنے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ (۹۶-۱۵) تو ہم (اس کی) پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹیں گے۔
اور سیاہی کے معنی کے اعتبار سے چولہے کے پتھروں (اَثَافِیْ) کو بھی سُفْعٌ کہا جاتا ہے۔ اور محاورہ ہے:۔ بِہٖ سُفْعَۃُ غَضَبٍ اس کے چہرہ پر غصے کا اثر ہے کیونکہ سخت غصہ کے وقت چہرہ کا رنگ دخانی سا ہو جاتا ہے۔ اور شکرے کو اَسْفَعُ کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے پر ...

---

[1] لہ لم اجدہ ۱۲ [2] کما قال حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ: لولا السِّفار وبعدہ خرق مَہمہ ۔ لترکتہا تحبو علی العرقوب وقول الاخطل لو بیقول البعض موقع اثر السفار بخطمہ من سود عقۃ او بنی الجوال ۱۲

میں سیاہ چمک سی پائی جاتی ہے۔ اور اِمْرَءَۃٌ سَفْعَاءُ اللَّوْنِ سیاہ رنگ عورت کو کہتے ہیں۔

(س ف ك)

اَلسَّفْكُ (ض) کے معنی خون ریزی کے ہیں۔

قرآن میں ہے:۔

وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (۲-۳۰) اور کشت و خون کرتا پھرے۔

ویسے یہ لفظ ہر سیال چیز اور آنسو بہانے کے متعلق بھی استعمال ہوتا ہے۔

(س ف ل)

اَلسُّفْلُ یہ عُلُوٌّ کی ضد ہے اور سَفُلَ (سَفُوْلًا) فَهُوَ سَافِلٌ کے معنی پست اور حقیر ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ (۹۵-۵) پھر (رفتہ رفتہ) اس کی حالت کو (بدل کر) پست سے پست کر دیا۔ نیز فرمایا:۔

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ (۹-۴۰) اور کافروں کی بات کو پست کر دیا۔

کبھی اَسْفَلُ "فوق" کے بالمقابل بھی استعمال ہوتا ہے چنانچہ فرمایا:۔

إِذْ جَاءُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ (۳۳-۱۰) جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی جانب سے تم پر (چڑھ) آئے۔

سُفَالَةُ الرِّيحِ ہوا کی بائیں جانب یعنی جدھر کو چل رہی ہو۔ اس کی ضد عُلَاوَۃٌ ہے جس کے معنی اوپر کی جانب کے ہیں یعنی جس طرف سے آ رہی ہو۔

اَلسَّفِلَةُ کمینے لوگ جیسے دُوْنٌ۔

اَمْرُهُمْ فِي سَفَالٍ ان کا معاملہ انحطاط میں ہے یعنی ان کی حالت دگرگوں ہے۔

(س ف ن)

اَلسَّفْنُ۔ اس کے اصل معنی چوب اور چمڑا وغیرہ کو چھیلنے کے ہیں اور سَفَنَ الرِّيحُ التُّرَابَ عَنِ الْاَرْضِ کے معنی ہیں۔ ہوا نے زمین سے مٹی کو کھس ڈالا۔ شاعر نے کہا ہے (الطویل) (۲۳۰) فَجَاءَ خَفِيًّا يَسْفِنُ الْاَرْضَ صَدْرُهُ[1] وہ زمین پر اپنا سینہ رگڑتے ہوئے پوشیدہ طور پر وہاں جا پہنچا۔ اور تراشی ہوئی چیز کو سَفِيْنٌ (فعیل بمعنی مفعول) کہتے ہیں جیسے نَقِيْضٌ بمعنی منقوض آ جاتا ہے اور اَلسَّفَنُ خاص کر اس کھردرے چمڑے کو کہا جاتا ہے جس کو تلوار کے قبضہ پر لگاتے ہیں اور چوب تراشی کے اوزار کو بھی مِسْفَنٌ کہا جاتا ہے جیسے تیشہ وغیرہ۔ اور چھیلنے کے معنی کے لحاظ سے کشتی کا نام سَفِيْنَةٌ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ وہ بھی سطح آب کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَأَمَّا السَّفِينَةُ (۱۸-۷۹) لیکن کشتی پھر مجازاً کشتی کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر آرام دہ سواری کو سَفِيْنَةٌ کہا جاتا ہے۔

---

[1] قالہ امرؤ القیس یصف ربیئاً یسفن ای یمسح وبجزہ: تری الترب منہ لاصقاً کل ملصق۔ والبیت فی اللسان (سفن)، و دیوانہ۔ ۹ وصنعۃ السندوبی، والعقد الثمین ۱۴ والمعانی الکبیر، ۔ ومختار الشعر الجاہلی ۱:۶، ونقد الشعر ۷۵ وفیہ لاصقاً کل ملزق وحضیاً بالمہملۃ، والبیت ایضاً فی تہذیب اصلاح المنطق (۱۱-۹۷) وفی الاصلاح ۴۰۵۔ ویروی بعض الطائیین ۱۲

(س ف ہ)

اَلسَّفَهُ اس کے اصل معنی جسمانی ہلکاپن کے ہیں اسی سے بہت زیادہ مضطرب رہنے والی مہار کو زِمَامٌ سَفِيْهٌ کہا جاتا ہے اور ثَوْبٌ سَفِيْهٌ کے معنی ردی کپڑے کے ہیں۔ پھر اسی سے یہ لفظ نقصان عقل کے سبب خفت نفس کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے سَفِهَ نَفْسَهٗ[1] جو اصل میں سَفِهَ نَفْسُهٗ ہے پھر اس سے فعل کی نسبت قطع کر کے بطور تمیز کے اسے منصوب کر دیا ہے جیسے بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهٗ کہ یہ اصل میں بَطِرَتْ مَعِيْشَتُهٗ ہے۔[2]

اور سَفَهٌ کا استعمال امور دنیوی اور اخروی دونوں کے متعلق ہوتا ہے چنانچہ امور دنیوی میں سفاہت کے متعلق فرمایا:۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمْ (۴-۵) اور بے عقلوں کو ان کا مال ...... مت دو۔

اور سفاہت اخروی کے متعلق فرمایا:۔

وَاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا (۷۲-۴) اور یہ کہ ہم میں سے بعض بیوقوف خدا کے بارے میں جھوٹ افترا کرتے ہیں۔

یہاں سفاہت دینی مراد ہے جس کا تعلق آخرت سے ہے اور آیت کریمہ:۔

اَنُؤْمِنُ كَمَا اٰمَنَ السُّفَهَاءُ اَلَا اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ (۲-۱۳) تو کہتے ہیں بھلا جس طرح بیوقوف ایمان لے آئے ہیں اسی طرح ہم بھی ایمان لے آئیں؟۔

میں ان کو سفیہ کہہ کر متنبہ کیا ہے کہ ان کا مؤمنین کو سُفَهَاءُ کہنا بنا بر حماقت ہے اور خود ان کی نادانی کی دلیل ہے۔ اسی معنی میں فرمایا:۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا (۲-۱۴۲) احمق لوگ کہیں گے کہ مسلمان جس قبلہ پر (پہلے سے چلے) آتے تھے اب اس سے کیوں منہ پھیر بیٹھے۔

(س ق ر)

سَقَرُ۔ (جہنم) یہ اصل میں سَقَرَتْهُ الشَّمْسُ وَصَقَرَتْهُ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں اسے دھوپ نے جھلس دیا اور پگھلا دیا۔ پھر جہنم کا علم بن گیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ (۷۴-۴۲) کہ تم دوزخ میں کیوں پڑے۔

اور نیز فرمایا:۔

ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ (۵۴-۴۸) اب آگ کا مزہ چکھو۔

پھر چونکہ سَقَرُ اپنے اصل کے لحاظ سے جھلس دینے کے معنی کو مقتضی ہے اس لئے آیات:۔

وَمَا اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ (۷۴-۲۷ تا ۲۹) اور تم کیا سمجھے کہ سقر کیا ہے؟ (وہ آگ ہے کہ) نہ باقی رکھے گی اور نہ چھوڑے گی اور بدن کو جھلس کر سیاہ کر دے گی۔

میں متنبہ کیا گیا ہے کہ سقر کے جو احوال تم مشاہدہ سے جانتے ہو اس کا معاملہ اس سے بالکل جدا ہے۔

---

[1] وفی الآیۃ (۲-۱۳۰) الا من سفہ نفسہ۔ [2] وفیہ اختلاف قال المبرد انہ متعد بنفسہ فلا تاویل کما ورد فی الحدیث الکبر ان تسفہ الحق وعند البعض منصوب علی التمییز کما ذہب الیہ المؤلف راجع الکشاف ۱۔ ...

(س ق ط)

اَلسُّقُوْطُ (ن) اس کے اصل معنی کسی چیز کے اوپر سے نیچے گرنے کے ہیں مثلاً کسی انسان کا چھت سے گر پڑنا یا اس کا بوڑھا ہو کر نیچے جھک جانا۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنْ یَّرَوْا کِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا (۵۲-۴۴)
اور اگر یہ آسمان (سے عذاب) کا کوئی ٹکڑا گرتا ہوا دیکھیں۔

فَاَسْقِطْ عَلَیْنَا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ۔ (۲۶-۱۸۷)
تو ہم پر آسمان سے ایک ٹکڑا لا گراؤ

اور اس کے معنی قدر قیمت اور مرتبہ کے لحاظ سے گر جانا بھی آتے ہیں جیسے فرمایا:۔

اَلَا فِی الْفِتْنَۃِ سَقَطُوْا (۹-۴۹) دیکھو یہ آفت میں پڑ گئے۔

اَلسَّقْطُ وَالسُّقَاطَۃُ ناکارہ اور ردی چیز کو کہتے ہیں اور اسی سے رَجُلٌ سَاقِطٌ ہے جس کے معنے کمینے آدمی کے ہیں۔ اَسْقَطَہٗ کَذَا فلاں چیز نے اس کو ساقط کر دیا۔

اور اَسْقَطَتِ الْمَرْءَۃُ (عورت نے نا تمام حمل گرا دیا) میں اوپر سے نیچے گرنا اور ردی ہونا دونوں معنی اکٹھے پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ اَسْقَطَتِ الْمَرْءَۃُ اس وقت بولتے ہیں جب عورت ناتمام بچہ گرا دے اور اسی سے ناتمام بچہ کو سَقْطٌ یا سِقْطٌ کہا جاتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے کر چقماق کی ہلکی سی (ناقص) چنگاری کو سِقْطُ الزَّنْدِ کہا جاتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ کبھی اس کے ساتھ بچہ کو بھی موسوم کیا جاتا ہے اور آیت کریمہ:۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِیْٓ اَیْدِیْہِمْ (۷-۱۴۹) اور جب وہ نادم ہوئے۔
میں پشیمان ہونا مراد ہے[1]۔ اور آیت:۔

تُسٰقِطْ عَلَیْکِ رُطَبًا جَنِیًّا (۱۹-۲۵) تم پر تازہ کھجوریں جھڑ پڑیں گی۔
میں ایک قراءت تَسَّاقَطْ بھی ہے اور اس کا فاعل نَخْلَۃ ہے اور ایک قراءت میں تَسَاقَطْ ہے جو اصل میں تَتَسَاقَطُ فعل مضارع کا صیغہ ہے اس میں ایک تاء محذوف ہے اس صورت میں یہ باب تفاعل سے ہوگا اور یہ اگرچہ فَاعَلَ کا مطاوع آتا ہے۔ لیکن کبھی متعدی بھی ہو جاتا ہے جیسا کہ تَجَرَّعَہٗ میں باب تَفَعَّلَ متعدی ہے۔ اور ایک دوسری قرأت میں یَسَّاقَطْ (صیغہ مذکر) ہے اس صورت میں اس کا فاعل جِذْع ہوگا[2]۔

(س ق ف)

سَقْفُ الْبَیْتِ مکان کی چھت کو کہتے ہیں اس کی جمع سُقُفٌ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَلِبُیُوْتِہِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّۃٍ (۴۳-۳۳) (ہم) ان کے گھروں کی چھتیں چاندی کی بنا دیتے۔

اور آیت کریمہ:۔

وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ (۵۲-۵) اور اونچی چھت کی قسم۔ میں مراد آسمان ہے جیسا کہ آیت:۔ وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا (۲۱-۳۲) میں آسمان کو محفوظ چھت فرمایا ہے۔

اور ہر وہ جگہ جو مُسَقَّفٌ ہو اسے سقیفہ کہا جاتا ہے جیسے صُفَّۃٌ (چبوترہ)، مکان وغیرہ۔

اور چھت کے ساتھ تشبیہ دے کر ہر اس لمبی چیز

---

[1] راجع (زبیدی) [2] راجع للقراءات التاج (سقط)

کو جس میں خم سا پایا جائے مُسَقَّفٌ کہہ دیتے ہیں۔

(س ق م)

اَلسَّقَمُ وَالسُّقْمُ خاص کر جسمانی بیماری کو کہتے ہیں بخلاف مَرَضٌ کے کہ وہ جسمانی اور قلبی دونوں قسم کی بیماریوں کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (۲-۱۰) ان کے دلوں میں (کفر کا) مرض تھا۔ اور آیت:۔

فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ (۳۷-۸۹) اور کہا میں تو بیمار ہوں۔ میں سَقِیْمٌ کا لفظ یا تو تعریض کے طور پر استعمال ہوا ہے اور یا زمانہ ماضی یا مستقبل کی طرف اشارہ کے لئے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ہلکی سی بدنی تکلیف کی طرف اشارہ ہو جو اس وقت ان کو عارض تھی۔ کیونکہ انسان بہرحال کسی نہ کسی عارضہ میں مبتلا رہتا ہے اگرچہ وہ اسے محسوس نہ کرے اور خوفناک جگہ کو مَکَانٌ سَقِیْمٌ کہا جاتا ہے۔

(س ق ی)

اَلسَّقْیُ وَالسُّقْیَا کے معنی پینے کی چیز دینے کے ہیں اور اِسْقَاءٌ کے معنی پینے کی چیز پیش کر دینے کے ہیں تاکہ حسب منشا لے کر پی لے لہذا اِسْقَاءٌ بنسبت سَقْیٌ کے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ اِسْقَاء میں مَا یُسْقٰی مِنْهُ کے پیش کر دینے کا مفہوم پایا جاتا ہے کہ پینے والا جس قدر چاہے اس سے نوش فرمالے۔ مثلاً۔ اَسْقَیْتُهٗ نَهْرًا کے معنی یہ ہوں گے کہ میں نے اسے پانی کی نہر پر لے جاکر کھڑا کر دیا۔ چنانچہ قرآن میں سَقْیٌ کے متعلق فرمایا۔ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (۷۶-۲۱) اور ان کا پروردگار ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

وَسُقُوْا مَاءً حَمِیْمًا (۴۷-۱۵) اور ان کو کھولتا ہوا پانی پلایا جائیگا۔

وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ (۲۶-۷۹) اور وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

اور اِسْقَاء کے متعلق فرمایا:۔

وَاَسْقَیْنٰکُمْ مَّاءً فُرَاتًا (۷۷-۲۷) اور تم لوگوں کو میٹھا پانی پلایا۔

فَاَسْقَیْنٰکُمُوْهُ (۱۵-۲۲) اور ہم ہی تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں۔

اور آیت کریمہ:۔

نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهَا (۲۳-۲۱) (کہ) جو ان کے پیٹوں میں ہے اس سے ہم تمہیں دودھ پلاتے ہیں۔ میں ایک قرأت فتحہ نون کے ساتھ بھی ہے۔

سِقْیٌ۔ کے معنی پانی کا حصہ اور سیراب شدہ زمین دونوں آتے ہیں کیونکہ سِقْیٌ بمعنی مَسْقِیٌّ (اسم مفعول) کے ہے جیسے نِقْضٌ بمعنی مَنْقُوْضٌ۔ اور یہ دونوں چیزیں بھی مفعول بنتی ہیں اس لئے سِقْیٌ کا لفظ ان دونوں پر بولا جاسکتا ہے۔

اَلْاِسْتِسْقَاءُ کے معنی کسی سے پانی طلب کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی (۲-۶۰) اور جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم کے لئے (خدا سے) پانی مانگا۔

اَلسِّقَاءُ (مشکیزہ) وہ برتن جس میں پینے کی چیز رکھی جائے اسی سے ہے اَسْقَیْتُكَ جِلْدًا کہ میں نے تمہیں (مشکیزہ بنانے کے لئے چمڑا دیا) اور آیت کریمہ:۔

جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ (۱۲-۷۰) (تو) اپنے

بھائی کے شلیتے میں پینے کا برتن رکھ دیا۔
میں سِقَايَةَ سے مراد وہی ہے جسے (بعد کی آیت میں) صُوَاعَ الْمَلِكِ کہا گیا ہے اس ایک ہی برتن کے یہ دو نام دو اعتبار سے ہیں یعنی اس کے ساتھ پانی پینے کے لحاظ سے اسے سِقَايَةَ کہا ہے اور اس لحاظ سے کہ اس کے ساتھ غلہ ماپا جاتا ہے اسے صُوَاعَ کہدیا ہے۔

(س ك ب)

مَاءٌ مَسْكُوبٌ کے معنی بہائے ہوئے پانی کے ہیں[1]۔
اور تیز رفتار گھوڑے کو فَرَسٌ سَكْبُ الْجَرْيِ کہا جاتا ہے۔ محاورہ ہے:۔ سَكَبْتُهُ فَانْسَكَبَ میں نے اسے بہایا تو وہ بہہ پڑا اور دَمْعٌ (آنسوؤں) کو بصورت فاعل تصور کر کے سَاكِبٌ (بہنے والے) کہا جاتا ہے اور کبھی دَمٌ مُنْسَكِبٌ بھی بولتے ہیں اور باریک کپڑے کو بھی سیال چیز کے ساتھ تشبیہ دے کر ثَوْبٌ سَكْبٌ کہدیتے ہیں گویا وہ بہتا ہوا پانی ہے۔

(س ك ت)

اَلسُّكُوْتُ (ن) اس کے اصل معنی تو ترکِ کلام یعنی خاموش ہونے کے ہیں۔ اور بہت زیادہ چپ رہنے والے آدمی کو رَجُلٌ سِكِّيْتٌ وَسَاكُوْتٌ کہا جاتا ہے اور سَكْتَةٌ یا سُكَاتٌ مرض سکتہ کو کہتے ہیں اور موسیقی میں سَكْتٌ کا لفظ سکون نفس کے ساتھ مخصوص ہے اور افتتاح صلوٰۃ کی حالت اور قرأت سے فارغ ہونے کے بعد سکوت کرنے کو سَكَتَاتٌ فِي الصَّلٰوةِ کہا جاتا ہے۔
اَلسُّكَيْتُ دوڑ میں سب سے آخر آنے والا گھوڑا

پھر چونکہ سکوت میں ایک گونہ سکون پایا جاتا ہے۔ اس لئے آیت:۔
وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُوْسَى الْغَضَبُ (۷-۱۵۴) اور جب موسیٰ (علیہ السلام) کا غصہ فرو ہوا۔
میں بطور استعارہ غصے کے فرو ہو جانے کے لئے سَكَتَ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

(س ك ر)

اَلسُّكْرُ اصل میں اس حالت کو کہتے ہیں جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان حائل ہو جاتی ہے اس کا عام استعمال شراب کی مستی پر ہوتا ہے اور کبھی شدت غضب یا غلبۂ عشق کی کیفیت کو سُکر سے تعبیر کر لیا جاتا ہے اسی لئے شاعر نے کہا ہے[2] (
۲۳۱) سُكْرَانِ سُكْرُ هَوًى وَسُكْرُ مُدَامَةٍ
نشے دو ہیں ایک نشۂ محبت اور دوسرا نشہ شراب۔
اور اسی سے سَكَرَاتُ الْمَوْتِ (موت کی بیہوشی) ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ (۵۰-۱۹) اور موت کی بے ہوشی حقیقت کھولنے کو طاری ہو گئی۔
اَلسَّكَرُ (بفتح السین والکاف) نشہ آور چیز۔ قرآن میں ہے:۔
تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ..... (۱۶-۶۷) کہ ان سے شراب بناتے ہو اور عمدہ رزق کھاتے ہو۔
اور شراب سے انسان اور اس کی عقل کے درمیان بھی چونکہ دیوار کی طرح کوئی چیز حائل ہو جاتی ہے اس اعتبار سے سَكْرٌ کے معنی پانی کو بند لگانے اور روکنے کے آجاتے ہیں اور اس بند کو جو پانی روکنے

---

[1] و فی القرآن وماءٍ مسکوب (۵۶-۳۱) [2] وتمامہ فمتی یفیق فتی بہ سکران؟ والبیت فی الرسالۃ بغیر عزو و فی المطبوع ظلم بغیر ۱۲ ؛

کے لئے لگایا جائے سکر کہا جاتا ہے (یہ فعل بمعنی مفعول ہے) اور آیت :۔

اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا ...... (۱۵۔۱۵) کہ ہماری آنکھیں مخمور ہوگئی ہیں۔ میں سُكِّرَتْ بعض کے نزدیک شکر سے ہے اور بعض نے سکر سے لیا ہے اور پھر سکر سے سکون کے معنی لے کر پرسکون رات کو لَيْلَةٌ سَاكِرَةٌ کہا جاتا ہے۔

(س ک ن)

اَلسُّكُوْنُ (ن) حرکت کے بعد ٹھہر جانے کو سکون کہتے ہیں اور کسی جگہ رہائش اختیار کر لینے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور سَكَنَ فُلَانٌ مَكَانَ كَذَا کے معنی ہیں اس نے فلاں جگہ رہائش اختیار کر لی۔ اسی اعتبار سے جائے رہائش کو مَسْكَنٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع مَسَاكِنُ آتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔

لَا يُرٰى اِلَّا مَسَاكِنُهُمْ ...... (۴۶۔۲۵) کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔

اور فرمایا :۔

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ (۶۔۱۳) اور جو مخلوق رات اور دن میں بستی ہے سب اسی کی ہے۔

لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ (۲۸۔۷۲) تاکہ تم اس میں آرام کرو۔ تو پہلے معنی یعنی سکون سے (فعل متعدی) سَكَّنْتُهٗ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کسی کو تسکین دینے یا ساکن کرنے کے ہیں اور اگر معنی سکونت مراد ہو تو اَسْكَنْتُهٗ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔

رَبَّنَا اِنِّيْ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ (۱۴۔۳۷) اے پروردگار میں نے اپنی اولاد ...... لا بسائی ہے۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ (۶۵۔۶) مطلقہ) عورتوں کو (ایام عدت میں) اپنے مقدور کے مطابق وہیں رکھو جہاں خود رہتے ہو۔

اور آیت :۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ (۲۳۔۱۸) اور ہم نے آسمان سے ایک اندازہ کے ساتھ پانی نازل کیا پھر اسے زمین میں ٹھہرایا۔ میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو وجود میں لانے اور پھر ایجاد کے بعد اسکے نابود کر دینے پر قادر ہے جیسا کہ آیت کے تتمہ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے اَلسَّكَنُ کے معنی سکون کے ہیں اور ہر وہ چیز جس سے راحت حاصل ہو اسے سَكَنٌ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا (۱۶۔۸۰) اور خدا ہی نے تمہارے لئے گھروں کو سکون کی جگہ بنایا۔ اور فرمایا :۔

اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (۹۔۱۰۳) تمہاری دعا ان کے لئے موجب تسکین ہے۔

وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا (۶۔۹۷) اور اسی نے رات کو (موجب) آرام ٹھہرایا۔

اور سَكَنٌ اس آگ کو بھی کہتے ہیں جس کے ساتھ سکون حاصل کیا جاتا ہے۔

اَلسُّكْنٰى کسی کو بغیر کرایہ کے رہائش کے لئے جگہ دینے کو سُكْنٰى کہا جاتا ہے اور ایک مکان میں رہنے والے لوگوں کو سَكْنٌ کہا جاتا ہے یہ سَاكِنٌ کی جمع ہے جیسے سَافِرٌ کی جمع سَفْرٌ آتی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ سَاكِنٌ کی جمع سُكَّانٌ (بضمہ سین) آتی ہے اور سُكَّان (بفتحہ سین) کشتی کے پتوار کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ کشتی کو ٹھہرایا جاتا ہے۔

اَلسِّکِّیْنُ (چھری) کو سکین اس لئے کہا جاتا ہے
(وہ مذبوح کی حرکت کو زائل کر دیتی ہے (تو یہ
سکون سے فِعِّیْلٌ کے وزن پر اسم مشتق ہے)
(ور آیت :-
نَزَّلَ السَّکِیْنَۃَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۴۸-۴)
(وہی تو ہے) جس نے مومنوں کے دلوں پر تسلی
نازل فرمائی -
(بعض نے کہا ہے کہ سَکِیْنَۃٌ سے مراد وہ فرشتے
(ہیں جو مومن کے دل کو تسکین دیتے ہیں - جیسا کہ
امیر المؤمنین (حضرت علیؓ) سے روایت ہے
(اِنَّ السَّکِیْنَۃَ لَتَنْطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ (حضرت
عمرؓ کی زبان پر سَکِیْنَۃٌ گویا ہے اور بعض نے
اس سے عقلِ انسانی مراد لی ہے اور عقل کو بھی جب
کہ وہ شہوات کی طرف مائل ہونے سے روک دے
سَکِیْنَۃٌ کہا جاتا ہے اور آیت :-
وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ . . . . . .
(۱۳-۲۸) اور جن کے دل یادِ خدا سے آرام پاتے ہیں -
بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے - اور بعض نے کہا
ہے کہ سَکِیْنَۃٌ اور سَکَنٌ کے ایک ہی معنی ہیں
یعنی رعب اور خوف کا زائل ہونا اور آیت :-
اَنْ یَّاْتِیَکُمُ التَّابُوْتُ فِیْہِ سَکِیْنَۃٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ
. . . . . (۲-۲۴۸) کہ تمہارے پاس ایک صندوق
آئیگا، اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے
تسلی ہوگی -
میں بھی یہی معنی مراد ہیں اور بعض مفسرین نے جو
یہ ذکر کیا ہے کہ وہ چیز تھی جس کا سر بلی کے سر کے
مشابہ تھا وغیرہ تو ہمارے نزدیک یہ قول صحیح نہیں ہے -
اَلْمِسْکِیْنُ بعض نے اس کی تفسیر مَنْ لَاشَیْئَ لَہٗ
(یعنی جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو) کے ساتھ کی ہے
اور یہ فقیر سے اَبلغ ہے (یعنی بنسبت فقیر کے زیادہ
نادار ہوتا ہے) لیکن آیت :-
وَاَمَّا السَّفِیْنَۃُ فَکَانَتْ لِمَسَاکِیْنَ (۱۸-۷۹) اور
کشتی غریب لوگوں کی تھی -
میں باوجود کشتی کا مالک ہونے کے انہیں مسکین
قرار دینا مَا یَؤُوْلُ کے لحاظ سے ہے یعنی کشتی
کے چلے جانے کے بعد کی حالت کے لحاظ سے
انہیں مسکین کہا گیا ہے - یا اس لئے کہ ان کی احتیاج
اور مسکنت کے مقابلہ میں کشتی کی کچھ بھی
حیثیت نہ تھی - اور آیت :-
وَضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ -
(۲-۶۱) اور آخر کار ذلت (ورسوائی) اور محتاجی
(وبے نوائی) ان سے چمٹا دی گئی -
میں اصح قول کے لحاظ سے مَسْکَنَۃٌ کی میم زائد
ہے (اور یہ سکون سے ہے)

(س ل ل)

سَلَّ (ن) الشَّیْئَ مِنَ الشَّیْئِ کے معنی
ایک چیز کے دوسری سے کھینچ لینے کے ہیں جیسے
تلوار کا نیام سے سونتنا - یا گھر سے کوئی چیز چوری
کھسکا لینا - قرآن میں ہے :-
یَتَسَلَّلُوْنَ مِنْکُمْ لِوَاذًا (۲۴-۶۳) جو تم میں
سے آنکھ بچا کر چل دیتے ہیں -
اسی مناسبت سے باپ کے نطفہ پر بھی یہ لفظ
بولا جاتا ہے - جیسے فرمایا :-
مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ . . . . (۳۲-۸)
خلاصے سے (یعنی) حقیر پانی سے پیدا کی -

لہ وفیہا حکایات غریبۃ راجع الدر للسیوطی ۱۲

یعنی وہ جوہر جو غذا کا خلاصہ ہوتا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں بطور کنایہ نطفہ مراد ہے۔ اور نطفہ پر اس کا اطلاق اس جوہر کے لحاظ سے ہے جس سے نطفہ بنتا ہے۔

اَلسُّلُّ ۔ سل کی بیماری کیونکہ یہ انسان سے گوشت اور قوت کو کھینچ لیتی ہے اور اَسَلَّہُ اللّٰہُ کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ نے اسے سل کی بیماری میں مبتلا کر دیا۔ حدیث میں ہے[1] (۱۷۷)

لَا اِسْلَالَ وَلَا اِغْلَالَ کہ چوری اور خیانت نہیں ہے۔

تَسَلْسَلَ الشَّیْءُ کے معنی کسی چیز کے مضطرب ہونے کے ہیں گویا اس میں بار بار کھسک جانے کا تصور کر کے لفظ کو مکرر کر دیا ہے تاکہ تکرار لفظ تکرار معنی پر دلالت کرے اسی سے سِلْسِلَۃٌ ہے جس کے معنی زنجیر کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا (۶۹-۳۲) پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے (جکڑ دو)۔

سِلْسِلَۃٌ کی جمع سَلَاسِلُ آتی ہے چنانچہ فرمایا:۔

سَلَاسِلَ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا (۷۶-۴) زنجیریں اور طوق اور دہکتی آگ (تیار کر رکھی ہے)۔

وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُوْنَ (۴۰-۷۱) اور زنجیریں ہوں گی اور گھسیٹے جائیں گے۔

ایک حدیث میں ہے[2] (۱۷۸)

يَا عَجَبًا لِقَوْمٍ يُقَادُوْنَ اِلَى الْجَنَّةِ بِالسَّلَاسِلِ اس قوم پر تعجب ہے جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے جنت کی طرف کھینچے جا رہے ہیں۔

اور مَاءٌ سَلْسَلٌ اس پانی کو کہتے ہیں جو اپنی قرارگاہ میں مضطرب ہو کر صاف ہو جائے۔ شاعر نے کہا ہے[3] (الطویل)

(۲۳۲) اَمْ مُهِلٌ اِلَیَّ مِنَ الرَّحِیْقِ السَّلْسَلِ

وہ مجھے شفاف شراب سے زیادہ مرغوب ہے۔

اور آیت (۷۶-۱۸) میں سَلْسَبِیْلًا (سلسبیل) کے معنی تیزی سے بہتے ہوئے صاف، لذیذ اور خوشگوار پانی کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ سَلْ اور سَبِیْل سے بنا ہے اور حَوْقَلَة وَبَسْمَلَة وغیرہ کی طرح الفاظ مرکبہ کے قبیل سے ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ ہر تیز رو چشمے کو سَلْسَبِیْل کہا جاتا ہے۔ اور زبان کے باریک سرے کو اَسَلَةُ اللِّسَان کہتے ہیں۔

(س ل ب)

اَلسَّلْبُ اس کے معنی کسی سے کوئی چیز چھین لینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ (۲۲-۷۳) اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے جائے تو اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے۔

اَلسَّلِيْبُ لٹا ہوا آدمی۔ وہ اونٹنی جس کا بچہ چھن گیا ہو اور اَلسَّلَبُ کے معنی چھینی ہوئی چیز اور درخت

---

[1] غریب ابی عبید (۱: ۸ ۱۹) وابوداؤد فی الجہاد والحاکم (۲: ۳۲۵) والفائق ۲/۱۳۲ والطبرانی عن کثیر بن عبداللہ عن ابیہ عن جدہ عمرو بن عوف سیاتی فی (غلل)۔ [2] الحدیث باختلاف الفاظہ فی (حم مرخ، د عن ابی ہریرۃ) راجع کنز العمال (۳/ ۱۷۸)

[3] قالہ ابو کبیر الہذلی (عامر بن الحلیس) وصدرہ: اَمْ لَا سبیل الی الشباب و ذکرہ والبیت فی اللسان (سلسل) ۔

سے اتاری ہوئی چھال کے ہیں۔ اور شاعر کے قول[1] (رجز)

(۲۳۳) فِی السُّلُبِ السُّوْدِ وَ فِی الْاَمْسَاحِ

(سیاہ ماتمی لباس اور ٹاٹ پہنے ہوتے ہیں)

میں بعض نے کہا ہے سیاہ ماتمی لباس مراد ہے جو مصیبت زدہ شخص پہن لیتا ہے اور ماتمی لباس کو سُلب اس لئے کہا جاتا ہے کہ اصل لباس اتار کر اسے پہنا جاتا ہے پھر جیسا کہ اَحَدَّتِ الْمَرْءَۃُ کا محاورہ ہے جس کے معنی ماتمی لباس پہننے کے ہیں ایسے ہی تَسَلَّبَتِ الْمَرْءَۃُ بھی کہا جاتا ہے

اَلْاُسْلُوْبُ طریقہ، روش جمع اَسَالِیْبُ۔

(س ل ح)

اَلسِّلَاحُ (سازِ جنگ) یعنی ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ساتھ لڑائی کی جائے جیسے تلوار، کمان، نیزہ چوب دستی وغیرہ۔ اس کی جمع اَسْلِحَۃٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔

وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ (۴-۱۰۲) اور ہوشیار اور مسلح ہو کر (تمہارے ساتھ نماز ادا کریں)

اَلْاِسْلِیْحُ۔ ایک قسم کی گھاس ہے جس کے کھانے سے اونٹ موٹے ہو جاتے ہیں مادہ اونٹنی کھالے تو اس کا دودھ بڑھ جاتا ہے گویا وہ موٹے ہو کر مسلح ہو گئے اور ذبح ہونے سے بچ گئے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[2] (الکامل)

(۲۳۴) اَزْمَانَ لَمْ تَاْخُذْ عَلَیَّ سِلَاحَهَا
اِبِلِیْ بِجِلَّتِهَا وَلَا اَبْكَارِهَا

اس زمانہ میں جب کہ میرے بڈھے اور جوان اونٹوں نے ہتھیار نہیں پہنے تھے یعنی موٹے نہیں ہوئے تھے۔

اَلسُّلَاحُ اصل میں اونٹ کے اس گوبر کو کہتے ہیں جو اسلیح گھاس کھانے کے بعد کرتا ہے پھر بطور کنایہ ہر فضلہ پر بولا جاتا ہے حتیٰ کہ حباری جانور کے متعلق مشہور محاورہ ہے۔

سِلَاحُهٗ سُلَاحُهٗ کہ اس کا فضلہ ہی اس کا ہتھیار ہے

(س ل خ)

اَلسَّلْخُ اس کے اصل معنی کھال کھینچنے کے ہیں۔ جیسے محاورہ ہے۔

سَلَخْتُهٗ فَانْسَلَخَ میں نے اس کی کھال کھینچی تو وہ کھچ گئی پھر اسی سے استعارہ کے طور پر زرہ اتارنے اور مہینہ کے گزر جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے سَلَخْتُ دِرْعَهٗ میں نے اس کی زرہ اتار لی۔ سَلَخَ الشَّهْرُ وَانْسَلَخَ مہینہ گزر گیا۔ قرآن میں ہے:۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ جب عزت کے مہینے گزر جائیں (۹-۵)

نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ ...... (۳۶-۳۷) کہ اس میں سے ہم دن کو کھینچ لیتے ہیں۔

---

[1] قالہ لبید حین ضرب عامر بن مالک وعنت لہ قینتان واختلف فی تدوینہ ففی اللسان (سلب) یخمش حراوجہ صحاح وفی المجمر (۳۷۴) ہذا اول البیت وعجزہ: وابنا ملاعب الرماح وبعدہ: یاعامرًا! یا عامر الصحاح۔ وعامرالکتیبۃ الرواح۔ ولہ قصۃ راجع المجمر والخطر فی الاشتقاق ۴ ۳۵ واللسان (نوح) [2] قالہ النمر بن تولب فی وصف الابل والبیت فی اللسان والمحکم (سلح، جلل) وامالی المرتضی (۲: ۹ا) والثمار ۹ ۷ ۲ والمعانی للقتبی ۹۱ ، ۳ ، ۱۲۳۱ والمیدانی (۱ : ۲۰۶ ، ۱۴ ، ۲۲ ، ۴۹ ، ۳۷ ، ۵۰) وفی اللسان ایام بدل ازمان وفی المطبوع علیَّ بدل الیَّ مصحف وللردمن سلاح الابل سمنہا وحسنہا وانہ یمنع صاحبہا من العقر والذبح وفی المرتضیٰ فی سلاح الابل اشعار والبیت ایضًا فی اللالئ مع السمط ۲ ۳۲ ۲ ، ۸۳ ، وغریب ابی عبید ۱۱ : ۰۵ ، ۲

اور محاورہ ہے۔
اَسْوَدُ سَالِخٌ مَسْلَخَ جِلْدَہٗ ۔ سیاہ سانپ نے اپنی کینچلی اتار دی اور کھجور کے جس درخت کی کچی کھجوریں جھڑ جائیں اسے نَخْلَۃٌ مِسْلَاخٌ کہا جاتا ہے۔

(س ل ط)

اَلسَّلَاطَۃُ اس کے معنی غلبہ حاصل کرنے کے ہیں اور سَلَّطْتُہٗ فَتَسَلَّطَ کے معنی ہیں میں نے اسے مقہور کیا تو وہ مقہور ہو گیا۔ قرآن میں ہے :۔
وَلَوْشَاءَ اللّٰہُ لَسَلَّطَھُمْ (۴-۸۹) اور اگر خدا چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا۔
وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُسَلِّطُ رُسُلَہٗ عَلٰی مَنْ یَّشَاءُ (۵۹-۶) لیکن خدا اپنے پیغمبروں کو جن پر چاہتا ہے مسلط کر دیتا ہے۔
اور اسی سے بادشاہ کو سلطان کہا جاتا ہے۔ اور سلطان کا لفظ تسلط اور غلبہ کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے فرمایا :۔
وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّہٖ سُلْطَانًا۔ (۱۷-۳۳) اور جو شخص ظلم سے قتل کیا جائے ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے۔
اِنَّہٗ لَیْسَ لَہٗ سُلْطَانٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّھِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطَانُہٗ عَلَی الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَہٗ۔ (۱۶-۹۹، ۱۰۰) کہ جو مومن ہیں اور اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں ان پر اس کا کچھ زور نہیں چلتا۔ اس کا زور انہیں لوگوں پر چلتا ہے جو اس کو رفیق بناتے ہیں۔
لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطَانٍ (۵۵-۳۳) اور زور کے سوا تم نہیں نکل سکتے۔

عام طور پر صاحب سلطنت کو سلطان کہا جاتا ہے اور حجت (دلیل) کو بھی سلطان کہا گیا ہے[1] کیونکہ دلوں پر اس کا دباؤ ہوتا ہے لیکن عام طور پر اس کا تسلط ان اصحاب علم و حکمت پر ہوتا ہے جو ایماندار و دیانتدار ہوں۔ قرآن میں ہے :۔
یُجَادِلُوْنَ فِیْ اٰیَاتِ اللّٰہِ بِغَیْرِ سُلْطَانٍ اَتَاھُمْ۔ (۴۰-۳۵) جو لوگ بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل آئی ہو خدا کی آیتوں میں جھگڑتے ہیں۔
فَاْتُوْنَا بِسُلْطَانٍ مُّبِیْنٍ (۱۴-۱۰) کھلی کھلی دلیل لاؤ۔ یعنی واضح دلیل اور حجت قائم کرو۔
وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطَانٍ مُّبِیْنٍ۔ (۱۱-۹۶) اور ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیاں اور دلیل روشن دے کر بھیجا۔
اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ عَلَیْکُمْ سُلْطَانًا مُّبِیْنًا۔ (۴-۱۴۴) کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر خدا کا صریح الزام لو۔ اور آیت :۔
ھَلَکَ عَنِّیْ سُلْطَانِیَہْ (۶۹-۲۹) (ہائے) میری سلطنت خاک میں مل گئی۔
میں سلطان کے دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں یعنی اس سے مراد دلیل بھی ہو سکتی ہے اور غلبہ بھی۔
اَلسَّلِیْطُ۔ اہل یمن کی زبان میں زیتون کے تیل کو کہتے ہیں اور سَلَاطَۃُ اللِّسَانِ کے معنی گفتگو پر قدرت کے ہیں اور یہ عموماً مذمت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور زبان دراز عورت کو اِمْرَءَۃٌ سَلِیْطَۃٌ کہا جاتا ہے اور سَنَابِکُ سَلِطَاتٌ کے معنی تیز سموں کے ہیں گویا قوت اور طول کی وجہ سے انہیں تسلط حاصل ہے۔

---

[1] وعن ابن عباسؓ : قد جاء السلطان بمعنی الحجۃ فی جمیع القرآن ۱۲

(س ل ف)

اَلسَّلَفُ کے معنی متقدم یعنی پہلے گزر جانے والا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّ مَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ (۴۳-۵۶) ان کو گئے گزرے کر دیا اور پچھلوں کے لئے عبرت بنا دیا۔

فَلَهٗ مَا سَلَفَ (۲-۲۷۵) تو جو پہلے ہو چکا وہ اسکا۔ یعنی اس کے پہلے گناہ کو معاف کر دیا جائے گا۔ اور اس پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔ اسی طرح آیت:۔

اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ (۴-۲۲)، مگر (جاہلیت میں) جو ہو چکا (سو ہو چکا)

میں ماسلف سے مراد یہ ہے کہ جو گناہ اس سے قبل ہو چکے ہیں وہ معاف کر دیئے جائیں گے۔ تو یہاں استثناء جواز فعل سے نہیں ہے کہ جو نکاح پہلے ہو چکے ہیں وہ جائز اور مباح ہیں بلکہ یہاں استثناء گناہ سے ہے یعنی اس سے قبل جو نکاح ہو چکے ہیں ان کا گناہ معاف کر دیا جائیگا اور اس پر کوئی گرفت نہیں ہوگی[1] اور لِفُلَانٍ سَلَفٌ کَرِیْمٌ کے معنی ہیں اس کے آباؤ و اجداد کریم تھے سَلَفٌ کی جمع اَسْلَافٌ اور سُلُوْفٌ آتی ہے۔

اور کسی چیز کی پیشگی قیمت ادا کرنے کو بھی سَلَفٌ کہا جاتا ہے۔

اَلسَّالِفَةُ گردن کے کنارے کو کہتے ہیں اور لڑائی میں ہراول دستہ یا سفر میں قافلہ سے آگے جانے والے لوگوں کو سَالِفَةٌ اور سَلَافٌ کہا جاتا ہے۔

سُلَافَةُ الْخَمْرِ باقی ماندہ عصیرہ۔ اَلسُّلْفَةُ (ناشتہ) یعنی وہ طعام جو مہمانی سے پہلے مہمان کو پیش کیا جائے۔ محاورہ ہے۔

سَلِّفُوْا ضَیْفَکُمْ وَلَهِّنُوْهُ اپنے مہمان کو نکل کھلاؤ۔

(س ل ق)

اَلسَّلْقُ قہر و غلبہ کے ساتھ دست یا زبان درازی کرنا کے ہیں اور اسی سے تَسَلَّقَ عَلَی الْحَائِطِ ہے جس کے معنی دیوار پھاندنے کے ہیں قرآن میں ہے:۔

سَلَقُوْکُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ (۳۳-۱۹) تو تیز زبانوں کے ساتھ تمہارے بارے میں زبان درازی کریں گے۔

محاورہ ہے۔ سَلَقَ اِمْرَاَتَهٗ اپنی عورت کو زبردستی لٹا کر اس کے ساتھ جماع کیا۔ مسیلمہ نے ایک عورت سے کہا۔[2] (

(۲۳۵) اِنْ شِئْتِ سَلَقْنَاكِ

کِ اِنْ شِئْتِ عَلٰی اَرْبَعٍ

چاہو تو چت لیٹ جاؤ اور چاہو تو پٹ لیٹو۔

اور سَلْقٌ کے معنی شلیتے کے ایک حلقہ کو دوسرے میں داخل کرنے کے ہیں اور میدہ کی روٹی کو سَلِیْقَةٌ کہا جاتا ہے اس کی جمع سَلَائِقُ آتی ہے۔ اور سَلِیْقَةٌ بمعنی طبیعت بھی آتا ہے اور سَلَقٌ کے معنی ہموار اور عمدہ زمین کے ہیں۔

(س ل ك)

اَلسُّلُوْكُ (ن) اس کے اصل معنی راستہ پر

---

[1] وفی البیضاوی: الاستثناء من المعنی اللازم للنہی ویحتمل الانقطاع (۵ انوار التنزیل ج ۱ ص ۸۳ بجلالین علی الھوامش) [2] فی اربع ابیات مقیدۃ القافیہ خاطب بہا سجاح التی تنبأت من بنی تغلب فی خلوۃ لہم واقعہا فصدقت بنبوتہ انظر القصۃ فی الطبری (۲: ۴۹۹) والمحاضرات ۴/ ۴۳۱ وفی روایتہ علقناک بدل سلقناک محرف ۱۲

چلنے کے ہیں۔ جیسے سَلَکْتُ الطَّرِیْقَ اور یہ فعل متعدی بن کر بھی استعمال ہوتا ہے یعنی راستہ پر چلانا چنانچہ پہلے معنی کے متعلق فرمایا۔

لِتَسْلُکُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا. (۷۱-۲۰) تاکہ اس کے بڑے بڑے کشادہ راستوں میں چلو پھرو۔

فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا (۱۶-۶۹) اور اپنے پروردگار کے صاف راستوں پر چلی جا۔

یَسْلُكُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ (۷۲-۲۷) اور اس کے آگے ..... مقرر کر دیتا ہے۔

وَسَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا (۲۰-۵۳) اور اس میں تمہارے لئے رستے جاری کئے۔

اور دوسرے معنی یعنی متعدی کے متعلق فرمایا۔

مَا سَلَكَكُمْ فِیْ سَقَرَ (۷۴-۴۲) کہ تم دوزخ میں کیوں پڑے۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ (۱۵-۱۲) اس طرح ہم اس (تکذیب وضلال) کو گنہگاروں کے دلوں میں داخل کر دیتے ہیں۔

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ (۲۶-۲۰۰) اسی طرح ہم نے انکار کو ..... داخل کر دیا۔

فَاسْلُكْ فِیْهَا (۲۳-۲۷) تو ... کشتی میں بٹھا لو۔

یَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا (۷۲-۱۷) وہ اس کو سخت عذاب میں داخل کرے گا۔

بعض نے سَلَكْتُ فُلَانًا فِیْ طَرِیْقِهٖ کی بجائے سَلَكْتُ فُلَانًا طَرِیْقًا کہا ہے اور عَذَابًا کو یَسْلُكْهُ کا دوسرا مفعول بنایا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ عَذَابًا فعل محذوف کا مصدر ہے اور یہ اصل میں نُعَذِّبُهٗ عَذَابًا ہے اور نیزے کی بالکل سامنے کی اور سیدھی ضرب کو طَعْنَةٌ سُلْكَةٌ کہا جاتا ہے۔ (سُلْکیٰ سیدھا نیزہ) اور سُلْكَةٌ مادہ کبک کو کہتے ہیں اس کا مذکر سُلَكٌ ہے۔

(س ل م)

اَلسِّلْمُ وَالسَّلَامَةُ کے معنی ظاہری اور باطنی آفات سے پاک اور محفوظ رہنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔

بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ..... (۲۶-۸۹) پاک دل (لے کر آیا وہ بچ جائیگا۔ یعنی وہ دل جو دغا اور کھوٹ سے پاک ہو تو یہ سلامت باطن کے متعلق ہے اور ظاہری عیوب سے سلامتی کے متعلق فرمایا:۔

مُسَلَّمَةٌ لَا شِیَةَ فِیْهَا (۲-۷۱) اس میں کسی طرح کا داغ نہ ہو۔

پس سَلِمَ یَسْلَمُ سَلَامَةً وَسَلَامًا کے معنی سلامت رہنے اور سَلَّمَهُ اللّٰهُ (تفعیل) کے معنی سلامت رکھنے کے ہیں۔ جیسے فرمایا:۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ (۸-۴۳) لیکن خدا نے (تمہیں) اس سے بچا لیا۔

اُدْخُلُوْهَا بِسَلَامٍ اٰمِنِیْنَ (۱۵-۴۶) ان میں سلامتی (اور خاطر جمع) سے داخل ہو جاؤ۔

اسی طرح فرمایا:۔

اِهْبِطْ بِسَلَامٍ مِّنَّا ..... (۱۱-۴۸) ہماری طرف سے سلامتی کے ساتھ ..... اتر آؤ۔

اور حقیقی سلامتی تو جنت ہی میں حاصل ہوگی جہاں کہ بقا ہے۔ فنا نہیں، غنا ہے احتیاج نہیں، عزت ہے۔ ذلت نہیں، صحت ہے بیماری نہیں چنانچہ اہل جنت کے متعلق فرمایا:۔

لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ (۶-۱۲۸) ان کے لئے ..... سلامتی کا گھر ہے۔

وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلٰى دَارِ السَّلَامِ (۱۰-۲۵) اور خدا سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلَامِ ..... (۵-۱۶) جس سے خدا اپنی رضامندی پر چلنے والوں کو نجات کے رستے دکھاتا ہے۔

ان تمام آیات میں سلام بمعنی سلامتی کے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں اَلسَّلَام اسمائے حسنیٰ سے ہے اور یہی معنی آیت لَهُمْ دَارُ السَّلَامِ میں بیان کئے گئے ہیں۔ اور آیت:۔

اَلسَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ (۵۹-۲۳) سلامتی امن دینے والا نگہبان۔

میں بعض نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وصفِ سلام کے ساتھ موصوف ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جو عیوب و آفات مخلوق کو لاحق ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب سے پاک ہے۔ اور آیت:۔

سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (۳۶-۵۸) پروردگار مہربان کی طرف سے سلام (کہا جائیگا)

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ (۱۳-۲۴) (اور کہیں گے) تم پر رحمت ہو (یہ) تمہاری ثابت قدمی کا بدلہ ہے۔

سَلَامٌ عَلٰى اِلْ يَاسِيْنَ (۳۷-۱۳۰) کہ الیاسین پر سلام اور اس مفہوم کی دیگر آیات میں سلام علیٰ آیا ہے تو ان میں لوگوں کی جانب سے تو سلامتی بذریعہ قول مراد ہے یعنی سَلَامٌ عَلَى الخ کے ساتھ دعا کرنا اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے سلامتی بالفعل مراد ہے یعنی جنت عطا فرمانا۔ جہاں کہ حقیقی سلامتی حاصل ہوگی جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اور آیت:۔

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا (۲۵-۶۳) اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو کرتے ہیں تو سلام کہتے ہیں۔

میں قَالُوْا سَلَامًا کے معنی ہیں ہم تم سے سلامتی چاہتے ہیں۔ تو اس صورت میں سَلَامًا منصوب بالفعل المضمر ہوگا یعنی نَطْلُبُ مِنْكَ السَّلَامَ اور بعض نے قَالُوْا سَلَامًا کے یہ معنی کئے ہیں کہ وہ اچھی بات کہتے ہیں تو اس صورت میں یہ مصدر محذوف یعنی قولًا کی صفت ہوگا۔ اور آیت کریمہ:۔

اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ (۵۱-۲۵) جب وہ ان کے پاس آئے تو سلام کہا۔ انہوں نے بھی (جواب میں) سلام کہا۔

میں دوسرے سلام پر رفع اس لئے ہے کہ یہ باب دعا سے ہے اور صیغہ دعا میں رفع زیادہ بلیغ ہے گویا اس میں حضرت ابراہیمؑ نے اس ادب کو ملحوظ رکھا ہے جس کا کہ آیت:۔

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا (۴-۸۶) اور جب تم کو کوئی دعا دے تو (جواب میں) تم اس سے بہتر (کلمے سے) (اسے) دعا دو۔

میں حکم دیا گیا ہے اور ایک قرأت میں سِلْمٌ ہے تو یہ اس بنا پر ہے کہ سَلَام (سِلْم (صلح)) کو چاہتا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے خوف محسوس کر چکے تھے پھر جب انہیں سلام کہتے ہوئے سنا تو اس کو پیغام صلح پر محمول کیا اور جواب میں سلام کہہ کر اس بات پر تنبیہ کی کہ جیسے تم نے پیغام صلح دیا ہے۔ ایسے ہی میری جانب سے بھی پیغام صلح قبول ہو۔

اور آیت کریمہ:۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا۔ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (۵۶-۲۵، ۲۶) وہاں نہ بیہودہ بات سنیں گے اور نہ گالی گلوچ (ہاں) ان کا کلام سلام

سلام (ہوگا)
کے معنی یہ ہیں کہ یہ بات صرف بذریعہ قول ہی نہیں ہوگی۔
بلکہ قولاً اور فعلاً دونوں طرح ہوگی۔ اسی طرح آیت:۔
فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ (۵۶-۹۱) تو کہا
جائیگا کہ تم پر داہنے ہاتھ والوں کی طرف سے سلام۔
میں بھی سلام دونوں معنی پر محمول ہوسکتا ہے اور آیت:۔
وَقُلْ سَلٰمٌ (۴۳-۸۹) اور سلام کہہ دو۔
میں بظاہر تو سلام کہنے کا حکم ہے لیکن فی الحقیقت
ان کے شر سے سلامتی کی دعا کرنے کا حکم ہے اور آیات
سلام جیسے:۔
سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ (۳۷-۷۹) (یعنی تمام
جہان میں ..... نوح پر سلام۔
سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ (۳۷-۱۲۰) کہ موسیٰ اور
ہارون پر سلام۔
سَلٰمٌ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ (۳۷-۱۰۹) ابراہیم پر سلام۔
میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان انبیاء (ابراہیم کو
اس قدر بلند مرتبہ عطا کیا تھا کہ لوگ ہمیشہ ان کی تعریف
کرتے اور ان کے لئے سلامتی کے ساتھ دعا کرتے رہیں
گے اور فرمایا:۔
فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ (۲۴-۶۱)
اور جب گھروں میں جایا کرو تو اپنے (گھر والوں) کو سلام
کیا کرو۔ یعنی تم ایک دوسرے کو سلام کہا کرو۔
اَلسَّلَامُ وَالسِّلْمُ وَالسَّلَمُ کے معنی صلح کے ہیں۔
چنانچہ فرمایا۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ
لَسْتَ مُؤْمِنًا (۴-۹۴) اور جو شخص تم سے سلام
علیک کہے اس سے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت اس شخص کے حق میں
نازل ہوئی ہے جسے باوجود اظہار اسلام اور طلب صلح
کے قتل کردیا گیا تھا اور فرمایا:۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً
(۲-۲۰۸) مومنو! اسلام میں پورے پورے
داخل ہو جاؤ۔
وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ (۸-۶۱) اور اگر یہ لوگ صلح
کی طرف مائل ہوں۔
اس میں ایک قرأت سَلْم (بفتحہ سین) بھی ہے۔
وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِنِ السَّلَمَ (۱۶-۸۷)
اور اس دن خدا کے سامنے سرنگوں ہوجائیں گے۔
يُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ (۶۸-۴۳)
(اس وقت) سجدے کے لئے بلائے جاتے تھے۔
جب کہ صحیح وسالم تھے۔
اور آیت کریمہ:۔
وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ (۳۹-۲۹) اور ایک
آدمی خاص ایک شخص کا (غلام) ہے۔
میں ایک قراءت سَلْمًا وَسِلْمًا بھی ہے اور یہ دونوں
مصدر ہیں اور حَسَنٌ وَنَكَدٌ کی طرح صفت کے
صیغے نہیں ہیں کہا جاتا ہے۔
سَلِمَ سَلْمًا وَسِلْمًا جیسے رَبِحَ رَبْحًا وَرِبْحًا
اور بعض نے کہا ہے کہ سِلْمٌ اسم ہے اور اس
کی ضد حَرْبٌ ہے۔
اَلْاِسْلَامُ اس کے اصل معنی سِلْم (صلح) میں
داخل ہونے کے ہیں اور صلح کے معنی یہ ہیں کہ فریقین
باہم ایک دوسرے کی طرف سے تکلیف پہنچنے سے
بے خوف ہوجائیں۔ اور یہ اَسْلَمْتُ الشَّيْءَ
اِلٰى فُلَانٍ (باب افعال) کا مصدر ہے اور اسی
سے بیع سَلَم ہے۔
شرعاً اسلام کی دو قسمیں ہیں کوئی انسان محض
زبان سے اسلام کا اقرار کرے دل سے معتقد ہو
یا نہ ہو اس سے انسان کا جان ومال اور عزت محفوظ

ہو جاتی ہے مگر اس کا درجہ ایمان سے کم ہے اور آیت :۔
قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا (۴۹-۱۴) دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے کہدو کہ تم ایمان نہیں لائے (بلکہ یوں) کہو اسلام لائے ہیں۔
میں أَسْلَمْنَا سے یہی معنی مراد ہیں۔ دوسرا درجہ اسلام کا وہ ہے جو ایمان سے بھی بڑھ کر ہے اور وہ یہ ہے کہ زبان کے اعتراف کے ساتھ ساتھ دلی اعتقاد بھی ہو اور عملاً اس کے تقاضوں کو پورا کرے مزید برآں یہ کہ ہر طرح سے قضا و قدر الٰہی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ جیسا کہ آیت :۔
إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ (۲-۱۳۱) جب ان سے ان کے پروردگار نے فرمایا۔ کہ اسلام لے آؤ تو انہوں نے عرض کی کہ میں رب العالمین کے آگے سر اطاعت خم کرتا ہوں۔
میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق مذکور ہے اور فرمایا :۔
إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ (۳-۱۹) (کہ) دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے۔ اور آیت :۔
وَتَوَفَّنِي مُسْلِمًا (۱۲-۱۰۱) تو مجھے اپنی اطاعت (کی حالت) میں اٹھائیو۔ کا مفہوم یہ ہے کہ مجھے ان لوگوں میں داخل کیجو جو تیری رضا کے تابع ہیں اور بعض نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ مجھے کلیتہً شیطان کے پنجے سے آزاد کر دے۔ جیسا کہ شیطان نے کہا تھا۔
لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ (۳۸-۸۳) میں ان سب کو بہکاتا رہوں گا۔ سوا ان کے جو تیرے خالص بندے ہیں۔ اور آیت :۔
إِنْ تُسْمِعُ إِلَّا مَنْ يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا فَهُمْ مُسْلِمُونَ (۳۰-۵۳) تم تو انہیں لوگوں کو سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں سو وہی فرمانبردار ہیں۔
میں مسلمون سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کے تابع اور فرمانبردار ہیں۔ اور آیت :۔
يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا (۵-۴۴) اسی کے مطابق انبیا جو (خدا کے) فرمانبردار تھے ..... حکم دیتے رہے ہیں۔
میں وہ انبیاء مراد ہیں جو اگرچہ اولوالعزم پیغمبروں کے تابع تھے لیکن حکم الٰہی سے ہدایت پا گئے تھے اور مستقل شرائع لے کر مبعوث ہوئے تھے۔
اَلسُّلَّمُ اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ بلند مقامات پر چڑھا جاتا ہے۔ تاکہ سلامتی حاصل ہو پھر سَبَبٌ کی طرح ہر اس چیز کو سُلَّمٌ کہا گیا ہے جو کسی بلند جگہ تک پہنچنے کا وسیلہ بنے چنانچہ قرآن میں ہے :۔
أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَسْتَمِعُونَ فِيهِ (۵۲-۳۸) یا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے جس پر (چڑھ کر آسمان سے باتیں) سن آتے ہیں۔
أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ (۶-۳۵) یا آسمان میں سیڑھی (تلاش کرو)
اور شاعر نے کہا ہے[1]۔ (الطویل)
(۲۲۳) وَلَوْ نَالَ أَسْبَابَ السَّمَاءِ بِسُلَّمٍ
گو سیڑھی لگا کر آسمان پر کیوں نہ چڑھ جائے۔
اور سَلَمٌ وَسِلَامٌ ایک قسم کے بڑے درخت کو کہتے ہیں کیونکہ وہ ہر قسم کی آفت سے محفوظ سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] لہ زہیر واولہ ومن ہاب اسباب المنیۃ ینلنہ ..... وفی اللسان وام یدن نال وتدمرنی (دبرہ)، وفی البیع لابن الانباری ۲۸۱۹، ولو رام ان یرقی السماء بسلم ۱۲

اَلسِّلَامُ ایک قسم کا سخت پتھر اس کا واحد سَلِمَۃٌ ہے۔

(س ل و)

اَلسَّلْوٰی اصل میں ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے لئے تسلی کا باعث ہو اسی سے اَلسُّلْوَان وَالتَّسَلِّیْ ہے جس کے معنی اطمینان اور راحت کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔

وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی ۔۔۔۔۔

(۲-۵۷) اور تمہارے لئے من وسلوٰی اتارتے رہے۔ میں بعض نے کہا ہے کہ بٹیر کی قسم کے جانور مراد ہیں۔ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ من ایک چیز ہے جو آسمان سے اترتی تھی اور سلوٰی ایک پرند کا نام ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے حضرت ابن عباسؓ کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ مَنّ اور سَلْوٰی کے الفاظ بطور مثال کے ذکر کئے گئے ہیں اور مراد وہ رزق ہے جو اللہ تعالےٰ نے گوشت اور سبزیوں کی صورت میں انہیں دیا تھا۔ اصل میں سلوٰی کا لفظ تَسَلِّیْ سے ماخوذ ہے اور سَلَیْتُ عَنْ کَذَا وَسَلَوْتُ عَنْہُ وَتَسَلَّیْتُ کے معنی کسی چیز سے تسلی حاصل کرنے اور اس کی محبت کو بھلا دینے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ سُلْوَان اسے کہتے ہیں جو انسان کو تسلی دے اور ایک قسم کے مہرے کو بھی سُلْوَانٌ کہا جاتا ہے جسے عرب لوگ محبت اور عشق سے تسلی حاصل کرنے کے لئے گھس کر پیتے تھے۔

(س م م)

اَلسَّمُّ (بفتحہ سین وضمہ آں) کے معنی تنگ سوراخ کے ہیں جیسے سوئی کا ناکہ یا ناک اور کان کا سوراخ ہوتا ہے۔ اس کی جمع سُمُوْمٌ آتی ہے قرآن میں ہے۔

حَتّٰی یَلِجَ الْجَمَلُ فِیْ سَمِّ الْخِیَاطِ (۷-۴۰) یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے نہ نکل جائے۔ اور سَمَّمَہٗ (ن) کے معنی کسی چیز میں گھس جانے کے ہیں۔ اور اسی سے "اَلسَّامَّۃُ" ہے یعنی وہ خاص لوگ جو ہر معاملہ میں گھس کر اس کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں اور انہیں دُخْلُلٌ بھی کہا جاتا ہے۔

اَلسَّمُّ۔ زہر قاتل کو کہتے ہیں کیونکہ یہ اپنے لطف تاثیر سے بدن کے اندر سرایت کر جاتی ہے اور یہ اصل میں مصدر بمعنی فاعل ہے۔

اَلسَّمُوْمُ (لو) گرم ہوا جو زہر کی طرح بدن کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُوْمِ (۵۲-۲۷) اور ہمیں لو کے عذاب سے بچا لیا۔

فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ۔ (۵۶-۴۲) (یعنی دوزخ کی) لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی میں۔

وَالْجَانَّ خَلَقْنٰہُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ۔ (۱۵-۲۷) اور جنوں کو اس سے بھی پہلے دھوئیں کی آگ سے پیدا کیا تھا۔

(س م د)

اَلسَّامِدُ غافل تکبر سے سر اٹھانے والا یہ سَمَدَ الْبَعِیْرُ فِیْ سَیْرِہٖ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹ کے گردن اٹھا کر تیز چلنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

وَاَنْتُمْ سَامِدُوْنَ (۵۳-۶۱) اور تم غفلت میں پڑے رہے ہو۔

اور سَمَدَ رَأْسَہٗ وَسَبَدَ کے معنی سر کے بالوں کو جڑ سے مونڈ ڈالنے کے ہیں۔

(س م ر)

اَلسُّمْرَۃُ گندمی رنگ کو کہتے ہیں اور کنایہ کے طور پر سَمْرَاءُ گندم کو کہا جاتا ہے اور اَلسَّمَارُ پتلا دودھ جس میں بکثرت پانی کی آمیزش ہو۔

اَلسُّمْرَۃُ ببول کا درخت غالباً اس کی رنگت کے اعتبار سے یہ نام رکھا گیا ہے۔

اَلسَّمَرُ۔ اصل میں رات کی تاریکی کو کہتے ہیں اور اسی سے محاورہ ہے[1] (مثل) لَا اٰتِیْکَ السَّمَرَ وَالْقَمَرَ کہ میں تیرے پاس کبھی نہیں آؤں گا پھر رات کو باتیں کرنا کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے اور سَمَرَ فُلَانٌ کے معنی ہیں اس نے رات کو باتیں کی۔ اسی سے مشہور محاورہ ہے[2]

لَا اٰتِیْکَ مَا سَمَرَ ابْنَا سَمِیْرٍ کہ میں تیرے پاس کبھی نہیں آؤں گا اور آیت کریمہ:۔

مُسْتَکْبِرِیْنَ بِہٖ سٰمِرًا تَہْجُرُوْنَ (۲۳-۶۷)

ان سے سرکشی کرتے کہانیوں میں مشغول ہوتے اور بیہودہ بکواس کرتے تھے۔

میں بعض نے اس کے معنی سُمَّار کئے ہیں تو ان کے نزدیک مفرد موضع جمع میں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ سَامِرٌ کے معنی تاریک رات کے ہیں۔ سَامِرٌ کی جمع سُمَّارٌ۔ سَمَرَۃٌ اور سَامِرُوْنَ آتی ہے۔ اور سَمَرْتُ الشَّیْءَ (ن) کے معنی کسی چیز میں میخ لگا کر مضبوط اور استوار کرنے کے ہیں اور مہمل چھوڑے ہوئے اونٹوں کو اِبِلٌ مُسَمَّرَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اور سَامِرِیٌّ ایک قبیلہ کی طرف نسبت ہے۔

(س م ع)

اَلسَّمْعُ۔ قوت سامعہ۔ کان میں ایک حاسہ کا نام ہے جس کے ذریعہ آوازوں کا ادراک ہوتا ہے اور اس کے معنی سننا (مصدر) بھی آتے ہیں اور کبھی اس سے خود کان مراد لیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَعَلٰی سَمْعِھِمْ (۲-۷)

خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے۔

اور کبھی لفظ سِمَاعٌ کی طرح اس سے مصدری معنی مراد ہوتے ہیں (یعنی سننا) چنانچہ قرآن میں ہے:۔

اِنَّھُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (۲۶-۲۱۲) وہ (آسمانی باتوں کے سننے (کے مقامات) سے الگ کر دیئے گئے ہیں۔

اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ (۵۰-۳۷) یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے۔

اور کبھی سَمْعٌ کے معنی فہم و تدبر اور کبھی طاعت بھی آجاتے ہیں مثلاً تم کہو۔ اِسْمَعْ مَا اَقُوْلُ لَکَ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ لَمْ تَسْمَعْ مَا قُلْتُ لَکَ تم نے میری بات سمجھی نہیں۔

قرآن میں ہے:۔

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْھِمْ اٰیٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا ..... (۸-۳۱) اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتے ہیں (یہ کلام) ہم نے سن لیا ہے اگر چاہیں تو اسی طرح کا (کلام) ہم بھی کہدیں۔

اور آیت:۔ سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا (۲-۹۳) (وہ کہنے لگے) ہم نے سن تو لیا۔ مگر مانتے نہیں کے معنی ہیں

---

[1] انظر المثل المستقصی والثمار ۲۲ والعسکری ۱۹۶، ۲/۲۲۹ واللسان والتاج (سمر) ۱۲ [2] اِبْنَا سَمِیْرٍ اللیل والنہار والمراد الدہر فمعنی المثل لا آتیک ابداً راجع السمط ۵۳۰

ہم نے تمہاری بات سمجھ لی ہے مگر ماننے کے نہیں۔

اسی طرح آیت :۔

سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (۲-۲۸۵) کے معنی ہیں ہم نے تیرا حکم سمجھ لیا اور قبول کیا"

اور آیت :۔ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ (۸-۲۱) اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جو کہتے ہیں کہ ہم نے (حکم خدا) سن لیا مگر حقیقت میں (نہیں سنتے۔

میں سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ ہم نے سمجھ لیا حالانکہ وہ سمجھتے نہیں۔ اور یہ بھی کہ ہم نے سمجھ لیا مگر وہ اس کے مطابق عمل نہیں کرتے کیونکہ جب انہوں نے اس کے مطابق عمل نہ کیا تو گویا اس شخص کی طرح ہیں جو سرے سے سنتا ہی نہیں۔

پھر اس کے بعد فرمایا۔ وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا ...... (۸-۲۳) اگر خدا ان میں نیکی (کا مادہ) دیکھتا تو ان کو سننے کی توفیق بخشتا اور اگر (بغیر صلاحیت ہدایت کے) سماعت دیتا تو وہ .... بھاگ جاتے۔

تو یہاں بھی وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ کے معنی ہیں اگر وہ انہیں قوت فہم بخشتا جس سے وہ سمجھتے۔ اور آیت (۴-۴۶) میں وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ (سنیئے نہ سنوائے جاؤ) کا محاورہ دو طرح بولا جاتا ہے۔ ایک بد دعا کے طور پر کہ وہ بہرا ہو جائے۔ دوم دعا کے طور پر پہلے معنی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ اَسْمَعَكَ اللّٰهُ۔ اللہ تجھے بہرہ کر دے اور دوسرے معنی کے لحاظ سے اَسْمَعْتُ فُلَانًا بولتے ہیں یعنی میں نے فلاں کو خوب سنائیں یعنی گالیاں دیں تو یہ گال دینے کے معنی میں متعارف ہے۔

مروی ہے کہ اہل کتاب نبی صلعم کو یہ کلمہ کہا کرتے اور اس سے آں حضرت کو اس فریب میں ڈالنے کی کوشش کرتے کہ وہ آپ کی تعظیم کرتے ہیں اور آپ کے حق میں دعا کرتے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ آپ کے حق میں بددعا کرتے تھے۔

ہر وہ مقام جہاں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے لئے سماعت کو ثابت کیا ہے یا کفار سے اس کی نفی کی ہے یا اس کی کوشش پر رغبت دلائی ہے تو اس سے مقصود اس کلام کے معنی کی طرف توجہ دینا اور اس میں غور و فکر کرنا ہے۔ جیسے فرمایا :۔

اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا (۷-۱۹۵) یا ان کے کان ہیں جن سے سنیں ؟۔

اور (کفار سے نفی کرتے ہوئے) فرمایا :۔

صُمٌّۢ بُكْمٌ (۲-۱۸) (یہ) بہرے ہیں گونگے ہیں۔

وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ (۴۱-۴۴) اور ان کے کانوں میں گرانی (یعنی بہراپن) ہے۔

اور جب سمع کے ساتھ ذات باری تعالیٰ متصف ہو تو اس سے مراد یا تو یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمام مسموعات کا علم ہے یا یہ کہ اس نے جزا دینے کا ارادہ فرمایا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے :۔

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا (۵۸-۱) (اے پیغمبر) جو عورت تم سے اپنے شوہر کے بارے میں بحث و جدال کرتی ہے .... خدا نے اس کی التجا سن لی۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا (۳-۱۸۱) خدا نے ان لوگوں کا قول سن لیا ہے جو کہتے ہیں کہ .....

اور آیت کریمہ :۔

اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاۗءَ (۲۷-۸۰) کچھ شک نہیں کہ تم مردوں کو (بات) نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو .... آواز سنا سکتے ہو۔

میں لَا تُسْمِعُ کے معنی یہ ہیں کہ تم انہیں کچھ بھی سمجھا نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ اپنی بدعملی کی وجہ سے قوت عاقلہ کو جو کہ انسانیت کے لئے مخصوص سرمایۂ حیات ہے کھو بیٹھے ہیں مردوں کی طرح ہیں۔ اور آیت:۔
اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ (۱۸-۲۶) وہ کیا خوب دیکھنے والا اور کیا خوب سننے والا ہے۔
میں اس شخص کے متعلق فرمایا کہ یہ شخص حکمت الٰہی کے عجائبات سے کس قدر آگاہ ہے۔ اور ذات باری تعالیٰ کے متعلق مَا اَبْصَرَهٗ وَمَا اَسْمَعَهٗ کہنا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ پہلے یہ بیان ہو چکا ہے کہ ذات باری تعالیٰ کو صرف انہی صفات کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے جو بطریق سمع ثابت ہوں۔ اور کفار کے متعلق جو یہ فرمایا ہے۔
اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا (۱۹-۳۸) وہ جس دن ہمارے سامنے آئیں گے کیسے سننے والے اور کیسے دیکھنے والے ہوں گے۔
تو اس کے معنی یہ ہیں جو باتیں ان کے اپنے نفوس پر ظلم کرنے اور نظر و فکر ترک کر دینے کی وجہ سے آج ان پر مخفی ہیں وہ اس روز ان کو سن اور دیکھ رہے ہونگے۔
اور فرمایا:۔
خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا (۲-۹۳) کہ جو کتاب تم کو دی گئی ہے اس کو زور سے پکڑے رہو اور جو تمہیں حکم ہوتا ہے اس کو سنو۔
سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ (۵-۴۲) (یہ) جھوٹی باتیں بنانے کے لئے جاسوسی کرنے والے۔
یعنی وہ سرداروں کے سامنے جھوٹی باتیں بنانے کیلئے تمہاری باتیں سنتے ہیں اور آیت:۔
سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ (۵-۴۱) اور ایسے لوگوں کے لئے جاسوسی کرتے ہیں جو ابھی تمہارے پاس نہیں آئے۔
یعنی وہ تمہاری باتوں کو ان تک پہنچانے کیلئے سنتے ہیں
اَلْاِسْتِمَاعُ اس کے معنی غور سے سننے کے ہیں جیسے فرمایا:۔ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ...... (۱۷-۴۷) یہ لوگ جب تمہاری طرف کان لگاتے ہیں تو جس نسبت سے یہ سنتے ہیں۔ ہم اسے خوب جانتے ہیں۔
وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ (۶-۲۵) اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو تمہاری (باتوں) کی طرف کان رکھتے ہیں۔
وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ (۱۰-۴۲) اور ان میں سے بعض ایسے ہیں جو تمہاری طرف کان لگاتے ہیں۔
وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ (۵۰-۴۱) اور سنو جس دن پکارنے والا ...... پکارے گا۔
اور آیت:۔ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ (۱۰-۳۱) یا (تمہارے) کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے۔
یعنی ان کا پیدا کرنے والا اور ان کی حفاظت کا متولی کون ہے۔
اور مِسْمَعٌ یا مَسْمَعٌ کے معنی کان کے سوراخ کے ہیں اور اسی کے ساتھ تشبیہ دے کر ڈول کے دستہ کو جس میں رسی باندھی جاتی ہو مِسْمَعُ الْغَرْبِ کہا جاتا ہے۔

(س م ک)

اَلسَّمْكُ چھت کو کہتے ہیں اور سَمَكَهٗ (ن) کے معنی بلند کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے۔ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا (۷۹-۲۸) اس کی چھت

کو اونچا کیا پھر اسے برابر کیا۔
شاعر نے کہا ہے۔ (الکامل)

(۲۲۷) إِنَّ الَّذِي سَمَكَ السَّمَاءَ بَنٰى لَنَا

وہ ذات جس نے آسمان کو بلند بنایا۔
اور ایک دعاء ماثورہ میں ہے (۱۷۹) یَا بَارِئَ السَّمٰوٰتِ الْمَسْمُوكَاتِ اے بلند آسمان کے پیدا کرنے والے۔
اور سَنَامٌ سَامِكٌ بلند کوہان کو کہتے ہیں اور ہر اس چیز کو جس سے کوئی چیز بلند کی جائے۔ اسے سِمَاكٌ (بکسرہ سین) کہا جاتا ہے اور سِمَاكٌ ایک ستارے کا نام بھی ہے اور اَلسَّمَكُ کے معنی مچھلی کے ہیں۔

(س م ن)

اَلسِّمَنُ کے معنی موٹاپہ کے ہیں اور یہ هُزَالٌ کی ضد ہے اور سَمِيْنٌ (صیغۂ صفت کے معنی ہیں فربہ ج سِمَانٌ قرآن میں ہے:۔
اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ (۱۲-۴۶) ہمیں اس خواب کی تعبیر بتایئے کہ سات موٹی گایوں۔۔۔۔
اور اَسْمَنْتُهٗ وَسَمَّنْتُهٗ کے معنی موٹا کرنے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔
لَا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ (۸۸-۷) جو نہ فربہی لائے اور نہ بھوک میں کچھ کام آئے۔
اَسْمَنْتُهٗ فربہ جانور خریدنے یا دینے کے ہیں۔ اور اِسْتَسْمَنْتُهٗ کے معنی فربہ پانے کے۔
اَلسُّمْنَةُ۔ ایک دوا جو فربہ ہونے کیلئے کھائی جاتی ہے۔
اَلسَّمْنُ۔ گھی کیونکہ گھی بھی فربہی کی قسم سے ہے اور اس کے کھانے سے انسان موٹا ہوتا ہے۔ اَلسُّمَانٰی ایک پرند کا نام ہے۔

(س م و)

سَمَاءٌ ہر شئے کے بالائی حصہ کو سَمَاءٌ کہا جاتا ہے شاعر نے ایک گھوڑے کی وصف میں کہا ہے۔ (الطویل)

(۲۲۸) وَاَحْمَرُ كَالدِّيْبَاجِ اَمَّا سَمَاؤُهٗ
فَرَيَّا وَاَمَّا اَرْضُهٗ فَمَحُوْلُ

وہ دیباج کی طرح سرخ ہے اس کا بالائی حصہ موٹا اور گدرا ہے اور زیریں حصہ لاغر اور سخت ہے۔
بعض نے کہا ہے (کہ یہ اسماء نسبیہ سے ہے) کہ ہر "سَمَاءٌ" اپنے ماتحت کے لحاظ سے "سَمَاءٌ" ہے لیکن اپنے مافوق کے لحاظ سے "اَرْضٌ" کہلاتا ہے۔ بجز سماء علیا (فلک الافلاک) کے کہ وہ ہر لحاظ سے سماء ہی ہے اور کسی کے لئے ارض نہیں بنتا۔ اور آیت:۔
اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ (۶۵-۱۲) خدا ہی تو ہے جس نے سات

لہ البیت للفرزدق من نقیضتہ المشہور مطلعہا ہذا البیت وتمامہ: بیتًا دعائمہ اعز واطول۔ والقصیدۃ فی دیوانہ (۲: ۷۱۴-۷۲۵) والنقائض (۱: ۱۸۲-۲۱۱) والبیت فی العمدۃ (۱: ۲۵۲) وفیہ قصۃ الفرزدق مع الطرماح ومجاز القرآن (۲: ۱۲۱) وشرح الدرۃ للخفاجی ۳۰۷ والمرزبانی فی العجم ۴۶۷ والموشح ۱۲۳ وابن عقیل رقم ۲۷۸ ومصارع العشاق ۷۷ والصاحبی ۲۵۷ والطبری (۱۲: ۳۷) والقرطبی (۱۶: ۲۱) والخزانۃ (۳: ۱۸۰۷) والاشباہ النحویہ (۳: ۱۹۳) والکامل ۶۹۷ والعینی (۴: ۳۱) ۲ہ وفی النوادر (۳۰۷) اللھم داحی المدحوات وباری المسموکات الخ وہذہ الصلوۃ فی ۱۰ اسطار۔ وہذہ من جملۃ من الصلوۃ علی النبی التی کان علیؓ یعلم الصحابۃ ۱۲ ۳ہ قالہ طفیل الغنوی وقد مر فی (ارض) ۱۲

آسمان پیدا کئے اور ویسی ہی زمینیں۔
کو اسی معنی پر محمول کیا ہے۔
نیز مَطَرٌ (بارش) کو بھی سَمَاءٌ کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اوپر سے آتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ سماء اس بارش کو کہا جاتا ہے جو ہنوز زمین پر نہ گری ہو تو اس میں بھی بلندی کے معنی ملحوظ ہیں۔
اور نباتات کو بھی سَمَاءٌ کہا جاتا ہے یا تو اسلئے کہ وہ بارش سے اگتے ہیں اور یا اس لئے کہ وہ زمین سے بلند ہوتے ہیں پھر لفظ سماء جو ارض کے بالمقابل ہے مؤنث ہے لیکن کبھی مذکر بھی آجاتا ہے اور واحد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
ثُمَّ اسْتَوىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوّٰهُنَّ (۲-۲۹)
پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک سات آسمان بنا دیا۔
اور کبھی اس کی جمع سَمٰوٰتٌ بھی بنا لیتے ہیں چنانچہ فرمایا:۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ (۳۱-۱۰) اسی نے آسمانوں کو۔۔۔۔ پیدا کیا۔
قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ (۲۳-۱۶) ان سے پوچھو کہ آسمانوں۔۔۔۔ کا پروردگار کون ہے؟۔
اور آیت:۔ اَلسَّمَاءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ (۷۳-۱۸) جس سے آسمان پھٹ جائیگا۔
میں سماء کو مذکر استعمال کیا ہے لیکن کئی ایک آیات جیسے إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ (۸۴-۱) جب آسمان پھٹ جائے گا۔
اور آیت:۔ إِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ (۸۲-۱) جب آسمان پھٹ جائے گا۔
میں مؤنث استعمال ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سماء کا لفظ اشجار میں نَخْلٌ یا اس قسم کے دوسرے اسماء جنس کی طرح ہے جو مذکر اور مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتے ہیں اور سَمَاءٌ کے معنی بارش ہوں تو یہ ہمیشہ مذکر استعمال ہوگا اور اس کی جمع اَسْمِيَةٌ آئے گی اور کسی بلند چیز کے کالبد کو سَمَاوَةٌ کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (رجز)
(۲۳۹) سَمَاوَةُ الْهِلَالِ حَتّٰى احْقَوْقَفَا
(راتیں بتدریجاً) افق پر ابھرے ہوئے چاند کو لپیٹتی رہیں حتیٰ کہ وہ ٹیڑھا ہو گیا۔
اور سَمَا إِلَى الشَّيْءِ کے معنی ہیں دور سے کسی چیز کا بلند شکل میں ظاہر ہونا۔
اور سَمَا الْفَحْلُ عَلَى الشَّوْلِ سَمَاوَةً سانڈھ اونٹ اونٹنی پر چڑھ گیا۔
اَلْاِسْمُ کسی چیز کی علامت جس سے اسے پہچانا جائے۔ یہ اصل میں سِمْوٌ ہے کیونکہ اس کی جمع اَسْمَاءٌ اور تصغیر سُمَيٌّ آتی ہے۔ اور اسم کو اسم اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے مسمیٰ کا ذکر بلند ہوتا اور اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا (۱۱-۴۱) اور (نوحؑ نے) کہا کہ خدا کا نام لے کر (کہ اسی کے ہاتھ میں) اس کا چلنا (ہے) سوار ہو جاؤ۔
وَإِنَّهُ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (۲۷-۳۰) وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور (مضمون یہ ہے) کہ شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔
اور آیت:۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاءَ (۲-۳۱) اور اس آدم کو سب (چیزوں کے) نام سکھائے۔

---

[1] قالہ العجاج واولہ ناج طواہ الاین مما وجفا طی اللیالی زلفا فزلفا والشطر فی اللسان (زلف) والمحکم (حقف) وقد مر فی (زلف) ۱۲

میں اسماء سے یہاں الفاظ و معانی دونوں مراد ہیں۔
خواہ مفرد ہوں خواہ مرکب اس اجمال کی تفصیل یہ ہے
کہ لفظ اسم دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ ایک اصطلاحی
معنی ہیں اور اس صورت میں ہمیشہ مخبر عنہ بنتا ہے۔
جیسے رَجُلٌ وَ فَرَسٌ دوم وضع اوّل کے لحاظ سے
اس اعتبار سے (کلمہ کی) انواع ثلاثہ یعنی مخبر عنہ (اسم)
خبر اور رابطہ (حرف) تینوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔
اور آیت کریمہ میں یہی دوسرے معنی مراد ہیں۔ کیونکہ
آدم علیہ السلام نے جس طرح اسماء کی تعلیم حاصل کی
تھی۔ اسی طرح افعال و حروف کا علم بھی انہیں حاصل
ہو گیا تھا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک کسی چیز کی
ذات کا علم حاصل نہ ہو محض نام کے جاننے سے انسان
اسے دیکھ کر پہچان نہیں سکتا مثلاً اگر ہم ہندی یا
رومی زبان میں چند چیزوں کے نام حفظ کر لیں تو ان
چیزوں کے اسماء کے جاننے سے ہم ان کے مسمیات
کو نہیں پہچان سکیں گے۔ بلکہ ہمارا علم انہیں چند
اصوات تک محدود رہے گا اس سے ثابت ہوا کہ
اسماء کی معرفت مسمیات کی معرفت کو مستلزم نہیں
ہے اور نہ ہی محض اسم سے مسمیٰ کی صورت ذہن میں
حاصل ہو سکتی ہے۔ لہٰذا آیت :۔
وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ میں اسماء سے کلام کی انواع
ثلاثہ اور صور مسمیات مع ان کی ذوات کے مراد ہیں۔
اور آیت :۔
مَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا
(۱۲-۴۰) جن چیزوں کی تم خدا کے سوا پرستش کرتے
ہو وہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے رکھ لئے ہیں۔
کے معنی یہ ہیں کہ جن اسماء کی تم پرستش کرتے ہو ان
کے مسمیات نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اصنام ان اوصاف
سے عاری تھے۔ جن کا کہ وہ ان اسماء کے اعتبار سے
ان کے متعلق اعتقاد رکھتے تھے۔ اور آیت :۔
وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ قُلْ سَمُّوهُمْ (۱۳-۳۳)
اور ان لوگوں نے خدا کے شریک مقرر کر رکھے
ہیں۔ ان سے کہو کہ (ذرا) ان کے نام تو لو۔
میں سَمُّوهُمْ سے یہ مراد نہیں ہے کہ لات، عزّیٰ
وغیرہ ان کے نام بیان کرو بلکہ آیت کے معنی یہ
ہیں کہ جن کو تم اِلٰہ (معبود) کہتے ہو ان کے متعلق
تحقیق کر کے یہ تو بتاؤ کہ آیا ان میں ان اسماء کے
معانی بھی پائے جاتے ہیں۔ جن کے ساتھ تم انہیں
موسوم کرتے ہو (یقیناً نہیں) اسی لئے اس کے بعد
فرمایا أَمْ تُنَبِّئُونَهُ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْأَرْضِ
أَمْ بِظَاهِرٍ مِنَ الْقَوْلِ ۔ ۔ ۔ ۔ (۱۳-۳۳) (کہ)
کیا تم اسے ایسی چیزیں بتاتے ہو جس کو وہ زمین
میں (کہیں بھی) معلوم نہیں کرتا یا (محض) ظاہری
(باطل اور جھوٹی) بات کی (تقلید کرتے ہو)
اور آیت :۔
تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ (۵۵-۷۸) تمہارے پروردگار
۔ ۔ ۔ ۔ کا نام بڑا با برکت ہے۔
میں اسم رب کے با برکت ہونے کے معنی یہ ہیں
کہ اس کی صفات۔ الکریم۔ العلیم۔ الباری، الرحمٰن
الرحیم کے ذکر میں برکت اور نعمت پائی جاتی
ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا :۔
سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (۸۷-۱) (اے پیغمبر)
اپنے پروردگار (جلیل الشان) کے نام کی تسبیح کرو۔
وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ (۷-۱۸۰) اور (خدا کے
نام سب اچھے ہی اچھے ہیں۔
اور آیت :۔
اِسْمُهُ يَحْيَىٰ لَمْ نَجْعَلْ لَهُ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا۔
(۱۹-۷) جس کا نام یحییٰ ہے۔ اس سے پہلے ہم نے

اس نام کا کوئی شخص پیدا نہیں کیا۔
(۴) میں سَمِيًّا کے معنی "ہم نام" کے ہیں، اور آیت:۔
هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا (۱۹-۶۵) بھلا تم اس کا کوئی ہم نام جانتے ہو۔
میں سَمِيًّا کے معنی نظیر کے ہیں یعنی کیا اس کی کوئی نظیر ہے جو اس نام کی مستحق ہو اور حقیقتاً اللہ کی صفات کے ساتھ متصف ہو اور اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کیا تم کسی کو ایسا بھی پاتے ہو جو اس کے نام سے موسوم ہو کیونکہ ایسے تو اللہ تعالیٰ کے بہت سے اسماء ہیں جن کا غیر اللہ پر بھی اطلاق ہو سکتا ہے یا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ ان سے معانی بھی وہی مراد ہوں جو اللہ تعالیٰ پر اطلاق کے وقت ہوتے ہیں۔ اور آیت:۔
يُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى (۵۳-۲۷) اور وہ فرشتوں کو (خدا کی) لڑکیوں کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔
میں لڑکیوں کے نام سے موسوم کرنے کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ فرشتوں کو "بنات اللہ" کہتے ہیں۔

(س ن ن)

اَلسِّنُّ دانت اس کی جمع اَسْنَانٌ آتی ہے قرآن میں ہے:۔
اَلسِّنُّ بِالسِّنِّ (۵-۴۵) دانت کے بدلے دانت
سَانَّ الْبَعِيْرُ النَّاقَةَ نر اونٹ نے دانت سے کاٹ کر اونٹنی کو نیچے بٹھا لیا۔
اَلسَّنُوْنُ (دانتوں کا منجن) ایک دوا جس سے دانتوں کا علاج کیا جاتا ہے۔
سَنَّ الْحَدِيْدَ کے معنی لوہے کو تیز کرنے (اور پگھلانے کے ہیں) اور جس چیز سے لوہے کو تیز کرتے ہیں اسے مِسَنٌّ (سان) کہا جاتا ہے اور اَلسِّنَانُ (بھالا) خاص کر اس لوہے کو کہتے ہیں جو نیزے کے سرے میں لگایا جاتا ہے۔ پھر سَنَّ الْحَدِيْدَ (تیز کرنا) کے ساتھ تشبیہ دے کر سَنَنْتُ الْبَعِيْرَ کہا جاتا ہے جس کے معنی اونٹ کو سخت ہنکا کر دبلا کر دینے کے ہیں اور پگھلانے کے معنی کے لحاظ سے سَنَنْتُ الْمَاءَ بولتے ہیں جس کے معنی پانی بہانے کے ہیں۔ محاورہ ہے۔
تَنَحَّ عَنْ سَنَنِ الطَّرِيْقِ (بسین مثلثہ) راستہ کے کھلے حصہ سے ہٹ جاؤ۔ پس سُنَنٌ کا لفظ سُنَّةٌ کی جمع ہے اور سُنَّةُ الْوَجْهِ کے معنی دائرہ رخ کے ہیں اور سُنَّةُ النَّبِيِّ سے مراد آنحضرت کا وہ طریقہ ہے جسے آپ اختیار فرماتے تھے۔ اور سُنَّةُ اللّٰهِ سے مراد حق تعالیٰ کی حکمت اور اطاعت کا طریقہ مراد ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (۴۸-۲۳) (یہی) خدا کی عادت ہے جو پہلے سے چلی آتی ہے اور تم خدا کی عادت کبھی بدلتی نہ دیکھو گے۔
وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (۳۵-۴۳) اور خدا کے طریقے میں کبھی تغیر نہ دیکھو گے۔
تو آیت میں اس بات پر تنبیہ پائی جاتی ہے۔ کہ شرائع کے فروعی احکام کی گو مختلف صورتیں چلی آئی ہیں لیکن ان سب سے مقصد ایک ہی ہے۔ یعنی نفس کو پاک کرنا اور اسے اللہ تعالیٰ کے ہاں ثواب اور اس کا جوار حاصل کرنے کے لئے تیار کرنا اور یہ مقصد ایسا ہے کہ اس میں اختلاف یا تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور آیت:۔
مِنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ (۱۵-۲۶) سڑے ہوئے گارے سے۔

میں بعض نے کہا ہے کہ مسنون کے معنی متغیر کے ہیں۔ اور آیت:۔
لَمْ يَتَسَنَّهْ ..... (۲-۲۵۹) دسری ایسی نہیں۔ میں لَمْ يَتَسَنَّهْ کے معنی بھی لَمْ يَتَغَيَّرْ ہیں اس میں ہا استراحت یعنی سکتہ کی ہے[1]۔

(س ن م)

قرآن میں ہے:۔ وَمِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ (۸۳-۲۷) اور اس میں تسنیم (کے پانی) کی آمیزش ہوگی۔
بعض نے کہا ہے کہ تَسْنِيمٍ جنت میں ایک اعلیٰ قسم کے چشمے کا نام ہے۔ جیسا کہ بعد میں اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:۔
عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ (۸۳-۲۸) وہ ایک چشمہ ہے جس میں سے (خدا کے) مقرب پئیں گے۔

(س ن و)

اَلسَّنَا (اسم مقصور) چمک دار روشنی کو کہتے ہیں اور اَلسَّنَاءُ (ممدود) کے معنی رفعت کے ہیں۔ اور معنی رفعت کے اعتبار سے آب کشی کے جانور کو "سَانِيَةٌ" کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ (۲۴-۴۳) اور بادل میں جو بجلی ہے اس کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر کے بینائی کو اچکے لئے جاتی ہے۔
اور سَنَتِ النَّاقَةُ تَسْنُو کے معنی ہیں اونٹنی نے کنوئیں سے پانی نکالا اور زمین کو سیراب کیا اور ایسی اونٹنی کو سَانِيَةٌ کہا جاتا ہے (والجمع السوانی)
اَلسَّنَةُ (سال) اس کی اصل دو طرح بیان کی جاتی ہے ایک یہ کہ اصل میں سَنْهَةٌ ہے کیونکہ محاورہ ہے سَانَهْتُ فُلَانًا کہ میں نے فلاں سے سالانہ اجرت پر معاملہ کیا۔ نیز اس کی تصغیر سُنَيْهَةٌ آتی ہے اور ایک قول کے مطابق اسی سے لَمْ يَتَسَنَّهْ (۲-۲۵۹) ہے جس کے معنی ہیں کہ وہ سالہا سال گزر جانے سے بھی متغیر نہیں ہوا اور نہ ہی اس کی تازگی ختم ہوئی ہے۔
بعض کے نزدیک اس کی اصل سَنْوَةٌ ہے۔ کیوں کہ اس کی جمع سَنَوَاتٌ آتی ہے اور اسی سے سَانَيْتُ فعل ہے اس صورت میں سَنَةٌ میں ہا برائے وقف ہوگی۔ جیسا کہ کِتَابِيَهْ و حِسَابِيَهْ میں ہے[2]۔ قرآن میں ہے:۔
أَرْبَعِينَ سَنَةً (۵-۲۶) چالیس برس کے لئے۔
سَبْعَ سِنِينَ دَأَبًا (۱۲-۴۷) سات سال متواتر۔
ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ (۱۸-۲۵) تین سو برس۔
اور آیت:۔
وَلَقَدْ أَخَذْنَا آلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِينَ (۷-۱۳۰) اور ہم نے فرعونیوں کو کئی سال تک قحط میں مبتلا رکھا۔
میں سنین سے مراد قحط سالی ہے اور زیادہ تر سَنَةٌ کا لفظ قحط سالی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ محاورہ ہے۔
أَسْنَتَ الْقَوْمُ لوگ قحط سالی میں مبتلا ہو گئے۔

---

[1] بناء علی قراءۃ حمزۃ والکسائی واصلہ عندہم لم یتسنی زمن الحاو ، ویحتمل ان یکون اصلہ لم یتسنن ماخوذا من سنن فابدلت نونہ الاخیرۃ حرف علۃ وسقطت بالجزم (راجع انوار التنزیل) ۱۲ [2] اصحاب المعاجم ذکرہ فی (س ن ہ) و (س ن و) ۱۲

شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل):

(۲۴۰) لَهَا اَرَجٌ مَاحَوْلَهَا غَيْرُ مُسْنِتٍ

جس کی خوشبو مہک رہی ہو اور اسکے ارد گرد تازگی پھیلی ہوئی ہو۔ دوسرے شاعر نے کہا ہے[2]

(الطویل مخروم)

(۲۴۱) فَلَيْسَتْ بِسَنْهَاءٍ وَلَا رُجَّبِيَّةٍ

اسے نہ تو خشک سالی نے نقصان پہنچایا ہے اور نہ ہی کمزور ہونے کی وجہ سے اسے ستون لگا کر کھڑا کیا گیا ہے۔

واضح ہے کہ اس شعر میں ہاء اصلی ہے۔ ایک اور شاعر نے کہا ہے[3]

(۲۴۲) يَاكُلُ اَزْمَانَ الْهُزَالِ وَالسِّنِيّ

جو ہزال اور قحط سالی کے زمانہ میں چرتا رہا ہو۔

یہاں اَلسِّنِيّ سَنَةٌ سے مُرَخَّمٌ نہیں ہے۔ بلکہ یہ فُعُوْلٌ کے وزن پر جمع ہے جیسے مِائَةٌ کی جمع مِئِيْنَ وَمِئُوْنَ آتی ہے اور عِصِيٌّ کی طرح فاء کلمہ مکسور ہے مگر برعایت قافیہ تخفیف کر کے ایک یا کو ساقط کر دیا گیا ہے۔ اور آیت:۔

لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ (۲-۲۵۵) اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند

میں سِنَةٌ وَسَنٌ سے ہے اور اس باب سے خارج ہے۔

(س ھ ر)

اَلسَّاهِرَةُ کے معنی میدان یا روئے زمین کے ہیں قرآن میں ہے:۔

فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ (۷۹-۱۴) اس وقت وہ (سب) میدان (حشر) میں آ جمع ہوں گے۔

بعض نے کہا ہے کہ سَاهِرَةٌ سے مراد روئے زمین (یعنی یہی زمین) ہے اور بعض کے نزدیک اَرْضِ آخرت مراد ہے اور اصل میں سَاهِرَةٌ اس زمین کو کہتے ہیں جس پر کثرت سے آمد و رفت ہو۔ گویا وہ آمد و رفت سے بیدار ہو چکی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[4] (الطویل)

(۲۴۳) تَحَرَّكُ يَقْظَانُ التُّرَابِ وَنَائِمُهٗ

تو بیدار اور سوئی زمین ہل جاتی ہے۔

اور ناک کی دونوں رگوں کو اَسْهَرَانِ کہا جاتا ہے۔

(س ھ ل)

اَلسَّهْلُ کے معنی نرم زمین کے ہیں اس

---

[1] قاله الشنفرى الازدى وصدره: بريحانة من حلية نورت . . . . والبيت من كلمة مفضلية رقم ۲۰ فی ۳۶ بیتا انظر الاغانی (۲۱-۹۰) والبیت فی اللسان (حلا) والمحکم (روح)، [2] قاله سويد بن الصامت الانصارى وقد نسب الى احيحة بن الجلاح قال فی السمط (۱: ۳۶۱) والاول اثبت وتمامه: ولكن عرايا فی السنين الجوائح۔ فی ابيات الرصف نخلا بالجودة يقول: نخلي ليست بسنهاء ولا ممنوعة الثمر ولكن اعريها الناس: رُجَبِيَّة "يروى بفتح الجيم بالتخفيف والتشديد وكلاهما نسب نادر والتشديد اذهب فی الشذوذ اه وفی مجالس ثعلب السنهاء النخلة التی تحمل سنة وسنة لا والرجبية التی يخاف سقوطها فيعمل لها رجبة وفی السمط الرجبة الخطيرة تبنى حول النخلة تمنع بها من ثمرها اه ليست ممنوعة الثمر واللفظان اختلف فی تفسيرهما راجع اللسان (رجب، سنة، عری) ومجالس ثعلب (۲: ۲۸۵) والقرطبی (۳: ۲۹۳) والئالی (۱: ۱۲۰) واضداد ابی الطيب ۴۶۹ ومعانی القرآن المنسوب الی الفراء (۱: ۱۷۳) وغريب القرآن للقتبی ۴۹ [3] والبیت فی اللسان (حتم) بغير عزو قال ابن بری: الشطر لامرءة من بنی عقيل تفخر باخوالها من اليمن وذكر ابو زيد انه للعامرية وصلته: حيدة خالی ولقيط وعلی وحاتم الطائی وهاب المئی - ولم يكن كخالك العبد الدعی . . . . هيلب غير ميتة غمر ذكی [4] قاله ابن هبيرة فی قصيدة وصدره: اذا نحن سرنا بين شرق ومغرب راجع الحماسة بشرح التبريزی ۲/۴۹ والمرزوقی ۳۰۰ والحيوان لابن ناقيا ص ۲۶۹ بد

کی جمع سُھُوْل آتی ہے اور یہ حَزْنٌ کی ضد ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُھُوْلِھَا قُصُوْرًا (۷-۷۴) (کہ) نرم زمین سے (مٹی لے کر) محل تعمیر کرتے ہو

اور اَسْھَلَ کے معنی نرم زمین میں جانے کے ہیں اور رَجُلٌ سَھْلِیٌّ کے معنی میدانی علاقہ کا باشندہ آدمی کے ہیں نَھْرٌ سَھْلٌ چھوٹے ریگ ناک اور نرم خو آدمی کو رَجُلٌ سَھْلُ الْخُلُقِ کہا جاتا ہے۔ (اس کی ضد) حَزْنُ الْخُلُقِ ہے اور سُھَیْلٌ ایک ستارے کا نام ہے۔

(س ھ م)

اَلسَّھْمُ وہ تیر جو چلایا جاتا ہے نیز قرعہ اندازی کے تیر وغیرہ کو سَھْمٌ کہا جاتا ہے۔ اسی سے قرآن میں ہے:۔

فَسَاھَمَ فَکَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ (۳۷-۱۴۱) اس وقت قرعہ ڈالا تو انہوں نے زک اٹھائی۔

اور اِسْتَھَمُوْا (افتعال) کے معنی قرعہ اندازی کرنے کے ہیں اور بُرْدٌ مُسَھَّمٌ اس چادر کو کہتے ہیں جس پر تیر کی تصویر ہو۔

سَھَمَ (ف) سُھُوْمًا۔ اَلْوَجْہُ لاغری کی وجہ سے چہرے کا متغیر ہونا۔ اور اَلسُّھَامُ (بالضم والفتح) اس مرض کو کہتے ہیں جس سے چہرہ متغیر ہو جاتا ہے۔

(س ھ و)

اَلسَّھْوُ (ن) وہ غلطی جو غفلت کی وجہ سے سرزد ہو اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے اسباب اور مولدات انسان کے اپنے اختیار سے پیدا کردہ نہ ہوں جیسے مجنوں آدمی کا کسی انسان کو گالی دینا۔ دوم یہ کہ اس کے مولدات انسان کے خود پیدا کردہ ہوں جیسے کوئی شخص شراب نوشی کرے اور پھر اس سے (نشہ میں) بغیر ارادہ کے کوئی برائی صادر ہو پہلی قسم کی خطا تو عفو کے حکم میں ہے لیکن دوسری قسم کی خطا پر مواخذہ ہوگا۔ اور اس دوسری قسم کے سہو کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

فِیْ غَمْرَۃٍ سَاھُوْنَ (۵۱-۱۱) بے خبری میں بھولے ہوئے ہیں۔

عَنْ صَلٰوتِھِمْ سَاھُوْنَ (۱۰۷-۵) نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔

(س ی ب)

اَلسَّائِبَۃُ (۵-۱۰۳) وہ جانور ہے جو چراگاہ میں آزاد چھوڑ دیا جائے اور اسے پانی اور چارہ سے کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہو (جاہلیت میں) اس قسم کی آزادی اس جانور کو دی جاتی تھی جو پانچ بچوں کو جنم دے چکا ہوتا[1]۔ اور اَلسَّائِبَۃُ اس غلام کو بھی کہا جاتا ہے جو آزاد کیا جائے اور (اس کی ولاء کا حقدار معتق (آزاد کنندہ) ہو[2] اور اسے حق حاصل ہو کہ اپنے مال میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور اسی کے متعلق نہی وارد ہوئی ہے[3]۔

اَلسَّیْبُ عطا کو کہتے ہیں اور اَلسِّیْبُ (بکسرہ سین) پانی کے جاری ہونے کی جگہ اصل میں یہ سَیَّبْتُہٗ فَسَابَ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں میں نے اسے آزاد چھوڑ دیا چنانچہ وہ چلی گئی اور اِنْسَابَ (انفعال) اَلْحَیَّۃُ کے معنی ہیں

[1] فی الصحاح عشرۃ البطن وقد نہی عنہ القرآن ولا سائبۃ (۵-۱۰۳) [2] کذا فی المطبوع وفی الصحاح: ولا یکون ولاء لاحد ... [3] ... لعبد العالم وابن الاثیر

سانپ پانی کی طرح تیزی سے اپنے بل میں اتر گیا۔

(س ی ح)

اَلسَّاحَۃُ کے معنی فراخ جگہ کے ہیں اسی اعتبار سے مکان کے صحن کو سَاحَۃُ الدَّارِ کہا جاتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔
فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِھِمْ (۳۷-۱۷۷) مگر جب وہ ان کے میدان میں آ اترے گا۔
اور وسیع مکان میں ہمیشہ جاری رہنے والے پانی کو سَائِحٌ کہا جاتا ہے اور سَاحَ فُلَانٌ فِی الْاَرْضِ کے معنی پانی کی طرح زمین میں چکر کاٹنا کے ہیں قرآن میں ہے:۔
فَسِیْحُوْا فِی الْاَرْضِ اَرْبَعَۃَ اَشْھُرٍ (۹-۲) تو (مشرکو تم) زمین میں چار مہینے چل پھر لو۔
اور اسی سے ہمیشہ سفر کرنے والے آدمی کو سَائِحٌ یا سَیَّاحٌ کہا جاتا ہے۔ اور آیت۔ اَلسَّائِحُوْنَ (۹-۱۱۲) روزہ رکھنے والے۔
میں سَائِحُوْنَ بمعنی صَائِمُوْنَ کے ہے۔ اسی طرح اَلسَّائِحَاتُ (۶۶-۵) سے روزہ رکھنے والی عورتیں مراد ہیں۔
بعض نے کہا ہے کہ روزہ دو قسم پر ہے ایک حقیقی روزہ جو کھانے پینے اور جماع کو ترک کرنے سے عبارت ہوتا ہے اور دوسرا روزہ حکمی ہے۔ جو کہ جوارح یعنی آنکھ، کان اور زبان وغیرہ کو معاصی سے روکنے کا نام ہے۔ تو سَائِحُوْنَ سے دوسری قسم کے روزہ دار مراد ہیں۔ اور بعض نے کہا ہے کہ سَائِحُوْنَ سے وہ لوگ مراد ہیں جو آیت:۔
اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَتَکُوْنَ لَھُمْ قُلُوْبٌ یَّعْقِلُوْنَ بِھَآ اَوْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِھَا۔۔۔۔۔ (۲۲-۴۶) کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر نہیں کی تاکہ ان کے دل (ایسے) ہوتے کہ ان سے سمجھ سکتے اور کان (ایسے) ہوتے کہ ان سے سن سکتے۔
کے مقتضیٰ کے تحت زمین میں سفر کرتے ہیں (یعنی قدرت الٰہی کے آثار و عجائبات دیکھتے) اور ان پر غور وفکر کرتے رہتے ہیں۔

(س و د)

اَلسَّوَادُ (ضد بیاض) سیاہ رنگ کو کہتے ہیں۔ اور اِسْوَدَّ (افعلال)، وَاِسْوَادَّ (افعیلال) کے معنی کسی چیز کے سیاہ ہونے کے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔
یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ (۳-۱۰۶) جس دن بہت سے منہ سفید ہوں گے اور بہت سے سیاہ۔
تو چہروں کے سفید ہونے سے اظہار مسرت اور سیاہ ہونے سے اظہار غم مراد ہے اسیطرح آیت۔
وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْھُہٗ مُسْوَدًّا وَّھُوَ کَظِیْمٌ (۱۶-۵۸) حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خوشخبری ملتی ہے تو اس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے اور (اس کے دل کو دیکھو تو) وہ اندوہناک ہو جاتا ہے۔
میں بھی مُسْوَدًّا سے بھی مغموم ہونا ہی مراد ہے۔ بعض نے آیت:۔ تَبْیَضُّ الخ میں حسی سفیدی[1]

---

[1] اما یعج المستدرک الحاکم عن ابی ہریرۃ وانظر کنز العمال ۵: ۲ رقم ۲۲۷ وفی الطبری ۱۱: ۲۸ مرفوعا عن ابی ہریرۃ وفی اللسان قال الزجاج فی قول اہل التفسیر واللغۃ جمیعا السائحون معنی الصائمون تاموس غریب القرآن للقتیبی ۱۹۳ ؟ ؟ ؟ ؟ ؟ ؟ ؟ ؟ ؟

سیاہی کے معنی مراد لئے ہیں۔ لیکن پہلا معنی زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ چیز تو قیامت کے دن اعمال کے اعتبار سے حاصل ہوگی عام اس سے کہ وہ دنیا میں سیاہ فام ہوں یا سفید فام اور اسی سفیدی اور سیاہی کو دوسری آیات میں یوں فرمایا ہے:۔

وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ (۷۵-۲۲) اس دن بہت سے منہ رونق دار ہوں گے۔

وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ (۷۵-۲۴) اور بہت سے منہ اس روز اداس ہوں گے۔

وَوُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ. تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ (۸۰-۴۰، ۴۱) اور کتنے منہ ہوں گے جن پر گرد پڑ رہی ہوگی (اور) سیاہی چڑھ رہی ہوگی۔

وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا (۱۰-۲۷) اور ان کے منہ پر ذلت چھا جائے گی اور کوئی ان کو خدا سے بچانے والا نہ ہوگا ان کے مونہوں (کی سیاہی) کا یہ عالم ہوگا کہ (ان) پر گویا اندھیری رات کے ٹکڑے اوڑھا دیئے گئے ہیں۔

اسی طرح مومنین کے متعلق حدیث میں آیا ہے[1] (۱۸۰) يُحْشَرُونَ غُرًّا مُحَجَّلِينَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوءِ کہ قیامت کے دن آثار وضو سے ان کے ہاتھ پاؤں اور چہرے چمک رہے ہوں گے۔

اور دور سے جو چیز نظر پڑے اسے بھی سَوَادٌ کہا جاتا ہے اسی طرح آنکھ کی سیاہی کو بھی سَوَادُ الْعَيْنِ سے تعبیر کر لیتے ہیں جیسا کہ کسی نے کہا ہے لَا يُفَارِقُ سَوَادِي سَوَادَهُ یعنی میری آنکھ اس کے شخص سے جدا نہیں ہوتی اور بڑی جماعت کو بھی سَوَادٌ کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ مروی ہے۔[2] (

عَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْأَعْظَمِ مسلمانوں کی بڑی جماعت کا ساتھ نہ چھوڑو ورنہ اس سے علیحدگی اختیار کرو)

اور سَيِّدٌ کے معنی بڑی جماعت کا سردار کے ہیں چنانچہ اضافت کے وقت سَيِّدُ الْقَوْمِ تو کہا جاتا ہے۔ مگر سَيِّدُ الثَّوْبِ یا سَيِّدُ الْفَرَسِ نہیں بولا جاتا اور اسی سے سَادَ الْقَوْمَ يَسُودُهُمْ کا محاورہ ہے چونکہ قوم کے رئیس کا مہذب ہونا شرط ہے اس اعتبار سے ہر فاضل النفس آدمی کو سَيِّدٌ کہا جاتا ہے چنانچہ آیت وَسَيِّدًا وَحَصُورًا (۳-۳۹) اور سردار ہوں گے اور عورت سے رغبت نہ رکھنے والے۔

میں بھی سَيِّدٌ کا لفظ اسی معنی پر محمول ہے۔ اور آیت۔ وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا (۱۲-۲۵) اور دونوں کو ...... عورت کا خاوند مل گیا۔

میں خاوند کو سید کہا گیا ہے کیونکہ وہ بیوی کا نگراں اور منتظم ہوتا ہے اور آیت:۔

رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا (۳۳-۶۷) اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے سرداروں اور بڑے لوگوں کا کہا مانا۔

میں سَادَتَنَا سے ولاۃ اور حکام مراد ہیں۔

(س ی ر)

اَلسَّيْرُ (ض) کے معنی زمین پر چلنے کے ہیں اور چلنے والے آدمی کو سَائِرٌ وَسَيَّارٌ کہا جاتا ہے اور ایک ساتھ چلنے والوں کی جماعت کو سَيَّارَةٌ کہتے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے:۔

---

[1] اخرجہ الشیخان عن ابی ہریرۃ وفی سندا یتہم جمیعا: ان امتی یدعون یوم القیامۃ غرا ...... راجع کنز العمال ۱۹ رقم ۹۷۴، [2] رواہ ابن ماجۃ وتتمتہ:۔ ان امتی لن تجتمع علی ضلالۃ عن انس وذکرہ النبہانی فی الفتح ار ۳۰۵ ۔

جَاءَتْ سَيَّارَةٌ (۱۲-۱۹) (اب خدا کی شان دیکھو کہ اس کنویں کے قریب) ایک قافلہ وارد ہوا۔

سِرْتُ (ض) کے معنی چلنے کے ہیں اور سِرْتُ بِفُلَانٍ نیز سِرْتُهٗ کے معنی چلانا بھی آتے ہیں اور معنیٰ تکثیر کے لئے سَيَّرْتُهٗ کہا جاتا ہے۔

(الغرض سَيْرٌ کا لفظ چار طرح استعمال ہوتا ہے) چنانچہ پہلے معنی کے متعلق فرمایا:۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ (۱۲-۱۰۹) کیا ان لوگوں نے ملک میں سیر و سیاحت نہیں کی۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ (۶-۱۱) کہو کہ (اے منکرین رسالت) ملک میں چلو پھرو۔

سِيرُوا فِيهَا لَيَالِيَ (۳۴-۱۸) کہ رات ... چلتے رہو۔

اور دوسرے معنی یعنی سِرْتُ بِفُلَانٍ کے متعلق فرمایا:۔

سَارَ بِأَهْلِهٖ (۲۸-۲۹) اور اپنے گھر کے لوگوں کو لے کر چلے۔

اور تیسری قسم (یعنی سِرْتُهٗ بدوں صلہ) کا استعمال قرآن میں نہیں پایا جاتا اور چوتھی قسم (یعنی معنی تکثیر) کے متعلق فرمایا:۔

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ (۷۸-۲۰) اور پہاڑ چلائے جائینگے۔

وَهُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (۱۰-۲۲) وہی تو ہے جو تم کو جنگل اور دریا میں چلنے پھرنے اور سیر کرانے کی توفیق دیتا ہے۔

اور آیت:۔ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ (۶-۱۱) کہ ملک میں چلو پھرو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ سیاحت جسمانی یعنی ملک میں سیر (سیاحت) کرنا مراد ہے اور بعض نے سیاحت فکری یعنی عجائبات قدرت میں غور و فکر کرنا اور حالات سے باخبر رہنا مراد لیا ہے جیسا کہ اولیاء کرام کے متعلق مروی ہے۔

أَبَدًا أَنْفُسُهُمْ فِي الْأَرْضِ سَائِرَةٌ وَقُلُوبُهُمْ فِي الْمَلَكُوتِ جَائِلَةٌ (کہ ان کے اجسام تو زمین پر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی روحیں عالم ملکوت میں جولانی کرتی رہتی ہیں) بعض نے کہا ہے اس کے معنی ہیں عبادت میں اس طرح کوشش کرنا کہ اس کے ذریعہ ثواب الٰہی تک رسائی ہو سکے اور آنحضرت علیہ السلام کا فرمان[1] (۱۸۱)

سَافِرُوا تَغْنَمُوا سفر کرتے رہو غنیمت حاصل کر لوگے بھی اسی معنی پر محمول ہے۔

پھر تَسْيِيرٌ دو قسم پر ہے ایک وہ جو چلنے والے کے اختیار و ارادہ سے ہو جیسے فرمایا:۔

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ (۱۰-۲۲) وہی تو ہے جو تم کو ... چلنے کی توفیق دیتا ہے۔

دوم وہ جو بذریعہ جبر کے ہو اور سائر یعنی چلنے والے کے ارادہ و اختیار کو اس میں کسی قسم کا دخل نہ ہو جیسے جبال کے متعلق فرمایا:۔

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا (۷۸-۲۰) اور پہاڑ چلائے جائیں گے تو وہ ریت ہو کر رہ جائیں گے۔

---

[1] ولفظہ الحدیث سافروا تصحوا واغنموا والحدیث فی رمق۔ عن ابن عباس الشیرازی فی الالقاب لمس وابونعیم فی الطب والقضاعی۔ عن ابن عمر وفی روایۃ: وتسدقوا رعب۔ عن محمد بن عبدالرحمٰن مرسلا، راجع للحدیث باختلاف الفاظہ کنز العمال ج ۶ رقم ۲۸۸۸-۲۸۹۲ فانہ ذکرہ بطرقہ المختلفۃ۔ وقد عقدہ ابوالفتح بن ابی حصین فی بیت، سافروا تغنموا وقدتا۔ ل علیہ السلام صوموا تصحوا وراجع خاص الخاص للثعالبی ۱۶۰) وفی المعاہد ۲ر ۸۵ "تمام الحدیث" بدل "علیہ السلام" وقد نسبہ الی عبدالمحسن بن محمد الصوری ۱۲

وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ (۸۱-۳) اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔

اَلسِّيرَةُ اس حالت کو کہتے ہیں جس پر انسان زندگی بسر کرتا ہے عام اس سے کہ اس کی وہ حالت طبعی ہو یا اکتسابی۔ کہا جاتا ہے:۔

فُلَانٌ حَسَنُ السِّيرَةِ فلاں کی سیرت اچھی ہے۔ فلاں قَبِيحُ السِّيرَةِ اس کی سیرت بری ہے اور آیت سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ (۲۰-۲۱) ہم اس کو ابھی اس کی پہلی حالت پر لوٹا دیں گے۔

میں سیرۃ اولیٰ سے اس عصا کا دوبارہ لکڑی بن جانا ہے۔

(س و ر)

اَلسَّوْرُ اس کے اصل معنی بلندی پر کودنے کے ہیں اور غصہ یا شراب کی شدت پر بھی سَوْرَۃ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ سَوْرَةُ الْغَضَبِ اور سَوْرَةُ الشَّرَابِ (شراب کی تیزی) سُرْتُ إِلَيْكَ کے معنی ہیں میں تیری طرف چلا اور سَاوَرَنِي فُلَانٌ کے معنی ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے ہیں۔ اور مُسَاوِرٌ یعنی وَثَّابٌ یعنی عربدہ گر کے ہیں اور اَلْاَسْوَارُ اَسَاوِرَةُ الْفُرْسِ کا مفرد ہے جس کے معنی تیر انداز کے ہیں کہا گیا ہے کہ یہ فارسی سے معرب ہے۔

سِوَارُ الْمَرْأَةِ (عورت کا بازو بند) یہ بھی معرب ہے اور اصل میں دَسْتْوَار ہے۔ بہر حال اس کی اصل جو بھی ہو اہل عرب اسے استعمال کرتے ہیں اور اس سے اشتقاق کرکے کہا جاتا ہے۔

سَوَّرْتُ الْمَرْأَةَ میں نے عورت کو کنگن پہنائے اور جَارِيَةٌ مُسَوَّرَةٌ وَمُخَلْخَلَةٌ اس لڑکی کو کہتے ہیں جس نے بازو بند اور پازیب پہن رکھی ہو۔

قرآن میں ہے:۔

أَسَاوِرَةٌ مِنْ ذَهَبٍ (۴۳-۵۳) سونے کے کنگن۔۔۔

أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ (۷۶-۲۱) چاندی کے کنگن۔۔۔

اور قرآن میں سونے کے ساتھ اَسْوِرَةٌ جمع لاکر پھر خاص کر اُلْقِيَ کا صیغہ استعمال کرنا اور فِضَّة سے قبل اَسَاوِرَ کا لفظ لاکر اس کے متعلق حُلُّوا کا صیغہ استعمال کرنے میں ایک خاص نکتہ ملحوظ ہے جس کی تفصیل دوسری کتاب میں بیان ہوگی[1]۔

اَلسُّوْرَةُ کے معنی بلند مرتبہ کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[2] (الطویل)

(۲۴۴) أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللهَ أَعْطَاكَ سُورَةً
تَرَى كُلَّ مَلِكٍ دُونَهَا يَتَذَبْذَبُ

بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسا مرتبہ بخشا ہے جس کے ورے ہر بادشاہ متذبذب نظر آتا ہے۔

اور سُوْرُ الْمَدِيْنَةِ کے معنی شہر پناہ کے ہیں اور سُوْرَةُ الْقُرْاٰنِ (قرآن کی سورت) یا تو سُوْرُ الْمَدِيْنَةِ سے ماخوذ ہے کیونکہ سورہ بھی شہر پناہ کی طرح قرآن کا احاطہ کئے ہوئے ہیں اس لئے انہیں سورۃ القرآن کہا جاتا ہے اور یا سورۃ بمعنی مرتبہ سے مشتق ہے۔ اور سورۃ بھی منازل قمر کی طرح ایک منزلہ ہے اس لئے اسے سورۃ کہا جاتا ہے اور یہ دونوں اشتقاق اس وقت ہو سکتے ہیں جب اس میں واؤ کو اصلی مانا جائے لیکن اگر اسے اصل میں سُؤْرَةٌ مہموز مانا جائے تو یہ اَسْأَرْتُ سے

---

[1] الشاذلی تفسیر القرآن الذی الفہ بعد مفرداتہ [2] قالہ النابغۃ فی مدح نعمان بن المنذر معتذرًا انظر دیوانہ ۱۳ ومختار الشعر الجاہلی ۱۷۵ وتفسیر الطبری (۵: ۲۳۵) وامالی المرتضیٰ (۱: ۲۸۷) والصناعتین ۷۵ مع آخر ونقد الشعر ۲۷ والحیوان (۳: ۹۵) والعقد (۵) والحصری (۳: ۹۲) والسیوطی ۸۰ والعقد الفرید ۲: ۱۲۳ والصاحبی ۱۹۸

مشتق ہوگا جس کے معنی کچھ باقی چھوڑ دینے کے ہیں اور سورۃ بھی چونکہ قرآن کا ایک ٹکڑا اور حصہ ہوتی ہے اس لئے اسے سورۃ کہا جاتا ہے اور آیت :۔

سُوْرَۃٌ اَنْزَلْنٰھَا (۲۴-۱) یہ (ایک) سورۃ ہے جسے ہم نے نازل کیا۔

میں سورۃ سے مراد احکام و حکم ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اَسْاَرْتُ فِی الْقَدَحِ سے مشتق ہے جس کے معنی پیالہ میں کچھ باقی چھوڑنے کے ہیں۔

شاعر نے کہا ہے[1] (البسیط)

(۲۴۵) لَا بِالْحَصُوْرِ وَلَا فِیْھَا بِسَآّبٍ

نہ تنگ دل اور بخیل ہے اور نہ عربدہ گر۔

ایک روایت میں وَلَا بِسَوَّارٍ ہے۔ جو سَوْرَۃٌ بمعنی شدت غضب سے مشتق ہے۔

(س و ط)

اَلسَّوْطُ (چمڑے کا کوڑا) بٹے ہوئے چمڑے کو کہتے ہیں جس کے ساتھ پیٹا جاتا ہے۔ اصل میں سَوْطٌ کے معنی کسی چیز کو خلط ملط کرنا کے ہیں اور اس سے فعل سُطْتُہٗ وَسَوَّطْتُہٗ آتا ہے اور کوڑے کو سوط اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی چند تسمے بٹنے سے باہم باہم خلط ملط ہو جاتے ہیں اور آیت :۔

فَصَبَّ عَلَیْھِمْ رَبُّکَ سَوْطَ عَذَابٍ (۸۹-۱۳) تو تمہارے پروردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا نازل کیا۔

میں عذاب الٰہی کو دنیاوی سزا کے ساتھ تشبیہ دیکر سوط سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ نزول قرآن کے زمانہ میں کوڑے سے سزا دی جاتی تھی بعض نے کہا ہے کہ سَوْطَ عَذَابٍ کے لفظ سے انواع عذاب کی طرف اشارہ ہے جس کی طرف کہ آیت حَمِیْمًا وَّغَسَّاقًا (۷۸-۲۵) میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

(س و ع)

اَلسَّاعَۃُ (وقت) اجزاء زمانہ میں سے ایک جزء کا نام ہے اور اَلسَّاعَۃُ بول کر قیامت بھی مراد لی جاتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ (۵۴-۱) قیامت قریب آپہنچی۔

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَۃِ (۷۹-۴۲) (اے پیغمبر لوگ) تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔

وَعِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَۃِ (۴۳-۸۵) اور اسی کو قیامت کا علم ہے۔

تو قیامت کو سَاعَۃٌ کہنا یا تو سرعت حساب میں تشبیہ کے طور پر ہے۔ جیسے فرمایا :۔

وَھُوَ اَسْرَعُ الْحَاسِبِیْنَ (۶-۶۲) اور وہ نہایت جلد حساب لینے والا ہے۔

اور یا اس معنی کے پیش نظر اسے سَاعَۃٌ کہا ہے جس پر کہ آیت کریمہ :۔

کَاَنَّھُمْ یَوْمَ یَرَوْنَھَا لَمْ یَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِیَّۃً اَوْ ضُحٰھَا

---

[1] قالہ الاخطل التغلبی وادلہ ، وشارب مربح بالکاس نادمنی والبیت من قصیدۃ جمہرۃ (۲۹۴-۳۰۲) فی ۵۰ بیتا یمدح فیہا یزید بن معاویۃ والبیت فی دیوانہ ۱۱۶ طبع بیروت ۱۸۹۱ء) والبحر (۱۰۱/۲ : ۴۸) ومجالس ثعلب (۵۱۱/۲) والطبری (۳ : ۲۵۵ / ۵ : ۴۱۱) وشواہد الکشاف ۴۵ والسان والمحکم والصحاح (حصر) والقرطبی (۴ : ۷۸) ومجاز القرآن (۱ : ۹۲) وتہذیب الالفاظ ۲۲۲ وتہذیب الاصلاح (۱ : ۱۲۵) وجمہرۃ اللغۃ ۹۹ والقبتی فی المعانی ۴۹۴ وفی معونۃ والمبتور ادبی روایۃ یعقوب فی اصلاح ۲۸۹، ۴۳۲ وابن قتیبۃ فی المعانی والجوہری فی صحاحہ ۱۲

(۷۹-۴۰) جب وہ اس کو دیکھیں گے (تو ایسا خیال کریں گے کہ گویا دنیا میں صرف) ایک شام یا صبح رہے ہیں۔

لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ (۴۶-۳۵) (تو خیال کریں گے کہ گویا دنیا میں) رہے ہی نہ تھے مگر گھڑی بھر دن۔

اور آیت:۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ (۳۰-۱۴) اور جس دن قیامت برپا ہوگی۔ میں تنبیہ فرمائی ہے۔ اور پہلی آیت یعنی يَوْمَ يَرَوْنَهَا میں "ھا" ضمیر سے مراد قیامت ہے اور دوسری آیت میں سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ سے وقت قلیل مراد ہے بعض نے کہا ہے کہ وہ ساعات جن سے قیامت مراد ہوتی ہے تین ہیں (۱) اَلسَّاعَةُ الْكُبْرٰى یعنی لوگوں کو محاسبہ کے لئے اٹھانا یا دوبارہ زندہ کرنا اور اسی کے متعلق آنحضرت نے ارشاد فرمایا ہے[1] (۱۸۲)

لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَظْهَرَ الْفُحْشُ وَالتَّفَحُّشُ وَحَتّٰى يُعْبَدَ الدِّرْهَمُ وَالدِّيْنَارُ الخ کہ قیامت قائم نہیں ہوگی جب تک کہ فحش اور بے حیائی کھلم کھلا نہ ہونے لگ جائے اور درہم و دینار کی پرستش نہ ہونے لگے اور آنحضرت نے اس قسم کی بہت سی علامات کا تذکرہ فرمایا ہے جو نہ آپ کے زمانہ میں ظاہر ہوئیں اور نہ بعد میں اب تک ان کا ظہور ہوا ہے[2]۔

(۲) دوم۔ اَلسَّاعَةُ الْوُسْطٰى جو کہ ایک قرن کے لوگ گزر جانے سے عبارت ہے جیسا کہ آنحضرت سے مروی ہے کہ آپؐ نے عبداللہ بن انیس کو دیکھ کر فرمایا

(۱۸۳) اِنْ يَّطُلْ عُمُرُ هٰذَا الْغُلَامِ لَمْ يَمُتْ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ اگر اس لڑکے کی عمر دراز ہوئی تو یہ تمام قیامت سے پہلے نہیں مرے گا۔

چنانچہ بعض کا قول ہے کہ وہ صحابہ کرام میں سب سے آخر فوت ہوئے ہیں۔

(۳) اَلسَّاعَةُ الصُّغْرٰى جو کہ انسان کی موت سے عبارت ہے پس اس معنی کے لحاظ سے ہر انسان کی موت اس کے لئے قیامت ہے[3] چنانچہ اسی معنی کی طرف آیت:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا (۶-۳۱) جن لوگوں نے خدا کے روبرو کھڑے ہونے کو جھوٹ سمجھا وہ گھاٹے میں آ گئے۔ یہاں تک کہ جب ان پر قیامت ناگہاں آموجود ہوگی تو بول اٹھیں گے کہ ہائے۔۔۔۔ افسوس ہے۔

میں اشارہ فرمایا گیا ہے (کیونکہ یہ حسرت انسان کو اس کی موت کے وقت ہوتی ہے۔ جیسا کہ آیت:۔

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ

---

[1] منها خروج الدابة ونزول المسيح وظهور الدجال وطلوع الشمس من مغربها والى ذالك ۱۲ ستة فانه صحيح مسلم (۲/۴۰۶) والبخاری من حديث النبی: ان يعش هذا الغلام فعلى ان لا يدركه الهرم حتى تقوم الساعة وانا اسم هذا الغلام فلم اره فى رواية صحيحة وفى صحيح مسلم الى غلام من ازدشنوءة وقال انس وكان من اتراىى ومعنى الحديث يموت ذالك القرن واولائك المخاطبون قال النووی ويحتمل انه علم ان هذا الغلام لا يبلغ الهرم راجع للبحث الفتح للحافظ (۱۰/۴۹-۵۰) [2] وفى الحديث من مات فقد قامت قيامته۔ [3] كما روى فى الحديث من مات فقد قامت قيامته انظر الفردوس لابى شجاع الديلمى وبمعناه فى الطبرى من حديث المغيرة بن شعبة وابن ابى الدنيا من حديث انس بسند ضعيف۔ راجع تخريج الكشاف رقم ۵ وتخريج الاحياء للعراقی (۴/۴۶)

قَرِیْبٍ (۶۳-۱۰) اور جو مال ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے اس (وقت) سے پیشتر خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کو موت آجائے تو اس وقت کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی سی اور مہلت کیوں نہ دی۔ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور آیت:۔ قُلْ أَرَأَيْتَكُمْ إِنْ أَتَاكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ أَوْ أَتَتْكُمُ السَّاعَةُ (۶-۴۰) (اے کافرو) بھلا دیکھو تو اگر تم پر خدا کا عذاب آجائے یا قیامت آموجود ہو۔

میں اَلسَّاعَۃُ سے مراد موت ہی ہے ایک حدیث میں ہے (۱۸۴) کہ جب سخت آندھی چلتی تو آپ کا چہرہ متغیر ہو جاتا اور فرماتے تَخَوَّفْتُ السَّاعَةَ کہ مجھے قیامت کا اندیشہ ہے۔ نیز فرمایا (۱۸۵) وَمَا أَحُدُّ طَرْفِيْ وَلَا أَغُضُّهَا إِلَّا ظَنَنْتُ أَنَّ السَّاعَةَ قَدْ قَامَتْ کہ جب میں اپنی نظر اٹھاتا ہوں یا نیچی کرتا ہو تو یہ خیال ہوتا ہے کہ بس قیامت آچکی۔ یعنی مجھے اپنی موت کا ہر لحہ خیال رہتا ہے جس طرح کہ عَامَلْتُهُ مُعَاوَمَةً یا مُشَاهَرَةً کا محاورہ ہے جس کے معنی سال یا مہینہ کے حساب سے معاملہ کرنے کے ہیں اسی طرح ساعات کے حساب سے معاملہ کرنے کے معنی میں عَامَلْتُهُ مُسَاوَعَةً استعمال ہوتا ہے اور جَاءَنَا بَعْدَ سَوْعٍ مِنَ اللَّيْلِ وَسُوَاعٍ کے معنی ہیں "سکون شب کے بعد وہ ہمارے پاس آیا" اور پھر سَاعَةٌ سے کبھی (اھمال (ضائع کرنا) کے معنی بھی لئے جاتے ہیں۔ چنانچہ محاورہ ہے:۔ أَسَعْتُ الْإِبِلَ (افعال) میں نے اونٹوں کو بیکار چھوڑ دیا یا ضائع کر دیا۔ هُوَ ضَائِعٌ سَائِعٌ وہ مہمل اور بیکار ہے۔

سُوَاعٌ ایک بت کا نام ہے[1]۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا اور وَدّ اور سُوَاعٌ ...... کو کبھی ترک نہ کرو (۷۱-۲۳)

(س و غ)

سَاغَ الشَّرَابُ فِي الْحَلْقِ کے معنی شراب کے آسانی کے ساتھ حلق سے نیچے اتر جانا کے ہیں وَأَسَاغَهُ كَذَا (افعال) کے معنی حلق سے نیچے اتارنے کے ہیں چنانچہ قرآن میں ہے۔ سَائِغًا لِلشَّارِبِينَ (۱۶-۶۶) پینے والوں کے لئے خوش گوار ہے۔ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ (۱۴-۱۷) اور گلے سے نہیں اتار سکے گا۔

اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے۔ سَوَّغْتُهُ مَالًا میں نے اس کے لئے مال خوش گوار بنا دیا۔ یعنی مباح کر دیا اور پھر اس کے ساتھ تشبیہ دے کر فُلَانٌ سَوْغُ أَخِيهِ کا محاورہ اس بچے کے متعلق استعمال ہوتا ہے جو اپنے بھائی کے بعد جلدی ہی پیدا ہو (یہ مذکر و مونث دونوں کے حق میں بولا جاتا ہے)۔

(س و ف)

سَوْفَ۔ (حرف تسویف) یہ حرف ہے جو فعل مضارع کو معنی حال سے مجرد کر کے معنی استقبال کے لئے خاص کر دیتا ہے (اسی لئے اسے حرف استقبال بھی کہتے ہیں) چنانچہ قرآن میں ہے:۔ سَوْفَ أَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّي (۱۲-۹۸) میں اپنے پروردگار سے تمہارے لئے بخشش مانگوں گا۔

---

[1] سواع لم نجد اصلا فی کلام العرب ولکن ان یکون مشتقا من السوع بمعنی الزمان وانظر لود (ود) وھما من الآلہۃ التی کانت قوم نوح تعبدھا۔

اور آیت :- فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۶ - ۱۳۶) عنقریب تم کو معلوم ہو جائے گا۔

میں تنبیہ کیا ہے کہ جس بات کا وہ مطالبہ کرتے ہیں اگرچہ فی الحال وہ حاصل نہیں ہے۔ لیکن وہ لامحالہ ہو کر رہے گی۔

اور اس میں مماطلہ (ٹال مٹول) اور تاخیر کے معنی پائے جاتے ہیں اور چونکہ وعدہ کرنے والا سَوْفَ فَعَلَ کَذَا کا محاورہ استعمال کرتا ہے اسلئے اَلتَّسْوِیفُ (تفعیل) کے معنی ٹال مٹول کرنا بھی آجاتے ہیں۔

اَلسَّوْفُ (ن) کے معنی مٹی یا بول کی بو سونگھنے کے ہیں پھر اس سے اس ریگستان کو جس میں راستہ کے نشانات مٹے ہوئے ہوں اور قافلہ کا رہنما اس کی مٹی سونگھ کر راہ دریافت کرے اسے "مَسَافَةٌ" کہا جاتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (رجز)

(۲۴۲) اِذَا الدَّلِيْلُ اسْتَافَ اَخْلَاقَ الطُّرُقِ

جب رہنما بے نشان راستوں پر سونگھ سونگھ کر چلے۔

اَلسُّوَافُ۔ اونٹوں کے ایک مرض کا نام ہے جس کی وجہ سے وہ مرنے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اور اس مرض کو سُوَافٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اس سے موت کی بو سونگھ لیتے ہیں یا موت ان کو سونگھ لیتی ہے اور یا اس لئے کہ اس سے جلد ہی ان کی موت آجاتی ہے۔

(س و ق)

سَوْقُ الْاِبِلِ کے معنی اونٹ کو ہنکانے اور چلانے کے ہیں یہ سُقْتُهٗ (ن) کا مصدر ہے اور اِنْسَاقَ (انفعال) کے معنی ہنکانے کے بعد چل پڑنے کے ہیں ان جانوروں کو جو ہنکائے جاتے ہیں سَیِّقَةٌ کہا جاتا ہے۔ اور عورت کو مہر ادا کرنے کے لئے سُقْتُ الْمَهْرَ اِلَی الْمَرْأَةِ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے اس لئے کہ عرب حق مہر میں (عام طور پر) اونٹ دیا کرتے تھے۔

اور آیت :- اِلٰی رَبِّكَ يَوْمَئِذِ نِ الْمَسَاقُ (۷۵ - ۳۰) میں اَلْمَسَاق کے معنی پروردگار کی طرف چلنا کے ہیں جیسا کہ آیت :-

اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰی (۵۳ - ۴۲) میں ہے یعنی تمہیں اپنے پروردگار کے پاس پہنچنا ہے۔

اور آیت :- مَعَهَا سَائِقٌ وَّشَهِيْدٌ (۵۰ - ۲۱) اس کے ساتھ چلانے والا ہوگا اور ایک اس کے عملوں کی گواہی دینے والا۔

میں سائق سے وہ فرشتہ مراد ہے جو اسے چلا کر حساب کے لئے پیش کرے گا اور دوسرا فرشتہ شہید (بطور گواہ کے اس کے ساتھ ہوگا جو اسکے حق میں یا اسکے خلاف گواہی دیگا بعض نے کہا ہے کہ یہ آیت :- كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ (۸ - ۶) گویا موت کی طرف دھکیلے جاتے ہیں۔ کے ہم معنی ہے اور آیت :-

وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ (۷۵ - ۲۹) اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ جائے گی۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں قبض روح کے وقت پنڈلیوں کا لپٹنا مراد ہے۔ اور بعض نے پنڈلیوں کا کفن میں لپٹنا مراد لیا ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ ان کے لپٹنے سے مراد موت ہے کہ زندگی میں وہ اس کے بوجھ کو اٹھا کر چلتی تھیں لیکن موت کے بعد وہ اس بار کی متحمل نہیں ہو سکیں گی بعض

---

[1] قاله رؤبة بن العجاج (الراعز الاسلامی) فی ارجوزة له ۴۷ ابیتا دہی فی دیوانه ۱۰۴ - ۱۰۸ وقبله : مسودة الاعطاف من وسم العرق وبعده : کانها حقیار بلقار الزنق ، والشطر وحده فی خزانة الادب (۱ : ۸۸) و دیوانه ۱۰۵ والاقتضاب ۲۱۲ وادب الکاتب ۵۱ والاضداد لابی الطیب ۴۹۸ واصلاح لیعقوب ۳۱۶ ۔

نے کہا ہے کہ ایک شدت کا دوسری شدت سے لپٹنا مراد ہے اسی طرح آیت :- یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ (۶۸-۴۲) جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھا دیا جائیگا۔ میں پنڈلی سے کپڑا اٹھانا صعوبت حال سے کنایہ ہے۔ اور یہ کَشَفَتِ الْحَرْبُ عَنْ سَاقِهَا کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی لڑائی کے سخت ہوجانے ہیں۔ بعض نے اس کی اصل یہ بیان کی ہے۔ کہ جب اونٹنی کے پیٹ میں بچہ مرجاتا ہے۔ تو مُمَرِّسٌ (جنوانے والا) اس کے رحم کے اندر ہاتھ ڈالتا ہے۔ اور اسے پنڈلیوں سے پکڑ کر زور سے باہر نکالتا ہے۔ اور یہ کَشَفَ عَنِ السَّاقِ کے اصل معنی ہیں پھر ہر ہولناک امر کے متعلق یہ محاورہ استعمال ہونے لگا ہے تو یہاں بھی شدت حال سے کنایہ ہے۔ اور آیت :- فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ (۴۸-۲۹) اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ میں بعض نے کہا ہے کہ سُوْقٌ سَاقٌ کی جمع ہے جیسے لَابَةٌ کی جمع لُوْبٌ اور قَارَةٌ کی جمع قُوْرٌ آتی ہے۔ اور اسی طرح آیت :- فَطَفِقَ مَسْحًا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ (۳۸-۳۳) پھر ان کی ٹانگوں اور گردنوں پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ میں بھی سُوْقٌ صیغہ جمع ہے اور رَجُلٌ اَسْوَقُ کے معنی بڑی پنڈلیوں والے آدمی کے ہیں، اسکی مؤنث سَوْقَاءُ آتی ہے اور سُوْقٌ کے معنی بازار بھی آتے ہیں جہاں خرید و فروخت ہوتی ہے۔ اور فروخت کے لئے وہاں سامان لے جایا جاتا ہے۔ اس کی جمع اَسْوَاقٌ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے :- مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (۲۵-۷) یہ کیسا پیغمبر ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اَلسَّوِيْقُ کے معنی ستو کے ہیں کیونکہ وہ بغیر چبائے حلق سے نیچے اتر جاتے ہیں۔

(س و ل)

اَلتَّسْوِيْلُ۔ کے معنی نفس کے اس چیز کو مزین کرنا کے ہیں جس پر اسے حرص بھی ہو اور اس کے قبح کو خوشنما بنا کر پیش کرنا کے ہیں قرآن میں ہے: بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا۔ (۱۲-۸) بلکہ تم اپنے دل سے (یہ) بات بنا لائے۔ اَلشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ (۴۷-۲۵) شیطان نے (یہ کام) انہیں مزین کر دکھایا۔

بعض ادباء نے[1] (البسیط)

(۲۴۴) سَالَتْ هُذَيْلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ فَاحِشَةً :-

(بنی ہذیل نے آنحضرت سے ایک فحش امر کا مطالبہ کیا) میں کہا ہے کہ یہاں سالت بمعنی طلبت ہے اور یہ سَالَ (مہموز) سے نہیں ہے جیسا کہ اکثر ادباء نے خیال کیا ہے۔

(س ی ل)

سَالَ الشَّيْءُ يَسِيْلُ کے معنی کسی چیز کے بہنے کے ہیں۔ اور اَسَلْنَا کے معنی بہا دینے کے۔ قرآن

[1] قالہ حسان بن ثابت الانصاری وتمامہ: ضلت ہذیل بما جاءت ولم تصب والبیت فی دیوانہ ۴۲ والکتاب (۲: ۳۰) وقال اصلہ مہموز۔ وذکر المؤلف فی محاضراتہ (۳: ۲۵۹) ان ابا کبیر الہذلی جاء الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فسألہ ان یحل الزنا فقال اتحب ان یؤتی الیک فی حرمک مثل ذلک قال لا ثم قال فادع اللہ ان یذہب منی الشبق فدعا لہ فقال حسان وانظر القصہ ایضاً اسد الغابۃ (۵: ۸۲) وذکر ابو کبیر الہذلی واجعۃ اشعارہ

ہیں ہے :۔
وَاَسَلْنَالَہٗ عَیْنَ الْقِطْرِ (۳۴-۱۲) اور ان کے لئے ہم نے تانبے کا چشمہ بہا دیا۔
یہاں اَسَلْنَا کے معنی پگھلا دینے کے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت اِسَالَۃ کا لفظ قطر کی اس حالت پر بولا جاتا ہے جو پگھلانے کے بعد ہوتی ہے۔
اَلسَّیْلُ (ض) یہ اصل میں سَالَ یَسِیْلُ کا مصدر ہے جس کے معنی بہنے کے ہیں اور بطور اسم اس پانی پر بولا جاتا ہے جو دور سے بہہ کر کسی جگہ پر آجائے اور وہاں برسا نہ ہو۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔
فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا (۱۳-۱۷) پھر برساتی نالے پر پھولا ہوا جھاگ آگیا۔
سَیْلَ الْعَرِمِ ..... (۳۴-۱۶) زور کا سیلاب
اَلسَّیَلَانُ (دونبالہ شمشیر و کارد وغیرہ) اس لمبے لوہے کو کہتے ہیں جو نصاب کی جانب سے تلوار چھری وغیرہ کے دستہ میں لگا ہوتا ہے۔

(س ء ل)

اَلسُّؤَالُ کے معنی کسی چیز کی معرفت حاصل کرنے کی استدعا یا اس چیز کی استدعا کرنے کے ہیں۔ جو مودی الی المعرفۃ ہو یعنی مال کی استدعا یا اس چیز کی استدعا کرنے کو بھی سُؤَال کہا جاتا ہے جو مودی الی المال ہو پھر کسی چیز کی معرفت کی استدعا کا جواب اصل میں تو زبان سے دیا جاتا ہے لیکن کتابت یا اشارہ اس کا قائم مقام بن سکتا ہے اور مال کی استدعا کا جواب اصل میں تو ہاتھ سے ہوتا ہے لیکن زبان سے وعدہ یا انکار اس کے قائم مقام ہوجاتا ہے۔ پھر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ سوال کے معنی استدعاء معرفت کیسے صحیح ہو سکتے ہیں جب کہ یہ ثابت ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے سوال کرے گا جیسے فرمایا :۔
وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ (۵-۱۱۶) اور (اس وقت کو بھی یاد رکھو) جب خدا فرمائے گا کہ اے عیسیٰ بن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا
تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے سوال کرنا کسی قسم کی معرفت حاصل کرنے کے لئے نہیں ہوگا اس لئے کہ وہ تو علام الغیوب ہے۔ (لَا تَخْفٰی عَلَیْہِ خَافِیَۃٌ) بلکہ لوگوں کو بتلانے اور انہیں سرزنش کرنے کی غرض سے ہوگا لیکن پھر بھی یہ سوال سوال عن المعرفۃ کبھی کسی چیز سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے اور کبھی محض سرزنش کے لئے جیسا کہ قرآن میں ہے :۔
وَاِذَا الْمَوْءٗدَۃُ سُئِلَتْ (۸۱-۸) جب لڑکی سے جو زندہ دفنا دی گئی ہے پوچھا جائیگا۔
اور کبھی صرف مسؤل (جس سے سوال کیا جائے) کو جتلانے کے لئے (نہ کہ خود کسی چیز سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے)
اور سوال جب کسی چیز کی معرفت حاصل کرنے کے لئے ہو تو مفعول ثانی کی طرف کبھی تو وہ متعدی بنفسہ ہوتا ہے اور کبھی حرف جار کے ذریعہ چنانچہ تم کہو گے سَأَلْتُہٗ کَذَا وَسَاءَلْتُہٗ عَنْ کَذَا وَبِکَذَا لیکن زیادہ تر بواسطہ عن کے متعدی ہوتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے :۔
یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الرُّوْحِ (۱۷-۸۵) اور تم سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔
وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ (۱۸-۸۳) اور تم سے ذی القرنین کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔
یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَنْفَالِ (۸-۱) (اے محمد مجاہد لوگ)

تم سے غنیمت کے مال کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔

اور فرمایا:۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ (۲-۱۸۶) اور (اے پیغمبر) جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں۔

سَاَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ (۷۰-۱) ایک طلب کرنے والے نے عذاب طلب کیا جو نازل ہو کر رہے گا۔

اور جب سوال طلب مال کے لئے ہو تو وہ متعدی بنفسہ بھی ہوتا ہے اور بذریعہ مِنْ کے بھی چنانچہ فرمایا:۔

وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ (۳۳-۵۳) اور جب پیغمبروں کی بیویوں سے کوئی سامان مانگو تو پردے کے باہر سے مانگو۔

وَاسْئَلُوْا مَا اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَا اَنْفَقُوْا (۶۰-۱۰) اور جو کچھ تم نے ان پر خرچ کیا ہو تم ان سے طلب کرو۔ اور جو کچھ انہوں نے (اپنی عورتوں پر) خرچ کیا ہو وہ تم سے طلب کرلیں۔

وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (۴-۳۲) اور خدا سے اس کا فضل (و کرم) مانگتے رہو۔

فقیر کو بھی جب وہ کسی چیز کی استدعا کرے تو اسے سائل کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳-۱۰) اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا۔

لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۵۱-۱۹) مانگنے والے اور نہ مانگنے والے۔

(س و م)

اَلسَّوْمُ کے معنی کسی چیز کی طلب میں جانے کے ہیں پس اسکا مفہوم دو اجزاء سے مرکب ہے یعنی طلب اور جانا پھر کبھی صرف ذہاب یعنی چلے جانا کے معنی ہوتے ہیں جیسے سَامَتِ الْاِبِلُ اونٹ چراگاہ میں چرنے کیلئے چلے گئے۔ اور ان اونٹوں کو جو باہر چرنے جاتے ہیں سَائِمَۃٌ کہا جاتا ہے اور کبھی صرف طلب کے معنی پائے جاتے ہیں جیسے سُمْتُ کَذَا میں نے اسے فلاں تکلیف دی چنانچہ قرآن میں ہے يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ (۲-۴۹) وہ لوگ تم کو بڑا دکھ دیتے تھے اور سِيْمَ فُلَانٌ الْخَسْفَ (فلاں کو خسف کا عذاب دیا گیا) یا هُوَ يُسَامُ الْخَسْفَ۔ کا محاورہ بھی اسی سے ماخوذ ہے اور اسی سے بَیْعٌ میں اَلسَّوْمُ ہے جس کے معنی نرخ کرنا کے ہیں چنانچہ کہا گیا ہے (۱۸۶)

صَاحِبُ السِّلْعَةِ اَحَقُّ بِالسَّوْمِ سامان کا مالک نرخ کرنے کا زیادہ حقدار ہے۔

اور سُمْتُ الْاِبِلَ فِی الْمَرْعٰی کے معنی چراگاہ میں چرنے کے لئے اونٹ بھیجنے کے ہیں۔ اور اسی معنی میں اَسَمْتُ الْاِبِلَ (انعال) وَسَوَّمْتُهَا (تفعیل) آتا ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ (۱۶-۱۰) اور اس سے درخت بھی (شاداب) ہوتے ہیں جن میں تم اپنے چارپایوں کو چراتے ہو۔

اَلسِّيْمَاءُ وَالسِّيْمِيَاءُ کے معنی علامت کے ہیں شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

---

[1] البخاری فی تاریخہ آتلہ فی اللسان (سوم) قالہ ابن عنقاء الفزاری فی عمیلة الفزاری واولہ: غلام رماہ اللہ بالخیر یافعا ۔ ۔ ۔ وفی روایة ابن الانباری بالحسن بدل الخیر وانظر الخبر والشعر فی الحماسة (۴: ۲۸ ط مصر) والمرزوقی ۱۵۸۸ والحصری (۴: ۱۰۴) والکامل (۱: ۲۲) والاغانی (۱۱۷:۱۷) والطبری (۲: ۹۸ (۴: ۸/۸۴: ۱۹۶) وشواہد الکشاف ۵۲ وابن ولاد ۶۲ والبحر (۲: ۳۱۶ ۸/ ۱۰۲) والمعجم للمرزبانی (۱۹۹) فی خمسة ابیات والمؤتلف للآمدی ۲۳۸ وبعدہ کان الثریا علقت فی جبینہ ۔ وفی انفہ الشعری وفی جیدہ القمر ۔ وفی روایة فوق نحرہ وعنقاء امہ واسمہ قیس بن بجرہ الفزاری المخضری والبیت الثانی قالہ علی بن طلحة حین قال الیوم راجع العقد (۴: ۳۲۲)

(۲۸۴) لَہٗ سِیْمِیَاءُ لَا تَشُقُّ عَلَی الْبَصَرِ

اس کے چہرے پر نشان ہے جو آنکھوں پر گراں نہیں گزرتا قرآن میں ہے :۔

سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (۴۸-۲۹) (کثرت سجود کے اثر سے ان کی پیشانیوں پر نشان پڑے ہوئے ہیں۔

اور سَوَّمْتُہٗ کے معنی نشان زدہ کرنے کے ہیں۔

اور مُسَوَّمِیْنَ (۳: ۱۲۵) کے معنی مُعَلَّمِیْنَ کے ہیں یعنی نشان زدہ اور مُسَوِّمِیْنَ (بصیغہ فاعل) کے معنی ہیں اپنے آپ پر یا اپنے گھوڑوں پر نشان امتیاز بنانے والے یا ان کو چھوڑنے والے۔

آنحضرت سے ایک روایت میں ہےلے (۱۸۷)

تَسَوَّمُوْا فَاِنَّ الْمَلَائِکَۃَ قَدْ تَسَوَّمَتْ کہ تم بھی نشان بنالو کیونکہ فرشتوں نے اپنے لئے نشان بنائے ہوئے ہیں۔

(س ء م)

اَلسَّاٰمَۃُ اس کے معنی کسی چیز کے زیادہ عرصہ تک رہنے کی وجہ سے اس سے کبیدہ خاطر یا دل برداشتہ ہوجانے کے ہیں اور یہ فعلاً (کسی کام کو زیادہ عرصہ تک کرنے) اور انفعالاً (کسی چیز سے زیادہ متاثر ہونے) دونوں طرح ہوتا ہے قرآن میں ہے:۔

وَھُمْ لَا یَسْئَمُوْنَ (۴۱-۳۸) اور (کبھی) تھکتے ہی نہیں

نیز فرمایا:۔

لَا یَسْئَمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَاءِ الْخَیْرِ (۴۱-۴۹)

انسان بھلائی کی دعائیں کرتا کرتا تو تھکتا نہیں۔

شاعر نے کہا ہےلے (الطویل)

(۲۴۹) سَئِمْتُ تَکَالِیْفَ الْحَیَاۃِ وَمَنْ یَّعِشْ
ثَمَانِیْنَ حَوْلًا لَا اَبَالَکَ یَسْأَمِ

میں زندگی کی خوشگواریوں سے اکتا چکا ہوں۔ ہاں جو شخص اسی کو پہنچ جائے وہ لامحالہ اکتا ہی جاتا ہے۔

(س ی ن)

طُوْرِ سَیْنَاءَ یہ مشہور پہاڑ کا نام ہے چنانچہ قرآن میں ہے :۔

تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَیْنَاءَ (۲۳-۲۰) (اور وہ درخت بھی ہم ہی نے پیدا کیا) جو طور سینا میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ حرف۔ اول یعنی سین کے فتحہ اور کسرہ دونوں کے ساتھ آتا ہے۔ فتح کی صورت میں قطعی طور پر الف ممدودہ برائے تانیث ہوگا کیونکہ عربی زبان میں فَعْلَالٌ کا وزن صرف کلمہ مضاعف کے ساتھ مختص ہے جیسے زَلْزَالٌ وَقَلْقَالٌ اور سین کے مکسور ہونے کی صورت میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کا الف عِلْبَاءَ اور حِرْبَاءُ کی طرح (برائے تانیث) ہو اور یہ بھی صحیح ہے۔ کہ الف سِرْدَاحٌ کے ساتھ ملحق کرنے کے لئے ہو اور اسی کو (دوسری جگہ) طُوْرِ سِیْنِیْنَ (۹۵-۲) بھی کہا گیا ہے۔

اَلسِّیْنُ حروف ہجاء میں سے ایک حرف کا نام ہے۔

(س و ی)

اَلْمُسَاوَاۃُ کے معنی وزن کیل یا مساحت

لے اخرجہ الطبری عن عمیر بن اسحاق (۴-۸۲) وفی النہایہ (۲-۱۸۸) تسوموا فان الملائکۃ قد تسومت ۱۲ ۳۲ لے الزہیر بن ابی سلمی والبیت فی مختار الشعر الجاہلی (۱: ۱۵۷) والبحر (۲: ۳۵۱) والمحاضرات (۴: ۴۹۸) والجمہرۃ ۱۰ والعقد الثمین ۹۶ وایام العرب ۲۷۶ (جامع الکبیر للیوزی) ۲۰ والمعلقات لابن الانباری ۲۸۷ وفی روایۃ عامًا بدل حولا وابن الشجری (۱: ۲۴۲) والسیوطی ۱۳۲ ؎ ؎ ؎

ئے لحاظ سے دو چیزوں کے ایک دوسرے کے برابر ہونے کے ہیں جیسے محاورہ ہے:۔

هٰذَا الثَّوْبُ مُسَاوٍ لِذٰلِكَ الثَّوْبِ یہ کپڑا اس کپڑے کے مساوی ہے۔ هٰذَا الدِّرْهَمُ مُسَاوٍ لِذٰلِكَ الدِّرْهَمِ یہ درہم اس درہم کے مساوی ہے اور کبھی بلحاظ کیفیت کے برابری ہونے پر بولا جاتا ہے جیسے:۔

هٰذَا السَّوَادُ مُسَاوٍ لِذٰلِكَ السَّوَادِ کہ یہ سیاہی اس سیاہی کے برابر ہے مگر اصل میں یہاں مساوات بلحاظ ذات سواد کے مراد نہیں ہوتی بلکہ بلحاظ مثل کے ہوتی ہے اور معنی معادلت (برابر) کے لحاظ سے یہ لفظ عدل والنصاف کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] (الطویل)

(۲۵) اَبَيْنَا فَلَا نُعْطِي السَّوَاءَ عَدُوَّنَا

ہم انکار کر دیتے ہیں اور اپنے دشمن کو عدل وانصاف نہیں دیتے۔

اِسْتَوٰى اس کا استعمال دو طرح ہوتا ہے ایک یہ کہ ایک دو یا دو سے زیادہ فاعل کی طرف اس کی اسناد ہو جیسے۔

اِسْتَوٰى زَيْدٌ وَعَمْرٌو فِي كَذَا کہ زید اور عمرو فلاں چیز میں برابر ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

لَا يَسْتَوُوْنَ عِنْدَ اللهِ (۹-۱۹) یہ لوگ خدا کے نزدیک برابر نہیں ہیں۔

دوم یہ کسی چیز کے اپنی ذات کے اعتبار سے حالت اعتدال پر ہونے کے لئے بولا جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔

ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى (۵۳-۶) (یعنی جبرائیل) طاقتور نے پھر وہ پورے نظر آئے۔

فَاِذَا اسْتَوَيْتَ اَنْتَ (۲۳-۲۸) جب تم اور تمہارے ساتھی کشتی میں بیٹھ جاؤ۔

اور محاورہ ہے:۔

اِسْتَوٰى اَمْرُ فُلَانٍ کہ فلاں کا معاملہ ٹھیک اور صحیح ہو گیا اور جب علیٰ کے ذریعہ متعدی ہو تو اس کے معنی کسی چیز پر چڑھنے، قرار پکڑنے اور مستولی ہونا کے ہوتے ہیں۔ جیسے محاورہ ہے:۔

اِسْتَوٰى فُلَانٌ عَلٰى عُمَالَتِهٖ فلاں نے اپنا عہدہ سنبھال لیا۔ قرآن میں ہے:۔

لِتَسْتَوُوْا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ (۴۳-۱۳) تاکہ تم ان کی سواری کرو۔

فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ (۴۹-۲۹) اور پھر وہ اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

اور اسی سے آیت:۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (۲۰-۵) (خدائے) رحمٰن جس نے عرش پر قرار پکڑا ہے اور بعض نے اس کے معنی یہ کئے ہیں کہ آسمان وزمین کی تمام چیزیں اس کے سامنے مساوی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے ان کو درست بنانے سے سب اس کے ارادہ کے مطابق ٹھیک اور درست ہو گئی ہیں۔ جیسا کہ آیت:۔

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ (۲-۲۹) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا تو ان کو ٹھیک (سات آسمان) بنا دیا۔

میں ہے بعض نے آیت اِسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ تمام چیزوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف برابر ہے کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کے متعلق یہ کہہ سکیں کہ یہ بنسبت دوسری چیز کے اللہ کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو اجسام پر قیاس نہیں کر سکتے جو ایک جگہ موجود ہوتے ہیں اور دوسری جگہ نہیں ہوتے۔

اور جب یہ لفظ (اِسْتَوٰى) متعدی بالیٰ ہو تو اسکے

---

[1] قالہ عنترۃ وتمامہ: تیاثا باعصاد والسمر المعطف والبیت فی مختار الشعر الجاهلی (ا: ۲۹۰) والعقد الثمین

معنی کسی چیز تک بالذات یا بالتدبیر پہنچ جانے کے ہوتے ہیں اور آیت :۔

ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (۴۱-۱۱) پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا۔

میں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی اَلْاِنْتِهَآءُ اِلَيْهَا بِالتَّدْبِيْرِ۔ یعنی تدبیر کرنا۔

اَلتَّسْوِيَةُ کے معنی کسی چیز کو ہموار کرنے کے ہیں اور آیت :۔

اَلَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ (۸۲-۷) (وہی تو ہے) جس نے تجھے بنایا اور تیرے اعضاء کو ٹھیک کیا۔

میں سَوّٰىكَ سے مراد یہ ہے کہ انسان کی خلقت کو اپنی حکمت کے اقتضاء کے مطابق بنایا اور آیت۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا (۹۱-۷) اور انسان کی اور اس کی جس نے اس کے قویٰ کو برابر بنایا۔

میں لفظ "ما" سے ان قوائے نفسانیہ کی طرف اشارہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے نفس کے لئے مُقَوِّم بنایا ہے چنانچہ فعل کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور یہ بحث دوسرے مقام پر مذکور ہو چکی ہے کہ فعل کی نسبت جس طرح فاعلِ حقیقی کی طرف ہوتی ہے اسی طرح آلہ اور ان تمام چیزوں کی طرف اس کی نسبت صحیح ہوتی ہے جن کا کہ وہ فعل محتاج ہوتا ہے۔ جیسے سَيْفٌ قَاطِعٌ (کہ یہاں فعل قطع کی نسبت تلوار کی طرف ہے جو آلہ قطع ہے) اور آیت کی یہ توجیہ جو ہم نے بیان کی ہے اس قول سے بہتر ہے جو مَا سَوّٰىهَا سے اللہ تعالیٰ مراد لیتے ہیں کیونکہ لفظ ما جنس کے لئے موضوع ہے اور سمع (یعنی کسی دلیل سمعی) سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے حق میں استعمال ہوا ہو لہذا اس سے ذات باری تعالیٰ مراد نہیں ہو سکتی۔ اور آیت :۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰى۔ (۸۷-۱، ۲) (اے پیغمبر) اپنے پروردگار جلیل الشان کے نام کی تسبیح کرو جس نے (انسان کو) بنایا پھر اس کے اعضاء کو درست کیا۔

میں سَوّٰى فعل (بلا اختلاف) اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے اسی طرح آیت کریمہ :۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ (۱۵-۲۹) جب اس کو (صورت انسانیہ میں) درست کر لوں اور اس میں (اپنی بے بہا چیز یعنی) روح پھونک دوں۔

اور اسی طرح دوسری آیت :۔

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا (۷۹-۲۸) اس کی چھت کو اونچا کیا پھر اسے برابر کر دیا۔

میں بھی فعل تسویۃ کا فاعل اللہ تعالیٰ ہی ہے اور آیت فَسَوّٰىهَا میں آسمان کا تسویہ اس کی بناوٹ اور تزیین دونوں کے لحاظ سے ہے۔ جیسا کہ آیت :۔

اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ (۳۷-۶) بے شک ہم ہی نے آسمان دنیا کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا۔ میں مذکور ہے۔

اَلسَّوِیُّ اسے کہتے ہیں جو مقدار اور کیفیت دونوں کے لحاظ سے افراط و تفریط سے محفوظ ہو۔ قرآن میں ہے۔

ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ..... (۱۹-۱۰) سالم تین رات (دن) ......۔

مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ (۲۰-۱۳۵) (دین کے) سیدھے راستے پر چلنے والے کون ہیں۔

اور رَجُلٌ سَوِیٌّ اس مرد کو کہا جاتا ہے جس میں خلق و خلقت دونوں اعتبار سے اعتدال پایا جائے اور افراط و تفریط سے محفوظ ہو۔ اور آیت :۔

عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ .....(۷۵-۴) پر قادر ہیں کہ ان کی پور پور درست کر دیں۔

میں تَسْوِیَۃُ الْبَنَانِ سے مراد ہتھیلی کو اونٹ کے پاؤں کی طرح بنا دینا مراد ہے کہ اس کی انگلیاں ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ تَسْوِیَۃُ الْبَنَانِ سے تمام انگلیوں کو یکساں بنا کر بیکار کر دینا مراد ہے کیونکہ انگلیوں کے قدر و ہیئت میں متفاوت ہونے کی حکمت ظاہر ہے کہ وہ اس صورت میں کسی چیز کے پکڑنے میں باہم تعاون کرتی ہیں اور اگر وہ سب برابر ہوتیں تو یہ تعاون ناممکن تھا اور آیت:۔

فَدَمْدَمَ عَلَیْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْبِهِمْ فَسَوّٰهَا (۹۱-۱۴) تو خدا نے ان کے گناہ کے سبب ان پر عذاب نازل کیا سب کو ہلاک کر کے) برابر کر دیا۔

میں سَوّٰهَا سے ان کے شہروں کو برباد کر کے زمین کے ساتھ برابر کر دینا مراد ہے۔ جیسے فرمایا:۔

وَهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا (۲-۲۵۹) جو کہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی تھی۔

اور بعض نے فَسَوّٰهَا کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ان کے شہروں کو ان پر برابر کر دیا جیسا کہ آیت:۔

لَوْ تُسَوّٰی بِهِمُ الْاَرْضُ (۴-۴۲) کہ کاش ان کو زمین میں مدفون کر کے مٹی برابر کر دی جاتی۔

میں مذکور ہے اور یہ کفار کے اس قول کی طرف اشارہ ہے جو کہ آیت:۔ وَیَقُوْلُ الْکٰفِرُ یٰلَیْتَنِیْ کُنْتُ تُرٰبًا (۷۸-۴۰) اور کافر کہے گا کہ اے کاش میں مٹی ہوتا۔ میں مذکور ہے۔

مَکَانٌ سُوًی وَسَوَاءٌ کے معنی وسط کے ہیں اور سَوَاءٌ وَسِوًی وَسُوًی اسے کہا جاتا ہے جس کی نسبت دونوں طرف مساوی ہوں اور یہ یعنی سَوَاءٌ وصف بن کر بھی استعمال ہوتا ہے اور ظرف بھی لیکن اصل میں یہ مصدر ہے۔

قرآن میں ہے:۔

فِیْ سَوَاۗءِ الْجَحِیْمِ ..... (۳۷-۵۵) (تو اس کو) وسط دوزخ میں۔

سَوَاۗءَ السَّبِیْلِ ..... (۲-۱۰۸) (تو وہ) سیدھے راستے سے۔

فَانْۢبِذْ اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَاۗءٍ (۸-۵۸) تو (ان کا عہد) انہیں کی طرف پھینک دو اور برابر کا جواب دو۔

تو یہاں عَلٰی سَوَاۗءٍ سے عادلانہ حکم مراد ہے۔ جیسے فرمایا:۔

اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ (۳-۶۴) (اے اہل کتاب) جو بات ہمارے اور تمہارے دونوں کے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی) ہے اس کی طرف آؤ۔

اور آیات:۔

سَوَاۗءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ (۲-۶) انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لئے برابر ہے۔

سَوَاۗءٌ عَلَیْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ (۶۳-۶) تم ان کے لئے مغفرت مانگو یا نہ مانگو ان کے حق میں برابر ہے۔

سَوَاۗءٌ عَلَیْنَآ اَجَزِعْنَآ اَمْ صَبَرْنَا (۱۴-۲۱) اب ہم گھبرائیں یا صبر کریں ہمارے حق میں برابر ہے۔

میں سَوَاۗءٌ سے مراد یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں عدم نفع میں برابر ہیں۔ نیز فرمایا:۔

سَوَاۗءَ نِ الْعَاکِفُ فِیْهِ وَالْبَادِ (۲۲-۲۵) خواہ وہ وہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے۔

اور کبھی سُوًی وَسَوَاۗءٌ بمعنی غیر (حرف استثنا) بھی آجاتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] (

[1] لم اجدہ ویرجی

(۲۵۱) فَلَمْ يَبْقَ مِنْهَا سِوَى هَامِدٍ

جسم مردہ کے سوا ان میں کوئی شخص باقی نہ رہا۔

اور دوسرے شاعر نے کہا ہے (الطویل)

(۲۵۲) وَمَا قَصَدَتْ مِنْ اَهْلِهَا لِسِوَائِكَا

اور اس اونٹنی نے اس شہر کے اہل میں سے تیرے سوا کسی کا قصد نہیں کیا۔

وَعِنْدِیْ رَجُلٌ سِوَاکَ تیرے علاوہ میرے پاس دوسرا آدمی ہے۔

اَلسِّیُّ کے معنی مساوی کے ہیں جیسے عِدْلٌ بمعنی مُعَادِلٌ اور قِتْلٌ بمعنی مُقَاتِلٌ کے آجاتا ہے چنانچہ محاورہ ہے۔

سِیَّانِ زَیْدٌ وَعَمْرٌو زید اور عمرو دونوں برابر ہیں۔

اور سِیٌّ کی جمع اَسْوَاءٌ آتی ہے جیسے نِقْضٌ کی جمع اَنْقَاضٌ اور بہت سے ہم مرتبہ یا برابر کے لوگوں کے لئے قَوْمٌ اَسْوَاءٌ وَمُسْتَوُوْنَ کہا جاتا ہے۔

اَلْمُسَاوَاۃُ۔ عرف میں قیمتی اشیاء کے متعلق بولا جاتا ہے جیسے ھٰذَا الثَّوْبُ یُسَاوِیْ کَذَا کہ اس کپڑے کی اتنی قیمت ہے۔ اصل میں یہ مُسَاوَاۃٌ فِی الْعَدَدِ سے مشتق ہے جس کے معنی دو چیزوں کے مقدار یا مرتبہ میں برابر ہونے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

حَتّٰی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ (۱۸-۹۶) جب اس نے دونوں پہاڑوں کے درمیان کا حصہ برابر کر دیا۔

(س و ء)

اَلسُّوْءُ۔ ہر وہ چیز جو انسان کو غم میں مبتلا کر دے اسے سوء کہا جاتا ہے خواہ وہ امور دنیوی کے قبیل سے ہو یا اخروی کے اور عام اس سے کہ اس کا تعلق احوال نفسانیہ سے ہو یا بدنیہ سے یا ان امور خارجیہ سے ہو جن کا تعلق جاہ وجلال کے چلے جانے یا کسی قریبی رشتے دار یا دوست کے فوت ہو جانے سے ہوتا ہے اور آیت:۔

بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ (۲۰-۲۲) وہ کسی عیب کے بغیر (چمکتا دمکتا) نکلے گا۔

میں سوء سے مراد آفت یعنی بیماری ہے بعض نے سُوْءٍ سے برص مراد لی ہے۔ لیکن یہ منجملہ ان امراض کے ایک ہے جو لاحق کو لگ جاتے ہیں

اور (عذاب اخروی کے متعلق) فرمایا:۔

اِنَّ الْخِزْیَ الْیَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ (۱۶-۲۷)

آج کافروں کی رسوائی اور برائی ہے۔

اور ہر وہ چیز جو قبیح ہو اسے "سُوْاٰی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی لئے یہ لفظ "اَلْحُسْنٰی" کے مقابلہ میں آتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ کَانَ عَاقِبَةَ الَّذِیْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰی۔ (۳۰-۱۰) پھر جن لوگوں نے برائی کی ان کا انجام بھی برا ہوا۔

جیسے اس کے مقابلہ میں فرمایا:۔

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَةٌ (۱۰-۲۶) جن لوگوں نے نیکوکاری کی ان کے لئے بھلائی ہے اور مزید برآں اور بھی۔

---

[۱] البیت من قصیدۃ لاعشی میمون مدح بہا ہوذۃ بن علی بن ثمامہ رئیس الیمامۃ وصدرہ: تجانف عن جو الیمامۃ ناقتی۔ وفی روایۃ اللسان والتاج (سوی) عدلت بدل قصدت وفی روایۃ ابن الشجری (۱: ۳۵) جل الیمامۃ بدل جو الیمامۃ وفی الخزانۃ (۳: ۳۹۹) عمدت بدل قصدت والبیت ایضا فی اللسان (جنف) والملی ابن الشجری (۲: ۴۵، ۲۵۲) وشرح الدیوان لثعلب ۴۷ وابن ولاد ۲۴ والاشباہ (۳: ۷۹) ودیوانہ ۱۳۱ والکامل ۱۱۸ والبحوا ۹۸:۴) والصاحبی ۱۵۴ وشرح شواہد للشنتمری (۱: ۱۳) والکتاب (۱: ۲۰۳) والبلدان (جو) واضداد ابی الطیب ۳۵۸ وفیہ تناور بدل تجانف واضداد ابن الانباری وفی روایتہ عدلت بدل قصدت والبیت من شواہد النحاۃ علی ان لفظۃ سواء قد یکون اسماً بمعنی غیر وفیہ بحث ۱۲ ❁

اور سَیِّئَۃٌ کے معنی برائی کے ہیں اور یہ حَسَنَۃٌ کی ضد ہے قرآن میں ہے:۔
بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَۃً (۲-۸۱) ہاں جو برے کام کرے۔
لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّیِّئَۃِ قَبْلَ الْحَسَنَۃِ (۲۷-۴۶) تم بھلائی سے پہلے برائی کے لئے کیوں جلدی کرتے ہو۔
یُذْھِبْنَ السَّیِّئَاتِ (۱۱-۱۱۴) گناہوں کو دور کر دیتی ہے۔
مَا اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَمَا اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ (۴-۷۹) (اے آدم زاد) تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی (شامت اعمال کی) وجہ سے ہے۔
فَاَصَابَھُمْ سَیِّئَاتُ مَا عَمِلُوْا (۱۶-۳۴)
اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ (۲۳-۹۶) اور بری بات کے مقابلہ میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو۔
اور حدیث میں ہے[1] (۱۸۶)
یَا اَنَسُ اَتْبِعِ السَّیِّئَۃَ الْحَسَنَۃَ تَمْحُھَا کہ انس برائی کے بعد نیکی کرو جو برائی کے اثر کو مٹا ڈالے گی۔
حَسَنَۃٌ اور سَیِّئَۃٌ دو قسم پر ہیں۔ ایک وہ جو عقل اور شریعت دونوں کی رو سے بھلی یا بری ہو۔ چنانچہ اس معنی کے لحاظ سے فرمایا:۔
مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشْرُ اَمْثَالِھَا وَمَنْ جَاءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَلَا یُجْزٰی اِلَّا مِثْلَھَا (۶-۱۶۱) جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لائے گا اسے سزا ویسی ہی ملے گی۔
دوسری حَسَنَۃٌ اور سَیِّئَۃٌ وہ ہے جو باعتبار طبیعت کے ہے یعنی وہ چیزیں جو طبیعت کو سبک یا گراں محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے قرآن میں ہے:۔
فَاِذَا جَاءَتْھُمُ الْحَسَنَۃُ قَالُوْا لَنَا ھٰذِہٖ وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰی وَمَنْ مَّعَہٗ (۷-۱۳۱) تو جب ان کو آسائش حاصل ہوتی تو کہتے کہ ہم اس کے مستحق ہیں اور اگر سختی پہنچتی تو موسیٰ اور ان کے رفیقوں کی بدشگونی بتاتے۔
ثُمَّ بَدَّلْنَا مَکَانَ السَّیِّئَۃِ الْحَسَنَۃَ (۷-۹۵) پھر ہم نے تکلیف کو آسودگی سے بدل دیا۔
اور سَاءَ فِیْ کَذَا وَسُؤْتُہٗ کہا جاتا ہے۔ اور اَسَأْتُ اِلٰی فُلَانٍ (بھلائی) بولتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔
سِیْٓئَتْ وُجُوْہُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۔۔۔۔ (۶۷-۲۷) تو کافروں کے منہ برے ہو جائیں گے۔
لِیَسُوْٓءٗا وُجُوْھَکُمْ (۱۷-۷) تاکہ تمہارے چہروں کو بگاڑیں۔ اور آیت:۔
وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ (۴-۱۲۳) جو شخص برے عمل کرے گا اسے اسی (طرح) کا بدلہ دیا جائیگا۔
میں سوء سے اعمال قبیحہ مراد ہیں۔ اسی طرح آیت:۔
زُیِّنَ لَھُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِھِمْ (۹-۳۷) ان کے برے اعمال ان کو بھلے دکھائی دیتے ہیں۔
میں بھی یہی معنی مراد ہیں اور آیت:۔
عَلَیْھِمْ دَائِرَۃُ السَّوْءِ (۹-۹۸) انہیں پر بری مصیبت (واقع) ہو۔
میں دَائِرَۃُ السَّوْءِ سے مراد ہر وہ چیز ہو سکتی ہے جو انجام کار غم کا موجب ہو اور آیت:۔
وَسَاءَتْ مَصِیْرًا (۴-۱۱۵) اور وہ بری جگہ ہے۔
سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا (۲۵-۶۶) (دوزخ) ٹھہرنے کی بری جگہ ہے۔ میں بھی یہی معنی مراد ہے۔

---

[1] وفی روایۃ فانہ لابی ذر وبعدہا "وخالق الناس بخلق حسن" وایضاً لمعاذ (راجع ابن کثیر ج ۲ ص ۴۶۴)

اور کبھی سَاءَ بِئْسَ کے قائم مقام ہوتا ہے۔
یعنی معنی ذم کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے فرمایا:۔
فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ فَسَاءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ
(۳۷-۷۷) مگر جب وہ ان کے مکان میں آ اتریگا
تو جن کو ڈرسنایا گیا تھا ان کے لئے برا دن ہوگا۔
سَاءَ مَا يَعْمَلُوْنَ (۵-۶۶) انکے عمل برے ہیں۔
سَاءَ مَثَلًا.....(۷-۱۷۷) مثال بری ہے۔
اور آیت:۔
سِيْئَتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۶۷-۲۷) (تو)
کافروں کے منہ برُے ہو جائیں گے۔
میں سِيْئَتْ کی نسبت وجوہ کی طرف کی گئی ہے
کیونکہ حزن وسرور کا اثر ہمیشہ چہرے پر ظاہر ہوتا
ہے اور آیت:۔
سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا (۱۱-۷۷) تو وہ
ان کے آنے سے غمناک اور تنگدل ہوئے۔
یعنی ان مہمانوں کو وہ حالات پیش آئے جن کی وجہ سے

اسے صدمہ لاحق ہوا۔ اور فرمایا:۔
لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ (۱۳-۱۸) ایسے لوگوں کا
حساب بھی برا ہوگا۔
وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ (۱۳-۲۵) اور ان کیلئے گھر بھی برا ہے
اور کنایہ کے طور پر سَوْءَةٌ کا لفظ عورت یا مرد کی
شرمگاہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے۔
كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ (۵-۳۱) اپنے بھائی کی
لاش کو کیونکر چھپائے۔
فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ (۵-۳۱) کہ اپنے بھائی کی
لاش چھپا دیتا۔
يُوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ (۷-۲۶) کہ تمہارا ستر ڈھانکے
بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا (۷-۲۲) تو ان کے ستر
کی چیزیں کھل گئیں۔
لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا
(۷-۲۰) تاکہ ان کے ستر کی چیزیں جو ان سے
پوشیدہ تھیں کھول دے۔

کِتَابُ الشِّیْن

ش ب ہ

اَلشِّبْہُ وَالشَّبَہُ وَالشَّبِیْہُ کے اصل معنی مماثلت بلحاظ کیف کے ہیں مثلاً لون اور طعم میں باہم مماثل ہونا یا عدل ظلم میں اور دو چیزوں کا حسی یا معنوی لحاظ سے اس قدر مماثل ہونا کہ ایک دوسرے سے ممتاز نہ ہوسکیں شُبْہَۃٌ کہلاتا ہے پس آیت کریمہ:۔

وَاُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِهًا (۲-۲۵) اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے۔

میں مُتَشَابِهًا کے معنی یہ ہیں کہ وہ میوے اصل اور مزہ میں مختلف ہونے کے باوجود رنگت میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں گے۔ بعض کے نزدیک کمال اور عمدگی میں ایک دوسرے کے مشابہ ہونا مراد ہے اور آیت کریمہ:۔

مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ (۶-۱۰۰) جو ایک دوسرے سے ملتے جلتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔

میں ایک قراءت مُتَشَابِهًا ہے مگر دونوں کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں اور آیت کریمہ:۔

اِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا (۲-۷۰) کیونکہ بہت سے بیل ہمیں ایک دوسرے کے مشابہ معلوم ہوتے ہیں۔

میں تَشَابَهَ فعل ماضی مذکر کا صیغہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور تَشَابَهُ فعل مضارع مونث بھی جو اصل میں تَتَشَابَهُ ہے اور تا رشین میں مدغم ہے۔ اور آیت:۔

تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (۲-۱۱۸) ان لوگوں کے دل آپس میں ملتے جلتے ہیں۔

میں ان کے قلوب کا گمراہی اور جہالت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہونا مراد ہے اور آیت:۔

وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ (۳-۷) اور بعض متشابہ ہیں۔

میں مُتَشَابِهَاتٌ سے مراد وہ آیات ہیں جن کی لفظی یا معنوی مماثلت کی وجہ سے تفسیر بیان کرنا مشکل ہو۔ عام فقہاء کے نزدیک متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن کے ظاہری معنی سے مقصود کا علم نہ ہوسکے۔

اصل میں آیات تین قسم پر ہیں بعض[1] علی الاطلاق محکم ہیں اور بعض[2] علی الاطلاق متشابہ اور بعض[3] من وجہ محکم اور من وجہ متشابہ ہیں۔

پھر متشابہات بھی تین قسم پر ہیں۔ متشابہ[1] بلحاظ لفظ، متشابہ[2] بلحاظ معنی اور متشابہ بلحاظ لفظ و معنی اور متشابہ بلحاظ لفظ پھر دو قسم پر ہے ایک وہ تشابہ جو الفاظ مفردہ میں ہوتا ہے۔ دوم وہ جو کلام مرکب میں پایا جاتا ہے۔ الفاظ مفردہ میں تشابہ یا تو بوجہ غرابت الفاظ کے ہوگا جیسے اَبٌّ وَيَزِفُّوْنَ کہ دونوں غریب معنی ہیں اور یا بوجہ لفظ کے مشترک ہونے کے جیسے يَدٌ وعَيْنٌ کہ یہ دونوں مختلف معانی کے لئے موضوع ہیں اور کلام مرکب میں تشابہ تین

قسم یہ ہے۔ بوجہ اختصار جیسا کہ آیت کریمہ:۔
وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴ - ۳) اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں ..... ان سے نکاح کر لو۔
دوسرے بوجہ بسط کلام کے جیسے فرمایا:۔
لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ (۴۲ - ۱۱) اس جیسی کوئی بھی چیز نہیں۔
کیونکہ اگر یہاں کاف نہ بڑھایا جاتا اور لَیْسَ مِثْلَهٗ شَیْءٌ کہا جاتا تو مطلب زیادہ صاف اور واضح ہو جاتا تیسرے وہ اشتباہ جو ترتیب کلام میں تغیر کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ آیت:۔
اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَیِّمًا (۱۸ - ۱، ۲) جس نے اپنے بندے (محمدؐ) پر اپنی کتاب نازل کی اور اس میں کسی طرح کی پیچیدگی نہیں رکھی (بلکہ) سیدھی (اور سلیس اتاری)
یہ اصل ترتیب کے لحاظ سے قَیِّمًا وَّلَمْ یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا تھا۔ نیز فرمایا:۔
لَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ۔ اِلٰی قَوْلِهٖ لَوْ تَزَیَّلُوْا (۴۸ - ۲۵) اور اگر ایسے مرد اور (عورتیں) نہ ہوتیں ——— اگر دونوں فریق الگ الگ ہو جاتے۔
متشابہ بلحاظ معنی جیسے صفات باری تعالیٰ اور احوال قیامت کہ یہ اوصاف نہ محسوس ہیں اور نہ محسوسات کی جنس سے ہیں اور جو چیز محسوس یا اس کی جنس سے نہ ہو اس کا تصور ہمارے لئے ناممکن ہوتا ہے۔ اور متشابہ من حیث اللفظ والمعنی کی پانچ قسمیں ہیں اول تشابہ بلحاظ کمیت کے مثلاً کسی حکم کے عام یا خاص ہونے کے متعلق شبہ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا:۔
اُقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ (۹ - ۵) تو مشرکوں کو... قتل کر دو۔
دوم بلحاظ کیفیت کے مثلاً کسی حکم کے واجب یا مندوب ہونے میں شک وشبہ پایا جاتا ہو چنانچہ فرمایا:۔
فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ (۴ - ۳) تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کر دو۔
سوم بلحاظ زمانہ کے یعنی کسی آیت کے ناسخ یا منسوخ ہونے میں تشابہ پایا جاتا ہو جیسے فرمایا:۔
اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (۳ - ۱۰۲) خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔
چہارم تشابہ بلحاظ مکان اور اسباب نزول کے جیسے فرمایا:۔
لَیْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا (۲ - ۱۸۹) اور نیکی اس بات میں نہیں ہے کہ تم (احرام کی حالت) میں گھروں میں ان کے پچھواڑے کی طرف سے آؤ۔
اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْکُفْرِ (۹ - ۳۷) مہینے کو پیچھے کر دینا کفر میں اضافہ کرتا ہے۔
تو ظاہر ہے کہ جو شخص ان کے رسم و رواج اور جاہلی عادات سے واقف نہ ہو وہ اس آیت کی تفسیر کو نہیں سمجھ سکتا۔
پنجم وہ تشابہ جو کسی فعل کے صحت وفساد کے شروط کو نہ جاننے کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ نماز اور نکاح کی شروط نہ جاننے سے اشتباہ ہو جاتا ہے۔
الغرض تشابہ کے یہ چند اقسام ہیں جن کا تصور کر لینے سے معلوم ہو جائے گا کہ مفسرین نے تشابہ کی جتنی بھی تشریحات بیان کی ہیں ان میں سے کوئی بھی مندرجہ بالا اقسام سے خارج نہیں ہے۔ مثلاً بعض کا قول ہے کہ الٓمٓ (حروف مقطعات) متشابہات سے ہے اور قتادہؒ نے کہا ہے کہ ناسخ محکم ہیں اور منسوخ متشابہ میں داخل ہیں اور الاصم کا قول ہے کہ جس آیت کی تفسیر متفق علیہ ہو وہ محکم اور جس کی تفسیر میں اختلاف

ہو وہ تشابہ ہے پھر جملہ متشابہات تین قسم پر ہیں۔ ایک وہ جن کا علم ہمارے لئے ناممکن ہے جیسے قیامت کا وقت اور دابۃ الارض کا خروج اور اس کی کیفیت وغیرہ۔ دوم وہ جن کا علم ہمیں ہوسکتا ہے۔ جیسے الفاظ غریبہ اور احکام مشکلہ سوم وہ جو ان دونوں کے بین بین ہیں جن کا علم صرف راسخین فی العلم کو ہی ہوسکتا ہے ہر ایک کے لئے ان تک رسائی ممکن نہیں۔ اسی قسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت نے حضرت علیؓ کے متعلق فرمایا (۱۸۷)

اَللّٰھُمَّ فَقِّھْہُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْہُ التَّاوِیْلَ کہ اے اللہ اسے دین میں سمجھ دے اور تاویل کا علم عطا فرما یہی دعا حضرت ابن عباسؓ کے متعلق بھی مروی ہے[1] (۱۸۸)

پس اس بحث کو پیش نظر رکھ لینے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آیت کریمہ:۔

وَمَا یَعْلَمُ تَاوِیْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (۳-۷) حالانکہ مراد اصلی خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں دستگاہ کامل رکھتے ہیں۔ میں اِلَّا اللّٰہُ پر بھی وقف صحیح ہے اور اَلرّٰسِخُوْنَ کے ساتھ ملا کر پڑھنا بھی جائز ہے اور ہر ایک یعنی وقف اور وصل کی ایک خاص وجہ ہے جو مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوسکتی ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِھًا (۳۹-۲۳) خدا نے نہایت اچھی باتیں نازل فرمائی ہیں (یعنی) کتاب جس کی آیتیں (ملتی جلتی) ہیں۔ میں مُتَشَابِھًا کے معنی یہ ہیں کہ احکام حکمت اور استقامت نظم کے لحاظ سے قرآن مجید کی تمام آیات ایک جیسی ہیں اور آیت کریمہ:۔

وَلٰکِنْ شُبِّہَ لَھُمْ (۴-۱۵۷) بلکہ ان کو ان کی سی صورت معلوم ہوئی۔

میں شُبِّہَ کے معنی یہ ہیں کہ ان کے سامنے کوئی دوسرا شخص مسیح علیہ السلام کے مشابہ بنا دیا گیا تھا جسے انہوں نے مسیح سمجھ کر قتل کر دیا تھا۔

اَلشَّبَہُ (پیتل) جواہر میں سے اسے کہا جاتا ہے جس کا رنگ سونے کے مشابہ ہوتا ہے۔

(ش ت ت)

اَلشَّتُّ کے معنی قبیلہ کو متفرق کرنے کے ہیں محاورہ ہے۔

شَتَّ جَمْعُھُمْ شَتًّا وَشَتَاتًا ان کی جمعیت متفرق ہوگئی۔ جَاؤُا اَشْتَاتًا وہ پراگندہ حالت میں آئے قرآن میں ہے:۔

یَوْمَئِذٍ یَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا (۹۹-۶) اس دن لوگ گروہ گروہ ہو کر آئیں گے۔

مِنْ نَّبَاتٍ شَتّٰی (۲۰-۵۳) (یعنی انواع واقسام) کی مختلف روئیدگیاں پیدا کیں۔

وَقُلُوْبُھُمْ شَتّٰی (۵۹-۱۴) (مگر) ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔

یعنی ان کی حالت مسلمانوں کی حالت کے برعکس ہے جن کے متعلق فرمایا:۔

وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَھُمْ (۸-۶۳) مگر خدا ہی نے ان میں الفت ڈال دی۔

شَتَّانَ یہ اسم فعل بروزن وَشْکَان ہے۔ محاورہ ہے۔

---

[1] وانما وعاؤہ صلی اللہ علیہ وسلم لابن عباس فمعروف ومتفق علیہ من حدیث ابن عباس دون قولہ "وعلمہ التاویل" فانہ انفرد بہذہ الزیادۃ احمد وابن حبان والحاکم وصححہ (تخریج العراقی علی الاحیاء (۳: ۴۲) وفی روایۃ الترمذی وابن عباس: اللھم علمہ الحکمۃ (۳/ ۲۲۲ مع التحفۃ ۱۲

شَتَّانَ مَاهُمَا وَشَتَّانَ مَابَيْنَهُمَا ان دونوں میں کس قدر بُعد اور تفاوت ہے

(ش ت و)

قرآن میں ہے:-

رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ (۱۰۶-۲) (یعنی) ان کو جاڑے اور گرمی کے سفر سے مانوس کرنے کے سبب)

اور شَتَى وَاَشْتَى کے معنی کسی جگہ موسم سرما گزارنے یا موسم سرما میں داخل ہونے کے ہیں جیسے صَافَ وَاَصَافَ کے معنی موسم گرما گزارنے یا موسم گرما میں داخل ہونے کے ہوتے ہیں۔

اَلْمَشْتیٰ وَالْمَشْتَاةُ (جاڑے کا زمانہ) اسم ظرف ہے اور کبھی مصدر بن کر بھی استعمال ہوتا ہے۔ شاعر نے کہا ہے[1] (الرمل)

(۲۴۵) نَحْنُ فِي الْمَشْتَاةِ نَدْعُوا الْجَفَلٰى

ہم موسم سرما یعنی قحط سالی میں دعوتِ عام دیتے ہیں۔

(ش ج ر)

اَلشَّجَرُ (درخت) وہ نبات جس کا تنہ ہو۔ واحد شَجَرَةٌ جیسے ثَمَرٌ وَثَمَرَةٌ۔ قرآن میں ہے۔

اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (۴۸-۱۸) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔

ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَا (۵۶-۷۲) کیا تم نے اس کے درخت کو پیدا کیا۔

وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (۵۵-۶) اور بوٹیاں اور درخت سجدہ کر رہے ہیں۔

مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ (۵۶-۵۲) تھوہر کے درخت سے

اِنَّ شَجَرَةَ الزَّقُّوْمِ (۴۴-۴۳) بلاشبہ تھوہر کا درخت

وَادٍ شَجِيْرٌ گنجان درختوں والی وادی۔ بہت درختوں والی جگہ۔

هٰذَا الْوَادِيْ اَشْجَرُ مِنْ ذَالِكَ اس وادی میں اس سے زیادہ درخت ہیں۔

اَلتَّشَاجُرُ وَالْمُشَاجَرَةُ وَالتَّشَاجُرُ باہم جھگڑنا اور اختلاف کرنا۔ قرآن میں ہے۔

فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (۴-۶۵) اپنے تنازعات میں۔

شَجَرَنِيْ عَنْهُ مجھے اس سے جھگڑا کر کے دور ہٹا دیا یا روک دیا حدیث میں ہے[2] (۱۸۹)

فَاِنِ اشْتَجَرُوْا فَالسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لَا وَلِيَّ لَهٗ اگر تنازع ہو جائے تو جس عورت کا ولی نہ ہو بادشاہ اس کا ولی ہے۔

اَلشِّجَارُ۔ ہودہ کی لکڑی چھوٹی پالکی۔

اَلْمِشْجَرُ لکڑی کا اسٹینڈ جس پر کپڑے رکھے یا پھیلائے جاتے ہیں۔

شَجَرَهٗ بِالرُّمْحِ اسے نیزہ مارا یعنی نیزہ مار کر اسی میں چھوڑ دیا۔

(ش ح ح)

اَلشُّحُّ (اسم) کے معنی حرص کے ساتھ بخل کے ہیں جو انسان کی عادت میں داخل ہو چکا ہو۔ قرآن میں ہے:-

---

[1] قالہ عنترۃ وتمامہ: لاتری الآدب فیھا ینتقر والبیت فی الکامل (۲: ۷۷۸) ودیوانہ ۶۸ واللسان (جعفل، نقر، ادب) والاقتضاب ۳۴۶ والاضداد ۲۱۴ واصلاح یعقوب ۳۸۱ والمرتضیٰ فی امالیہ (۱: ۲۵۴) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۴۴۲) وابن ولاد ۱۲ وتہذیب الالفاظ ۹۱ رقم ۴۹۰ والعقد الثمین ۱۲۶ والمعانی للقتبی ۳۷۷ [2] اخرجہ ابن حبان فی زوائدہ من حدیث عائشۃ رقم ۱۲۴۷ وفی الدارقطنی عنہا بلفظۃ: فان اشتجروا بدل تشاجروا (راجع النیل ۶: ۱۲۴—۱۲۵)

وَ اُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ (۴-۱۲۸) اور طبائع تو بخل کی طرف مائل ہوتی ہیں۔
وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ (۵۹-۹) اور جو شخص حرص نفس سے بچا لیا گیا۔
رَجُلٌ شَحِیْحٌ بخیل آدمی قَوْمٌ اَشِحَّۃٌ بخیل لوگ قرآن میں ہے۔
اَشِحَّۃً عَلَی الْخَیْرِ (۳۳-۹) مال میں بخل کریں۔
اَشِحَّۃً عَلَیْکُمْ (۳۳-۱۹) (یہ اس لئے کہ) تمہارے بارے میں بخل کرتے ہیں۔
خَطِیْبٌ شَحْشَحٌ خوش بیان اور بلیغ لیکچرر۔ یہ شَحْشَحَ الْبَعِیْرُ فِیْ ھَدِیْرِہٖ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹ کے مستی میں آواز کو پھرانے کے ہیں۔

(ش ح م)

اَلشَّحْمُ چربی ج شُحُوْمٌ قرآن میں ہے۔
حَرَّمْنَا عَلَیْھِمْ شُحُوْمَھُمَآ ..... (۶-۱۴۷)
ان کی چربی حرام کردی تھی۔
شَحْمَۃُ الْاُذُنِ. کان کا نرم حصہ جس میں بالیاں پہنی جاتی ہیں۔ یہ نرم ہونے کے لحاظ سے چونکہ چربی جیسا ہوتا ہے اس لئے اسے شَحْمَۃ کہا جاتا ہے اور شَحْمَۃُ الْاَرْضِ (کیچوا) گرگٹ کی قسم کا ایک جانور جو زمین یا ریت میں گھس کر رہتا ہے۔
رَجُلٌ مُشَحَّمٌ گھر میں بہت زیادہ چربی رکھنے والا۔ شَحِمٌ۔ چربی کھانے کا حریص لیکن جو اپنے دوستوں کو بہت چربی کھلانے والا ہو اسے شَاحِمٌ کہا جاتا ہے۔ اور شَحِیْمٌ کے معنی موٹے تازے اور چربی دار کے ہیں۔

(ش ح ن)

اَلشَّحْنُ کشتی یا جہاز میں سامان لادنا، بھرنا قرآن میں ہے:۔
فِی الْفُلْکِ الْمَشْحُوْنِ (۲۶-۱۱۹) بھری ہوئی کشتی میں (سوار) تھے۔
اَلشَّحْنَاءُ کینہ عداوت جس سے نفس پُر اور بھرا ہوا ہو عَدُوٌّ مُشَاحِنٌ بہت سخت دشمن گویا وہ دشمنی سے پُر ہے۔
اَشْحَنَ لِلْبُکَاءِ غم سے بھر کر رونے کیلئے آمادہ ہونا۔

(ش خ ص)

(اَلشَّخْصُ) کھڑے انسان کا جسم جو دور سے نظر آئے اسے شَخْصٌ کہا جاتا ہے اور شَخَصَ مِنْ بَلَدِہٖ کے معنی شہر سے چلے جانا کے ہیں۔ شَخَصَ بَصَرُہٗ اس کی آنکھ پتھرا گئی۔ شَخَصَ سَھْمُہٗ تیر نشانے سے اونچا نکل گیا۔ اور اَشْخَصَ (افعال) اس نے نشانے سے اونچا نکال دیا۔ قرآن میں ہے:۔
تَشْخَصُ فِیْہِ الْاَبْصَارُ (۱۴-۴۲) جب کہ (دہشت کے سبب) آنکھ کھلی کی کھلی رہ جائے گی۔
شَاخِصَۃٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا (۲۱-۹۷) کافروں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں۔

(ش د د)

اَلشَّدُّ یہ شَدَدْتُ الشَّیْءَ (ن) کا مصدر ہے جس کے معنی مضبوط گرہ لگانے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَشَدَدْنَا اَسْرَھُمْ (۷۶-۲۸) اور ان کے مفاصل کو مضبوط بنایا۔
فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (۴۷-۴) ان کو مضبوطی سے قید کرلو۔

اور شدّ کا لفظ عہد، بدن، قوائے نفس اور عذاب سب کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
وَكَانُوْا أَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً (۵-۴۴) وہ ان سے قوت میں بہت زیادہ تھے۔
عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى (۵۳-۵) ان کو نہایت قوت والے نے سکھایا۔
نہایت قوت والے سے حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔
غِلَاظٌ شِدَادٌ (۶۶-۶) تند خو اور سخت مزاج (فرشتے)
بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ (۵۹-۱۴) ان کا آپس میں بڑا رعب ہے۔
اَلشَّدِيْدُ وَالْمُتَشَدِّدُ: بخیل۔ قرآن میں ہے۔
وَإِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ (۱۰۰-۸) اور وہ تو مال کی سخت محبت والے ہیں۔
یہاں شَدِيْدٌ بمعنی مفعول بھی ہوسکتا ہے۔ گویا وہ خرچ کرنے سے باندھ دیا گیا ہے کہ اس معنی میں غلّ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيْهِمْ (۵-۶۴) یہود کہتے ہیں کہ خدا کا ہاتھ (گردن سے) بندھا ہوا ہے (یعنی اللہ بخیل ہے) انہیں کے ہاتھ باندھے جائیں
اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ شَدِيْدٌ بمعنی فاعل کے ہو تو گویا مُتَشَدِّدٌ وہ ہے جس نے تھیلی کو (بوجہ بخل کے) مضبوطی سے باندھ رکھا ہو۔ اور آیت کریمہ:۔
حَتّٰى إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهٗ وَبَلَغَ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً (۴۶-۱۵) یہاں تک کہ جب جوان ہوتا ہے اور چالیس برس کو پہنچ جاتا ہے۔
میں متنبہ کیا گیا ہے کہ جب انسان اس عمر یعنی چالیس (برس) کو پہنچ جاتا ہے جس میں اس کے قویٰ مضبوط ہو جاتے ہیں تو اس کی عادات پختہ ہو جاتی ہیں اور وہ انہیں ترک نہیں کر سکتا۔ شاعر نے کیا ہی خوب اشارہ کیا ہے[1] (الطویل)

(۲۵۴-۵۵) فَإِذَا الْمَرْءُ وَافَى الْأَرْبَعِيْنَ وَلَمْ يَكُنْ
لَهٗ دُوْنَ مَا يَهْوٰى حَيَاءٌ وَلَا سِتْرٌ
فَدَعْهُ وَلَا تَنْفِسْ عَلَيْهِ الَّذِيْ مَضٰى
وَإِنْ جَرَّ أَسْبَابَ الْحَيَاةِ لَهُ الْعُمْرُ

جب انسان چالیس برس کی عمر کو پہنچ جائے اور اسے اس کی خواہش سے حیا کا پردہ مانع نہ ہو تو اسے اس کی حالت پر چھوڑ دے اور گزشتہ پر کسی قسم کا دریغ نہ کر اگرچہ عمر اس کے لئے زندگی کے تمام اسباب کھینچ کر کیوں نہ لے آئے۔
شَدَّ فُلَانٌ وَاشْتَدَّ: تیزی سے چلنا۔
ہوسکتا ہے کہ یہ شَدَّ حِزَامَهٗ لِلْعَدْوِ کے محاورہ سے مشتق ہو جس کے معنی دوڑنے کے لئے کمربستہ ہونے کے ہیں جیسا کہ اسی معنی میں اَلْقٰى ثِيَابَهٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اِشْتَدَّتِ الرِّيْحُ کے محاورہ سے ماخوذ ہو جس کے معنی زور کی ہوا چلنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
اِشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ (۱۴-۱۸) کہ اس پر زور کی ہوا چلے۔

---

[1] في سبعة أبيات نسبها القالي ۲/۱۷۷ - الى اسحٰق بن خريم بن فاتك الاسدي قال البكري ۲۶۱ والصحيح انها لاقيشر مغيرة بن اسود من بني اسد بن خزيمة وفي الوحشيات ۲۷۷ منسوبة لاعرابي نزل بيحيى بن جبريل - يقال من لم يرد هذه الابيات ظاهروعة له انظر لتخريجها السمط ۲۶۱ والشعراء ۴۸۷ (تحقيق احمد شاكر) وفي رواية الوحشيات (الحماسة الصغرى) وفي بدل وافى: يأتي بدل يهوى وإني بدل معنى والدهر بدل العمر والبيت في الروح للآلوسي (۲۶-۱۷)

(ش ر ر)

اَلشَّرُّ وہ چیز ہے جس سے ہر ایک کراہت کرتا ہو۔ جیسا کہ خیر اسے کہتے ہیں جو ہر ایک کو مرغوب ہو۔ قرآن میں ہے:۔

مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا (١٩-٧٥) کہ مکان کس کا برا ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ (٨-٢٢) کچھ شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تمام جانداروں سے بدتر بہرے ..... ہیں۔

شر کا اصل معنی اور اس کے جملہ اقسام خیر کی بحث میں بیان ہو چکے ہیں۔

رَجُلٌ شَرٌّ وَشِرِّيْرٌ شریر آدمی وَقَوْمٌ اَشْرَارٌ برے لوگ۔ اَشْرَرْتُهٗ کسی کی طرف شر کی نسبت کرنا بعض نے کہا ہے کہ اَشْرَرْتُ كَذَا کے معنی کسی چیز کو ظاہر کرنے کے بھی آتے ہیں۔ اور شاعر کے اس قول سے استدلال کیا ہے[1] (الطویل)

(٢٥٦) اِذَا قِيْلَ اَيُّ النَّاسِ شَرٌّ قَبِيْلَةٍ
اَشَرَّتْ كُلَيْبٍ بِالْاَكُفِّ الْاَصَابِعُ

جب یہ پوچھا جائے کہ کونسا قبیلہ سب سے برا ہے تو ہاتھ انگلیوں سے بنی کلیب کی طرف اشارہ کر دیتے مگر اس شعر کے علاوہ اس معنی پر اگر اور کوئی دلیل نہ ہو تو یہاں اَشَرَّتْ کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کہ ہاتھ انگلیوں سے ان کی طرف شر کی نسبت کر دیتے ہیں۔

اَلشَّرَرُ بضم الشین، شرر مکروہ چیز شَرَارُ النَّارِ آگ کی چنگاری۔ آگ کی چنگاری کو شَرَارٌ اسلئے کہتے ہیں کہ اس سے بھی نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے قرآن میں ہے۔

تَرْمِيْ بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ (٧٧-٣٢) اس سے آگ کی اتنی اتنی بڑی چنگاریاں اڑتی ہیں جیسے محل۔

(ش ر ب)

اَلشُّرْبُ کے معنی پانی یا کسی اور مائع چیز کو نوش کرنے کے ہیں۔ قرآن نے اہل جنت کے متعلق فرمایا:

وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (٧٦-٢١) اور ان کا پروردگار انہیں نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

اور اہل دوزخ کے متعلق فرمایا:۔

لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ...... (٦-٧٠)
ان کے لئے پینے کو کھولتا ہوا پانی۔

شَرَابٌ کی جمع اَشْرِبَةٌ ہے اور شَرِبْتُهٗ شُرْبًا وَشُرْبًا کے معنی پینے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ اِلٰى قَوْلِهٖ فَشَرِبُوْا مِنْهُ (٢-٢٤٩) جو شخص اس میں سے پانی پی لے گا وہ مجھ سے نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس سے پی لیا۔ نیز فرمایا:۔

فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ (٥٦-٥٥) اور پیو گے بھی تو ایسے جیسے پیاسے اونٹ پیتے ہیں۔

اَلشِّرْبُ پانی کا حصہ۔ پینے کی باری۔ قرآن میں ہے

هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (٢٦-١٥٥) یہ اونٹنی ہے (ایک دن) اس کی پانی پینے کی باری ہے اور ایک معین روز تمہاری باری۔

كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ (٥٤-٢٨) ہر باری والے کو اپنی باری پہ آنا چاہیئے۔

---

[1] قالہ الفرزدق فی ہجو جریر ولفظہ کلیب بالجر علی حذف الجار وابقاء عملہ ویروی بالرفع علی التقدیر ہذہ کلیب وفی البیت حذف وقلب واصلہ: اشرت الاکف بالاصابع الی کلیب وفی روایۃ اشارت والبیت فی ابن عقیل رقم ٢٠٨ والخزانۃ (٣: ٦٤٩) ودیوانہ ٥٢٠ والمغنی ٣ فی المخطبۃ والسیوطی ہم والعینی (٢: ٥٤٢) وکلیب ہی کلیب بن یربوع قبیلۃ جریر۔

اَلْمَشْرَبُ (مصدر) پانی پینا (ظرف زمان یا مکان) پانی پینے کی جگہ یا زمانہ۔ قرآن میں ہے:۔
قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ (۲-۶۰) تمام لوگوں نے اپنا اپنا گھاٹ معلوم کرکے پانی پی لیا۔
اَلشَّارِبُ ہم پیالہ یا شراب کو کہتے ہیں اور مونچھ کے بالوں اور حلق کی اندرونی رگ کو شارِبٌ کہا جاتا ہے گویا ان کو پینے والا تصور کیا گیا ہے اس کی جمع شَوَارِبُ آتی ہے۔ ھُذلی نے گورخر کے متعلق کہا ہے[1] (الکامل)
(۲۵۷) "صَخِبُ الشَّوَارِبِ لَا يَزَالُ كَأَنَّهُ"
اس کی مونچھیں سخت گویا وہ ۔۔۔۔۔۔
اور آیت کریمہ:۔
وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ (۲-۹۳) اور ان کے کفر کے سبب (بچھڑا گویا) ان کے دلوں میں رچ گیا تھا۔
میں بعض نے کہا ہے کہ یہ أَشْرَبْتُ الْبَعِيرَ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی اونٹ کے گلے میں رسی باندھنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[2] (
(۲۵۸) وَأَشْرَبْتُهَا الْأَقْرَانَ حَتَّى وَقَصْتُهَا
بِقُرْحٍ وَقَدْ أَلْقَيْنَ كُلَّ جَنِينٍ
میں نے انہیں باہم باندھ لیا حتی کہ قرح (منڈی) میں لاڈالا اس حال میں کہ انہوں نے حمل گرادیئے تھے۔
تو آیت کے معنی یہ ہیں کہ گویا بچھڑا ان کے دلوں پر باندھ دیا گیا ہے۔ اور بعض نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں پلا دی گئی ہے کیونکہ عربی محاورہ میں جب کسی کی محبت یا بغض دل کے اندر سرایت کر جائے تو اس کے لئے لفظ شَرَابٌ کو بطور استعارہ بیان کرتے ہیں کیونکہ یہ بدن میں نہایت تیزی سے سرایت کرتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے[3] (الوافر)
(۲۵۹) تَغَلْغَلَ حَيْثُ لَمْ يَبْلُغْ شَرَابٌ
وَلَا حُزْنٌ وَلَمْ يَبْلُغْ سُرُورُ
اس کی محبت وہاں تک پہنچ گئی جہاں کہ نہ شراب اور نہ ہی حزن (وسرور) پہنچ سکتا ہے۔
اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں اس قدر زیادہ نہیں تھی تو ہم کہیں گے کیوں نہیں؟ عجل کا لفظ بول کر ان کی فرط محبت پر تنبیہ کی ہے کہ بچھڑے کی صورت ان کے دلوں میں اس طرح نقش ہوگئی تھی کہ محو نہیں ہوسکتی تھی مثل مشہور ہے۔
أَشْرَبْتَنِي مَا لَمْ أَشْرَبْ یعنی تو نے مجھ پر جھوٹا الزام لگانا۔

(ش ر ح)

شَرَحْتُ اللَّحْمَ وَشَرَّحْتُهُ کے اصل معنی گوشت (وغیرہ) کے لمبے لمبے ٹکڑے کاٹ کر پھیلانے کے ہیں۔ اور اسی سے شرح صدر ہے یعنی نور الٰہی اور سکون و اطمینان کی وجہ سے سینے میں وسعت پیدا ہوجاتا۔ قرآن میں ہے:۔

---

[1] قال ابو ذویب وتمامہ: عبد لآل ابی ربیعۃ مسبع۔ والبیت فی اللسان (سبع)، وقدمر [2] انشدہ فی ہذا المعنی ایضا ثعلب والبیت لبعض بنی اسد من اللصوص انظر مجالس ثعلب ۱۱۰ واللسان (شرب) والبارع والمحکم (قرح) فی اربعۃ ابیات مع خلاف فی الترتیب والقرح اسم سوق وادی القری وقصبتہا والعائذ نہ والکلابی وقبلہ: لقد علمت ذہ والکلابی انتی نہین باجواز الغلاۃ مہین والذود ام جماعۃ من الابل اذا کانت اناثا [3] قالہ عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبۃ بن مسعود احد الفقہاء السبعۃ فی المدینۃ فی زوجتہ عثمۃ ولہ فیہا اشعار کثیرۃ والبیت فی الحماسۃ مع المرزوقی رقم ۵۰۵ ومجالس ثعلب ۴۸ وامالی المرتضی (۱: ۲۱۷، ۴۰۰) والقالی (۲: ۱۹۱) فی خمسۃ والاغانی (۹: ۱۴۳) والسمط ۸۱، والحماسۃ بالتبریزی (۳: ۱۶۷) والحیوان (۵: ۴۶) والحصری (۱: ۲۱۲) فی ثلاثۃ اشعار مجموعۃ المعانی ۱۶۲ وعزاہ فی المحاضرات (۲: ۴۴) الی ابی عبد اللہ بن طاہر وقبلہ: فتقت القلب ثم ذررت فیہ ہواک فلیم فالتام الفطور۔

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي (۲۰-۲۵) کہا اے پروردگار میرا سینہ کھول دے۔

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (۹۴-۱) (اے محمدؐ) ہم نے تیرا سینہ کھول نہیں دیا۔

أَفَمَن شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ (۳۹-۲۲) بھلا جس کا سینہ خدا نے ... کھول دیا ہو۔

شَرْحُ الْمُشْكِلِ مِنَ الْكَلَامِ کے معنی مشکل کلام کی تشریح کرنے اور اس کے مخفی معنی کو ظاہر کرنیکے ہیں۔

(ش ر د)

شَرَدَ الْبَعِيرُ کے معنی ہیں اونٹ بدک کر بھاگ نکلا شَرَّدْتُ فُلَانًا فِي الْبِلَادِ میں نے شہروں میں بھگا دیا وَشَرَّدْتُ بِهِ یعنی میں اس سے ایسا برتاؤ کیا کہ اسے دیکھ کر دوسرے لوگ اس جیسا کام نہ کریں جیسے نَكَّلْتُ بِهِ کہ میں نے اسے دوسروں کے لئے عبرت بنادیا۔ قرآن میں ہے :۔

فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ (۸-۵۷) تو انہیں ایسی سزا دو کہ جو لوگ ان کے پس پشت ہوں وہ ان کو دیکھ کر بھاگ جائیں۔

مشہور محاورہ ہے۔

فُلَانٌ طَرِيدٌ شَرِيدٌ فلاں راندہ درگاہ ہے۔

(ش ر ذ م)

اَلشِّرْذِمَةُ۔ تھوڑی سی جماعت جو لوگوں سے الگ ہوگئی ہو۔ قرآن میں ہے :۔

لَشِرْذِمَةٌ قَلِيلُونَ (۲۶-۵۴) یہ لوگ تھوڑی سی جماعت ہیں۔

یہ ثَوْبٌ شَرَاذِمُ کے محاورہ سے ماخوذ ہے جس کے معنی پھٹے پرانے چیتھڑوں کے ہیں۔

(ش ر ط)

اَلشَّرْطُ وہ معین حکم جس کا وقوع کسی دوسرے امر پر معلق ہو اسے شرط کہتے ہیں وہ دوسرا امر اس کے لئے بمنزلہ علامت کے ہوتا ہے اور شَرِيطٌ بمعنی شرط آتا ہے اس کی جمع شرائط ہے۔ اِشْتَرَطْتُ كَذَا[1] کوئی شرط لگانا۔ اور اسی سے شَرَطٌ بمعنی علامت ہے۔ اور أَشْرَاطُ السَّاعَةِ کے معنی علامات قیامت کے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔

فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا (۴۷-۱۸) سو اس کی نشانیاں (وقوع میں) آچکی ہیں۔

اور پولیس کو شُرَطٌ کہا جاتا ہے اس لئے کہ وہ بھی ایسی علامت لگا لیتے ہیں جس سے ان کی پہچان ہوسکتی ہو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اشراط الابل سے مشتق ہے جس کے معنی رذیل اونٹوں کے ہیں۔ اور پولیس میں بھی چونکہ (عام طور پر) رذیل لوگ ہوتے تھے اس لئے انہیں شُرَطٌ کہہ دیا گیا ہے۔

أَشْرَطَ نَفْسَهُ لِلْهَلَكَةِ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا یا کسی کام میں ہلاکت کی بازی لگانا۔

(ش ر ع)

اَلشَّرْعُ سیدھا راستہ جو واضح ہو، یہ اصل میں

[1] واشراط الساعۃ بمعنی العلامات اوالبینات ثم الاشراط بمعنی العلامات علی نوعین مضیقۃ وہی التی لم تبق الدنیا بعدہ وتوعبا الالیسرلیسیر کنزول المهدی وظهور الرجال وخروج الدابۃ وطلوع الشمس من مغربها وغیرذالک وغیرمضیقۃ وہی اکثر الاشراط المداوع الغزوالفت فیہا کتب مختصرۃ ومطولۃ ۔ السیوطی رسالۃ سماہا الکشف عن مجاوزۃ ہذہ الامۃ الالف وبجور الزاخرۃ فی علوم الآخرۃ للسفارینی

شَرَعْتُ لَهٗ طَرِیْقًا (واضح راستہ مقرر کرنا) کا مصدر ہے اور بطور اسم کے بولا جاتا ہے۔ چنانچہ واضح راستہ کو شَرْعٌ وَشِرْعٌ وَشَرِیْعَۃٌ کہا جاتا ہے۔ پھر استعارہ کے طور پر طریق الہیہ پر یہ الفاظ بولے جاتے ہیں قرآن میں ہے:۔

شِرْعَۃً وَّمِنْهَاجًا (۵۔۴۸) ایک دستور اور طریق۔ اس میں دو قسم راستوں کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ایک وہ راستہ جس پر اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مسخر کر رکھا ہے کہ انسان اسی راستہ پر چلتا ہے جس کا تعلق مصالح عباد اور شہروں کی آبادی سے ہے چنانچہ آیت:۔ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (۴۳۔۳۲) اور ہر ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے۔

میں اسی طرف اشارہ ہے دوسرا راستہ دین کا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے مقرر فرما کر انہیں حکم دیا ہے کہ انسان اپنے اختیار سے اس پر چلے جس کے بیان میں شرائع کا اختلاف پایا جاتا ہے اور اس میں نسخ ہوتا رہا ہے اور جس پر کہ آیت:۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا (۴۵۔۱۸) پھر ہم نے تمہیں دین کے کھلے راستہ پر (قائم) کر دیا تو اسی (راستے) پر چلے چلو۔ دلالت کرتا ہے حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ شِرْعَۃً وہ راستہ ہے جسے قرآن نے بیان کر دیا ہے۔ اور مِنْهَاجٌ وہ ہے جسے سنت نے بیان کیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ (۴۲۔۱۳) اس نے تمہارے لئے دین کا وہی رستہ مقرر کیا جس کے اختیار کرنے کا حکم دیا تھا۔

میں دین کے ان اصول کی طرف اشارہ ہے جو تمام ملل میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں اور ان میں نسخ نہیں ہو سکتا۔ جیسے معرفت الہی اور وہ امور جن کا بیان آیت وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (۴۔۱۳۶) اور جو شخص خدا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں سے انکار کرے۔ میں پایا جاتا ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ شریعت کا لفظ شَرِيْعَةُ الْمَاءِ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی پانی کے گھاٹ کے ہیں اور شریعت کو شریعت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کی صحیح حقیقت پر مطلع ہونے سے سیرابی اور طہارت حاصل ہو جاتی ہے۔ سیرابی سے مراد معرفت الہی کا حصول ہے جیسا کہ بعض علماء کا قول ہے کہ میں پیتا رہا لیکن سیر نہ ہوا۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو گئی تو بغیر پینے کے سیری حاصل ہو گئی اور طہارت سے مراد وہ طہارت ہے جس کا ذکر کہ آیت:۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا (۳۳۔۳۳) اے پیغمبر کے اہل بیت خدا چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کی میل کچیل صاف کر دے اور تمہیں بالکل پاک صاف کر دے میں پایا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا (۷۔۱۶۳) (یعنی) اس وقت کہ ان کے ہفتے کے دن مچھلیاں ان کے سامنے پانی کے اوپر آتیں۔ میں شُرَّعًا، شَارِعٌ کی جمع ہے۔ اور شَارِعَةُ الطَّرِيْقِ کی جمع شَوَارِعُ آتی ہے جس کے معنی کھلی سڑک کے ہیں۔

اَشْرَعْتُ الرُّمْحَ قِبَلَهٗ میں نے اس کی جانب نیزہ سیدھا کیا۔ بعض نے شَرَعْتُهٗ فَهُوَ مَشْرُوْعٌ

کہا ہے اور شَرَعَتْ السَّفِیْنَۃَ کے معنی جہاز پر بادبان کھڑا کرنے کے ہیں جو اسے آگے چلاتے ہیں۔
هُمْ فِیْ هٰذَا الْاَمْرِ شَرْعٌ۔ یعنی وہ سب اس میں برابر ہیں۔ یعنی انہوں نے اسے ایک ہی وقت میں شروع کیا ہے اور شَرْعُكَ مِنْ رَجُلٍ زَیْدٌ یعنی حَسْبُكَ ہے یعنی زید ہی اس قابل ہے کہ تم اس کا قصد کرو یا اس کے ساتھ مل کر اپنا کام شروع کرو۔
اَلشِّرْعُ۔ بربط کے وہ تار جن سے راگ شروع کیا جاتا ہے۔

(ش ر ق)

شَرَقَتِ (ن) شُرُوْقًا۔ الشَّمْسُ آفتاب طلوع ہوا۔ مثل مشہور ہے (مثل)
لَا اَفْعَلُ ذَالِكَ مَاذَرَّ شَارِقٌ وَاَشْرَقَتْ جب تک آفتاب طلوع ہوتا رہیگا میں یہ کام نہیں کروں گا۔ یعنی کبھی بھی نہیں کروں گا۔ قرآن میں ہے:۔
بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ (۳۸-۱۸) صبح اور شام یہاں اشراق سے مراد وقتِ اشراق ہے۔
اَلْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ جب مفرد ہوں تو ان سے شرقی اور غربی جہت مراد ہوتی ہے اور جب تثنیہ ہوں تو موسم سرما اور گرما کے دو مشرق اور دو مغرب مراد ہوتے ہیں اور جمع کا صیغہ ہو تو ہر روز کا مشرق اور مغرب مراد ہوتا ہے یا ہر موسم کا قرآن میں ہے۔
رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (۷۳-۹) وہی مشرق اور مغرب کا مالک (ہے)
رَبُّ الْمَشْرِقَیْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَیْنِ (۵۵-۱۷) وہی دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا مالک ہے۔
وَرَبُّ الْمَشَارِقِ (۳۷-۵) اور مشرقوں کا رب ہے۔
مَكَانًا شَرْقِیًّا (۱۹-۱۶) مشرق کی طرف چلی گئی۔
اَلْمَشْرُقَۃُ جاڑے کے زمانہ میں دھوپ میں بیٹھنے کی جگہ جہاں سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی دھوپ پڑتی ہو۔ شَرَّقْتُ اللَّحْمَ گوشت کے ٹکڑے کر کے دھوپ میں خشک کرنا۔ اَلْمُشَرَّقُ عیدگاہ کو کہتے ہیں کیونکہ وہاں طلوع شمس کے بعد نماز ادا کی جاتی ہے۔ شَرِقَتِ الشَّمْسُ آفتاب کا غروب کے وقت زردی مائل ہونا اسی سے اَحْمَرُ شَارِقٌ کا محاورہ ہے جس کے معنی نہایت سرخ کے ہیں۔
اَشْرَقَ الثَّوْبَ کپڑے کو خالص گہرے رنگ کے ساتھ رنگنا۔
لَحْمٌ شَرَقٌ سرخ گوشت جس میں بالکل چربی نہ ہو۔

(ش ر ك)

اَلشِّرْكَۃُ وَالْمُشَارَكَۃُ کے معنی دو ملکیتوں کو باہم ملا دینے کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ایک چیز میں دو یا دو سے زیادہ آدمیوں کے شریک ہونے کے ہیں۔ خواہ وہ چیز مادی ہو یا معنوی مثلاً انسان اور فرس کا حیوانیت میں شریک ہونا یا دو گھوڑوں کا سرخ یا سیاہ رنگ کا ہونا اور شَرَكْتُہٗ وَشَارَكْتُہٗ وَتَشَارَكُوْا اور اِشْتَرَكُوْا کے معنی باہم شریک ہونے کے ہیں اور اَشْرَكْتُہٗ فِیْ كَذَا کے معنی شریک بنا لینا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَاَشْرِكْہُ فِیْ اَمْرِیْ (۲۰-۳۲) اور اسے میرے کام میں شریک کر۔ اور حدیث میں ہے (۱۹۱)
اَللّٰهُمَّ اَشْرِكْنَا فِیْ دُعَاءِ الصّٰلِحِیْنَ اے اللہ ہمیں نیک لوگوں کی دعا میں شریک کر۔
ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام کو فرمایا۔ (۱۹۲)
اِنِّیْ شَرَّفْتُكَ وَفَضَّلْتُكَ عَلٰی جَمِیْعِ خَلْقِیْ وَاَشْرَكْتُكَ فِیْ اَمْرِیْ۔ کہ میں نے تمہیں تمام

مخلوق پر شرف بخشا اور تجھے اپنے کام میں شریک کرلیا یعنی میرے ذکر کے ساتھ تمہارا ذکر ہوتا رہے گا اور میں نے اپنی طاعت کے ساتھ تمہاری طاعت کا بھی حکم دیا ہے جیسے فرمایا۔

وَ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (۵-۹۲) اور خدا کی فرمانبرداری اور رسول خدا کی اطاعت کرتے رہو۔

قرآن میں ہے:۔

وَ فِی الْعَذَابِ مُشْتَرِکُوْنَ (۳۷-۲۳) (اس دن) عذاب میں شریک ہوں گے۔

شَرِیْکٌ۔ ساجھی۔ قرآن میں ہے:۔

وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ (۱۷-۱۱۱) اور نہ اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے۔

اس کی جمع شُرَکَاءُ ہے جیسے فرمایا۔

شُرَکَاءُ مُتَشَاکِسُوْنَ (۲۹-۲۹) جس میں کئی آدمی شریک ہیں۔ (مختلف المزاج اور بدخو۔

شُرَکَاءُ شَرَعُوْا لَہُمْ (۴۲-۲۱) کیا ان کے وہ شریک ہیں جنہوں نے ان کے لئے ایسا دین مقرر کیا ہے۔

اَیْنَ شُرَکَاءِیْ (۴۱-۴۷) میرے شریک کہاں ہیں۔

دین میں شرک دو قسم پر ہے۔ شرک عظیم یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرانا اور اَشْرَکَ فُلَانٌ بِاللّٰہِ کے معنی اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کے ہیں اور یہ سب سے بڑا کفر ہے۔ قرآن میں ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ .... (۴-۱۱۶) خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے۔ اور فرمایا:۔

وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا (۴-۱۱۶) اور جس نے خدا کے ساتھ شریک بنایا وہ رستے سے دور جا پڑا۔

اِنَّہٗ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ .... (۵-۷۲) جو شخص خدا کے ساتھ شریک کریگا خدا اس پر بہشت کو حرام کر دیگا۔

یُبَایِعْنَکَ عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ بِاللّٰہِ شَیْئًا (۶۰-۱۲) اس بات پر بیعت کرنے کو آئیں کہ خدا کے ساتھ نہ شرک کریں گی۔

سَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا لَوْ شَاءَ اللّٰہُ مَا اَشْرَکْنَا (۶-۱۴۸) جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے۔

دوم شرک صغیر کہ کسی کام میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو بھی خوش کرنے کی کوشش کرنا اسی کا دوسرا نام ریا اور نفاق ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

شُرَکَاءَ فِیْمَآ اٰتٰہُمَا فَتَعٰلَی اللّٰہُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔ (۷-۱۹۰) تو اس (بچے) میں جو وہ ان کو دیتا ہے اس کا شریک مقرر کرتے ہیں جو وہ شرک کرتے ہیں۔ خدا کا (رتبہ) اس سے بلند ہے۔

وَ مَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُہُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَ ہُمْ مُّشْرِکُوْنَ۔ (۱۲-۱۰۶) اور یہ اکثر خدا پر ایمان نہیں رکھتے مگر (اس کے ساتھ) شرک کرتے ہیں۔

بعض نے اِلَّا وَ ہُمْ مُّشْرِکُوْنَ کے معنی یہ کئے ہیں کہ مگر وہ شَرَکٌ یعنی دنیا کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں اور اسی سے علیہ السلام نے فرمایا[۱] (۱۹۳)

اَلشِّرْکُ فِیْ ہٰذِہِ الْاُمَّۃِ اَخْفٰی مِنْ دَبِیْبِ النَّمْلِ .... یعنی اس امت میں شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ خفی ہوگا پس لفظ شِرْکٌ الفاظ مشترکہ

[۱] اللسان والنہایۃ (شرک)، والحکیم عن ابن عباس عن عائشۃ وعن ابی بکر وحل عن ابی عباس وفی جمیع الروایات فی امتی بدل ہذہ الامۃ وفی روایۃ الذر بدل النمل وفی تخریج العراقی (۳: ۳۰۶) اتقوا ہذا الشرک فانہ اخفی من دبیب النمل رواہ ابن حبان فی الضعفاء من حدیث ابی بکر الصدیق والطبرانی من حدیث ابی موسیٰ الاشعری ونزہۃ المجالس للصفوری ص ۶، راجع کنز العمال ج ۳ رقم ۴۷ ۲۳، ۲۳۳۴-۲۳۷۷، ۲۳۹۶

سے ہے اور آیت کریمہ :۔
وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (۱۸-۱۱۰) پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔
میں دونوں قسم کا شرک مراد ہے اور آیت کریمہ :۔
اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ (۹-۵) مشرکوں کو ۔ ۔ ۔ ۔ قتل کردو۔
میں اکثر فقہاء نے تمام کفار مراد لئے ہیں۔ کیونکہ یہود بھی (اہل کتاب تھے) عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے جیسا کہ قرآن میں ہے :۔
وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ (۹-۳۰) یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں۔
اور بعض نے کہا ہے کہ اہل کتاب کے علاوہ دوسرے کفار مراد ہیں کیونکہ آیت :۔
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصَّابِئِيْنَ وَالنَّصَارٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا (۲۲-۱۷) جو لوگ مومن (یعنی مسلمان) ہیں اور جو یہودی ہیں اور ستارہ پرست اور عیسائی اور مجوسی اور مشرک۔
میں مشرکین کو یہود و نصاریٰ سے الگ عطف کے ساتھ بیان فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب مشرکین سے خارج ہیں۔

(ش ر ی)

شراءٌ اور بیعٌ دونوں لازم ملزوم ہیں۔ کیونکہ مُشْتَرِیْ کے معنی قیمت دے کر اس کے بدلے میں کوئی چیز لینے والے کے ہیں۔ اور بائع اسے کہتے ہیں جو چیز دے کر قیمت لے اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب ایک طرف سے نقدی اور دوسری طرف سے سامان ہو۔ لیکن جب خرید و فروخت جنس کے عوض جنس ہو۔ تو دونوں میں سے ہر ایک کو بائع اور مشتری تصور کرسکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بیع اور شراء کے الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں اور عام طور پر شَرَيْتُ بمعنی بِعْتُ اور اِبْتَعْتُ بمعنی اِشْتَرَيْتُ آتا ہے قرآن میں ہے۔
وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ (۱۲-۲۰) اور اس کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ ڈالا۔
يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ (۴-۷۴) جو لوگ آخرت (کو خریدتے اور اس) کے بدلے دنیا کی زندگی کو بیچنا چاہتے ہیں۔
پھر شراءٌ اور اشتراءٌ کا لفظ ہر اس چیز کے متعلق استعمال ہوتا ہے جس کے عوض میں دوسری چیز لی جائے۔ چنانچہ فرمایا :۔
اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ (۳-۷۷) جو لوگ خدا کے اقراروں (کو بیچ کر ان) کے عوض تھوڑی سی قیمت حاصل کرتے ہیں۔
لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ (۳-۱۹۹) وہ خدا کی آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہیں لیتے۔
اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ (۲-۸۶) جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی خریدی۔
اِشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ (۲-۱۶) جنہوں نے گمراہی خریدی۔
اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۹-۱۱۱) خدا نے مومنوں سے ۔ ۔ ۔ ۔ خرید لئے ہیں۔
اور جس چیز کے بدلے اللہ تعالیٰ نے ان کی جانیں خرید کی ہیں اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :۔
يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ (یعنی خدا کی راہ میں لڑتے اور شہید ہوتے ہیں) اور خوارج اپنے آپ کو شُرَاةٌ کے نام سے موسوم کرتے تھے۔
اور آیت :۔
وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ

اللہ (۲-۲۰۷) اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اپنی جان بیچ ڈالتا ہو۔ سے استدلال کرتے تھے کہ یہاں یَشْرِیْ بمعنی یَبِیْعُ ہے۔ جیساکہ آیت اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی الآیۃ سے معلوم ہوتا ہے۔

(ش ط ط)

اَلشَّطَطُ کے معنی حد سے بہت زیادہ تجاوز کرنے کے ہیں جیسے شَطَّتِ الدَّارُ وَاَشَطَّ (گھر کا دور ہونا) اور یہ کسی مقام یا حکم یا نرخ میں حد مقررہ سے تجاوز کرنے پر بولا جاتا ہے۔

شاعر نے کہا ہے[1] ع (البسیط)

(۲۶۰) شَطَّ الْمَزَارُ بِجَدْوٰی وَانْتَھَی الْاَمَلُ

یعنی جدوی (محبوبہ) کی زیارت مشکل ہوگئی اور ہر قسم کی امیدیں منقطع ہوگئیں۔

اور کبھی شَطَطٌ بمعنی جَوْر بھی آجاتا ہے چنانچہ فرمایا:۔ لَقَدْ قُلْنَا اِذًا شَطَطًا۔ (۱۸-۱۴) تو ہم نے بعید از عقل بات کہی۔

شَطُّ النَّھْرِ۔ دریا کا کنارا (جہاں سے پانی دور ہو۔

(ش ط ر)

شَطْرُ الشَّیْءِ کے اصل معنی نصف یا وسط شے کے ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَوَلِّ وَجْھَکَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (۲-۱۴۴) اور اپنا منہ مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کیطرف پھیر لو۔ یہاں شطر بمعنی سمت ہے۔ جیسے فرمایا:۔

فَوَلُّوْا وُجُوْھَکُمْ شَطْرَہٗ (۲-۱۴۴) (نماز کے وقت) اس مسجد کی طرف منہ کرلیا کرو۔

شَاطَرْتُہٗ شِطَارًا آدھا آدھا تقسیم کرلینا۔

شَطَرَ بَصَرَہٗ اس طرح دیکھنا کہ تمہاری طرف بھی نظر رہے اور دوسرے کی طرف بھی۔

حَلَبَ فُلَانٌ الدَّھْرَ اَشْطُرَہٗ اس نے زمانہ کے خیر وشر کو پہچان لیا۔ اصل میں یہ لفظ اونٹنی کے متعلق استعمال ہوتا ہے چنانچہ جب کوئی شخص اونٹنی کے اگلی طرف کے دو تھنوں سے دودھ نکال لے اور پچھلی طرف کے چھوڑ دے تو اس کے متعلق حَلَبَ اَشْطُرَہٗ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے۔ اور شَطُوْرٌ اس اونٹنی کو کہا جاتا ہے جس کے ایک جانب کے تھن خشک ہوگئے ہوں اور شَطُوْرٌ اس بکری کو بھی کہا جاتا ہے جس کا ایک تھن دوسرے سے لمبا ہو۔

شَطَرَ کے معنی ایک جانب ہوجانے کے ہیں۔ اور شَاطِرٌ سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو دور رہتا ہو اس کی جمع شُطُرٌ آتی ہے۔

شاعر نے کہا ہے[2] ع (المتقارب)

(۲۶۱) اَشَاقَکَ بَیْنَ الْخَلِیْطِ الشُّطُرُ

---

[1] وتمامہ: فلا خیالٌ ولا عہدٌ ولا طللُ۔ وبعدہٗ: الا رجاءٌ فما ندری اَنُدرکہٗ۔ ام یستمر فیاتی دونہ الاجلُ والبیت من قصیدۃ لابن احمر مدح بہا النعمان بن بشیر بن سعد الانصاری وہو اول لد فی الاسلام من الانصار وآخر من ولی الکوفۃ لمعاویۃ بن ابی سفیان قتلتہ بنو کلب فی فتنۃ مروان وکان عثمانیا وابوہ بشیر بن سعد عقبی بدری والشطانی الذیل ۸ والبیت فی التاج (شط، واللسان (جدا) والالفاظ ۳۳۹ والسمط (۳: ۷) وجدوی اسم امرءۃ۔ [2] وتمامہ: وفیمن اقام من الحی ہر البیت لامرئ القیس رواہ فی اللسان (شطر) وفی روایۃ اشاقک وفی روایۃ الدیوان (صنعۃ السندوبی) ۵۲ وفیمن اقام من الحی ہر۔ ام الظاعنون بہا فی الشطر وانہ البیت مع آخر قد نقد علیہ فی رسائل البلغاء: ۳۳۳-۳۳۲ وفیہ شاقہ بدل شاقک۔

دوستوں میں پیچھے رہنے والوں نے اپنا مشتاق بنا لیا ہے۔
اور شاطر بعید عن الحق کو بھی کہتے ہیں۔ اور اس کی جمع شُطَّارٌ آتی ہے۔

(ش ط ن)

اَلشَّیْطَانُ اس میں نون اصلی ہے اور یہ شَطَنَ سے مشتق ہے جس کے معنی دور ہونیکے ہیں[1] اور بِئْرٌ شَطُوْنٌ (بہت گہرا کنواں)۔
شَطَنَتِ الدَّارُ۔ گھر کا دور ہونا غُرْبَةٌ شَطُوْنٌ (وطن سے دوری) وغیرہ محاورات اسی سے مشتق ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ لفظ شَیْطَانٌ میں نون زائدہ ہے اور یہ شَاطَ یَشِیْطُ سے مشتق ہے جس کے معنی غصہ سے سوختہ ہو جانے کے ہیں۔ اور شیطان کو بھی شیطان اسی لئے کہا جاتا ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے جیسا کہ آیت:۔
خَلَقَ الْجَانَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (۵۵-۱۵) اور جنات کو آگ کے شعلہ سے پیدا کیا۔
سے معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں قوت غضبیہ اور حمیت مذمومہ افراط کے ساتھ پائی جاتی ہے اس بنا پر اس نے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔
ابو عبیدہ نے کہا ہے[2] کہ شیطان ہر سرکش کو کہتے ہیں خواہ وہ جن وانس سے ہو یا دیگر حیوانات سے۔ قرآن میں ہے:۔
شَیٰطِیْنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ (۶-۱۱۲) شیطان (سیرت) انسانوں اور جنوں کو۔

وَاِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوْحُوْنَ (۶-۱۲۱) اور شیطان (لوگ)۔۔۔۔ دلوں میں (یہ بات) ڈالتے ہیں۔
وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ (۲-۱۴) اور جب اپنے شیطانوں میں جاتے ہیں۔
یعنی جب جنوں اور انسانوں میں سے اپنے اصحاب کے پاس جاتے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّیٰطِیْنِ (۳۷-۶۵) جیسے شیطانوں کے سر۔
میں بعض نے کہا ہے کہ شیاطین سے باریک جسم کے سانپ مراد ہیں اور بعض نے سرکش جن مراد لئے ہیں اور زناگ یعنی تھوہر کے پتوں کو، بدنما ہونے کی وجہ سے بطور تشبیہ رؤس الشیاطین کہا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔
وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ (۲-۱۰۲) اور ان (یہودیوں) کے پیچھے لگ گئے جو (سلیمانؑ کے عہد سلطنت میں) شیاطین پڑھا کرتے تھے۔
میں شیاطین سے سرکش جن مراد ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سرکش انسان بھی مراد ہوں شاعر نے کہا ہے[3]

(۲۶۲) لَوْ اَنَّ شَیْطَانَ الذِّئَابِ الْعُسَّلِ

اگر سرکش تیز رو بھیڑیا۔
یہاں عُسَّلٌ۔ عَاسِلٌ کی جمع ہے اور عاسل کے معنی نہایت سرعت کے ساتھ دوڑنے والے کے ہیں اور عَسَلَانٌ کا لفظ بھیڑیئے کی تیزروی کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسرے شاعر نے کہا ہے[4] (الرجز)

(۲۶۳) مَا لَیْلَةُ الْفَقِیْرِ اِلَّا شَیْطَانٌ

---

[1] راجع حماسۃ (۱: ۳۴۲) واللسان (شطن)، وفیہا کل عاتٍ متمرد مکان کل عارم۔ [2] فعلی ہذا یکون وزنہ فیعالا واذا کانت نونہ زائدۃ فوزنہ فعلان من شاط داعراب ثلاثین لابن خالویہ (۷۔۸)۔ [3] لم اجدہ۔ [4] وتمامہ "مجنونۃ تودی بروح الانسان" والبیت فی اللسان (فقر) بغیر عزو وفی البلدان (فقر) بجزءہ: مجنونۃ تودی تریح الاسنان وسیاتی فی (فقر)

کہ مقام نفیر میں ملت شیطان کی طرح بھیانک ہوتی ہو۔ اور انسان کی ہر بری خصلت کو شیطان کہا جاتا ہے۔ چنانچہ علیہ السلام نے فرمایا ہے[1]۔ اَلْحَسَدُ شَیْطَانٌ وَالْغَضَبُ شَیْطَانٌ کہ حسد بھی شیطان ہے اور غصہ بھی شیطان ہے۔

(ش ط ء)

شَاطِئُ الْوَادِی کے معنی وادی کے کنارہ کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِی الْاَیْمَنِ (۲۸-۳۰) تو میدان کے دائیں کنارے سے آواز آئی۔

شَاطَاتُ فُلَانًا کے معنی ہیں میں اس کے ساتھ ساتھ وادی کے کنارے پر چلا۔

شَطْأُ الزَّرْعِ کھیتی کی سوئی جو زمین سے نکل کر دونوں جانب پھیل جاتی ہے ج اَشْطَاءٌ قرآن میں ہے:۔

کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَہٗ (۴۸-۲۹) گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے زمین سے اپنی سوئی نکالی۔

ایک قرأت میں شَطَأَہٗ ہے جیسے شَمْعٌ وَشَمَعٌ وَنَھْرٌ وَنَھَرٌ وَغیرذالک۔

(ش ع ب)

اَلشِّعْبُ اس قبیلہ کو کہتے ہیں جو ایک قوم سے پھیلا ہو۔ اس کی جمع شُعُوْبٌ آتی ہے قرآن میں ہے۔

شُعُوْبًا وَّقَبَائِلَ (۴۹-۱۳) قومیں اور قبیلے (بنائے)

اَلشِّعْبُ مِنَ الْوَادِی۔ وادی کا وہ مقام جہاں اس کا کنارہ ملتا اور دوسرا جدا ہوتا ہو جب تم اس جگہ کو دیکھو جہاں اس کا کنارہ جدا ہو رہا ہے تو ایسا معلوم ہو

کہ ایک چیز کے ٹکڑے ہو رہے ہیں اور جب اس سرے کو دیکھو جہاں دوسرا اس سے ملتا ہے تو ایسا محسوس ہو کہ دونوں سرے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ شَعْبٌ کے معنی جمع کرنا اور متفرق کرنا دونوں آتے ہیں اور شُعَیْبٌ یا تو شَعْبٌ کی تصغیر ہے جو مصدر یا اسم ہے اور یا شِعْبٌ کی۔

اَلشَّعِیْبُ پرانی مشک جو مرمت اور درست کی گئی ہو۔ اور آیت کریمہ:۔

اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (۷۷-۳۰) اس سائے کی طرف چلو) جس کی تین شاخیں ہیں۔ کی تشریح اس کتاب کے بعد بیان ہو گی۔

(ش ع ر)

اَلشَّعْرُ بال اس کی جمع اَشْعَارٌ آتی ہے قرآن میں ہے۔

وَمِنْ اَصْوَافِھَا وَاَوْبَارِھَا وَاَشْعَارِھَا (۱۶-۸۰) اون اور پشم اور بالوں سے۔

شَعَرْتُ کے معنی بالوں پر مارنے کے ہیں۔ اور اسی سے شَعَرْتُ کَذَا مستعار ہے جس کے معنی بال کی طرح باریک علم حاصل کر لینے کے ہیں اور شاعر کو بھی اس کی فطانت اور لطافت نظر کی وجہ سے ہی شاعر کہا جاتا ہے تو لَیْتَ شِعْرِیْ کَذَا کے محاورہ میں شعر اصل میں علم لطیف کا نام ہے پھر عرف میں موزوں اور مقفی کلام کو شعر کہا جانے لگا ہے اور شعر کہنے والے کو شاعر کہا جاتا ہے۔ اور آیت کریمہ:۔

بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ ھُوَ شَاعِرٌ (۲۱-۵) بلکہ اس نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے نہیں بلکہ یہ شعر

---

[1] مسلم احمد ۱۲

ہے جو اس (شاعر) کا نتیجہ طبع ہے۔

نیز آیت کریمہ :۔

لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ (۳۷-۳۶) ایک دیوانے شاعر کے کہنے سے۔

اور آیت: شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ (۵۲-۳۰) شاعر ہے اور ہم اس کے حق میں... انتظار کرتے ہیں بہت سے مفسرین نے یہ سمجھا ہے کہ انہوں نے آنحضرت پر شعر بمعنی منظوم اور مقفی کلام بنانے کی تہمت لگائی تھی۔ حتی کہ وہ قرآن میں ہر اس آیت کی تاویل کرنے لگے جس میں وزن پایا جاتا ہے جیسے وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ اور تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ۔

لیکن بعض حقیقت شناس لوگوں نے کہا ہے کہ اس سے ان کا مقصد منظوم اور مقفی کلام بنانے کی تہمت لگانا نہیں تھا کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ قرآن اسلوب شعری سے مبرا ہے اور اس حقیقت کو عوام عجمی بھی سمجھ سکتے ہیں پھر فصحاء عرب کا کیا ذکر ہے۔ بلکہ وہ آپ پر (نعوذ باللہ) جھوٹ کی تہمت لگاتے تھے کیونکہ عربی زبان میں شعر بمعنی کذب اور شاعر بمعنی کاذب استعمال ہوتا ہے۔ حتی کہ جھوٹے دلائل کو اَدِلَّةٌ شِعْرِيَّةٌ کہا جاتا ہے اسی لئے قرآن نے شعراء کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ (۲۶-۲۲۴) الآیۃ اور شاعروں کی پیروی گمراہ لوگ کیا کرتے ہیں۔

اور شعر چونکہ جھوٹ کا پلندہ ہوتا ہے۔ اس لئے مقولہ مشہور ہے کہ اَحْسَنُ الشِّعْرِ اَكْذَبُهٗ سب سے بہتر شعر وہ ہے جو سب سے زیادہ جھوٹ پر مشتمل ہو اور کسی حکیم نے کہا ہے کہ میں نے کوئی متدین اور راست گو انسان ایسا نہیں دیکھا جو شعر گوئی میں ماہر ہو۔

اَلْمَشَاعِرُ حواس کو کہتے ہیں لہذا آیت کریمہ:۔

وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۴۹-۲) اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ کے معنی یہ ہیں کہ تم حواس سے اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اور اکثر مقامات میں جہاں لَا يَشْعُرُوْنَ کا صیغہ آیا ہے اس کی بجائے۔ لَا يَعْقِلُوْنَ کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو محسوس تو نہیں ہو سکتی لیکن عقل سے ان کا ادراک ہو سکتا ہے اور مَشَاعِرُ الْحَجِّ کے معنی رسوم حج ادا کرنے کی جگہ کے ہیں اس کا واحد مَشْعَرٌ ہے اور انہیں شَعَآئِرُ الْحَجِّ بھی کہا جاتا ہے اس کا واحد شَعِيْرَةٌ ہے چنانچہ قرآن میں ہے:۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ (۲۲-۳۲) اور جو شخص ادب کی چیزوں کی جو خدا نے مقرر کی ہیں عظمت رکھے عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ (۲-۱۹۸) مشعر حرام (یعنی مزدلفہ) میں۔

اور آیت کریمہ:۔

لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ (۵-۲) خدا کے نام کی چیزوں کی بے حرمتی نہ کرنا۔

میں شَعَآئِرَ اللّٰهِ سے مراد قربانی کے وہ جانور ہیں جو بیت اللہ کی طرف بھیجے جاتے تھے۔ اور قربانی کو شَعِيْرَةٌ اس لئے کہا گیا ہے۔ کہ شَعِيْرَةٌ (یعنی نیزلوہے) سے اس کا خون بہا کر اس پر نشان لگا دیا جاتا تھا۔

اَلشِّعَارُ وہ لباس جو انسان کے جسم کے ساتھ ملا رہتا ہے نیز لڑائی میں فوجی اشارہ کو بھی شعار کہا جاتا ہے۔

اَشْعَرَهُ الْحُبُّ محبت اس کا لباس بن گئی۔

اَلْاَشْعَرُ لمبے بالوں والا آدمی یا وہ گھوڑا جس کے کھر کے اردگرد گھنے بال ہوں اور سخت مصیبت کو کہا

جاتا ہے۔ اور شُعَرَاءُ کتے کی مکھی کو بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ ہر وقت اس کے بالوں پر بیٹھی رہتی ہے۔
اَلشَّعِیْرُ جو کا دانہ۔ اَلشِّعْرٰی ایک ستارے کا نام ہے جو سخت گرمی کے زمانہ میں طلوع ہوتا ہے اور آیت کریمہ:
هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰی (۵۳-۴۹) اور یہی شعریٰ کا مالک ہے میں شعریٰ کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ وہ ایک قوم کا معبود تھا۔

(ش ع ف)

آیت کریمہ: قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا (۱۲-۳۰) میں ایک قرأت قَدْ شَعَفَهَا یعنی مہملہ کے ساتھ ہے جو کہ شَعَفَةُ الْقَلْبِ سے مشتق ہے اور شَعَفَةُ الْقَلْبِ دل کے اس ملہبے کو کہتے ہیں جو شہرگ کے ساتھ لٹکا ہوا ہوتا ہے۔ اور شَعَفَةُ الْجَبَلِ پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں۔ اسی سے محاورہ ہے:
فُلَانٌ مَشْعُوْفٌ بِكَذَا فلاں اس پر فریفتہ ہے گویا محبت اسکے شعفہ قلب تک پہنچ گئی ہے۔

(ش ع ل)

اَلشَّعَلُ۔ آگ کا بھڑکنا یا بھڑکانا کہا جاتا ہے شُعْلَةٌ مِّنَ النَّارِ آگ کا شعلہ اور قَدْ اَشْعَلْتُهَا کے معنی ہیں میں نے آگ بھڑکائی۔
ابو زید کے نزدیک شَعَلْتُهَا (فعل مجرد) کہنا بھی جائز ہے۔ اَلشَّعِیْلَةُ جلتی ہوئی بتی۔ بعض نے سفیدی کے چمکنے کے لئے بھی بَیَاضٌ یَشْتَعِلُ کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:
وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا (۱۹-۴) اور سر بڑھاپے کی وجہ سے شعلہ مارنے لگا ہے۔
یہاں رنگت کے لحاظ سے بالوں کی سفیدی کو آگ کے ساتھ تشبیہ دے کر اشتعال کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اِشْتَعَلَ فُلَانٌ غَضَبًا فلاں غصہ سے بھڑک اٹھا یہاں غصہ کو حرکت کے لحاظ سے آگ کے بھڑکنے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اسی سے اَشْعَلْتُ الْخَيْلَ فِی الْغَارَةِ کا محاورہ ہے۔ یعنی میں نے غارت گری کے لئے سواروں کو چاروں طرف پھیلا دیا۔ جیسا کہ اَوْقَدْتُهَا وَهَيَّجْتُهَا وَاَضْرَمْتُهَا کے محاورات ہیں۔

(ش غ ف)

اَلشَّغَافُ۔ دل کا اندرونی حصہ قرآن میں ہے:
قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا (۱۲-۳۰) اس کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے۔
حسن نے اس کے یہ معنی کئے ہیں کہ یوسف کی محبت اس کے شغاف یعنی باطن قلب تک پہنچ گئی۔ اور ابو علی نے وسط قلب کے معنی بیان کئے ہیں اور یہ دونوں معنی مآل کے لحاظ سے تقریباً ایک ہی رہیں۔

(ش غ ل)

اَلشُّغُلُ وَالشُّغْلُ۔ ایسی مصروفیت جس کی وجہ سے انسان دوسرے کاموں کی طرف توجہ نہ دے سکے قرآن میں ہے:
فِی شُغُلٍ فٰكِهُوْنَ (۳۶-۵۵) عیش و نشاط کے

۱؎ و فی مجاز ابو عبیدۃ و یقرؤہ قوم (قد شعفها) و هو من المشعوف قال فی الطبری (۱۲-۱۰۱-۱۱۱)، قرء بالمهملة ابو رجاء والاعرج وعوف و روی عن علی والجمهور بالمعجمة راجع الفتح (۸/۲۷۲)

مشغلے میں ہوں گے۔

ایک قرأت میں شُغُلٍ ہے یہ شُغِلَ فَهُوَ مَشْغُوْلٌ (باب مجرد) سے آتا ہے اور اُشْتُغِلَ استعمال نہیں ہوتا شُغُلٌ شَاغِلٌ مصروف رکھنے والا کام۔

(ش ف ع)

اَلشَّفْعُ کے معنی کسی چیز کو اس جیسی دوسری چیز کے ساتھ ملا دینے کے ہیں اور جفت چیز کو شَفْعٌ کہا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے :۔

وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (۸۹-۳) اور جفت اور طاق کی۔ بعض نے کہا ہے کہ شَفْعٌ سے مراد مخلوق ہے کیونکہ وہ جفت بنائی گئی ہے۔ جیسے فرمایا :۔

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (۵۱-۴۹) اور ہر چیز کی ہم نے دو قسمیں بنائیں۔

اور وتر سے ذات باری تعالیٰ مراد ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے یگانہ ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ شفع سے مراد يَوْمَ النَّحْرِ ہے کیونکہ اس کے بعد دوسرا دن اس کی مثل ہوتا ہے اور وتر سے مراد یوم عرفہ ہے[1] اور بعض نے کہا ہے کہ شفع سے اولاد آدم اور وتر سے آدم علیہ السلام مراد ہیں کیونکہ وہ بن باپ کے پیدا کئے گئے تھے[2]۔

اَلشَّفَاعَةُ کے معنی دوسرے کے ساتھ اس کی مدد یا شفارش کرتے ہوئے مل جانے کے ہیں۔ عام طور پر کسی بڑے با عزت آدمی کا اپنے سے کم تر کے ساتھ اس کی مدد کے لئے شامل ہو جانے پر بولا جاتا ہے اور قیامت کے روز شفاعت بھی اسی قبیل سے ہو گی[3]۔ قرآن میں ہے :۔

لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (۱۹-۸۷) (تو لوگ) کسی کی سفارش کا اختیار رکھیں گے مگر جس نے خدا سے اقرار لیا ہو۔

لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ (۲۰-۱۰۹) اس روز کسی کی شفارش فائدہ نہ دے گی۔ مگر اس شخص کی جسے خدا اجازت دے۔

لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا (۵۳-۲۶) جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں دیتی۔

وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (۲۱-۲۸) وہ اس کے پاس کسی کی سفارش نہیں کر سکتے مگر اس شخص کی جس سے خدا خوش ہو۔

فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِيْنَ (۷۴-۴۸) (اس حال میں) سفارش کرنے والوں کی سفارش ان کے حق میں کچھ فائدہ نہ دے گی۔

یعنی جن معبودوں کو یہ اللہ کے سوا سفارش کیلئے پکارتے ہیں وہ ان کی سفارش نہیں کر سکیں گے۔

مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ (۴۰-۱۸) کوئی دوست نہیں ہوگا اور نہ کوئی سفارشی جس کی بات قبول کی جائے۔

وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (۴-۸۵) جو شخص نیک بات کی سفارش کرے تو اس کو اس (کے ثواب) میں سے حصہ ملے گا۔ اور جو بری بات کی سفارش کرے اس کو اس (کے عذاب) میں سے حصہ ملے گا۔ یعنی جو شخص اچھے یا برے کام میں کسی کی مدد اور سفارش کرے گا وہ بھی اس فعل کے نفع ونقصان

---

[1] قول ابن عباس وعکرمۃ والضحاک [2] مجاہد والحسن وفی تفسیر الآیۃ اقوال اخر علی (الطبری ۳۰-۱۷۰-۱۷۲) [3] انکر الشفاعۃ المعتزلۃ وقالوا اخلاف العدل وانکروا لاحادیث الواردۃ فی اثباتہ وہی ادل فرقۃ انکر الحدیث وراجع کتب الاصول)

میں اس کا شریک ہوگا۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں شفاعت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے کے لئے کسی اچھے یا برے مسلک کی بنیاد رکھے اور وہ اس کی اقتداء کرے تو وہ ایک طرح سے اس کا شفیع بن جاتا ہے۔ جیساکہ آنحضرت نے فرمایا ہے (۱۹۵)

مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا کہ جس شخص نے اچھی رسم جاری کی اسے اس کا ثواب ملے گا اور اس پر عمل کرنے والوں کا بھی اسے اجر ملے گا اور جس نے بری رسم جاری کی اس پر اس کا گناہ ہوگا۔ اور جو اس پر عمل کرے گا اس کے گناہ میں بھی وہ شریک ہوگا۔ اور آیت کریمہ۔

مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهِ (۱۰-۳) کوئی (اس کے پاس) اس کا اذن لئے بغیر کسی کی سفارش نہیں کر سکتا۔

کے معنی یہ ہیں کہ وہ اکیلا ہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے اور نظام کائنات کے چلانے میں کوئی اس کا ساجھی نہیں ہے۔ ہاں جب وہ امور کی تدبیر و تقسیم کرنے والے فرشتوں کو اجازت دیتا ہے تو وہ اس کی اجازت سے تدبیر امر کرتے ہیں۔

اِسْتَشْفَعْتُ بِفُلَانٍ عَلَى فُلَانٍ فَتَشَفَّعَ لِي میں نے فلاں سے مدد طلب کی تو اس نے میری مدد کی۔

شَفْعَةٌ۔ کے معنی کسی کی سفارش قبول کرنے کے ہیں۔ اور اسی سے علیہ السلام کا فرمان ہے (۱۹۶)

اَلْقُرْآنُ شَافِعٌ وَمُشَفَّعٌ کہ قرآن شافع اور مشفع ہوگا یعنی قرآن کی سفارش قبول کی جائے گی۔

اَلشُّفْعَةُ کے معنی ہیں کسی مشترکہ چیز کے فروخت ہونے پر اس کی قیمت ادا کر کے اسے اپنے ملک میں شامل کر لینا۔ یہ شَفْعٌ سے مشتق ہے۔ آنحضرت نے فرمایا ہے (۱۹۷)

إِذَا وَقَعَتِ الْحُدُودُ فَلَا شُفْعَةَ جب حدود مقرر ہو جائیں تو حق شفعہ باقی نہیں رہتا۔

(ش ف ق)

اَلشَّفَقُ غروب آفتاب کے وقت دن کی روشنی کے رات کی تاریکی میں مل جانے کو شفق کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (۸۴-۱۶) ہمیں شام کی سرخی کی قسم۔

اَلْإِشْفَاقُ کسی کی خیر خواہی کے ساتھ اس پر تکلیف آنے سے ڈرنا کیونکہ مشفق ہمیشہ مشفق علیہ کو محبوب سمجھتا ہے اور اسے تکلیف پہنچنے سے ڈرتا رہتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔

وَهُمْ مِنَ السَّاعَةِ مُشْفِقُونَ (۲۱-۴۹) اور وہ قیامت کا بھی خوف رکھتے ہیں۔

۱؎ رواہ الحاکم ومسلم والترمذی والنسائی وابن ماجۃ۔ عن جریر و باختلاف الالفاظ۔ عن ابی جحیفۃ و راجع الفتح (۳/ ۲۰۰)

۲؎ الحدیث اخرجہ ابن حبان من روایۃ جابر والحاکم من حدیث معقل بن یسار والطبرانی من حدیث ابن مسعود وابو عبیدۃ فی فضائل القرآن و راجع لتخریجہ الکاف ۹۲ و کنز العمال ج ۱ رقم ۲۲۰۷ و ۲۳ و ۲۳۶ ؛ ۳؎ رواہ الترمذی من حدیث جابر بن عبد اللہ قال وقد رواہ بعضہم مرسلا عن ابی سلمۃ والمسئلۃ مختلف فیہا بین الفقہاء راجع التحفۃ شرح الترمذی (۲: ۴۹) باختلاف الالفاظ فی البخاری ومسند احمد وابی داؤد وابن ماجۃ والشافعی عن الزہری عن ابی سلمۃ و سعید بن المسیب مرسلا و راجع کنز العمال ۳/۷

اور جب یہ فعل حرف مِنْ کے واسطہ سے متعدی تو اس میں خوف کا پہلو زیادہ ہوتا ہے اور اگر بواسطہ فِیْ کے متعدی ہو تو عنایت کے معنی نمایاں ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔

إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ (۵۲-۲۶)
اس سے قبل ہم اپنے گھر میں خدا سے ڈرتے رہتے تھے۔

مُشْفِقُونَ مِنْهَا (۴۲-۱۸) وہ اس سے ڈرتے ہیں۔

مُشْفِقِينَ مِمَّا كَسَبُوا (۴۲-۲۲) وہ اپنے اعمال (کے وبال سے) ڈر رہے ہوں گے۔

أَأَشْفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا (۵۸-۱۳) کیا تم اس سے کہ .... پہلے خیرات دیا کرو ڈر گئے ہو۔

(ش ف و)

شفا۔ کنوئیں وغیرہ کے کنارہ کو کہتے ہیں۔ یہ قرب ہلاکت کے لئے ضرب المثل ہے۔ قرآن میں ہے:۔

عَلَىٰ شَفَا جُرُفٍ هَارٍ (۹-۱۰۹) گر جانے والی کھائی کے کنارہ پر۔

عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ (۳-۱۰۳) (اور تم) آگ کے گڑھے کے کنارے تک ....

أَشْفَىٰ فُلَانٌ عَلَى الْهَلَاكِ فلاں ہلاکت کے قریب پہنچ گیا۔ اور اسی سے استعارہ کے طور پر کہا جاتا ہے مَا بَقِيَ مِنْ كَذَا إِلَّا شَفًى .... کہ فلاں چیز تھوڑی سی باقی رہ گئی ہے (یہ چاند یا سورج کے غروب ہونے یا کسی کی موت کے وقت بولا جاتا ہے) شَفَا کا تثنیہ شَفَوَانِ اور جمع أَشْفَاءٌ آتی ہے۔

(ش ف ی)

اَلشِّفَاءُ (ض) مِنَ الْمَرَضِ سلامتی سے ہمکنار ہونا یعنی بیماری سے شفا پانا یہ مرض سے صحت یاب ہونے کے لئے بطور اسم استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں شہد کے متعلق فرمایا:۔

فِيهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ (۱۶-۶۹) اس میں لوگوں کے (امراض کی) شفا ہے۔

هُدًى وَشِفَاءٌ (۴۱-۴۴) وہ ہدایت اور شفا ہے۔

شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُورِ (۱۰-۵۷) وہ دلوں کی بیماریوں کی شفا ہے۔

وَيَشْفِ صُدُورَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ (۹-۱۴) اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا بخشے گا۔

(ش ق ق)

اَلشَّقُّ شگاف کو کہتے ہیں۔ شَقَقْتُهُ بِنِصْفَيْنِ میں نے اسے برابر دو ٹکڑوں میں کاٹ ڈالا۔ قرآن میں ہے:۔

ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا (۸۰-۲۶) پھر ہم نے زمین کو چیرا پھاڑا۔

يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ (۵۰-۴۴) اس روز زمین (ان پر سے) پھٹ جائے گی۔

وَانْشَقَّتِ السَّمَاءُ (۶۹-۱۶) اور آسمان پھٹ جائے گا۔

إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ (۸۴-۱) جب آسمان پھٹ جائیگا۔

اور آیت کریمہ:۔

وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (۵۴-۱) اور چاند شق ہو گیا۔

میں بعض نے کہا ہے کہ انشقاق قمر آنحضرت کے زمانہ میں ہو چکا ہے۔ اور بعض کا قول ہے کہ یہ قیامت کے قریب ظاہر ہوگا اور بعض نے اِنْشَقَّ الْقَمَرُ کے معنی وَضَحَ الْأَمْرُ کئے ہیں یعنی معاملہ واضح ہو گیا۔

اَلشِّقَّةُ پھاڑا ہوا ٹکڑا۔ اسی سے محاورہ ہے۔
طَارَ فُلَانٌ مِنَ الْغَضَبِ شِقَاقًا فلاں غصہ سے پھٹ گیا۔ جیسا کہ تَقَطَّعَ غَضَبًا کا محاورہ ہے۔
طَارَتْ مِنْهُمْ شِقَّةٌ ان کا ایک حصہ اڑ گیا۔ یعنی غضب ناک ہوئے۔

اَلشِّقُّ اس مشقت کو کہتے ہیں جو تگ ودو سے بدن یا نفس کو لاحق ہوتی ہے جیسا کہ الانکسار کا لفظ بطور استعارہ نفس کی درماندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ (۱۶-۷) زحمت شاقہ کے بغیر
اَلشُّقَّةُ وہ منزل مقصود جس تک بمشقت پہنچا جائے۔ قرآن میں ہے:۔
بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ (۹-۴۲) لیکن مسافت ان کو دور (دراز) نظر آئی۔

اَلشِّقَاقُ (مفاعلۃ) کے معنی مخالفت کے ہیں گویا ہر فریق جانب مخالف کو اختیار کر لیتا ہے اور یا یہ شَقَّ الْعَصَا بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ کے محاورہ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی باہم افتراق پیدا کرنے کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا (۴-۳۵) اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں اَن بَن ہے۔
فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ (۲-۱۳۷) تو وہ تمہارے مخالف ہیں۔
لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْ (۱۱-۸۹) میری مخالفت تم سے کوئی ایسا کام نہ کرا دے۔
لَفِيْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ (۲-۱۷۶) وہ ضد میں (آ کر نیکی سے) دور (ہو گئے) ہیں۔
وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۸-۱۳) اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے۔ یعنی اس کے اولیاء کی صف کو چھوڑ کر ان کے مخالفین کے ساتھ مل جاتا ہے۔ جیسے فرمایا:۔
وَمَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (۹-۶۳) یعنی جو شخص خدا اور رسول کا مقابلہ کرتا ہے۔
وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ (۴-۱۱۵) اور جو شخص پیغمبر کی مخالفت کرے۔

اَلْمَالُ بَيْنَنَا شَقَّ الشَّعْرَةِ اَوْ شَقَّ الْاُبْلُمَةِ[1] یعنی مال ہمارے درمیان برابر برابر ہے۔
فُلَانٌ شِقُّ نَفْسِيْ اَوْ شَقِيْقُ نَفْسِيْ یعنی وہ میرا بھائی ہے میرے ساتھ اسے گونہ مشابہت ہے۔
شَقَائِقُ النُّعْمَانِ گل لالہ یا اس کا پودا[2]۔
شَقِيْقَةُ الرَّمْلِ ریت کا ٹکڑا۔
اَلشِّقْشِقَةُ اونٹ کا ریہ جو مستی کے وقت باہر نکالتا ہے اس میں چونکہ شگاف ہوتا ہے۔ اس لئے اسے شِقْشِقَةٌ کہتے ہیں[3]۔
بِيَدِهٖ شُقُوْقٌ اس کے ہاتھ میں شگاف پڑ گئے ہیں شِقَاقٌ سم کا شگاف فَرَسٌ اَشَقُّ راستہ سے ایک جانب مائل ہو کر چلنے والا گھوڑا۔
اَلشُّقَّةُ اصل میں کپڑے کے نصف حصہ کو کہتے ہیں اور مطلق کپڑے کو بھی شُقَّةٌ کہا جاتا ہے۔

---

[1] والابلمة الخوصة ای نحن متساوون فیه لان الخوصة اذا شققت طولا انشقت نصفین [2] واحدہ شقیقة واضیف الی النعمان بن المنذر لانه حمی ارضا فکثر فیها وقیل النعمان اسم الدم فشبهت حمرتها بحمرة الدم (اللسان: شقق) [3] وفی اللسان: ولا تکون الا للجمل العربی والجمع الشقاشق ومنه سمیت الخطباء شقاشق وفی حدیث علیؓ ان کثیرا من الخطب شقاشق الشیطان لما یدخل فیها من الکذب وفی الفائق القول منسوب لعمرؓ

(ش ق و)

اَلشَّقَاوَۃُ (بدبختی) یہ سعادت کی ضد ہے اور شَقِیَ (س) شَقْوَۃً وَشَقَاوَۃً وَشَقَاءً کے معنی بدبخت ہونے کے ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا (۲۳-۱۰۶) ہم پر ہماری کم بختی غالب ہوگئی۔
میں ایک قرأت شَقَاوَتُنَا ہے[1] تو شِقْوَۃٌ بروزن رِدَّۃٌ ہے۔ سعادت کی طرح شقاوت بھی امور اضافیہ سے ہے۔ جیسا کہ سعادت دو قسم پر ہے دینوی و اخروی اور پھر سعادت دنیوی تین قسم پر ہے۔ نفسانی، بدنی اور خارجی۔ اسی طرح شقاوت بھی انہی اقسام کی طرف منقسم ہوتی ہے۔ چنانچہ شقاوت اخروی کے متعلق فرمایا:۔
فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ (۲۰-۱۲۳) وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ تکلیف میں پڑے گا۔
رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا (۲۳-۱۰۶) ہم پر ہماری کم بختی غالب ہوگئی۔
اور شقاوت دنیوی کے متعلق فرمایا:۔
فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ (۲۰-۱۱۷) تو یہ کہیں تم دونوں کو جنت سے نکلوا نہ دے پھر تم تکلیف میں پڑ جاؤ۔
بعض نے کہا ہے کہ کبھی شَقَاءٌ کا لفظ تَعَبٌ کی جگہ پر استعمال ہوتا ہے جیسے شَقِيتُ فِي كَذَا یعنی میں نے فلاں معاملہ میں مشقت اٹھائی اور ان دونوں میں عموم خصوص کی نسبت ہے ہر شقاوت کو تعب کہہ سکتے ہیں لیکن ہر تعب شقاوت نہیں ہوتی لہذا تعب شقاوت سے عام ہے۔

(ش ك ك)

اَلشَّكُّ کے معنی دو نقیضوں کے ذہن میں برابر اور مساوی ہونے کے ہیں یہ یا تو اس لئے ہوتا ہے کہ ان دونوں کی علامتیں یکساں طور پائی جاتی ہیں اور یا اس لئے کہ دونوں میں سے کسی پر بھی دلیل نہیں ہوتی۔
اَلشَّكُّ کبھی تو نفس شے میں ہوتا ہے کہ کون سی جنس سے ہے اور کبھی اس کی صفت میں اور کبھی اس غرض کے بارے میں جس کے لئے وہ چیز وجود میں لائی گئی ہے۔
شک جہالت ہی کی ایک قسم ہے لیکن اس سے اخص ہے کیونکہ جہل میں کبھی سرے سے نقیضین کا علم ہی نہیں ہوتا۔ پس ہر شک جہل ہے مگر ہر جہل شک نہیں ہے۔ قرآن میں ہے:۔
لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيبٍ (۱۱-۱۱۰) وہ تو اس سے قوی شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔
بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ يَلْعَبُونَ (۴۴-۹) لیکن یہ لوگ شک میں کھیل رہے ہیں۔
فَإِن كُنتَ فِي شَكٍّ (۱۰-۹۴) اگر تم کو اس کتاب کے بارے میں کچھ بھی شک ہے۔
اور یہ (شک) یا تو شَكَكْتُ الشَّيْءَ سے مشتق ہے جس کے معنی چاک کر ڈالنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے[2] (الکامل)

(۲۴۶) وَشَكَكْتُ بِالرُّمْحِ الْأَصَمِّ ثِيَابَهُ
لَيْسَ الْكَرِيمُ عَلَى الْقَنَا بِمُحَرَّمٍ

---

[1] وہی قراءۃ ابن مسعودؓ والاول قراءۃ اہل المدینۃ (اللسان)۔ [2] قالہ عنترۃ انظر اللسان (شک) والطبری (۹-۱۲۶) ومحاضرات المؤلف (۲: ۱۴۰) والجمہرۃ ۲۲ والمعلقات لابن الانباری ۳۴۶ والعشر للتبریزی ۱۹۶ والمعانی للقتبی ۳ و دیوانہ ۲۱

میں نے ٹھوس نیزے سے اس کا دل دیا د سرع کو چاک کر ڈالا اور شریف آدمی نیزے پر حرام نہیں ہوتا۔ تو گویا شک کے معنی کسی چیز میں شگاف ڈالنے کے ہیں اور کسی شے کے اس طرح ہونے کے ہیں کہ اس میں رائے کو قرار حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس پر اعتماد ہو سکے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اس شَكَّ سے مستعار ہو جس کے معنی بازو کے پہلو سے چمٹ جانے کے ہیں اس طرح شک کا مفہوم یہ ہوگا کہ دو متضاد چیزوں کا باہم دیگر اس طرح مل جانا کہ رائے اور فہم ان میں داخل ہو کر ایک دوسری سے الگ نہ کر سکے اور اِلْتَبَسَ الْاَمْرُ وَاخْتَلَطَ وَاَشْكَلَ وغیرہا استعارات سے بھی اس اشتقاق کی تائید ہوتی ہے۔

اَلشِّكَّةُ ہتھیار جس سے کسی چیز کو پھاڑا جاتا ہے۔

(ش ك ر)

اَلشُّكْرُ کے معنی کسی نعمت کا تصور اور اس کے اظہار کے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ كَشْرٌ سے مقلوب ہے جس کے معنی کشف یعنی کھولنا کے ہیں۔ شکر کی ضد کفر ہے جس کے معنی نعمت کو بھلا دینے اور اسے چھپا رکھنے کے ہیں اور دَابَّةٌ شَكُوْرٌ اس چوپائے کو کہتے ہیں جو اپنی فربہی سے یہ ظاہر کر رہا ہو کہ اس کے مالک نے اس کی خوب پرورش اور حفاظت کی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہ عَيْنٌ شَكْرٰى سے ماخوذ ہے جس کے معنی آنسوؤں سے بھرپور آنکھ کے ہیں اس لحاظ سے شکر کے معنی ہوں گے منعم کے ذکر سے بھر جانا۔

شکر تین قسم پر ہے۔ شکر قلبی یعنی نعمت کا تصور کرنا۔ شکر لسانی یعنی زبان سے منعم کی تعریف کرنا شکر بالجوارح یعنی بقدر استحقاق نعمت کی مکافات کرنا۔ اور آیت کریمہ:۔

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا (۳۴-۱۳) اے داؤد کی آل میرا شکر کرو۔

میں بعض نے کہا ہے کہ یہاں شُكْرًا منصوب علی التمیز ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو عمل کرو وہ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کے لئے کرو۔ اور بعض نے کہا ہے کہ شُكْرًا اِعْمَلُوْٓا کا مفعول ہے۔ اور اُشْكُرُوْا کی بجائے اِعْمَلُوْٓا اس لئے کہا گیا ہے تاکہ شکر کی انواع ثلاثہ یعنی شکر قلبی ولسانی اور شکر بالجوارح کے التزام پر تنبیہ ہو جائے۔

قرآن میں ہے:۔

اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ (۳۱-۱۴) کہ میرا بھی شکر کرتا رہ اور اپنے ماں باپ کا بھی۔

وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ (۳-۱۴۵) اور ہم شکر گزاروں کو عنقریب بہت اچھا صلہ دیں گے۔

وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ (۲۷-۴۰) اور جو شکر کرتا ہے تو اپنے ہی فائدہ کے لئے۔

اور آیت کریمہ:۔

قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ (۳۴-۱۳) اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی ہیں۔

میں تنبیہ پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کماحقہ شکر گزار ہونا بہت مشکل کام ہے یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء میں سے شکر گزاری پر صرف دو پیغمبروں کی تعریف کی ہے اول حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جیسے فرمایا:۔

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ۔ اس کی نعمتوں کے شکر گزار تھے دوم حضرت نوح کی جیسے فرمایا:۔

إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا (۱۷-۳) بے شک نوح ہمارا شکر گزار بندہ تھا۔

اور جب شکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جیسے۔ إِنَّهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ (۶۴-۱۷) بے شک خدا قدر شناس اور بردبار ہے۔

تو اس سے اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں پر انعام کرنا اور ان کی عبادت گزاری کی پوری پوری جزا دینا مراد ہوتا ہے نَاقَةٌ شَكِرَةٌ دودھ سے بھرے ہوئے تھنوں والی اونٹنی (یہ شکر سے صیغہ صفت ہے) مقولہ مشہور ہے[1]۔

هُوَ أَشْكَرُ مِنْ بَرْوَقٍ وہ بروق گھاس سے بھی زیادہ شکر گزار ہے۔ بروق گھاس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہلکی سی بارش سے ہری بھری ہو جاتی ہے اور شَكْرٌ کے معنی کنایہ کے طور پر عورت کی شرمگاہ اور اس سے جماع کے بھی آتے ہیں۔ کسی نے کہا ہے[2]۔

إِنْ سَأَلَتْكَ ثَمَنَ شَكْرِهَا وَشَبْرِكَ أَنْشَأَتْ تَطُلُّهَا اگر وہ تجھ سے اپنی شرمگاہ اور جماع کی اجرت طلب کرتی ہے تو تو اس میں حیلے بہانے کرتا ہے۔

اَلشَّكِيرُ تر و تازہ گھاس جو درخت کے تنہ میں ہو۔ اور شَكِرَتِ (س) اَلشَّجَرَةُ کے معنی درخت کی شاخوں کے گنجان ہونے کے ہیں۔

(ش ك س)

اَلشَّكِسُ بدمزاج کو کہتے ہیں اور آیت کریمہ: شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ (۲۹-۳۹) جس میں کئی آدمی شریک ہیں (مختلف المزاج) اور بدخو۔ یعنی اپنی بدمزاجی کی وجہ سے باہم جھگڑا کرنے والے ہیں۔

(ش ك ل)

اَلْمُشَاكَلَةُ کے معنی شکل و صورت میں مشابہ ہونے کے ہیں اور نِدٌّ کے معنی جنس میں شریک ہونے کے ہیں اور شَبَهٌ کے معنی کیفیت میں مماثلت کے ہیں۔ چنانچہ آیت کریمہ:۔ وَآخَرُ مِنْ شَكْلِهِ أَزْوَاجٌ (۵۸-۳۸) اور اسی طرح کے اور بہت سے (عذاب ہوں گے)، میں ہیئت اور تعاطی فعل کے لحاظ سے مماثلت مراد ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ شَكْلٌ کے معنی دَلٌّ یعنی عورت کے ناز و انداز کے ہیں لیکن اصل میں اس نسبت کو کہتے ہیں جو دو ہم مشرب و ہم پیشہ شخصوں میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اسی سے محاورہ ہے۔ اَلنَّاسُ أَشْكَالٌ وَأُلَّافٌ کہ لوگ باہم مشابہ اور الفت کرنے والے ہیں۔

اصل میں مُشَاكَلَةٌ شَكْلٌ سے ہے اور شَكَلْتُ الدَّابَّةَ کے معنی ہیں میں نے جانور کی ٹانگیں (شکال سے) باندھ دیں اور شکال اس رسی کو کہتے ہیں جس

---

[1] انظر المثل اللسان (برق) والمیدانی رقم ۲۰۵۲ و فیہ تخضر من غیر مطر بل تنبت بالسحاب اذا نشأ ۱۲۔ [2] قالہ یحیی بن یعمر رجل خاصمتہ امرأتہ فی مہرہا او سدہ القتبی فی ادب الکتاب (ص ۱۲) مثلا للتقعیر والتقعیب و فیہ الخبر و مجالس ثعلب ۲۹۵ ثم قال والشکر: الفرج والکامل للمبرد ۶۸ و کتب تراجم النحویین مع اختلاف فی الروایۃ و فی اللسان (ضہل طلل) والفائق ۳۲۳/۱ و زیادۃ تضہلہا ای تعطیہا القلیل من حقہا والنہایۃ (شکر) و فیہ: أإن بزیادۃ ہمزۃ الاستفہام و فی المطبوع تصحیف و ارتباک ۱۲

سے اس کی ٹانگیں باندھ دی جاتی ہیں پھر اس سے استعارہ کے طور پر شَكَلْتُ الْكِتَابَ کی طرح شَكَّلْتُ الْكِتَابَ کا محاورہ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی کتاب کو اعراب لگانے کے ہیں۔

دَابَّةٌ بِهَا شِكَالٌ وہ جانور جس کے ایک اگلے اور ایک پچھلے پاؤں میں شِکال یعنی پائے بند کی طرح سفیدی ہو۔ قرآن میں ہے :۔

قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ (۱۷-۸۴) کہو کہ ہر ایک اپنے طریق کے مطابق عمل کرتا ہے۔

یعنی اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتا ہے جو اسے پائے بند کئے ہوئے ہے کیونکہ فطرت انسان پر سلطان قاہر کی طرح غالب رہتی ہے جیسا کہ ہم اپنی کتاب "الذَّرِيعَةُ إِلَىٰ مَكَارِمِ الشَّرِيعَةِ" میں بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ ایسے ہی جیسا کہ آنحضرت نے فرمایا ہے[۱] (۱۹۹)

كُلٌّ مُتَيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ (ہر کس بقدر ہمت اوست)

اَلْأَشْكَلَةُ حاجت جو انسان کو پابند کردے اور اَلْإِشْكَالُ کے معنی (بطور استعارہ) کسی کام کے پیچیدہ ہو جانے کے ہیں۔ جیسا کہ اشتباہ کا لفظ شُبْهَةٌ سے مشتق ہے اور مجازاً کسی امر کے مشتبہ ہونے پر بولا جاتا ہے۔

(ش ک و)

اَلشَّكْوُ وَالشِّكَايَةُ وَالشَّكَاةُ وَالشَّكْوَىٰ کے معنی اظہار غم کے ہیں اور شَكَوْتُ وَاَشْكَيْتُ دونوں ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہے :۔

إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ (۱۲-۸۶) کہ میں تو اپنے غم اور اندوہ کا اظہار خدا سے کرتا ہوں۔

وَتَشْتَكِي إِلَى اللَّهِ (۵۸-۱) اور خدا سے شکایت (رنج وملال) کرتی ہے۔

أَشْكَاهُ (افعال) کے معنی کسی کو صاحب شکوہ کر دینے کے آتے ہیں۔ جیسے أَمْرَضْتُهُ (اس کو صاحب مرض کر دیا) اور کسی کی شکایت کا ازالہ کرنے کے لئے بھی یہ فعل استعمال ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں ہے[۲] (۲۰۰)

شَكَوْنَا إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ وَسَلَّمَ حَرَّ الرَّمْضَاءِ فِي جِبَاهِنَا وَأَكُفِّنَا فَلَمْ يُشْكِنَا

کہ ہم نے آنحضرت کے پاس اپنی پیشانیوں اور ہاتھوں میں گرمی کی شدت کی شکایت کی لیکن آپ نے ہماری شکایت کا ازالہ نہ کیا۔

اصل میں شَكْوٌ کے معنی شَكْوَةٌ یعنی چھوٹے مشکیزہ کو کھولنے اور اس کے اندر کی چیز کو ظاہر کرنے کے ہیں لہٰذا یہ دراصل بَثَثْتُ لَهُ مَا فِي وِعَائِي اور نَفَضْتُ مَا فِي جِرَابِي کی طرح استعارہ ہے جس کے معنی دل کی بات کو ظاہر کر دینے کے ہیں۔

اَلْمِشْكٰوةُ طاق جو آر پار نہ ہو۔ قرآن میں ہے :۔

كَمِشْكٰوةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ (۲۴-۳۵) گویا ایک طاق ہے جس میں چراغ ہو۔

تو مشکوۃ سے مراد مومن کا دل اور مصباح سے نور الٰہی مراد ہے۔

---

[۱] رواہ الحاکم وابو داؤد واصلہ متفق علیہ عن عمران بن حصین والترمذی عن عمر والحاکم ایضاً عن ابی بکر فی حدیث طویل [۲] اخرجہ مسلم لیعدان اورد احادیث ابراد الظہر والبیہقی من حدیث خباب راجع النیل (۲: ۳۲۹) والزرقانی علی المؤطا (۱: ۴۰) والحدیث فی جل کتب الحدیث وفی الفائق (۱: ۲۵۲) والنہایۃ (شکو) ۱۲

(ش م ت)

اَلشَّمَاتَۃُ کے معنی دشمن کی مصیبت پر خوش ہونے کے ہیں اور یہ شَمِتَ بِہٖ فَھُوَ شَامِتٌ کا مصدر ہے اور اَشْمَتَ اللّٰہُ بِہِ الْعَدُوَّ کے معنی ہیں اللہ اسے مصیبت پہنچائے جس سے اس کے دشمن خوش ہوں قرآن میں ہے:۔

فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ (۷-۱۵۰) تو ایسا نہ کیجئے کہ دشمن مجھ پر ہنسیں۔

تَشْمِیْتٌ کے معنی چھینکنے والے کو دعا دینے کے ہیں۔ گویا ازالہ شماتۃ کی دعا ہے جیسے تَعْرِیْضٌ کے معنی مرض کو زائل کرنے کے ہیں۔ شاعر نے کہا ہے (البسیط)[1]

(۲۶۵) ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خَبَاتٌ لَہٗ

طَوْعُ الشَّوَامِتِ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تو اس نے خوف وہراس اور سردی میں کھڑے ہو کر رات گزاری۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں شوامت سے قوائم یعنی ٹانگیں مراد ہیں لیکن یہ معنی محل نظر ہیں اس لئے کہ اس بیت کے علاوہ اس معنی پر اور کوئی دلیل نہیں ہے۔

(ش م خ)

(اَلشَّامِخُ) بلند ج مونث شَامِخَات)

قرآن میں ہے:۔

وَّرَوَاسِیَ شٰمِخٰتٍ (۷۷-۲۷) اونچے اونچے پہاڑ۔

اور اسی سے شَمَخَ بِاَنْفِہٖ کا محاورہ ہے جس کے معنی تکبر کرنے کے ہیں۔

(ش م ء ز)

اَلْاِشْمِئْزَازُ۔ منقبض وگرفتہ ہو جانا۔ قرآن میں ہے۔

اِشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ (۳۹-۴۵) تو ان لوگوں کے دل منقبض ہو جاتے ہیں۔

(ش م س)

اَلشَّمْسُ کے معنی سورج کی ٹکیہ یا دھوپ کے ہیں ج شُمُوْسٌ قرآن میں ہے:۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّھَا (۳۶-۳۸) اور سورج اپنے مقررہ رستے پر چلتا رہتا ہے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (۵۵-۵) سورج اور چاند ایک حساب مقرر سے چل رہے ہیں۔

شَمَسَ یَوْمُنَا وَاَشْمَسَ۔ دن کا دھوپ والا ہونا۔

شَمَسَ فُلَانٌ شِمَاسًا گھوڑے کا بدکنا ایک جگہ پر قرار نہ پکڑنا۔ گویا قرار نہ پکڑنے میں سورج کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

(ش م ل)

اَلشِّمَالُ۔ بایاں ضد یمین۔ قرآن میں ہے:۔

عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ (۵۰-۱۷) جو دائیں اور بائیں بیٹھے ہیں۔

---

[1] قالہ النابغۃ والبیت بتمامہ، فارتاع من صوت کلاب فبات لہ۔ طوع الشوامت من خوف ومن بردا والبیت فی اللسان (شمت) ومختار الشعر الجاہلی (۱: ۵۰) والمحکم (طوع) وفیہ ومن صرد والکلاب صاحب الکلاب والشوامت القوائم ای بات الثور طوع قوائمہ (یعنی قائما) وہذا علی روایۃ من روی طوع بالنصب ومن رفعہ فانہ یرید من طوع الشوامت ای ماتشتہیہ اعداؤہ راجع للبیت ایضا البحرۃ: ۲۲۷) والعقد الثمین ۲ والعشر للتبریزی ۴ ۲۹ والبیت من ابیات المعانی راجع اللسان والمعانی الکبیر للقتبی ۹ ۲۳

نیز چھوٹی چادر جس سے بائیں جانب ڈھانپ لی جائے اسے بھی شِمَالٌ کہا جاتا ہے جس طرح کہ عربی زبان میں دوسرے اعضاء کی مناسبت سے لباس کے مختلف نام رکھے گئے ہیں۔ مثلاً قمیص کی آستین کو یَدٌ (ہاتھ) اور جو حصہ سینہ اور پشت پر آئے اسے صَدْرٌ اور ظَهْرٌ کہا جاتا ہے اور پائجامہ کے پائنچہ کو رِجْلٌ سے موسوم کر دیتے ہیں وغیرہ ذالک۔

اور اَلْاِشْتِمَالُ بِالثَّوْبِ کپڑے کو اس طرح لپیٹنا کہ اس کا بالائی سرا بائیں جانب ڈالا جائے حدیث میں ہے[1] (۱۰۱) نُهِيَ عَنْ شِمَالِ الصَّمَّاءِ کہ اشتمال الصماء ممنوع ہے۔

اور استعارہ کے طور پر کمبل کو جو جسم پر لپیٹا جاتا ہے۔ شَمْلَةٌ وَمِشْمَلٌ کہا جاتا ہے اور اسی سے شَمَلَهُمُ الْاَمْرُ کا محاورہ ہے جس کے معنی کسی امر کے سب کو شامل اور عام ہو جانے کے ہیں۔ پھر شِمَال کے لفظ سے مجازاً کہا جاتا ہے۔ شَمَلْتُ الشَّاةَ بکری کے تھنوں پر غلاف چڑھانا۔ اور شِمَال کے معنی عادت بھی آتے ہیں کیونکہ وہ بھی چادر کی طرح انسان پر مشتمل ہو جاتی ہے۔

اَلشَّمُوْلُ شراب کیونکہ وہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور شراب کو شمول کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ عقل کو ڈھانپ لینے کی وجہ سے خَمْرٌ کہا جاتا ہے۔

اَلشِّمَالُ (بکسر الشین) وہ ہوا جو کعبہ کی بائیں جانب سے چلتی ہے اور اس میں ایک لغت شَمَالٌ (بفتحہ شین بھی ہے۔

شَامَلَ وَاَشْمَلَ کے معنی شمال کی جانب میں جانے کے ہیں جیسے جنوب سے اَجْنَبَ۔ (جنوب کو جانا) کنایہ کے طور پر تلوار کو مِشْمَلٌ کہا جاتا ہے جیسا کہ اسے رِدَاءٌ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی سے مُرْتَدِيًا بِالسَّيْفِ وَمُتَدَرِّعًا لَهُ کی طرح جَاءَ مُشْتَمِلًا بِسَيْفِهِ کا محاورہ ہے:۔

نَاقَةٌ شِمِلَّةٌ وَشِمْلَالٌ بادِ شمال کی طرح تیز رو اونٹنی۔ اور شاعر کے قول[2] ع (الکامل)

(۲۶۷) وَلَتَعْرِفَنَّ خَلَائِقًا مَشْمُوْلَةً
وَلَتَنْدَمَنَّ وَلَاتَ سَاعَةَ مَنْدَمِ

تم عمدہ اخلاق کو پہچان لو گے اور تم پشیمانی اٹھاؤ گے لیکن وہ وقت پشیمانی کا نہیں ہوگا۔

میں مَشْمُوْلَةٌ سے مراد پاکیزہ اخلاق ہیں گویا باد شمال نے (شراب کی طرح) انہیں ٹھنڈا اور خوش گوار بنا دیا۔

(ش ن ء)

شَنِئْتُهٗ (ف س) کے معنی بغض کی وجہ سے کسی چیز سے نفرت کرنے کے ہیں۔ اسی سے اَزْدِ شَنُوْءَةَ مشتق ہے جو ایک قبیلہ کا نام ہے اور آیت کریمہ:۔ شَنَاٰنُ قَوْمٍ (۵-۲) لوگوں کی دشمنی۔

میں شَنَاٰنٌ کے معنی بغض اور دشمنی کے ہیں ایک قرأت میں شَنْاٰنٌ بسکون نون ہے پس تخفیف (یعنی سکون نون) کی صورت میں اسم

---

[1] متفق علیہ و ابوداؤد و البیہقی من حدیث ابن عمر راجع ایضاً الزرقانی علی الموطا ۴ر۲۸۷ و الفائق ۱ر۲۰۲ ؎ [2] البیت من شواہد الطبری ۲۳ر۱۲۲ و راجع لہ ایضاً اضداد ابی الطیب ۴۱۳ و الاصمعی ۱۸ و ابن السکیت ۱۷۳ و ابن الانباری ۴۸ و فی کل المراجع بغیر عزو و الخزانۃ البغدادیہ ۲ر۱۴۸ ؎

اور فتح نون کی صورت میں مصدر ہوگا[1] اور اسی سے فرمایا۔
اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ (۱۰۸-۳) کچھ شک نہیں کہ تمہارا دشمن ہی بے اولاد رہے گا۔

(ش ھ ب)

اَلشِّهَابُ کے معنی بلند شعلہ کے ہیں خواہ وہ جلتی ہوئی آگ کا ہو یا فضا میں کسی عارضہ کی وجہ سے پیدا ہو جائے۔ قرآن میں ہے:۔
فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ (۳۷-۱۰) تو جلتا ہوا انگارہ اس کے پیچھے لگتا ہے۔
شِهَابٌ مُّبِيْنٌ (۱۵-۱۸) روشنی کرنیوالا انگارہ۔
شِهَابًا رَّصَدًا (۷۲-۹) انگارہ تیار۔
اَلشُّهْبَةُ سفیدی جس میں کچھ سیاہی ملی ہوئی ہو۔
جیسا کہ انگارہ کی روشنی کے ساتھ دھواں ملا ہوتا ہے اسی سے كَتِيْبَةٌ شَهْبَاءُ کا محاورہ ہے جس کے معنی مسلح لشکر کے ہیں کیونکہ اس میں ہتھیاروں کی چمک سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاہی اور سفیدی ملی ہوئی ہیں۔

(ش ھ د)

اَلشُّهُوْدُ وَالشَّهَادَةُ کے معنی کسی چیز کا مشاہدہ کرنے کے ہیں خواہ بصر سے ہو یا بصیرت سے اور صرف حاضر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے۔
عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (۹-۱۰۵) پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا۔
لیکن اولیٰ یہ ہے کہ شُهُوْدٌ کے معنی صرف حاضر ہونا ہوں اور شَهَادَةٌ میں حاضر ہونے کے ساتھ مشاہدہ کا بھی اعتبار کیا جائے اَلْمَحْضَرُ بمعنی مشہد یعنی حاضر ہونے کی جگہ کو کہا جاتا ہے مُشْهِدٌ وہ عورت جس کا خاوند حاضر ہو اور مَشْهَدٌ کی جمع مَشَاهِدُ آتی ہے اسی سے مَشَاهِدُ الْحَجِّ ہیں یعنی وہ مواضع شریفہ جہاں کہ فرشتے اور نیک لوگ حاضر ہوتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ مَشَاهِدُ الْحَجِّ کے معنی مناسک حج کے ہیں قرآن میں ہے:۔
لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (۲۲-۲۸) تاکہ وہ اپنے فائدہ کے لئے حاضر ہوں۔
وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا (۲۴-۲) اور ان کی سزا کے وقت ..... موجود ہو۔
مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ (۲۷-۴۹) ہم تو اس کے گھر والوں کے موقع ہلاکت پر گئے ہی نہیں۔
وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ (۲۵-۷۲) اور وہ جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔
یعنی نہ تو زُوْرٌ کے موقع پر خود ہی حاضر ہوتے ہیں اور نہ ہی اس کا قصد یا ارادہ کرتے ہیں۔
اَلشَّهَادَةُ۔ وہ بات جو کامل علم ویقین سے کہی جائے خواہ وہ علم مشاہدۂ بصر سے حاصل ہوا ہو یا بصیرت سے۔ اور آیت کریمہ:
اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ (۴۳-۹) کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے۔
میں مشاہدہ بصر مراد ہے۔ اور پھر سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ (عنقریب ان کی شہادت لکھ لی جائے گی) سے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ شہادت

---

[1] الاسم مثل سکران وعطشان من سکر وعطش والمصدر مثل طیران ونسلان وشنآن (؟) ورملان ؟ال الجبری ... و اولی القراءتین قراءة من یفتح النون لان المصادر یاتی علی فعلان

یعنی حاضر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اور آیت کریمہ:
وَأَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (۲-۸۴) اور تم اس بات کے گواہ ہو۔
یعنی تَشْهَدُوْنَ کے معنی تَعْلَمُوْنَ کے ہیں یعنی تم اس بات کو یقین کے ساتھ جانتے ہو۔ اور آیت کریمہ
مَا أَشْهَدْتُهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ (۱۸-۵۱) میں نے نہ تو ان کو آسمان کے پیدا کرنے کے وقت بلایا تھا۔
یعنی تنبیہ کی ہے کہ یہ اس لائق نہیں ہیں کہ اپنی بصیرت سے خلق آسمان پر مطلع ہو جائیں
اور آیت کریمہ:
عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (۲۳-۹۲) وہ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے۔
یعنی غائب سے وہ چیزیں مراد ہیں جن کا ادراک نہ تو ظاہری حواس سے ہو سکتا ہو اور نہ بصیرت سے اور شہادت سے مراد وہ اشیاء ہیں جنہیں لوگ ظاہری آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔
شَهِدْتُ کا لفظ دو طرح پر استعمال ہوتا ہے
(۱) علم کی جگہ آتا ہے اور اسی سے شہادت ادا ہوتی ہے مگر أَشْهَدُ بِكَذَا کی بجائے اگر أَعْلَمُ کہا جائے تو شہادت قبول نہیں ہوگی بلکہ أَشْهَدُ ہی کہنا ضروری ہے۔
(۲) قسم کی جگہ پر آتا ہے چنانچہ أَشْهَدُ بِاللّٰهِ أَنَّ زَيْدًا مُنْطَلِقٌ میں أَشْهَدُ بمعنی أُقْسِمُ ہے بعض نے کہا ہے کہ اگر أَشْهَدُ کے ساتھ بِاللّٰهِ نہ بھی ہو تب بھی یہ قسم کے معنی میں ہوگا اور کبھی عَلِمْتُ بھی اس کے قائم مقام ہو کر قسم کے معنی دیتا ہے اور اس کا جواب بھی جواب قسم کی طرح ہوتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1] (الکامل)
(۲۶۷) وَلَقَدْ عَلِمْتُ لَتَأْتِيَنَّ مَنِيَّتِي
مجھے یقین ہے کہ میری موت ضرور آکر رہے گی۔
شَاهِدٌ اور شَهِيْدٌ کے ایک ہی معنی ہیں شَهِيْدٌ کی جمع شُهَدَاءُ آتی ہے قرآن میں ہے
وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ (۲-۲۸۲) تو گواہ انکار نہ کریں۔
وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ (۲-۲۸۲) اور دو مردوں کو گواہ کر لیا کرو۔
شَهِدْتُ کے معنی کسی جگہ پر حاضر ہونے کے ہیں اور شَهِدْتُ عَلٰى كَذَا کے معنی کسی واقعہ کی شہادت دینے کے قرآن میں ہے:
شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ (۴۱-۲۰) ان کے کان ان کے خلاف (ان کے اعمال کی) شہادت دیں گے۔
اور کبھی شہادت کے معنی فیصلہ اور حکم کے ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:
وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا (۱۲-۲۶) اس کے قبیلہ میں سے ایک فیصلہ کرنے والے نے فیصلہ کیا۔
اور جب شہادت اپنی ذات کے متعلق ہو تو اس کے معنی اقرار کے ہوتے ہیں۔ جیسے فرمایا:
وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ إِلَّا أَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ أَحَدِهِمْ أَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ (۲۴-۶) اور خود ان کے سوا ان کے گواہ نہ ہو تو ہر ایک کی شہادت یہ ہے کہ چار

---

[1] ذا السیوطی ۸۰-۲ البیت منسوب للبید ولم اجدہ فی دیوانہ وتمامہ ان المنایا لا تطیش سہامہا وقد روی عجزہ ما عوف علی ولا عدمہ، کذا قال العینی فی شرح الشواہد راجع رقم ۲۵۲

بارخدا کی قسم کھائے۔

اور آیت کریمہ:۔ مَا شَهِدْنَا إِلَّا بِمَا عَلِمْنَا (۱۲-۸۱) اور ہم نے تو اپنی دانست کے مطابق (اس کے لے آنے کا) عہد کیا تھا۔

میں شَهِدْنَا بمعنی أَخْبَرْنَا ہے اور آیت کریمہ:۔ شَاهِدِينَ عَلَىٰ أَنفُسِهِم بِالْكُفْرِ (۹-۱۷) جب کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں گے۔

میں شَاهِدِينَ بمعنی مُقِرِّينَ ہے یعنی کفر کا اقرار کرتے ہوئے۔

لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا (۴۱-۲۱) تم نے ہمارے خلاف کیوں شہادت دی۔

اور آیت کریمہ:۔ شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ (۳-۱۸) خدا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے لوگ۔

میں اللہ تعالیٰ کے اپنی وحدانیت کی شہادت دینے سے مراد عالم اور انفس میں ایسے شواہد قائم کرنا ہے جو اس کی واحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1]۔

وفی کل شیئ لہ آیۃ (۲۶۸)

تدل علی انہ واحد

ہر چیز کے اندر ایسے دلائل موجود ہیں جو اس کے یگانہ ہونے پر دلالت کر رہے۔

بعض نے کہا ہے کہ باری تعالیٰ کے اپنی ذات کے لئے شہادت دینے سے مراد یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کو نطق بخشا اور ان سب نے اس کی وحدانیت کا اقرار کیا۔ (أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ) اور فرشتوں کی شہادت سے مراد ان کا ان افعال کو سرانجام دینا ہے جن پر وہ مامور ہیں۔ جس پر کہ آیت:۔

فَالْمُدَبِّرَاتِ أَمْرًا (۷۹-۵) پھر دنیا کے کاموں کا انتظام کرتے ہیں۔ دلالت کرتی ہے۔ اور اُولوالعلم کی شہادت سے مراد یہ ہے کہ وہ مخلوق کے رموز و اسرار پر مطلع ہوتے اور ان کا اقرار کرتے ہیں اور شہادت بایں معنی اہل علم کے ساتھ ہی مخصوص ہے کیونکہ جہلاء اس قسم کی شہادت سے کوسوں دور ہیں اسی لئے کفار کے متعلق فرمایا:۔

مَا أَشْهَدتُّهُمْ خَلْقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَا خَلْقَ أَنفُسِهِمْ (۱۸-۵۱) میں نے ان کو نہ تو آسمان اور زمین کے پیدا کرنے کے وقت بلایا تھا اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت۔

اور آیت کریمہ:۔

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (۳۵-۲۸) خدا سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں۔ جو صاحب علم ہیں۔

میں بھی اسی معنی پر تنبیہ فرمائی ہے اور آیت:۔

وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ (۴-۶۹) اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ۔

میں بھی شہداء سے یہی لوگ مراد ہیں۔

---

[1] البیت فی البحر (۲: ۴۰۲-۳: ۱۳۹- ۴: ۳۲۲) ومحاضرات المؤلف (۴: ۳۹۸) فی خلاثۃ ابیات والطبری ودفی ابن کثیر قبلہ فواعجبا کیف یعصی الالہ۔ ام کیف یجحدہ الجاحد۔ ونسبہ الی ابن المعتز وفی طبقات ابن المعتز ۲۰۷ انہ لابی العتاہیۃ وتعد انا نواس دعجارلاتہ ایاہ وہوالصواب کمافی زہرالآداب للحصری (۲: ۹۴) وطراز المجالس ۱۱۶ ٭

شَھِیْدٌ یہ کبھی بمعنی شاہد یعنی گواہ آتا ہے۔ چنانچہ آیت :۔
سَائِقٌ وَّ شَھِیْدٌ (۵۰-۲۱) اس کے ساتھ (ایک) چلانے والا اور (ایک) گواہ ہوگا۔ میں شہید بمعنی گواہ ہی ہے جو اس کے لئے یا اس پر گواہی دیگا۔ اسی طرح آیت کریمہ :۔
فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّةٍ بِشَھِیْدٍ وَّجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَھِیْدًا (۴-۴۱) بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے احوال بتانے والے کو بلائیں گے اور تم کو لوگوں کا حال بتانے کو گواہ طلب کریں گے۔
میں بھی شہید بمعنی شاہد ہی ہے اور آیت کریمہ :۔
اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ (۵۰-۳۷) یا دل سے متوجہ ہوکر سنتا ہے۔
کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو کچھ سنتے ہیں ان کے دل اس کی شہادت دیتے ہیں بخلاف ان لوگوں کے جن کے متعلق فرمایا ہے۔ اُولٰٓئِکَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّکَانٍۭ بَعِیْدٍ (۴۱-۴۴) ان کو (گویا) دور جگہ سے آواز دی جاتی ہے۔
اور آیت کریمہ :۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِلٰی قَوْلِهٖ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ کَانَ مَشْھُوْدًا (۱۷-۷۸) کیونکہ صبح کے وقت قرآن کا پڑھنا موجب حضور ملائکہ ہے۔
میں قرآن کے مشہود ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قراءت کرنے والے پر شفاء رحمت، توفیق، سکینت اور ارواح نازل ہوتی ہیں۔
جن کا کہ آیت :۔
وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا ھُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۱۷-۸۲) اور ہم قرآن کے ذریعہ سے وہ کچھ نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لئے شفا اور رحمت ہے۔
میں ذکر پایا جاتا ہے۔ اور آیت :۔
وَادْعُوْا شُھَدَآءَکُمْ (۲-۲۳) اور جو تمہارے مددگار ہیں ان کو بلاؤ۔ میں شُھَدَآءَ کی تفسیر میں مختلف اقوال ہیں جن پر معنی شہادت مشتمل ہے۔ چنانچہ ابن عباسؓ نے اس کے معنی اَعْوَان یعنی مددگار کے کئے ہیں اور مجاہدؒ نے اس کے معنی یہ کئے ہیں "کہ جو تمہارے حق میں گواہی دیں" اور بعض نے شہداء سے وہ لوگ مراد لئے ہیں۔ جن کے موجود ہونے کو قابل قدر اور معتبر سمجھا جائے یعنی وہ ایسے لوگ نہ ہوں جن کے متعلق کہا گیا ہے[1] (البسیط) (۹۶) مُخَلَّفُوْنَ وَیَقْضِی النَّاسُ اَمْرَھُمْ وَھُمْ بِغَیْبٍ وَّفِیْ عَمْیَآءَ مَا شَعَرُوْا
وہ پیچھے رہتے ہیں اور لوگ اپنے معاملات کا فیصلہ کرلیتے ہیں وہ غیر حاضر اور بے خبر ہوتے ہیں اور ان کو اس بات کا علم تک نہیں ہوتا
اور آیت کریمہ :۔
وَنَزَعْنَا مِنْ کُلِّ اُمَّةٍ شَھِیْدًا (۲۸-۷۵) اور ہم امت میں سے گواہ نکال لیں گے۔
میں بھی شہید کا لفظ انہی معانی پر حمل کیا گیا ہے۔ اور آیت کریمہ

---

[1] قالہ الاخطل فی کلیب بن یربوع رھط جریر و بعدہ: الاکلون خبیث الزاد وحدھم ۔ والسائلون بظھر الغیب: ما الخبر والبیت فی الکامل و محاضرات المؤلف (۱: ۱۱۳) و دیوانہ ۱۰۱ والسیوطی ۲۰۸ و فیہ یعنی بدل یقضی و قبلہ: اما کلیب بن یربوع فلیس لھا . عند التفاخر ایراد ولا صدر

وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ (۱۰۰-۱۷) اور وہ اس سے آگاہ بھی ہے۔
إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (۴۱-۵۳) کہ تمہارا پروردگار ہر چیز سے باخبر ہے۔
وَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا (۴۸-۲۸) اور (حق ظاہر کرنے کو) خدا ہی کافی ہے۔
میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حق تعالےٰ سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا:۔
لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ (۴۰-۱۶) اور کوئی چیز خدا سے مخفی نہیں رہے گی۔
يَعْلَمُ السِّرَّ وَأَخْفَىٰ (۲۰-۷) وہ تو چھپے بھید اور پوشیدہ بات تک کو جانتا ہے۔
علی ہذا القیاس متعدد آیات ایسی ہیں جو اس معنی (یعنی علم باری تعالیٰ کے محیط ہونے) پر دال ہیں۔
اور قریب المرگ شخص کو بھی شہید کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے پاس فرشتے حاضر ہوتے ہیں چنانچہ آیت کریمہ:۔
تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا (۴۱-۳۰) الآیۃ ان پر فرشتے اتریں گے اور کہیں گے کہ خوف نہ کرو۔
میں بھی اسی معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور فرمایا:۔
وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ (۵۷-۱۹) اور اپنے پروردگار کے نزدیک شہید ہیں ان کے لئے ان کے اعمال کا صلہ ہوگا۔
اور قُتِلَ شُهَدَاءَ کو شُهَدَاء یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ حالت نزع میں ان نعمتوں کا مشاہدہ کر لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تیار کی ہیں اور یا اس لئے کہ ان کے ارواح باری تعالےٰ

کے ہاں حاضر کئے جاتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا:۔
وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا (۳-۱۶۹) اور جو لوگ خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ مت سمجھنا اور آیت کریمہ:۔
وَالشُّهَدَاءُ عِندَ رَبِّهِمْ (۵۷-۱۹) اور پروردگار کے نزدیک شہید ہیں۔ بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے اور آیت کریمہ:۔
وَشَاهِدٍ وَمَشْهُودٍ (۸۵-۳) اور حاضر ہونے والے کی اور جو اس کے پاس حاضر کیا جائے اس کی قسم۔
میں بعض نے کہا ہے کہ مَشْهُودٌ سے یوم جمعہ مراد ہے اور بعض نے یوم عرفہ مراد لیا ہے اور بعض نے یوم قیامت اور شَاهِدٌ سے ہر وہ شخص مراد ہو سکتا ہے جو اس روز میں حاضر ہوگا اور آیت کریمہ:۔
يَوْمٌ مَّشْهُودٌ (۱۱-۱۰۳) اور یہی وہ دن ہے جس میں خدا کے روبرو حاضر کئے جائیں گے۔
میں مَشْهُودٌ بمعنی مُشَاهَدٌ ہے اور اس میں تنبیہ ہے کہ وہ دن ضرور آکر رہے گا۔
اَلتَّشَهُّدُ کے معنی أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُولُ اللَّهِ پڑھنے کے ہیں اور عرف میں تشہد کے معنی اَلتَّحِيَّاتُ اور ان اذکار کے ہیں جو حالت تشہد (جلسہ) میں پڑھے جاتے ہیں۔

(ش ھ ر)

اَلشَّهْرُ (مہینہ) وہ مدت معینہ جو چاند کے ظہور سے شروع ہوتی ہے۔ یا دوران شمس کے بارہ

حصوں میں سے ایک حصہ کا نام ہے جو ایک نقطہ سے شروع ہو کر دوسرے نقطہ پر ختم ہو جاتا ہے قرآن میں ہے:۔
شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ (۲-۱۸۵) (روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے جس میں ۔ ۔ ۔ ۔
اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ (۲-۱۹۷) حج کے مہینے معین ہیں جو معلوم ہیں۔
اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا (۹-۳۶) خدا کے نزدیک مہینے گنتی میں بارہ ہیں
فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ (۹-۲) تو مشرکو! زمین میں چار مہینے چل پھر لو۔
اَلْمُشَاهَرَةُ کے معنی ہیں مہینوں کے حساب سے معاملہ کرنا۔ جیسے مُسَانَهَةٌ (سال وار معاملہ کرنا) اور مُيَاوَمَةٌ (دنوں کے حساب سے معاملہ کرنا) اَشْهَرْتُ بِالْمَكَانِ کسی جگہ مہینہ بھر قیام کرنا شَهَرَ فُلَانٌ وَاشْتَهَرَ کے معنی مشہور ہونے کے ہیں خواہ وہ شہرت نیک ہو یا بد۔

(ش ھ ق)

اَلشَّهِيْقُ۔ کے معنی لمبی سانس کھینچنا کے ہیں لیکن شَهِيْقٌ سانس لینے اور زَفِيْرٌ سانس چھوڑنے پر بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ (۱۱-۱۰۶) اس میں ان کو چلانا اور دھاڑنا ہو گا۔
وَسَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا (۲۵-۱۲) اور چیخنے چلانے کو سنیں گے۔
اصل میں یہ لفظ جَبَلٌ شَاهِقٌ سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی انتہائی بلند پہاڑ کے ہیں۔

(ش ھ و)

اَلشَّهْوَةُ کے معنی ہیں نفس کا اس چیز کی طرف کھنچ جانا جسے وہ چاہتا ہے۔ خواہشات دنیوی دو قسم پر ہیں صَادِقَہ اور کَاذِبَہ
سچی خواہش وہ ہے جس کے حصول کے بغیر بدن کا نظام مختل ہو جاتا ہے جیسے بھوک کے وقت کھانے کی اشتہا اور جھوٹی خواہش وہ ہے جس کے عدم حصول سے بدن میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ پھر شَهْوَةٌ کا لفظ کبھی اس چیز پر بولا جاتا ہے۔ جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور کبھی خود اس قوت شہویہ پر اور آیت کریمہ:۔
زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ (۳-۱۴) لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں (بڑی) زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔
میں شہوات سے دونوں قسم کی خواہشات مراد ہیں۔ اور آیت کریمہ:۔
وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (۹-۵۹) اور خواہشات نفسانی کے پیچھے لگ گئے۔
میں جھوٹی خواہشات مراد ہیں یعنی ان چیزوں کی خواہش جن سے استغنا ہو سکتا ہو۔ اور جنت کے متعلق فرمایا:۔
وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْ اَنْفُسُكُمْ (۴۱-۳۱) اور وہاں جس (نعمت) کو تمہارا جی چاہے گا تم کو ملے گا۔
فِيْمَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ (۲۱-۱۰۲) اور جو کچھ ان کا جی چاہے گا اس میں ۔ ۔ ۔ ۔
رَجُلٌ شَهْوَانٌ وَشَهْوَانِيٌّ خواہش کا بندہ شَيْءٌ شَهِيٌّ لذیذ چیز۔ مرغوب شے۔

(ش و ب)

اَلشَّوْبُ (ن) کے معنی ہیں خلط ملط کرنا۔

قرآن میں ہے:۔

لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ (۳۷-۶۷) گرم پانی ملا کر اور عَسَلٌ یعنی شہد کو شَوْبٌ یا تو اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ تمام مشروبات میں ملایا جاتا ہے اور یا اس لئے کہ اس کے ساتھ موم ملا ہوا ہوتا ہے مثل مشہور ہے (مثل)

مَا عِنْدَهٗ شَوْبٌ وَّلَا رَوْبٌ نہ اس کے پاس شہد ہے اور نہ دودھ بالکل قلاش ہے۔

(ش و ر)

اَلشَّوَارُ کے معنی ظاہری سامان آرائش کے ہیں اور کنایہ کے طور پر اندام نہانی پر بولا جاتا ہے اور شَوَّرْتُ بِهٖ کے معنی ہیں میں نے اسے شرمندہ کیا۔ گویا اس کے ستر کو ننگا کر دیا۔

شُرْتُ الْعَسَلَ وَاَشَرْتُهٗ چھتے سے شہد نکالنا شاعر نے کہا ہے (الرمل)

(۲۷۰) وَحَدِيْثٍ مِّثْلُ مَاذِيٍّ مُّشَارٍ

اور باتیں جو چھتے سے نکالے ہوئے تازہ شہد کی طرح شیریں تھیں۔

اور شہد نکالنے کے اعتبار سے شُرْتُ الدَّابَّةَ کے معنی ہوئے گھوڑے کی دوڑ معلوم کرنا کہ کس قدر دوڑ سکتا ہے اور خطبیوں کے متعلق کہا جاتا ہے:۔ مِشْوَارٌ كَثِيْرُ الْعِثَارِ کہ خطبے ایسی منڈی ہے جہاں بہت زیادہ لغزش کا خطرہ ہے۔

اور اَلتَّشَاوُرُ وَالْمُشَاوَرَةُ وَالْمَشُوْرَةُ کے معنی ہیں ایک دوسرے کی طرف بات لوٹا کر رائے معلوم کرنا یہ بھی شُرْتُ الْعَسَلَ سے مشتق ہے جس کے معنی چھتہ سے شہد کا لنا کے ہیں قرآن میں ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳-۱۵۹) اور اپنے کاموں میں ان سے مشورہ لیا کرو۔

اَلشُّوْرٰى ہر وہ امر جس میں مشورہ کیا جائے قرآن میں ہے:۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲-۳۸) اور اپنے کام آپس کے مشورہ سے کرتے ہیں۔

(ش و ظ)

اَلشُّوَاظُ۔ آگ کا شعلہ جس میں دھواں نہ ہو قرآن میں ہے:۔

شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ وَّنُحَاسٌ (۵۵-۳۵) آگ کے شعلے اور دھواں۔

(ش و ك)

اَلشَّوْكُ کانٹا اور کبھی شَوْكٌ اور شِكَّةٌ

لہ کذا فی النوادر لابی سہل ۱۵ وراجع للمثل اللسان (روب شوب) ومنہ فی الحدیث: لا شوب ولا روب ای لا غش ولا تخلیط قالہ ابن الاثیر فی تفسیر ہذا الحدیث ای لاغش ولا تخلیط۔ سلہ قالہ عدی بن زید العبادی وہو من مشاہیر شعراء الجاہلیۃ ذکرہ بروکلمن فی تاریخہ (۱: ۱۷۴) وایضاً الخزانۃ (۲: ۲۰) واولہ۔ فی سماع یاذن الشیخ لہ۔ والبیت فی اللسان (اذن، شور، موذ) والفائق (۱: ۱۳) و (۱: ۲۳۷) والطبری (۳۰: ۲۷) ولترجمۃ الاغانی (۲: ۱۸-۴۳) وجمہرۃ اشعار العرب ۱۰۳ وتاریخ الطبری والبیت فی الامالی المرتضی (۱: ۲۳۴) بغیر عزو والصحاح (موذ) وقبلہ: وملاب قد تلہیت بہا۔ تصرت الیوم فی بیت قدارۃ والقصیدۃ مقیدۃ القافیۃ۔ سلہ وفی الصحاح: ایاک والخطب فانہا مشوار کثیر العثار۔

کے لفظ سے اسلحہ اور شدت مراد ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے:۔
غَیْرَ ذَاتِ الشَّوْکَةِ (۸-۷) کہ جو قافلہ بے شان وشوکت (یعنی ہتھیار) ہے۔
اور تشبیہ کے طور پر بچھو کے ڈنک کو بھی شَوْكٌ کہا جاتا ہے اور خاردار درخت کو شَجَرَةٌ شَاكَةٌ وَشَائِكَةٌ کہہ دیتے ہیں۔ شَاكَنِي الشَّوْكُ مجھے کانٹا چبھ گیا شَوَّكَ الْفَرْخُ چوزے نے کانٹے اور پر نکال لئے شَوَّكَ ثَدْيُ الْمَرْأَةِ عورت کی چھاتی ابھر آئی شَوَّكَ الْبَعِيْرُ اونٹ کے انیاب کا لمبا اور کانٹے کی طرح تیز ہونا۔

(ش و ی)

شَوَيْتُ اللَّحْمَ وَاشْتَوَيْتُهُ کے معنی گوشت بھوننا کے ہیں۔ قرآن میں ہے:۔
يَشْوِي الْوُجُوْهَ (۱۸-۲۹) ان کے چہروں کو جھلس دے گا۔
شاعر نے کہا ہے (الرمل)
(۲۷) فَاشْتَوىٰ لَيْلَةَ رِيحٍ وَاجْتَمَلْ
تو اس نے ٹھنڈی رات (یعنی قحط سالی) میں گوشت بھونا اور چربی پگھلا کر کھائی۔
اَلشَّوٰى جسم کے اطراف۔ ہاتھ پاؤں۔ وہ اعضاء جن پر زخم لگنے سے موت واقع نہ ہو محاورہ ہے۔ رَمَاهُ فَاَشْوَاهُ اسے تیر مارا تو اس کے اطراف پر لگا یعنی ایسے عضو پر نہیں لگا جس پر زخم لگنے سے انسان مرجاتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى (۷۰-۱۶) کھال ادھیڑ ڈالنے والی۔
اور اسی سے غیر اہم معاملہ کو بھی شَوًى کہا جاتا ہے کیونکہ شَوًى مُقْتَل یعنی عضو رئیس نہیں ہوتا (جس پر زخم لگنے سے انسان مرجائے)
اَلشَّاةُ بھیڑ۔ یہ اصل میں شَايِهَةٌ ہے کیونکہ اس کی جمع شِيَاهٌ اور تصغیر شُوَيْهَةٌ آتی ہے۔

(ش ی ء)

اَلشَّيْءُ بعض کے نزدیک شی وہ ہوتی ہے جس کا علم ہو سکے اور اس کے متعلق خبر دی جا سکے اور اکثر متکلمین کے نزدیک یہ اسم مشترک ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے ماسوا پر بھی بولا جاتا ہے اور موجودات اور معدومات سب کو شے کہہ دیتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ شے صرف موجود چیز کو کہتے ہیں۔ یہ اصل میں شَاءَ کا مصدر ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے متعلق شے کا لفظ استعمال ہو تو یہ بمعنی شَاءٍ یعنی اسم فاعل کے ہوتا ہے اور غیر اللہ پر بولا جائے تو مَشِيْءٌ (اسم مفعول) کے معنی میں ہوتا ہے۔ پس آیت کریمہ:۔
اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ (۳۹-۶۲) خدا ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔
میں لفظ شی چونکہ دوسرے معنی (اسم مفعول) میں استعمال ہوا ہے اس لئے یہ عموم پر محمول ہوگا اور اس سے کسی قسم کا استثناء نہیں کیا جائیگا کیونکہ شی

له قاله لبيد داوله: او نهنه فاتاه رزقه وقبله وغلام ارسلته امه۔ بالوك فبذلنا ما سأل۔ وفي رواية واحتمل بالحاء بدل الجيم وقال في شواهد الكشاف (۱) ورواية الجيم انسب ما فيه والبيت في تهذيب الالفاظ ۱۱۲ وديوانه ۳۹ والمعاني للقتبي ۱۸۴ ط۔ حيدر آباد ۱۳۴۸

مصدر بمعنی المفعول ہے مگر آیت کریمہ :۔
قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَھَادَۃً (۶-۱۹) ان سے پوچھو کہ سب سے بڑھ کر (قرین انصاف) کس کی شہادت ہے۔
میں شے بمعنی اسم فاعل ہے اور اللہ تعالیٰ کو اَکْبَرُ شَھَادَۃً کہنا ایسے ہی ہے جیسا کہ دوسری آیت فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ (۲۳-۱۴) (تو خدا جو سب سے بہتر بنانے والا بڑا بابرکت ہے)
میں ذات باری تعالیٰ کو اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ کہا گیا ہے۔
اَلْمَشِیْئَۃُ ۔ اکثر متکلمین کے نزدیک مشیئت اور ارادہ ایک ہی صفت کے دو نام ہیں لیکن بعض کے نزدیک دونوں میں فرق ہے (۱) مشیئت کے اصل معنی کسی چیز کی ایجاد یا کسی چیز کو پا لینے کے ہیں۔ اگرچہ عرف میں مشیئت ارادہ کی جگہ استعمال ہوتا ہے پس اللہ تعالیٰ کی مشیئت کے معنی اشیاء کو موجود کرنے کے ہیں اور لوگوں کی مشیئت کے معنی کسی چیز کو پالینے کے ہیں پھر اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کو چاہنا چونکہ اس کے وجود کو مقتضی ہوتا ہے۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے۔ مَا شَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ کہ جو اللہ تعالیٰ چاہے وہی ہوتا ہے اور جو نہ چاہے نہیں ہوتا۔
ہاں اللہ تعالیٰ کا کسی چیز کا ارادہ کرنا اس کے حتمی وجود کو نہیں چاہتا۔ چنانچہ قرآن میں ہے :۔
یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (۲-۱۸۵) خدا تمہارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔
وَمَا اللّٰہُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (۴۰-۳۱) اور خدا تو بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔
کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ لوگوں میں عُسْر اور ظلم پائے جاتے ہیں۔
(۲) مشیئت اور ارادہ میں دوسرا فرق یہ ہے کہ انسان کا ارادہ تو اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے بغیر ہو سکتا ہے مثلاً انسان چاہتا ہے کہ اسے موت نہ آئے لیکن اللہ تعالیٰ اس کو مار لیتا ہے۔ لیکن مشیئت انسانی مشیئت الٰہی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی جیسے فرمایا :۔
وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ ...... (۸۱-۲۹) اور تم کچھ بھی نہیں چاہتے مگر وہی جو خدائے رب العالمین چاہے۔
ایک روایت ہے کہ جب آیت :۔
لِمَنْ شَاءَ مِنْکُمْ اَنْ یَّسْتَقِیْمَ (۸۱-۲۸)
یعنی اس کے لئے جو تم میں سے سیدھی چال چلنا چاہے۔
نازل ہوئی تو کفار نے کہا یہ معاملہ تو ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم چاہیں تو استقامت اختیار کریں اور چاہیں تو انکار کردیں اس پر آیت کریمہ :۔
وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ نازل ہوئی۔
بعض نے کہا ہے کہ اگر تمام امور اللہ تعالیٰ کی مشیئت پر موقوف نہ ہوتے اور ہمارے افعال اس پر معلق اور منحصر نہ ہوتے تو لوگ تمام افعال انسانیہ میں انشاء اللہ کے ذریعہ استثناء کی تعلیق پر متفق نہیں ہوسکتے تھے۔ قرآن میں ہے :۔
سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ (۳۷-۱۰۲) خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں پائے گا۔
سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ صَابِرًا (۱۸-۶۹) خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔
یَاْتِیْکُمْ بِہِ اللّٰہُ اِنْ شَاءَ ...... (۱۱-۳۳) اگر اس کو خدا چاہے گا تو نازل کریگا۔
اُدْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ (۱۲-۹۹) مصر میں

داخل ہو جائیے خدا نے چاہا تو ....
قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ (۷ - ۱۸۸) کہدو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا مگر جو خدا چاہے وَمَا يَكُوْنُ لَنَا أَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَا إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ .... (۷ - ۸۹) اور ہمیں شایان نہیں کہ ہم اس میں لوٹ جائیں ہاں خدا جو ہمارا پروردگار ہے وہ چاہے تو (ہم مجبور ہیں)۔
وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا إِلَّا أَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ (۱۸ - ۲۳) اور کسی کام کی نسبت نہ کہنا کہ میں اسے کل کروں گا مگر (ان شاء اللہ کہہ کر یعنی اگر) خدا چاہے۔

(ش ی ب)

اَلشَّيْبُ وَالْمَشِيْبُ بڑھاپا۔ بالوں کی سفیدی۔ قرآن میں ہے:۔
وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا (۱۹ - ۴) اور بڑھاپے سے سر شعلہ مارنے لگا۔
بَاتَتِ الْمَرْأَةُ بِلَيْلَةٍ شَيْبَاءَ عورت نے شب زفاف گزاری یعنی جس میں اسکی بکارت زائل کی گئی ہو اس کے برعکس بَاتَتِ الْمَرْأَةُ بِلَيْلَةٍ حُرَّةٍ وہ رات جس میں اس کی بکارت زائل نہ کی گئی ہو۔

(ش ی ت)

شِيَةٌ اصل میں وِشْيَةٌ ہے اس کی بحث باب الواو میں بیان ہوگی۔

(ش ی خ)

اَلشَّيْخُ کے معنی معمر آدمی کے ہیں۔ عمر رسیدہ آدمی کے چونکہ تجربات اور معارف زیادہ ہوتے ہیں اس مناسبت سے کثیر العلم شخص کو بھی شیخ کہہ دیا جاتا ہے۔ محاورہ ہے:۔
شَيَّخَ بَيِّنُ الشَّيْخُوْخَةِ وَالشَّيْخِ وَالتَّشَيُّخِ یعنی وہ بہت بڑا عالم ہے۔ قرآن میں ہے:۔
هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا (۱۱ - ۷۲) یہ میرے میاں (بھی) بوڑھے ہیں۔
أَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ (۲۸ - ۲۳) ہمارے والد بڑی عمر کے بوڑھے ہیں۔

(ش ی د)

اَلْمَشِيْدُ (پلستر کیا ہوا، بلند) قرآن میں ہے۔
وَقَصْرٍ مَّشِيْدٍ (۲۲ - ۴۵) اور بہت سے بلند محل ہیں۔
تو مَشِيْدٌ کے معنی یا تو پلستر کی ہوئی عمارت کے ہیں اور یا مُطَوَّلٌ یعنی بلند کے ہیں۔ اگر چہ یہ بھی مآل کے لحاظ سے پہلے معنی کی طرف راجع ہے محاورہ ہے شَيَّدَ قَوَاعِدَهٗ اس کی بنیادوں کو اسی طرح محکم بنایا جیسے گچ کی ہوئی ہوتی ہیں۔
اَلْإِشَادَةُ (افعال) کے معنی (بلند آواز سے شعر پڑھنا یا گانا) کے ہیں۔

(ش ی ط)

اَلشَّيْطَانُ اس کی بحث پہلے گزر چکی ہے[1]۔

[1] دیکھئے (ش ط ن)

(ش ی ع)

اَلشِّیَاعُ کے معنی منتشر ہونے اور تقویت دینا کے ہیں کہا جاتا ہے۔
شَاعَ الْخَبَرُ خبر پھیل گئی اور قوت پکڑ گئی۔
شَاعَ الْقَوْمُ قوم منتشر اور زیادہ ہو گئی۔
شَیَّعْتُ النَّارَ بِالْحَطَبِ ایندھن ڈال کر آگ تیز کرنا۔
اَلشِّیْعَۃُ وہ لوگ جن سے انسان قوت حاصل کرتا ہے اور وہ اس کے ارد گرد پھیلے رہتے ہیں اسی سے بہادر کو مُشَیَّعٌ کہا جاتا ہے۔
شِیْعَۃٌ کی جمع شِیَعٌ وَاَشْیَاعٌ آتی ہے قرآن میں ہے۔
وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِہٖ لَاِبْرٰھِیْمَ (۳۷-۸۳) اور ان ہی یعنی نوح علیہ السلام کے پیروؤں میں ابراہیم تھے۔
ھٰذَا مِنْ شِیْعَتِہٖ وَھٰذَا مِنْ عَدُوِّہٖ (۲۸-۱۵) ایک تو موسیٰ کی قوم کا ہے اور دوسرا اس کے دشمنوں میں سے تھا۔
وَجَعَلَ اَھْلَھَا شِیَعًا (۲۸-۴) وہاں کے باشندوں کو گروہ در گروہ کر رکھا تھا۔
فِیْ شِیَعِ الْاَوَّلِیْنَ (۱۵-۱۰) پہلے لوگوں میں (بھی)۔
وَلَقَدْ اَھْلَکْنَآ اَشْیَاعَکُمْ (۵۴-۵۱) اور ہم تمہارے ہم مذہبوں کو ہلاک کر چکے ہیں۔

(ش ء ن)

شَاْنٌ کے معنی حالت اور اس اتفاقی معاملہ کے ہیں جو کسی کے مناسب حال ہو اسکا اطلاق صرف اہم امور اور حالات پر ہوتا ہے۔ قرآن میں ہے:۔
کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ (۵۵-۲۹) ہر روز کام میں مصروف رہتا ہے۔
شَاْنُ الرَّاْسِ کھوپڑی کی چھوٹی چھوٹی ہڈیوں کے ملنے کی جگہ جس سے انسان کا قوام ہے اسکی جمع شُؤُوْنٌ آتی ہے۔

تمت الجزالاوّل